آج

۵۲

خصوصی شمارہ

محمد خالد اختر

ترتیب

اجمل کمال

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

آج

ادبی کتابی سلسلہ شمارہ ۵۲

فروری ۲۰۰۵ء

سالانہ خریداری:

پاکستان: ایک سال (چار شمارے) ۳۰۰ روپے (بشمول ڈاک خرچ)

ہندستان: ایک سال (چار شمارے) ۲۴۰ روپے (بشمول ڈاک خرچ)

دیگر ممالک: ایک سال (چار شمارے) ۳۰ امریکی ڈالر (بشمول ڈاک خرچ)

رابطہ:

پاکستان: آج کی کتابیں 316، مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی 74400

فون: 5213916 5650623

ای میل: city_press@email.com, aajquarterly@gmail.com

ہندستان:

C/o Dr. Ather Farouqui, First Floor,

80, Sukhdev Vihar, New Delhi 110 025

دیگر ممالک:

Dr. Baidar Bakht,21 White Leaf Crescent, Scarborough, Ontario M1V 3G1, Canada. Phone: (416) 292 4391, Fax: (416) 292 7374

E-mail: bbakht@rogers.com

Scanned with CamScanner

تعارف

محمد خالد اختر کی تحریروں کے اس انتخاب کو، جس میں ان کے مضامین، کتابوں پر تبصرے، پیروڈیاں اور یادداشتیں شامل ہیں، ان کی ذہنی سرگزشت یا سوانح حیات کے طور پر بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ پینتیس برس سے زیادہ عرصے کے دوران شائع ہونے والی یہ تحریریں کتابوں اور ان کے لکھنے والوں کے بارے میں بھی ہیں اور محمد خالد اختر کے زندگی کے تجربات کے بارے میں بھی۔

ایک منفرد اور صاحبِ اسلوب ادیب کے طور پر انھوں نے افسانہ، ناول، مزاح، طنز، پیروڈی، سفرنامہ اور خطوط کی اصناف میں اپنا بھرپور تخلیقی اظہار کیا اور اپنے گرویدہ پڑھنے والوں کی ایک بڑی تعداد کو وہ مسرت بخشی جو اعلیٰ درجے کے ادب کے مطالعے سے حاصل ہوتی ہے۔ اس کے باوجود، محمد خالد اختر نے ہمیشہ خود کو لکھنے والے سے زیادہ پڑھنے والے کے طور پر شناخت کرنا پسند کیا۔ زیرِ نظر انتخاب میں شامل ان کی تحریریں دراصل ایک پُرشوق پڑھنے والے کی یادداشتوں کا لطف رکھتی ہیں جس کے لیے اس کی محبوب کتابوں کے بہت سے کردار اسی طرح، بلکہ اس سے زیادہ، حقیقی ہوتے ہیں جس طرح وہ لوگ جن سے زندگی کے عمل میں اس کی ملاقات ہوئی ہو۔ کسی نئی عمدہ کتاب کو دریافت کرنا ان کے لیے بالکل ایسا تھا جیسے کوئی نیا، مَن موہنا دوست بنانا۔ اس ذاتی تعلق کی گہرائی ہی نے کتابوں اور لکھنے والوں کے بارے میں ان کی تحریروں میں، جنھیں آپ آئندہ صفحات میں پڑھیں گے، ایسا رنگ پیدا کیا ہے جو عموماً تبصروں اور مضامین میں نہیں ملتا۔

محمد خالد اختر نے اپنی ان تحریروں کے ذریعے پڑھنے والوں کی کئی نسلوں کی ادبی تربیت کی اور ان میں وہ تنقیدی شعور پیدا کیا جو انھیں ادب سے محظوظ ہونے اور عمدہ اور ناقص کتابوں کے درمیان امتیاز کرنے کے قابل بناتا ہے، لیکن کتابوں سے ان کے مطالبات اس قسم کے نہیں جیسے پیشہ ور تنقید نگار کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا انداز اردو ادب کی مروجہ تنقید سے بہت خوشگوار طور پر مختلف ہے۔ ان کے اسلوب کی ایک خصوصیت دھیمے مزاح کی وہ رو ہے جو یوں تو ان کے تبصروں اور مضامین میں بیشتر وقت سطح کے نیچے چلتی رہتی ہے، لیکن کبھی کبھی سطح پر آ کر نمایاں ہو جاتی ہے۔ یہ بات خاص طور پر ان کی بےمثل پیروڈیوں میں ظاہر ہوتی ہے جن میں سے چند اس انتخاب کے تیسرے حصے میں شامل کی گئی ہیں اور جن میں وہ اپنے کسی پسندیدہ اور ناپسندیدہ لکھنے والے کے اسلوب کو اپنے شائستہ طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

انتخاب کا چوتھا حصہ محمد خالد اختر کی ان تحریروں پر مشتمل ہے جو "ایک لکھنے والے کی نوٹ بک" کے ذیلی عنوان سے کئی قسطوں میں شائع ہوئیں اور جن میں انھوں نے متنوع موضوعات پر اپنے خیالات رقم کیے۔

آخر میں ضمیمے کی ذیل میں کچھ ایسی تحریریں شامل کی گئی ہیں جو اس انتخاب کے بنیادی موضوع کو کسی نہ کسی طرح روشن کرتی ہیں۔ ان میں محمد خالد اختر کی متفرق تحریروں کے علاوہ ان کی کتابوں پر تبصرے اور خود ان کے لکھے ہوئے تبصروں پر اختلافی ردعمل شامل ہیں۔

—اجمل کمال

Scanned with CamScanner

محمد خالد اختر

(۱۹۲۰ء — ۲۰۰۲ء)

محمد خالد اختر کی تصانیف

بیس سو گیارہ	ناول	۱۹۵۰ء
چاکیواڑہ میں وصال	ناول	۱۹۶۴ء
کھویا ہوا افق	انتخاب	۱۹۶۸ء
دو سفر	سفرنامے	۱۹۸۴ء
چچا عبدالباقی	کہانیاں	۱۹۸۵ء
مکاتیب خضر	خطوط	۱۹۸۹ء
یاترا	سفرنامہ	۱۹۹۰ء
ابن جبیر کا سفر	مطالعہ	۱۹۹۵ء
لالٹین اور دوسری کہانیاں	کہانیاں	۱۹۹۷ء

Scanned with CamScanner

ترتیب

مضامین

شفیق الرحمٰن ۱۳

سعادت حسن منٹو ۳۱

دائیں طرف یا بائیں طرف ۵۲

ایک آدمی احمد شاہ نامی ۶۱

رابرٹ لوئی اسٹیونسن ۸۳

ایک کالج میگزین ۸۷

شاعرِ بہار ۹۶

تبصرے

سات سمندر پار ۱۰۵

یہ بیویاں یہ کلرک ۱۱۱

انسان ۱۱۵

اداس نسلیں ۱۲۲

چلے دن بہار کے ۱۴۸

کہتے ہیں جس کو عشق ۱۵۰

Scanned with CamScanner

۱۵۲	سرراہے
۱۵۳	افکارِ پریشاں
۱۶۸	اردو شاعری کا مزاج
۱۷۸	دستک نہ دو
۱۸۴	آتش رفتہ
۱۹۱	دیواریں
۱۹۳	بجنگ آمد
۱۹۹	نئے ناولوں کی کھیپ
۲۰۸	رگِ سنگ
۲۱۱	کرنافلی
۲۱۶	حسرت عرض تمنا
۲۲۸	بازگشت
۲۳۲	روہی
۲۳۳	لمحے کی بات
۲۴۵	اردو کی آخری کتاب
۲۴۹	آوارہ گرد کی ڈائری
۲۵۷	جنگل
۲۶۲	نکلے تری تلاش میں
۲۶۸	اپنا اپنا جہنم
۲۷۴	آوازِ دوست
۲۸۱	کپاس کا پھول
۲۹۱	فاختہ
۲۹۶	تین بہنیں
۳۰۴	اندلس میں اجنبی

Scanned with CamScanner

٣١٠ پکھیرو

٣١٤ کھوئی ہوئی شام

٣١٩ بستی

٣٢٤ گردِراہ

٣٣٦ رئیس امروہوی، فن اور شخصیت

٣٥١ مہانڈراڈیکھنس

پیروڈیاں

٣٥٧ چھتری

٣٧٦ گھپلا

٣٨٣ میرے بھی جم خانے

٣٩٤ مسٹر گھیٹو سے انٹرویو

٤١٧ موم اور شہد

٤٣٧ مہتاب خاں شتاب اور شکیل چکوری

٤٥٠ سعید بن مجید عرف مجاہد اشبیلیہ

ایک لکھنے والے کی نوٹ بک

٤٦٣ ریت پر لکیریں

ضمیمہ

٥١٥ ایک دیباچہ جو چھپ نہ سکا

Scanned with CamScanner

۵۱۸ چاکیواڑہ میں وصال (ابن انشا)

۵۲۱ کھویا ہوا اُفق (محمد کاظم)

۵۳۰ تبصرے پر تبصرہ (صلاح الدین اکبر)

۵۳۴ ''اداس نسلیں'' کے تبصرے پر تبصرہ (فہمیدہ ریاض)

۵۳۷ محمد خالد اختر (اشفاق احمد)

۵۴۲ مجھے کہنا ہے کچھ

Scanned with CamScanner

مضامین

Scanned with CamScanner

شفیق الرحمٰن

ایڈیٹر "نقوش" نے شفیق الرحمٰن کی شخصیت پر لکھنے کے لیے مجھے چنا ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ شفیق سے اس قدر نزدیک ہونے کی وجہ سے اس کام کو مجھ سے زیادہ خوش اسلوبی سے کوئی دوسرا انجام نہیں دے سکتا۔ اب یہ ایک بحث طلب امر ہے کہ آیا ایک آدمی اپنے دوست کا بہترین سوانح نگار ہوسکتا ہے۔ کیا کوئی اپنے دوست کے بارے میں اس ٹھنڈے اور غیر جذباتی طریق سے سوچ سکتا ہے جو اس قسم کی تصویر کشی کے لیے بے حد ضروری ہے؟ ہم مادام تو ساد کے موم کے بنے ہوئے بت نہیں۔ ہم خون اور پوست کی مخلوق ہیں اور دوستی بڑی حد تک ایک جذباتی وابستگی ہے۔ ہم سب میں اپنے دوستوں کی آمد رگوں میں خون کی تیز تر گردش کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ ہم محفل میں اور محفل کے باہر اپنے بہترین دوستوں کے گن اونچے سروں میں گاتے ہیں۔ وہ ہماری اپنی زندگی میں اس قدر اہم ہوتے ہیں اور ہم ان سے اس درجہ محبت کرتے ہیں کہ ہم انھیں حسین اور چمکیلے رنگوں میں پیش کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ اسے انسانی کمزوری کہو یا کچھ اور، ایک دوست کے متعلق مکمل غیر شخصی انداز میں نہیں لکھا جا سکتا۔ دوستی اپنی ماہیت سے تنقید کی قوت کو معطل کر دیتی ہے۔ ہم اپنے دوستوں کی ویسی ہی تصویر کھینچ سکتے ہیں جیسے وہ ہمیں نظر آتے ہیں۔

اس مشکل کے پیش نظر، اور اپنی ادبی حدود اور کوتاہیوں کو پوری طرح جانتے ہوئے، مجھے ایڈیٹر کی فرمائش کو افسوس کے ساتھ رد کر دینا چاہیے، مگر کوئی چیز مجھ کو ایسا کرنے سے روک رہی ہے۔ اچھے اور خوش اخلاق ایڈیٹر کی یہ دعوت مجھے اپنے دوست کو ایک چھوٹا سا خراجِ عقیدت پیش کرنے کا ایسا موقع دیتی ہے جو ایک آدمی کی زندگی میں روز روز نہیں آتا۔ کیا میں اسے اس آسانی سے جانے دوں؟ نہیں، میں اس دعوت کو قبول کرتے ہوئے، الفاظ میں اپنے سب سے جیالے اور بھڑکیلے دوست کا ایک ہلکا سا تاثر دینے کی کوشش کروں گا — اس کے باوجود کہ میری لغت محدود ہے اور میری زبان عجیب اور لنگڑی۔

Scanned with CamScanner

شفیق اور میں قریب قریب ہم عمر ہیں۔ ہم نے ایک ہی ماہ اور سال میں اس خوبصورت اور حیران کن دنیا پر آنکھیں کھولیں۔ دو جماعتیں ہم نے بہاولپور ہائی اسکول میں اکٹھی پڑھیں — ساتویں اور آٹھویں۔ ہم فوراً دوست نہیں بنے اور کافی مدت تک ایک دوسرے کو اجنبی جانوروں کی طرح مشتبہ نظروں سے دیکھتے رہے۔ اُن دنوں کا شفیق ایک گل گوتھنا، گول مٹول لڑکا تھا جو ترکی ٹوپی پہنتا تھا اور ایک چھوٹے، بچوں کے سائیکل پر چڑھ کر اسکول میں آتا تھا۔ وہ فضل بک ڈپو کے سنسنی خیز اور راتوں کی نیند حرام کر دینے والے جاسوسی ناولوں کا بڑی شدت سے مطالعہ کیا کرتا تھا، اور میرا خیال ہے بچپن کی خود فریبی سے اپنے آپ کو بھی ایک ماہر جاسوس سمجھتا تھا۔ وہ اکثر سائیکل پر خیالی ڈاکوؤں یا مجرموں کا تعاقب کیا کرتا اور اپنی کارکردگیوں کی لمبی محیر العقول کہانیاں سناتا جو ہمیں اس کی خوش قسمتی پر رشک کرنے پر مجبور کر دیتیں۔ بازار میں ایک دکان تھی جہاں چاند تارے کی شکل کی چوسنے والی مٹھائیوں کے علاوہ فضل بک ڈپو کے ناول بھی شاید ایک پیسہ یومیہ کرائے پر مل سکتے تھے۔ شفیق کے توسط سے میں بھی ان ناولوں سے متعارف ہو گیا اور رفتہ رفتہ ان کا رسیا بن گیا۔ ہم ان ناولوں کو کلاس میں لے کر آتے اور ماسٹر کی موجودگی میں انھیں ڈیسک کے نیچے چھپا کر پڑھتے۔ ہم ضخیم سے ضخیم ناول کو ایک دن میں ختم کر کے دم لیتے — نہ صرف اس لیے کہ انھیں ایک بار شروع کر کے ختم کیے بغیر چھوڑنا ناممکن ہوتا بلکہ اس لیے بھی کہ ایک زائد دن کتاب کو رکھنے سے ہمیں خواہ مخواہ ایک پیسہ مزید کرایہ دینا پڑتا تھا۔ جب ماسٹر جماعت میں سود یا تجارت کی گتھیاں سلجھا رہا ہوتا، ہم بڑے مزے سے اپنی تہہ خانوں اور نقاب پوشوں کی دنیا میں گم ہوتے۔ ہم دونوں کو پڑھنے کی عادت انھی ناولوں نے ڈالی۔ ہم ان جاسوسی ناول لکھنے والوں کی ذہانت اور قابلیت پر رشک کیا کرتے، ان مصنفوں کے ناموں میں ہمیں ایک شان، ایک عظمت نظر آتی، اور ہم دونوں کے دلوں میں اس ارادے نے پہلی بار جڑ پکڑی کہ ہم بڑے ہو کر مصنف بنیں گے اور فضل بک ڈپو کے ناول نگاروں کی طرح سنسنی خیز اور ہوش ربا ناول لکھا کریں گے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، میری یہ مصنف بننے کی خواہش اور ہوس ایک غلطی تھی۔ اس کی مجھے ایک بڑی قیمت ادا کرنا پڑی ہے۔ اب جب کہ مجھے اس غلطی کا احساس ہو چلا ہے، کسی نئی زندگی کی طرف لوٹ جانا ناممکن ہے۔ شفیق میں اُن دنوں بھی قصے لکھنے کا ایک قدرتی ملکہ تھا، اُس وقت بھی اس میں دوسروں کو ہنسی

سے لوٹ پوٹ کر دینے کی وہ لااُبالیانہ ادا تھی جس نے اسے اس قدر مسرت بخش مصنف اور دوست بنا دیا ہے۔ وہ بیٹھے بٹھائے پانچ منٹ میں چھوٹی مزاحیہ نظمیں چست کر لیتا۔ مضمون آفرینی اور طباعی کا خلقی مادہ اس میں موجود تھا۔

ہم، گھر والوں سے چوری چھپے، دارالاشاعت پنجاب سے بھی کتابیں منگواتے۔ ان کی وی پی چھڑانے کے لیے ہم اپنے جوڑے ہوئے پیسوں کو پول (pool) کرتے۔ کیا ہم بادشاہوں کی طرح خوش نہ ہوتے تھے جب کتابوں کا بنڈل ہمارے قبضے میں ہوتا تھا! اور کس دھڑکن اور اضطراب سے ہم اس بنڈل کو کھولتے تھے، اور کیسی خوبصورت کتابیں وہ ہوتی تھیں! ''قصرِ صحرا''، ''عمر و عیار''، ''جنوبی سمندر کی کہانی''، ''الحمرا کی کہانیاں۔'' میں نے ایسی کتابیں پھر نہیں پڑھیں، اور نہ کبھی پڑھوں گا۔ وہ لڑکے خوش قسمت ہیں جنھوں نے اپنے لڑکپن میں انھیں پڑھا ہے۔ شفیق اکثر کہتا ہے کہ وہ جو کچھ ہے انھی کتابوں کی بدولت ہے۔ انھوں نے ہمیں اصل ادب کے حسن اور لطافت سے روشناس کیا اور ہمارے تخیل کو جلا دی۔

ہم دونوں میں سے ایک بھی ابھی تک ان کتابوں کے سحر تلے سے نہیں نکل سکا۔ میری اپنی چہیتی کتابیں ''قصرِ صحرا'' کے تین حصے اور ''جنوبی سمندروں کی کہانی'' تھے — یہ پہلی بحری لڑائیوں اور عجیب ملکوں میں دہشت ناک مہموں کے متعلق ایک ناول ہے، اور اس سے زیادہ اچھی کہانی کی کوئی لڑکا خواہش نہیں کر سکتا۔ شفیق کو جو کتاب سب سے اچھی لگی، وہ غلام عباس کی ''الحمرا کی کہانیاں'' تھی۔ ان کہانیوں کے اسرار، جادو اور رومان نے اُسے بالکل مسخر کر لیا۔ اور پھر اس کتاب میں رنگین تصویریں تھیں۔ ان دنوں میں بھدی سے بھدی تصویریں بھی کس قدر حقیقی اور جاندار لگتی تھیں۔ ہم دونوں کے دل پر ابھی تک وہ عجیب تصویریں نقش ہیں جو ان کتابوں کے متن کو السٹریٹ (illustrate) کرتی تھیں۔ ویسے آرٹسٹ آج کل کیوں نہیں ہوتے؟

آٹھویں پاس کر کے شفیق غالباً محض تبدیلی آب و ہوا کی خاطر بہاول پور اسکول چھوڑ کر بہاول نگر کے ہائی اسکول میں جا داخل ہوا۔ ہم پھر ایک سال تک نہ ملے۔ جب وہ گرمیوں کی چھٹیوں میں چند ہفتوں کے لیے بہاول پور آیا تو وہ جسمانی طور پر ایک مختلف شفیق تھا اور اس کی آواز بھاری ہو گئی تھی۔ یہ مجھے بڑا عجیب اور دلچسپ معلوم ہوا۔ میں اس سے آگاہ نہیں تھا کہ بعینہٖ وہی تبدیلیاں مجھ میں بھی آ چکی

Scanned with CamScanner

تھیں۔ حقیقت میں ہم دونوں کے قدوں میں یک لخت اضافہ ہو گیا تھا۔ ہم نے پھر کچھ وقت اکٹھے گزارا۔ میرے والد صاحب کی کتابوں میں واشنگٹن ارونگ کی انگریزی کتاب "الحمرا کی داستانیں" کی ایک جلد نکل آئی۔ اسے میں نے شفیق کو دے دیا اور وہ چھٹیوں کے بعد اسے اپنے ساتھ بہاول نگر لے گیا۔ اس نے اس میں سے دو تین کہانیوں کے آزاد ترجمے کیے۔ میرا خیال ہے وہ "عصمت" میں چھپے۔ وہ بڑے خوبصورت ترجمے تھے ـــ شوخ اور شگفتہ اور بے تکلف۔ ان کے بعد شفیق مختلف رسائل میں چھپنے لگا۔ اس نے پہلے ہلے میں ہی چھاپے کی عجیب دنیا کو فتح کر لیا تھا، اور وہ غالباً اردو کا واحد مصنف ہے جس کا کوئی مضمون ناقابل اشاعت سمجھ کر لوٹایا نہیں گیا۔ اسے اس کی خوش نصیبی پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ ابتدا ہی سے اس کی طنازی نے زبان کی روانی اور شوخی کے پردے میں اپنا رنگ جما دیا۔ ادبی شہرت اسے اس عمر میں ہی حاصل ہو گئی جب بہت سے اپنے مطلب کے اظہار کے لیے زبان کی مشکلات سے ایک مایوسانہ پیکار میں سرگرداں ہوتے ہیں۔

میٹرک پاس کرنے کے بعد شفیق نے رہتک میں ایک کالج میں داخلہ لیا۔ (یہ لوگ رہتک کے راجپوت ہیں اور شفیق کا پورا نام راؤ شفیق الرحمن ہے۔) رہتک سے اس نے ایف ایس سی (میڈیکل) بڑے اچھے نمبروں پر پاس کیا اور لاہور کے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں داخلے کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ میں نے ۱۹۳۸ء میں بہاول پور کالج سے بی اے کیا اور اپنے والد کو مجھے لا کالج بھیجنے پر اکسایا اگرچہ قانون سے مجھے کوئی طبعی رغبت نہیں تھی۔ اسی سال میں لا کالج میں داخل ہوا۔ لا کے پہلے سال میں باعزت طریقے سے فیل ہوا کیونکہ ممتحنوں نے قانون کی اس تشریح سے جو میں نے (متعدد کارٹونوں کی مدد سے) اپنے پرچوں میں کی تھی، اتفاق نہیں کیا تھا۔ دوسرے سال میں مغل پورہ کے انجینئرنگ کالج میں داخل ہو گیا۔ انجینئرنگ کے لیے مجھے قانون سے بھی کم رغبت تھی، مگر میرا خیال تھا کہ انجینئرنگ کالج میں جا کر میں 'پریکٹیکل' ہو جاؤں گا۔ دوسرے لوگ 'پریکٹیکل' تھے، میں 'پریکٹیکل' نہیں تھا ـــ اور یہ خیال مجھے کافی ناخوش رکھتا تھا۔

شفیق اب میڈیکل کالج کے تھرڈ ایئر میں تھا۔ جب میں لا کالج میں تھا تو ہم کسی وجہ سے بہت کم ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ اب ہم دوسرے تیسرے ملنے لگے۔ وہ بلاناغہ ہر چھٹی کو سائیکل پر میرے پاس آ جاتا۔ ہم وہاں سے سچے آوارہ گردوں کی طرح پاپیادہ کھیتوں میں سے دریا کی طرف چل پڑتے۔

Scanned with CamScanner

ہم دونوں اَن تھک چلنے والے ہیں۔ ہم راستے میں دم لیتے، دھوپ سینکتے، کسی درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر وہی باتیں کرتے جو کرب زدہ نوجوان ہمیشہ کرتے ہیں۔ ہم راہ میں پڑتے ہوے تاریخی کھنڈروں کی دیواروں پر اسکول کے لڑکوں کی طرح اپنے ناموں کو چاقو سے کندہ کرتے تاکہ ہم لافانی ہو جائیں اور آئندہ نسلوں کے سیلانی جان سکیں کہ ہمارا بھی کبھی اس سرائے دوروزہ میں گزر ہوا تھا۔

بعض وقت ہم اپنے ساتھ کوئی کتاب لے جاتے اور کسی سبز اور شاداب جگہ پر بیٹھ کر اس میں سے صفحے پڑھ کر ایک دوسرے کو سناتے۔ ہم نے مزاح نگار اسٹیفن لیکاک (Stephen Leacock) کی بیشتر کتابیں انھی سیروں میں اسی طریق سے پڑھی ہیں۔ ہم چھوٹے شرارتی بچوں کی طرح بے تکلفانہ قہقہے لگا کر ہنستے اور کئی بار سنجیدہ دہقانی راہ گیر ہمیں عجیب نظروں سے دیکھتے جیسے کہ ہم باؤلے ہوں۔

میں نے شفیق کے قہقہوں کے سے اونچے اور صحت مند اور کسی کے قہقہے نہیں سنے۔ اور میں کسی اور کو نہیں جانتا جس کی باتوں میں اتنی شگفتگی اور چمک ہو۔ اس کے قہقہے مجھے اپنے تاریک خول سے باہر کھلی ہوا اور چمکیلی دھوپ میں لے جاتے۔ اس کی مسرت مجھے چھو جاتی اور میں اس قدر ہنستا کہ میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے۔ وہ کون سی ایسی باتیں ہوتی تھیں جو ہمیں یوں بے تحاشا ہنساتی تھیں؟ دو تین مجھے یاد ہیں، مگر میں ان کو یہاں نہیں لکھوں گا، کہ ایسی باتیں لکھے جانے کے بعد اپنی آب و تاب کھو دیتی ہیں اور سپاٹ اور بے جان لگتی ہیں۔

شفیق اور میں اب تک ان لمبی سیروں کو نہیں بھولے۔ ان سیروں کا سرمئی نیلا آسمان اب تک ہم پر چمکتا ہے۔ اب تک کسی اکیلے پرندے کی راگنی ہمارے کانوں کو سنائی دیتی ہے۔ ان سیروں نے واقعی ہمیں ایک دوسرے کے نزدیک کر دیا ــــ کھلی سڑک کی رفاقت سی اور کوئی رفاقت نہیں۔ انھوں نے زندگی کو بھی قابلِ برداشت بنا دیا اور انجینئرنگ کالج کے خشک ماحول میں رنگینی کی لہر پیدا کر دی۔

کالج کے دنوں ہی سے شفیق کو ایک خوبصورت جسم بنانے کا خبط تھا۔ وہ اب تک اپنی روزانہ ورزش میں باقاعدہ ہے۔ کالج میں اس کا معمول تھا کہ وہ صبح اٹھ کر ہوسٹل کے سامنے کے لان میں ایک میل دوڑتا۔ شام کو وہ کرکٹ کے لیے چلا جاتا (وہ ایک وقت میں اچھا خاصا فاسٹ باؤلر سمجھا جاتا تھا)۔ کھیل کے بعد وہ گرما میں اکثر کالج سوئمنگ ٹینک میں آدھ میل تیرتا۔

Scanned with CamScanner

وہ ایک اچھا طالب علم تھا، اور جہاں تک مجھے یاد ہے، وہ کسی سال میں فیل نہیں ہوا۔ وہ اپنے کالج کی دوسری سرگرمیوں میں بھی چمکا اور اپنے فائنل ایئر میں اتفاقِ رائے سے اس سال کے لیے ڈرامیٹک کلب کا سیکرٹری منتخب ہوا۔ اس کی سیکریٹری شپ کے دور میں میڈیکل کالج کے ڈرامیٹک کلب نے ایک ڈراما اسٹیج کیا جو بہت کامیاب رہا۔

۱۹۴۰ء میں اس نے ایم بی بی ایس کا امتحان پاس کیا۔ اسی سال اس کی پہلی کتاب ''کرنیں'' خوشنما جیبی سائز میں اور حجاب امتیاز علی کے حوصلہ افزا دیباچے کے ساتھ چھپی۔ یہ شفیق الرحمٰن کے لیے ایک مسعود اور مبارک سال تھا— نئی کامرانیوں اور نئی آزادیوں کا سال۔ امتحان میں کامیابی نے اسے وہ معاشی خودمختاری دی جس کے لیے وہ اتنا بے تاب تھا۔ اس کے اعزہ اسے سول میں ڈاکٹر دیکھنے کے خواہاں تھے؛ شفیق کو سویلین ڈاکٹر کی زندگی سے نفرت تھی۔ فوج کی ملازمت کی دمک اور ایڈونچر نے اس کے نوجوان دل کو اپیل کیا۔ اس نے کمیشن کے لیے درخواست دی جو اسے فوراً مل گیا۔ وہ جنگ کے دن تھے اور فوج میں ڈاکٹروں کی بڑی مانگ تھی۔

لاہور چھوڑنے سے پہلے دو دن اس نے میرے ساتھ گزارے۔ (میں نے ہوسٹل چھوڑ دیا تھا اور اب ریلوے اسٹیشن کے سامنے ریوالی سینما کے پاس ایک تاریک اور اداس دو منزلہ ہوٹل میں اقامت پذیر تھا۔) ہر ایک شخص کی طرح وہ اپنی پہلی تقرری کے متعلق نروس اور مضطرب تھا۔ اسے لاہور چھوڑنے پر افسوس تھا اور اپنی نئی زندگی کے لیے وسوسے اسے کچھ بے سکون اور اداس بنا رہے تھے۔ یہ وسوسے ایک ایسے شخص کے لیے قدرتی تھے جو بنیادی طور پر شرمیلا ہے۔

ٹریننگ کے بعد اس کی مختلف جگہوں پر تقرری ہوتی رہی۔ مجھے اس کے خط باقاعدگی سے رومینٹک ناموں والے شہروں سے آتے رہے— فورٹ سنڈیمن، دارجیلنگ، آسام اور جنوبی ہند کے مقامات سے۔ وہ ایک بڑا دلچسپ خط لکھنے والا ہے۔ اس کے خط بتاتے تھے کہ وہ اپنی ابتدائی جھجک اور شرمیلے پن پر غالب آ گیا ہے اور اپنی نئی زندگی کی کڑی روٹین میں نہ صرف رچ گیا ہے بلکہ اسے پُرلطف اور مزاج کے موافق پا رہا ہے۔ وہ اپنی یونیفارم اور اپنے اسٹارز پر اتنا مغرور تھا جتنا ایک چھوٹا اسکول کا لڑکا پہلی بار انگریزی کپڑے پہننے پر— اور یہ کہنا کوئی مذاق نہیں کہ اس نے کمیشن یونیفارم پہننے کے لیے لیا۔ وہ اپنی نئی شان میں، جو میرے لیے باعثِ رشک تھی، کبھی کبھی لاہور میں ایک دو روز کے لیے آ نکلتا۔ وہ

ایک خاکی، چوڑے چھجوں کا فیلٹ پہننے کا بڑا مشتاق تھا۔ اس میں وہ کسی امریکن فلم کا کاؤبوائے لگتا۔ مجھے یہ فیلٹ ایک آرمی ڈاکٹر کے لیے بہت فلیمبائنٹ (flamboyant) معلوم دیتا۔ شفیق کو اس چیز سے محبت تھی اور ایک دفعہ اس نے اس چیز کی دوسری سب ٹوپیوں پر برتری ثابت کرنے کے لیے مجھے ایک گھنٹے کا لیکچر دیا۔ اپنے دوستوں کے احتجاجات کے باوجود اس نے اس ٹوپی کا پہننا جاری رکھا۔

۱۹۴۳ء میں خوش قسمتی سے اس کی ایک ایسے اسٹیشن پر تقرری ہوئی جس سے بہتر اسٹیشن اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ نیا اسٹیشن خوبصورت اور شاداب وادیِ کلو میں ایک پہاڑ کے دامن میں واقع تھا۔ یہاں تقریباً چار ہزار اٹلی کے جنگی قیدی، جنگ کے شور و شغب سے دور، ایک مکمل چین اور امن میں اپنی ویکیشن (vacation) گزار رہے تھے۔ یول کیمپ — یہ اس جگہ کا نام تھا — ایک قیدیوں کے کیمپ کے علاوہ ایک ہالی ڈے کیمپ تھا، اور اطالوی یہاں جنگ کے خاتمے تک ایک مسلسل پکنک کے مزے لے رہے تھے۔ یہاں میں نے شفیق کے ساتھ ایک حسین مہینہ گزارا۔ اس نے دو تین سالوں میں انگریزی ادب کی کتابوں کی اچھی خاصی لائبریری اکٹھی کر لی تھی۔ ہم نے ایک دوسرے کو صفحے پڑھ کر سنانے کے خوشگوار طریقے سے ڈیمن رینان کی اور دوسری کئی مزاحیہ کتابیں ختم کر ڈالیں۔ بہترین کتاب جو ہم نے اس طرح پڑھی ''گڈ سولجر شویک'' (Good Soldier Shwiek) تھی۔ ''گڈ سولجر شویک'' غالباً جنگوں اور فوجی زندگی پر سب سے پُر لطف طنز، ہر لحاظ سے دنیا کی عظیم کتابوں میں شمار کی جا سکتی ہے۔ جب ہم پڑھ نہ رہے ہوتے، ہم کیمپ سے دور میلوں لمبی سیروں پر نکل جاتے یا پہاڑوں پر چڑھائی کرتے۔ کیبن سے نیچے پتھریلی سڑک پر مارچ کرتے ہوئے اطالوی قیدی ہمارے لیے ایک مستقل تفریح کا سامان تھے۔ وہ باتیں کرتے ہوئے اپنے بازوؤں اور ہاتھوں کو مبالغہ آمیز طریق پر ہلاتے۔ جھگڑتی ہوئی عورتوں کی طرح ان کی زبان کتر کتر چلتی تھی — ''تفیرو... لاتفیرو... فیرو... فیرو...'' اطالوی بڑی باتونی اور جذباتی نسل ہیں۔ مقطع داڑھیوں والے، چشمے لگے اطالوی جرنیل ہمیں بڑے مضحکہ خیز لگتے۔ شفیق اور میں نے اتفاق کیا کہ اطالویوں کو جنگ میں جھونکنا سراسر زیادتی تھی۔

اسی یول کیمپ میں ہی کاؤنٹ کمولا شفیق کا دوست بنا۔ کاؤنٹ کی شخصیت نے اس پر گہرا اور انمٹ نقش ڈالا۔ اس نے ایک ناول کے لیے بھی نوٹ (notes) لینے شروع کیے جس میں کاؤنٹ کمولا کو مرکزی کردار ہونا تھا۔ بعض وجوہات کی بنا پر وہ ناول نہ لکھا جا سکا۔ جب ۱۹۵۲ء میں شفیق کاؤنٹ کے

Scanned with CamScanner

وطن میں گیا تو کاؤنٹ نے اس کی میزبانی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ''برساتی'' میں شفیق نے کمولا کی فیاضی اور فراخ دلی کی ایک نہایت دلآویز تصویر کھینچی ہے۔

یول کے بعد ہم اکثر ملتے رہے ہیں۔ اسے سال میں ایک مہینے کی چھٹی ملتی ہے جو وہ بہاول پور میں بسر کرتا ہے۔ کبھی میں اسے چار پانچ دن ملنے کے لیے چلا جاتا ہوں۔ ہم دونوں کے ملازمت کے بکھیڑے ان ملاقاتوں کے وقفوں کو طویل کرتے جا رہے ہیں۔ ۱۹۵۰ء میں شفیق آرمی کی طرف سے ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ گیا۔ وہ اپنے نام کے ساتھ ایک ڈگری کی لڑی لایا ہے جو مجھے ہمیشہ بھول جاتی ہے۔

۲

جب اس کی پہلی کتاب ''کرنیں'' چھپی تو اس کا نام ایک مزاحیہ افسانوں کے مصنف کی حیثیت سے کافی مشہور ہو چکا تھا۔ ''کرنیں'' ۱۹۴۱ء میں طبع ہوئی — اسی سال میں اس نے ایم بی بی ایس کیا اور کمیشن لیا۔ یہ کتاب خوب بکی اور ایک سال میں ہی اس کے دوسرے ایڈیشن کے چھپنے کی نوبت آ گئی۔ ''شگوفے''، ''لہریں''، ''مدوجزر''، ''حماقتیں'' اور ''پچھتاوے''، ایک دوسرے کے بعد، ایک ایک سال کے وقفے سے شائع ہوئیں۔ ان کی شگفتگی اور تازگی نے اس کے پڑھنے والوں کو مسخر کر لیا اور اس کی شہرت کو بڑھا دیا۔ بقول اس کے ''ہندوستان بھر میں اس کا طوطی بولنے لگا۔'' اس کی سب کتابوں کے تین یا اس سے زیادہ ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ اس سے اس کی مقبولیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

''الحمرا کی کہانیاں'' نے جنھیں اس نے اسکول کے زمانے میں پڑھا تھا، اسے بے حد متاثر کیا ہے اور وہ ابھی تک اس کے جادو کے اثر سے (خوش قسمتی سے) نہیں نکل پایا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر کوئی اچھی، خواہشیں پوری کرنے والی پری اسے اس کے لڑکپن کے زمانے کی چند گھڑیاں واپس دینے پر تیار ہو جائے تو وہ ان گھڑیوں کو چنے گا جن میں وہ الحمرا کے رومانوں کی پُراسرار دنیا میں کھویا ہوتا تھا۔ ایک لکھنے والے پر اس کے بچپن اور لڑکپن کی پڑھی ہوئی کتابوں کے اثر کا اندازہ کرنا بڑا مشکل ہے، مگر اس میں کوئی کلام نہیں کہ ان کا اثر گہرا اور دیرپا ہوتا ہے۔ شفیق کی سنجیدہ کہانیوں میں رومانیت اور حسن کی حس ''الحمرا'' کی دین ہے۔

Scanned with CamScanner

مزاح میں اس کا استاد کینیڈین مصنف اسٹیفن لیکاک ہے۔ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ لیکاک سے پہلے پہل میں نے شفیق کا تعارف کرایا۔ میں اس بڑے مزاح نگار سے واقفیت کے لیے اپنے باپ کا زیر بار احسان ہوں جس کا لیکاک ایک زمانے میں چہیتا مصنف تھا اور جسے لیکاک کی کتاب ''لٹریری لیپسز'' (Literary Lapses) کے کئی مزاحیہ مضمون از بر یاد تھے۔ میں نے ''لٹریری لیپسز'' کو پڑھا اور اس قدر ہنسا کہ میں پہلے کسی کتاب کو پڑھ کر نہ ہنسا تھا۔ میں نے یہ کتاب شفیق کو دی۔ لیکاک اس کے دل کو بھا جانے والا مزاح نگار تھا، اور وہ ایک 'لیکاک فین' بن گیا۔ اس نے لاہور کی ساری سیکنڈ ہینڈ کتابوں کی دکانیں پروفیسر لیکاک کے دوسرے ورکس (works) کی تلاش میں چھان ماریں اور کافی لیکاک اکٹھا کر لیا۔ جب شفیق کسی کباڑیے کی دکان پر لیکاک کی کوئی کتاب دیکھتا تو اس کا چہرہ روشن ہو جاتا اور وہ اس پر ایک طفلانہ بے تابی سے جھپٹتا، گویا کہ اس نے ایک سونے کی کان دریافت کر لی ہے۔

ہم دونوں لیکاک سے محبت کرنے لگے۔ وہ ہمیں ہنساتا تھا، اور اُن دنوں قہقہے لگا کر ہنسنا ہماری زندگی کا واحد مقصد تھا۔ اگر شفیق کے اندر اس کی طبعی ظرافت اور شوخی کا جوہر نہ ہوتا تو بیس لیکاک بھی اسے مزاح نگار نہ بنا سکتے۔ اس نے بڑی خوبی اور لطافت سے اردو نثر میں انگریزی مزاح کو رچایا ہے، جو اردو میں ایک نئی چیز تھی۔ ایک نئی وضع کو اس خوبصورتی اور شگفتگی سے فروغ دینا کہ نثر کا چہرہ نہ بگڑے، ہر کسی کا کام نہیں۔ وہ لوگ جو اسے آسان خیال کرتے ہیں، ذرا اس کے رنگ میں دو صفحے تو لکھ کر دیکھیں۔ اس کے نقادوں نے اس سے انصاف کا سلوک نہیں برتا اور اکثر اس کی کتابوں کی طرف ایک برترانہ اور سرپرستانہ انداز اختیار کیا ہے۔

ایک کتاب کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ پڑھی جا سکے، اس کا پڑھنا ایک فرض نہ بن جائے — شاید یہ بھی کہ وہ پڑھنے والے کے دل کو مسرت بخشے۔ شفیق کی کتابیں اور کہانیاں اس آزمائش پر پوری اترتی ہیں۔ کوئی اس پر ایک پھیکا یا بے جان فقرہ لکھنے کا الزام نہیں دھر سکتا۔ اس کی رواں، سڈول اور شگفتہ نثر ایک قدرتی پہاڑی ندی کی طرح اُچھلتی اور نغمے سناتی بہتی جاتی ہے۔ اس کی انشا کی قوت پیدائشی اور طبعی ہے۔ اس کی نثر اپنے کئی مشہور ہم عصروں کی نثر کی طرح دھچکوں اور ہچکچاہٹوں کے ساتھ آگے نہیں بڑھتی اور کہیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ اس کا قلم چلتے چلتے رک گیا ہے۔ اسے شاذ و نادر ہی صحیح لفظ یا موزوں استعارے کے لیے سوچنا پڑتا ہے۔ ایک بڑے ذہین اور سلجھے ہوئے ترقی پسند افسانہ نگار نے ایک دفعہ

Scanned with CamScanner

میرے سامنے اقرار کیا، ''جہاں تک انشا کا تعلق ہے، خالص نیریٹو (narrative) کا، شفیق کا مقابلہ ہم میں سے بہت کم کر سکیں گے۔ اس کا ہلکا، خوبصورت اسلوب، جو ہر قسم کے مطلب کا بار آسانی سے اٹھا سکتا ہے، واقعی قابلِ رشک ہے۔ لیکن...'' لیکن کے بعد جو اس نے کہا اس کا مطلب یہ تھا کہ شفیق کا دماغ پوری طرح پروان نہیں چڑھا، کہ اس کا سماجی شعور ناپختہ اور جھوٹا ہے، کہ اپنی کہانیوں میں وہ اپنے کو گلیمرائز (glamourise) کرتا رہتا ہے، کہ وہ ڈانس ہالوں اور فاکس ٹراٹ کی کلاؤڈ ککولینڈ (Cloud Cuckoo Land) سے باہر نکلنے سے گریزاں ہے۔ اس افسانہ نگار کا فیصلہ یہ تھا کہ شفیق ایک ''بورژوا'' مصنف ہے۔

ان الزامات میں سے اکثر کوتاہ فطرتی اور ہمدردی کی کمی پر مبنی ہیں، اور اس مختصر مضمون میں میں ان پر تفصیل سے بحث کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ ہم میں سے وہ جنھیں شفیق کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا ہے، جانتے ہیں کہ وہ سڑک پر کبھی کسی اپاہج یا بوڑھی مانگنے والی عورت کو کچھ دیے بغیر نہیں گزر سکتا۔ انگلستان جاتے وقت وہ اپنے بیرے علی کے متعلق بڑا فکر مند تھا کہ اس کے پیچھے وہ بے روزگار یا اداس نہ ہو جائے، اور انگلستان سے وہ اسے باقاعدگی سے دل جوئی کے خطوط لکھتا رہا۔ کیا کوئی ایسے شخص کے بارے میں یہ کہے گا کہ وہ دوسروں کے لیے درد سے بیگانہ ہے؟

ہم ایک ایسے لکھنے والے کے بارے میں، جس کا واحد مقصد ہمیں مسرت دینا اور ہنسانا ہے، تنگ نظری سے نہیں سوچ سکتے۔ میں ہمیشہ اس شخص کا احسان مند اور شکر گذار رہوں گا جو جاتے ہوئے مجھے سڑک پر ملے اور چند شوخ، زندہ دلانہ فقروں سے میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ لے آئے۔ یہی شگفتگی اور زندگی ہے جس نے اسے اتنے ادبی اور غیر ادبی لوگوں کا چہیتا مصنف بنا دیا ہے۔ اگلے روز کی بات ہے کہ میں نے ریل کے سفر کے دوران میں سامنے کی نشست پر ایک درشت اور متین ادھیڑ عمر کے شخص کو بڑے انہماک سے ایک کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے پایا۔ ہر چار پانچ منٹ کے بعد درشت چہرے کے نقوش کو مسکراہٹ کی سلوٹیں نرم اور جاندار بنا دیتیں اور مسرت اس کے (معمول کے طور پر) بے روح چشموں میں سے باہر دمکنے لگتی۔ مجھے یقین ہے کہ ایک دو بار اس کی ہنسی بھی نکل گئی۔ اب یہ ایک ایسا آدمی تھا (غالباً کوئی متفکر وکیل یا بینک کا ہیڈ اکاؤنٹنٹ) جس کے دل پر عموماً پریشانیوں اور سنجیدگی کے تاریک، روح فرسا سائے چھائے رہتے تھے اور جو شاذ و نادر ہی مسکراتا تھا۔ میں بیٹھا تعجب کرتا رہا کہ وہ

Scanned with CamScanner

کون سا خوش نصیب مصنف ہے، جس نے اس بجھی ہوئی راکھ میں خوشی کی چنگاری ڈال دی ہے۔ میں اس مصنف پر رشک کرنے لگا۔ ایک اسٹیشن پر جب وہ آدمی تھوڑی دیر کے لیے کوئی چیز لینے کی خاطر اٹھا تو میں نے فوراً سیٹ پر پڑی ہوئی کتاب کو اٹھا کر دیکھا — یہ نئے، یونیفارم ایڈیشن میں شفیق الرحمٰن کی ''حماقتیں'' تھی۔

شفیق سہل نویس نہیں ہے، جیسا کہ اس کی نثر کی بے ساختہ روانی سے کئی ایک کو گمان ہوگا۔ اس نے آج تک کوئی چیز قلم برداشتہ یا ایک نشست میں نہیں لکھی۔ جب کسی چیز یا کہانی کے جراثیم اس کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں تو وہ اس پر اچھی طرح سوچتا ہے، اپنے دوستوں سے مشوروں کی خاطر اس پر بحث کرتا ہے، اپنی کاپی بک کے بیسیوں صفحے کرداروں کے اسکیچوں اور پلاٹ کے ارتقا کے مختلف ممکنات سے سیاہ کر ڈالتا ہے۔ کئی کئی ہفتے وہ ایک بھینس کی طرح اس آئیڈیا کی جگالی کرتا رہتا ہے، اور جب تک اسے پورا اطمینان نہیں ہو جاتا، وہ اصل کہانی کا لکھنا شروع نہیں کرتا۔ ''پچھتاوے'' اور ''مدوجزر'' کی اکثر کہانیاں دو تین مہینے کی مسلسل سوچ اور محنت کا نتیجہ ہیں۔ اکثر وہ ایک کہانی کو دوبارہ اور سہ بارہ لکھے گا، اور اسے اشاعت کے لیے اس وقت تک نہ بھیجے گا جب تک اس کا فنکارانہ ضمیر (artistic conscience) اسے یہ نہیں کہے گا، ''اسے اشاعت کے لیے بھیج دو، یہ اچھی چیز ہے۔'' وہ ایک بے حد دیانت دار فنکار ہے۔ وہ اپنے پڑھنے کو سونے کے بدلے پیتل دے کر دھوکا نہیں دیتا۔

کیا وہ شہرت کا بھوکا ہے؟ رسالوں اور کتابوں میں اس کے نت نئے فوٹوگراف چھپتے ہیں، اور کپور کے الفاظ میں ''وہ اپنی ہر نئی تصویر میں اپنی پچھلی تصویر سے جوان نظر آتا ہے۔'' اس سے کئی لوگوں کو خیال ہو گیا ہے کہ وہ باغ میں ایک مور کی طرح شیخی خورہ ہے اور اپنی ذات سے محبت کرتا ہے۔ یہ درست نہیں۔ پیٹر پین (Peter Pan) کی مانند دراصل وہ ایک لڑکا ہے جو بڑا نہیں ہوا۔ اسے جینے کے عمل سے — اور نمائشیت سے، جو اس کا لازمہ ہے — محبت ہے۔ سب سے اچھی بات جو اس کی زندگی میں ہوئی، اس کی پیدائش تھی — اس عجیب اور خوبصورت کرے پر اُس کا ورود۔ وہ ابھی تک اس معجزے پر مغرور اور حیران ہے۔ اس کے فوٹوگراف اس کی 'جینے کے عمل' سے محبت کے آئینہ دار ہیں۔

اور وہ شہرت کا بھوکا کیوں ہو؟ شہرت اور مقبولیت اسے ایک بڑی کم عمر میں بن مانگے ہی مل گئیں۔ اس نے مشہور ہونے کے لیے وہ کمینے اور گھٹیا حربے کبھی نہیں استعمال کیے جو کئی ناکامیاب

Scanned with CamScanner

ادیب کرتے ہیں...اور ایک اُور طرح سے دیکھا جائے تو شہرت یا نمائشیت کی خواہش ایک بالکل قدرتی اور فطری خواہش ہے۔ پچھلے دنوں اسی رسالے میں مجھے حضرت فراق گورکھپوری کے ان دلآویز خطوط پڑھنے کا اتفاق ہوا جو انھوں نے وقتاً فوقتاً ایڈیٹر ''نقوش'' کو لکھے تھے۔ فراق اردو ادب میں ایک بڑی اور محترم ہستی ہیں اور وہ خطوط بڑے خیال افروز اور اعلیٰ ذہنی کاوشوں کا نتیجہ ہیں، لیکن ان 'پرائیویٹ' خطوط کو پڑھتے ہوئے اس خیال سے بچنا ناممکن ہے کہ وہ اشاعت اور آئندہ نسلوں کو مدنظر رکھ کر لکھے گئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ ریکگنیشن (recognition) کے لیے تڑپ رہے ہیں۔ یہ انسانی کمزوری فراق کی شخصیت کو میری نظر میں زیادہ محبوب بنا دیتی ہے۔ پھر بھی پڑھنے والے کو اس خواہش میں ایک مریضانہ گھٹن کا احساس ہوتا ہے — جیسے لکھنے والا خود رحمی کا شکار ہو رہا ہے۔

شفیق کی 'نمائشیت' میں اس مریضانہ گھٹن کا دخل نہیں۔ وہ اسٹیج پر محض اس لیے چمکیلے پروں اور کلغیوں میں سج سجا کر اٹھلاتا ہوا آتا ہے کہ اسٹیج پر ہونا اس کے لیے بڑا پُر لطف ہے۔ ''اچھے لوگو، تالیاں بجاؤ!'' وہ کہتا ہوا معلوم ہوتا ہے، ''میں شفیق الرحمٰن ہوں اور تمھیں ہنسانے آیا ہوں۔'' اور اگر کوئی تالی نہیں بجاتا تو اس کو صدمہ پہنچتا ہے، لیکن وہ اس شخص سے کوئی میل نہیں رکھتا۔

شفیق قہقہے تو ہر وقت لگاتا رہتا ہے مگر میری رائے میں اس کے خمیر میں ایک بنیادی یاسیت ہے — ایک بڑی گہری یاسیت۔ اس کی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ اسے زندگی سے بے حد محبت ہے — زندگی جس میں چمکتا ہوا سورج ہے، نغمہ ریز جھرنے ہیں، حسین آنکھوں والی لڑکیاں ہیں، سنہری کاغذوں والے چاکلیٹ ہیں۔ اسے اس پُر رنگ میلے سے محبت ہے اور بیشتر وقت اسے چیزوں اور لوگوں کی وقتی اور عارضی نوعیت کا احساس رہتا ہے۔ یہ دو دن کا تماشا ہے، گزرا ہوا لمحہ پھر نہ آئے گا، میں یہ شفق پھر نہ دیکھ سکوں گا، یہ لڑکی مجھ سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو جائے گی...زندگی کی گھڑی کی ریت گرتی، گرتی جاتی ہے اور ایک وقت — کسی وقت — اسے اس اسٹیج سے یکلخت رخصت ہونا پڑے گا۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بزدل ہے یا موت سے ڈرتا ہے — سر والٹر اسکاٹ کے داماد، دوست اور سوانح نگار لاک ہارٹ (Lockhart) نے ناولسٹ کی لائف میں لکھا ہے کہ جب سر والٹر کو یقین ہو گیا کہ اس کا آخری لمحہ اب دور نہیں ہے اور وہ مرنے والا ہے، تو اس کا چہرہ دہشت سے پیلا پڑ گیا اور وہ ایک بچے کی طرح رو پڑا۔ سر والٹر بزدل نہیں تھا اور موت سے خائف نہ تھا۔ وہ آنسو زندگی سے

رخصت ہونے کے لیے تھے۔ وہ رویا کیونکہ اسے پتا لگ گیا کہ کل سورج اس کے لیے نہیں اُبھرے گا، نہ ابابیلیں پھر کبھی اس کی حسین ُہیدرز سے ڈھنپی ہوئی پہاڑیوں کو اپنی گنجار سے نغمہ ریز کریں گی۔

اسی لیے یہ تضاد ہے کہ یہ کامیڈین ایک ٹریجیڈین بھی ہے۔ اس کے افسانوں کے دو مجموعوں — ''پچھتاوے'' اور ''مدوجزر'' — میں اس کی یہ یاسیت ایک اندوہناک چیخ بن جاتی ہے۔ ''پچھتاوے'' کے افسانے ایک دبی ہوئی جدت اور ایک نادر لطافت سے لکھے ہوئے ہیں اور انھیں اس کی آدھی تعریف بھی نہیں ملی جس کے وہ حق دار ہیں۔

''مدوجزر''، ''پچھتاوے'' سے پہلے آئی، اور اسی لیے ''پچھتاوے'' میں جو پختگی اور مشاہدہ ہے، وہ ''مدوجزر'' میں نہیں ملتا۔ ''مدوجزر'' کی بیشتر کہانیوں میں ایک یکسانیت ہے اور اس کی کہانیاں ایک ہی تھیم (theme) پر مختلف ویری ایشنز (variations) ہیں۔ یہ کتاب اُس زمانے میں لکھی گئی جب شفیق اپنی سب سے پہلی محبت کی میٹھی تلخیاں برداشت کر رہا تھا۔ بچپن کی سنہری دنیا اور بلوغت کے شروع کی گلابی محبت (جسے انگریزی میں بچھڑے کی محبت یا green sickness کہتے ہیں) کی تصویریں سارے اردو ادب میں اس سچائی اور لطافت سے شاید ہی کسی اور نے پیش کی ہوں گی۔ اس کی یہ دو کتابیں (اور ان میں وہ شاہکار ناولٹ ''برساتی'' بھی شامل کر لیجیے) کئی ایک لحاظ سے اس کی اپنی آپ بیتیاں ہیں۔ اس کی ساری شخصیت اس کی ان کتابوں میں ہے۔ یہ سب صیغۂ واحد متکلم میں لکھی ہوئی ہیں اور ان کا ہیرو خود شفیق الرحمٰن ہے۔ ان کتابوں کے پڑھنے کے بعد ایک شخص اس کی شخصیت، اس کے خیالات، اس کے اندازِ گفتگو سے پوری طرح واقف ہو سکتا ہے۔ ''برساتی'' پڑھیے، آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ شفیق لنچ نہیں کھاتا، کرکٹ اور باکسنگ کا شوقین ہے، لڑکیوں میں بڑا مقبول ہے، ایک چنچل ایریل کی طرح ہنستا رہتا ہے، کبھی زندگی کے کھیل سے بور نہیں ہوا۔ یہ 'بور نہ ہونا' ہی میری نظر میں بذاتِ خود ایک اچیومنٹ (achievement) ہے۔

لیکن یہ ایک مزاح نگار اور پیروڈسٹ (parodist) کی حیثیت میں ہے کہ اس کی انفرادیت سب سے نمایاں ہے۔ مزاح میں جدید نسل میں اس کا کوئی رقیب نہیں — کپور کے استثنا کے ساتھ۔ مگر پھر کپور مزاح نگار سے زیادہ ایک طنز نگار ہے۔ ایک طنز نگار کی حیثیت سے شفیق اتنا کامیاب نہیں۔ اس کی تحریر میں وہ کٹیلا پن، وہ پُر کینہ شرارت نہیں آ سکتی جس کے لیے بے کار ہاضمے کا ہونا ضروری ہے۔

Scanned with CamScanner

شفیق کا ہاضمہ بالکل درست ہے کیونکہ وہ لنچ نہیں کھاتا۔

شفیق کے رومانس اس کے دوستوں میں ایک مذاق بن چکے ہیں۔ وہ متعدد اور دلچسپ ہیں۔ چند ایک سے عبرت کا پہلو بھی نکلتا ہے۔ وہ ایک 'مستقل' عاشق ہے، یعنی پچھلے سترہ اٹھارہ سال میں شاید ہی کوئی ایسا لمحہ اس کی زندگی میں آیا ہوگا، جب وہ کسی بتِ طناز کے دامِ زلف میں اسیر نہ تھا۔ وہ اپنے محبوبوں کو اس کثرت سے بدلتا ہے، جس کثرت سے لوگ اپنی قمیصیں یا اپنے ہیٹ بدلتے ہیں۔ ایک رومان ابھی بیچ میں ہوتا ہے کہ وہ دوسرا شروع کر چکتا ہے — ترک شدہ محبوب کا نام تک اس کے ہونٹوں پر نہیں سنا جاتا۔

اس نے اپنی ایک پیروڈی ''قصہ حاتم طائی'' میں بہت سی مہ وشوں کے درمیان حاتم طائی کی ذہنی کیفیتوں کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ اس کے حسبِ حال ہے۔ اس میں ایک مقام پر حاتم طائی کو ایک حور شمائل نازنین دکھائی دیتی ہے۔ وہ والہانہ اس کا عاشقِ زار ہو کر اس کی سمت چل پڑتا ہے۔ اتنے میں راہ میں اسے ایک اور ہوشربا حسینہ نظر آتی ہے، وہ فوراً پہلی کو چھوڑ کر دوسری کے پیچھے ہو لیتا ہے۔ راستے میں اسے ایک تیسری عشوہ طراز جاتی ہوئی ملتی ہے، حاتم طائی فوراً اس پر ہزار جان سے عاشق ہو جاتا ہے اور عشقِ صادق کا دم بھرنے لگتا ہے۔ شفیق اور حاتم طائی دونوں حضرات نازنینوں کے تیر مژگاں سے فوراً گھائل ہو جاتے ہیں۔ ان کے لیے نسائی ادا ہلاکت کا حکم رکھتی ہے۔

لیکن شفیق کا پہلا عشق فی الواقع ایک طویل اور سنجیدہ افیئر (affair) تھا۔ ۱۹۴۰ء کے برکت کے سال میں جب وہ میڈیکل کالج لاہور میں تھرڈ ایئر کا طالب علم تھا، اس نے وائی ایم سی اے میں ایک بیڈمنٹن کے میچ میں (یا شاید سینما میں، مجھے اچھی طرح یاد نہیں) مس 'ج' کو پہلی بار دیکھا۔ اس کا بالوں کو گوندھنے کا اسٹائل ہوشربا تھا۔ اس کی آنکھیں گرما کے آسمان کی مانند نیلی تھیں — بہرحال، شفیق کی رائے تھی کہ وہ نیلی ہیں۔ نوجوان میڈیکو میچ کے ختم ہونے تک کانوں اور سر تک 'ج' کی محبت میں ڈوب چکا تھا۔

'ج' سے اس کی محبت بڑی طویل اور صبر آزما تھی۔ اس نے اس ایک عشق میں ایسی ثابت قدمی اور پامردی کا ثبوت دیا کہ اس کے دوست حیران ہو گئے۔ متعدد وقفوں اور انٹرپشنز (interruptions) کو چھوڑ کر یہ محبت پورے آٹھ سال تک رہی۔ 'ج'، جو تین بہنوں میں سب سے چھوٹی تھی، شفیق سے زیادہ

بیڈمنٹن کو چاہتی تھی۔ شفیق کو اس سنگ دل محبوبہ سے کبھی روبرو ہوکر بات کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ 'ج' نے غیروں سے کہا اور غیروں سے سنا لیکن اپنوں سے، یعنی شفیق سے، نہ کبھی کچھ کہا نہ سنا۔ محبوب کی اس بے اعتنائی نے شفیق کو اسے رام کرنے کے لیے اور زیادہ بے صبر اور ضدی بنا دیا۔ اس نے 'ج' کے والدین کو رشتے کے لیے درخواست دی، جو انھوں نے رد کر دی۔ شفیق نے ''مدوجزر'' لکھ کر 'ج' کے کنبے سے انتقام لیا۔ ''مدوجزر'' کی سب کہانیوں میں وہ خود ہیرو ہے، مس 'ج' ہیروئن (اس کے نام مختلف کہانیوں میں مختلف ہیں، مگر وہ حقیقت میں ایک ہی لڑکی ہے)۔ کنبے کے بعض قابل اعتراض افراد کے تھمب نیل (thumbnail) خاکے تیکھی اور لطیف طنز کے شاہکار ہیں۔ ''مدوجزر'' 'ج' کے نام ایک شعر کے ساتھ منسوب کی گئی جس میں ج سے غیروں سے کہنے سننے کا شکوہ کیا گیا تھا۔ اس نے کتاب کی دو جلدیں تحفتاً 'ج' کے ہاں بھجوا دیں۔ مجھے یہ معلوم نہیں کہ آیا 'ج' کے کنبے والوں نے ''مدوجزر'' کے مختلف کرداروں کے روپ میں اپنے کو پہچانا یا نہیں، البتہ یہ یقینی ہے کہ ان کا انداز اس کے بعد سخت ہو گیا۔ 'ج' کے ساتھ شفیق کی نسبت کے پراسپیکٹ (prospects) بالکل مدھم ہو گئے۔

''مدوجزر'' غالباً ۱۹۴۳ء میں شائع ہوئی۔ اس وقت 'ج افیئر' اپنے پورے عروج پر تھا۔ شفیق کی فوجی ڈیوٹی اسے لاہور سے دور لیے پھرتی رہی۔ وہ اب دوسرے محبوبوں کے اشارے دینے لگا اور ہم نے سمجھ لیا کہ 'ج افیئر' ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکا ہے، اور ہم سب نے اطمینان کا سانس لیا۔

میری حیرت کا اندازہ کیجیے کہ جب میں ۱۹۴۸ء میں انگلستان سے واپسی پر شفیق سے لاہور میں ملا تو 'ج افیئر' ابھی چل رہا تھا۔ شفیق نے 'ج' کے کنبے کے افراد میں سے ایک صاحب سے — جو 'شیطان سیریز'' کی کہانیوں میں شیطان کے اور بیجنل بن کر مشہور ہوئے اور جو خود بھی 'ج' کو کورٹ (court) کر رہے تھے — دوستی اور بے تکلفی کی راہ و رسم پیدا کر لی تھی۔ ان صاحب نے کمال قربانی سے کام لیتے ہوئے 'ج' کے معاملے میں شفیق کی مدد کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ ایک شام کو جب میں شفیق کے ساتھ میس میں تھا تو ان صاحب نے فون پر مطلع کیا کہ 'ج' کے والدین رشتے پر راضی ہو گئے ہیں۔ یہ خوشخبری سنتے ہی شفیق کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ازدواجیت کے خیال نے اسے پینکی (panicky) بنا دیا۔

''اب کیا ہوگا؟'' اس نے مجھ سے پوچھا، ''وہ لوگ مان گئے ہیں۔''

''ہوگا کیا!'' میں نے چڑ کر کہا، ''یہی تم چاہتے تھے۔''

Scanned with CamScanner

''نہیں یار خالد! اب یہاں سے تبدیلی کرانا پڑے گی۔''

یہ رومان کچھ عجیب لگتا ہے... 'ج' کو حاصل کرنے کے لیے آٹھ نو سال کی مسلسل اور پیہم تگ و دو اور پھر کامیابی پر افسوس اور حسرت کا اظہار! ''سیاحت نامہ نادر شاہ افغانی'' میں نادر شاہ صاحب کے ''فلسفۂ شادی و محبت'' سے مندرجہ ذیل پُر لطف اقتباس پڑھنے کے بعد یہ رومان غالباً اتنا عجیب نہیں لگے گا۔

ہمارا فلسفۂ شادی و محبت: ہمارے خیال میں اگر محبت کو شادی سے اور شادی کو محبت سے دور رکھا جائے تو دونوں نہایت مفید چیزیں ہیں لیکن نوجوان نہایت جلد بازی سے کام لیتے ہیں۔ دوسروں کے تجربے سے مستفیض نہیں ہوتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خواہ مخواہ شادی مول لے بیٹھتے ہیں۔ اکثر مشاہدے میں آیا ہے کہ جو لوگ شادی سے پہلے پچھتاتے تھے، وہ شادی کے بعد بھی پچھتاتے ہیں۔ ہم کبھی نہیں پچھتائے، حالانکہ ہم کسی زمانے میں بڑے بانکے البیلے نوجوان مشہور تھے۔

راولپنڈی میں شفیق کئی غیر شادی شدہ لڑکیوں کی ماؤں کا منظورِ نظر رہا— آٹھ نو سو روپے تنخواہ پانے والا صحت مند، اسمارٹ اور خندہ جبیں فوجی ڈاکٹر، جو اتنی اچھی کتابیں بھی لکھتا تھا، انھیں اپنی لڑکیوں کے لیے آئیڈیل شوہر دکھائی دیتا۔ اس کے پاس ایک چھوٹی اطالوی ٹاپالینو گاڑی بھی تھی— صرف دو کے لیے۔ ماؤں نے اس مستقل عاشق کو مسخر کرنے کی کوشش کی۔

اس کے رومانس کی تاریخ لکھنے کے لیے بڑی فرصت درکار ہے۔ کچھ عرصے وہ راولپنڈی میں (یہ اس کے انگلستان جانے سے پہلے کا قصہ ہے) اپنی ٹاپالینو میں ایک جرمن لڑکی کو بٹھائے نظر آتا رہا۔ اس لڑکی نے فوراً بعد ایک اینگلو انڈین لڑکے سے شادی کر لی۔ پھر ایک اور لڑکی تھی جسے وہ پیار سے ''مینڈھا'' کہا کرتا تھا۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور غزالی تھیں، اس کی صورت بھولی بھالی اور پُرکشش تھی، اس کا قد قدرے چھوٹا تھا (شفیق کو چھوٹے قد کی لڑکیاں سخت ناپسند ہیں، مگر ''مینڈھے'' کی دوسری خوبیاں اس کے چھوٹے قد کے عیب کی تلافی کر دیتی تھیں)۔ وہ اس سے شادی کر لیتا مگر اسی اثنا میں وہ ایک اور لڑکی سے ملا جس کے نقوش ''مغلئی'' تھے اور قد لانبا۔ اسے وہ چھوڑ دینے کے بعد ''مس گھوڑا'' کے لقب سے یاد کیا کرتا۔ اس نے اس سے اس لیے شادی نہ کی کہ اس کا بھائی (یا ماموں) کمیونسٹ نکلا۔

اس کے رومانس اس کی ذہنی صحت مندی اور ابلتے ہوئے ولولے کی outlet ہیں۔ شادی سے یہ دائمی کنوارا سخت خائف ہے۔

Scanned with CamScanner

انگلستان سے واپسی کے بعد یا تو اس میں متانت اور پختگی آ گئی ہے اور یا وہ اپنے رومانسوں کے متعلق کم سخن ہو گیا ہے۔ اس کا آج کل کوئی رومان سننے میں نہیں آتا۔ ایک اور امکان بھی ہے کہ اس محبت کرنے والے شخص نے آخر اپنے ساتھی کا انتخاب کر لیا ہو۔ اس نے اتنے لوگوں کو مسرت دی ہے ——وہ مسرت اور طمانیت کا سب سے زیادہ حق دار ہے۔

یہ میرا دوست شفیق الرحمٰن ہے۔

اس کے چہرے پر علم اور محبت کی جوت ہے۔ اس کی متنوع رنگا رنگ کی معلومات، اس کا بات کرنے کا شگفتہ اور دلچسپ انداز، اس کی انسانیت —— یہ سب صفات اسے ایک بڑا پُر لطف ساتھی اور دوست بناتی ہیں۔ ڈرائنگ روم میں یا باہر کھلی سڑک پر اس کی باتیں ایک ساسحر ڈالتی ہیں اور مردہ ترین سے مردہ ترین دل میں بہار لے آتی ہیں۔

اکثر ادبی مزاج کے لوگوں کو سفید بالوں اور ایک اعصابی بے سکونی کی شکل میں عملی زندگی میں داخل ہونے کی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ اسے یہ قیمت ادا نہیں کرنا پڑی کیونکہ اس نے ادب کے فن کے ساتھ زندہ رہنے کے فن سے غفلت نہیں برتی۔ لکھنا اس کے لیے خون اور پسینہ بہانا نہیں بلکہ زندہ رہنے کی مانند ایک دلچسپ اور پُر لطف شغل ہے۔

میرے ترقی پسند دوست کا اعتراض کہ شفیق طبقاتی شعور سے بیگانہ ہے، شاید درست ہو۔ ایک اچھا، ایماندار دل اور تندرست جسم طبقاتی شعور سے زیادہ ضروری چیزیں ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ ایک آدمی میں بڑا گہرا طبقاتی شعور ہو اور جذباتی اور روحانی طور پر وہ اتنا بے حس ہو جتنا ایک پتھر کا ٹکڑا۔ مجھے یہ تمنا ضرور ہے کہ شفیق بھی کالو بھنگی یا اپنے بیرے علی کے متعلق کوئی افسانہ لکھے اور ڈرائنگ روم اور ڈانس ہال کی گھونٹ دینے والی فضا سے باہر زندگی کے کوچوں میں نکل آئے۔ جب وہ ایوننگ سوٹ کے ڈمیوں (dummies) کی بجائے ان عام آدمیوں کے بارے میں لکھے گا جو جرنیلوں اور بادشاہوں سے کہیں زیادہ اہم اور عظیم ہیں، تو اس کے قلم میں ایک نئی توانائی اور جولانی آ جائے گی۔ فنکار کے لیے سب سے بڑا خطرہ اس کا ذریعۂ معاش ہوتا ہے۔ روٹی تو اسے بہر طور کمانا ہی ہے، مگر اُسے چوکس رہنا چاہیے کہ کہیں وہ اپنے پیشے کے ماحول میں ڈھل کر نہ رہ جائے۔ یہ فنکار کی موت ہے اور ایک سچا فنکار ہمیشہ

Scanned with CamScanner

سوسائٹی کی قبول شدہ قدروں اور معیاروں کے خلاف برسرِ پیکار رہتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ضرور لمبے بال ہی رکھے اور کلب میں چادر پہن کر جا بیٹھے، بلکہ یہ کہ اسے یہ احساس رہنا چاہیے کہ دنیا کی عزت اور آدابِ محفل کے notions ضروری طور پر صحیح نہیں۔ شفیق سے مجھے اکثر یہ شکایت رہی ہے کہ اپنی تحریروں اور افسانوں میں وہ اخلاق کے معاملے میں ایک بوڑھی کنواری چچی کا رویہ رکھتا ہے۔ وہ احتیاط برتتا ہے کہ اس کے قلم سے کوئی ایسا خیال نہ ادا ہو جائے جو بستر میں پڑھتی ہوئی اسکول کی لڑکی کے چہرے کو شرم سے لال کر دے۔ اسے شریف لوگوں کی طبائع سلیم کا بڑا خیال رہتا ہے۔ اس سے اس کی تحریروں میں دودھ اور شوربے کا اثر آ جاتا ہے۔ ہم اپنے ادب کو واڈکا کی طرح تیز اور چڑھ جانے والا پسند کرتے ہیں۔

یہ میری تمنائیں اور شکایتیں ہیں۔ ''برساتی'' میں اس نے انشا کی بڑی قوت کا ثبوت دیا ہے۔ میں اس قوت کو کسی عظیم تر مقصد کے لیے استعمال ہوتے دیکھنا چاہتا ہوں۔

(نقوش، لاہور، شخصیات نمبر، جنوری ۱۹۵۶ء)

سعادت حسن منٹو

آزاد مشرب، مضطرب منٹو — ایک اور واحد منٹو — کی موت سے اردو ادب کی دنیا پر ایک ایسی گھٹا ٹوپ افسردگی کا بادل چھا گیا ہے جس کی مثال ہماری پوری یادوں میں مشکل سے ملے گی۔ ادب پیدا کرنے والے پہلے بھی گزرتے رہے ہیں لیکن مجھے یقین ہے کسی کی موت سے بھی ہم نے اپنے کو اس درجہ غریب اور کم مایہ نہیں محسوس کیا جس قدر اس بوہیمین مصنف کی موت سے۔ نثر کا عظیم زرکار ہم میں سے اٹھ گیا ہے اور اس کے بغیر فن اور انسانیت کی محفل سونی اور ویران ہو گئی ہے۔ ویسے تو یہ نقصان ساری انسانیت اور ساری ادبی دنیا کا نقصان ہے مگر ہم میں سے کتنوں کے لیے، جو اُسے محض اس کے افسانوں کے ذریعے جانتے تھے، یہ ایک نہایت شدید ذاتی نقصان ہے — اتنا ذاتی جتنا ایک بے حد پیارے اور عزیز دوست کا گزر جانا۔ بوہیمیا کے پُر تصویر کوچوں میں روشنیاں ماند پڑ گئی ہیں اور دنیا کو کھونے والے اور اس کے رواجوں کی جکڑ بندیوں سے آزاد بوہیمیا کے باسی اپنے استاد، اپنے بادشاہ سے محروم ہو گئے ہیں۔ تاہم یہ اقرار کرنا پڑے گا کہ یہ سوگ صرف بوہیمیا والوں کا سوگ نہیں — انسان سے محبت کرنے والے، جھوٹ اور ریاکاری سے نفرت کرنے والے، اردو نثر کے عاشق، سب آج اس بچھڑنے والے مصنف کے لیے روتے ہیں۔ اس کے حرف گیر، اس کی ادبی عظمت کے منکر، اس کی ذات پر اوچھے وار کرنے والے اس کی زندگی میں بڑے مصروف رہے۔ انھوں نے اس کے فن کو بڑھئی کی کاریگری سے تشبیہ دے کر اس کا مذاق اڑایا۔ وہ بے چارے اس سے آگاہ نہ تھے کہ اس طرح دراصل وہ اس کے فن کی عظمت کا اعتراف کر رہے تھے۔ اگر اس کا فن واقعی کاریگری تھا، اگر واقعی یہ اتنی ہی آسان تھا تو وہ خود کوشش بسیار کے باوجود اس جیسی ایک بھی کہانی کیوں نہ لکھ سکے۔ انھوں نے اسے فحش نگار کہا اور ایک بہادر مگر درماندۂ روزگار مصنف کی عجیب وارفتہ مزاج زندگی کو دنیاوی عزت داری کی عینک سے دیکھ کر ناک بھوں چڑھائی۔ وہ خود چاہے نیکی کے پتلے ہوں مگر انھیں اس انسان کی عظمت کا کیا اندازہ ہو سکتا

Scanned with CamScanner

تھا۔ یہ لوگ اس کی زندگی میں مصروف رہے۔ چپکے سے، سرگوشیوں میں انھوں نے ''گلیورز ٹریولز'' کے بالشتیوں کی طرح دیو کے پاؤں سے زمین کھود کر اسے گرانے کی کوشش کی، کہ زندگی میں وہ اس سے ڈرتے تھے۔ اب وہ بھی اس کی موت کے سانحے سے سن ہو گئے ہیں۔ شاید انھوں نے اس مرے ہوئے 'آوارہ مزاج' کی کمزوریوں اور کوتاہیوں کو اب معاف کر دیا ہے اور اس کے ساتھ ہی اپنے گریبانوں میں جھانک کر اس برائی، اس کمینگی کی ایک جھلک دیکھ لی ہے جو اُن کے دلوں میں چھپی بیٹھی ہے۔ ان میں شاید اب ایسا کوئی نہیں جسے اس کی موت سے تھوڑا بہت صدمہ نہ پہنچا ہو گا۔ انھیں بھی غالباً احساس ہوا ہے کہ یہ موت کوئی معمولی موت نہ تھی اور یہ کہ اس کی موت سے ہمارے ادب میں ایک ایسا خلا پیدا ہو چکا ہے جو آسانی سے پُر نہیں ہو سکے گا۔

ہمارے پاس یقیناً اب بھی الفاظ کی رنگین مصوری کرنے والے، رومانیت اور شعریت کے دیے جلانے والے مصنف موجود ہیں لیکن مختصر افسانہ نگاری کا استاد ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا ہے۔ وہ اب پھر نہیں آئے گا۔ اردو ادب — بلکہ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ دنیا کا ادب — اس کے جانے سے صحیح معنوں میں مفلس ہو گیا ہے۔ وہ موپاساں اور چیخوف کی صف میں تھا۔ وہ ان کا ہمسر تھا۔ شاید بہ لحاظِ فن ان سے بھی قدر آور تھا۔ وہ اپنی مختصر زندگی میں ہمارے ادبی منظر پر ایک دیو کی طرح چھایا ہوا تھا۔ سچے موتیوں کی سی پاک نثر میں وہ اپنے افسانوں سے ہمارے سوئے ہوئے ضمیروں کو کچوکے دیتا تھا، ہماری خود طمانیت اور مصلحت کوشی میں احساس کی سوئیاں چبھوتا تھا اور بار بار ہمیں ایک ایسا مکمل صاف شفاف آئینہ دکھاتا تھا جس میں ہم اپنے اصل روپ کا عکس دیکھنے سے نہ بچ سکتے تھے۔ وہ ہمیں سوچنے اور ایک بہتر انسان بننے پر مجبور کرتا تھا — اور جب میں ایک 'بہتر انسان' کہتا ہوں تو میری مراد آپ کے سلجھے ہوئے کفایت شعار، مصلحت اندیش انسان سے نہیں ہے جو عموماً اپنی خود غرضی کو اپنی سوجھ بوجھ کا نام دیتا ہے اور جس کے سامنے اپنی اور اپنی اولاد کی بہتری اور ترقی کے سوا اور کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ ہمارے ادب میں متشرع نیکی اور مصلحت اندیشی کی تعلیم اور ہدایت ایک سے زیادہ مصنفوں نے دینے کی کوشش کی ہے۔ اس آشرم کا بڑا پروہت ہمارے ہاں ڈپٹی نذیر احمد ہے جس کے ناول ہمیں یہ تعلیم دیتے ہیں کہ ہم نذیر احمد جیسے بن جائیں — دنیاوی لحاظ سے عزت دار، صوم و صلوٰۃ کے پابند، کفایت شعار اور گانٹھ کے پورے۔ منٹو کے 'بہتر انسان' میں ان اوصاف میں سے کوئی بھی چیز نہیں، مگر

Scanned with CamScanner

انسانیت کی اصل روح اس میں موجود ہے۔ وہ ایک ایسا انسان ہے، جس کا غالباً منہ دیکھنا بھی آج کے ڈپٹی نذیر احمد گوارا نہ کریں گے اور اپنے بچوں کو اس کے پاس بٹھانا گناہ سمجھیں گے۔ منٹو کا 'بہتر انسان' اشراف میں سے نہیں۔ آپ اسے نہ مسجد میں پائیں گے، اور نہ ہی غالباً کلب ہاؤس میں۔ آپ اسے زندگی کی سڑک پر رواں دواں پائیں گے، اپنے ہم جنسوں سے محبت کرتا ہوا، اپنی زندگی کے خزانے کو ایک کنجوس کی طرح سینے سے لگائے رکھنے کی بجائے ایک سخی کی طرح لٹاتا ہوا۔ سعادت حسن منٹو کسی 'ازم' کا مبلغ نہ تھا۔ اس نے اپنے بے مثل فن کو کسی پرانے زمانے کے ضابطۂ اخلاق کے تابع کر کے اسے بے جان اور جھوٹا نہیں بنایا تھا اور اگر اس کا کوئی 'ازم' تھا، کوئی ضابطہ اور کوئی مسلکِ حیات تھا، جسے وہ شدت سے اپنائے ہوئے تھا، تو یہ مسلک تھا انسانیت سے محبت کا مسلک، اور اس سے بڑا مسلک اور ہو بھی کیا سکتا ہے؟ ایسے آدمی کی موت کتنا بڑا نقصان ہے، خاص طور پر اس لیے کہ وہ ایک بڑا فن کار بھی تھا۔ ہمارا نقصان اس لیے بھی ناقابلِ تلافی ہے کہ منٹو ابھی اپنے فن کی معراج تک نہیں پہنچا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ بڑے اور عظیم تر شاہکاروں کو ابھی اس کے قلم سے نکلنا تھا۔ اس کا ذہن شیکسپیئر کے ذہن کی طرح زرخیز تھا۔ لاتعداد کرداروں کی جتنیں اس میں زندگی سے روشناس ہونے کے لیے تڑپ رہی تھیں اور یہ مکمل اور حساس فن کار ہمیشہ اور ہر لحظہ اپنے فن میں تکمیل کے لیے کوشاں تھا۔

جو کچھ اس نے ہمارے ادب کو دیا ہے، وہ عظیم اور اَن مٹ ہے، ان لازوال چیزوں میں سے جو ایک بار عالمِ وجود میں آجانے کے بعد زندہ رہتی ہیں۔ اس کے لیے شاہکار لکھنا ایک ایسا ہی معمول تھا جیسا اس کے کئی ہم عصر افسانہ نگاروں کے لیے بے جان اور پھسپھسے افسانے قلمبند کرنا۔ اس کی چیزیں زندہ رہیں گی، لیکن جسے اب ہم جیتے جی یاد کرتے رہیں گے، جس کا اب ہم سدا سوگ منائیں گے، وہ انسان سعادت ہے۔ کیسا خوبصورت انسان تھا وہ! وہ ساری انسانیت سے بھائیوں کی طرح محبت کرتا تھا۔ وہ دوسروں کے لیے جان دے سکتا تھا۔ خود وہ ایک لحظے کے لیے بھی الجھنوں اور دکھوں سے آزاد نہ ہو سکا۔ ہم سب جانتے ہیں اُسے کس چیز نے مارا... مگر نہیں، اس کی قاتل شراب نہ تھی۔ "کوئی تنگی سی تنگی ہے، کوئی ترشی سی ترشی ہے!" اس نے ایک دفعہ چچا سام کے نام ایک خط میں شکایت کی اور وہ تنگی اور ترشی اس کی زندگی میں ایک زندہ ہولناک حقیقت تھی۔ ہم سب جانتے ہیں، اسے بچایا جا سکتا تھا۔ لیکن جب وہ مر رہا تھا، خودکشی کر رہا تھا تو ہم اس کے افسانے پڑھنے اور ان پر تنقیدیں کرنے میں لگے

ہوئے تھے۔ اس کو بچانے کے لیے ہم نے ایک انگلی تک نہ ہلائی۔ ڈپٹی نذیر احمد ہمارے رگ و ریشے سے ابھی گیا نہ تھا۔ ہمارے دل منٹو کے دل کی طرح بڑے اور فراخ نہ تھے کہ ساری دنیا کو محبت کے بازوؤں میں سمیٹ لیتے۔ وہ شخص سب انسانوں سے پیار کرتا تھا، اس سے کسی کو اس دو اور دو چار کی دنیا میں پیار نہ تھا اور ہماری آنکھوں کے سامنے وہ ''تنگی اور ترشی'' کی نذر ہو گیا — تنگی اور ترشی جو اس کے بھائیوں اور ہم جنسوں کی کمینگی اور چھوٹے پن کے سوا اور کچھ نہ تھی۔ ہم میں سے کتنے ہی اب جب منٹو کے بارے میں سوچتے ہیں، اپنے کو مجرم محسوس کرتے ہیں۔ منٹو کو خود منٹو نے ایک تدریجی خودکشی کے عمل سے مارا۔ تاہم ہم اس کی موت کی ذمہ داری سے خود کو مطمئن ضمیر کے ساتھ بری نہیں کر سکتے۔

''انسان سعادت'' جیسا میں اُسے جانتا تھا

میں ۱۹۵۱ء کے گرما میں چند دنوں کے لیے لاہور میں اپنے ایک ناشر دوست کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ ان دنوں منٹو لاہور میں نیا نیا آیا تھا اور میرا ناشر دوست اس کی چند ایک کتابیں چھاپ رہا تھا۔ منٹو نے اس کے ادارے سے شائع ہونے والے ایک نئے ادبی مجلّے کی ترتیب کے لیے بھی رضامندی ظاہر کی تھی۔ (یہ مجلّہ بڑی آب و تاب سے نکلا مگر دو شماروں کے بعد ہی تجارتی وجوہ کی بنا پر ایک خاموش موت مر گیا۔)

میرا ناشر دوست منٹو سے بڑا متاثر تھا۔ ''بڑا پیارا آدمی''، ''ایشیا کا سب سے عظیم انسان'' — یہ ان توصیفی القاب میں سے چند تھے جن سے وہ ایک پجاری کی مذہبی وارفتگی سے اپنے ادبی بت کے سنگھاسن پر چڑھاوے چڑھاتا تھا۔ ایسے القاب کا مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا، میں اس عمر سے قدرے آگے گزر آیا تھا جب ہر مصنف کا نام اپنے گرد شان اور عظمت کا ہالہ لیے ہوتا ہے۔ میں برتری کے انداز میں اپنے شرمیلے اور جھینپو دوست کی قصیدہ گوئی پر مسکراتا اور اس کے ساتھ چل کر منٹو سے ملنے کے وعدوں کو کل پر ٹالتا جاتا۔

پھر ایک صبح مجھے بتایا گیا کہ ''ایشیا کا سب سے بڑا انسان'' مجھ سے ملنا چاہتا ہے — وہ مجھے میرے ایک افسانے کے سلسلے میں دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے ہردوار میں اپنے سفر پر ایک لمبا افسانہ لکھا تھا۔ ہر ایک پچیس سالہ نوجوان لکھنے والے کی طرح مجھے یقین تھا کہ میں نے ایک شاہکار لکھا ہے۔ مگر ان مدیروں کی رائے جنھیں میں نے اسے چھاپنے کے لیے بھیجا، میری رائے سے مختلف تھی۔ نتیجہ یہ تھا

Scanned with CamScanner

کہ افسانہ بڑے عرصے تک اشاعت پذیر نہ ہو سکا تھا۔ پھر میں نے اسے اپنے ناشر دوست کو بھجوایا۔ اس نے اسے منٹو کو پڑھنے کے لیے دیا۔ منٹو نے اسے پسند کیا مگر وحشیانہ کاٹ چھانٹ اور قطع برید سے اُسے آدھا کر ڈالا۔ کئی ایسے پیروں کے پیروں پر لکیر پھیر دی جو میرے نزدیک بڑے خوبصورت اور سحر انگیز تھے لیکن جو افسانے کی وحدت تاثر میں یقیناً کسی طرح مددگار نہ تھے۔ یہ افسانہ "اردو ادب" (جو میرے ناشر دوست کے مجلّے کا نام تھا) میں چھپنے کے لیے چن لیا گیا۔ لیکن جب میرے دوست نے مجھے لکھا کہ اس کی تھوڑی سی قطع برید کی گئی ہے تو میں نے اپنے افسانے کو ایک نئے روپ میں، مجھے دکھائے بغیر، شائع کرنے سے روک دیا۔ افسانے کا مسودہ مجھے بھیجا گیا۔ مجھے فی الواقع بڑا غصہ آیا۔ میرے افسانے کی اس سفاکی سے کانٹ چھانٹ کرنے والا منٹو کون تھا! میں اپنی حماقت میں یہ نہ سوچ سکا کہ یہ کتر بیونت فن کے ایک استاد نے کی تھی اور اس طرح ایک ژولیدہ اور پریشان رپورتاژ سے ایک نادر لطافت اور تاثر کا مختصر افسانہ بن گیا تھا۔ یہ افسانہ بعد میں "کھویا ہوا افق" کے عنوان سے "سویرا" میں چھپا۔ اب بھی میرا خیال ہے کہ میں شاید اس سے بہتر کہانی کبھی نہ لکھ سکوں گا۔ صرف منٹو کی کاٹ چھانٹ نے اسے ایک کامیاب کہانی بنا دیا۔ مجھے یہ کہنا چاہیے کہ یہ میری نہیں بلکہ منٹو کی اچھی کہانیوں میں شمار ہو سکتی ہے، کیونکہ بات کہنے کی نسبت اسے اَن کہا چھوڑنا کہیں بڑا فن ہے۔ سچ ہے کہ چھوٹی سی چیز سے فن میں عظمت آجاتی ہے مگر عظمت کوئی چھوٹی چیز نہیں، اور ہمارے بہت سے افسانہ نگار بات کو بہت زیادہ کہہ کر اپنی تخلیقات پیدا نہیں کرتے بلکہ انھیں ہمیشہ کے لیے دفن کر دیتے ہیں — مگر اُس وقت میں یہ سب کچھ نہ سمجھتا تھا اور مجھے منٹو سے اس کی اس بے رحم تصحیح کی وجہ سے کافی کد سی تھی۔ اب جب وہ مجھ سے ملنے کا خواہش مند تھا تو مجھے چار و ناچار اپنے دوست کے ہمراہ اس کے ہاں جانا پڑا۔ وہ ہال روڈ پر بنگلہ نما مکانوں کے بلاک میں سے ایک تھا۔ وہ اس کی نچلی منزل میں رہتا تھا۔ یہ چھوٹے خوشنما مکان نیم دائرے میں ایک سبز گول باغیچے کو احاطہ کیے ہوئے تھے۔ جگہ یقیناً ایسی تھی جسے انگریزی میں پاش (posh) کہا جا سکتا تھا — اردو کے ایک مصنف کے لیے بہت زیادہ پاش جس کی گزر محض اس کی تحریروں پر تھی۔ میں یہ توقع کر رہا تھا کہ منٹو غلیظ بالکنیوں والے ایک تنگ و تاریک فلیٹ میں رہتا ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ برآمدے کے باہر سبز جھلملیوں کی جافری بھی موجود تھی۔

میرے دوست کے دستک دینے پر ایک آدمی نے آکر دروازہ کھولا؛ ایک آدمی جس کا سر بڑا اور

گنبد نما تھا اور جس کی آنکھیں اس کے کھلے فراخ ماتھے کے نیچے جیسے باہر نکلی ہوئی تھیں۔ یہ ایک انسان کی آنکھیں نہ تھیں۔ میں نے ایسی عجیب آنکھیں پہلے کسی انسانی چہرے میں نہ دیکھی تھیں۔ یہ آدمی ایک بے عیب، سپید پاجامے اور کرتے میں ملبوس تھا اور اپنے ایک ہاتھ میں ایک کھلا فاؤنٹین پین لیے ہوئے تھا۔ خوشی اور اخلاص کی روشنی چمکی اور اس نے اتنی گرم محبت سے تمتماتا ہوا ہاتھ ملایا کہ اسی وقت میری ساری سرد مہری، سارا جھینپوپن دور ہو گیا۔ تاریک اجنبی دیوار جو دو انسانوں کے درمیان ہوتی ہے، پانی کی طرح بیٹھ گئی۔ میں اُسے جانتا تھا، وہ میرا برسوں کا دوست تھا۔ منٹو لمبے کاؤچ پر بیٹھ گیا۔ اس پر ایک کاپی بک کھلی رکھی تھی۔ ہمارے آنے سے پیشتر وہ ایک افسانہ لکھنے میں مصروف تھا۔ (یہ افسانہ اس کی کہانیوں کے مجموعے ''چغد'' میں شامل ہے۔) اُن دنوں وہ ہر روز ایک افسانہ مکمل کر کے اپنے ناشر کے حوالے کر رہا تھا۔ ایک افسانے کا معاوضہ اسے تیس یا بیس روپے مل جاتے تھے۔ یہ روپے آشفتہ مزاج بوہیمین کے لیے بڑے کام کی شے تھے۔ ان سے وہ 'کافر' حاصل کی جا سکتی تھی جو اس کے منھ سے لگی ہوئی تھی اور جو اس کی 'تنگی و ترشی' کے درد کو تسکین دیتی تھی۔ ان سے اس کی بیوی اور پیارے بچے آرام اور فراغت کی گھڑیوں سے ہمکنار ہو سکتے تھے۔ کمرے میں ہر چیز صاف ستھری اور قرینے سے رکھی ہوئی تھی۔ کاؤچ کے پاس تپائی پر ایک گلدان تھا۔ (اس میں اصلی چمکیلے پھول تھے!) اور ایک ایش ٹرے بھی تھی۔ یہ آدمی نازک مزاج اور نفاست پسند ہے، میں نے سوچا۔ وہ اپنی زندگی میں بھی اسی نظم اور قرینے کا شیدائی ہے جسے وہ اپنی تخلیقات میں بروئے کار لاتا ہے — ہر ایک لفظ تراش سے درست اور اپنی جگہ پر قرینے سے بیٹھا ہوا۔ یہ ایک بڑے مصنف کا کمرہ نہ تھا؛ یہ ایک شہر کے اچھے کھاتے پیتے وکیل یا آفس سپرنٹنڈنٹ کا کمرہ ہو سکتا تھا۔ ایک مصنف کے کمرے میں آدمی ایک پُر تصویر افراتفری کی توقع کرتا ہے — ہر چیز نیچے اوپر، میز پر کاغذوں اور کتابوں کے گڑ بڑ انبار، باسی قہوے کے پیالے، فرش پر پڑے ہوئے سگریٹوں کے ٹکڑے۔ بعض عظیم ترین مصنفوں نے ایسے کمروں میں اپنی بڑی کتابیں تخلیق کی ہیں۔ بالزاک ایسے ہی ماحول میں کام کرتا تھا اور اپنے اردگرد کی بے نظمی میں خوش تھا۔ اسی طرح، مجھے یقین ہے، دوستوو سکی لکھتا تھا جس کا لکھنے کا کمرہ (جب وہ جیل کا حجرہ نہ ہوتا تھا) ایک باقاعدہ کباڑ خانہ ہوتا تھا۔ اسی طرح بد نظمی اور افراتفری کا حامل ان کا عظیم فن ہے — ان کے بڑے ناول الجھے ہوئے، طوفانی اور ناتراشیدہ ہیں، اچھی چیزوں سے بھرے ہوئے، لیکن بہت کچھ کچرے اور ردی سے بھی اٹے

Scanned with CamScanner

ہوئے۔ ان میں نظم اور تکنیک کا شائبہ نہ تھا۔ ان کے ناولوں کو پڑھنا گویا ایک وسیع کباڑ خانے میں داخل ہونا ہے جہاں پہلے پہل تو انسان پریشان ہو جاتا ہے، پھر کباڑ کے ڈھیروں میں سے اس کی آنکھ نوادر پر پڑتی ہے۔۔۔ اور کیسے عجیب نوادر! پریشانی اور الجھن کے درمیان پڑھنے والے کے دماغ میں لَو جل اٹھتی ہے اور اُسے اپنی محنت اور کاوش کا خوبصورت صلہ مل جاتا ہے۔ منٹو اپنے فن میں پھیلاؤ اور بے ترتیبی سے نفرت کرتا تھا۔ یہی نفاست پسندی، نظم اور سلیقے سے محبت وہ اپنے اردگرد کی چیزوں میں پسند کرتا تھا۔ ہر چیز اپنی ٹھیک جگہ پر ہونی چاہیے۔ ہر شے صاف ستھری ہونی چاہیے۔ اس کے صفائی اور قرینے کے خبط کے بارے میں میرے ناشر دوست نے مجھے کئی ایک دلچسپ باتیں بتا رکھی تھیں۔ اب میں نے اس کا خود تجربہ کیا۔ میرے سامنے کاؤچ پر اپنی سپید لمبی مخروطی انگلیوں میں ایک جلتا ہوا سگریٹ پکڑے اور مجھے گائے جیسی بڑی آنکھوں سے دیکھتا ہوا جو بوٹے سے قد کا شخص بیٹھا تھا وہ اپنی ذات میں بھی ستھرے پن کا قائل تھا۔ اس کے کپڑے سپید اور اجلے تھے۔ اس کے ایک غیر قدرتی رنگت والے چہرے میں سب سے زیادہ اظہار کرنے والی اور مستحکم اس کی بڑی اُمڈتی ہوئی آنکھیں تھیں۔ وہ فی الواقع غیر انسانی اور خوفناک تھیں، جنھیں گویا دیوتاؤں نے خصوصیت سے انسانوں کی روحوں میں جھانکنے، ان کی اچھائی اور کمینگی کی عکاسی کرنے کے لیے بنایا تھا... میں نے انھیں خوفناک کہا ہے، یہ پوری سچائی نہیں، چونکہ یہ "رپ وین ونکل" کے گاؤں کی پہاڑیوں کی طرح ہمیشہ ایک ہی رنگ اور یکساں کیفیت کی نہ رہتی تھیں۔ وہ خوشی اور محبت سے بھی لبریز ہو سکتی تھیں، اور پھر ان سے خوبصورت اور کوئی آنکھیں نہ ہوتی تھیں؛ وہ چلبلی ہنستی ہوئی آنکھیں بھی بن جاتی تھیں اور اتنی معصوم بھی جتنی ایک دودھ پیتے بچے کی آنکھیں؛ اور وہ پتھر کی آنکھیں بھی تھیں، تلخ اور سرد مہر! میں نے بعد میں ان کی یہ سب مختلف کیفیات دیکھیں۔ اس کی آنکھ کے بدلنے سے وہ انسان بھی بدل جاتا تھا۔ بعض وقت اتنا مختلف کہ آپ اس کو پہچانتے نہ تھے اور ڈر جاتے تھے۔ مگر اُس روز اپنے اس کمرے میں منٹو سے زیادہ پیارا میٹھا دوست اور کوئی نہ ہو سکتا تھا۔

ہمارے معذرت کرنے پر کہ ہم اس کے کام میں مخل ہوئے ہیں، اس نے خندہ پیشانی سے کہا، نہیں بالکل نہیں، اس کے لکھنے میں اس سے کوئی حرج نہیں ہوتا۔ ہمارے جانے کے بعد وہ افسانے کو اسی سرے سے پھر شروع کر دے گا جہاں اس نے اسے چھوڑا تھا۔ اس نے مسودہ اٹھا کر ہمیں دکھایا۔

آخری فقرہ ابھی نامکمل تھا۔ وہ موڈ اور الہامی لمحے کا قائل نہ تھا۔ اس نے کہا کہ رات کو سوتے وقت وہ دوسرے روز کے افسانے کی کہانی کے موضوع کے لیے بڑے ہاتھ پاؤں مارتا ہے مگر کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ صبح تک اسے کوئی پتا نہیں ہوتا کہ وہ کیا اور کیسا افسانہ لکھے گا۔ پھر حجامت بنانے کے لیے جاتے یا غسل کرتے ہوئے اُسے کوئی خیال سوجھتا ہے، پلاٹ ذہن میں آتا ہے، پھر چند کردار ابھرتے ہیں اور وہ افسانہ لکھنے بیٹھ جاتا ہے — پھر لامحالہ کردار خود افسانے کا بیڑا اٹھا لیتے ہیں۔ منٹو ان کو تخلیق نہیں کرتا: وہ اس کی تخلیق کرتے ہیں۔ وہ اپنے کرداروں کے سامنے بے بس ہوتا ہے۔ منٹو ہمیشہ یہ بات اپنے دوستوں میں دہراتا تھا مگر اپنے آپ پر ''نقوش'' میں ایک چھوٹے سے خاکے میں اس نے اقبال کیا کہ یہ محض بکواس ہے۔۔۔ میری رائے میں صداقت ان دونوں انتہاؤں کے درمیان ہے۔ منٹو پلاٹ اور کرداروں کو سوچتا تھا مگر ایک دفعہ جان پڑنے کے بعد کردار مصنف کو اپنے ساتھ ساتھ چلاتے تھے اور افسانہ اپنے آپ کو خود لکھتا جاتا تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جوہری کی صناعانہ نگاہ ہار میں پروئے جانے والے ایک ایک ہیرے کو پرکھنے سے بیگانہ ہو جاتی تھی۔ فن کار ہمیشہ چوکس اور ہوشیار رہتا تھا۔ چونکہ وہ جاندار کردار پیدا کر سکتا تھا اور الفاظ کی مصوری کا ماہر تھا، یہ کام اس کے لیے نسبتاً سہل تھا۔ لیکن اس کے نقادوں کا اس کے اپنے الفاظ کو چرا کر یہ سمجھ لینا کہ اس کا فن سہل تھا، بڑا حیرت ناک ہے۔

''اوئے محمد خالد اختر یار،'' اس نے اٹھ کر میری طرف سگریٹ کا پیکٹ بڑھاتے ہوئے کہا، ''توں سنیا اے میرے کولوں خواہ مخواہ بگڑیا ہویا ایں۔ بھائی، مینوں تیری چیز پسند آئی سی۔ میں اس دے وچ تبدیلی تے کوئی نہیں کیتی، صرف کٹ چھٹ کیتی اے۔''

اس کی اس معذرت سے میں شرمسار ہو گیا۔ اس کی آنکھیں مجھے محبت سے، کچھ 'ملزمی' سے دیکھ رہی تھیں۔ ''نہیں منٹو صاحب! میں ناراض تو نہیں ہوا۔''

''ہن ایہہ چیز زندہ رہے گی!'' اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

میں اسے اچھی طرح نہ جانتا تھا اس لیے میں نے اپنی اس تعریف کا قدرے برا مانا۔ یہ آدمی اپنے کو کیا سمجھتا ہے؟

''اچھا، ہن ٹھیریں گا نا کجھ دیر؟ میں کل آواں گا۔ تو مینوں بڑا پیارا لگنا ایں،'' منٹو نے ہمیں الوداع کرتے ہوئے کہا۔ اس نے میرے کھچاؤ پر مکمل فتح پالی تھی۔ یہ منٹو کا ایک چہرہ تھا — لیکن جیسا کہ

Scanned with CamScanner

میں نے پہلے کہا ہے، اس کے کئی چہرے تھے۔

اس پہلی ملاقات کے بعد میں لاہور میں اپنے مختصر قیام کے دوران اس سے کئی بار ملا۔ اُسے میری لکھنے کی کوشش سے دلچسپی ہوگئی تھی۔ لیکن مجھے یہ خدشہ لاحق رہتا تھا کہ کہیں اس کی بڑی بڑی وحشت ناک آنکھیں میرے اندر نہ جھانک رہی ہوں اور کہیں وہ سچائی کو نہ بھانپ لیں۔ شاید وہ مجھے اپنے کسی افسانے کا کردار بنانا چاہتا ہے، میں اس خیال سے کانپتا تھا۔ میں خوش قسمت ہوتا اگر وہ مجھے اپنی کسی کہانی کے کرداروں میں سے ایک بنالیتا—یوں میں جاوداں ہو جاتا۔ وہ انسانی فطرت کا طالب علم تھا، اور اس روکھی، ریاکار دنیا میں سچے اخلاص کا جویا۔ اس کی مجھ میں دلچسپی بھی زیادہ تر اس لیے تھی۔ پچیس سال کی جوانی خود غرض ہوتی ہے۔ وہ کھلے بازوؤں سے آگے بڑھا۔ میں نذیر احمد اور اس کے مقلدوں کے چند نایاب پندو نصائح پر عمل کرتے ہوئے پیچھے اپنے خول میں سکڑ گیا۔ ان پندو نصائح کے بغیر دنیا رہنے کے لیے سنہری جگہ بن سکتی ہے۔

پہلی ملاقات کے دوسرے روز ہی وہ میرے ناشر دوست کے ہاں مجھ سے ملنے آیا۔ میں اس دن بخار میں اکیلا پڑا تپ رہا تھا۔ منٹو نے تقریباً سارا دن میرے پاس گزارا۔ مجھے یاد ہے کہ اس نے میری بیماری کا مذاق اڑایا اور اپنے کرتے کی جیب میں سے برانڈی کی ایک چھوٹی بوتل سے مجھے پانچ چھ گھونٹ چڑھا جانے پر مجبور کیا۔ مجھے مجبور کرنے کی خاص ضرورت نہ تھی اور میں نے اچھے لمبے گھونٹ لیے۔ منٹو نے مجھے یقین دلایا کہ اب میں ٹھیک ٹھاک ہو جاؤں گا۔ اسے برانڈی کی چنگا کر دینے والی تاثیر پر مکمل ایمان تھا۔ اسے وہ زکام سے لے کر گنوریا تک سب امراض کے لیے اکسیر سمجھتا تھا۔ اس کی باتیں اب مجھے یاد نہیں رہیں۔ ہاں وہ مجھے بہلانے کے لیے متواتر بولتا رہا۔ اس نے کسی سے ملاقات کا ایک طویل اور قدرے بے سر و پا قصہ شروع کیا جس نے اس وقت مجھے شدت سے بور کیا... منٹو کی زبان بہکی اور لڑکھڑاتی تھی، مگر اس کے دماغ کی صفائی دھندلائی نہ تھی اور اس کی پچھلی گفتگوؤں کی تفصیلات کی یاد کبھی غلطی نہیں کرتی تھی۔ اتنے گھنٹوں کی اس کی باتوں نے مجھے کچھ تھکا دیا۔

وہ دوسرے دن میرے ناشر دوست کے پاس شاید اپنے ایک افسانے کے پیسے مانگنے کے لیے آیا۔ اس دن وہ ایک بدلا ہوا منٹو تھا۔ اس کی آنکھیں پتھر اور برف کی تھیں۔ میں اس کے پاس بیٹھا اور اسے باتوں میں لگانے کی کوشش کی۔ ایک گھنٹے میں اس نے ایک لفظ نہ کہا اور مجھے اس طرح دیکھا جیسے

Scanned with CamScanner

ہم مکمل اجنبی ہوں۔ یہ میرے لیے ایک عجیب اور غیر مرئی تجربہ تھا۔ میں نے سوچا، کوئی تاریک قوت اس پر مسلط ہے۔ پیسے لے کر وہ ایک لفظ کہے بغیر چپ چاپ اٹھ کر چلا گیا۔

اسی شام وہ پھر آیا تو بڑے اچھے موڈ میں تھا اور بڑا زندہ دل دوست ثابت ہوا۔ اس سے اگلے دن ہی وہ مجھے اپنے ہمراہ لاہور کی فلمی دنیا کی سیر کرانے لے گیا۔ یہاں اُسے ہر کوئی جانتا تھا۔ کئی ڈائریکٹروں اور ایکٹروں کی شادیوں میں اس کا ہاتھ تھا۔ ایک بار میں نے اس کی آنکھوں کو بھڑکتے ہوئے اور اس کے چہرے پر تمتماہٹ کو اچھلتے ہوئے دیکھا۔ ایک فلم اسٹوڈیو میں منٹو سے تعارف کرائے جانے پر ایک ایکٹر نے اس مشہور نام سے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ منٹو ہمیں ایک ایسے اسٹوڈیو میں بھی لے گیا جہاں اس کی ایک کہانی فلمائی جا رہی تھی۔ باہر آنے پر میں نے اسے سخت غصے کی حالت میں دیکھا۔ اس کا مختصر جسم پتے کی طرح ہلتا تھا۔ ڈائریکٹر نے اپنے قبیلے کے طور کے مطابق منٹو کی کہانی کو زیادہ 'پاپولر' بنا دیا تھا۔ منٹو جلے ہوئے دل سے اسے بے نقط سناتا رہا۔ ''اختر، اے جگہ بکواس اے۔''

ایک صبح میرا ناشر دوست مجھے اور منٹو کو اپنے ایک کام کے لیے ہمراہ لے گیا۔ اس نے ہومیو پیتھک کالج کا آغاز کرنے کی ٹھانی تھی اور وہ نئے وزیر صحت و تعلیم سے درخواست کرنا چاہتا تھا کہ وہ اس کے افتتاحی جلسے کی صدارت کرے۔ وزیر کی کوٹھی پر جا کر منٹو نے اپنا ارادہ تبدیل کر دیا۔ ''جاؤ بھئی تسیں وزیراں نوں ملن۔ اسیں ایتھے بیٹھے آں۔'' جب ہم وزیر صاحب سے مل کر باہر آئے تو منٹو ہمیں کہیں نظر نہ آیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم نے اُسے ایک فقیرنی کی کٹیا میں سے ہمیں پکارتے ہوئے سنا جہاں وہ بڑے مزے سے اکڑوں بیٹھا انسانی فطرت کی کتاب پڑھ رہا تھا۔ میرا خیال ہے یہی اس کی عظمت تھی۔ انسانوں میں شدید طور سے دلچسپی کی وجہ سے اس کے تجربے اور تاثرات فرسٹ ہینڈ تھے۔ وہ اپنے ان ہم عصروں کی طرح نہ تھا جو انسانی فطرت کا علم کتابوں سے حاصل کرتے ہیں یا جو اونچے گھوڑوں پر سوار زرق برق راستوں پر سے گزرتے ہیں۔

انھی دنوں منٹو کے دو خوجے دوست چنیوٹ سے لاہور آئے تھے۔ یہ مجھے معلوم نہیں کہ منٹو نے انھیں کیسے دریافت کر لیا اور وہ اس کے دوست کیونکر تھے۔ منٹو ان کے متعلق بے حد پُرجوش تھا۔ ''اختر!'' اس نے مجھے کہا، ''چل تینوں اُناں نال ملاواں۔ بڑے مزیدار آدمی نیں۔'' اس نے بتایا کہ دونوں خوجے فلیٹی ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہ اپنے ساتھ چاندی کا ایک ہاون دستہ لائے تھے، اُسے وہ

Scanned with CamScanner

بھنگ گھوٹنے کے لیے استعمال میں لاتے تھے۔ منٹو کے لیے وہ ایسے تھے جیسے ایک بچے کے لیے سونے کا خزانہ۔ وہ انھیں انسانیت کے دو دلچسپ نمونے سمجھتا تھا۔ مجھے ایسے لوگوں سے ملنے کا ذرہ بھر شوق نہ تھا۔ میں منٹو کے ساتھ فلیٹی میں نہ گیا۔ لیکن ایک روز مال روڈ پر ضیاری کی ایک دکان میں ان دونوں کی زیارت نصیب ہو ہی گئی۔ ان میں سے ایک گیروے رنگ کا لاچا اور ایک لمبا کرتا پہنے ہوئے تھا۔ منٹو ان کی مصاحبت میں تھا اور ان کی صحبت میں بڑا خوش اور مغرور لگتا تھا۔ وہ فی الواقع زندگی کے کوچوں کا کھلنڈرا شوخ لڑکا تھا۔ اسی اسکول میں اس نے ہر قسم اور ہر قماش کے لوگوں سے آسانی اور بے تکلفی سے دوست بنا لینے کا فن سیکھا۔ منٹو چنیوٹ کے ان خوجوں پر ایک افسانہ لکھنا چاہتا تھا۔ وہ افسانہ نہ لکھا جا سکا اور خوجے بدقسمتی سے ابدیت کا تمغہ پانے سے بال بال بچ نکلے۔

منٹو کی ایک ہولناک، دہلا دینے والی تصویر میرے لوحِ ذہن پر نقش ہے (ان سطروں کو لکھتے وقت بھی وہ تصویر، وہ منظر اصلی زندگی کی طرح میرے سامنے ابھر رہا ہے)۔

ایک چلچلاتی دوپہر کو میں اور میرے چند دوست تانگے سے مال روڈ کے چینیز ریستوراں کے سامنے اترے۔ پاس ایک برف بیچنے والے کی دکان کے سامنے سر پر تولیہ لیے اور لال پتھریلی نگاہوں سے خلا میں دیکھتا ہوا سعادت حسن منٹو کھڑا تھا۔۔۔ آشفتگی اور انسانی تنہائی کی مکمل تصویر۔ اسے اس طرح دیکھ کر ایک چاقو میرے کلیجے میں سے گزر گیا۔ اپنے دوستوں کو چھوڑ کر میں اس کے پاس گیا۔ اس نے مجھے کوری انجانی نظروں سے گھورا۔ ''میں برف لینا پیاں،'' اس نے لڑکھڑاتی زبان سے کہا۔ برف بیچنے والا اپنے شرابی گاہک کو عجیب طرح سے تک رہا تھا (اس بے چارے کو کیا پتا تھا کہ اس سے بڑا اور عظیم تر آدمی اس کی دکان پر کبھی نہ آئے گا)۔ منٹو نے برف کی بڑی سل کی سل خریدی، اسے تولیے میں لپٹا۔ ''جاؤ تسیں، اپنے دوستاں نال چینیز جاؤ۔ جاؤ تساں۔'' اس نے اپنا پتلا لمبا ہاتھ بڑھایا اور تولیے میں لپٹی ہوئی برف کی سل کو بغل میں دابے وہ جھکے ہوئے بے مقصد قدموں سے زمزمہ کی طرف چل پڑا۔ میرا دل چاہا میں اس کے ساتھ جاؤں، مگر چینیز میں میرے دوست میرا انتظار کر رہے تھے۔

منٹو کی زندگی موپاساں کی ایک کہانی ''بیرا، ایک جرعہ اور'' کے ہیرو کی طرح خالی اور سونی تھی۔ وہ ایک ایسے جہاز کی مانند تھا جس کا لنگر ٹوٹ چکا ہو۔ اس کے لیے اس پُر آلام دنیا کے سمندر میں کوئی امن کا جزیرہ نہ تھا اور وہ اس خلا کو سستی تند شراب کے متواتر گھونٹوں سے پُر کرتا تھا۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا

کہ یہ درشتی و ترشی، تھی یا اس کے ہم جنسوں کی کمینگی اور خود غرضی جس نے اُسے الکحل کے دروازے پر بے بس ڈال دیا۔ شاید اس کی اپنی (آرٹسٹ کی) تنہائی اس کے پینے کا سبب تھی۔ الفاظ کی مصوری ایک تھکا دینے والا، خون پی لینے والا کام ہے — اور اس میں کوئی شک نہیں کہ منٹو ہر لمحہ ایک آرٹسٹ تھا۔ صحیح لفظ کے لیے اس کی کاوش پیہم اور مسلسل تھی۔ بڑی آنکھیں ہمیشہ دوسرے انسانوں کے دلوں میں غوطے لگاتی تھیں اور اس کا ذہن بے رحمی سے چھوٹی سے چھوٹی تفصیل محفوظ کرتا جاتا تھا۔ اس کی یہ عادت بعض دفعہ اس کی صحبت کو بوجھل بنا دیتی تھی۔ اس کی صحبت ایک نارمل تجربہ نہ تھا۔

مجھے ۱۹۵۱ء کا وہ عجیب دہشت ناک دن اب تک یاد ہے جس کے خیال سے اب بھی میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایسا دن میری زندگی میں اچھوتا ہے۔ اس چمکیلے سورج کی دنیا کی بجائے کسی تاریک اور دیوانی دنیا سے اس کا تعلق معلوم ہوتا ہے۔ اسی سال کے کرسمس میں ہم کار میں لاہور آئے اور میکلوڈ روڈ پر لاہور ہوٹل میں اترے۔ ہم تین دوست تھے۔ ایک کو میں 'اپی کیورس' کہوں گا چونکہ وہ اپنے کو بھی اپی کیورس کہتا تھا اور فلسفیانہ مزاج رکھتا تھا۔ دوسرے کا نام 'پیٹر' ہوگا۔ پیٹر ایک شاعر تھا اور ایک کامریڈ بھی۔ ہم اپی کیورس کی کار میں لاہور گل چھرے اڑانے کے واحد اور بلند مقصد سے آئے تھے۔ میں ایک پُرسکون، ٹھنڈے خون کا شخص ہوں — گل چھرے اڑانے کے لیے طبعاً اور جسمانی لحاظ سے ناموزوں۔ مگر شوریدہ اپی کیورس اور پیٹر مجھے زبردستی اپنے ہمراہ گھسیٹ لائے تھے۔ لاہور، میری طالب علمی کا لاہور، مجھے ہمیشہ ایک پُرکشش شہر لگا ہے۔ یہاں پہنچنے کے بعد دوسرے دن لوہاری دروازے کے باہر اپنے ناشر دوست کی دکان پر مجھے بتایا گیا کہ منٹو صاحب میرا اور اپی کیورس کا انتظار کر کے ابھی ابھی گئے ہیں۔ میرے ناشر دوست نے منٹو کو ہماری آمد کی تاریخ سے مطلع کر رکھا تھا۔ ہم وہاں ابھی کھڑے ہی تھے کہ منٹو اور راہی تانگے میں وہاں آ پہنچے۔ منٹو اترتے ہی ہماری طرف لپکا۔

''اوئے اختر، میں تے بڑے دن دا تیرا انتظار کر ریا آں۔ رشید کولوں پچھ، کنے چکر لائے نیں۔''

اپی کیورس اور پیٹر نے اس بلائے ناگہانی کو پسند نہ کیا۔ ان کے دوسرے پروگرام تھے اور اب ظاہر تھا کہ منٹو ان کو نہ چھوڑے گا۔

منٹو نے کہا، ''آؤ چلیے، فیر گھر چلیے۔ پر او تھے تے افریقہ اتریا ہویا اے۔'' افریقہ اس کے چند قرابت دار تھے جن کا نیروبی میں کاروبار تھا۔

Scanned with CamScanner

میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے سے شراب چھلکی پڑ رہی تھی اور اس کی زبان معمول سے زیادہ لڑکھڑاتی تھی۔ منٹو کار میں بیٹھ گیا اور ہم نے لاہور ہوٹل میں جانے کا فیصلہ کیا۔ ''پر یار راہی! ساڈا دارو تے ختم ہو گیا۔ او تھے چل کے کراں گے کی؟ چلو لے لیاں گے۔ پر پیسے؟... چلو پیساں دی وی فکر نہ کرو۔'' اس نے پیچھے ہماری طرف دیکھا۔ ''اپنا خالد جو اے۔ ریاض اے۔ پندرہ روپے تے اناں کولوں نکل آن گے...''

پندرہ روپے سے ہاتھ دھونے کے خیال نے ہمیں زیادہ خوش نہ کیا۔ ''منٹو صاحب،'' میں نے کہا، ''آپ کے لیے لاہور ہوٹل میں بلیک اینڈ وہائٹ پڑی ہے۔'' پیٹر اپنے ساتھ وسکی کی ایک بوتل لے کر آیا تھا۔

لاہور ہوٹل کے کمرے میں پہنچ کر منٹو بڑے مزے سے نیچے فرش کی دری پر بیٹھ گیا۔ ''لیا بھئی فیر!'' پیٹر نے بلیک اینڈ وہائٹ کی بوتل کھولی اور اس میں سے شراب ایک گلاس میں انڈیلی... منٹو اسے ایک گھونٹ میں چڑھا گیا۔ اسے پیتے دیکھ کر آدمی کو ڈر لگتا تھا۔ جتنا وہ پیتا تھا، اتنا ہی وہ زیادہ پیاسا ہو جاتا تھا۔ ہر پندرہ بیس منٹ کے بعد پیٹر اس کے لیے گلاس میں وسکی ڈالتا اور وہ اسے اپنے اندر ڈال لیتا۔ اس کی گفتگو لکنت زدہ اور بے ربط تھی۔ اس کی بڑی، بوڑھے ہرن کی سی آنکھیں، جو اپنے افق سے بھٹکی ہوئی اور کسی کھوئی چیز کی متلاشی تھیں، اب اپنے اندر ایک چنچل بچے کی مسکراہٹ لیے ہوئے تھیں۔ کچھ دیر تک وہ میرے ایک ناول کے مسودے کے بارے میں مجھ سے چھیڑ کرتا رہا۔ ''اوئے اختر، میں تیرا ناول پڑھیا اے۔ نرا بکواس، بکواس— اوہ ساری گل جس واسطے توں دو سو صفحے لکھے نیں، چھ صفحیاں وچ کہی جاسکدی سی۔ اوئے تو لکھیا کر، پر تھوڑا، تھوڑا...''

میں نے اپنے شاہکار کے بکواس کا نام پانے کا ذرا بھی برا نہ منایا۔ یہ بکواس سہی مگر منٹو نے اسے پڑھا تھا! ہم مسحور اور کچھ سہمے ہوئے اس عجیب آدمی کی بہکتی اور سیانی باتیں سنتے رہے۔ آنکھیں جلتے انگارے بن گئیں، اس کا ہاتھ رعشہ زدہ ہو گیا، پھر بھی اس نے اپنے ذہن کی صفائی ایک لمحے کے لیے نہ کھوئی۔ ہمارے لیے یہ ایک وحشت ناک خواب میں سانس لینا تھا۔

وہ کئی ایک بار اٹھا۔ ''چل راہی چلیے۔ اناں کدے جانا ہووے گا۔'' وہ ہماری طرف ملزمانہ آنکھوں سے دیکھتا، پھر بیٹھ جاتا۔ ''او اُتھے چل کے کی کراں گے۔ اُتھے افریقہ اتریا ہویا اے۔''

چار گھنٹے کی بادہ نوشی کے بعد اُسے نیندسی آگئی، اور وہ پلنگ پر ایک بچے کی طرح اکٹھا ہو کر اور اپنی بانہہ کو اپنی آنکھوں پر رکھ کر سو گیا۔ اس پریشان بے قرار نیند سے وہ آدھ آدھ گھنٹے کے بعد بیدار ہوتا اور بستر پر اٹھ بیٹھتا۔ ''ٹریژر آئی لینڈ'' کے بحری قزاق بلی جونز کی طرح وہ ہم پر لال آنکھیں گاڑتا اور ہلاکت کی دوا کے ایک اور گلاس کا حکم دیتا۔ ڈر کے مارے ہمیں انکار کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

ایک دفعہ اس نے مجھے اور اوپی کیورس کو آواز دی۔ ''ایتھے آ کے بیٹھ نا یار!'' ہم اس کے پاس جا کر بیٹھے — کچھ گھبرائے سے، کچھ سحر زدہ... ''اوئے اختر، توں بکواس لکھیا اے۔ لکھیا کر لیکن مختصر، مختصر۔''

ہم نے اس کی کہانیوں کا کسی طرح ذکر کر دیا۔ وہ غصے میں بھڑک اٹھا۔ ناتواں جسم کپکپانے لگا۔ ''میرا ذکر چھوڑ دیو،'' اس نے کہا، ''میری بات نہ کرو۔'' اس نے اپنی ایک انگلی کا قلم بنا کر دوسرے ہاتھ پر لکھنے کا اشارہ کیا، ''میری بات چھوڑو۔ میں ایک سطر لکھ دوں وہ آرٹ ہے۔'' وہ اپنی انانیت کے موڈ میں تھا۔ ہم سہم کر دبک گئے۔ عجیب بات یہ تھی کہ یہ کوری شیخی نہ تھی۔ اس کا دعویٰ سو فیصدی درست تھا۔ جو کچھ وہ لکھ دیتا تھا، آرٹ تھا۔

اس کا غصہ فوراً اتر گیا اور اس نے ایک التجا کے لہجے سے کہا، ''اختر، ایس بک بک توں میں نکلنا چاہنا۔ مینوں اپنے نال پہاڑاں تے لے چلو، دور... مینوں کڈو ایتھوں...''

میں نے کہا کہ ہم اسے اپنے ساتھ کاغان کی وادی میں لے چلیں گے۔

''مینوں اس بلا توں دور رکھنا،'' اس نے وسکی کی بوتل کی سمت اشارہ کیا۔ اس کی آنکھیں آزادی اور کوہستانی ہواؤں کے تخیل سے خواب آلود ہو گئیں۔ اچانک اس کا چہرہ اداس اور سنجیدہ ہو گیا۔ ''میرے بیوی بچے... انہاں داں کی ہووے گا؟ انہاں دا انتظام کرنا پئے گا۔'' ایک دفعہ اس نے یہ بھی کہا، ''میں مر جاواں گا، منٹو مر جائے گا تو اختر توں وی روئیں گا، تساں سارے روؤ گے۔''

باہر گہری شام پڑنے پر وہ آخر گھر جانے کے لیے اٹھا۔ ''چلیے بھئی افریقہ نوں ملیے۔''

میں اسے اور راہی کو نیچے سڑک پر چھوڑنے آیا۔ میکلوڈ روڈ پر نیلے اندھیرے میں تانگوں اور موٹروں کی روشنیاں اچھل رہی تھیں اور زندگی کا پُر رنگ، دلچسپ اور احمقانہ میلہ لگا تھا۔ راہی نے ایک تانگے کو آواز دی۔ منٹو نے مجھ سے اپنا ہاتھ ملایا، ''او اچھا بھئی اختر!'' پھر اچانک اجنبیت اور کھنچاؤ کی

رتی میرے اندر ٹوٹ گئی اور میں نے اس پیارے اکیلے آدمی کو گلے لگالیا۔

جب میں اسے تانگے میں سوار کرا کے لوٹا تو میری آنکھوں میں انسان کی تنہائی کے المیے کا خیال کر کے آنسو آ گئے۔ میں نے منٹو کو پھر کبھی نہ دیکھا۔ جب اس کی کہانی ''موذیل'' چھپی تو میں نے منٹو کو ایک بے حد عقیدت مندانہ اور تعریفی خط لکھا — اس قسم کا خط جو ایک چیلا اپنے گرو کو لکھتا ہے۔ میں نے لکھا کہ وہ ایشیا کا یقیناً سب سے بڑا آدمی ہے۔ اس خط سے اسے خوشی ہوئی اور اس نے مجھے اپنے واحد خط میں جواب دیا کہ میں منٹو کے غبارے میں اتنی ہوا نہ بھروں کہ وہ پھول کر آسمان کی پہنائیوں میں اوجھل ہو جائے۔ اس نے اسی رات کی بات کو دہرایا کہ اس نے اپنے کرداروں کو پیدا نہیں کیا بلکہ اس کے ہر نئے کردار کے بعد ایک نیا منٹو جنم لیتا ہے۔

یہ خط مجھ سے کھو گیا ہے۔ اب اسے حاصل کرنے کے لیے میں کیا کچھ دینے کو تیار نہیں ہوں! اس آخری ملاقات کے بعد میں دو تین بار لاہور گیا، منٹو سے نہ ملا۔ اس کے لیے میں عمر بھر اپنے کو کوستا رہوں گا۔ اس کی خبریں مجھے ملتی رہتیں — اس کی بیماریاں، اس کے شراب چھوڑنے کی خاطر دماغی اسپتالوں میں داخلے، اس کی اپنے بیوی اور بچوں کو آرام سے رکھنے کی تند کشمکش — مگر پچھلے چار پانچ مہینے سے مجھے اس کی کوئی خبر نہ ملی تھی۔

پھر سرما کی ایک سرخ اداس شام — پتے سڑک پر بکھرتے ہوئے اور ایک آندھی چلتی ہوئی — اور پیٹر ایک غم زدہ چہرے سے تانگے میں سے چلاتا ہوا اترا، ''منٹو مر گیا!''

میں اس وقت گاڑی پکڑنے کے لیے اسٹیشن جا رہا تھا۔ پیٹر مذاق کر رہا ہوگا، جس طرح اس کی عادت تھی۔ مگر اس کے چہرے نے مجھے بتایا کہ یہ مذاق نہیں ہے۔ میرا دل ڈوبا، دنیا گویا اوپر نیچے ہو گئی۔ ہم میں سے کتنوں کے لیے زندگی کی لو اس دن بجھ گئی۔

آرٹسٹ منٹو

'آرٹسٹ منٹو'، 'انسان سعادت حسن' سے الگ نہ تھا۔ ایک دوسرے کا پرتو اور عکس تھا۔ یہ چیز شاید ہر بڑے فن کار کے بارے میں کافی صداقت سے کہی جا سکتی ہے، لیکن منٹو کے بارے میں یہ بات ایک سے

Scanned with CamScanner

زیادہ لحاظ سے بچ تھی۔ اس کے آخری ایک دو سال میں آرٹسٹ اور انسان اس طرح غیر منقسم طور پر گتھ گئے تھے کہ ایک کو دوسرے سے الگ بتانا مشکل تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بعض وقت (جیسا کہ اس کے ایک نقاد دوست نے ایک دفعہ کہا) اس کی صحبت شریف رواجی فطرتوں کے لیے بوجھل ہونے لگتی تھی۔ وہ ہر وقت آرٹسٹ تھا، صحیح لفظ کی تلاش وار اپنے فن کی کارفرمائیوں سے اس درجہ چھلکتا ہوا کہ وہ لوگوں کے لیے ناقابل برداشت ہو جاتا اور وہ اس سے بچ کر اپنی چھین بھری سمجھ دار دنیا میں جانے کی خواہش کرنے لگتے۔ شریف و دنیادارانہ معیار سے اس کا رویہ، اس کا طریق حیات یقیناً کرینکش (crankish) اور نامناسب تھا اور اس کی صحبت میں سورج اور کھلی ہوا کی کمی تھی۔ ایک آرٹسٹ کی حیثیت سے وہ زندگی کا ایک ایک لمحہ بھرپور طریق سے جیتا تھا اور جب وہ کسی سے ملتا تو وہ محض رسمی واقفیت پر قانع نہ ہوتا بلکہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ شخص کیا ہے، اور یہ چیز بھلے مانسوں کے لیے بڑی پریشان کن ہوتی۔ وہ اپنے اور اپنی کتاب (کل انسانیت اس کی کتاب تھی) کے درمیان کوئی تکلف اور 'اچھے' اخلاق کی دیوار برداشت نہ کر سکتا تھا۔ اس کے اندر کا آرٹسٹ ہمیشہ ہر ملنے والے کی روح میں جھانکتا رہتا تھا اور یہ پتا لگاتا رہتا تھا کہ اس میں سونا کتنا ہے اور زنگ آلود لوہا کتنا۔ منٹو ہر لمحہ اپنے افسانے خود جیتا تھا اور اس ایک کہانی کے مقابلے میں جسے وہ حقیقتاً لفظوں میں لاتا تھا، بیسیوں اس کے ذہن میں ہوتی تھیں۔ میرا خیال ہے اس نے ڈیڑھ سو یا دو سو کے قریب مختصر افسانے لکھے ہوں گے۔ مجھے یقین ہے کہ کئی ہزار افسانے پلاٹ اور کرداروں سے متعلق اس کے اندر جل رہے تھے جنھیں وہ نہ لکھ سکا۔ وہ بعض دفعہ بڑا کھرا اور ظاہراً بداخلاق ہوتا، جس کا بے سمجھ ظاہر میں برا مانتے۔ یہ اس کا لوگوں کو کھولنے کا طریقہ تھا۔ ہم سب بند کتابیں ہیں اور دیکھا جائے تو ہمارے بہترین دوست بھی ہمارے متعلق تاریکی میں ہوتے ہیں۔ ہم خود بھی یہی چاہتے ہیں کہ ہمارا اصل تاریکی میں رہے اور ہماری کمینگی اور غلاظت ان پر آشکارا نہ ہو۔ آرٹسٹ منٹو فوراً آدمی کو بھانپ جاتا تھا اور اس کی فطرت کو لاشعور کے آئینے میں منعکس کر لیتا تھا۔ بوڑھے ہرن کی سی آنکھیں سب کچھ دیکھ لیتی تھیں۔ موپاساں میں بھی یہ خداداد خوفناک صفت تھی، مگر جہاں عظیم فرانسیسی کو اس کے علم نے فطرتِ انسانی کے متعلق حد درجہ تلخ اور سنکی بنا دیا تھا، منٹو نے آدمی کی کمینگی اور جھوٹ کے باوجود اس سے رشتۂ محبت استوار رکھا۔ سارے انسانوں کا درد اور حزن اس اکیلے بادہ گسار میں تھا اور سب آدمی اس کے اپنے بھائی تھے۔ یہ محبت اور یہ درد اس کے ہر ترشے اور

چھانٹے ہوئے افسانے میں نو اسخ ہے اور اس واحد چیز کی بدولت اسے فرانسیسی دیو سے ایک لحاظ سے بڑا افسانہ نگار کہا جا سکتا ہے۔

میں نے لکھا ہے کہ آرٹسٹ اور انسان ایک تھے؛ وہ ایک ضرور تھے لیکن ایک اہم فرق کے ساتھ۔ جہاں انسان سعادت اپنی دنیاوی زندگی میں بے حد جذباتی ہو جاتا تھا — احساسات کی انگلیوں کے نیچے ایک طرب آمیز ساز — وہاں آرٹسٹ منٹو سرد اور سخت اور بے رحم تھا۔ آرٹسٹ منٹو برف تھا اور اپنی تخلیقات سے جذبات کے خودرو گنجلک پودوں کو اس سفا کی سے چھانٹتا تھا جیسے ایک محتاط باغبان اپنی کیاریوں پر سے زہریلی بیلوں کو۔ یہ وہ شعوری طور پر، ارادتاً نہیں کرتا تھا بلکہ یہ اس کے لیے قدرتی تھا۔ ایسے کئی مصنف ہیں، غالباً بہت زیادہ، جو کسی مقصد میں خلوص کے ساتھ یقین رکھنے کی وجہ سے، یا ادبی فیشن کی خاطر، جذبات کی رو میں بہہ جاتے ہیں۔ ان کی تخلیقات میں آبدار نثری ٹکڑے ہوتے ہیں، اور خوبصورت منظر نگاری کے صفحوں کے صفحے، لیکن ان پر مقصدی جذباتیت ایک چھتے کی طرح پڑی ہوتی ہے۔ وہ اپنی تخلیقات کو اپنے ہاتھوں ایسے مکمل اور کامیاب طریق سے دفن کرتے ہیں کہ ہزار مسیحا بھی انھیں جلا نہیں سکتے اور ان کی لکھی ہوئی چیزیں (گو وہ وقتی طور پر بھڑکدار چمکیلا تاثر پیدا کرتی ہیں) پیدائش ہی میں جان دے دیتی ہیں۔ آرٹسٹ منٹو جانتا تھا کہ ایک فن پارے کے لیے مقصدیت اور جذباتیت زہر قاتل ہے — ایک تخلیق بہت زیادہ کہی ہوئی باتوں سے مرتی ہے نہ کہ اَن کہی باتوں سے۔ اسی لیے وہ بے باکی سے، بے رحمی سے اختصار کرتا تھا۔ کہانی میں جو فقرہ ہو ضروری ہو، وہ کردار میں دم پھونکے یا کہانی کی سالمیت میں معاونت کرے۔ اگر وہ فقرہ ان چیزوں میں سے کچھ بھی نہیں کرتا تو خواہ اس کا خیال کیسا ہی تازہ اور انوکھا ہو، کہانی میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ کہانی اس کے بغیر بہتر ہو گی۔ منٹو ایک بڑا آرٹسٹ تھا کیونکہ وہ ہم عصروں سے زیادہ قربانی کر سکتا تھا۔ مجھے یاد ہے، اس نے ایک دفعہ کہا تھا کہ وہ ''کھول دو'' کو اپنی عظیم ترین کہانی سمجھتا ہے کیونکہ اس میں ایک بھی فقرہ زائد نہیں۔ اب ''کھول دو'' بے حد مختصر مختصر افسانہ ہے، اور شاید مختصر ترین جو منٹو نے لکھا ہے۔ اس کے افسانے کبھی کتابی دس بارہ صفحوں سے لمبے نہیں ہوتے۔

وہ سومرسٹ ماہام کی طرح اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ ایک مختصر افسانے کا ایک 'شروع' ہونا چاہیے، ایک 'وسط' اور ایک 'انجام'۔ اس کا واضح طور پر متعین پلاٹ ہونا چاہیے۔ اگر اس لکھی ہوئی چیز کا

'شروع' اور 'وسط' تو ہے مگر آخیر میں کہانی کسی انجام کو نہیں پہنچتی اور راہ میں لٹکی رہ جاتی ہے تو یہ اور تو سب کچھ ہو سکتی ہے، 'مختصر افسانہ' نہیں ہو سکتی۔ منٹو اپنی کہانیوں کو صناعی سے ایک چونکا دینے والا انجام دیتا تھا۔ اس کی کئی کہانیوں کے انجام یقیناً عظیم ہیں اور ان کا سارا ڈھانچا ان کے آخری فقروں میں ایستادہ ہے۔ ''کھول دو''، ''موذیل'' اور ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' کے خاتمے عظیم ہیں اور وہ دنیا کی عظیم ترین کہانیوں میں سے ہیں۔ اس کے حرف گیروں نے اس کی کہانیوں کے ان انجاموں کو محض مداری کے ہاتھوں کی صفائی کہہ کر تمسخر اڑایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کا فن زندگی کے مطابق نہیں ہے۔ دنیا کے بڑے مختصر افسانہ نگاروں کی مانند منٹو اس سچائی کو جانتا تھا کہ فن کبھی زندگی کے مطابق نہیں ہوتا۔ فن زندگی کی عکاسی نہیں ہے، جو الجھی ہوتی ہے، جس کا کوئی سر پیر نہیں ہوتا اور جس میں مسلسل تخیل کی گزشتہ تصویروں، دوستوں کے ساتھ بے رنگ گفتگوؤں اور ایک لامحدود، بے منطقی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ایک فن پارہ، اس کے برعکس، ایک مکمل، واضح اور موثر چیز ہے۔ شولنسن اپنے ایک مضمون میں فن پارے کو اقلیدس کے دائرے کی مانند بتاتا ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ منٹو پہلے اور آخر ایک مختصر افسانہ نگار تھا۔ اس کی کہانیاں اتنی مختصر یعنی کٹی چھنٹی ہیں کہ ایک طرح وہ جسم کے بغیر ہیں۔ اس کی نثر چھوٹے، نپے تلے فقروں پر مشتمل ہے اور حیران کن حد تک رنگینی سے دور ہے۔ اس کی لغت بھی ہم عصروں کی نسبت محدود ہے۔ منٹو کا جینیئس میری رائے میں ناول لکھنے کے لیے موزوں نہ تھا۔ منٹو کا خیال تھا کہ ناول اس بات کو کئی سو صفحے میں پھیلا کر کہنے کا فن ہے جو پانچ صفحوں میں سمیٹی جا سکتی ہو۔ مسلسل اور لگاتار محنت جو ایک ناول لکھنے کے لیے درکار ہے، منٹو کے مضطرب ذہن کو راس نہ آتی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ کوئی ناول شروع کرتا تو چند دن بعد اس سے تنگ آ کر اسے بیچ میں چھوڑ دیتا۔ اس کا خیال تھا کہ بہت کم ایسے ناول ہیں جو زندہ رہ سکتے ہیں۔

اس کے فن کے بارے میں ایک اور نکتے کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ اس نے لامحالہ اپنے کرداروں کو روندے ہوئے طبقے سے چنا۔ یہ بڑا انسانیت پرست طوائفوں، ممد بھائیوں، موذیلوں سے محبت کرتا تھا اور ان کے متعلق لکھتا تھا۔ اب کچھ تو یہ اس وجہ سے تھا کہ اپنی ساری زندگی اس نے سوسائٹی سے دھتکارے ہوئے لوگوں کے ساتھ گزاری۔ وہ اس زندگی کو اپنی ہتھیلی کی مانند جانتا تھا۔ وہ ان لوگوں سے ملا تھا اور ان سے باتیں کی تھیں۔ لیکن اصل وجہ اور تھی۔ مجھے یقین ہے اسے بڑے آدمیوں اور زندگی کے زرق برق راستوں سے کبیدگی تھی۔ اس کے نزدیک وہ بے روح، کھوکھلے اور شیخی خورے تھے۔ وہ

Scanned with CamScanner

دلچسپ نہ تھے، اس لیے اس نے ان کو شاذ و نادر ہی اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا۔ ان عزت دار اشراف کی بجائے اس نے طوائفوں اور غنڈوں اور تانگے والوں کے متعلق لکھا۔ اس نے ان کے اندر کے سونے کو نکالا اور انسانی روح کی عظمت اور خوبصورتی کی ایسی تصویر کھینچی کہ اس کے افسانوں کو پڑھنے والے یقیناً بہتر انسان بن گئے۔ ان کو اس حقیقت کا احساس ہوا کہ آوارہ موذیل تمھاری باعفت، سگھڑ، دیندار خواتین سے کہیں عظیم اور خوبصورت عورت تھی۔ وہ اتنی اچھی اور نیک تھی کہ وہ خود بھی اس کی گرد کو نہ پا سکتے تھے۔ منٹو نے ہمیں انسانوں میں اصلی عظمت سے روشناس کیا۔ اس نے ادب میں دلیری اور بے باکی سے وہ کچھ کیا جو پہلے کسی نے کرنے کی جرأت نہ کی تھی۔ مجھے ان لوگوں کے ہوش و حواس کی سلامتی پر شک ہوتا ہے جو اصرار کرتے ہیں کہ وہ فحش نگار ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ منٹو نے کبھی کوئی فحش کہانی نہیں لکھی۔ کیا ''کھول دو'' ایک فحش کہانی ہے؟ کیا اس بے مثال تند و تلخ شاہکار کو پڑھنے کے بعد ہم یہ خواہش کرنے لگتے ہیں کہ کاش ہم اس بازیافتہ عورت کو ٹرک میں لانے والے بہادروں کے ساتھ ہوتے؟ اگر ہم یہ خواہش کرنے لگتے ہیں تو فحاشی ہمارے اندر ہے، منٹو میں نہیں۔ منٹو نے تو فحاشی پر اس زمانے میں سب سے دلیرانہ، سب سے تیکھا وار کیا ہے۔ ''میں ایک سطر لکھ دوں، وہ آرٹ ہے''۔۔۔ ایک فانی ناتواں آدمی کے لیے یقیناً ایک اونچا دعویٰ! مگر حیرانی کی بات ہے کہ یہ کس قدر سچ ہے۔ ایک سطر بھی جو اس نے لکھی، آرٹ ہے۔

ایک خط

سو یہ تھا آرٹسٹ منٹو اور انسان سعادت۔ ایک دوست نے مجھے بتایا کہ دہلی میں ایک شام اس نے منٹو کو ایک بدرو کے کنارے پڑا پایا۔ منٹو نے اسے سرد پتھریلی نگاہوں سے دیکھا اور اپنے وہاں ہونے کو گویا سمجھانے کی خاطر کہا کہ وہ بدرو میں اچھائیاں ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اچھائیاں؟'' میرے دوست نے حیرت سے پوچھا۔ ''ہاں، اچھائیاں'' منٹو نے جواب دیا، ''لیکن میں بدرو میں غلاظت اور گندگی کے سوا کچھ نہیں دیکھ رہا ہوں۔ میری زندگی بھی ایک ایسی ہی بدرو ہے، اور میرا عارف بیٹا تو ایک ستھری اور آلودگی سے پاک شے تھا اور وہ سات دن پہلے مر چکا ہے۔'' جب منٹو نے یہ الفاظ کہے تو اس کا چہرہ رواقی غم و الم

سے جامد اور خوفناک ہو رہا تھا۔ وہ ہمیشہ زندگی کی بدرو میں اچھائیاں ڈھونڈتا رہا تھا، کوئلوں کے انباروں میں لعل۔ یہ پیہم تلاش اکثر بے سود ہوتی تھی۔ اس جستجو میں اس کی آنکھیں کھوئی کھوئی سی رہتی تھیں۔ وہ کسی گنوائی ہوئی چیز کو ڈھونڈتا معلوم ہوتا تھا۔

وہ یہ کہنے کا مشتاق تھا کہ اگر ایک شخص لکھنا چاہتا ہے تو اسے پڑھنا بالکل نہیں چاہیے کہ اس سے مصنف کی اوریجنلٹی ختم ہو جاتی ہے؛ اسے زندگی کو ایک پُر جوش ولولے سے جینا اور زندگی کی کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ یہی اس کا اپنا طریقہ تھا اور اس نے عرصے سے پڑھنا ترک کر رکھا تھا۔ وہ گورکی کو بہت بڑا فن کار تصور کرتا تھا کیونکہ گورکی نے اپنا انسانی فطرت کا علم اور اپنا فن لمبی سڑک پر سے حاصل کیا تھا۔ منٹو جانتا تھا کہ کتابیں اصل زندگی کا بالکل بے خون بدل ہیں۔ لائبریریوں میں بیٹھ کر زندگی کا مطالعہ کرنے والے کبھی عظیم فن پیدا نہیں کرتے... میری رائے میں سارے اردو ادب میں غالب کی مثال کو چھوڑ کر کوئی اور اُس کے رتبے کو نہیں پہنچ سکتا۔ فطرتِ انسانی کے نباض ہونے کی حیثیت میں وہ شیکسپیئر کے پاس جگہ پانے کے لیے نااہل نہیں۔ ممکن ہے کتنوں کو میری یہ مدح سرائی مبالغہ آمیز اور انصاف سے کوسوں دور لگے، مگر وقت یہ ثابت کر دے گا کہ منٹو کا فن باقی رہنے والا ہے۔

یہ مثال دینے کے لیے کہ اس کی موت نے سلجھے ہوئے اور حساس ذہنوں پر کیا اثر کیا اور کتنے جذبوں کو ان کے دلوں میں ابھارا، نیچے میں اپنے ایک دوست کے ایک خط کا اقتباس تقریباً اسی کے الفاظ میں دیتا ہوں جو اس نے مجھے منٹو کی وفات کے چند دن بعد لکھا:

”منٹو پر قلم اٹھانا کوئی آسان بات نہیں، خاص کر اس کے لیے جو اس بڑے انسان کے متعلق اس قدر کم جانتا ہو، اور جو کچھ تھوڑا بہت مجھے اس کے بارے میں علم ہے، تمھارے تعارف کی بدولت ہے۔ اس کی موت نے ادبی حلقوں میں غم اور محرومی کی چادر ڈال دی ہے، خصوصیت سے ان ناشروں پر جنھوں نے اس کی کتابوں سے ہاتھ رنگے۔ ان بے چاروں کا ٹکسال بند ہو گیا ہے اور سنہری انڈے دینے والی مرغی اب نہیں رہی۔ بہت سے چوٹی کے اخباروں نے اس خبر پر جلی سیاہ حاشیے چڑھائے۔ بہت سی سوگواری کی محفلیں بچھیں، ریڈیو پر تقریریں کی گئیں۔ مقالے پڑھے گئے اور پڑھے جائیں گے۔ منٹو یوم منائے جائیں گے، منٹو پر نمبر نکلیں گے۔ وہی لوگ جن کے نزدیک وہ راندۂ درگاہ اور قابلِ دار تھا، اب اچانک اس پر مہربان ہو گئے ہیں۔ اس سب ادبی شور اور ہمدردی کی ظاہرداری کے باوجود بہت

Scanned with CamScanner

تھوڑے ایسے تھے جنھوں نے اس انسان کی پاک روح کو پہچانا۔ یہ سب اونچی اور بلند بانگ باتیں بڑی بھلی اور خوش آئند ہیں لیکن اس درد سے بھرے ہوئے انسان کا درد کسے ہے جو اپنے توانا قلم سے فن تخلیق کر دیتا تھا؟ لوگ حالات سے فائدہ اٹھانے میں بے حد طاق تو ہیں لیکن قدرتوں کی طنز دیکھو، بالشتیے ایک دیو کو اپنے حقیر پیمانوں سے ناپتے ہیں۔ جب میں ان کی باتیں سنتا ہوں تو، معاف کرو، مجھے ایسا لگتا ہے جیسے ایک گھریلو بلونگڑا زرعی اصلاحات پر بولنے لگ جائے۔ کم آدمیوں کو اس ادبی شمع کے گل ہونے کا افسوس اور درد ہے اور بیشتر، جن کے دیے اس کے سامنے نہ جل سکتے تھے، اب اطمینان کا سانس لیں گے۔ دیو اب نہیں ہے، اس لیے بالشتیے اب اپنی ہستی کا احساس کرا سکتے ہیں۔ تم اس خلا کو محسوس کر سکتے ہو یا وہ عام چھوٹے لوگ جن کا غمگسار اور سچا دوست وہ آشفتہ مزاج انسان تھا۔ ایسی درخشاں، ایسی بے باک زندگی خاتمے کو پہنچ گئی ہے۔ ایسا دلیر، ایسا خوبصورت انسان بنانے والے کے پاس جا چکا ہے۔ گلیوں کا آوارہ آدمی، عام کچلا ہوا آدمی، دکھ کی خزاں سے ستا ہوا آدمی اب اپنے سب سے بڑے اور پیارے دوست سے محروم ہو چکا ہے۔"

اور اس آخری فقرے کو مرے ہوئے عظیم آدمی پر ہمارا الوداعی سلام بن جانے دو۔ اس سے زیادہ اسے کوئی اور تعریف خوش نہیں کر سکتی۔ اس سے زیادہ اور کوئی کتبہ اس کے مناسبِ حال نہیں ہے۔

(فنون، لاہور، جنوری ۱۹۶۳ء)

دائیں طرف یا بائیں طرف

کھلنا کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی سفید لانچ چالنا کی دریائی بندرگاہ میں لنگر ڈالے کھڑی تھی۔ شام ڈھل رہی تھی اور پرلے کنارے کے جنگل کے اوپر ایک زرق برق رنگوں کا آسمان دریا کے پانیوں میں سونا اور گلاب گھول رہا تھا۔ ہم سب لانچ کے واحد کیبن میں جمع تھے۔ کسی طرح اردو کے مختصر افسانے پر بحث چل پڑی اور بیرن ہوچھا نے یہ سوال کیا کہ اس دور کے اردو کے افسانہ نگاروں میں سب سے پہلے کس کا نام آنا چاہیے۔ بیدی، منٹو، کرشن، ندیم، بلونت سنگھ، اشفاق کے نام پیش کیے گئے۔ میں نے سعادت حسن منٹو کو بہترین افسانہ نگار کہا۔ میں نے اس استاد کے سادہ و شستہ اسلوب، بیان کے اختصار اور غیر جذباتی انداز کو سراہا۔ میں نے کہا کہ وہ ایک دو فقروں میں جیتے جاگتے کردار پیدا کرتا ہے اور اس کی کہانی کا ایک واضح چونکا دینے والا انجام ہوتا ہے۔ کاؤنٹ بورس (ایک اور جینٹل بوہیمین اور اپنی طرز کا جینئیس) منٹو کو رگیدنے کے موڈ میں تھا۔ اس نے منٹو کو مداری کہا جو تھیلے میں سے خرگوش نکال کر ہاتھ کی صفائی دکھاتا ہے۔ اس نے کہا، ''منٹو کے افسانے لُچے پن اور رجائیت کے مرض کے شکار ہیں اور تم انھیں دوبارہ نہیں پڑھ سکتے۔'' میں نے کہا، ''میں نے 'موذیل' کو چار دفعہ پڑھا ہے اور 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' کو سات آٹھ دفعہ، اور میں نہیں سمجھتا کہ اردو میں ان سے بہتر کہانیاں لکھی جاسکتی ہیں۔'' کاؤنٹ بورس نے ناول کا تاج کرشن چندر کے سر پر رکھا۔ اس نے کہا، ''اس کی تحریر میں رنگینی اور حلاوت ہے۔ اور اگر وہ جذباتی ہے تو اس کا کیا — ہم سب جذباتی ہیں، پھر ہم ادب میں جذباتیت سے کیوں بدکتے ہیں؟'' کاؤنٹ بورس جھگڑنے اور اپنی منوانے کے موڈ میں تھا، اور میں نے اس سے جلد متفق ہونے میں عافیت سمجھی۔ شاید کاؤنٹ بورس ٹھیک ہی تھا۔

جوانی کے دنوں میں کرشن میرا محبوب ترین اردو مصنف تھا اور ہم اس کی رنگین تحریر کے طلسم میں اپنی اُمنگوں، دکھوں ور رومانی تمناؤں کی تسکین پاتے تھے۔ بحث شاید طول پکڑتی کہ ناولسٹ پامس

Scanned with CamScanner

(Pompus)، جو اپنی ڈھائی من کی لاش کو کیبن کے نرم گدگدے بنکر پر چت لٹائے پڑا تھا، چونکا اور پوچھنے لگا کہ ہمارا موضوع بحث کیا تھا۔ جب ہم نے اسے بتایا تو وہ برتری کے انداز میں مسکرایا۔ وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ اردو کے بہترین ناولسٹ کی موجودگی میں کوئی کیسے منٹو اور کرشن کا ذکر کر سکتا ہے — جب مگرمچھ موجود ہو تو چھوٹی مچھلیوں کو کیوں اہمیت دی جائے۔ منٹو اس کے نزدیک ایک لچا لفنگا، فحش نویس تھا اور کرشن محض ایک لالہ۔ مجھے یقین تھا کہ ناولسٹ پامپس نے منٹو، کرشن یا دوسرے جدید افسانہ نگاروں کو بالکل نہیں پڑھا تھا، اگرچہ ان کو پڑھنے کے بعد بھی اپنے متعلق اس کی اپنی رائے کبھی نہ بدلتی۔

وہ اپنا ذکر کرنے لگا، بالکل بے محل طور سے۔ اس نے ہمیں بتایا کہ کیسے جب وہ اپنا معرکۃ الآرا ناول ''سعید بن مجید'' لکھ رہا تھا تو اس کے ایک مداح نے اس کے نام ایک خط میں تحریر کیا کہ وہ بستر مرگ پر پڑا ہے، ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے۔ اس کی اب واحد تمنا یہ ہے کہ خداوند باری تعالیٰ اسے اتنی مہلت دے دے کہ وہ مرنے سے پہلے ''سعید بن مجید'' پڑھ سکے۔

کاؤنٹ بورس نے چپکے سے مجھ سے کہا، ''میں کہتا ہوں کامریڈ! اس فتنہ انگیز شخص پر ہلکا سا لاٹھی چارج نہ کیا جائے؟''

ہم نے پھر ڈائننگ روم میں ناولسٹ پامپس کو ناولسٹ پامپس کے موضوع پر باتیں کرتے سنا — جہالت واقعی مہا آنند ہوتی ہے۔ کھانے کے بعد میں عرشے پر اکیلا گیا۔ ایک پیلا گول چاند جنگلوں کے اوپر نکل رہا تھا اور پانی میں اس کا عکس ہزاروں ریزوں میں ٹوٹ رہا تھا۔ میں کرشن چندر کے متعلق سوچنے لگا — وہ کون سا جادو تھا جس سے اس نے جوانی میں ہمارے دلوں کو مسخر کر لیا تھا اور ہمیں اپنا پجاری بنا لیا تھا؟

ایسا فینامینا (phenomena) ہمارے ادب میں پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔

۲

غالباً ۱۹۳۸ء کے اوائل میں کرشن چندر کی پہلی کہانی ''جہلم میں ناؤ پر'' چھپی اور وہ اس دن سے ایک مشہور مصنف بن گیا۔ اس کا نام ہمارے ادب میں ایک درخشاں ستارے کی طرح ابھرا اور ہم اس کی چکاچوند سے چندھیا گئے۔ وہ رات کو سو کر صبح اٹھا تو ہر کوئی اس کی باتیں کر رہا تھا۔ ہم اس کی اچھوتی

Scanned with CamScanner

نثر، بیان کی رنگینی اور تخیل کی رومانیت کے جادو تلے آ گئے اور کئی سال تک اس جادو کی تاثیر ہم پر چھائی رہی۔ وہ اردو ادب میں واقعی فینا مینا ہے، اور اگر چہ اس کا جادو اب قدرے مدھم اور پھیکا ہو چلا ہے مگر کرشن ہماری ہستی کا ایک اہم جز بن چکا ہے — ایک پیارے بھائی کی طرح۔ اس نے ہماری جوانی کے کرب وحزن سے بھرے ایام میں ہمیں اتنا کچھ دیا، اتنے سارے ڈیپ جلائے۔ کسی نے اردو میں اس سے پہلے ایسی نثر نہ لکھی تھی، اتنی لطیف اور مدھ بھری، ہر لفظ نئے ڈھلے ہوئے سکے کی طرح چمکدار اور اپنی جگہ پر ہیرے کی مانند سجا ہوا۔ یہ نثر میں مرصع کاری تھی، الفاظ میں طلسمی مصوری، ہر فقرہ لال چھبا اور پڑھنے والے کے ذہن میں بھڑکیلے اور رنگا رنگ کے سپنے جگاتا ہوا۔ ایک نئی نثر کا بادشاہ اردو زبان میں آ گیا تھا، ایک نادر جادوگر، جس نے الفاظ کی بے جان مورتوں میں جان ڈال دی تھی۔ کوئی تعجب کی بات نہ تھی کہ ہم حسن ولطافت کے اس ریلے کے سامنے بہہ گئے — سرشار، خوش اور بے قابو۔ محمد حسین آزاد نے پیش گوئی کی تھی کہ زبان کے اہلِ ذوق بڑے بڑے صاحبِ قدرت ہیں، اور ہوں گے، کوئی نہ کوئی منزل مقصود تک پہنچے گا۔ کرشن چندر وہ لکھنے والا معلوم ہوتا تھا جس نے آزاد کی پیش گوئی پوری کر دی تھی۔

ایک اچھا لکھنے والا ہمارے سامنے ایک نئی دنیا کھول دیتا ہے، اور کرشن چندر کی دنیا بے حد انوکھی، نئی نویلی اور پرکشش تھی۔ تشبیہیں اور استعارے جو وہ استعمال کرتا تھا، عام تام اور گھسے پٹے اور مردہ نہ تھے بلکہ اپنی دلآویزی اور لطافت سے تخیل کو روشن کر دیتے تھے۔ ''جہلم میں ناؤ پر'' ہماری ادبی خزاں میں بہار کی تازہ ہواؤں کی طرح آئی اور گویا ایک معجزہ وقوع پذیر ہوا۔ اس کے بعد کہانیاں، خاکے اور مضامین اس کے زرخیز، انتھک قلم سے ایک کبھی نہ ختم ہونے والی ندی کی مانند بہنے لگے اور اردو پڑھنے والوں میں اس کی مقبولیت بڑھتی گئی۔ اُن دنوں ہمیں یقین تھا کہ جہاں کرشن چندر بیٹھا ہے وہی اردو ادب کا تخت ہے۔ اب میں یہ بات کہتے ہوئے ہچکچاؤں گا، لیکن اُن دنوں مجھے اس کا یقین تھا۔

اپنی اس سوچ میں میں اکیلا نہ تھا۔ کرشن کی ہر نئی کہانی کو ہم اس اضطراب، اس دل کی دھڑکن سے پڑھتے تھے کہ اب وہ عجیب بات معلوم ہوتی ہے۔ جب اس کی کوئی نئی کہانی ''ادب لطیف'' یا ''سویرا'' میں چھپتی تو یہ ایک اہم خبر ہوتی اور ہم بے تاب ہو کر لوہاری کے بک اسٹال پر رسالہ لینے کے لیے بھاگتے اور جب تک اسے پڑھ نہ لیتے چین سے نہ بیٹھتے۔ اور ہم اسے ایک بار ہی نہ پڑھتے بلکہ دوبارہ اور سہ بارہ۔ اسے اپنے دوستوں کو پڑھ کر سناتے اور کئی دن اس کے سحر میں رہتے۔ مجھے یوں

Scanned with CamScanner

یاد ہے جیسے کل کی بات ہو کہ میں لا کالج میں پڑھتا تھا اور ایک شام انار کلی میں گھوم رہا تھا۔ میرا ایک دوست سائیکل پر گاتا ہوا گزرا۔ میرے پوچھنے پر کہ وہ اتنی جلدی میں کیوں ہے، اس نے کہا کہ کسی نے اسے بتایا ہے کہ کرشن چندر کی نئی کہانی ''دو فرلانگ لمبی سڑک''، ''ادب لطیف'' میں چھپی ہے اور وہ یہ رسالہ لینے جا رہا ہے۔ میں بھی اس کے پیچھے بھاگا۔ میرا دل آنے والی خوشی کے خیال سے ایک پرندے کی طرح پھڑ پھڑا رہا تھا۔

جب اس کی کہانیوں کی پہلی کتاب ''طلسم خیال'' شائع ہوئی تو یہ ہمارے ادب میں ایک سنگ میل سے کم نہ تھی۔ میں نے اس کی ہر کہانی کو کم از کم آدھا درجن بار ضرور پڑھا ہوگا۔ ''جہلم میں ناؤ پر'' اور ''آنگی'' میری چہیتی تھیں، اور ''آنگی'' تب جان کیٹس کی ''لا بیلے ڈیم سانز مرسی'' کی طرح لطیف اور غیر مرئی اور انمٹ معلوم ہوتی تھی — نثر میں ایک مکمل نظم۔ میں نہیں جانتا ''آنگی'' کو میں نے کتنی بار پڑھا۔ بہر حال وہ مجھے ''لا بیلے ڈیم سانز مرسی'' کی طرح زبانی یاد ہو گئی۔ جان کیٹس کی لافانی نظم مجھے اب بھی زبانی یاد ہے، مگر ''آنگی'' مجھے بھول چکی ہے — صرف اس کی سحر آگیں خوابی خوبصورتی اب بھی ذہن میں ایک دمک بن کر اٹکی ہوئی ہے۔

کیسے وقت گزرتا ہے! ان کہانیوں کو پڑھے اب مجھے کم و بیش پچیس سال ہو چکے ہیں۔ اس وقت ان کا پڑھنا ایک زندہ روحانی تجربہ تھا جس نے یقیناً میرے اور میرے دوستوں کے فکر و ذہن کو شدت سے متاثر کیا۔ شاید میں ان کہانیوں کو اب کبھی نہیں پڑھوں گا۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں مجھے مایوسی اور ڈس الیوژن (disillusion) کا سامنا نہ ہو۔ ماضی کے حسین سپنے اسی طرح درخشاں اور خوشنما رہنے چاہییں۔ موپاساں نے ایک بار کہا تھا کہ آدمی کو جوانی میں پڑھی ہوئی کتابیں دوبارہ نہ پڑھنی چاہییں، نہ ہی اپنے دوستوں کے پرانے خطوط۔ تاہم چند دن ہوئے، میں ریلیجس بک سوسائٹی کے سامنے پیومنٹ پر سیکنڈ ہینڈ کتابوں کو دیکھ رہا تھا۔ سیکنڈ ہینڈ کتابوں کو سونگھنا، ان کے ورق الٹنا، ان کو پرکھنا میرے لیے سب غموں اور دکھوں کا تریاق ہے۔ کیسے کیسے خزانے آدمی کو یہاں ملتے ہیں... میں نے ایک پھٹے ہوئے سرورق کی کتاب اٹھائی۔ یہ ''طلسم خیال'' تھی، اس کا پہلا ایڈیشن۔ ایک بار مجھے زبردست تحریک ہوئی کہ میں اسے خریدوں اور ان کہانیوں کو دوبارہ پڑھ کے دیکھوں کہ کیا پرانا طلسم ان میں اب بھی باقی ہے۔ پھر موپاساں کی نصیحت کو یاد کر کے میں تذبذب میں پڑ گیا۔ اتنے میں ایک اونچی پیشانی والے

کبڑے آدمی نے، جو میری طرح ان سیکنڈ ہینڈ کتابوں کی دکانوں پر اکثر منڈلاتا رہتا ہے اور غالباً کوئی کلرک ہے، اس کتاب کو آٹھ آنے میں خرید لیا اور مجھے اپنے ششو پنج سے نجات مل گئی۔ میں نے پھر احمد حسین صاحب کے رسالہ ''شبابِ اردو'' (جون ۱۹۱۲ء) کی بوسیدہ جلد خریدی، جس میں چکبست کا ایک مضمون تھا اور جس میں سب لکھنے والوں کے ناموں کے آگے القاب، ڈگریاں اور عہدے دیے ہوئے تھے۔ اس سے مجھے یاد آیا کہ شروع شروع میں کرشن چندر بھی 'کرشن چندر ایم اے' ہوتا تھا (''طلسمِ خیال'' از کرشن چندر ایم اے، ''شکست'' از کرشن چندر ایم اے)— پچیس سال پہلے ایم اے کی کچھ تھوڑی بہت وقعت تھی اور ایم اے ہونے سے آدمی کی قدر و قیمت میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ اچھے پرانے دن!

کرشن نے نہ صرف ایک حیران کن زرخیز دماغی سے کہانیاں لکھیں، اس نے مزاحیہ خاکے بھی لکھے اور کئی کتابوں کے دیباچے بھی۔ اس نے ن م راشد کی ''ماورا'' کا دیباچہ لکھا۔ ''ماورا'' ایک طرح سے جدید اردو شاعری کی پہلی کتاب تھی جس کی نظمیں ایک مدت تک 'کافی ہاؤس نقادوں' کا موضوع بحث بنی رہیں اور اب انھی کی رائے میں کچھ مضحکہ خیز دھوم دھام کی لفاظی لگتی ہیں۔ یہ دیباچہ ایک بناوٹ کی چیز تھا، اس قسم کی چیز جو فرمائش پر محض لکھنے کے لیے لکھی جاتی ہے۔ وہ لکھتا رہا۔ میری رائے میں ''زندگی کے موڑ پر'' میں اس کے فن نے اپنا سب سے اونچا مقام چھوا۔ پھر اس کا ناول ''شکست'' تھا جو یقیناً اردو کے عمدہ ناولوں میں سے ہے اور جس میں بڑے حسین اور جاندار ٹکڑے ہیں۔ اس میں اس نے اپنے محبوب کشمیر کے نظاروں کی ایسی بھڑکتی ہوئی تصویریں کھینچ دی ہیں کہ قاری ان کے رنگوں میں کھو جاتا ہے۔ اس نے کشمیر کو اپنا خطہ بنا لیا اسی طرح جیسے سیکس (Sussex) ہارڈی کا ہے، اور سونے سرخ یارک شائر مورز (Moors) برانٹے بہنوں کے۔ وادی کی جھیلوں، بہتے ہوئے جھرنوں، چیڑ سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں اور الھڑ گلابی رخساروں اور نرگسی آنکھوں والی دوشیزاؤں کو اس نے اپنے تخیل کے طلسم سے زندۂ جاوید کر دیا۔ اور صرف کشمیر ہی نہیں، جہلم بھی کرشن چندر کنٹری ہے۔ چند ماہ ہوئے، میں اپنے دوستوں اپی کیورس اور پیٹر کے ساتھ کار پر منگلا جا رہا تھا۔ جب ہم جہلم کے پل پر پہنچے تو ہمیں ایک طرفہ ٹریفک کی وجہ سے رکنا پڑا۔ دن ڈھل رہا تھا اور مغربی افق گلنار ہو رہا تھا۔ دریا ایک جھیل کی طرح فراخ اور ساکت جھلمل جھلمل کرتا تھا۔ اس کے پانی پر گلاب اور عنبر سے چھڑکے ہوئے تھے۔ بائیں

طرف پرے ٹلہ جوگیاں کی تکونی پہاڑی، جہاں ہیر کے فراق میں جوگی بننے اور اپنے کان چھدوانے گیا تھا، پانی میں سے ایک ترشے ہوئے نیلم کی طرح اُمڈی آئی تھی۔ اور ایک مچھیرے کی ناؤ چپ چاپ پانی اور افق کے درمیان لٹکی ہوئی تھی۔ ہمیں ''جہلم میں ناؤ پر'' یاد آ گئی۔ یہ کرشن چندر کا جہلم تھا۔ اسی طرح کاغان اور سوات کی وادیاں بھی کرشن چندر کنٹریز ہیں اور ان خطوں میں سفر کرتے ہوئے ہم اس کی ان پہلی کہانیوں کی بابت سوچے بغیر نہیں رہ سکتے — وہی گھراٹ، وہی چشمے، وہی ڈھکیاں، وہی وحشی آنگیاں۔

•

۳

پھر جادو رفتہ رفتہ پھیکا پڑنے لگا اور کرشن کی تحریروں کی آب و تاب مدھم ہونے لگی۔ یہ سارا اس کا قصور بھی نہ تھا — ہم جوانی کی جذباتی رومانیت سے نکل آئے تھے اور اب ہم ایک کہانی میں لفظی مصوری سے زیادہ اور بھی بہت کچھ کے طلبگار تھے۔ کرشن کی جذباتیت اور اس کی اپنے کرداروں کی امنگوں اور ارمانوں سے ذاتی اپنائیت (involvement) اب ہمیں کھلنے لگی... اور خود کرشن چندر کے افکار و نظریات میں بھی ایک عجیب تغیر آ گیا تھا۔

اپنے اس دور میں اس نے افسانوی پمفلٹ تو بے شمار لکھے مگر اصل کہانی ایک بھی نہیں۔ وہ پہلے کی طرح کے مہکتے ہوئے اسلوب میں لکھے ہوئے پمفلٹ تھے، افسانوی شکل میں اور کافی دلچسپی کے حامل۔ کرشن چندر، ہم سب اچھی طرح جانتے تھے، اچھائی، حسن اور سادگی کی طرف ہے، اور اسی لیے ہم اس سے محبت کرتے تھے۔ اس کے دل میں انسانیت کے لیے بے پناہ تڑپ تھی، ایک کلبلاتا ہوا درد، اور وہ کمینگی، خود غرضی، ظلم اور برائی کے خلاف تھا — مگر یہ پمفلٹ تبلیغی تھے۔ اس نے ایک نیا مذہب دریافت کر لیا تھا اور وہ کھلم کھلا نعرے بازی پر اتر آیا تھا۔ اب ایک اچھا فن کار کبھی غصیلے جنونی کا روپ نہیں دھارتا، اور کرشن ایک سرگرم اور پرجوش لیفٹنٹ بن گیا۔ اپنی بے حد اُچھالی ہوئی کہانی ''مہالکشمی کا پل'' میں اس نے ہم سے ایک متعصب، بازاری مبلّغ کے لہجے میں سوال کیا کہ آیا ہم مہالکشمی کے پل کے دائیں طرف تھے یا بائیں طرف۔ یہ اس جیسے تخلیقی مصنف کے لیے ایک بھونڈا سوال تھا، گو اُس وقت اس کی یہ کہانی ایک مخصوص طبقے میں ایک شاہکار کی حیثیت سے تسلیم کی گئی۔ ہمارے بہت سے لکھنے والے لیفٹنٹ ہو گئے — خواہ ذہنی یقین سے، خواہ دباؤ سے، خواہ فیشن کے طور پر۔ وہ ایک

Scanned with CamScanner

دوسرے کو کامریڈ کہتے اور ایک دوسرے کی تیسرے درجے کی بناوٹی کہانیوں اور نظموں کو آسمان پر چڑھاتے۔ اُن دنوں بہت سے شاہکار لکھے گئے جواب کسی کو یاد بھی نہیں۔ وہ لکھنے والے جنھوں نے پارٹی لائن میں گھٹنے سے انکار کر دیا اور اپنے فن کی انفرادیت سے چمٹے رہے، انھیں تنزل پسند اور قابلِ تعزیر مجرم قرار دیا گیا۔ جیسا کہ میرے دوست شفیق الرحمٰن نے اپنی ایک عمدہ پیروڈی میں لکھا، یہ ایک ''ریکٹ'' (racket) تھا۔ یہ لیفٹسٹ مصنف اپنے نئے دریافت کیے ہوئے مذہب کے حلقے میں بچوں کی طرح خوش تھے۔ وہ خلوص سے سوچتے تھے کہ وہ خدا کے چنے ہوئے ہیں اور انھیں روح کا منّ وسلویٰ مل گیا ہے۔

لیفٹسٹ اُن دنوں ہم سب تھے اور کئی ایک کو اشتراکیت انسان کے سب دکھوں اور غموں کا واحد حل معلوم ہوتی تھی۔ روسی انقلاب نے انسانیت کو ایک نیا وژن (vision)، انسانی برابری کا ایک نیا تصور دیا تھا۔ انسانی تاریخ میں یہ اشتراکی انقلاب کتنا پُرشوکت اور زلزلہ خیز تھا — ہزاروں برس کی غلامی اور جاگیریت کو بیخ وبُن سے ہلاتا ہوا۔ ایک چھوٹے سے، نوکیلی داڑھی اور گنبد نما سر والے آدمی نے دہقانوں اور مزدوروں کی خاطر خودسر زاروں سے ان کی وسیع قلمرو چھین لی تھی اور اس کے جانشین اسٹالن نے، جو ایک لوہار کا بیٹا تھا، ان کچلے ہوئے لوگوں کو معاشی آزادی دے دی تھی اور سب انسانوں کو اصل معنی میں بھائی بھائی بنا دیا تھا۔ 'سرخ فوج' صرف روسی دہقانوں اور مزدوروں کی فوج نہ تھی۔ یہ بہادر فوج، افسروں اور زریں فیتوں یا لشکر کشی کے کسی نشان وعلم کے بغیر، ساری دنیا کے مجبور اور راندے ہوئے لوگوں کی اپنی فوج تھی۔ (ان دنوں ہمارے کئی شاعروں نے مقدس باپ اور سرخ فوج کے گیت گائے اور راتوں رات عظیم بن گئے۔) یورپ اور ایشیا کے کتنے ہی انٹلکچوئل، مصنف اور شاعر اس نئے انقلابی وژن سے متاثر ہوئے — آرتھر کوئسلر سے مصنف، آڈن سے شاعر۔ زراعت کی اشتمالیت کے وقت ہم نے روس میں گھناؤنی بربریت اور عذاب دہی کی خبریں پڑھیں کہ کیسے ہزاروں لاکھوں آدمی بے گھر ہو کر سائبیریا میں جلاوطن کیے گئے یا گولی سے اڑا دیے گئے۔ ان خبروں نے ہمیں ڈس الیوژن ضرور کیا۔ گپھے دار مونچھوں والا، گٹھیلا، لوہار کا بیٹا زار سے کم بے درد اور سفاک نہ تھا۔ آرتھر کوئسلر نے اپنے ناول *Darkness at Noon* میں اشتراکیت کی ایک طاقتور نفسیاتی اناٹومی کی اور جارج آرویل نے ''نائنٹین ایٹی فور'' میں اس یوٹوپیا کی ایک خوفناک اور دل ہلا دینے والی تصویر کھینچی — لیڈر

کی اصل سائز سے دس گنا بڑی تصویریں دیواروں اور چوراہوں پر لگی ہوئی اور ان کے نیچے موٹے حروف میں یہ عبارت: ''بڑا بھائی تمھیں دیکھ رہا ہے''۔ پارٹی ورکرز کے ذاتی کمروں میں ٹیلی اسکرین جن میں سے ان کی سب حرکات وزارتِ محنت کے ہیڈ کوارٹرز میں نظر میں رکھی جاتی تھیں، گیلے بھربھرے عوامی سگریٹ، بے مسرت سیکس، ہر کوئی دوسرے سے خائف۔

جب ہم اپنے لیفٹسٹ دوستوں سے اس ناقابلِ یقین ظلم، اس فکر و خیال کی regimentation کا ذکر کرتے تو وہ ہمیں یقین دلاتے کہ یہ سب استعمار پسند پریس کا پروپیگنڈا ہے۔ بعض کف در دہاں اس استبداد کی سرگرمی سے طرفداری کرتے: ''یہ سب جلاوطنیاں اور قتل ضروری ہیں۔ ان سماج دشمنوں کی موجودگی میں اشتراکیت کو ہمیشہ خطرہ لاحق ہے۔ یہ ایک ضروری اور عبوری مرحلہ ہے۔'' جب ہم پوچھتے کہ اگر وہ خود یا ان کے قریبی لوگ اس عبوری مرحلے کا شکار بنیں تو وہ اسے کیسے پسند کریں گے، تو وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھتے۔ بہت سے انٹلکچوئل اور ادیب ایسے تھے جو اس لیے کمیونسٹ تھے کہ یہ ایک فیشن تھا۔ انھوں نے مارکس اور اینگلز کا ایک لفظ نہیں پڑھا تھا لیکن ان کے نام ان کے یوں وردِ زباں تھے جیسے وہ ان کے ساتھ اکٹھے سکول میں پڑھتے رہے ہوں۔

مجھے اپنا ایک دوست یاد ہے جو افسانے اور ناول لکھا کرتا تھا۔ وہ اپنے مسودے بریف کیس میں لیے الفنسٹن اسٹریٹ میں پھرتا تھا اور اگر اسے کوئی جاننے والا مل جاتا تو وہ اسے کسی اچھے ریستوراں میں لے جاتا اور اپنے ناول کے پہلے دو باب ایک خاص اختیار کیے ہوئے لہجے میں سناتا۔ (یہ ناول دو باب سے کبھی آگے نہ بڑھا اور مصنف کی ایجادی قوتیں یہاں پہنچ کر فزل آؤٹ ہو گئیں۔) یہ شخص اپنے طور طریقے میں قدرے زنانہ اور نخریلا، ایک مکمل ڈینڈی تھا۔ وہ بہترین سلائی کے سوٹ پہنتا اور اس کی قمیص کے اسٹڈ قیمتی ہوتے۔ وہ ہمیشہ اونچے ریستورانوں میں جاتا۔ اس کا ایک نوکر تھا جو اسے بوٹ پہناتا اور جس سے وہ نہایت سختی سے بولتا۔ یہ شخص خود کو کمیونسٹ کہتا تھا، انسانی برادری کی باتیں کرتا تھا اور استعماری نظام کو گالیاں دیتا تھا۔ ایک شام جب ہم سائیکل رکشا میں برنس گارڈن ایک دوست سے ملنے گئے تھے تو اس نے رکشا والے کو تیز نہ چلنے پر اتنا سخت سست کہا کہ میں سوچنے لگا، میرے دوست میں اصل انسانی احساسات ہیں ہی نہیں۔ ایک دفعہ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ خود کمیونسٹ کہتا ہے لیکن اس کا طور طریقہ، اس کے tastes، اس کی بود و باش، اس کے عقیدے کے بالکل منافی ہے۔ اس

پر وہ کٹ گیا اور مجھے اس طرح دیکھنے لگا جیسے میں ایک قابلِ رحم بے وقوف ہوں۔ اس نے مجھے مطلع کیا کہ میں اشتراکی تھیوری کو نہیں سمجھتا۔ کمیونزم میں کوئی ایسی بات نہیں جو تمھیں ٹھاٹھ سے رہنے سے روکے، بلکہ کمیونزم کا مقصد یہ ہے کہ سب آدمی اچھی زندگی گزاریں۔

کرشن چندر اور دوسروں کی اس عبوری دور کی اتنی مدح سرائی میرے لیے بے حد تکلیف دہ تھی۔ ایک اچھے فنکار میں ضعیف العقلی کا مظاہرہ افسوسناک تھا۔ کیا وہ یہ نہیں سمجھتا تھا کہ مطلق العنان حکومت اور طاقت اپنے استعمال کرنے والوں میں اسفل ترین جذبات اُبھارنے کا سبب بنتی ہے؟ بدھ اور یسوع سے لے کر کارل مارکس تک نے ایک بہتر، پاک اور ارفع انسانی زندگی کے خواب دیکھے؛ وہ خواب ابھی تک اتنے ہی دور ہیں جتنی آسمان کی دھنک۔

کرشن کی اپنے ان پمفلٹوں کے بارے میں رائے کافی اونچی تھی۔ جب اس لیفٹسٹ دور میں اس کے ایک دوست نے اس سے ایک خط میں شکایت کی کہ اس کی کہانیوں میں اب وہ لطف نہیں رہا، تو ایک سخت جلے بھنے ہوئے کرشن چندر نے ایک تلخ جوابی خط شائع کیا۔ یہ خط بڑا مشہور ہوا۔ مجھے اس کے ابتدائی الفاظ تھوڑے یاد ہیں۔ کرشن نے لکھا کہ تم ٹھیک کہتے ہو میرے دوست! میری کہانیوں میں اب وہ مزہ نہیں رہا جو شراب کے نشے، افیون کی چسکی اور امساک کی گولی میں ہے... میں اب بھی سمجھتا ہوں کرشن اپنے دوست پر خواہ مخواہ برس پڑا۔ اس نے ایک سچی بات کہی تھی۔ ایک ادیب کا کام لکھنا ہے، اپنے پڑھنے والوں کو مسرت اور آگہی کے چند لمحے مہیا کرنا، نہ کہ پرچار کرنا۔ ہم سب کو وہی کام کرنا چاہیے جس کے لیے ہم بنے ہیں۔ مصلح اور مبلغ کا روپ دھارنا ایک کہانی کہنے والے کا کام نہیں۔ کرشن کے جوابی خط سے کیا ہم یہ سمجھیں کہ وہ اپنے لیفٹسٹ دور سے پہلے کے لکھے ہوئے افسانوں اور ناولوں کو محض افیون کی چسکی اور امساک کی گولی کا درجہ دیتا ہے؟ نہیں نہیں، کرشن چندر! تم غلطی پر ہو۔ وہ کہانیاں جو تم نے جوانی کی حدت اور تازگیِ فکر سے لکھیں—— ''جہلم میں ناؤ پر''، ''آگہی''، ''زندگی کے موڑ پر'' اور ''کالو بھنگی'' جیسی کہانیاں—— وہی تمھیں زندہ رکھیں گی، انھی کی خاطر ہم تم سے محبت کرتے ہیں۔

(فنون، لاہور، اکتوبر ۱۹۶۵ء)

ایک آدمی، احمد شاہ نامی

احمد ندیم قاسمی کے بارے میں میں کیا جانتا ہوں؟ ایک انسان دوسرے انسان کے متعلق کیا کچھ جان سکتا ہے؟ ایک آدمی کا بہت تھوڑا روپ اس کے جاننے والوں، دوستوں اور عزیزوں کے مشاہدے کے لیے سامنے آتا ہے — صرف وہی حصہ جو خود ہمارے اندرونی وجود کے آئینے میں منعکس ہوتا ہے اور اسے زندگی کی شاہراہ پر ہمارے قریب لاتا ہے۔ باقی بہت بڑا حصہ — گراہم گرین کے الفاظ میں 'اندر کا آدمی' — اکثر ہم میں سے بیشتر کی نظروں سے اوجھل رہتا ہے۔ ایک بڑا ناول نگار دوستووسکی، طالسطائی یا ہمارا کہانی نویس منٹو شاید اس حصے کو اپنی عکسی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے، ہر کوئی نہیں۔ یہ کون جانے ایک انسانی دل کے اندر کون سی امنگیں، محرومیاں، خواہشیں پرورش پاتی ہیں؛ کون سے بھسم کرنے والے، ابتدائی جبلی جذبات واحساسات وہاں بستے ہیں۔ ہم سب یک رنگ نہیں، اور مختلف حالات اور موقعوں پر ہمارے کردار وافعال مختلف ہوتے ہیں۔ وہ چہرہ جو ایک عوامی لیڈر ہزاروں اور لاکھوں کے بے رُخ مجمعوں کے روبرو پیش کرتا ہے، وہ چہرہ نہیں جو اس کے جگری یار اور لنگوٹیے ذاتی مجلس میں دیکھتے ہیں، یا جسے اس کے گھر میں اس کی بیوی اور بچے جانتے ہیں۔ طالسطائی کی بیوی نے اس کے مرنے کے دس سال بعد غالباً میکسم گورکی سے کہا، "لیو کے ساتھ میرا ساتھ دس برس رہا، مگر میں اسے کبھی نہ سمجھ پائی۔" نپولین، دنیا کا فاتح، فرانس کی سپاہ کی آنکھ کا تارا، اپنی پہلی بیوی جوزیفائن بیوماروس کی نگاہوں میں ایک قدرے ڈھیٹ، مطلب پرست، باتونی شخص تھا جس کی باتیں اسے انتہائی بور کرتی تھیں۔ میں ایک دفعہ ایک بڑے قومی شاعر کے لڑکے سے، جو اس کی پہلی بیوی سے تھا، کراچی میں ملا۔ والرس کی مونچھوں والا، گٹھیلا، خوش باش شخص! اور جب میں نے اُس کے مشہور محترم باپ کی شاعری میں قومی اور ملی جذبے کی تعریف کی اور اتنے عالی مرتبہ باپ کا بیٹا ہونے پر اس کی تہنیت کی، تو اُس کی والرس مونچھوں کے پیچھے ایک طنزیہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "تم اس کی قومی عظمت کو سینے سے لگاؤ۔ وہ ایک بہت کم

ظرف، چھوٹا آدمی ہے، اور میں اس کا منھ تک دیکھنے کا روادار نہیں۔'' سعادت حسن منٹو ایک بڑا فیاض طبع، دمساز اور صحیح معنوں میں انسان دوست (humane) شخص تھا، جو دوسرے کا دکھ سن کر تلملا جاتا تھا۔ مگر بعض وقت اس کی بڑی، پیلی، اُبلتی آنکھیں جو انسانوں کی بے کسی اور تنہائی پر اشک بار رہتی تھیں، پتھر ہو جاتی تھیں اور وہ اپنے کمرے میں بجلی کے پنکھے کے نیچے بیٹھے آشناؤں اور مداحوں پر جھنجھلاہٹ میں اس قسم کے الفاظ کے ساتھ برس پڑتا تھا: ''جاؤ، اپنے اپنے گھروں کو جاؤ۔ نواب زادے صوفوں پر بجلی کے پنکھے کے نیچے ایسے مزے سے جمے ہیں جیسے اُن کا اپنا گھر ہے۔ اوئے تم لوگوں کو اپنے گھر میں یہ صوفے اور یہ پنکھے کی ٹھنڈی ہوا کہاں میسر! کچھ پتا ہے، مجھ کو تمھاری ناز برداری کے لیے بجلی کا کتنا بل دینا پڑتا ہے؟ وہ دو گے؟'' منٹو بے شک یہ سب کچھ ٹھیٹھ پنجابی میں کہتا اور ایک بدنصیب نے جس پر یہ واردات گزری تھی، مجھے خود یہ قصہ سنایا۔ اس نے مجھے یقین دلایا کہ یہ کلمے کہتے وقت منٹو کا لب ولہجہ قطعاً مزاح اور چھیڑ چھاڑ کا نہیں تھا، جیسا کہ خیال کیا جا سکتا ہے۔ اس کے طور میں اتنی تلخی، کمینگی اور بدتمیزی آ گئی تھی کہ اس کے بعد کسی بھلے مانس کے وہاں بیٹھے رہنے یا پھر اُدھر کا رخ کرنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ منٹو کو لوگوں نے مختلف رنگوں میں دیکھا ہے اور چونکہ اس نے بے باک، منھ پھٹ اور لگی لپٹی نہ رکھنے والی طبیعت پائی تھی، اس کے اندر کے آدمی کے احساسات کبھی کبھار اُبل پڑتے تھے اور اس کے ملنے والوں کو متحیر یا مجوب کر دیتے تھے۔ وہ اپنے یا دوسروں کے راز رکھنے میں یقین نہ رکھتا تھا اور میلے متعفن کپڑے کو برسرِ بازار دھونے میں اسے خاص لطف آتا تھا۔

اب ندیم، اس کے سب قریبی دوست جانتے ہیں، منٹو جیسے شوریدہ سر، ہردم مضطرب، بے حیا اور بوہیمین کرداروں میں سے نہیں۔ ندیم کے متعلق کبھی اوپر دیے ہوئے واقعے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ میں نہیں سمجھتا کہ اُس نے کبھی مغلظات بکی ہوں یا ملنے والوں کو کھڑے کھڑے گھر سے نکال باہر کیا ہو۔ اس کی گھریلو زندگی کا مجھے علم نہیں، مگر مجھے یقین ہے کہ وہ ایک محبت کرنے والا، متحمل مزاج شوہر ہے، اور اس نے کبھی غضبناک ہو کر گھر کے برتن نہیں توڑے۔ گو وہ ایک کہنہ اور بلا کا سگریٹ نوش ہے، اس نے کبھی شراب نہیں چکھی، اور بیئر یا وہسکی کا ذائقہ اس کے ہونٹوں کے لیے ناآشنا ہے۔ کتنی بڑی محرومی! لیکن ندیم اسے قطعاً محرومی نہیں جانتا، اور شراب نوشی کو 'سات فقہی گناہوں' میں سے ایک گردانتا ہے۔ اپنے ایامِ شباب میں محکمۂ ایکسائز کی دو سال کی ملازمت بھی اسے اس لاابالی، معصیانہ

راہ پر نہ لا سکی۔ ہم اس اخلاقی ضبط کے لیے اس کا احترام کر سکتے ہیں، یا خود مبتدی متوالے ہونے کی وجہ سے اس پر رحم کھا سکتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس نے ایک درویشانہ اور دیندارانہ ماحول میں آنکھیں کھولیں اور پرورش پائی اور اس کے بچپن کے اخلاقی ٹیبو اس کے خون میں رچ بس گئے ہیں۔ اس نے ان ٹیبوؤں اور تحریموں سے چھٹکارا پانے کے جتن بھی نہیں کیے، کیونکہ وہ اس کے لیے کڑے اخلاقی قوانین ہیں جن سے انحراف مذلت اور خواری ہے۔ میں سمجھتا ہوں ان اخلاقی تحریموں نے اس کی شخصیت کو کسی قدر گھونٹ کے رکھ دیا ہے۔ اس کی گفتگو پُر لطف، دل پذیر اور شگفتہ ہوتی ہے، مگر اس کے ہمراہ گفتگو کے راستے پر کچھ دیر چل کر تم ایک ایسے مکان پر آنکلتے ہو جس کا آہنی دروازہ اور دریچے بند ہیں، اور جس میں سوائے اس کے کوئی داخل نہیں ہو سکتا۔ اس بے ہوا اور اُجاڑ مکان میں وہ اکیلا رہتا ہے، اپنے غالب اخلاقی آسیبوں، پچھتاووں، نامرادیوں اور پشیمانیوں کے ساتھ! ندیم کے دو تین قریبی دوست ہیں، جن میں میں فخر سے خود کو بھی شمار کرتا ہوں، مگر میرا خیال ہے اس کا کوئی ایسا ہمراز نہیں جس کے سامنے اس کی اندرونی زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب ہو۔ اپنی تنومند، الھڑ جوانی میں اس نے ضرور کسی سرگیں آنکھوں والی دیہاتی 'روجی' سے تپتی محبت کی ہوگی، مگر اس کے دوست اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے اور وہ اس کا ذکر تک نہیں کرتا۔ یہ کہی نہ جانے والی بات ہے، قدرے شرمناک، 'ہش ہش' مخرب اخلاق قسم کی چیز! اگر ندیم نے کبھی اپنی آپ بیتی لکھی تو بلاشبہ وہ ایک بے حد دلچسپ صحیفہ ہوگی — اس عہد کی ادبی اور تاریخی شخصیات کے متعلق چمکتی دمکتی یادداشتوں سے بھری۔ ہاں اس میں ندیم کس حد تک موجود ہوگا، میں نہیں کہہ سکتا۔ برٹرینڈ رسل یا کسی حد تک غالب اپنی سوانحی تحریروں اور خطوں میں اپنے متعلق بے باکی سے، صفائی سے، سادگی سے سب کچھ بتا سکتے ہیں۔ رسل کو تو اُس پر جان دینے والی ایک حاملہ محبوبہ کو چھوڑ دینے کے بارے میں بتانے میں بھی جھجک نہیں ہوتی۔ غالب کی ستم پیشہ ڈومنی اور اُس کی پُرعیش بدمستی سب جانتے ہیں۔ ان انکشافات نے ان کے قد و قامت میں کوئی کمی نہیں کی، بلکہ ان کی وجہ سے کیا وہ ہم سب کے زیادہ قریب نہیں آجاتے؟ ندیم اخلاقی قدروں میں محصور، اور اپنے امیج پر آنچ نہ آنے دینے کے بارے میں محتاط، اپنے 'اندر کے آدمی' میں ہمیں جھانکنے نہیں دے گا۔ سچ بات ہے کہ اس میں ایک وکٹورین شرم و حیا (prudery) ہے اور بعض وقت میں سوچتا ہوں کہ میرا یہ پیارا دوست اپنے اخلاقی عقیدوں میں ایک بوڑھی کنواری خالہ ہے! یہ پروڈری ندیم کی طبیعت ہے اور اس

کے لیے اسے الزام دینا یا اس کی ادبی حیثیت سے انکار کرنا حماقت ہے۔ حال ہی میں نئی نسل کی ایک دلیر، باصلاحیت، ذہین وفطین شاعرہ نے ایک رسالے کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ چونکہ احمد ندیم قاسمی کے سامنے ہم جنسی کا ذکر کرنے سے اس کی بھنویں کھڑی ہو جاتی ہیں، اس لیے وہ بڑا شاعر نہیں ہو سکتا۔ میں سمجھتا ہوں یہ انوکھی منطق ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ بڑے انگریزی شاعر بائرن، شیلے، جان کیٹس یا براؤننگ ہم جنسی کے ذکر پر غیر آسودہ یا محجوب نہ ہوتے، اور اس کے باوجود کون اس سے انکار کر سکتا ہے کہ وہ بڑے شاعر ہیں۔ ایک بڑے انسان اور شاعر ہونے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ آزادہ رو، رواج کا باغی، اور منکرِ اخلاق ہو، یا ہم جنسی کے رموز وفوائد سے آگاہی رکھتا ہو۔ اگر ہماری شاعرہ ہم جنسی کا ذکر غالب یا میر کے سامنے کرتی تو وہ لاحول پڑھتے اور انھیں اپنے کانوں پر یقین نہ آتا۔ وہ اس خاتون کو باؤلی کہتے اور تعجب کرتے کہ لڑکیوں کو کیا ہو گیا ہے، ان کی حیا کیوں چلی گئی اور آسمان کیوں نہیں گر پڑتا؟ خود وارث شاہ جو یقیناً پروڈ نہیں تھا (ننگی جلتی ہوئی شاعری جو اس نے اپنی ''ہیر'' میں کی ہے!) ایک خاتون سے ہم جنسی کا ذکر سن کر اپنا سینہ پیٹ لیتا، اور قربِ قیامت کے مضمون میں چند بیت فی البدیہہ باندھتا — اور وہ چھوٹے شاعر نہ تھے۔ کیا یہ خاتون ایک نیو انٹلکچوئل کی حیثیت سے یہ کہنا چاہتی ہے کہ ای ای کمنگز اور دوسرے ماہرین جنسیات کی نظمیں جان کیٹس کی ''نائٹنگیل'' یا رابرٹ براؤننگ کی ''لاسٹ رائیڈ ٹو گیدر'' سے اعلیٰ تر اور بہتر شاعری ہیں؟ یا غالباً پرانی ۱۹۴۰ء سے پہلے کی شاعری اب مردہ شے ہے، اور نئی نسل کے لیے اس میں کوئی خوبصورتی، کوئی پیام نہیں؟ خاتون نے ندیم کے بڑے شاعر ہونے سے انکار کیا ہے، اور غالباً اس کو ندیم کے بڑا تخلیقی فن کار ہونے میں شک ہے، کیونکہ ندیم صرف ایک شاعر ہی نہیں بلکہ اردو زبان کا ایک اونچا افسانہ نگار بھی ہے۔ ہنری ملر اور بروز (Burroughs) بلاشبہ ہر قسم کی جنسی غلط روی (perversion) کے علم میں بڑے گنی اور سیانے ہیں اور ان کی سہ حرفی الفاظ کی وسیع پُرمغز لغت سنسناہٹ پیدا کرتی ہے، مگر ان کی ''ٹراپک آف کینسر'' اور ''نیکڈ لنچ'' اپنے سارے فن یا بافت سازی کے ساتھ ''کینسر وارڈ'' یا ''ٹن ڈرمز'' سے بڑے ناول نہیں ہیں۔ ڈی ایچ لارنس کا شروع کیا ہوا فیشن اب اپنی جدت کھونے کو ہے اور نوبوکوف کی ''لولیتا'' — ایک ادھیڑ عمر آدمی کی نوخیز چھوٹی لڑکیوں کے ساتھ جنسی کارگزاریوں کی کہانی — ایک اچھا ناول تھا اور اس نے اپنی اشاعت پر ایک سنسنی پیدا کر دی، مگر کم از کم ایک پڑھنے والے کے لیے ناول کے پہلے چند صفحات کے

Scanned with CamScanner

بعد آگے پڑھنا دشوار ہو گیا۔ اسے یہ ساری فن کاری انتہائی اُکتا دینے والی اور بھونڈی لگی، اگرچہ اس کے چند ایک گرمانے والے حصے اپنے اثر کے بغیر نہ تھے۔ کیا خاتون شاعرہ کے خیال میں ''لولیتا'' ایمیلی برونٹے کی ''وُدرنگ ہائیٹس'' سے بڑا ناول ہے؟ کیا ہم ان سب کتابوں سے محبت نہیں کرتے جو سادگی سے، خوبصورتی سے، ہمارے ساتھ اُن چیزوں کی باتیں کرتی ہیں جو ہمارے دلوں کے قریب ہیں؟ مجھ کو دو زانوؤں کے بیچ کے انسانی عضو کی افادیت تسلیم ہے، مگر بڑے ناول اس کی کارکردگیوں کی تفصیل کے بغیر بھی لکھے گئے ہیں، اور اس عضو کا خیال جس طرح ڈی ایچ لارنس پر مسلط تھا، وہ اکثر ایک بیمار اور مرض زدہ ذہن کی علامت ہوتا ہے۔ لارنس کی بیوی فریڈا نے اس کے مرنے کے بعد کسی سے کہا کہ لارنس نامردی کا شکار تھا اور جنسی فعل کا نا اہل! اور جس طرح ایک بھوکا آدمی بھوک مٹانے کا وسیلہ نہ رکھتے ہوئے روٹی کے سوا کسی چیز کا نہیں سوچ سکتا، لارنس ہمیشہ جنس کی پُر اسرار تاریک قوت کا راگ الاپتا رہتا تھا۔ (میں بحیثیت ایک ناول نگار اس کی عظمت سے انکار نہیں کر رہا!)

مگر اس خاتون شاعرہ کی بات میں صداقت کی ایک قلیل مقدار ضرور ہے۔ شاید وہ صرف یہ کہنا چاہتی تھی کہ ندیم پروڈ ہے۔ پروڈ وہ ضرور ہے اور ایک بار اس نے ''فنون'' میں راجندر سنگھ بیدی کی ایک شاہکار کہانی کو اس بنا پر نہ چھاپا کہ وہ بہت ننگی تھی اور اس میں پستانوں کا ذکر تھا۔ ندیم فی الواقع اپنی اخلاقی تحریمات کی حدود میں اس 'فحاشی' کو سمجھنے سے قاصر ہے اور نئی پود کے اس وادی میں آزادی سے کھل کھیلنے پر حیران! مگر پھر اردو کے کتنے ہی اچھے فن کار پروڈ ہیں —— غلام عباس پروڈ ہے، اور قرۃ العین حیدر ایک اتنی بڑی پروڈ کہ جھنجھلاہٹ ہونے لگتی ہے۔ ہم ایک تخلیقی فن کار سے صرف اس بنا پر نہیں جھگڑ سکتے کہ اس کے کردار، مردانہ اور زنانہ، کبھی ایک دوسرے کے ساتھ نہیں سوتے۔ ہم جنسی کے ذکر پر ندیم کی بھنویں کھڑی ہو گئیں! کس ندیم کی؟ ہو سکتا ہے اندر والے سمندر سے گہرے ندیم کا ردِ عمل کچھ اور ہو —— زیادہ فطری اور سچا!

ہاں، میں احمد ندیم قاسمی کے متعلق کیا جانتا ہوں؟ شاید بہت کم۔ شاید اتنا جتنا ایک دوست کو جاننے کا حق ہے۔ ہر انسان اپنی ذات میں ایک جزیرہ ہے اور محبت ہی دو انسانوں کو ایک دوسرے سے ملانے کا واحد پل ہے۔ میں احمد ندیم قاسمی سے اُس وقت سے محبت کرتا ہوں جب قسمتوں نے ہمیں پینتیس چھتیس برس پہلے صادق ایجرٹن کالج بہاولپور کے ایوانوں میں اکٹھا لا پھینکا۔ میں فرسٹ ایئر کا

طالب علم تھا، وہ تھرڈ ایئر کا۔ مگر خوش قسمتی سے ہم ایک ہی پروفیسر کے گروپ موسوم بہ 'سولجرز' میں شامل تھے۔ 'سولجرز' کے اجلاس ہر ہفتے ہمارے پروفیسر کی صدارت میں ہوتے تھے۔ ہائی اسکول ہی سے مجھے رائیڈر ہیگرڈ، فینی مور کوپر اور رابرٹ لوئی اسٹیونسن کے مہماتی ناول پڑھنے کی لت پڑ گئی تھی اور میں اُن کے طرز میں انگریزی میں جنگلی آدمیوں اور بحری قزاقوں کی کہانیاں لکھتا رہتا تھا۔ میں اپنے ذہن کی ایک عجیب خیالی دنیا میں گم صم رہتا تھا، مکمل طور پر مگن! اُن میں سے چند کہانیاں میں نے 'سولجرز' میں پڑھیں، جن پر مجھے کافی داد ملی ـــ اگرچہ گروپ کے چند لوگوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں نے اُن کو کہاں سے نقل کیا ہے۔ ندیم، جو اُس وقت احمد شاہ ندیم تھا، 'سولجرز' کے اجلاسوں میں اپنی نئی نئی نظمیں سنایا کرتا۔ ان نظموں میں ایک نئی نغمگی، تازگی اور اُجلاپن ہوتا تھا اور ہم ان کے جادو تلے آ گئے تھے۔ یہ گٹھے جثے کا، فراخ رو دیہاتی نوجوان ایک فطری شاعر تھا اور اس وقت بھی ہم اس سے مستقبل میں بڑی چیزوں کی توقع رکھتے تھے اور ہمیں یقین تھا کہ وہ جلد ہی شعر و ادب کی دنیا میں اپنا مقام حاصل کرے گا۔ وہ اپنے پروفیسر کا چہیتا طالب علم تھا، اور فورتھ ایئر میں آکر 'سولجرز' گروپ کا سیکرٹری بن گیا تھا اور کالج میگزین ''نخلستان'' کے اردو حصے کا ایڈیٹر بھی! ادب سے ہمارا سانجھا شغف رفتہ رفتہ ہمیں ایک دوسرے کے قریب لے آیا اور جلد ہی ایک ایسی گہری جذباتی اور دلی وابستگی کی بنیاد بن گیا جو اوائل جوانی میں ہی ممکن ہے اور زندگی کی حسین ترین چیزوں میں سے ایک ہے۔ تقریباً ہر شام کو میں ندیم کے ہوسٹل کے مانیٹر والے بالائی کمرے میں ہوتا۔ وہ مجھے اپنی اُس روز کی نظم سناتا، اور میں کبھی کبھار اسے اپنی لکھی ہوئی کسی مہماتی کہانی کا حصہ سناتا۔ اُن دنوں میں بڑا ہو کر اسٹیونسن کی طرح لڑکوں کے لیے مہماتی ناول لکھنے کی امنگ رکھتا تھا۔ (میں فوری طور پر ایک بحری قزاق بھی بننا چاہتا تھا، مگر اس خواہش کی تکمیل میں کئی ایک دقتیں حائل تھیں۔) آہ اوائلِ جوانی کے سنہری سپنے! یہ شاذ و نادر ہی پورے ہوتے ہیں، لیکن زندگی کی روکھی پھیکی، اُکتا دینے والی وادی میں اُن کی دمک مرتے دم تک انسان کے ساتھ رہتی ہے۔

میں اپنے اوائل جوانی کے ان ایام کی یادوں میں زیادہ دیر اٹکنا چاہتا ہوں، مگر ندیم نے ''جلال و جمال'' کے طویل دیباچے میں ان ڈھالنے والے (formative) دنوں کی اتنی کہانی پہلے ہی لکھ دی ہے جتنی وہ بتانا مناسب سمجھتا تھا۔ اس کی صلاحیتوں کا رخ مختصر افسانے کی طرف موڑنے میں غالباً میرا بھی تھوڑا بہت ہاتھ ہے۔ میرے اُکسانے پر ندیم نے رائیڈر ہیگرڈ کے طرز میں ایک لمبے مہماتی ناول کا

آغاز کیا۔ اس نے اس کے اسی یا نوے صفحات لکھ لیے اور مجھے پڑھنے کے لیے دیے۔ اور پھر اس نے ہمت ہار دی — یہ اس کا genre نہیں تھا۔ وہ پنجاب کے دیہات کے اصلی لوگوں کی اصلی جیتی جاگتی کہانیاں لکھنا چاہتا تھا۔ بحری قزاق اور جنگلی آدمی اس کی طبیعت کو راس نہ آئے۔ میں نے اسے مختصر افسانے لکھنے کا حوصلہ دلایا اور جلد ہی وہ اس کام میں جٹ گیا۔ کئی دفعہ شام کو گھر سے کالج گراؤنڈ آتے ہوے میں اُسے گھاس پر لیٹے یا کسی بنچ پر بیٹھے اپنا افسانہ لکھنے میں منہمک پاتا۔ پہلی ہی کہانی شاید اختر شیرانی کے رسالے ''رومان'' میں اشاعت کے لیے قبول کر لی گئی جس سے اس کی ہمت بندھی اور اس نے چند ایک اور کہانیاں لکھیں۔ (ان میں سے بعض کہانیاں بعد میں اس کے پہلے مجموعے ''چوپال'' میں اشاعت پذیر ہوئیں۔) اس طرح شاعر کے علاوہ وہ افسانہ نگار بھی بن گیا۔ ان دونوں اصناف سے وہ اُن دنوں آسانی اور آسودگی کے ساتھ نپٹ لیتا تھا اور کالج سے فراغت کے بعد اس نے اپنے فن افسانہ نگاری میں کمال حاصل کرنے کے لیے کئی سال بڑی ریاضت کی۔ اس کی مشہور اور بڑی کہانیاں کئی سال بعد کی پیداوار ہیں، مگر بہاول پور کالج کے وہ دو سال وہ عرصہ تھا جب اس کے ادبی ذوق کی کونپلیں نکلیں، اور مستقبل کا شاعر اور افسانہ نگار پیدا ہوا۔

کالج سے فراغت کے بعد ندیم بہاول پور سے چلا گیا اور وہ پُر اذیت اور کرب ناک مہینے جو اس نے لاہور میں ڈگری ہاتھ میں لیے کسی چھوٹی سی ملازمت کی تلاش میں جوتیاں چٹخاتے گزارے، ان کی تلخی اور ہولناکی وہ ابھی تک نہیں بھول سکا۔ جس دفتر میں وہ جاتا 'کوئی اسامی خالی نہیں' کی تختی اس کا خیر مقدم کرتی۔ باہر کی دنیا کی نامہربانی اور بے دردی نے اس خام دہقانی نوجوان کے حساس دل کو بری طرح مجروح کیا اور کئی بار اس نے خودکشی کرنے کی ٹھانی۔ اپنی بوڑھی ماں کی محبت اور اپنے ستارے میں ایمان نے اسے یہ انتہائی قدم اٹھانے سے روکا۔ بہت سے دن اس نے بغیر کچھ کھائے پیے گزارے۔ کئی راتیں لاہور کے گلی کوچوں میں چلتے چلتے کاٹیں۔ اس سارے عرصے میں ہم ایک دوسرے سے مستقل خط و کتابت کرتے رہے۔ اس کے خط شدید جذبات سے بھاری، لبریز اور لمبے ہوتے تھے — اس کی تلخ کامیوں، امنگوں اور ہماری دوستی کی تابانی اور عظمت کے مضمون سے بھرے ہوے۔ وہ اکثر میرے پاس بیرنگ آتے تھے، کیونکہ ڈاک کے عام لفافے کا ٹکٹ اتنے فراواں مواد کی ترسیل کے لیے کفایت نہیں کرتا تھا۔ ہر خط میں وہ اپنی بوڑھی ماں کا ذکر ضرور کرتا جس کی کوکھ نے اسے جنا تھا اور جو اس

Scanned with CamScanner

کے نزدیک ساری دنیا کی عظیم ترین عورت تھی۔ ندیم اپنی ماں کو حقیقتاً پوجتا تھا۔ اس کی دل جوئی کی خاطر، اس خاطر کہ وہ اپنے بیٹے کے کارناموں پر غرور کر سکے، وہ ادب کے آسمان پر اپنا نام درخشاں سونے کے حروف میں رقم کرنے کے لیے تڑپتا۔ میں ندیم کو پنسل سے لمبے خطوں کے ذریعے جواب دیتا (اُن دنوں میں ہمیشہ پنسل سے لکھا کرتا تھا)۔ وہ عموماً نوجوانی کے لاأبالیانہ ناسٹیلجیا، کھلے سمندروں، بادبانی جہازوں اور بحری قزاقوں کی باتوں سے معمور ہوتے تھے۔ (میں نے بحری قزاق بننے کا مصمم ارادہ کر رکھا تھا اور یہ یقین رکھتا تھا کہ اس کے علاوہ کوئی اور کیریئر مجھے راس نہیں آ سکتا۔) نوخیز جوانی کی متوالی خود پرستی اور کھری خود غرضی میں ندیم کی دکھوں اور اذیتوں کی داستان مجھے ضروری حد تک دل گرفتہ نہ کرتی، اور میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کے لمبے پُر درد خطوط پڑھنے کے بعد میں خون کے آنسو روتا تھا۔ خودنگر اور خود رحمی سے مغلوب نوجوانوں نے اکثر ایسے ناسٹیلجک خطوط ایک دوسرے کو لکھے ہیں۔ ندیم کے چند خط میرے باپ کے ہاتھ آ لگے۔ وہ گھر کے پتے پر بھیجے جاتے تھے اور میرا باپ تجسس کی وجہ سے انھیں کھول کر پڑھنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا تھا۔ مجھے یاد ہے ایک خط اُس نے سارے کنبے کے سامنے چٹخارے لے لے کر اور کٹیلی طنزیہ رائے زنی کے ساتھ پڑھا۔ (میں غصے اور شرم سے کانوں کی لوؤں تک سرخ تھا!) اُسے پڑھنے کے بعد اور نوجوانی کی پُر جوش جذباتیت پر کٹ کٹ کرتے ہوئے اس نے اس خط کے ورق میری طرف ان الفاظ کے ساتھ پھینکے، ''کون ہے تمھارا یہ دوست؟ کیا تم سمجھتے ہو اس کی دماغی حالت درست ہے؟ میرے خیال میں وہ سراسر پاگل ہے۔'' میں تعجب کرتا ہوں کہ اگر میرا باپ ندیم کے نام لکھا ہوا میرا کوئی خط پڑھ لیتا تو اپنے بیٹے کے متعلق وہ کیا رائے قائم کرتا! میری بحری قزاق بننے کی پُر جوش امنگ اس اچھے آدمی کو روئیں روئیں تک ہلا دیتی۔ وہ مجھے آئی سی ایس کے مقابلے کے امتحان میں بٹھانا چاہتا تھا۔ وہ ایک میٹر آف فیکٹ قسم کا، دنیادار، سمجھدار آدمی تھا — ایک ہردل عزیز، محنتی اور قابل ریونیو آفیسر۔ اس کی شخصیت میں مقناطیسیت تھی، گفتگو میں چمک، اور لوگ، چھوٹے بڑے، اس کی طرف کھنچے چلے آتے تھے اور مجھے شک ہے کہ اپنی دنیوی کامیابی، خوش لباسی اور دینی قیاس آرائیوں کے باوجود اپنے اندرونی وجود میں وہ شاعری کی رمق کے بغیر نہیں تھا، کیونکہ اس کی میز کی دراز میں اولیور گولڈ اسمتھ کی ''وِکر آف ویکفیلڈ'' کا ایک دبیز، سنہری حاشیے کا نسخہ موجود رہتا تھا۔ وہ اکثر اس کتاب کو بڑی مسرت سے پڑھتا اور ہمیشہ مجھے اس کتاب کو پڑھنے کی تاکید کرتا۔ شاید اصل اندرونی

Scanned with CamScanner

آدمی ویکفیلڈ کے پادری کی طرح سادہ لوح، سادہ دل اور بے غرض تھا اور ظاہر ملازمت کی مصروفیتوں اور ماحول کا چڑھا ہوا ملمع تھا۔ (عجیب طور سے، اقبال نے اسے کبھی اپیل نہ کیا، اور میں نے اسے کبھی اقبال کا کلام پڑھتے نہیں دیکھا۔ افرنگی قالین اور صوفوں پر اعتراض، پہاڑوں میں بسیرا کرنے کی تلقین اس کے لیے ناقابل فہم تھی — صاف پاگل پن!) وہ میری مصنف بننے کی کوششوں پر دانت پیستا اور ناراضگی کا اظہار کرتا۔ ادب سے میرا انہماک اس کے نزدیک وقت کا ضیاع تھا۔ اس کی جگہ بھلا میں آئی سی ایس کے مقابلے کے امتحان کی تیاری کیوں نہیں کرتا تھا؟ اب میں کبھی کبھار اپنے آپ سے پوچھتا ہوں، کیا میرا باپ صحیح نہیں تھا؟ کیونکہ برسوں کی خوش فہمی اور جگر سوزی اور جانکاہی کے بعد میں اس حقیقت کو جان گیا ہوں کہ میں ایک غیر اصلی، فرضی چیز ہوں، کہ ایک تخلیقی مصنف بننے کے قدرتی جوہر دیوتاؤں نے مجھے ودیعت نہیں کیے، کہ میں احمقانہ اور بے فائدہ طور پر ایک سراب کا پیچھا کرتا رہا ہوں۔ میں کبھی اسٹیونسن کی ''ویئر آف ہرمسٹن'' اور ''ماسٹر آف بیلنٹرے'' جیسی کتابیں نہیں لکھ سکتا یا چھپوا سکتا! اگر میں اپنے باپ کی نصیحت پر عمل کرتا تو شاید زندگی کے کسی اور میدان میں اپنی ہستی کی تکمیل اور آسودہ خاطری اور خوشی پا لیتا۔ مگر اب اپنے خول سے برآمد ہونا میرے لیے ناممکن ہو گیا ہے۔ افسوس، اب وقت گزر چکا!

اس بے ربط غیر متعلق انحراف کے لیے مجھے معاف کرو، مگر ندیم پر یہ مضمون ان دو دوستوں کی کہانی بھی ہے جو جواں سالی کی امنگوں اور سنہری سپنوں سے مخمور، ہاتھ میں ہاتھ ڈالے، ادب وسخن کی وادی میں ظفر و فتح یابی کے جھنڈے گاڑنے نکلے۔ ان میں سے ایک قدرتی شاعر اور کہانیاں کہنے والا تھا اور اپنی منزل پانے میں کامیاب ہوا، دوسرا بناوٹی (fake) تھا اور راہ میں تھک ہار کر رہ گیا، مگر اس کا کیا؟ دو دوستوں میں سے ایک نے کامرانی پائی تو کیا یہ دوسرے دوست کی بھی کامرانی نہیں تھی؟ کیا دوسرے دوست نے بھی اس پُر تکان رہ نوردی میں خوش آواز دیویوں کے اُلوہی نغمے نہیں سنے؟

ہماری لگاتار خط و کتابت تقریباً ایک سال تک جوش و خروش سے جاری رہی۔ کاش میں نے ندیم کے اس زمانے کے کچھ خطوط سنبھال کر رکھے ہوتے! وہ اب میرے پاس نہیں۔ ندیم نے میرے کچھ خطوط بحفاظت رکھے، اور جب اس کی پہلی کہانیوں کی کتاب ''چوپال'' دارالاشاعت پنجاب کے مطبع خانے سے چھپی تو ان خطوط کے کچھ ٹکڑے کتاب کے میرے نام انتساب میں درج تھے۔ ''چوپال'' میں

ندیم کے ابتدائی زمانے کی کہانیاں ہیں اور یہ کتاب غالباً اب بازار میں نہیں ملتی۔ یہ خط و کتابت ایک سال بعد کچھ کم ہونے لگی۔ ہم دونوں اس نوحہ خوانی سے کچھ اُکتا گئے اور دوسری دلچسپیوں اور مشغلوں نے ہماری توجہ اپنی جانب کھینچ لی۔ بالآخر یہ تقریباً ختم ہی ہوگئی۔ وہ کیسا زمانہ تھا! میں ندیم کے متعلق نہیں کہہ سکتا لیکن خط لکھنا اب میرے لیے ایک مشکل، کٹھن اور اُکتا دینے والا مرحلہ بن کر رہ گیا ہے۔

لاہور میں اس بے کاری اور مایوسی میں ندیم کو بالآخر ایک سہارا ملا، ایک دوست جس نے اپنی شفقت کے پروں میں لے لیا اور جس کے پاس وہ اپنے غم واندوہ کا تریاق ڈھونڈنے کے لیے جانے لگا۔ یہ اختر شیرانی، تپتے جذبات اور ایروس (Eros) کا شاعر تھا۔ دو بالکل مختلف رنگ ڈھنگ کے آدمی ایک دوسرے کے قریب کیونکر آ گئے، مجھے بڑا عجیب لگتا ہے۔ اختر شیرانی اسکاٹ شاعر رابرٹ برنز کی طرح ایک شرابی اور عیاش تھا— مکمل آزاد مشرب اور دائمی رنگیلا عاشق! ندیم تب کالج سے نکلا ہوا ایک خام، صالح نوجوان شاعر تھا جس کے لیے اپنے سے پندرہ سال بڑے شاعر کی اخلاقیات یقیناً بے حد کریہہ اور نفرت انگیز ہونی چاہیے تھیں۔ اختر شیرانی ان دنوں ایک ماہانہ رسالہ ''رومان'' نکالتا تھا اور ندیم کی کچھ چیزیں، نظمیں اور کہانیاں، ''رومان'' میں چھپیں۔ پنجابی برنز اپنے رند ہونے کے باوجود ایک فن کار تھا۔ اس نے اپنے نوجوان قلم کار کا جوہر بھانپتے ہوئے اس کا حوصلہ بڑھایا اور اسے اپنے پاس آنے جانے کی اجازت دی۔ مجھے یاد ہے ندیم نے مجھے اپنے ایک خط میں لکھا، ''تم لاہور آؤ گے تو میں تمھیں اختر شیرانی سے ملاؤں گا۔ اس جیسا پیارا آدمی میں نے اور کوئی نہیں دیکھا۔'' معلوم ہوتا ہے اختر شیرانی ایک بڑا فراخ دل شخص تھا اور دردمندی اور انسانی محبت کے جذبات اس میں کوٹ کوٹ کر بھرے تھے۔ ندیم کو کئی بار اختر کے گھر پناہ ملی۔ اختر کے اپنے وسائل محدود تھے، مگر اس نے کئی بار ندیم کو اپنے ہاں زبردستی کھانا کھلایا اور ایک دو بار اسے کچھ رقم دینے کی بھی کوشش کی۔ میرا خیال ہے ایک وقت ان کے تعلقات کافی گہرے تھے اور ندیم اپنا بہت سا وقت شرابی اور عیاش مزاج شاعر کی صحبت میں گزارتا تھا۔ اختر شیرانی کے لیے بڑی محبت اور قدر کے باوجود ندیم نے خود کو پنجابی برنز کے رنگ میں نہ رنگنے دیا، یا جیسا کہ ندیم کہے گا، اس کا دامن معصیت سے آلودہ نہ ہوا اور اس کی جوانی بے داغ رہی۔ اس نے اپنے ہر قسم کے اخلاق سے آزاد مربی کے ساتھ ہم نوشی سے اجتناب کیا اور نہ اس کی ہمرہی میں سلماؤں کے شکار کو نکلا— وراثت کے اخلاقی ٹیبوز بہت سخت تھے۔

Scanned with CamScanner

انھی دنوں ندیم نے ایک خط میں اس خواہش کا اظہار کیا کہ 'نور الٰہی محمد عمر' کی طرح ہماری چیزیں دونوں کے مرکب نام 'ندیم خالد' کے نام سے چھپیں۔ میں اس میں متامل تھا اور میں نے اس تجویز سے اتفاق نہ کیا، جس کا میرے خیال میں ندیم نے قدرے برا مانا۔ مگر میرے پاس اپنی وجوہ تھیں۔ میں حقیقتاً اپنا نام چھاپے میں دیکھنا چاہتا تھا، ادبی فلک پر جگمگانا چاہتا تھا، مگر اپنے دوست کی نگارش کے کریڈٹ میں مجھے شریک ہونے میں عذر تھا اور ندیم کی نظموں اور کہانیوں پر اپنا نام دیکھ کر میری انا کو کوئی تسکین نہیں ہو سکتی تھی۔ اپنے نام کو چھپا ہوا دیکھنے کا آسان طریقہ یہ ضرور تھا مگر میں ادھار مانگے ہوئے کلاہ اور چغے میں ادب کی دنیا میں نہیں گھسنا چاہتا تھا، اور سانجھی سارنگ نوازی مجھے پسندیدہ نہ لگی۔ ہم کبھی اچھے ہم کار (collaborator) نہ ثابت ہوتے اور ہماری دوستی اس تجربے سے صحیح سلامت بچ کر نہ نکل پاتی۔ میں نہیں جانتا کہ نور الٰہی اور محمد عمر کے باہمی تعلقات کیسے تھے اور اُن میں سے ایک، دوسرے کے بارے میں کیسے خیالات رکھتا تھا۔ یہ ممکن ہے کہ ہم کاری کے چند سالوں کے بعد نور الٰہی محمد عمر کی صورت سے سخت بیزار ہو گیا ہو اور محمد عمر نور الٰہی کو سامنے آتا دیکھ کر پاس کی کسی گلی میں ڈبکی لگا جاتا ہو۔ جذباتیت ہمیشہ احمد ندیم قاسمی میں رچی بسی رہی ہے۔

وہ ادبی حلقوں میں جلد ہی جانا پہچانا ہو گیا۔ اس کی شاعری میں ایک سادگی، نغمگی اور معصومیت تھی جو ہر ایک کو بھا گئی۔ اس کی کئی غزلیں، سیاسی نظمیں ''انقلاب'' میں چھپیں اور ان میں سے ایک، جو کافی اچھی اور زوردار تھی، اس نے 'سولجرز' کی میٹنگ میں پڑھ کر سنائی۔ اختر شیرانی کے بعد مولانا عبدالمجید سالک نے جواں سال شاعر کو اخلاقی اور مالی سنبھالا دیا۔ سالک نیاز مندانِ لاہور کے حلقے کا روح رواں، انقلاب میں ناقابل تقلید، نکھری نثر میں ''افکار و حوادث'' کا راقم، ادبی اور سیاسی حلقوں میں بارسوخ تھا۔ اس کی دلچسپ، شگفتہ، چٹکلوں سے بھری گفتگو نے ندیم کو گرویدہ کر لیا، اور ندیم نے بھی اس کے دل میں جگہ پیدا کر لی۔ عمروں کے تفاوت کی وجہ سے ندیم نے ہمیشہ اپنے تعلقات میں حفظِ مراتب کو ملحوظ رکھا۔ مولانا عبدالمجید سالک کے توسط سے وہ 'نیاز مندانِ لاہور' کے گروپ کے مشاہیر اور دوسرے ادبی لوگوں سے متعارف ہوا۔ دارالاشاعت پنجاب کے امتیاز علی تاج کو اپنے بچوں کے ہفتہ وار رسالے ''پھول'' کے لیے ایک اچھے مدیر کی جستجو تھی۔ سالک کا امتیاز علی تاج سے بڑا یارانہ تھا، اور جیسا کہ جاننے والے جانتے ہیں (اور یہ کہنا بے رحمی نہیں) تاج کی مشہور تمثیل ''انارکلی'' کی نگارش کو سنوارنے، اس کے

Scanned with CamScanner

اسلوب کو نکھارنے میں سالک اور پطرس نے بڑی کاوش کی تھی — کیونکہ ''چچا چھکن'' کا مصنف بھی اور یجنل ادیب نہیں تھا۔ سالک نے تاج سے ''پھول'' کی ادارت کے لیے ندیم کی سفارش کی، بلکہ ندیم کو اپنے دوست کے حوالے کر دیا۔ اس طرح یہ دیہاتی خام نوجوان ساٹھ روپے ماہوار پر ''پھول'' کا مدیر تعینات ہوا۔ دارالاشاعت پنجاب کا اصل مہتمم اور منصرم تاج کا بڑا بھائی سیّد حمید علی ایک مزاج دار، سخت گیر شخص تھا، ناک بہنے کی مستقل بیماری کی وجہ سے چڑچڑا اور بے حوصلہ۔ ندیم نے ''پھول'' کو بچوں کا ایک اوّل درجے کا پرچہ بنانے میں بھرپور محنت کی۔ لیکن وہ سیّد حمید علی کا تنخواہ دار ملازم تھا، اور اس ادارت میں اُسے خوشی حاصل نہ ہوئی۔ وہ اس ملازمت سے چمٹا رہا، کیونکہ روح اور جسم کا رشتہ قائم رکھنے کے لیے دو وقت کی روٹی ضروری تھی۔ سالک، جو ندیم سے اپنے بیٹے کی سی محبت کرتا تھا، اس کی دل جوئی کے لیے اکثر وہاں آنکلتا، اُس کی غمی اور اداسی کو بھانپ کر ہنسی مذاق کی باتیں کرتا اور پھر کسی نہ کسی حیلے سے حمید علی سے اجازت لے کر اسے کسی ہوٹل میں کباب کھلانے لے جاتا۔ ''پھول'' میں ندیم نے بچوں کی کتنی ہی اچھی نظمیں لکھیں۔ سالک کے کہنے پر ندیم نے اپنی کہانیاں کتاب کی صورت میں طباعت کے لیے جمع کیں، اور سیّد حمید علی اس کے جملہ حقوق دو سو روپے میں خریدنے پر راضی کیے گئے، اور اس کی پہلی کتاب موسوم بہ ''چوپال'' دارالاشاعت پنجاب کے مطبع سے شائع ہوئی۔ ایک مصنف کی پہلی کتاب اس کے لیے ایک بڑا ناقابلِ یقین واقعہ ہوتی ہے اور بعد کی زندگی میں کوئی مسرت، اس پہلی کتاب کی مسرت کی طرح تاباں نہیں ہو پاتی۔ ایک دبیز، مجلد کتاب کی پیشانی پر اپنا نام دیکھ کر خوشی اور غرور سے وہ کچھ دن ہوا میں اُڑا ہوگا۔ ''چوپال'' میرے نام منسوب تھی اور اس نے اس کی ایک جلد مجھے بھی بھیجی۔ میں اس کی خوشی میں برابر کا شریک ہوا۔ میں اپنے دوست کی کتاب کو چھپا ہوا پا کر اتنا خوش تھا جیسے یہ کتاب خود میں نے لکھی ہو۔ کافی عرصہ میں ''چوپال'' کو اپنے سرہانے تلے رکھ کر سوتا رہا۔

اُن دنوں میں ہی ندیم کی ایک اور کتاب ایک ہندو مہاشے کے نام سے چھپی۔ میں نے وہ کتاب نہیں دیکھی اور میں نہیں سمجھتا کہ اس کا نسخہ اب بازار میں کہیں موجود ہے۔ یہ رسولِ اکرم کی سوانح تھی اور مہاشے جی نے اس کے لکھنے کا ندیم کو تین سو روپے معاوضہ دیا، اور پھر کتاب کو اپنے نام سے شائع کر دیا۔ یہ غالباً ڈھائی تین سو صفحات کی پورے سائز کی کتاب تھی، ندیم کی تین چار ماہ کی جانکاہی کا نتیجہ۔ یہ ایک نادار فاقہ کش مصنف کے استحصال کی ایک دلچسپ مثال تھی — اور یہ غالباً واحد مثال

نہیں! ندیم اب شاذ ہی اس کا ذکر کرتا ہے۔ مہاشے جی کی چال بازی اور کتاب کا ضیاع اسے بھول چکا ہے۔ اس کتاب میں غالباً کوئی ادبی خوبی نہ تھی۔

وہ دارالاشاعت پنجاب سے قریب قریب ایک سال منسلک رہا اور پھر اپنے ایک رشتہ دار میجر کی معاونت سے محکمۂ ایکسائز میں سب انسپکٹر جا لگا۔ اس ملازمت کے فرائض اس کی فطرت کے بالکل منافی تھے اور اس نے خود کو پانی سے باہر آئی ہوئی مچھلی کی طرح محسوس کیا ہوگا۔ اسے کئی بار ایسے کام کرنا پڑے جو وہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ یقینی ہے کہ ایکسائز کے محکمے میں ایسا سیدھا سادا، مکر و حیلہ سے عاری، رقیق القلب عہدے دار کبھی بھرتی نہیں ہوا ہوگا۔ پھر بھی میرا قیاس ہے کہ اس کی زندگی کا وہ ایکسائز انسپکٹری کا عرصہ نسبتاً خوشی اور خاطر جمعی کا دور تھا — ایک اچھی آرام دہ فراغت کی سرکاری ملازمت، معاش کی طرف سے اطمینان، خوش باش بے فکرے دوستوں کی صحبت — زندگی بری نہیں تھی! اسے قمار بازوں، شرابیوں، چرس پینے والوں اور انسانی سوسائٹی کی تلچھٹ سے ملنے جلنے، ان کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور اس نے دریافت کیا کہ ان میں سے بعض کا دل سونے کا تھا اور روح معصوم! وہ صرف اپنے حالات کے مارے تھے اور عزت دار اور کامیاب لوگوں سے زیادہ خلوص اور دردمندی اپنے اندر رکھتے تھے۔ یہ ماحول ایک کہانیاں لکھنے والے کے لیے ایک اچھا کارآمد اسکول تھا — کم از کم ایک ٹی ہاؤس سے بہتر!

بلاشبہ وہ اس ملازمت کی جکڑ بند سے بالآخر اُکتا گیا۔ وہ سب انسپکٹری کے مخصوص سانچے میں نہ ڈھل سکا، اور اپنے دوستوں اور عزیزوں کی ناراضگی کی پروا کیے بغیر ایک صبح اُس نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ وہ پھر لاہور میں اپنے مقدر کے ستارے کی جستجو میں آ گیا۔ اس کے لیے ایک شاعر اور کہانی کہنے والے کے سوا اور کوئی کیریئر نہ تھا!

بہاولپور کالج سے بی اے کرنے کے بعد — سال ۱۹۳۹ء میں — میں لاہور لا کالج میں داخل ہوا؛ اس لیے نہیں کہ قانون سے یا کسی اور دنیوی کیریئر سے مجھے کوئی لگاؤ تھا بلکہ محض اُس وقت تک دم لینے کا وقفہ حاصل کرنے کے لیے جب میں بحری قزاق بن سکتا تھا یا تبت میں جا کر دلائی لاما کے چرن چھو کر مکتی حاصل کر سکتا تھا۔ میں اُن لوگوں میں سے ہوں جو اپنی طبیعت میں کسی بل کی وجہ سے نارمل

دنیاوی سانچے میں نہیں ڈھل سکتے اور جن کے لیے ہمیشہ انوکھے رومانی خوابوں میں جینا مقسوم ہوتا ہے۔ قانون سے بھلا مجھ کو واسطہ! میں جو فطرتاً ایک لاقانونی اور جنگلی مخلوق تھا۔ وہ لوگ جو میری طرح خوابوں میں رہتے ہیں، اکثر شرمیلے، اپنے ہم جنسوں سے خائف اور مطلقاً غیر عملی ہوتے ہیں، اور ایسا ہی میں بھی تھا—ایک انیس سالہ بھولا بھالا، جھجکنے والا لڑکا، زندگی کی شکست وریخت میں مار کھا جانے والا!

ندیم تب اپنی ایکسائز انسپکٹری سے بھاگ آنے کے بعد لاہور میں تھا اور ہم اکثر ملا کرتے۔ اس زمانے کا لاہور، ملک کی تقسیم سے پہلے کا لاہور، ادبی ہنگاموں سے پُر بہار تھا۔ ''ادب لطیف''، ''سویرا'' جیسے خالص ادبی پرچے کافی تعداد میں چھپتے تھے اور پڑھے جاتے تھے۔ تب کے لاہور کو ہم صحیح معنوں میں علم وفن کی آماج گاہ کہہ سکتے ہیں۔ اردو زبان کے چوٹی کے نثر نگار، افسانہ نویس اور شاعر لاہور میں رہتے تھے، اس دھڑکتے ہوئے، کثیر الآباد تاریخی شہر کی فضا کو اپنی صلاحیتوں کے اجالنے کے لیے سازگار پاتے ہوئے۔ اس وقت کا لاہور کہاں گیا؟ اب ادب کے اجارہ دار پروفیسر اور ڈاکٹر رہ گئے ہیں یا لمبے بالوں والے، چشمہ لگے، انٹلکچوئل نوجوان، جو چائے خانوں میں بیٹھ کر کامیو اور سارتر اور پاؤنڈ پر بحثیں کرتے ہیں اور خود کو ان سے کسی طرح کم نہیں جانتے!

ندیم مجھے اپنے ہمراہ چراغ حسن حسرت کے ہاں لے گیا۔ حسرت کی ادارت میں ان دنوں ہفتہ وار رسالہ ''شیرازہ'' نکلا کرتا تھا، اردو کا ایک قسم کا ''پنچ'' میگزین، جس کا میں ایک مشتاق قاری تھا اور جس میں اپنے نام کو چھپے ہوئے دیکھنے کے لیے بے تاب تھا۔ اس بے عیب اردو نثر لکھنے والے سے مل کر مجھے قدرے مایوسی ہوئی۔ شلوار اور قمیص میں جھکی ہوئی گھنی مونچھوں والا ایک تندخو، ان گھڑ، لحیم شحیم شخص، میری ایک ادبی آدمی کی ذہنی تصویر کے بالکل الٹ! اُن دنوں میرا خیال تھا کہ ادبی لوگوں کو کوئی فرشتوں جیسی نورانی مخلوق لگنا چاہیے۔ اپنی جھجک کے باعث میں اس خوفناک شخص کے سامنے کچھ کہنے کی ہمت نہ کر سکا۔ سب باتیں ندیم نے کیں۔ اس تعارف کا یہ فائدہ ہوا کہ میرے دو تین ہلکے پھلکے مضامین ''شیرازہ'' کے لیے قبول کر لیے گئے اور میرا نام چھاپے میں نمودار ہوا۔

ایک دن ندیم نے مجھے ایک نوجوان مصنف کے بارے میں بتایا، ماسٹر آف آرٹس نوجوان جس نے ''ادب لطیف'' میں اپنی پہلی ایک دو کہانیوں سے ادبی دنیا کو ایک ہی ہلّے میں سر کر لیا تھا اور ہر کوئی اس کی باتیں کر رہا تھا۔ اس طرح ہم کرشن چندر سے اس کے داتا دربار کے قریب واقع اخباری دفتر میں

جا ملے۔ ایک ہندو بیوہ خاتون نے انگریزی میں ایک ماہوار فیشن میگزین کی اشاعت کا آغاز کیا تھا اور اس کی ادارت کے فرائض غالباً پچھتر روپے ماہوار مشاہرے پر کرشن چندر کو سونپے گئے۔ اس بوٹے سے قد، سرگیں متفکرانہ آنکھوں والے خوبصورت نوجوان کو میں نے پسند کیا۔ اس کی گفتگو دھیمی، سلجھی ہوئی اور دلچسپ تھی۔ مگر زیادہ تر باتیں ایک لمبے، دبلے پتلے، مچھلی کی آنکھوں والے آدمی نے کیں، جو لوہے کی تاروں سے جڑا ہوا ایک پرندہ لگتا تھا جس نے کسی طریق سے ایک میلے سوتی سوٹ کے اندر راستہ پالیا ہو۔ بعد میں ندیم نے مجھے بتایا کہ یہ حضرت پروفیسر کنہیا لال کپور، مشہور طنز نگار تھے۔ اگر میں چاہتا تو ندیم مجھے دوسری ادبی شخصیتوں سے ملانے لے جاتا۔ وہ بیدی، اشک، دیوندر ستیارتھی اور دوسرے ادیبوں کو جانتا تھا۔ پھر محمد دین تاثیر، عبدالمجید سالک، غلام رسول مہر، مولانا صلاح الدین احمد، پرانی روش کے نثر نگار بھی تھے جن سے اس کو خصوصی نیازمندی تھی۔ لیکن میں ان ادبی ستاروں سے ملنے سے کتراتا رہا۔ میں ادبی لوگوں کی صحبت میں نروس اور سہما سہما رہتا تھا، اور اب بھی میرا وہی حال ہے۔

جیسا کہ قرائن سے ظاہر ہے، میں قانون کے پہلے سال میں فیل ہوا۔ میں نے قانون کی کسی کتاب کو اٹھا کر دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی اور امتحان کے پرچوں میں میں نے بڑے اوٹ پٹانگ، پُر مذاق اور غیر متعلق جواب دیے۔ انجینئرنگ کالج میں داخلہ مل جانے سے لاہور میں میرا قیام مزید پانچ سال رہا۔ ندیم میو روڈ پر ایک فلیٹ میں اٹھ آیا تھا اور وہاں ایک سرائے کے کیپر (inn-keeper) کی حیثیت سے رہتا تھا۔ جب بھی میں وہاں جاتا، کوئی ایک درجن کے قریب خوشاب سے آئے ہوئے دیہاتی کمروں کے مختلف کونوں میں چارپائیوں پر مزے سے لیٹے ہوتے۔ اتنی وسیع مہمان داری اس سے کب تک نبھ سکتی تھی! بالآخر اسے یہ فلیٹ چھوڑ دینا پڑا۔ ان سالوں میں ہماری دوستی کی لو کچھ بجھنے لگی اور پرانی چمک دمک اور پہلے والی تابانی ماند پڑ گئی۔ ان پانچ سالوں میں ہم سات آٹھ بار سے زیادہ نہ ملے ہوں گے۔ ندیم کا اس کھچاؤ میں کوئی قصور نہ تھا، ایک عجیب ذہنی بیماری کے بادل مجھ پر چھا رہے تھے — گھنے، کثیف اور دم گھونٹنے والے! میں محسوس کرتا جیسے میں ایک گہرے تاریک گڑھے میں پڑا ہوں اور کبھی سورج کو چمکتے نہیں دیکھ سکوں گا۔

ندیم کے یہ سال ادبی حیثیت سے بہت نتیجہ خیز اور بارآور تھے۔ ہر سال اس کی ایک آدھ کتاب بازار میں آتی تھی۔ اس کے افسانوں کے مجموعے ''بگولے''، ''طلوع و غروب''، اور ''شیرازہ'' میں چھپے

ہوئے مزاحیہ مضامین کا انتخاب ''کیسر کیاری'' اسی عرصے میں شائع ہوئے۔ اس کی نظموں اور غزلوں کی کتاب ''جلال و جمال'' اور دیہاتی رومان کے قطعات کے مجموعے ''رم جھم'' نے اس کی شاعری کی عظمت کا سکہ ان لوگوں پر بھی جما دیا جنھیں اس کے جینئیس کے بارے میں کوئی شک تھا۔ اسے اپنے نام کو آدھی درجن کتابوں کی پشت پر چھپا ہوا دیکھ کر مسرت ہوتی ہوگی۔ شاعری اور افسانہ نگاری میں اس کی انوکھی صلاحیتوں نے مولانا صلاح الدین احمد جیسے ناقدوں سے داد وصول کی۔ اس کے قلم نے پنجاب کے دیہات کے رومانس اور حسن کو تابناک، کھنکتے ہوئے الفاظ میں اپنی کتابوں میں مسخر کیا۔ نسبتاً کم عمر میں — چھبیس ستائیس سال کی عمر کو پہنچنے تک — وہ اردو ادب کی دنیا میں اپنی شہرت کو مستقل بنیادوں پر قائم کر چکا تھا اور اگر اس غریب دہقانی نوجوان کے دماغ کو اپنے معاصرین کی تحسین نشلی شراب کی طرح چڑھی تو یہ قدرتی تھا اور ہم اسے اس پر الزام نہیں دے سکتے۔

مگر یہ سال اس کے لیے انتہائی تنگی اور عسرت کی تلخ کامیوں سے پُر تھے اور فکرِ روزگار نے اس کی پریشان حالی کو کم نہ کیا۔

آنے والے سالوں میں اس کی اپنی روزی کمانے کی جدوجہد، ناشروں اور مدیروں کی ناز برداریاں، مکتبۂ جدید کے چودھری نذیر احمد مرحوم کے ماہنامے ''ادبِ لطیف'' کی ادارت، آل انڈیا ریڈیو میں دو تین سال کی ملازمت، میاں افتخار الدین کے اخبار ''امروز'' میں ''پنج دریا'' کے قلمی نام سے مزاحیہ کالم نویسی، بعد میں خود اس کرسیِ ادارت پر جمنا جسے چراغ حسن حسرت اور بالیاقت، کم نصیب ادیب نے خصوصیت بخشی تھی، پھر پروگریسو پیپرز کے حکومت کی تحویل میں آنے پر اُ[illegible] علیحدگی، وغیرہ — اس سب کچھ کے بارے میں میں ذکر نہیں کروں گا۔ اس پندرہ سال[illegible]ے میں ہم کبھی کبھار ہی یکجا ہوئے اور ہماری خط و کتابت عملاً بند رہی۔ ان سالوں کی حقیقی اور دلچسپ داستان ندیم کو خود لکھنی چاہیے، اور ممکن ہے وہ کبھی اس کو لکھے گا، جب اسے زندگی کی پگڈنڈی پر دم لینے اور شام کے جھٹپٹے میں طے کیے ہوئے رستے کو مڑ کر دیکھنے کی فرصت میسر ہوگی۔ اور میری خواہش ہے کہ یہ داستان محض واقعات اور اپنے معاصرین کی حکایات کو ذکر میں نہیں لائے گی بلکہ اس کے 'اندر کے آدمی' کی کہانی بھی ہوگی، گو مجھے اس میں شبہ ہے کہ وہ اتنی جرأت، اتنی پُر صداقت بے باکی بروئے کار لا سکے گا جو ایسی

خودنوشت کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ اُسے اپنی پروڈری کو جھاڑنا اور اس بہروپ کو جسے پہن کر ہم سب دنیا کے کاروباروں میں اپنے ہم نفسوں کے روبرو جاتے ہیں، اتار پھینکنا ہوگا۔ اس کی مرنجاں مرنج طبیعت، وضع داری، اخلاق پرستی، قدیم روش سے فطری لگاؤ — اس کی ظاہری شخصیت کی یہ خوبیاں اس کے اصلی اور سچی بات کہنے کی راہ میں آڑے آئیں گی۔

۱۹۶۲ء میں ایک روح فرسا ملازمت کی بیڑیاں پہنے، جن کے لیے میں بالکل نااہل تھا، صحت، امنگ اور ذوقِ زیست میں لٹا ہوا، شدید خود رحمی اور خوف کا شکار، زندگی کے پُرتموج سمندر میں ایک تھکا ہارا تیراک، میں لاہور آیا۔ ندیم سے ملاقاتیں ہونے لگیں، گو آغازِ دوستی کا وہ پہلا والہانہ شعلہ پھر نہ جلا۔ ندیم اپنی معاش کی کٹھن آزمائشوں کے باوجود میرے بارے میں حقیقتاً مشوش تھا۔ وہ ہر ممکن طور پر میرے زخموں پر مرہم رکھنے کی کوشش کرتا۔ وہ میری حالت پر افسوس کرتا اور رحم کا اظہار کرتا۔ کوئی آدمی کتنا ہی تباہ و برباد ہو، رحم کھایا جانا پسند نہیں کرتا اور اپنے اس ہمدرد، حوصلہ مند اور خلیق دوست کا میرے لیے تردّد مجھے بعض اوقات ناگوار گزرتا۔ ایسا رحم، میں سمجھتا ہوں، ایک طرح کی بے رحمی ہے۔

یہاں میرے بھارت بلڈنگ کے دفتر میں ایک دن ندیم میرے پاس آیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اُس نے ایک ادبی مجلّہ ''فنون'' نکالنے کا حتمی فیصلہ کرلیا ہے۔ اس کا ڈیکلریشن لے لیا گیا ہے، دفتر کے کمرے کا بندوبست بھی ہوگیا ہے اور اس کا پہلا نمبر دو مہینے کے اندر اندر اشاعت پذیر ہوجائے گا۔ اس نے مجھ سے ''فنون'' کے لیے کچھ لکھنے کی فرمائش کی۔ میں کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ پچھلے پانچ چھ سال سے اپنی گھونٹ دینے والی مایوسی میں میں نے اردو کی ایک سطر نہیں لکھی تھی — خط تک نہیں۔ اپنے فیک (fake) ہونے کو جانتے ہوئے میں نے مصنف بننے کی خواہش کسی افسوس کے بغیر ترک کردی تھی۔ لیکن اتنے اچھے ہمدم سے میں کیونکر انکار کرتا، جب یہ اس کی دلی خواہش تھی کہ میں ''فنون'' کے لیے لکھوں۔ میں نے اس سے کچھ لکھنے کا وعدہ کرلیا۔ اس وقت سے میں باقاعدگی سے ''فنون'' میں لکھتا رہا ہوں — تبصرے، مزاحیہ مضمون، کہانیاں — اور اس مجلّے کے چند ہی شمارے ایسے ہوں گے جن میں میرا نام نہ چھپا ہو۔ ندیم نے ہمیشہ اپنی تعریف سے میری ہمت بندھائی اور جو چیز بھی میں نے ''فنون'' کے لیے بھجوائی، اس میں شائع ہوئی۔ ان تبصروں اور مضامین کو کوئی دوسرا ایڈیٹر آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا: وہ ایک مربیانہ انداز اختیار کرتا اور زبان و بیان کی خامیوں کی طرف میری توجہ دلاتے ہوئے انھیں لوٹا دیتا۔

Scanned with CamScanner

''فنون'' میں میں جو چاہتا تھا لکھتا تھا۔ میرے بعض تبصرے ندیم کو اچھے اور متوازن نہیں لگے ہوں گے، تاہم وہ کسی قطع و برید اور ایک لفظ کے حذف کے بغیر چھپے۔ اس سے مجھے خیال ہوتا ہے کہ وہ اتنا پروڈ نہیں۔ اس طرح میرے ادبی کیریئر کا پھر سے آغاز ہوا۔ میں اپنے فیک ہونے کی دل شکستگی کو بھول گیا۔ اپنے نام کو چھپا ہوا دیکھنے کی مسرت کافی تھی۔

میری صحت اسی طرح خراب تھی۔ میرے معدے کا نظامِ ہضم درست نہ ہوا۔ مگر ندیم کے ''فنون'' نے مجھے منزل بہ منزل گرنے اور اپنے فطری ملکے (instinct) کی مکمل معدومی سے بچالیا۔

احمد ندیم قاسمی کی عمر اب چھپن برس ہے، اس کے بال کھچڑی ہو چلے ہیں، مگر اس کی عام تندرستی اچھی ہے۔ وہ اب سمن آباد میں اپنے ایک متواضع اور صاف ستھرے چھوٹے سے مکان میں رہتا ہے۔ ایک نرم دل باپ، ایک اچھا، خیال رکھنے والا شوہر، ہمیشہ خوش اخلاق، متواضع، ہنس مکھ، کسی قدر محتاط اور مطلقاً راست رو اور بری عادتوں سے پاک۔ آمدنی کے محدود ذرائع کے باوجود اس کا ہاتھ بڑا کھلا ہے اور مجھے کچھ شک ہے کہ وہ روپے کی قدر و قیمت سے پوری طرح واقف نہیں — وہ روپیہ جس کے نہ ہونے سے وہ ایک وقت پریشان حال رہتا تھا، اور اس کے پانچوں حواس ماؤف ہو چلے تھے۔ انگریزی ادب اُس نے زیادہ نہیں پڑھا اور کالج میں شیکسپیئر اور نصاب کی کتابیں پڑھنے کے بعد اس نے زیادہ تعداد میں مغربی ناول یا مختصر افسانے نہیں پڑھے ہوں گے۔ موپاساں، ترگنیف، چیخوف کی کہانیاں، ایلیا اہرن برگ کے دو ایک ناول، شاید کامیو اور سارتر کی اکا دکا کتاب — ایک اوریجنل مصنف کے لیے، جیسا کہ وہ ہے، اسے گھاٹا نہیں کہا جا سکتا۔ ولیم شیکسپیئر اور وارث شاہ (میں ان کا ندیم سے موازنہ نہیں کر رہا) — دو بڑے اور اوریجنل اور حیرت انگیز شاعر — بنیادی طور پر 'پڑھنے والے' نہیں تھے، انھوں نے بہت کم کتابیں جانی ہوں گی، مگر ان کا نفسیاتِ انسانی کا خلقی مشاہدہ اور فطری قوتِ بیان ایسی تھی جو بہت کم لوگوں کو قدرت ودیعت کرتی ہے۔ ندیم نے البتہ اردو کے کلاسیکی شعرا کے دیوان ایک طالب علمانہ شغف سے مطالعہ کیے ہیں اور علمِ بحور کے متعلق اتنا کچھ جانتا ہے جتنا کوئی جان سکتا ہے۔ اس کی ''جلال و جمال'' کے بعد کی شاعری میں ایک کلاسیکی کاملیت (perfection) اور گہرائی ہے۔ مگر ذاتی طور پر میں اس کے پہلے دور کی شاعری سے اس کی سادگی، نکھار اور کچی جذباتیت (passion) کی

وجہ سے محبت کرتا ہوں۔ اس میں سوندھی سوندھی زمین کی بو باس ہے۔ اس نے اردو زبان میں بڑے اچھے افسانے لکھے ہیں، اور مختلف اسالیب (genres) میں، اور اگرچہ اس کی پہلی کہانیاں اپنی اصلی اور سچی دیہاتی فضا کے ساتھ قدرے جذباتیت سے رنگی ہیں، اس کی بعد کی متعدد کہانیوں میں فارم کی پرفیکشن اتنی نمایاں ہے کہ وہ واقعی شاہکار کہی جاسکتی ہیں۔ اس کے نکتہ چیں جو اس کو بڑا افسانہ نگار تسلیم نہیں کرتے، اس کے پاسنگ بھی نہیں۔ ویسے ان صاحبان کے نزدیک بے چارے موپاساں اور ماہم بھی نااہل قصہ گو تھے اور کہانی کہنے کے فن میں بالکل ان گھڑ! ندیم نے شاعری اور افسانہ نگاری کے علاوہ دوسری اصناف میں بھی اپنی لیاقتوں کا استعمال کیا ہے۔ اس نے انگریزی کے گلبرٹ اور سلیواں کے ڈھب پر اردو میں اوپیرا لکھے ہیں، طنزیہ اور مزاحیہ مضامین میں طبع آزمائی کی ہے، ریڈیو، ٹیلی وژن اور فلم اسکرپٹ روانی سے اور قلم برداشتہ تحریر کیے ہیں۔ پھر اس کی روزانہ اخبار میں مزاحیہ کالم نویسی ہے— ہر روز کی پُرتکان مشقت اور تخلیقی فن کار کے لیے ایک بے روح عمل (hack work)! یہ روزانہ کالم اس کی اور اس کے کنبے کی بقا کے لیے ضروری ہیں، اس کا ذریعۂ معاش ہیں، کیونکہ اردو کی ادبی کتابیں بالکل نہیں بکتیں۔ ہوشیار ناشر ایک کتاب کو محکمۂ تعلیم سے منظور کرا کے کتب خانوں میں کھپا دیتا ہے۔ مصنف کی اپنی جلدیں اس کے دوستوں میں تقسیم ہو جاتی ہیں، اور ایک ہزار کا ایڈیشن ختم ہونے میں تین چار سال یا اس سے زیادہ کی مدت لگ جاتی ہے، اور اکثر یہ ختم نہیں ہو چکتا۔ منشی پریم چند نے، جو اپنے زمانے میں اردو کے ایک شہرت یافتہ اور مقبول مصنف تھے، اپنی پچھلی عمر میں ایک دفعہ حساب لگایا کہ اپنے درجن سے اوپر ناولوں اور افسانوں کے مجموعوں سے انھوں نے کل بتیس روپے ماہوار سے زیادہ نہیں کمایا تھا۔ (اس زمانے کے بتیس روپے آج کل کے تین سو یا چار سو روپے سمجھ لو۔) کتنا خوش نصیب تھا پریم چند! ان دنوں اردو کا کوئی ادیب بھی اپنی کتابوں سے اتنی آمدنی پیدا کر سکنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ (میں نسیم حجازیوں، ابن صفیوں، رضیہ بٹوں کی بات نہیں کر رہا۔) کالم نگاری یقیناً ندیم کا اصل genre نہیں، جس طور سے یہ چراغ حسن حسرت کا تھا یا عبدالمجید سالک کا، اس لیے اس میں تعجب کی بات نہیں کہ بعض وقت اس کے کالم اپنے نشانے پر ٹھیک بیٹھتے ہیں اور بعض وقت فائر بینڈ بے رخ پڑتا ہے اور آدمی کو کالم نگار کے ساتھ ہمدردی سی ہوتی ہے۔

وہ ادبی دنیا کی اُس بلندی پر پہنچ چکا ہے کہ ادبی انجمنوں، کالجوں کی مجالس اور ہر ایک قسم کے

مشاعروں کی صدارت کے لیے اس کی کافی مانگ رہتی ہے۔ ایک 'بیبا' انسان ہونے کی وجہ سے وہ انکار نہیں کر سکتا اور اکثر طوعاً و کرہاً اسے یہ اعزاز اپنے سر منڈھنا پڑتا ہے۔ اس کی موجودگی جلسے کی شوبھا بڑھاتی ہے، اس کو امتیاز بخشتی ہے اور جلسے کے مہتمم ایک بڑے ادبی مشیر کو ہتھیا کر فخر و مسرت سے پھولے نہیں سماتے۔ دراصل ایسی صدارتیں اس ملک کی ادبی چہل پہل (literary game) کا ایک جزو ہیں اور شاید ایک مصنف کی ٹیم ٹام کے لیے لازمی بھی۔ میرے دوست کے لیے اب یہ گیم پرانی ہو جانے کی وجہ سے کچھ بور ہو چلی ہے اور میں نے بعض موقعوں پر اسے اپنے مداحوں اور مشتاقوں کی کھیپ کو دیکھ کر پیلا پڑتے اور پھر بڑی وضع داری سے اس تاریخ پر اپنی کسی اور مصروفیت کی اوٹ میں صدارت کی دعوت کو ٹالتے ہوئے پایا ہے۔ ایسے مشکل موقعوں پر اس کا پی اے اختر اسی تاریخ کی کسی اور مصروفیت (engagement) کی یاددہانی کراتا ہے!

ایک ادبی مجلّے کے مدیر کو خالص کاروباری شخص ہونا چاہیے، جو وہ اصلاً نہیں۔ وہ حساب کتاب نہیں رکھ سکتا اور میں اکثر تعجب کرتا ہوں کہ وہ ''فنون'' میں اشاعت کے لیے آنے والے مسودات کو کیونکر سنبھال کر رکھتا ہے۔ وہ کبھی گم نہیں ہوتے۔ ہر ایک مسودہ، نظم ہو یا نثر، وہ خود بغائر نظر پڑھتا ہے، اور ہمیشہ نئی قابلیت کو دریافت کرتا ہے۔ بالکل انجانے، مبتدی لکھنے والوں کے افسانے اس طرح ''فنون'' میں جگہ پاتے ہیں۔ بہت کم مدیروں میں اصلی اور نقلی نگارش اور کندن اور پیتل میں تمیز کرنے کی اہلیت ہوتی ہے اور وہ چیزیں، اکثر اونچے افسروں یا ڈاکٹر نقادوں یا سکہ بند افسانہ نگاروں کی لکھی ہوئی، جو ان کے مجلوں میں لافانی ادبی شاہکاروں کے دھوم دھڑکے کے ساتھ شائع ہوتی ہیں، ادب سے دور کا واسطہ بھی نہیں رکھتیں — مہمل، بے لطف الفاظ کی صنعت گری! اور ندیم اپنی پروڈری کے باوجود نئے مصنفوں کی ننگی چیزیں بھی چھاپ دینے سے نہیں ہچکچاتا، اگر ان مصنفوں میں جوہرِ قابل کی آنچ ہو اور فن کی سچی لگن! یہ میں مانتا ہوں ایک حالیہ اور قدرے حیران کن نمو ہے۔ ایک دو سال پہلے یہ صورت نہ تھی۔ مجھے یاد ہے کہ اُس نے بعض اچھی اور اعلیٰ پائے کی کہانیوں کو محض اس لیے اپنے رسالے میں نہ چھپنے دیا کہ ان میں جنسی اعضا اور ان کی کارکردگی کا ذکر تھا۔ پھر اس کی یہ عادت بھی تھی (اور وہ اسے ایک مدیر کا استحقاق سمجھتا ہے) کہ وہ اپنے شاعروں اور افسانہ نگاروں کی تحریروں میں ننگے 'تھری لیٹر' الفاظ اور فحش، غیر مہذب خیالات چھانٹ کر ان کی اصلاح کر دیتا تھا۔ تھری لیٹر الفاظ کی جگہ شرافت اور

شائستگی کے آئینہ دار الفاظ تحریر میں بج جاتے تھے ـــ اکثر لکھنے والے کے معنی یا خاص تاثر کو جو وہ ان الفاظ سے پیدا کرنا چاہتا تھا، زائل کرتے ہوئے، یا ساری تصویر کو ایک نیا رنگ دیتے ہوئے! بہر حال ایسی درستی لکھنے والے پسند نہیں کرتے اور اصلاح دینے والے پر دانت پیستے ہیں۔ کس طرح ندیم کا رویہ اب بدل گیا ہے، یہ میں نہیں جانتا۔ کیا پروڈری کے بادل اب چھٹ رہے ہیں؟ کیونکہ ''فنون'' کے پچھلے چند شماروں میں چند ایک ایسی چیزیں چھپی ہیں جنھیں دو تین سال پہلے کا ندیم چھاپنے میں جھجک اور رکاوٹ محسوس کرتا۔ ''فنون'' کے لکھنے والے اپنے ایڈیٹر کی اخلاق پرستی کی ڈھیل کو بھانپ کر اب کھل کھیلنے لگے ہیں۔ یہ شاید ان کے لیے اور خود پارسا ایڈیٹر کے لیے اچھا ہے۔ جدید پود، ممنوعات سے سرکشی پر آمادہ، جنس کو اس طرح لیتی ہے جیسے اینیما کے ڈبے کے استعمال کو!

ندیم کی خط و کتابت کافی وسیع تھی (کتنے لمبے اور جذباتی خطوط اس نے منٹو اور دوسرے ادیبوں کو لکھے ہوں گے!) اور اب بھی اتنی کم نہیں۔ اس کی بیشتر مکاتیب نگار غالباً خواتین ہوتی ہیں ـــ ذوق ادب و سخن میں مشق کرنے والی عورتیں، نوعمر، ٹین ایج لڑکیاں جن کی ادبی تمنائیں ہیں اور جو ''فنون'' میں اپنا نام دیکھنا چاہتی ہیں۔ وہ ہمیشہ سخن گذاری کے فن میں اُن کی کوششوں کو سراہتا ہے، ان کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں مسرت محسوس کرتا ہے۔ اس طرح ''فنون'' نے کئی نئی پود کی شاعرات اور افسانہ نگاروں سے، جن میں اصلی لیاقت کی دمک ہے، پڑھنے والوں کو متعارف کیا ہے۔ ندیم دراصل جدید پود کی جذباتی آزادی اور بے جھجک اظہار سے خوش نہیں ـــ وہ عصمت و عفت مآب کیوں نہیں ہو سکتیں اور اپنی نگارش میں شائستہ اور اچھے الفاظ کیوں نہیں لکھ سکتیں۔ زندگی کی ہر متبرک چیز کے متعلق ان کا بے راہ رو اور گستاخ (flippant) انداز اسے بوکھلاہٹ میں مبتلا کر دیتا ہے۔ ہائے، دنیا کو کیا ہو رہا ہے؟ یہ اس کی سوچ ہے۔ اس نئی پود کی لکھنے والیوں کو وہ اپنے خطوں میں برادرانہ اور پدرانہ شفقت سے ایک متین لہجے میں نصیحت کرتا ہے کہ وہ یوں اخلاق کی پرانی قدروں کا مذاق نہ اڑائیں، اور نیکی و عفت مآبی کی راہ سے نہ بھٹکیں!

کیا میں اپنے دوست کے مرقعے میں رنگ بھرنے میں کامیاب ہوا ہوں؟ کیا اتنے بے ربط، بگشٹ الفاظ اندر کے آدمی کا کچھ مدھم سا ہیولیٰ قائم کر سکے ہیں؟ ـــ شاید نہیں! وہ اسی طرح ایک جزیرہ

ہے جیسے میں—— اور میں اس جزیرے کو اس کے درختوں کی خوشبو، اس کے چشموں کی مٹھاس، اس کی پہاڑیوں کی دل آویزی سے پہچانتا ہوں۔ کیسی زندگی اس نے گزاری ہے! اس نے بچپن میں قرآن پڑھا ہے اور سعدی کی گلستاں بوستاں، اپنے گاؤں کی چراگاہوں میں گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ کبڈی کھیلی ہے، وہ مفلسی اور غربت کی تلخی جانتا ہے، اس نے نظمیں اور کہانیاں لکھی ہیں، وہ کالج میں والی بال کا کپتان رہا ہے، اعصابی مرض نے اسے ایک لمبی مدت تک بے دم رکھا ہے، وہ جیل گیا ہے، اس نے چین دیکھا ہے، اپنے ٹریڈز (trades) بدلے ہیں، شادی کی ہے اور بچے بچیوں کا باپ بنا ہے۔ جو کچھ پانے کے لیے وہ زندگی کے سفر پر نکلا تھا، اس نے حاصل کیا ہے۔ (واقعی اس نے حاصل کیا ہے؟) زندگی میں بہت سی چیزیں اس نے نہیں کیں—— اس نے پتنگ نہیں اڑائی، اونٹ کا سفر نہیں کیا، رابرٹ لوئی اسٹیونسن کو نہیں پڑھا، ہم جنسی کی محبت نہیں کی، کوہ پیمائی نہیں کی، بکرے کی ٹانگوں اور سموں والے یونانی دیوتا کی شہنائی کے دل کش نغموں پر مست نہیں ہوا، نہ اُن کی تال پر اوچھے عیاشانہ ناچ ناچے ہیں۔ کنارِ دریا اُسے برہنہ گلعذار ایروس (Eros) پانی میں پاؤں لٹکائے نہیں ملی اور اس کا دل اس کی رنگین ادا پر نہیں لوٹا۔ وہ اپنے بزرگانِ سلف کے بنائے ہوئے سیدھے راستے سے نہیں بھٹکا، وہ اپنے بتھے سے نہیں اکھڑا، اور نشاط طبعی کی وادیاں، سب ہپیوں اور آوارہ مزاج روحوں کی پیاری، اس کے لیے اجنبی رہیں!—— اور کئی دوسری چیزیں!

میں نہیں سمجھتا وہ ان چیزوں کے لیے کبھی پچھتاتا ہے جو اُس نے نہیں کیں—— اور یہ اچھا ہے۔

یہ ہے وہ بامروّت، انسان کا درد رکھنے والا، خوبصورت آدمی—— ایک آدمی، احمد شاہ نامی!

(افکار، کراچی، ندیم نمبر، جنوری فروری ۱۹۷۵ء)

Scanned with CamScanner

رابرٹ لوئی اسٹیونسن

جس لکھنے والے نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا، دنیا کو میرے لیے تہ و بالا کر ڈالا اور میری زندگی کا سارا ڈھب یکسر بدل دیا، اسکاٹ لینڈ کا ناول نویس، انشائیہ نگار اور شاعر رابرٹ لوئی اسٹیونسن تھا۔ مجھے اس طرح یاد ہے جیسے کل کی بات ہو جب اپنے لڑکپن میں اس کی بحری قزاقوں کی مہماتی 'رومانس' میرے ہاتھ لگی۔ اُس وقت میں نویں جماعت کا طالبِ علم تھا اور میں اور میرا جگری یار عبدالمجید، جو حال ہی میں ایک مڈل اسکول کا ہیڈ ماسٹر ہو کر ریٹائر ہوا ہے، اپنے ہائی اسکول کی لائبریری سے ایک بے حد جرأت مندانہ پلاٹ کے مطابق کتابیں چرایا کرتے تھے۔ ہم پکڑے جاتے تو ہماری جو درگت بنتی، اس کے خیال ہی سے مجھے اب بھی پسینہ آجاتا ہے۔ مجید کو کتابوں کا کوئی شوق نہیں تھا اور وہ اس پلاٹ میں (جسے ہم دونوں نے نہایت سوچ بچار اور احتیاط سے تیار کیا تھا) محض دوستی نبھانے کی خاطر شریکِ کار ہوا تھا۔ ہم اُسے تاریخِ انگلستان کے ہاؤس آف پارلیمنٹ کو بارود سے اڑا دینے والے مشہور گن پاؤڈر پلاٹ کے تتبع میں ایل پی (یعنی لائبریری پلاٹ) کہہ کر پکارتے اور خود کو گائی فاکس کے بھائی بند سمجھتے۔ ہمارے ہم جماعت یا کسی اور کو ایل پی پلاٹ کا کبھی پتا نہ چل سکا۔ طریق کار یہ تھا کہ ڈاکے کا ایک خاص دن مقرر کر لیا جاتا اور جب اسکول بند ہو جاتا اور چوکیدار نچلی منزل کے کمروں کو مقفل کر کے اپنی کوٹھڑی میں 'ساوی' (بھنگ) گھوٹنے میں مشغول ہوتا، ہم کونے کے پانی کے کمرے (واٹر روم) سے اوپر جانے والی لکڑی کی سیڑھیوں پر چڑھ جاتے۔ اوپر کی منزل پر عموماً کوئی نہ کوئی دروازہ بے مقفل رہ جاتا اور ایک کمرے میں داخل ہو جانے سے ہم سب کمروں میں رسائی پا لیتے۔ (یہ کافی پُرخطر کام تھا اور ایک بار ہم تقریباً پکڑے ہی گئے تھے۔) ہمارے پاس ایک خاص چابی تھی جو چار پانچ کتابوں کی الماریوں کو لگ جاتی۔ ایک دھاوے میں ہم پندرہ بیس کتابوں کی جیپ اڑالاتے اور داڑھی والے نیم نابینا، بڈھے پھونس میر صاحب کو جو لائبریرین تھے، کبھی شک تک نہ گزرا کہ کتابیں الماری سے غائب

ہوتی جا رہی ہیں۔ (ایل پی پلاٹ ایک اور کہانی ہے جسے میں پھر کبھی تفصیل سے سناؤں گا۔) ایک ایسی کھیپ میں اسٹیونسن کی ''ٹریژر آئی لینڈ'' (Treasure Island) بھی نکلی، موٹے ٹائپ میں چھپی ہوئی اور جہازوں، جزیروں اور بحری قزاقوں کی رنگین تصویروں سے مزین۔ میں نے اسے پڑھنا شروع کیا (حالانکہ بعض انگریزی الفاظ اور فقرے میری لیاقت سے اونچے تھے اور مجھے بار بار لغت میں اُن کے معنی ڈھونڈنے پڑے)۔ اسے پڑھتے ہوئے میں ایک ایسی جادو نگری میں داخل ہوا جس میں سے پھر نہیں نکل سکا۔ ''ٹریژر آئی لینڈ'' کو ختم کرنے میں مجھے سات دس دن لگ گئے۔ ان دنوں میں قزاقوں، سمندروں اور مدفون خزانوں کی دنیا میں کھویا رہا اور مجھے آس پاس کی کسی چیز کا ہوش نہ رہا۔ اگر اب کوئی 'اچھی پری' ماضی کے کسی دور کی سیر کرنے کی میری خواہش پوری کرے تو میں انھی سحر آلود ایام کو لوٹنا چاہوں گا جب میں اسٹیونسن کی لافانی ''ٹریژر آئی لینڈ'' کو پہلی بار پڑھ رہا تھا اور کندھے پر کپتان فلنٹ نامی طوطا بٹھائے، بیساکھی پر پھدکتے، لنگڑے سمندری باورچی لانگ جان سلور کی ہمراہی میں اچھے جہاز بس پنی اولا (Hispaniola) پر بحری قزاقوں کے مدفون خزانے کے جزیرے کی کھوج میں روانہ ہوا تھا۔ ''ٹریژر آئی لینڈ'' کو پڑھنے کے بعد میں وہ لڑکا یا وہ آدمی نہ تھا جو اس کتاب کے ہاتھ لگنے سے پہلے تھا۔ میرا تخیل بھڑک اٹھا اور اب میں ایک ہی امنگ اپنے سینے میں لیے تھا: غضیلے دھاڑتے سمندروں پر بحری قزاق بننے کی۔ میں نے تب دوسرے ممکنہ پیشوں (مثلاً فلم ایکٹر، ریلوے گارڈ وغیرہ بننا) کو ہمیشہ کے لیے سلام کہہ دیا۔

جس ہیجان اور جس دھک سے رہ جاتے دل کے ساتھ میں نے اسٹیونسن کی یہ لڑکوں کے لیے لکھی گئی مہماتی رومانس ''ٹریژر آئی لینڈ'' اور بعد میں دوسری رومانسز ''کڈ نیپڈ''، ''بلیک ایرو'' اور ''ماسٹر آف بیلنٹرے'' پڑھیں، وہ کیفیت مجھے بڑے ہونے پر کسی اور کتاب کے پڑھنے سے نصیب نہ ہوئی، طالسطائی، دوستووسکی، چارلس ڈکنز، تھامس ہارڈی کے شاہکاروں میں بھی نہیں جنھیں میں نے بہت سال آگے، زندگی کی مختلف منزلوں میں پڑھا۔ دراصل میں ان آدمیوں میں سے ہوں جو رومان اور مہم جوئی پر پلے ہوئے ہوتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ بہت کم آج کل کے لڑکے ''ٹریژر آئی لینڈ'' کے چمکتے ہوئے الفاظ سے جادو کی دنیا میں پہنچتے ہوں گے۔ میں ان پر رحم کھائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ہم ان دنوں ٹیلی وژن اور اسپیس ایج اور سائنس فکشن کے زمانے میں رہ رہے ہیں اور ہمارے بیٹوں کو بادبانی جہازوں

Scanned with CamScanner

اور بحری قزاقوں کی کہانیاں کام کی چیزیں معلوم نہیں دیتیں۔
کالج میں آکر میں اسٹیونسن کی مالا جپتا تھا، اسی کے گن گاتا تھا۔ میں اپنے محبوب کی تقلید میں چھوٹے کالروں کی گھسی مخملی جیکٹ اور ہری چیتھڑا سی ٹائی پہنے سائیکل پر شہر کے گلی کوچوں میں آوارہ گردی کیا کرتا۔ اسٹیونسن کی جوانی کی ایک تصویر (جسے میں نے کسی کتاب میں سے پھاڑا تھا)، ہمیشہ میری جیکٹ کی بالائی جیب میں ہوتی اور میں ہر آدھ گھنٹے، گھنٹے کے بعد اسے نکال کر غرور سے دیکھا کرتا۔ اسی طرح اسٹیونسن کی کوئی نہ کوئی کتاب "نیو اریبین نائٹس" یا "ورجنی پس پیور سک" یا "ٹریولز ود اے ڈنکی"، جسے میں دسویں یا بارھویں بار پڑھ رہا ہوتا، میری جیکٹ کی نچلی جیب میں ہوتی۔ میں نے اسٹیونسن کی طرح لگنے کے لیے بالوں کے درمیان میں سیدھی مانگ نکالنی اختیار کی اور گدی پر پٹے بھی رکھ لیتا اگر مجھے اپنے باپ کی گھرکیوں کا ڈر نہ ہوتا۔ پٹے تو میں نے نہ رکھے، مگر اپنے بال ضرور اس حد تک بڑھا لیے کہ گھر والے اس پر زیادہ چیں بہ جبیں نہ ہوں۔ کالج میں ہی میں نے ایک دفعہ اسٹیونسن کی وضع پر جھکی ہوئی مونچھیں رکھنے کا ارادہ کیا مگر میرے چند دوستوں نے مجھے یقین دلایا کہ مونچھوں کے ساتھ میں سرکس کا رنگ ماسٹر لگنے لگوں گا، اور میں نے کچھ افسوس سے اپنا ارادہ بدل دیا۔ میں خود کو رابرٹ لوئی اسٹیونسن کا چیلا کہتا، اور حقیقت یہ ہے کہ رانجھے نے کبھی ہیر سے اتنی محبت نہ کی ہوگی، نہ رومیو نے اپنی جولیٹ سے، جو مجھے اسٹیونسن سے تھی اور اب تک ہے۔ یہ مذاق نہیں اگر میں یہ کہوں کہ اسٹیونسن ہی میری پہلی اور آخری محبت ہے۔ یہ محبت اب تک سرد نہیں ہوئی اور اب بھی جب کبھی کسی کتب خانے یا کتابوں کی دکان پر اسٹیونسن کی "ٹریژر آئی لینڈ" یا "کڈ نیپڈ" کا کوئی نیا ایڈیشن یا اس کی زندگی پر لکھی ہوئی کتاب دکھائی دیتی ہے تو میرا دل اُچھل پڑتا ہے اور جی چاہتا ہے کہ اسے جھٹ سے خرید لوں۔ کالج کے ایام سے لے کر اب تک میں نے اپنی ان چہیتی کتابوں کے مختلف ناشروں کے طبع شدہ درجنوں ہی ایڈیشن مختلف اوقات میں خرید کیے ہوں گے۔ کوئی سال ہی جاتا ہے جب میں اسٹیونسن کی کوئی نہ کوئی کتاب شاید دسویں یا پندرھویں بار پھر سے نہیں پڑھتا۔ اسٹیونسن کی سحر کاری سے موہے جانے کے بعد دوسرے انگریزی اور مغربی مصنف جن کی کتابیں کالج کی لائبریری میں موجود تھیں، میرے لیے پھیکے اور بے نام سے ہو گئے۔ مجھے ان کی کتابیں پڑھنے میں لطف نہ آتا۔

تب سے میں نے تہیہ کیا کہ میں بڑا ہو کر لڑکوں کے لیے دہاڑتے سمندروں اور بحری قزاقوں

کے ارغوانی رومانس لکھوں گا۔ میری اس آرزو کی بیل کبھی منڈھے نہ چڑھی اور میری آلکسی اور غفلت کی نذر ہوگئی۔

اور میں اب اپنی ناکامیوں پر حسرت کے آنسو بہاتے ہوئے اکثر سوچتا ہوں کہ کیسے ایک علیل، موت سے آنکھ مچولی کھیلنے والا شخص (جیسا کہ رابرٹ لوئی اسٹیونسن تھا) اپنی نسل کا سب سے زیادہ دل پذیر اور معجز نگار لکھنے والا بن سکا اور کہاں سے اس کی نگارش میں وہ جادو پیدا ہوا، جو اس کی کتاب کو اب تک زندہ تابندہ اور سرسبز رکھے ہوئے ہے۔

(روزنامہ نوائے وقت، کراچی)

Scanned with CamScanner

ایک کالج میگزین

اب جب زندگی کی شام ڈھل رہی ہے اور میں ڈوبتے دن کی ملگجی روشنی میں بسیرا کرنے والے پرندوں کی راگنیاں سنتا پہاڑی سے نیچے اتر رہا ہوں، پلٹ کر پیچھے دیکھتے ہوئے صادق ایجرٹن کالج میں اپنی طالب علمی کا زمانہ مجھے ایک سنہری جھٹپٹے میں لپٹا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اپنی جواں سالی کے کئی ایک سین اور چہرے ابھی تک میرے ذہن میں اس طرح روشن ہیں جیسے کل کی بات ہو، اور کئی ایک کو میں مکمل طور پر بھول چکا ہوں یا وہ مجھے دھندلے دھندلے یاد ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ بعض اوقات 'یاد' (memory) ہمارے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتی اور عجب فریب کرتی ہے۔ کیا وہ زمانہ اتنا ہی زریں، خوبصورت، پُر حیرت تھا جتنا وہ مجھے اب عمر کی اس منزل میں نظر آتا ہے؟ کیا وہ اپنے سپنوں، آشاؤں اور رومانی بے چینیوں کے ساتھ ساتھ عجیب خوف، وسوسے اور ایامِ بلوغت کے سب درد بھی نہ لیے تھا جو اکثر زندگی کو تیرہ وتار اور بے مصرف بنا دیتے تھے اور آدمی 'آپ گھات' (خودکشی) کا سوچنے لگتا تھا؟ کیا کالج کے ایوانوں اور گیلریوں میں گھومتا ہوا، وہ گھنگھریالے بالوں اور تازہ چہرے والا ناپختہ، خام، اپنی ذات میں مگن لڑکا میں ہی تھا؟ اور اگر وہ لڑکا اب مجھے زندگی کی راہوں پر اچانک کہیں مل جائے تو کیا میں اُسے پہچان لوں گا؟ شاید نہیں۔ وہ لڑکا اسٹیونسن اور رائیڈر ہیگرڈ کی دنیا میں رہتا ہوا، ایک مختلف مخلوق تھا جسے میں نہیں جانتا۔ وہ میرے لیے ایک اجنبی ہو چکا ہے۔

میں نے ۱۹۳۴ء میں بہاول پور کے صادق ڈین ہائی اسکول سے (جس کی دو منزل مکعب عمارت اب ٹیکنیکل اسکول میں بدل چکی ہے) میٹرک کیا۔ صادق ایجرٹن کالج میری نگاہوں میں نہ جچا اور میں مچل گیا کہ میں گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھوں گا۔ میرے والد نے میری ضد کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور مجھے ایک ماتحت تحصیل دار حکیم وشحیم ملک لال خاں کی معیت میں لاہور کے گورنمنٹ کالج کی فرسٹ ایئر کلاس میں داخلے کے لیے بھیج دیا۔ ملک لال خاں گورنمنٹ کالج کے اولڈ بوائے تھے اور

Scanned with CamScanner

پروفیسر احمد شاہ بخاری پطرس کے پرانے کلاس فیلو۔ کچھ ان کی دوڑ دھوپ سے اور کچھ اپنے دادا کی حکومتِ برطانیہ کی خدمات کے صدقے مجھے داخلہ مل گیا۔ (میرے دادا کا معتمدِ خاص فیض علی میراسی گاؤں سے دادا کی سندات، سرٹیفکیٹس وغیرہ کا بستہ لے کر پہنچا تھا۔ وہ ہمارے ساتھ انٹرویو کے کمرے میں آیا اور وہ چٹھیاں انٹرویو بورڈ کے سامنے پیش کی گئیں، جس پر احمد شاہ بخاری نے کوئی مزاحیہ ریمارک بھی کیا۔) فرسٹ ایئر فول کی مروجہ رسومات میں سے بخیر وخوبی گزر جانے کے بعد میں نے پر پرزے نکالے۔ کل سترہ روپے میں ایک ریشمی سوٹ، ایک سوتی سوٹ اور پانچ ٹول کی سفید قمیصیں پیسہ اخبار بازار کے ایک ہندو درزی سے سلوائے۔ ایک سبز فلیٹ ہیٹ بھی ساڑھے چار روپے میں خریدا۔ بیو برمل (Beau Brummel) کی طرح چھیلا بنا، میں اکثر کالج کے گراؤنڈ، انارکلی اور مال پر مٹرگشت کرتا نظر آتا۔ کھیلوں میں تو میں ہمیشہ پھسڈی رہا اور ان کے نزدیک نہیں پھٹکا، مگر شام کو کالج کے جم خانے میں باقاعدگی سے جا کر ورزشی کرتب کرتا اور ڈنڈ بیٹھکیں نکالتا۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے اپنے باپ کو ایک خط میں اپنے بائی سیپس (بازو کے پٹھے) کے اٹھارہ انچ ہو جانے کی خوش خبری دی جس نے اُسے زیادہ خوش نہیں کیا۔ اُسے میری باڈی بلڈنگ سے زیادہ میری پڑھائی میں دلچسپی تھی۔ میں نے سوئمنگ پول بھی جانا شروع کیا اور ایک بار، جب وہاں کوئی بھی نہیں تھا، ڈوبتا ڈوبتا بچا۔ میں نے اسٹیونسن، رائیڈر ہیگرڈ، فینی مور کوپر کی کتابوں کی ایک اچھی خاصی لائبریری بھی بنالی (جسے میرے کواڈرینگل کے کمرے میں کسی نے چرا لیا)۔ میں نے زبانوں میں فارسی کی بجائے فرنچ چنی تھی مگر چونکہ میں اپنی کلاس میں فرنچ کا واحد اسٹوڈنٹ تھا، فرانسیسی پڑھانے والے استاد مسٹر ہیٹ (Mr. Hett) نے مجھے اکسانے کی کوشش کی کہ میں فرنچ کی بجائے کوئی اور زبان لے لوں۔ مسٹر ہیٹ نے فرنچ کی ایک کلاس بھی نہیں لی، اور مجھے یہ خیال نہ آیا کہ ایک زبان کا لینا ضروری ہے اور میں اسے فارسی سے بدل لوں۔ (یہی مسٹر ہیٹ بعد میں انگلستان کے ایک ہوٹل میں ہم جنسیت کے فعل میں ماخوذ ہوئے اور جہاں تک مجھے یاد ہے، اس وقت کے قانون کے تحت انھیں جیل ہوئی۔) گورنمنٹ کالج میں ویسے تو زندگی ٹھیک ٹھاک تھی مگر یہ بات کہ میرا زبان (language) کی کلاس میں نہ بیٹھنا گل کھلائے گا، میرے ذہن پر رہنے لگی۔ اسی اثنا میں میرے دادا کا ایک خط مجھے ملا۔ ان کے ایک 'جاسوس' نے (جو میرا ماموں زاد بھائی تھا اور لاہور پڑھتا تھا) انھیں اطلاع دی تھی کہ مجھے بھاٹی گیٹ پر ایک سنیما سے نکلتے اور دوسرے میں داخل ہوتے

دیکھا گیا۔ اس مخربِ اخلاق حرکت کے بعد خاندان کے بزرگ سر جوڑ کر بیٹھے اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ مجھے بہاول پور کے صادق ایجرٹن کالج میں داخل کر دیا جائے۔ میں نے بھی چون وچرا نہ کی۔ فرنچ کا نہ پڑھنا میرے ذہن پر سوار تھا۔ اس طرح گورنمنٹ کالج لاہور میں پہلی سہ ماہی کا امتحان دینے کے بعد (فرنچ کے بغیر) میں چپ چاپ دم دبائے بہاول پور چلا آیا۔ گو مائیگریشن ابھی زیرِ غور تھی، بہاول پور کالج کے پرنسپل مشتاق احمد زاہدی نے مجھے اپنے کالج میں داخل کر لیا۔ چار سال میں صادق ایجرٹن کالج میں اسٹوڈنٹ رہا اور ۱۹۳۸ء میں اس کے آستانے سے گریجویشن کی سند لیے باہر دنیا میں آیا۔

اس زمانے کی صادق ایجرٹن کالج کی عمارت میں اب صادق ڈین ہائی اسکول قائم ہو چکا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ گنبدوں، برجیوں اور کنگوروں سے مزین سرخ اینٹوں کی بڑی عمارت اپنے گراؤنڈ اور باغیچوں کے ساتھ اب بھی بہاول پور کی حسین ترین عمارتوں میں ہے اور اس فنِ عمارت کی مظہر ہے جو پچاس ساٹھ سال پہلے عباسیوں کی اس ریاست میں مقبول تھا۔ مجھے یہ ایک افسانوی قصرِ دل کشا لگی اور گورنمنٹ کالج لاہور کی، ستارہ ومحراب سے پُرغرور، کلیسائی عمارت سے کسی طرح کم نہیں۔ ایجرٹن کالج کی بنیاد انیسویں صدی کے اواخر میں ایک انگریز لیفٹیننٹ گورنر ایجرٹن صاحب نے رکھی تھی اور اس کی تاریخ بھی تقریباً اتنی ہی پرانی تھی جتنی لاہور گورنمنٹ کالج کی۔ اس کالج میں جلدی ہی میرا جی لگ گیا اور لاہور چھوڑنے کا ملال رفتہ رفتہ جاتا رہا۔

جب میں یہاں کا اسٹوڈنٹ بنا، پرنسپل مشتاق احمد زاہدی کی شخصیت کالج پر چھائی تھی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک طرح وہی خود 'کالج' تھے، یعنی اس کے روحِ رواں۔ مجھے وہ ایک چھریرے نکیلے جامہ زیب شخص کے طور پر یاد ہیں — سر پر فیض کیپ، بدن پر ریشمی اچکن سفید بے شکن پاجامہ، بکسوا لگی سیاہ گرگابی اور ہاتھ میں مضطر چھڑی۔ لڑکے ان سے بڑا خوف کھاتے تھے اور جب وہ کالج کے ایوانوں میں داخل ہوتے اور لڑکوں کو پتا چلتا کہ پرنسپل صاحب آ رہے ہیں تو وہ خالی کلاس روموں میں بھاگ کر چھپ جاتے۔ زاہدی تھے تو پرانے بی اے مگران کی لیاقتِ ذاتی اور تیزیِ ذہن مسلمہ تھی۔ یہ وہی مشتاق احمد زاہدی ہیں جن کا ذکر قرۃ العین حیدر کی 'آپ بیتی' میں ملتا ہے اور جو رشتے میں مس حیدر کے ماموں یا خالو لگتے تھے۔ زاہدی صاحب سے میں نے نہیں پڑھا۔ وہ غالباً بی اے فائنل میں انگریزی کی کلاس لیتے تھے۔ میرے کالج میں آنے کے چند ماہ بعد وہ ریٹائر ہو کر دتی چلے گئے۔ ان کا بیٹا

Scanned with CamScanner

آصف جو بی اے فائنل میں پڑھتا تھا، کافی ذہین و فطین، بجیلا اور اسمارٹ نوجوان تھا۔ بڑا اچھا مناظر (debator) اور انگریزی زبان کا لیکھک۔ وہ کالج میگزین میں لکھتا تھا اور ایک وقت اس کا اسٹوڈنٹ ایڈیٹر بھی رہا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار جب کالج ہال میں کسی موقعے پر موجودہ امیر کے باپ سر صادق محمد خاں مرحوم اور اس وقت کے انگریز ریزیڈنٹ بہادر آئے تو ان کے سامنے کالج کی ڈراما سوسائٹی نے ولیم شیکسپیئر کے ایک ڈرامے ہنری چہارم کے چند سین اسٹیج کیے۔ ان میں مشہور ہنسوڑ اور شیخی باز سر جان فالسٹاف کا کردار آصف نے کیا اور اس حسن و خوبی سے کہ سب عش عش کر اٹھے۔ (مگر یہ شاید میرے کالج میں آنے سے ایک آدھ سال پہلے کی بات ہے ——وہی 'یاد' کی چالاکیاں!)

کالج میں آکر میں نے کھیلوں میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ گو میں نے کچھ عرصہ ٹینس کے کورٹس پر بلے مارنے کی مشق کی، پھر اس کھیل کو اپنے بس کا روگ نہ پا کر میں نے اُسے اور دوسرے سب کھیلوں کو خیر باد کہا۔ دراصل میں ہمیشہ اپنے آپ کو ایک قسم کا 'لٹریری مین' (ادبی آدمی) تصور کرتا تھا اور میری آرزو تھی کہ بڑے ہو کر میں اسٹیونسن اور رائیڈر ہیگرڈ کی طرز کی مہماتی کتابیں لکھوں گا۔ میرا خیال ہے کہ اپنی اس آرزو میں میں کافی سنجیدہ تھا اور جہاں کبھی بھی میں جاتا، اپنے چہیتے مصنفوں کی ایک دو کتابیں میری بغل یا جیب میں ہوتیں۔ اسٹیونسن کی ایک کتاب سے پھاڑی ہوئی تصویر میں اکثر اپنے کوٹ کی بالائی جیب میں اپنے دل کے ساتھ رکھتا تھا۔ اس سے مجھے ایک گونہ خوشی سی ہوتی۔ شاید میرا خیال تھا کہ ایسا کرنے سے میں بھی کبھی اسٹیونسن کے مرتبے کا مصنف بن جاؤں گا —— آغازِ جوانی میں ہم سب خاصے احمق اور برخود غلط ہوتے ہیں۔

میں نے انگریزی میں دو تین بحری قزاقوں کی کہانیاں لکھیں اور انھیں اپنے باپ کی ٹائپ رائٹر مشین پر بڑی محنت سے اور ایک انگلی چلا کر ٹائپ کیا۔ مجھے وہ اس وقت شاہکار لگیں۔ مگر لکھنے سے زیادہ مجھے انگریزی ادب پڑھنے سے شغف تھا اور میں کالج کے فارغ پیریڈز میں بیشتر وقت لائبریری میں الماریوں میں سجی کتابوں کے پشتوں پر لکھے نام دیکھنے میں صرف کرتا۔ ادب کی میری پیاس غیر تسکین پذیر تھی، مگر میں ہمیشہ ان مصنفوں کی تلاش میں رہتا جو اسٹیونسن کی طرح 'ایڈونچرز' لکھتے تھے، مثلاً ڈوما، ورمن، کانن ڈوئل وغیرہ۔

خوش قسمتی سے جس ٹیوٹوریل گروپ 'سولجرز' میں میرا نام رکھا گیا، اس کے اتالیق (ٹیوٹر)

انگریزی کے سینئر پروفیسر پیرزادہ عبدالرشید تھے جن کو انگریزی ادب سے سچا لگاؤ تھا (یہ انگریزی زبان کے بہت کم استادوں میں ہوتا ہے)۔ وہ پہلے علی گڑھ میں تھے جہاں سے وہ گروہ بندی کی سیاست کا شکار ہو کر بہاول پور چلے آئے۔ ان کی لیاقت کا شہرہ بہت تھا مگر میں نے کبھی ان کے ہاتھ میں کوئی ادب کی کتاب نہیں دیکھی، نہ ہی ان کے قلم کی لکھی ہوئی کوئی چیز کالج میگزین میں میری نظر سے گزری۔ ایک زمانے میں انھوں نے یقیناً انگریزی ادب میں بہت کچھ لگن اور لطف سے پڑھا ہوگا، مگر اب انھوں نے اپنے 'ادبی لگاؤ' کو صرف کالج کے نصاب کی 'پوئٹری' اور 'پروز' تک محدود کر لیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنے انکتے رکتے لہجے میں جان کیٹس، شیلے اور رابرٹ برنز کی شاعری کا سحر کا کچھ حصہ اپنے سننے والوں کو دل نشیں کرانے میں کامیاب ہو جاتے تھے — یہ ایک استاد میں بڑی خوبی ہے۔ پیرزادہ عبدالرشید دیکھنے میں 'ادبی' نہیں لگتے تھے — میانہ قد، گدگدے سے، موٹیلی گردن ایک طرف جھکی ہوئی، سوٹڈ بوٹڈ۔ وہ ایک پھرتی کی، مدوّری چال چلتے تھے، جیسے چلنے میں ان کی ٹانگیں دائرے میں چکر کھا رہی ہوں۔ (اس زمانے میں تقریباً سب ہی پروفیسر اور لیکچرر سوٹڈ بوٹڈ ہوتے تھے ماسوائے فارسی یا عربی کے لیکچرروں کے۔ فارسی کے لیکچرر مولوی حاجی احمد تو باقاعدہ شلوار قمیص، اچکن اور دستار میں آتے تھے اور عربی کے لیکچرر مولوی شاکر محمد تو کئی بار کُرتے اور تہہ بند میں بھی کلاس میں آ بیٹھتے۔ فزکس کے پروفیسر ڈاکٹر شجاع منعمی مرحوم جو ابھی نامونس نہیں تھے، کبھی کبھار ایک پیلی رنگت کی پلس فور اور لمبی جرابوں میں بھی آ جاتے۔)

پیرزادہ رشید کا مکان برلبِ سڑک تھا، بہاول پور کے فرید گیٹ کے بالکل پاس (جو اس وقت بیکانیری دروازہ کہلاتا تھا)۔ وہ سرِ شام مکان کے باہر آرام کرسی میں دھنسے، چھوٹی گول میز پر جھکے — چندھی آنکھیں ''السٹریٹڈ ویکلی'' سے چپکائے، پنسل کے کچھ نشان لگاتے نظر آتے۔ ان کو اصل میں ''السٹریٹڈ ویکلی'' کے کراس ورڈ معمے حل کرنے کی لت تھی (یہ میرے باپ کو بھی تھی اور ان دنوں کئی پڑھے لکھے حضرات انھی معموں کے خبط میں مبتلا تھے)۔ عام طور پر مشہور تھا کہ پیرزادہ رشید کو ایک دو برس پہلے صحیح یا صحیح سے قریب کراس ورڈ حل کرنے پر ایک ڈیڑھ ہزار روپے کا انعام بھی ملا تھا۔ میں وہاں سے گزرتا تو میرا بڑا دل چاہتا کہ میں اس نامور انگریزی ادب کے پروفیسر کی خدمت میں حاضر ہوں اور اس سے اپنی 'ادبی' ریڈنگ کے بارے میں کچھ رہنمائی حاصل کروں۔ پیرزادہ صاحب کو اپنے کام میں محو

Scanned with CamScanner

دیکھ کر میری ہمت نہ ہوتی۔ آخر ایک شام جی کڑا کر کے اور سرتا سر پسینے میں شرابور میں ان کی چھوٹی میز کی طرف گیا جس پر ایک چھوٹا چمنی والا لیمپ جل رہا تھا۔ میں نے سلام کیا۔ انھوں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ پھر اپنے معمے کو چھوڑ چھاڑ اٹھ کھڑے ہوے اور کمال محبت اور گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ ''آؤ بیٹھو، کیسے آئے؟'' میں نے نروس انداز میں عرض حال کی کہ مجھے بتایئے کہ انگریزی کے کن کن نئے مصنفوں کو پڑھوں۔ نئے مصنفوں میں انھوں نے جے پی پریسٹلے کی تعریف کی اور پریسٹلے کی 'اینجل پیونٹ' (Angel Pavent) پڑھنے کو کہا۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ رابرٹ لوئی اسٹیونسن پر وہ زیادہ شیفتہ نہ تھے۔ کانریڈ اور تھامس ہارڈی کی (جنھیں میں نے بالکل نہیں پڑھا تھا) انھوں نے پُرزور سفارش کی۔ دس منٹ بیٹھ کر میں وہاں سے اٹھ آیا اور اس دن سے جے بی پریسٹلے اور کانریڈ کے ناول میرے زیرِ مطالعہ آگئے۔ ان دونوں لکھنے والوں کو میں نے بہت پڑھا ہے لیکن تھامس ہارڈی سے میری دوستی زیادہ نہ نبھ سکی—سالوں بعد میں نے ہارڈی کی ''ٹیس آف دی ڈوبرولز'' اور ''جیوڈ دی آبسکیور'' پڑھیں اور مجھ پر اس کی عظمت آشکارا ہوئی۔

میں دیکھتا ہوں میری 'یادیں' مجھے بھگائے لیے جا رہی ہیں اور مجھے ان کی باگیں کھینچ کر رکھنی ہوں گی۔ میں پہلے اپنے ٹیوٹوریل گروپ 'سولجرز' (جس کے صدر اور ٹیوٹر پیرزادہ عبدالرشید یا پی اے رشید تھے) کے بارے میں چند باتیں کہوں گا اور پھر کالج میگزین ''نخلستانِ ادب'' (انگریزی میں The Oasis) کی جانب آؤں گا۔ میری جتنی بھی انگریزی کہانیاں ''اوسس'' میں چھپیں، سب پہلے پہلے 'سولجرز' کے پندرہ روزہ اجلاسوں میں پڑھی گئیں۔ پہلی کہانی جو میں نے 'سولجرز' کی میٹنگ میں پڑھی ''گوسٹ آف اے پائیریٹ'' (Ghost of a Pirate) تھی جسے پیرزادہ رشید نے بے حد سراہا اور مجھ سے ''اوسس'' میں چھاپنے کے لیے لے لیا۔ دوسری دو کہانیاں بھی سمندری قزاقوں اور جہازوں کے بارے میں تھیں اور مجھے یاد ہے ان میں سے ایک نے ''اوسس'' کے صفحات پر جگہ پائی۔ میری ایک انگریزی میں لکھی ہوئی کہانی ''صبوحی'' تو 'سولجرز' کے اجلاس میں بڑی مقبول ہوئی۔ پیرزادہ صاحب نے اس رومانی لو اسٹوری کی بہت تعریف کی (اور ان کی اس تعریف سے میں خوشی سے پھولا نہ سمایا)۔ مگر بعد میں انھوں نے چند انگریزی الفاظ کے تلفظ کی غلطیاں بھی جتا دیں جو میں نے پڑھنے میں کی تھیں

Scanned with CamScanner

(میں آسمان سے زمین پر آرہا)۔ یہ کہانی (جو ''اوسس'' میں دھوم دھام سے چھپی) ایک لڑکے احمد شاہ کو بہت پسند آئی۔ یہ احمد شاہ ضلع خوشاب کے ایک پیر گھرانے کا صحت مند لڑکا تھا۔ نکلتا ہوا قد، چوڑے ہاتھ پاؤں، سرخی مائل تیکھا چہرہ، ہونٹ کے گوشے سے ٹھوڑی تک کسی تیز آلے کے گھاؤ کا چکتا۔ بانکی طرح دار پگڑی اور اچکن والا احمد شاہ ایک پیدائشی شاعر تھا— ان لوگوں میں سے جو دنیا میں خوبصورت گیت لکھنے کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔ 'صبوحی' کا نام اسے اتنا بھایا کہ وہ اس کی نظموں اور قطعات کی دیہاتی عورت بنی۔ میں اور احمد شاہ، جو ندیم تخلص کرتا تھا، بڑے گہرے دوست بن گئے۔ اگر میں لاہور سے بہاول پور نہ آتا اور 'سولجرز' میں نہ ہوتا تو شاید ہم ایک دوسرے کے قریب نہ آپاتے۔ 'سولجرز' میں میں ایک اور غیر معمولی ذہن کے مالک شخص سے بھی ملا جو آخری سال میں گروپ کا سیکرٹری ہوا۔ اس کا نام ضیاء الحق تھا۔ گداز طبیعت، سمندر کی طرح وسیع دل، بلا کا خوش گفتار، انسان دوست۔ ان اوصاف کے ساتھ وہ نہایت شکیل و جمیل نوجوان تھا اور جب وہ اپنی اونچے شملے والی پگڑی، بے شکن اچکن اور تلّے دار جوتی میں خراماں خراماں چلتا تو وہ فی الواقع انسانوں میں ایک شہزادہ دکھائی دیتا۔ ندیم اور ضیا دونوں میرے عمر بھر کے دوست بن گئے۔ ندیم کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہے، ضیا کو کوئی نہیں جانتا، مگر دونوں نابغۂ روزگار ہستیاں ہیں، مجھے ان کی دوستی پر فخر ہے۔

جہاں تک مجھے یاد ہے کالج میگزین کے اردو کے سیکشن میں چار سال کے عرصے میں میری صرف دو چار چیزیں چھپیں، وہ ڈوما اور اسٹیلنے ورمن کے ناولوں سے متاثر ہو کر لکھی گئی تھیں مگر تھیں بالکل اوریجنل۔ میرے دوستوں کو وہ خوب دلچسپ لگیں مگر ان سب نے مجھ سے کہا، ''بھئی سچ سچ بتاؤ، تم نے انھیں کہاں سے ترجمہ کیا۔'' دراصل ان کہانیوں کی سیٹنگ (setting)، لوکیل (locale)، کردار وغیرہ سب بدیشی (فارن) تھے۔ کوئی اور ایسی کہانیاں لکھتا تو میں بھی انھیں ترجمہ کہتا۔ اس پر مستزاد میری انگریزی اردو۔ اردو تب مجھے آتی نہیں تھی اور اب بھی ساری عمر جھک مارنے کے بعد بھی نہیں آئی۔ اتنے سال اردو زبان لکھنے کی مشق کرنے کے باوجود ابھی تک اس میدان میں گھٹنوں کے بل چلتا ہوں اور معمولی سا مفہوم بھی بلا تکلف اور صفائی سے اردو میں ادا نہیں کر سکتا۔ بہر حال ''اوسس'' (اور ''نخلستانِ ادب'') میں میری چھپی ہوئی نگارشات نے مجھ میں 'رائٹر' اور 'لٹریری مین' ہونے کا زعم ضرور پیدا کر دیا اور کالج میگزین ہی میں میں نے اپنے نام کو چھپا ہوا دیکھا۔

Scanned with CamScanner

میرا خیال ہے میرے وقتوں میں کالج میگزین کے مندرجات کا معیار اتنا گیا گزرا نہیں تھا۔ ندیم اور افسوں کی نظمیں تو بہت اچھی ہوتی تھیں۔ (کئی سال ہوئے افسوں وفات پا گئے۔) ''نخلستانِ ادب'' میں نثری مضامین، افسانے وغیرہ بالعموم بڑی شاعرانہ، رنگین زبان میں ہوتے تھے کہ اس وقت اسی طرز کا رواج تھا۔ ''ہمایوں''، ''عالمگیر''، ''ادبِ لطیف'' جیسے پائے کے ادبی رسالوں میں کئی لکھنے والے ایسی ہی زبان لکھتے تھے اور فصاحت و بلاغت کے دریا لنڈھاتے تھے۔ ان کی واہ واہ بھی ہوتی تھی۔ وہ نیاز فتح پوری، فلک پیا، آغا حشر کاشمیری کا دور تھا۔ کالج میگزین میں جواں سال ادیب اگر ان ثقہ انشا پردازوں کی پیروی میں رنگیں بیانی کی طرف مائل تھے تو ہم ان کو الزام نہیں دے سکتے۔ ویسے کالج میگزین سے بہت اونچے ادبی معیار کی توقع نہیں کی جانی چاہیے۔

ایک اور بات یہ تھی کہ کالج کے پروفیسر اور لیکچرار بھی ''اوسس'' یا ''نخلستانِ ادب'' میں لکھنے سے کنی کتراتے۔ ممکن ہے وہ لونڈوں اور طالب علموں کے میگزین میں چھپنا کسرِ شان گمان کرتے ہوں یا ان کے پاس کہنے کے لیے کوئی خاص بات نہ ہو۔ پی اے رشید جیسے اسکالر اور ڈاکٹر ایف ایم شجاع منعمی جیسے ادبی 'شیر' بھی اپنے رشحاتِ قلم سے اپنے کالج کے میگزین کو محروم رکھتے۔ حالانکہ احمد بخاری پطرس، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم اور گورنمنٹ کالج لاہور کے دوسرے پروفیسر وقتاً فوقتاً اپنے کالج میگزین ''راوی'' میں لکھتے رہتے تھے۔ ''راوی'' کے ادبی معیار کے دوسرے کالجوں کی میگزینوں سے قدرے بہتر ہونے کی وجہ یہ بھی تھی۔

''اوسس'' یا ''نخلستانِ ادب'' سال میں ایک بار ہی چھپتا تھا۔ شاید کبھی ایک سال میں دو شمارے آ گئے ہوں۔ میری طالب علمی کے چار سالوں میں انگریزی حصے کے نگراں تو پی اے رشید ہوتے تھے اور اردو حصے کے پروفیسر صادق علی جو اپنے نام کے آگے ریسرچ اسکالر فارڈی لٹ لکھا کرتے تھے۔ ایڈیٹر اور سب ایڈیٹر کئی گئے اور آئے۔ انگریزی اور اردو حصوں کے ادارتی بورڈ الگ الگ ہوتے تھے۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ میں کبھی ''اوسس'' کا ایڈیٹر یا سب ایڈیٹر نہیں بنا۔ ندیم کے بارے میں میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ اپنی تعلیم کے آخری سال میں ''نخلستانِ ادب'' کے ایڈیٹر بنے یا نہیں۔ (وہ مجھ سے دو سال سینئر تھے۔) میرے کئی دوست غلام ربانی، معین الدین حسن، سردار محمد ایوب مرحوم، اندر بھان کسی نہ کسی سال میں کالج میگزین کے ادارتی بورڈ سے منسلک ہوئے۔ ان دنوں انگریزی اور اردو حصوں کے ساتھ

Scanned with CamScanner

ایک ہندی کا حصہ بھی ہوتا تھا جس کے انچارج سنسکرت کے کوئی مہاشے پروفیسر تھے۔

ایک طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ بہاول پور میں ''اوسس'' یا ''نخلستانِ ادب'' پہلا خالصتاً ادبی رسالہ تھا جس میں معیار سے قطع نظر ادبی تحریریں شائع ہوتی تھیں۔ میں کالج کے تیسرے سال میں تھا۔ جب پروفیسر ایف ایم شجاع منعمی نے بہاول پور سے ایک 'باقاعدہ' ادبی ماہنامے ''محقق'' کا آغاز کیا۔ میں نے بھی ''محقق'' کے لیے دو تین کہانیاں لکھیں مگر اس رسالے کو پروفیسر صاحب زیادہ دیر تک نہ چلا سکے اور یہ پانچ چھ شماروں کے بعد بند ہو گیا۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں ''محقق'' کا ادبی معیار بھی کالج میگزین ''نخلستان'' سے کسی طور بہتر نہ تھا اور اس کے بند ہو جانے سے اردو ادب کا کوئی خاص نقصان نہیں ہوا۔

اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد بہاول پور آنے پر مجھے پچھلے چند ایک سالوں کے ''نخلستانِ ادب'' کے پرچے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ انگریزی حصہ (''اوسس'') اور ہندی حصہ اب اس کے ساتھ شائع نہیں ہوتے اور یہ اب خالصتاً اردو کا میگزین ہے جو سال یا دو سال میں ایک بار شائع ہوتا ہے۔ ''نخلستانِ ادب'' کا ادبی معیار یقیناً ہمارے وقتوں سے بہتر ہوا ہے مگر مجھے کچھ کچھ یہ تاثر ہوا کہ یہ طالب علموں سے زیادہ اب پروفیسر صاحبان کا میگزین بن رہا ہے جس میں معلموں اور پرانے طالب علموں (اولڈ بوائز) کی نگارشات کثرت سے ہوتی ہیں۔ میری رائے میں کالج میگزین کو نوجوان طالب علموں کی ہی ناپختہ ادبی کاوشوں اور ذہنی نکاس کے لیے وقف رہنا چاہیے کیونکہ کالج میگزین ہوتا ہی اس لیے ہے۔ 'معیاری' ادب کی اشاعت کے لیے تو لاہور، کراچی اور دوسرے شہروں سے کئی رسالے نکلتے ہیں۔

(سہ ماہی الزبیر، بہاولپور، سو سالہ صحافت نمبر)

شاعرِ بہار

جب میں فیض کی شاعری کا سوچتا ہوں تو تخیل کچھ ایسی تصویر بناتا ہے کہ بہار کی نرم صبح باغیچے کی ہر پتی، ہر شگوفے پر اپنے رنگ بکھیرے ہے اور ایک تنہا بلبل گلاب کی جھاڑی میں بیٹھا دھیمے راگ الاپ رہا ہے۔ اس نغمے میں کسک ہے اور درد، میٹھا میٹھا، اور سب سُر تیاں اتنی سبک اور لطیف کہ طبیعت کھل اٹھتی ہے۔ اس کے راگوں میں اتنی غنائیت، اتنا جادو ہے جو دل پر اثر کر جاتا ہے اور جو، سب منصف مزاج تسلیم کریں گے، اس کے معاصرین کی شاعری میں نہیں ملتا۔ اس جادو کے عنصر کے بغیر سب شاعری اور نظم گوئی مقفیٰ و مسجع عبارت آرائی کے سوا کچھ بھی نہیں؛ پروازِ فکر، نازک خیالی اور الفاظ کی سج دھج کے باوجود تاثیر کے طلسم سے خالی۔ اس کا اثر پڑھنے والے کے دل تک نہیں پہنچتا۔ اس لیے گو اردو زبان میں ہر سال بیسیوں شاعری کے مجموعے آب و تاب سے وارد ہوتے ہیں اور ہزاروں نظمیں اور غزلیں لکھی جاتی ہیں، اس کلام کے خدوخال خاص و عام کی نظر میں نہیں کھب پاتے۔ چند ایک نظمیں ہی ذہن میں اپنی دمک چھوڑ جاتی ہیں۔ بیشتر کو ہم پڑھنے کے بعد بھول جاتے ہیں اور دوبارہ نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے۔ اب فیض کے کلام میں وہ تبحرِ علمی اور شکوہِ الفاظ تو ہمیں نہیں ملتا جسے کئی لوگ شاعری کے لیے لازمہ قرار دیتے ہیں مگر اس میں جادو کا وہ عنصر ہے جس کے بغیر شاعری شاعری نہیں بن پاتی۔ ہم اس کی نظموں اور ترانوں کو بھول نہیں سکتے اور پلٹ پلٹ کر ان کی طرف لوٹتے ہیں۔ شاعری اس کے لیے ایسی ہی ہے جیسے گلاب کی پنکھڑی میں نرم آبی رنگ، اور وہ ایک پیدائشی شاعر ہے۔ وہ کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کی شاعری کی دنیا ے خیال گو حسن و عشق اور ظلم و استبداد کے خلاف انسانی جدوجہد کے مطالب میں محصور ہے، اس کے تخیل کا پرندہ بار بار انھی آشنا مناظر اور راستوں پر پرواز کرتا ہے، مگر ہم اس سے کبھی نہیں اکتاتے اور کبھی نہیں تھکتے۔ اس کے راگوں کی تازگی باسی نہیں ہوتی اور خدا جانے وہ بار بار پڑھنے پر بھی کیوں نہیں کملاتے۔ میرے خیال میں یہ اس لیے ہے کہ اس کا بات کہنے کا ڈھنگ انوکھا اور نرالا اور

مسحور کن ہے۔ ایک سچے مغنی کا ڈھنگ! اور وہ الفاظ کو اتنی سادگی اور پُرکاری سے استعمال کرتا ہے کہ اس کے اشعار اصلی موتیوں سے پروئی ہوئی لڑیوں کی مانند جھلمل جھلمل کرتے ہیں۔ ہم کو اقبال کی "نیا شوالہ" جیسی نظموں میں یہی سادگی اور پُرکاری ملتی ہے اور یہ نظمیں اس کی بہترین اور سب سے خوبصورت نظموں میں سے ہیں۔ گو اس نظریاتی دور میں کوئی ان کا ذکر نہیں کرتا (اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اقبال کی بعد کی شاعری کی عظمت اور خوبصورتی سے انکار کر رہا ہوں)۔

فیض کی شاعری شکوہ اور تجمل اور گھن گرج کی شاعری نہیں ہے جیسا کہ اقبال کی بیشتر شاعری ہے۔ اقبال کو پڑھتے ہوئے ہمیں اونچے برف پوش کوہساروں اور تند یلغار کرتے ہوئے سمندروں کی شوکت، ہیبت اور خوبصورتی کا احساس ہوتا ہے۔ نہیں، فیض کی شاعری میں کلامِ نبوت والی شان نہیں۔ یہ ایک گداز دل دھیمے مزاج کے مرنجاں مرنج، خوش ذوق، قدرے تساہل پسند شخص کی شاعری ہے جس کے دل پر دنیا کے آقاؤں اور فرماں رواؤں کی مجبور انسانیت پر ستم آرائیاں اور سفاکیاں چوکے لگاتی ہیں اور جو کبھی کبھی ظلم کے خلاف اپنی آواز اٹھائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ دھیمی، نرم، نغمگی سے پُر، تباہ کن آواز جسے اس کے چاہنے والے حرزِ جاں بنا لیتے ہیں اور جو صاحبانِ سطوت کو بے حد ناگوار گزرتی ہے۔ ان کا بس چلے تو وہ اس گستاخ شاعر کو کچا چبا جائیں۔ مگر وہ اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔ بلبل کو باغ میں اپنے گیت گانے سے کون روک سکتا ہے۔ میں اسے اقبال سے بڑا صحیح انقلابی نہیں سمجھتا، کیونکہ آگ اور بارود سے سلگتی ہوئی "لینن خدا کے حضور میں"، "باغی مرید" (گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن) اور "خدا کا اپنے فرشتوں کو پیغام" جیسی نظمیں اقبال کے علاوہ کون لکھ سکتا تھا۔ خدایانِ دین و حکومت جتنا چاہیں کہ اقبال نے یہ نظمیں نہ کہی ہوتیں اور اپنے کو خودی اور مسلمان کے مطالب تک محدود رکھا ہوتا، وہ اس کے کلام کے مجموعوں میں ابھی تک جوں کی توں موجود ہیں، اگرچہ ریڈیو یا ٹی وی پر کوئی مطربہ انھیں بھولے سے نہیں گاتی اور نصابی کتابوں میں ان کا وجود مفقود ہے، جیسے وہ نظمیں حکیم الامت اقبال کے بجائے کسی اور کی ہوں۔

فیض کے یہاں وہ مطالب اور کیفیات کا پھیلاؤ نہیں جو اقبال کی قدرت میں ہے مگر پھر اقبال کی شاعری میں ایک بڑے انسانی جذبے، مرد کی عورت سے محبت، کا سراغ کہیں نہیں ملتا، اور اس بڑے شاعر کا یہ خانہ حیرت ناک حد تک خالی ہے۔ میں نے اکثر سوچا ہے کہ اقبال اس لحاظ سے کچھ کچھ ایک

Scanned with CamScanner

بوڑھی، باشرم وحیا عورت ہے اور اس بشری محبت کو اپنی شاعری کی تھیم بنانے کا حوصلہ نہیں کر پاتا۔ وہ ایک دفعہ مشرق کے صورت گروں، شاعروں اور افسانہ نگاروں پر برسا کہ ان بے چاروں کے اذہان پر عورت سوار ہے، اور اسے یہ خیال نہیں آیا کہ فن کے کئی بڑے شاہکار حسینوں کی اس محبت سے ہی تو پھوٹے ہیں۔ اپنی شاعری میں صرف ایک جگہ اس نے وجودِ زن سے تصویر کائنات میں رنگ ہونے کا اقرار کیا ہے مگر اس نے انسانی محبت کے گیت نہیں گائے (اسی لیے شاید عورتوں کو اس کی شاعری اپنے دام میں نہیں لیتی)۔ اب فیض میں یہ خانہ بھرپور ہے اور وہ ایک قدرتی رومینٹک ہے۔ اس کی شاعری سے اس کی تپش کی آنچ کبھی نہیں گئی، اور وہ یقیناً ایک مستقل عاشق (constant lover) ہے جسے اس بڑھاپے میں بھی کیوپڈ کے تیر گھائل کرتے ہیں۔ منہ پھٹ سعادت حسن منٹو نے کہیں لکھا ہے کہ جب وہ امرتسر کالج میں پڑھتا تھا تو وہ اپنے استاد فیض احمد فیض کی پیغام رسانی کے فرائض سرانجام دیا کرتا تھا جس کی محبوبہ ایک پُرفضا پہاڑی مقام (غالباً ڈلہوزی میں) لیڈی ڈاکٹر تعینات تھی۔ میں فیض کی محبتوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا مگر مجھے کچھ کچھ شک ہے کہ وہ کبھی محبت کے اس جال سے رہائی نہیں پاسکا۔ مگر اس کی محبت ایک عظیم انگریزی شاعر جان کیٹس کی ایک عورت کے لیے جلتی ہوئی، بھسم کرتی ہوئی محبت سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی۔ یہ ایک ہلکی دبی دبی میٹھی محبت ہے جس کے لیے (میں سمجھتا ہوں) وہ اپنی جان کو جوکھوں میں ڈالنے کے لیے تیار نہیں اور جس کے لیے وہ مطلقاً کاہل ہے۔ گرانڈ پیشن (grand passion) اس نے شاید کبھی نہیں جانا اور شاید اٹھارویں اور انیسویں صدی کے شعرا ہی اس کے اہل تھے۔ گو میں اکثر سوچتا ہوں کہ اگر جان کیٹس زندہ رہتا تو کیا اس کی پہلی محبت اپنی ساری حدت اور وارفتگی کے ساتھ برقرار رہتی؟ محبت کی دبی دبی کیفیت کو جس خوبصورتی اور نغمگی اور لطافت سے فیض نے اپنی نظم میں سمو دیا ہے وہ کسی اور اردو کے شاعر کو نصیب نہیں۔ اور اس کی اس شاعری میں ابہام نہیں، ارغوانی سی دھند ضرور ہے۔

جس طرح فیض محبت اور دنیا کے ہر دھندے میں کاہل اور نرم رو ہے، اسی طرح وہ اپنی شاعری کے معاملے میں بھی ہے۔ کسی نے انگریزی ادیب ای ایم فارسٹر کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کی مشہوری ہر اس کتاب کے ساتھ بڑھتی گئی جو اس نے نہیں لکھی، اور یہ فیض کے بارے میں بھی سچ ہے۔ میں نے اس کی پہلی کتاب ''نقشِ فریادی'' اپنے کالج کے ایام میں پڑھی تھی، جب وہ انتیس تیس برس کا

Scanned with CamScanner

تھا، اور اسی پہلی کتاب سے اس کا اردو شاعری کے میدان میں سکہ جم گیا اور اس نے ایک شاعر کی حیثیت سے وہ مقام حاصل کرلیا جو کئی شاعروں کو برسوں کی جاں سوزی اور جگر کاوی کے بعد بھی نصیب نہیں ہوتا۔ اس کی ساری شہرت تین چار پتلے سو ڈیڑھ سو صفحات کے مجموعوں پر قائم ہے اور وہ تمھارے پُر گو، لگن سے کام کرنے والے والے طوفانی شاعروں میں سے نہیں جو مہینے میں کم از کم پانچ دس نظمیں، غزلیں نہ لکھ لیں تو انھیں چین نہیں آتا۔ فیض شاید اتنی نظمیں سال دو سال میں کہہ لیتا ہوگا۔ اور طویل نظم کی صنف میں اس نے کبھی طبع آزمائی نہیں کی۔ اس کی ساری نظمیں تقریباً بہت چھوٹی اور مختصر ہیں، اور مثنویوں اور کینٹوز سے وہ دور بھاگتا ہے۔ وہ اپنی جان ہلکان نہیں کرنا چاہتا اور شاید پُر گوئی اس کی طبیعت کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتی۔ مجھے فیض کی صحبت میں جم کر بیٹھنے کا اتفاق نہیں ہوا اور میں نہیں جانتا کہ آیا اپنے احباب کی محفلوں میں بھی وہ اتنا ہی کم سخن ہے۔ میرا گمان ہے وہ زیادہ باتیں نہیں کرتا ہوگا، کبھی غپ نہیں ہانکتا ہوگا لیکن اپنے سہج سہج سے ادا کیے ہوئے جملوں میں اپنی وسعتِ نظر اور اعلیٰ ذوق سے اتنی جان ڈال دیتا ہوگا کہ اس کے رفیق اس کے ساتھ بیٹھنے کو کسی اور کی صحبت پر ترجیح دیتے ہوں گے۔ اس کی مختصر جچی تلی باتوں میں گلوں کی خوشبو ہوتی ہوگی۔ منٹو نے جو فیض کے محبت ناموں کو اس کی محبوبہ تک پہنچانے کا مقدس کام اپنے سر لیا اور اس میں میدان اور پہاڑ کے چکر کاٹے تو غالباً اس لیے کہ فیض نے اپنی باتوں سے اس کا دل موہ لیا تھا۔ منٹو کو اپنے عاشق طبع استاد کی شاعری سے کوئی رغبت تھی یا نہیں، میں نہیں جانتا۔ وہ کسی شاعری کو زیادہ وقعت نہیں دیتا تھا، اگرچہ اردو شاعروں میں وہ صرف غالب کی عظمت کا قائل تھا اور وہ بھی شاید میرزا کے خطوط کی وجہ سے۔ اسے کبھی کوئی شعر یاد نہ ہو سکا۔

فیض کی ایک خوبی کا میں مداح ہوں۔ حسد کا جذبہ انسانوں کے خمیر میں گندھا ہوا ہے اور سب سے عام خصلتوں میں سے ہے۔ ادبی لوگوں میں اس کی کارفرمائی خصوصی طور پر بے حد شدید ہے اور نت نئے گھناؤنے فتنے جگاتی ہے۔ وہ ایک دوسرے پر رکیک حملے کرنے، پیٹھ پیچھے چھرا گھونپنے سے نہیں چوکتے۔ کھل کر فراخ دلی سے کسی کی تعریف کرتے نہیں، نہ سن سکتے ہیں۔ مجھے ہمیشہ ایسا لگا، فیض کو اس جذبے نے کبھی بے کل نہیں کیا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ ہو کہ جوانی ہی میں بین الاقوامی شہرت اس کی جھولی میں آن گری اور اپنے مشن کی کامیابی نے اس کے قدم چوم لیے۔ اسے کسی سے حسد کرنے کی

Scanned with CamScanner

ضرورت ہی پیش نہیں آئی، کیونکہ ناکامیابی ہی لوگوں کو کمینہ اور زہریلا بناتی ہے۔ میں نے اسے ادبی گروہ بندیوں، سازشوں اور جوڑ توڑ سے ہمیشہ لاتعلق دیکھا۔ اس کی ذات پر اونچے اور بھونڈے دار ہوتے رہے ہیں۔ اس کی شاعری کو رگیدا جاتا ہے۔ فیض کے ابرو پر اس سے بل نہیں آتا۔ وہ غصے سے پیچ و تاب نہیں کھاتا اور بدھ کی طرح شانت اور خنداں رہتا ہے۔ اسے کبھی یہ توفیق بھی نہیں ہوئی کہ اپنے کسی مداح کو کہہ کر اپنے ان عیب جوؤں اور گورکنوں کے لتے لے ڈالے اور ان کے منہ کو آئے۔ اس کی یہی بے پروائی، لاتعلقی اس کے حملہ آوروں، دشمنوں کو مشتعل اور بے بس کر دیتی ہے۔ سارا بارود گیلا ہو جاتا ہے۔ کریں تو کیا کریں۔ میں نے کسی جگہ پڑھا ہے کہ جب اٹیلا یا ہنی بال کی وحشی فوجیں (ان دو حضرات میں سے کس کا لشکر تھا مجھے یاد نہیں) فتح و نصرت کے جھنڈے اڑاتی روم کے شہر میں داخل ہوئیں تو یہ دیکھا کہ رومن سینیٹ کے باہر شہر کے فادرز (سردار) ان کی فتح کی للکاروں سے بے تعلق، پُرسکون اور نامضطرب چہروں کے ساتھ بیٹھے ہیں۔ وہ یہ دیکھ کر کہ اہل روم ان کی ظفریابی کی دو کوڑی کی پروا نہیں کر رہے، بڑے جز بز اور کچھ کھسیانے ہوئے۔ یہی روما کے سٹی فادرز کا سلوک فیض کا اپنے حاسدوں اور دشمنوں سے ہے۔ بہتوں کو یاد ہوگا کہ چند سال پہلے ملک کے ایک اعزاز یافتہ قومی شاعر نے ایک کثیر الاشاعت ڈائجسٹ میگزین میں فیض کے خلاف افترا اور بدگوئی کی ایک شدید مہم چلائی جو ماہ بہ ماہ جاری رہی اور جو نہایت درجے کے گرے ہوئے ذوق کی آئینہ دار تھی۔ اس میں فیض پر بڑے خوفناک بہتان باندھے گئے تھے اور اسے ایک ایسا غدار دکھایا گیا تھا جو چند بتانِ حسین اور شراب کی بوتل کے عوض اپنے ملک کا سودا کرنے کو ہر دم تیار ہے۔ قومی شاعر نے اپنے آپ کو نہایت پرہیزگار، پاکباز، صوم و صلوٰۃ کا پابند اور سچا محبِ وطن ظاہر کیا تھا اور ثابت کیا تھا کہ وہ نہ ہوتا تو ملک ایک بڑی طاقت کے ہاتھ لگ جاتا۔ چونکہ ہر کوئی قومی شاعر کے اپنے کردار کو اچھی طرح جانتا تھا، اس لیے سلیم الطبع پڑھنے والے ان بے سروپا جھوٹوں اور خود آرائیوں پر خوب ہنسے۔ اتنی بھونڈی تہمت بازی پر بہتوں کو گھن سی آئی۔ کسی کے جذبۂ حب الوطنی پر حرف رکھنا بڑا اوچھا حربہ ہے اور وہ لوگ جو اپنی حب الوطنی کے ڈھول دن رات پیٹتے رہتے ہیں ڈاکٹر سیموئیل جانسن کی رائے میں اصل شہدے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ فیض کی طرف سے اس بہتان طرازی کا مسکت جواب آئے گا۔ وہ چپ رہا اور مجھے یقین ہے کہ وہ محض ہنس دیا ہوگا اور اس کی رات کی نیندیں قطعاً حرام نہیں ہوئی ہوں گی۔ خدا جانے اس نے یہ مضامین پڑھنے کی

تکلیف بھی گوارا کی یا نہیں کیونکہ وہ حد درجہ کاہل ہے۔ کتے بھونکتے ہیں اور قافلہ اپنی راہ چلا جاتا ہے۔

شاید اسی کاہلی کی وجہ سے وہ ایک برا مکاتیب نگار ہے۔ اس کے ایک مداح نے کچھ سال ہوئے فیض کے خطوط، یادداشتوں اور جائزوں پر مشتمل ایک کتاب بڑے فخر اور دھوم دھام سے شائع کی تھی اور میرا دل چاہا کہ یہ قطعاً غیر ضروری تھی، کتاب نہ چھپتی تو بہتر تھا۔ ایسے تبرکات کو چھاپنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ وہ میرے لیے مایوس کن خطوط تھے، اور اسی طور اس بڑے شاعر اقبال کے خطوط جن کے مجموعے چھپے چلے جاتے ہیں، مجھے کاروباری سے اور ادبی چاشنی سے معرا لگتے ہیں۔ شاید بعض بڑے شاعر اپنی شاعری ہی میں خود کو بے نقاب کرتے ہیں اور اسی سے ہم ان کی ذات کی تھاہ پا سکتے ہیں۔ مگر فیض فن اور شاعری کا ایک صاحب ادراک پُرکشش نقاد ہے اور اس کی ادبی تنقیدوں کی ایک کتاب جو کئی سال پہلے میرے ہاتھ لگی دیکھنے کے لائق ہے۔ اس کی نثر کی تازگی، شگفتگی اور حسنِ بیان سے میں بڑا متاثر ہوا۔

فیض کو میں ایک آدھ بار ہی ملا ہوں۔ پہلی بار میں اسے ۱۹۶۶ء میں کراچی میں ملا جہاں وہ ہارونوں کے کسی آرٹس کالج سے منسلک تھا۔ میں کراچی میں رائٹرز گلڈ کی تقریب کے سلسلے میں آیا ہوا تھا۔ کسی نے مجھے بتایا کہ فیض کو میرا ناول ''چاکیواڑہ میں وصال'' بڑا پسند ہے اور وہ اس کی فلم بنانے کی فکر میں ہے۔ وہ مجھ سے اس سلسلے میں بات کرنا چاہتا تھا۔ میں اور ایک میرا دوست کوئی گیارہ بجے اس کے گلڈ کے دفتر کے پاس کے مکان میں پہنچے اور اُتھل پتھل ڈرائنگ روم میں صوفوں پر بٹھا دیے گئے۔ فیض غسل خانے میں تھا اور جلد ہی وہ باہر آیا۔ ملگجے اڑے ہوئے بال، بڑا سا سر، کشادہ پیشانی، چمکتی روشن آنکھیں، گول گیم چہرہ، متوسط قد اور گدگدا بھرا ہوا جسم۔ وہ ابھی تک دھاری دار شب خوابی کا لباس پہنے تھا۔ میں نے اپنا تعارف کرایا۔ اس کی آنکھوں میں ٹمٹماہٹ سی آئی اور اس نے کھڑے کھڑے سگریٹ پیتے ہوئے ہنستی ہوئی نگاہیں میرے نزار کھلے ہوئے جسم پر ڈالیں۔ وہ ایک دفعہ بھی نہ بیٹھا کیونکہ وہ اپنے کپڑوں کی تلاش میں تھا۔ میں نے اسے اپنی کتاب ''کھویا ہوا افق'' پر آدم جی ایوارڈ ملنے پر اس کا شکریہ ادا کیا کیونکہ وہ ایوارڈ کی مستحق ادب کی کتابوں کی کمیٹی کا چیئرمین اور سینئر ممبر تھا اور مجھے ایوارڈ صرف اس کی سفارش پر ملا تھا اور دوسرے ارکان نے چار و ناچار اتفاقِ رائے میں فائل پر اپنے دستخط کر دیے تھے۔ ''یہ دراصل پوسٹ ہیومس ایوارڈ ہے،'' اس نے کہا۔ میں قدرے چونکا۔ پوسٹ

Scanned with CamScanner

ہیومس تو مرے پیچھے ہوتا ہے۔ کیا فیض کا خیال ہے کہ میں مر چکا ہوں؟ اس نے وضاحت کی، ''ایوارڈ دراصل تمھیں 'چاکیواڑہ' پر ملا ہے۔''

''چاکیواڑہ میں وصال'' کئی سال پہلے طبع ہوئی تھی اور ابن انشا نے فیض کو اس کے پڑھنے کی ترغیب دی تھی۔ اس نے پھر بتایا کہ ''چاکیواڑہ'' پر فلم بنانے کا کام شروع ہو چکا ہے۔ اس نے اس کے اسکرپٹ کے کچھ صفحات بھی لکھ لیے تھے مگر وہ کہیں اوپر نیچے ہو گئے ہیں۔ فلمی یونٹ والوں نے لوکیشن وغیرہ بھی دیکھی ہیں۔ چند باتیں ہماری اور ہوئیں اور ہم اٹھ کر چلے گئے۔ دوسری بار کوئی پندرہ سال بعد میں اسے آرٹس کونسل میں ایک فنکشن پر ملا۔ میرے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے یقین دلایا، ''اب انشاءاللہ 'چاکیواڑہ' کی فلم ضرور بن جائے گی۔'' وہ فلم فیض کی کاہلانہ کوششوں کے باوجود نہ بن پائی اور کبھی نہیں بنے گی۔

وہ اب ملک سے باہر ہے۔ مشرق کے غارت زدہ پیرس بیروت میں — ایک بے ملک آدمی — اور ہم سب اس کے وطن لوٹنے کے منتظر ہیں جس کی گلیوں اور کوچوں میں اس کی روح اٹکی ہے۔ جب تک وہ نہیں لوٹتا اردو شاعری کے قطب نما کی سوئی بیروت کی جانب یا اس شہر کی سمت جہاں وہ اپنے سفر کے دوران مقیم ہوگا، تھرتھراتی رہے گی۔

(ماہنامہ آواز، کراچی)

Scanned with CamScanner

تبصرے

Scanned with CamScanner

سات سمندر پار

اختر ریاض الدین احمد

اردو سفری ادب میں بالکل مفلس ہے۔ کہنے کو تو بہت سے سفرنامے اس زبان میں ملیں گے (جو کوئی مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کو گیا اس نے لوٹنے پر اپنا سفرنامہ ضرور لکھا ہے) لیکن ان میں سے بیشتر راہنمائی کی کتابیں ہیں اور مقامات اور واقعات کی پھیکی سپاٹ فہرستیں۔ عموماً ان کا اندازِ تحریر کچھ اس قسم کا ہوتا ہے: "ہمارا طیارہ چار بج کر پینتالیس منٹ پر ٹمبکٹو ہوائی اڈے پر پہنچا۔ شیخ البیرونی الوجودی خوش قسمتی سے مجھے وہیں مل گئے۔ میں نے اپنا نام بتایا تو لپٹ گئے۔ ان کے شتر مرغ پر بیٹھ کر ہم ان کے دولت کدے پر پہنچے۔ فوراً ہی بعد دسترخوان چنا گیا جس پر بھنے ہوئے مسلّم حلال کچھوے، دریائی گھوڑے کے تلے ہوئے پائے، اُبلے ہوئے ٹڈے اور دوسری مختلف لوازمات تھیں۔ شیخ کے یقین دلانے پر کہ یہ سب حلال ہیں، جی بھر کر کھایا، اگرچہ بعد میں شدید بدہضمی کی شکایت ہوگئی جس کے اثرات اب تک کچھ کچھ باقی ہیں۔" میں اس مثال کو زیادہ طول نہیں دوں گا؛ پڑھنے والا سمجھ چکا ہوگا کہ میرا مطلب کن 'سفرناموں' سے ہے۔ حقیقت میں ہمارے ادب میں صحیح سفری کتاب ابھی تک نہیں لکھی گئی۔ اردو میں کوئی "لیونگرو" نہیں، نہ ہی کوئی "ٹریولز وِدا ے ڈنکی۔" ہماری قوم میں غالباً مہم جوئی اور ویگابانڈ اسپرٹ اور رومانی تخیل کا مکمل فقدان ہے۔

چند سال پہلے محمود نظامی کا سفرنامہ "نظرنامہ" آب وتاب سے چھپا، اور میرا خیال ہے کہ مصنف کو اس کے لکھنے پر کوئی ادبی قسم کا انعام بھی ملا۔ ذاتی طور پر اسے پڑھنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ اس کی ضرورت سے زیادہ تعریف کی گئی ہے۔ میں اسے ایک سفری کتاب نہیں کہوں گا اور اپنے طرزِ بیان میں وہ ان سفرناموں سے مختلف نہیں ہے جن کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ نظامی مرحوم کا مرصع، رنگین اور پُرتصنع اسلوب ایک سفری کتاب کے لیے موزوں نہیں۔ جہاں ایک فقرے سے کام چل سکتا ہے، وہاں انھوں نے چار ستعمال کیے ہیں۔ انھوں نے اپنے رنگوں کو بہت گاڑھا ملایا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جھاڑ جھنکار اور ٹہنیوں کی بہتات سے پھول اور کونپلیں اور پتے سب غائب ہوگئے ہیں۔

Scanned with CamScanner

میں نے اسے ایک بے حد اکتا دینے والی اور بوجھل کتاب پایا۔ اس میں سفر کا سحر بالکل مفقود تھا۔

اختر ریاض الدین احمد کی یہ کتاب ہماری امیدوں کو بڑھاتی ہے۔ یہ ایک حقیقی سفری کتاب ہے۔ اس سفرنامے میں ٹوکیو، موسکو اور چند دوسرے شہروں کے مرقعے ہیں جہاں انھیں جا کر رہنے کا اتفاق ہوا۔ انھوں نے اسے ایک چہکتے مہکتے اسلوب میں لکھا ہے — ایک سادہ اور فرح بخش اسلوب جو پڑھنے والے کے دل کو موہ لیتا ہے۔ وہ جدید اردو ادب کی روح فرسا فسردگی میں بہار کی تازہ ہوا کا جھونکا بن کر آئی ہیں۔ ان کے مرقعوں میں جماہیاں بہت کم ہیں اور دل بستگیاں اَن گنت۔ امریکی مزاح نگار ناول نویس مارک ٹوین کی ایک یادداشت، انگریزی ایسے اِسٹ (essayist) اور اخبار نویس اے۔جی گارڈنیر — جس نے 'ایلفا آف دی پلاؤ' (Alpha of the Plough) کے قلمی نام سے بہت سی خوبصورت کتابیں لکھی ہیں — نے اپنے ایک ایسے میں قلم بند کی ہے۔ مارک ٹوین اور گارڈنیر ایک شام ٹوین کے مکان پر دالان میں چٹختی ہوئی آگ کے پاس بیٹھے تھے۔ مسز ٹوین — جو ایک منتظم 'چوکور' عورت تھی اور ٹوین کے دل کا شرارہ — میز پر کھانا چننے میں مصروف تھی۔ یکا یک ٹوین کو کچھ خیال آیا۔ اپنی آنکھوں میں شرارت بھری ٹمٹماہٹ لیے اور اپنے پائپ کی ڈنڈی سے اپنی بیوی کی سمت اشارہ کرتے ہوئے گارڈنیر سے کہا: ''یہ عورتیں دل فریب چیزیں ہوتی ہیں لیکن خدا نے انھیں ظرافت کی حس سے بے بہرہ رکھا ہے۔''

اختر ریاض الدین کے ان سفری مرقعوں اور خاکوں کو پڑھنے کے بعد کوئی ان کے بارے میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان میں ظرافت کی حس نہیں۔ مجھے تو وہ سنجیدگی اور متانت اور بناوٹی شرم وحیا کی دشمن معلوم دیتی ہیں۔ ان کے بات کہنے کے ڈھب میں بڑی شوخی اور چلبلا پن اور لطافت ہے۔ یہی ایک صفت ان کی اس کتاب کو منفرد اور اچھوتا بنانے کے لیے کافی تھی۔ (ہم فی الواقع شگفتگی کے لیے ترس گئے ہیں!) وہ بظاہر بڑی سوجھ بوجھ اور علم وفہم والی خاتون نہ سہی مگر ان کی نظر حیران کن حد تک وسیع اور گہری ہے اور وہ بلاشبہ ایک سلجھے ہوئے تربیت یافتہ دل ودماغ کی مالک ہیں (جو افسوس ہے کہ ہماری عورتوں میں قدرے نایاب شے ہے)۔

کتاب کا انتساب ہی اس کے متن کا بنیادی سُر مہیا کرتا ہے۔ یہ تحریکِ امدادِ باہمی کے نام معنون کی گئی ہے اور ان الفاظ میں: ''تحریکِ امدادِ باہمی کے نام! جس کے تعاون کے بغیر یہ سفرنامہ کبھی

تکمیل نہ پاتا۔ نہ میاں کو دورے رہتے اور نہ مجھے دورے پڑتے۔'' اختر ریاض الدین احمد کے ''میاں'' ——یہ بتانے میں کچھ حرج نہیں—— محکمہ امدادِ باہمی کے سیکریٹری ہیں اور ہماری حکومت کے ذہین ترین اور قابل ترین افسروں میں سے ایک۔ اس انتساب کو غالباً اعلیٰ درجے کی ظرافت تو نہیں کہا جا سکتا مگر اس میں ایک معصوم (یا شاید جانی بوجھی) شگفتگی کا رنگ ہے جو ان کی شوخ طبعی اور طراری کو ظاہر کرتا ہے۔ بعض کو شاید اس مذاق میں سستے پن کی جھلک ملے مگر ایسا سوچنا غلط ہوگا۔ دراصل اختر ریاض الدین اتنی چنچل اور شوخ ہیں کہ وہ کہیں بھی نہیں چوکتیں۔ میں نے پہلے بھی لکھا ہے کہ وہ نہیں ہیں تو پروڈ (prude) نہیں ہیں۔ ذاتی طور پر مجھے ان کے انتساب کا یہ قدرتی (جین آسٹن کا سا) پچ اچھا لگا، اور ہر کوئی دیکھ سکتا ہے کہ کتاب کہنے کو تو تحریکِ امدادِ باہمی کے نام معنون ہے لیکن ہے دراصل ان کے میاں کے نام جنھیں وہ بہت چاہتی ہیں (یہاں میں بھی پروڈ نہیں بنوں گا)۔

پہلا مرقع ''ٹوکیو'' اس کتاب کے دلچسپ ترین سفروں میں سے ہے۔ وہاں وہ اپنے میاں کے ساتھ جیٹ میں گئیں۔ (انتساب نے ہمیں پہلے ہی بتا دیا ہے کہ ان کے میاں کو دورے رہتے ہیں۔) صبح دم جب انھوں نے اپنے صاف ستھرے ہوٹل کی کھڑکیوں سے باہر نگاہ ڈالی تو چیری کے گلابی شگوفے قطار در قطار کھڑے لہرا رہے تھے۔ وہ ان کی للک میں باہر آئیں اور ان کو چھوا تو انھیں دھچکا سا لگا۔ وہ کاغذ کے بنے ہوئے مصنوعی شگوفے تھے۔ جاپان میں قدرت کی صنعت کاریاں انھیں مختصر پیمانے پر لگیں۔ ان کا بڑا آتش فشاں پہاڑ انھیں ''پیارا سا سفید ریش بونا'' دکھائی دیا۔ ان کے باغ گڑیوں کے چمن لگے۔ ہر جگہ پھول ہی پھول! وہ لکھتی ہیں: ''پھول ہالینڈ کا پیشہ ہے بلکہ تجارت، لیکن جاپانیوں کا طریقِ زندگی ہے۔ ایک سڑا سا قصاب بھی اپنی دکان پر پھول اٹکائے بیٹھا ہے۔''

اپنے رفیقانہ باتونی لہجے میں وہ خوب فقرے چست کرتی جاتی ہیں جو بعد میں ایک دمک چھوڑ جاتے ہیں اور جن کو یاد کر لینے کو جی چاہتا ہے۔ چند ایک نمونے ملاحظہ ہوں: ''عورت وہاں کی بے تحاشا پلی ہوئی ہے''، ''صبح لمبی تان کر اٹھی تو سورج دیوتا کمرے کے اندر تھے اور میرے دیوتا کمرے کے باہر کانفرنس میں پاکستان کا تجزیہ کرنے''، ''ٹیکسی ڈرائیور کسی انجمنِ خودکشی کا رکن رکین معلوم ہوتا ہے''، ''وہ (جاپانی عورتیں) بولتی کیا ہیں کہ منھ سے رس ٹپکتا ہے اور ہمارے مردوں کے منھ سے پانی۔''

''ٹوکیو'' کے مرقعے کو پڑھنے کے بعد آپ نہ صرف ٹوکیو کے شہر کی اچھی طرح سیر کر لیتے ہیں

Scanned with CamScanner

بلکہ جاپانی لوگوں، ان کے رسوم و آداب، ان کے اداروں، ان کے کردار کے مختلف پہلوؤں سے بھی اچھی طرح واقف ہو جاتے ہیں۔ اختر ریاض الدین کا تاریخی اور سیاسی شعور قابلِ تحسین ہے اور قدرے چونکا دینے والا۔ جاپان کی تاریخی جھلکیاں جو انھوں نے دی ہیں، وہ بڑی دلچسپ ہیں اور خاصی معلوماتی، اگرچہ بعض جگہ مجھے محسوس ہوا کہ اُنھوں نے اپنے مرقعے کو 'جامع' اور 'فاضلانہ' بنانے کے لیے پیوندکاری کی ہے۔ انھوں نے خود ایک جگہ لکھا ہے کہ ''جاپانی گیشا'' کے بارے میں جاننے کے لیے انھوں نے دو تین کتابیں پڑھیں۔ ویسے تو تحقیق کا جذبہ بذاتِ خود بری چیز نہیں، اور کسی ملک یا قوم کی سیاسی یا معاشی تاریخ اس کے بغیر نہیں لکھی جا سکتی۔ اختر ریاض الدین نے اپنے تاریخی اور تحصیلی مواد کو قابو میں رکھا ہے اور اس میں کلام نہیں کہ شخصیتوں اور واقعات پر ان کی خیال آرائیاں دانش مندانہ اور متوازن ہیں۔

''موسکو'' کے مرقعے میں آپ ''برف کی بلوری تنہائیوں اور صنوبر کی برہنہ پرچھائیوں'' میں ہوائی اڈے سے شہر کا سفر کرتے ہیں، موسکو کی کڑی شدید سردی میں ٹھٹھرتے ہیں، زویا اور نیلو کی معیت میں سرخ اسکوائر کو دیکھتے ہیں۔ مصنفہ یہاں کچھ نیم پژمردہ گل داؤدی تین روبل میں لے کر لینن اور اسٹالن کے مزار پر چڑھانے کے لیے بھی گئیں۔ وہاں ان دونوں کی حنوط شدہ ممیوں کی نمائش انھیں نہ بھائی۔ موسکو کا مرقع بڑا ابھرپور اور جاندار ہے اور وہ اپنے قلم کی دو تین جنبشوں سے ایک شخص، جگہ یا منظر کی کیفیت بخوبی evoke کر لیتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ انشا پردازی کے فن سے بخوبی واقف ہیں اور پُرفریب سادگی اور صفائی سے جو کچھ وہ کہنا چاہتی ہیں، کہہ جاتی ہیں۔ میری رائے میں موسکو اور لینن گراڈ کے مرقعوں میں وہ اپنے تحقیقی جذبے کو قابو میں نہیں رکھ سکیں: ان کے تاریخی حصے ضرورت سے زیادہ سفری حصوں پر غالب ہیں۔ جہاں وہ اپنے اچھوتے، ہلکے، چنچل لہجے میں روزمرہ کی باتوں، چیزوں اور لوگوں کے بارے میں غپ مارتی جاتی ہیں، وہاں تو وہ پڑھنے والے کے دل و دماغ کو موہ لیتی ہیں — ایسے موقعوں پر وہ اپنا آپ ہوتی ہیں — لیکن ایسے موقعے بھی آتے ہیں جہاں وہ مضمون کی جامعیت کی رعایت سے یا اپنی فنی امنگوں کے دباؤ سے عبارت آرائی پر اتر آتی ہیں۔ اس سے ان کی تحریر میں تصنع آ جاتا ہے کیونکہ یہ تشبیہوں اور استعاروں سے رنگین لہجہ مصنفہ کا نہیں ہے، باہر کی چیز ہے۔ ان کی کتاب میں چند ایک ایسے ٹکڑے ہیں جنھیں غالباً مصنفہ نے بیان کو 'وقیع' یا مناسب طور

پر 'لٹریری' بنانے کے لیے جڑا ہے، مثلاً اسی فقرے کو لیجیے جسے قدرت اللہ شہاب نے اپنے پیش لفظ میں دہرایا ہے: "رات کی خنک خلا میں چاند اکیلا تنہا لٹک رہا تھا گویا ساری مخلوقات کے گناہ کی پاداش میں صلیب پر چڑھا دیا گیا ہو۔" میری رائے میں یہ دور از کار تشبیہ ہے جو دماغ میں گھنٹی نہیں بجاتی۔ یہ فقرہ جھوٹا اور پُر تصنع تاثر دیتا ہے اور میں اسے اچھی نثر نہیں سمجھتا۔ میں شکایت نہیں کر رہا ہوں؛ ایسے ٹکڑے اس سفرنامے میں کہیں کہیں ہیں، کیونکہ مصنفہ کی قدرتی سادگی، شگفتہ بیانی اور سلاست انھیں ایسی عبارت آرائی کی دلدل سے بچائے رکھتی ہے۔ میں ایک عام رجحان کی طرف اشارہ کر رہا ہوں جس سے ہم سب کو بھاگنا چاہیے اور وہ ہے خواہ مخواہ 'لٹریری' بننے کا رجحان۔ منٹو میں یہ نہیں تھا، اور یہ اس کی عظمت کے رازوں میں سے ایک ہے۔

"کراچی سے نیپلز"، "قاہرہ" اور "لندن اور نیویارک" تینوں اوّل درجے کے سفری خاکے ہیں اور ایک پیدائشی ادیبہ کے موقلم کے کھینچے ہوے۔ بیگم اختر میں ایک نادر ملکہ ہے — کردار تخلیق کرنے یا ان کو جیتا جاگتا پیش کرنے کا ملکہ۔ میرا خیال ہے ان کی اگلی کتاب ایک ناول ہوگی جس میں، بہت سے اردو ناولوں کے برعکس کردار، چوبی پتلے نہیں ہوں گے بلکہ گوشت پوست کے اصل انسان ہوں گے۔ ان کی وسعتِ نظر، تازگیِ مضمون اور دلیر شوخی ان کی بڑی ودیعتی قوتیں ہیں اور امید ہے کہ وہ ان کو زندگی کی مکروہات میں بجھ جانے اور زائل ہونے سے بچالیں گی۔ یہ گھریلو باتیں کرنے کا سلیقہ اور شگفتگیِ طبع اردو کے بہت کم لکھنے والوں کے حصے میں آئی ہے۔ یہی ان کے اصل تحفے ہیں۔ انھی کو پختگیِ فکر اور سلاست روی سے جلا دینے کی ضرورت ہے اور انھیں لفاظی اور مبالغوں اور انشا پردازی کے جھوٹے دیوتاؤں کے پیچھے نہ جانا چاہیے۔

اتنی اچھی کتاب اچھے طریق پر طبع نہیں ہوئی، غالباً یہ پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی کی طرف سے اردو ادبی کتاب چھاپنے کی پہلی جسارت ہے لیکن محض اس بنا پر اس ادارے کی افسوسناک کوتاہیوں سے درگذر نہیں کیا جا سکتا۔ املا کی غلطیوں سے یہ کتاب بھری ہوئی ہے اور کئی فقرے اتنے مسخ ہیں کہ مدعا ہی غتربود ہو جاتا ہے۔ میں اس سے یہی نتیجہ اخذ کر سکتا ہوں کہ کسی نے کتابت شدہ کاپیوں یا پروفوں کو نہیں دیکھا۔ مصنفہ شاید پروف ریڈنگ کی بیزار کن مشقت سے کترا گئیں اور یہ کام کسی اور کو سونپ دیا۔ ان کی ذرا سی سستی نے خوبصورتی سے لکھی ہوئی ایک کتاب کا رنگ روپ ذرا سا اڑا دیا۔

گرد پوش کے فلیپ پر "سویرا" کے ایڈیٹر ریاض چودھری کی تعارفی عبارت ہے — اس مرصع، پُر تکلف اور مہمل لفاظی سے پُر زبان میں جو گرد پوش کی عبارتوں کے لیے مروّج ہے۔ اس کو چار پانچ دفعہ پڑھنے کے بعد بھی مجھے پتا نہ چل سکا کہ ریاض چودھری کہنا کیا چاہتے ہیں۔ فلیپ کی عبارت کے لیے یہ گنجلک اور فنتاسٹک طرز آخر کیوں معمول بن چکا ہے؟ پچھلے فلیپ پر البتہ انتظار حسین کے تعارفی الفاظ مجھے پسند آئے۔ انتظار حسین کی سادہ، جھالروں اور آرائشوں سے معرا نثر نئے لکھنے والوں کے لیے اچھا نمونہ ہے، اور جو کچھ وہ کہنا چاہتے تھے اسے نہایت خوبی سے کہا ہے۔ اس کتاب کا رسمی تعارف نامہ مولانا صلاح الدین احمد کا ہے — وہی پُر شوکت اسلوب جس میں پرانی چاشنی کا مزہ قائم ہے۔ پیش لفظ قدرت اللہ شہاب نے لکھا ہے جو اس مصرعے پر ختم ہوتا ہے: "گیسوے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے"۔ اس بہت زیادہ استعمال شدہ مصرعے سے مجھے چڑ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ گیسوے اردو ابھی اور پچاس سال تک منت پذیر شانہ رہیں گے اور اس وقت اس خلائی زمانے کی دنیا کی زبان جارج آرویل کی Newspeak ہوگی۔ ادب کا سنہری زمانہ اب بیت چکا ہے، اور جب لوگ کہتے ہیں کہ فلاں فلاں مصنف کی کتابیں ابد تک باقی رہیں گی تو میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ابد ابھی کئی اربوں سال پرے ہے اور اگر کسی لکھنے والے کا نام سو دو سو سال ہی زندہ رہ جائے تو بھی غنیمت ہے۔

اختر ریاض الدین ان دو جغادری ادیبوں کے نعرہ ہاے تحسین اور چیئرز کے شور میں ادبی اکھاڑے میں آئی ہیں (اکھاڑا اس لیے کہ ہمارا ادبی سین آج کل اکھاڑے کا ہی سا سماں پیش کرتا ہے)۔ وہ اس اعانت اور سفارش کے بغیر بھی آتیں تو بھی ہم انھیں نظر انداز نہ کر سکتے۔ "سات سمندر پار" ایک اچھی، شگفتہ، چنچل سفری کتاب ہے۔ امید ہے مصنفہ کی طبیعت کی شوخی اپنی مزید جھلکیاں دکھلاتی رہے گی اور وہ ہمیں اور بہت سی اچھی پڑھنے کے لائق چیزیں دیں گی، لیکن تحقیقاتی، معلوماتی اور لٹریری نہیں — اس کام کے لیے اللہ کے فضل سے ہمارے ہاں علاماؤں اور ڈاکٹروں کی کھیپ کی کھیپ موجود ہے۔

(فنون، لاہور، جنوری ۱۹۶۳ء)

یہ بیویاں یہ کلرک

اسرار اشفاق

پندرہ بیس سال پہلے جب ہم لڑکے تھے اور ''عالمگیر'' اور ''نیرنگِ خیال'' جیسے اردو کے ماہنامے سہ رنگی بھڑکیلی تصویروں سے مزین اپنے ضخیم خاص نمبر اور سالنامے نکالا کرتے تھے، اردو مزاح خوب زوروں پر تھا اور بہت سے لوگ مزاحیہ تحریریں لکھتے معلوم ہوتے تھے — ملا رموزی، ناکارہ حیدرآبادی، فرحت اللہ بیگ، شوکت تھانوی جیسے لوگ۔ ہم ان کے مضامین اور افسانوں پر ہمیشہ پل پڑتے اور لڑکوں کی قدرتی جولانیِ طبع کی وجہ سے آسانی سے اور خوب خوب ہنستے تھے۔ لیکن ان سب کا بادشاہ عظیم بیگ چغتائی تھا جو فی الواقع 'ناقابلِ مزاحمت' تھا۔ اس کا نام کسی کہانی کے سرے پر دیکھتے ہی خود بخود گدگدیاں ہونے لگتی تھیں اور پڑھنے سے پہلے ہی آدمی کی باچھیں کھل جاتیں اور ہنسی ضبط کرنا مشکل ہوتا۔ عظیم بیگ چغتائی کی بعض کہانیاں مجھے اب بھی یاد ہیں — ''انگوٹھی کی مصیبت'' اور ''لوٹے کا راز'' اور ''الشذری'' — اور میں اب بھی سمجھتا ہوں کہ وہ ہمارے بہترین قدرتی مزاح نگاروں میں تھا، چلبلے پن اور ہنسی مذاق کا پٹارا۔ ناکارہ حیدرآبادی بھی اچھا تھا اور مجھے یاد ہے کہ اس کی ایک کہانی نے مجھے بڑا ہی ہنسایا۔ ملا رموزی، جس کا مزاح کافی حد تک لق لق کی طرح اس کے نام میں تھا اور کچھ اس کی گلابی اردو میں، جلد ہی باسی ہو گیا۔ پھر شوکت تھانوی کی ''سودیشی ریل'' نے ایک سنسنی پیدا کی اور بڑی مشہور ہوئی۔ اس کے بعد جو کچھ اس نے لکھا وہ اس کا اینٹی کلائمکس معلوم ہوا۔ غالباً ۱۹۳۲ء میں ایک چھوٹی سی کتاب ''مضامین پطرس'' میرے ہاتھ لگی اور مجھے یاد ہے کہ میرے ایک دوست اور میں نے ان مضامین کو اتنے قہقہے مار کر پڑھا کہ ہنسی سے ہماری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ان دنوں یہ کتاب مجھے مزاح کی معراج لگی تھی اور مجھے یقین تھا کہ اس سے زیادہ ہنسانے والی کتاب اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ پطرس نے اس کے بعد کچھ نہیں لکھا — کم از کم مزاح کی صنف میں کچھ نہیں — مگر وہ شہرت جو اسے حاصل ہوئی اب تک باقی ہے۔

یہ سب مزاح نگار اب کہانی بن چکے ہیں۔ کیا ان کو اب کوئی پڑھتا ہے؟ (مگر کیا آج کل کوئی کسی کو پڑھتا بھی ہے؟) لڑکپن میں ہم جلدی اور آسانی سے ہنستے ہیں اور یہ لکھنے والے اب اتنے فنی

(funny) نہیں لگتے۔ ممکن ہے نقص ہم میں ہو اور ہم زیادہ بڑے اور سنجیدہ ہو گئے ہوں۔ اصل وجہ کچھ اور ہے۔ ایسی ظرافت اور مزاح جو اعلیٰ درجے کا نہ ہو، اس کے فیشن پتلونوں، کوٹوں اور شلواروں کی طرح ادلتے بدلتے رہتے ہیں اور وہ چیزیں جو ایک نسل کو بہلاتی اور ہنساتی ہیں دوسری نسل کے لیے مطلقاً فنی نہیں ہوتیں۔ آج کل ''اودھ پنچ'' کی قسم کی شوریدہ ظرافت جو پھکڑ پن کے کنارے سے سرا ملاتی ہے، ہمیں معمولی سا ہی محظوظ کرتی ہے۔ ہم اپنے مزاح میں کچھ اور گہرائی، تیکھا پن اور عمدگی چاہتے ہیں۔ ''گلیورز ٹریولز'' اور والٹیر کی ''کینڈیڈ'' کا مزاح سب وقتوں کے لیے ہے اور اس قسم کا مزاح جو پی جی ووڈ ہاؤس لکھتا ہے، کچھ وقت کے بعد مشینی اور بے جان ہو جاتا ہے۔ میرا کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ ہمارے ہاں اب اچھے مزاح نگار نہیں رہے۔ کپور اور شفیق الرحمٰن فرسٹ ریٹ ہیں اور انھوں نے ہزاروں کو ہنسایا ہے اور اگر وہ خوش نصیب ہوئے تو شاید دو ہزار بعد المسیح تک ان کی کتابیں پڑھی جائیں گی۔ رشید احمد صدیقی اور اس طرز میں دوسرے لکھنے والے صحیح معنی میں اور کچھ ہوں تو ہوں، مزاح نگار نہیں ہیں۔ ان کا مزاح بہت کچھ لفظوں اور عبارت آرائی سے پیدا کیا ہوا ہے، ایک بہت ہی مصنوعی اور پُر تکلف قسم کا مزاح جس میں اریل قسم کی قدرتی پلپلاہٹ اور شگفتگی کا ذرا بھی گزر نہیں۔

زیرِ تبصرہ کتاب ''یہ بیویاں یہ کلرک''، جو ایک نئے مزاح نگار کا اعلان اور تعارف کراتی ہے، بیس سال پہلے چھپتی تو واقعی فنی سمجھی جا سکتی تھی، اب اس میں گئے گزرے مزاحیہ سنہری دور کی پھپھوندی سی لگی ہوئی ہے۔ مصنف، جو آرمی جی ایچ کیو میں سپرنٹنڈنٹ ہیں، اچھے پُر مذاق اور خوش طبع شخص لگتے ہیں، اور ان کے سب دوست —— جن میں ان کے ناشرین کی انجمن کے صدر، اس انجمن کے سیکرٹری، شوکت تھانوی اور ہر دل عزیز خاتون ناولسٹ زبیدہ خاتون (بنت اے آر خاتون) شامل ہیں —— اس چھوٹی ادبی پیشکش کو مناسب طریق سے لانچ کرنے میں ان کی معاونت کی خاطر ان کے گرد و پیش اکٹھے ہو گئے ہیں۔ ان حضرات اور خاتون نے دوستی کا حق پورا پورا ادا کیا ہے۔ کتنی اچھی بات ہے! میں نے کبھی کسی کتاب کے اتنے بہت سے دیباچے، پیش لفظ اور تعارف نامے نہیں دیکھے۔ مصنف کے اپنے تعارف کے علاوہ ان کے چار دوستوں نے بھی دیباچہ نگاری کے نیک کام میں حسبِ توفیق حصہ لیا ہے اور ان کے بعض خیالات بے حد اچھوتے ہیں۔ مرزا محسن برلاس ایم اے، بی ایس سی (علیگ) نے، جو اس کتاب کو شائع کرنے والی انجمن اردو مصنفین کے صدر ہیں، اپنے دیباچے بعنوان ''مزید قدم'' کو

ارسطو کے نظریے سے شروع کیا ہے۔ آگے چل کر وہ اپنے مصنف اسرار اشفاق کی ہمہ گیر قابلیت، دماغی صلاحیت اور حساس دل کی ضمانت دیتے ہیں اور اس امر کے لیے شکر گذار ہیں کہ جناب اسرار اشفاق نے اپنی اس نادر تصنیف سے متعلق جملہ حقوق بغرض اشاعت انجمن کو تفویض کیے اور پاکستان میں صرف انجمن کو اس کا اہل سمجھا کہ وہ اس کو چھاپے۔ پھر وحید الحسن ہاشمی نے، جو انجمن کے سیکرٹری ہیں، طنز ومزاح کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کی رائے میں قیامِ پاکستان کے بعد یہ خیال جڑ پکڑ چکا تھا کہ اب اس آخری دور کے بعد، جس میں پطرس بخاری کا بھرپور طنز تھا اور فرحت اللہ بیگ کا مزاحیہ ادب، کوئی دوسرا طنز ومزاح نگار پیدا نہیں ہوگا۔ لیکن شوکت تھانوی کے الفاظ میں جناب اسرار اشفاق نے اس مفروضے کو غلط ثابت کردیا ہے۔ بریوو! بریوو، سیکرٹری صاحب! تیسرا پیش لفظ شوکت تھانوی مرحوم نے لکھا ہے (انھوں نے یقیناً اسے مرنے سے پہلے لکھا ہوگا)۔ شوکت نے بزمِ مزاح میں ایک نئے مزاح نگار کا خیر مقدم کرنے کا شرف حاصل کرنے پر خوشی کا اظہار کیا ہے اور دعا کی ہے کہ اسرار اشفاق کے لیے داد (یعنی مزاح کی) سازگار ثابت ہو اور وہ اپنی منزل سے نہ بھٹکیں۔ انھوں نے اسرار اشفاق صاحب کو دو چار مشورے بھی دیے ہیں جن پر کاش وہ خود بھی عمل کرتے تو ہم بہت سے ادبی جھاڑ جھنکاڑ سے بچ جاتے۔ میرے خیال میں یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ شوکت تھانوی دوسرے درجے کے مزاح نگار تھے اور اپنی صلاحیتوں کے باوجود انھوں نے اتنی روا روی میں لکھا کہ ان کے مزاح کی بجائے خود ان پر ہنسی آنے لگی۔ آخری دیباچہ جو سرٹیفکیٹ کی شکل میں ہے زبیدہ خاتون بنت اے آر خاتون کا ہے۔ ہر کوئی جانتا ہے کہ وہ شہرۂ آفاق ناولسٹ کی بیٹی ہیں اور خود بھی ماشاء اللہ ناولسٹ ہیں۔ (بعض خواتین کا خیال ہے کہ وہ اپنی والدہ سے بھی اچھا لکھتی ہیں۔) سرٹیفکیٹ میں زبیدہ خاتون نے خود بھی مزاح نویسی کی مشق کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ لکھتی ہیں، ''آپ (جناب اسرار اشفاق) کی تحریروں میں سادگی ہونے کے باوجود سیکڑوں شرارے بھی چھپے ہوے ہیں جو کہ خدا نے چاہا تو ترقی کرتے کرتے ایسے روشن ہو جائیں گے جو اندھوں کو بھی نظر آنے لگیں گے۔''

کتاب کا انتساب ''محترم ادب نواز دوست مرزا محسن برلاس کے نام'' ہے، جیسا کہ ہونا ہی چاہیے تھا۔ میں نے خود اپنی پہلی کتاب اپنے ناشر کو معنون کی تھی۔ یہ ہمیشہ ایک اچھی پالیسی رہی ہے، اگرچہ اس کی بنا پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آئندہ بھی مصنف اور ناشر کے باہمی تعلقات اتنے ہی اچھے رہیں گے۔

Scanned with CamScanner

میرے اس چھیڑ چھاڑ کے لہجے کے باوجود کسی کو یہ گمان نہ ہونا چاہیے کہ کتاب بذاتِ خود کسی کام کی نہیں۔ مصنف اور اس کے دوستوں کی باہمی ستائش دراصل ان کی اس امر سے مکمل بے خبری کی بنا پر ہے کہ اعلیٰ ظرافت کیا ہوتی ہے۔ یہ جناب اسرار اشفاق کی پُرکشش جھجک اور منکسر مزاجی کا بھی پتا دیتی ہے۔ میں ہائی برو (high brow) نہیں بننا چاہتا لیکن اگر ایک شخص نے ''کینڈیڈ'' یا بہترین یورپی مزاح پڑھا ہے تو قدرتاً اس کا ظرافت کا معیار قدرے مختلف ہو جاتا ہے۔ میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اسرار اشفاق اور ان کے پرخلوص دوستوں کو یہ اطمینان نہیں کر لینا چاہیے کہ یہ کتاب ایک شاہکار ہے یا ہمارے مزاحیہ ادب میں ''مزید قدم'' ہے، کیونکہ یہ کوئی شاہکار یا اس کے لگ بھگ کی کوئی چیز نہیں ہے۔

یہ مزاحیہ مضامین یا خاکوں کی کتاب مبتدیانہ اور ہلکی پھلکی ہے مگر پڑھی جا سکتی ہے۔ اسرار اشفاق منجھے ہوئے ادیب نہیں اور ان کی تحریر میں کچھ کچا پن ہے، کالج میگزین کی یاد دلاتا ہوا۔ البتہ اُن میں ایک اچھی بات یہ ہے کہ وہ بڑے بھولپن سے اور تصنع کے بغیر لکھتے ہیں۔ ان میں تکلف اور انشا پردازی کا نام و نشان نہیں اور ان کے مزاح کے نمونے، سنٹکس (syntax) کی لغزشوں سے قطع نظر، روایتی مزاح نگاروں کی تحریروں کے مقابلے میں کسی طرح کم نہیں۔ میں نے کتاب کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک پڑھا، آسانی سے اور دلچسپی سے، اور آج کل ایک کتاب کا پڑھنے کے لائق ہونا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ بعض مضامین واقعی اپنی طرز میں خاصے اچھے اور پُرلطف ہیں، مثلاً ''خدا بچائے ان کلرکوں سے'' یا ''ہائے بیویاں'' یا ''تو چھٹی لے کے آجا بالما''۔ ہمارے دوست کے ان چند مضامین میں اچھے مشاہدے کا ثبوت ملتا ہے اور کالج میگزین ٹائپ مزاح زیادہ نہیں کھٹکتا۔ کلرکوں اور اُن کی بیویوں کو یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہیے۔ اول الذکر کو اس سے پوری طرح اپنی بے بسی اور مظلومیت کا احساس ہوگا، اور بیویاں شاید اس کے مطالعے کے بعد بہتر بیویاں بن جائیں اور ستے ہوئے سادہ مزاج شوہروں کو پریشان کرنا چھوڑ دیں۔

(فنون، لاہور، اپریل مئی ۱۹۶۴ء)

انسان

صلاح الدین اکبر

ایک شہرۂ آفاق اور مقبولِ عام ناولسٹ نے ایک دفعہ انگریزی اور یورپی ادب پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے مجھ سے کہا (اس وقت ہم ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی لانچ ''ہیلن'' میں سندر بن کی یاقوتی اور زمردیں دنیا میں سے گزر رہے تھے): ''دوستووسکی! دوستووسکی کی کیا بات ہے! انگریزوں نے دو اس مرتبے کے ناول نویس پیدا کیے ہیں، ایک ہال کین اور دوسری میری کوریلی۔ ہال کین اپنے مرتبے میں دوستووسکی اور میری کوریلی کے درمیان میں آتا ہے۔'' میں ہنسنا چاہتا تھا لیکن ناولسٹ کے احساسات کو صدمہ نہ پہنچانے کی خاطر میں نے اپنا منھ اتنا سیدھا رکھا جتنا ممکن تھا۔ میرا خیال ہے بے چارے دوستووسکی کا نام اس نے کہیں سن رکھا ہوگا، اور ہال کین اور میری کوریلی دو ہی انگریزی مصنف ہوں گے جنھیں اس نے پڑھا ہوگا۔ اس رائے کے مضحک پہلو سے مجھے یہاں بحث نہیں (ہال کین اور میری کوریلی کے نام انگریزی ادب کی کسی تاریخ میں نہیں لیے جاتے، اگرچہ وہ اپنے وقت میں زبردست بیسٹ سیلرز تھے)۔

ناول نگاروں میں صلاح الدین اکبر کا مقام کہاں ہے؟ ناولسٹ پامپس (Pompus) کی کتاب سے ایک ورق اڑاتے ہوئے میں یہ کہوں گا کہ ناول ''انسان'' کو پڑھنے کے بعد انھیں میکسم گورکی اور دیہات سدھار کے ایف ایل برین کے درمیان جگہ دی جا سکتی ہے۔ اس ناول میں گورکی کی ''ماں'' کی گونجیں ہیں ـــ اور ظاہر ہے کہ ''انسان'' کا مصنف گورکی نہیں ہے۔ ویسے ''ماں'' اتنا بڑا ناول نہیں۔ جب ایک لکھنے والا مبلغ اور مصلح کا جبہ اوڑھ لیتا ہے تو وہ تخلیق کرنے سے لاچار ہو جاتا ہے۔ اسی لیے ''ماں'' کو ایک اچھا سماجی اور معاشی پمفلٹ تو کہہ سکتے ہیں، ایک اچھا ناول نہیں۔ یہی المیہ صلاح الدین اکبر صاحب کے ساتھ گزرا ہے، اور چونکہ ان کی صلاحیتیں میکسم گورکی سے بہت کم ہیں (انھیں اس کا برا نہیں ماننا چاہیے) ان کا ناول ایک مری ہوئی بے جان سی چیز بن کر رہ گیا ہے۔ جس میں اسٹیج کا تاثر ہے اور کردار بناوٹی انداز میں گفتگو کرتے ہیں۔ چار سو صفحات کے اس ناول میں لہو اور زندگی کی ایک

Scanned with CamScanner

رمق بھی نہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ انھوں نے یہ ناول بڑی لگن اور اخلاص سے لکھا ہے، اور اگر لگن اور اخلاص ایک اچھا ناول لکھنے کے لیے کافی ہوتے تو ''انسان'' واقعی ایک عظیم ناول ہوتا، لیکن جیسا کہ ہم سب، جو قلم گھسیٹنے کے ہنر میں اپنی جانیں مارتے ہیں، جانتے ہیں کہ تخلیق کے لیے خالی لگن سے کچھ نہیں ہوتا۔ بالعموم آدھی رات تک چراغ کا تیل جلانے سے جو کچھ لکھا جاتا ہے اس میں صرف تیل کی بو آتی ہے۔ صلاح الدین اکبر کے مختصر افسانے میں نے کسی زمانے میں پڑھے تھے۔ میں اب انھیں بھول چکا ہوں۔ جہاں تک مجھے یاد ہے وہ اچھے نپے تلے افسانے تھے اور ایڈیٹروں کی مروجہ زبان میں ''مصنف کا مستقبل تابناک تھا''۔ ان کا پہلا ناول میں نے نہیں پڑھا۔ ''انسان'' ان کا دوسرا ناول ہے، چند ایک برسوں کے وقفے کے بعد لکھا ہوا۔ میں نے اس ناول کو بہت سی توقعات سے پڑھنا شروع کیا اور پھر اس لیے بھی کہ گرد پوش پر مولانا صلاح الدین احمد اور پروفیسر عابد علی نے اس کی بہت تعریف کی تھی۔ مولانا صلاح الدین احمد اپنی رنگین، جوہردار زبان میں ہر نئے لکھنے والے کو بڑی فیاضی سے داد دیتے ہیں — اور یہ ایک اچھی بات ہے۔ پروفیسر عابد علی عابد نے قدرے رکھ رکھاؤ اور وضع داری کی ریت برتی ہے اور اپنی رائے کو اس دعا پر ختم کیا ہے کہ خدا حسن قبول ارزانی فرمائے۔ کیا یہ ناول واقعی مولانا کے کہنے کے مطابق اول درجہ کی تخلیق ہے یا دونوں حضرات نے مصنف کا دل رکھنے کی کوشش کی ہے؟ گرد پوش پر تعارفی الفاظ لکھنے والے اچھی بری چیز کو خوب خوب سراہنا فرض سمجھتے ہیں۔ اگر یہ ان دونوں قابلِ احترام ادبی بزرگوں کی حقیقی رائے ہے تو مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ناول کی فنی عظمت کے بارے میں ان کے نظریات بالکل ناپختہ (lopsided) ہیں۔

میں نے اس ناول کو توقعات سے اس لیے پڑھا کہ اردو میں اچھے ناول کم ہی لکھے جاتے ہیں اور آدمی کو ہمیشہ یہ امید رہتی ہے کہ وہ اچانک ایک ایسا ناول پڑھے گا جس کے گن اور فنی خوبیاں اسے حیران کر دیں گی۔ فلیپ پر اپنی تصویر میں صلاح الدین اکبر ایسے ہی مصنف کا تصور دیتے تھے جن سے ایک شاہکار لکھنے کی امید باندھی جا سکتی تھی — فراخ پیشانی، سلجھا ہوا ہمدرد چہرہ، مسکراتی ہوئی آنکھیں۔ مگر ناول کے پہلے چند صفحات پڑھنے کے بعد ہی مجھے مایوسی ہوئی — جیسے کہ مجھے ہمیشہ ہوتی ہے۔ مگر میں پڑھتا گیا، اسی لگن اور اخلاق سے جس سے ڈاکٹر صاحب نے یہ ناول لکھا ہے۔ مجھے اس پر ریویو لکھنا تھا، اور مجھے اس ناول کے لکھنے والے سے بہت ساری محبت ہو گئی۔ وہ مجھے بڑا درد رکھنے والا انسان

لگا، خلوص اور آئیڈیلز سے پُر انسان جس کا دل ساری انسانیت کی تڑپ سے لبریز تھا۔

ڈاکٹر صاحب ایک اچھے پمفلٹ لکھنے والے ہیں مگر ناولسٹ نہیں۔ انھوں نے ابھی اپنی تھیم کو کہانی کے تار و پود میں گوندھنے کا کسب نہیں حاصل کیا، اور شاید یہ کسی سچی تخلیقی صلاحیت کے بغیر حاصل بھی نہیں ہوتا۔ ان کی بڑی کمزوری وہی ہے جو اردو کے بہت سے ناول لکھنے والوں میں پائی جاتی ہے، یعنی جیتے جاگتے زندہ کرداروں کو پیدا کرنے اور قدرتی سادہ انداز میں کہانی کہنے کی اہلیت کا فقدان۔ اس طرح اپنی تھیم اور اپنے مقصد کے تجمل کے باوجود، اور اس کے باوجود کہ اس کے صفحات میں اچھائی (goodness) رچی ہوئی ہے، ڈاکٹر صاحب کا یہ ناول اپنے انداز میں ایم اسلم، رئیس احمد جعفری اور ہماری بیسٹ سیلر خواتین ناولسٹوں کے ناولوں سے مختلف نہیں۔ انھی کی طرح یہ روایتی سانچے میں ڈھلا ہوا ہے، بے مقصد گفتگو سے اَٹا ہوا جو کرداروں کو ذرہ بھر بھی نہیں اُبھارتی اور جس کا واحد فائدہ ناول کے صفحے پورا کرنا لگتا ہے۔ اس اسکول کے ناول، جو لازماً اصلاحی ہوتے ہیں، مجھے ہمیشہ گڑھے کے پانی کی طرح جامد اور گلے سڑے لگتے ہیں۔ اگرچہ میں اس سے آگاہ ہوں کہ بہت سے لوگ انھیں والہانہ شوق سے پڑھتے ہیں لیکن حقیقتاً اپنی راتوں کی نیند حرام کرتے ہیں۔ (ویسے آج کل ایم اسلم، رئیس احمد جعفری اور نسیم حجازی کی فیکٹریاں قدرے مدھم پڑ گئی ہیں اور مال اس تیزی سے تیار نہیں ہو رہا — یا مجھے ہی ایسا لگتا ہے۔) بیسٹ سیلر خواتین ناولسٹوں کے بارے میں پھر بھی ایک دو اچھی باتیں کہی جا سکتی ہیں، اگرچہ میں ان کو بھی نہیں پڑھ سکتا۔ وہ کم از کم سادگی سے کہانی کہنے کا گر جانتی ہیں اور اصلاحی اور تبلیغی مقصد کے بوجھ کے بغیر روز مرہ کی گھریلو گپ شپ، شادی بیاہ کے تذکرے، دلہن کی پوشاکوں اور زیوروں کی فہرستیں، اماں جی کا زکام اور خان بہادر کا گٹھیا ان کے ناولوں کے موضوع ہوتے ہیں۔ وہ ایسی آسانی اور خالی الذہنی سے ناول لکھتی چلی جاتی ہیں جیسے وہ اپنے بچوں کی اونی جرابیں بُنتی ہیں۔ غالباً انھیں دماغ یا تخیل سے بالکل کام نہیں لینا پڑتا۔ میں واقعی ان کی اس سہل نویسی پر رشک کرتا ہوں۔ محیر العقول خواتین! میں سچ مچ ان کے اس 'انعام' کا مداح ہوں۔ پھر ہمیں یہ بھی اقرار کرنا پڑے گا کہ پچھلے پندرہ بیس سال میں اردو میں جو بہترین ناول لکھے گئے ہیں وہ خواتین ہی نے لکھے ہیں۔ اور ان میں سے ایک دو تو تقریباً شاہکار ہیں — فنی طور پر کلاسک اور زندہ رہنے کے قابل۔

ڈاکٹر صاحب کی طرف لوٹتے ہوئے، انتھنی ٹرالوپ نے، جو ایک بارلیش وکٹورین ناولسٹ تھا اور

جس نے پچاس کے لگ بھگ ناول لکھے اور بیشتر ریلوے گاڑی کے ڈبوں میں لکھے، اپنی آپ بیتی میں ایک بڑی سیانی اور سوجھ بوجھ کی بات لکھی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ ''ہوسکتا ہے کہ ایک لکھنے والا کہانی کا تانا بانا خوب بن سکتا ہو اور زبان اور اسلوب پر پوری طرح حاوی ہو لیکن اگر وہ زندہ کردار تخلیق نہیں کرتا تو اس کی اہلیتیں بیکار رہوں گی۔ وہ ناول تو لکھنے کو لکھ لے گا مگر یہ لکڑی کا ناول ہوگا...'' اور ڈاکٹر صاحب نے لکڑی کا ناول لکھا ہے۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ وہ اچھے پڑھے لکھے تربیت یافتہ ذہن کے انسان معلوم ہوتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ انھوں نے انگریزی ادب کا اچھا خاصا مطالعہ کیا ہوگا۔ جیتے جاگتے کردار پیدا کرنا تو خدا کا دیا ہوا ملکہ ہے، جس کا اکتساب نہیں ہوسکتا؛ وہ اور کچھ نہیں تو نئی تکنیک ہی استعمال کر سکتے تھے جو ان کے ناول کو تازگی اور دلچسپی بخش دیتی۔ خدا جانے انھوں نے روایتی ڈگر پر ہی چلنے میں کیا مصلحت دیکھی۔ بلاشبہ ان کا ناول ایم اسلم کے ناولوں سے کہیں اچھا ہے کیونکہ انھوں نے بڑے خلوص سے کچھ کہنے کی کوشش کی ہے اور وہ سپنا جو انھوں نے دیکھا ہے ایک لحاظ سے خوبصورت حقیقت بننے کے لائق ہے اور ان کے ناول کو پڑھنا تضیع اوقات نہیں، پھر بھی موضوع کی شوکت اس سے بہتر اظہار چاہتی تھی۔

جب ناول شروع ہوتا ہے تو اس کے ہیرو اختر میاں، جو اچھے کھاتے پیتے گھرانے کے فرد ہیں اور بیشتر وقت لینڈ اسکیپ پینٹنگ میں صرف کرتے ہیں، پہلے ہی سے شادی شدہ ہوتے ہیں۔ اس طرح پڑھنے والے کی رومانی آرزوئیں کھلنے سے پہلے ہی مرجھا جاتی ہیں۔ ان کی بیوی سے ان کی یہ شادی محبت کی شادی ہے۔ ان کی چہلیں نہایت سنجیدہ اور فلسفیانہ ہوتی ہیں اور شگفتگی کہیں بھی چمک نہیں مارتی۔ اختر میاں کو پہلی ہی نظر میں رخشندہ سے محبت ہو جاتی ہے، جب وہ ان کی بہن عفت کے ساتھ ان کے گھر آتی ہے اور ان کے جذبات میں جوار بھاٹا پیدا ہوتا ہے۔ (ہر کوئی جانتا ہے کہ جب سمندر کے دل میں جذبات کا طوفان آتا ہے جب اس کا، سمندر کا، دل چاہتا ہے کہ بڑھ کر آسمان کو چھو لے اور چاند کو چوم لے تو دنیا اسے جوار بھاٹا کہتی ہے۔) اختر میاں بڑے پکے ارادے کے اور ہٹیلے آدمی ہیں اور خاندانی روایات کو ٹھکرا کر اپنے ابا حضور خان بہادر اصغر حسین، جن کا شمار شہر کے سربرآوردہ رئیسوں میں ہوتا ہے، اور اپنی اماں حضور کی شدید مخالفت کے باوجود رخشندہ سے شادی کر لیتے ہیں۔ رخشندہ ڈاک خانے کے ایک سپرنٹنڈنٹ کی بیٹی ہے اور ان کے مرتبے سے کمتر ہے۔ خان بہادر کا ارادہ تھا کہ ان کا بیٹا

Scanned with CamScanner

آئی سی ایس کے امتحان میں بیٹھے اور ڈپٹی کمشنر یا کمشنر لگے، لیکن اختر میاں ان سے کہتے ہیں کہ وہ کووں کی اس ٹولی میں شامل نہیں ہونا چاہتے جو چند سفید پر لگا کر اپنے آپ کو ہنس سمجھنے پر بضد ہیں۔ (آئی سی ایس حضرات براہ مہربانی نوٹ فرمالیں۔) خان بہادر، جو سیدھے سادے شفیق باپ ہیں، اپنے بیٹے کی آئیڈیلسٹک باتوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ اختر میاں کی بہن عفت اور ایک چھبیلے خوش پوش نوجوان طالب علم سہیل کے ڈھکے چھپے رومان کا قصہ چلتا ہے۔ ہمارے دلوں میں جوار بھاٹا اٹھتا ہے، لیکن افسوس کہ شادی کی بات چیت مکمل ہونے سے پہلے ملک کی تقسیم ہو جاتی ہے اور فسادات شروع ہو جاتے ہیں۔ مصنف نے خان بہادر کے شہر کا نام بتانے میں مصلحت نہیں جانی؛ صرف تحقیق سے اتنا اشارہ ملتا ہے کہ وہ بیاس پار کا کوئی شہر ہے، جو لکھنؤ بھی ہو سکتا ہے اور مدراس بھی۔ اب ایک سچ مچ کے ناول میں جب ایک مصنف جگہوں اور شہروں کے نام نہیں دیتا (جو ایجادی قوتوں کے ضعف یا کسی اور وجہ سے ہو سکتا ہے) تو مجھے بڑی جھنجھلاہٹ ہوتی ہے۔ بیاس پار سمندر اور کوہ ہمالیہ تک بڑا لمبا چوڑا علاقہ ہے اور ڈاکٹر صاحب اٹلس میں ہندوستان کا نقشہ ہی دیکھ لیتے تو انھیں بیاس پار کے شہر کے بیسیوں نام مل سکتے تھے۔ ایک داستان یا فینٹسی میں تو جگہ کا نام نہ ہونا قابلِ معافی ہے اور سمجھ میں آتا ہے، مگر ناول میں نہیں۔ اس سے واقعات پر ایک غیر حقیقی سی دھند چھا جاتی ہے۔ بہر نوع، تقسیم ملک کے بعد اس شہر میں فسادات شروع ہو جاتے ہیں اور یہ لٹا پٹا خاندان بے خانماں ہو کر لاہور پہنچتا ہے۔ لاہور اسٹیشن پر اختر میاں کو اپنا پرانا دوست سہیل مل جاتا ہے۔ وہ سہیل کے ساتھ اس کے مکان میں جاتے ہیں۔ ایک خاصا صاف ستھرا مکان ہندوؤں کے محلے میں (کون سے محلے میں؟) سہیل میاں کے قبضے میں ہے اور انھوں نے مل ملا کر ایک کپڑے کی دکان، ایک دوائیوں کی دکان، ایک آدھ فیکٹری پر تصرف کر کے کافی چلتے پرزے ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ کچھ روز وہ سہیل کے ہاں رہتے ہیں اور پھر ایک اور مکان میں اٹھ جاتے ہیں۔ سہیل اختر میاں کو بھی لوٹ میں حصہ لینے اور ہاتھ رنگنے کی دعوت دیتا ہے لیکن اختر میاں کا ضمیر یہ گوارا نہیں کر سکتا۔ خان بہادر لاہور پہنچتے ہی بیمار پڑ جاتے ہیں اور ساری دیکھ بھال کے باوجود ان کی حالت ردّی سے ردّی ہوتی جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا ارادہ یہاں خان بہادر کو اگلے جہان میں بھیجنے کا ہوتا ہے، پھر خدا جانے کیوں وہ اپنا ارادہ بدل دیتے ہیں اور خان بہادر یکلخت چاق و چوبند ہو جاتے ہیں۔ خان بہادر کے ایک لنگوٹیے دوست شیخ نیاز احمد کے توسط سے اختر میاں کو شہر کی ایک بڑی مل میں آرٹسٹ

ڈیزائنر کی جگہ مل جاتی ہے۔ مل کا جو سیٹھ ہے، اور جس کا نام مل کی طرح صیغۂ راز میں ہے، انسانی روپ میں پورا درندہ ہے۔ شیخ نیاز احمد صاحب کی عدالت میں سیٹھ کے ایک دو کیس اٹکے ہوئے ہیں اور سیٹھ کا خیال ہے کہ اختر میاں کی وجہ سے اس کا کام نکل آئے گا۔ اختر میاں گندم کی بالیوں وغیرہ کے ڈیزائن بناتے ہیں اور فارغ وقت میں مل کے مزدوروں سے ہمدردی اور دل سوزی میں اپنا وقت گزارتے ہیں۔ سیٹھ اور اس کے منیجر کو اختر میاں کا مزدوروں سے گھلنا ملنا مطلق نہیں بھاتا۔ ان کا خیال ہے کہ وہ مزدوروں میں بے اطمینانی اور بغاوت کے بیج بو رہا ہے۔ ایک زبردست ہڑتال کے بعد تو آدمی ان کو زیادہ الزام بھی نہیں دیتا۔ پھر سیٹھ ناچار ہو کر فیصلہ کرتا ہے کہ اختر میاں کو مروا کر اس کا کانٹا ہی نکال دیا جائے لیکن اس عرصے میں سیٹھ کی سرخ عنابی ہونٹوں والی لڑکی کو اختر میاں سے ایک قسم کی افلاطونی نوعیت کی محبت ہو چکتی ہے اور وہ اختر میاں کو بروقت اطلاع دے دیتی ہے۔ اختر میاں کچھ مدت شیخ نیاز احمد کے ہاں روپوش ہو جاتے ہیں۔ یہاں ہائی لائف اور پُر رعونت افسروں کی کارکردگیوں اور مزدوروں کی غربت و فلاکت کی کئی تصویریں ہیں، لیکن سب غیر حقیقی اور ڈرامائی۔ گفتگو سراسر تبلیغی اور مقصدی ہے اور اختر میاں اپنے اصلاحی نصب العین کو ایک لحظے کے لیے بھی نہیں بھولتے، خواہ وہ اپنی بیوی سے بات کر رہے ہوں یا سرخ عنابی ہونٹوں والی رعنا سے۔ اس شخص میں ذرا بھی لچک نہیں۔ متانت اور سنجیدگی کا دامن اس کے ہاتھ سے ایک لمحے کے لیے نہیں چھوٹتا۔ اختر میاں ایک بوتے ہوئے منبر ہیں۔ پڑھنے والے کو یہ تو پتا ہے کہ سب کچھ لاہور میں ہو رہا ہے مگر اُس لاہور کا اِس لاہور سے کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا۔ یہ کوئی سا بھی شہر ہو سکتا ہے، اور شاید کوئی بھی نہیں، کیونکہ لاہور کی فضا اور اس کا کردار ناول میں بالکل مفقود ہے۔ صرف ماڈل ٹاؤن کا ذکر ایک دو جگہ نظر آتا ہے جہاں شیخ نیاز احمد نے اپنے دوست خان بہادر اصغر حسین کو ایک دلکشا کوٹھی الاٹ کروادی ہے۔ شہر اتنا ہی بے جان ہے جتنے کردار۔ ڈاکٹر صاحب شاید یہ بھول گئے کہ وہ ایک الیگری یا پریوں کی کہانی نہیں لکھ رہے ہیں بلکہ ایک ناول لکھ رہے ہیں اور ناول پڑھنے والے کو ایک ایسے شہر کی فضا چاہیے جو واقعی زمین پر موجود ہو۔

آخر اختر میاں بددل ہو کر ملازمت چھوڑ دیتے ہیں۔ ابا حضور نے کہیں کچھ زمینیں لے رکھی ہیں (کہاں؟ ان کا کچھ پتا نہیں چلتا)۔ اختر میاں پانچ دس خاندانوں کو ساتھ لے کر نئی بستی میں اُترتے ہیں جہاں زمین بنجر اور ویران ہے، اور بقیہ ناول اختر میاں کی طرف سے اس خطے کو ایک اشتمالی بہشت

بنانے کی کوششوں کے متعلق ہے۔ دو تین سال میں وہاں لہلہاتی شاداب کھیتیاں اور قطعے نظر آتے ہیں۔ اسکول، کالج، ہسپتال، لائبریری تعمیر ہو جاتے ہیں اور وہاں کی زمین کے منافعے میں وہاں کے سب باسیوں کا حصہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب فی الواقع کمیونسٹ نہیں ہیں اور سیاسی ہنگاموں میں وہ اپنے ہیرو اختر میاں کی طرح ذرا بھی اُلجھنے کے لیے تیار نہیں، مگر یہ رحمٰن بستی ایک اشتراکی فارم سے کافی نزدیک کی چیز لگتی ہے۔ پھر یہاں مل نصب ہوتی ہے اور سیٹھ صاحب، جو اپنا ذہن یکلخت بدل چکے ہیں، اس اشتراکی مل کے نصب کرنے میں اختر میاں کی مدد کرتے ہیں۔ اختر میاں کی زندگی میں سب سے فخر کا دن وہ ہوتا ہے جب مہمانِ خصوصی سربراہ مملکت مل کا برقی بٹن دبا کر اس کا افتتاح کرتے ہیں اور مشینوں کی گڑگڑاہٹ سے مل کی فضا گونج اٹھتی ہے۔ سربراہ مملکت مہمانوں کو مخاطب کر کے کہتے ہیں، ''میں ساری مملکت میں اگر کسی خطۂ زمین پر فخر کر سکتا ہوں تو وہ یہی چھوٹی سی بستی ہے۔ یہ ایک نمونہ ہے ساری مملکت کے لیے، سب انسانوں کے لیے، سب ملکوں، سب قوموں کے لیے۔ معاشرتی بے یقینی کے ٹھہرے ہوئے ساکن پانی میں حرکت وعمل کی جس کنکری کو پھینک کر آپ نے یہ بڑھتے دائرے بنائے ہیں خدا کرے یہ وسیع ہوتے جائیں اور پہلے ہماری مملکت اور بعد میں سب کائنات کو حسین ترین، شاداب ترین کرۂ ارض میں تبدیل کر دیں۔''

ڈاکٹر صاحب! یہ رحمٰن پورہ کی اشتراکی بہشت کہاں ہے؟ ہم سب وہاں جانا چاہیں گے۔ مگر آپ کے ناول کی کہانی کا کیا بنا؟ رعنا آج کل کہاں ہیں؟ خان بہادر اصغر حسین اور شیخ نیاز احمد بقید حیات ہیں یا چل بسے؟ سیٹھ صاحب نے کئی اور ملیں کھڑی کر لی ہیں یا اب دریا کے سامنے کھڑے ہو کر ہر آئے گئے کو پانی پلاتے ہیں؟

انسانی ہمدردی اور اُلفت کا دودھ ایک خوبصورت اور عجیب چیز ہے، مگر میں اس کو ایک کتاب کے صفحات میں ٹپکتے ہوئے دیکھنا پسند نہیں کروں گا۔ میرا خیال ہے کہ اس ناول کی ایک بڑی اچھی کامیاب پاکستانی فلم تیار ہو سکتی ہے جس میں کام کرنے والے ستارے شمیم آرا، درپن اور نیلو ہوں گے اور جس میں پندرہ ٹھمکتے دمکتے گانے ہوں گے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ باکس آفس پر ہٹ ہوگی اور کئی معرکۃ الآرا ہفتے چلے گی۔ لیکن اسکرپٹ میں کچھ تبدیلیاں کرنا پڑیں گی۔ اختر میاں کو شروع سے شادی شدہ دکھانا مناسب نہ ہوگا اور رعنا اور رخشندہ میں سے ایک کو کار کے حادثے میں ختم کرنا ضروری ہوگا۔ رعنا کے

Scanned with CamScanner

پارٹ کے لیے نیلو سے بڑھ کر کون ہو سکتا ہے۔ میک اپ سے اچھے بھلے ہونٹ سرخ عنابی ہو سکتے ہیں — خدا حسنِ قبول ارزانی فرمائے۔

آخر یہاں ہر کوئی کیوں اصلاحی اور تبلیغی ناول لکھنے پر تلا بیٹھا ہے؟ شرر اور ڈپٹی نذیر احمد سے لے کر ایم اسلم اور نسیم حجازی تک سب ہمیں اپنے رنگ کا بہتر انسان بنانے میں مصر ہیں، خواہ ہم اس قسم کے بہتر انسان بننے کے بالکل خواہاں نہ ہوں۔ میں داڑھی رکھ کر، ہاتھ میں بھالا پکڑ کر اور گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے محلے سے گزرنے کا تصور ہی نہیں کر سکتا، مگر ان مصنفین کو ضد ہے کہ میں ایسا کروں۔ صلاح الدین اکبر کا ''انسان'' صحیح معنی میں ایک آئیڈیلسٹ انسان سہی مگر وہ ہر وقت سنجیدگی اور متانت سے وعظ کرتا ہے۔ وعظ کے لیے ایک منبر ہی موزوں ہے نہ کہ ایک ناول۔ تاہم اپنی تمام فروگزاشتوں اور کوتاہیوں کے باوجود ہمیں ڈاکٹر صاحب کا شکر گذار ہونا چاہیے کہ ان کا سپنا حقیقتاً خوبصورت اور پیارا ہے۔ یہی سپنا اس ناول کو بچاتا ہے۔

سب کو اس visionary کا یہ ناول پڑھنا چاہیے۔ ❋

(فنون، لاہور، اپریل مئی ۱۹۶۴ء)

عبداللہ حسین کی ''اداس نسلیں''

ہمیں ''اداس نسلیں'' لکھنے کے لیے ٹاؤن ہال کے سامنے مسٹر عبداللہ حسین کا مجسمہ نصب کرنا چاہیے، اور میرا خیال ہے کہ ہمارا مصنف اس خیال کی دلی حمایت کرے گا۔ ''ندی'' اور ''سمندر'' جیسی کہانیوں نے ثابت کر دیا ہے کہ ان کی صلاحیتیں بڑی منفرد قسم کی ہیں، اور ''اداس نسلیں'' کی کچھ سنسنی انگیز اشاعت سے پہلے ہی وہ ادبی شہرت کے سرکش اور بے اصول گھوڑے کی زرّیں زین میں بڑے کروفر سے جم چکے تھے۔ اس ناول نے ان کی ساکھ کو پختہ اور مسلم کر دیا ہے۔ یہ ایک وھیل مچھلی جتنی بڑی کتاب ہے — باریک ٹائپ کے چھ سو چھیالیس صفحے — اور اختتام میں دی ہوئی تاریخوں سے پتا چلتا ہے کہ ان کو اس

❋ ''تبصرے پر تبصرہ'' (از صلاح الدین اکبر) ضمیمے میں صفحہ ۵۳۲ پر ملاحظہ کیجیے۔

Scanned with CamScanner

کے لکھنے میں پورے پانچ سال لگے۔ آدمی اس ہمت اور صبر آزما استقلال اور واضح قابلیت کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا جو اس ناول کو بنانے اور مکمل کرنے میں بروئے کار لائی گئی ہوگی کیونکہ یہ ثابت قدمی اور یک سوئی کا ایک ٹورڈی فورس (tour de force) ہے... اور ناول ابھی باقاعدہ طور پر ختم نہیں ہوا؛ یہ ابھی تک جاری ہے اور میرا خیال ہے ہمیں جلد ہی اس کے سیکوئل (sequel) سے نبٹنا پڑے گا جو اتنا ہی طویل، اتنا ہی بھرپور ہوگا — عبداللہ حسین کسی کام کو ادھورے اور سرسری طریق پر کرنے پر یقین نہیں رکھتے۔ آج کل ہمارے ادب میں اتنا کچھ بے پروائی اور رواروی اور ہنگامی انداز میں لکھا جارہا ہے کہ یہ تکمیل کا جذبہ بڑی کم یاب اور قابل قدر صفت ہے اور اسی لیے... صرف اسی لیے ہمیں ان کا مجسمہ نصب کرنا چاہیے۔ اور کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ مجسمے میں ڈھالے جانے کے لیے ایک موزوں ترین موضوع نہیں ہیں — گھنے چمکیلے بال، خوبصورت صحت مند چہرہ، لمبا قد۔ میں نے ایک بار ہی پاک ٹی ہاؤس کے باہر اس ناول کے باہمت ناشر اور ایک دبلے پتلے بوہیمین دوست کی معیت میں ان کی جھلک دیکھی تھی۔ پہلی ہی نظر میں مجھے صحیح طور سے سوجھا کہ یہ لمبا خوش پوش وجیہہ نوجوان ''اداس نسلیں'' کے مصنف عبداللہ حسین کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ میں نے برسوں پہلے اسے دیکھا تھا، جب میں اسکول کا لڑکا تھا۔ کہاں؟ مجھے یاد آ گیا۔ لانگ مین کے چھاپے ہوئے رائیڈر ہیگرڈ کی ''شی'' کے مصور ایڈیشن میں۔ سنہری گھنگریالے بالوں والا، اپالو سا — لیو (Leo) پجاری کالی کوتیس کا دسویں پشت میں نیا جنم۔ لیو بالکل ایسا تھا۔ انسانی وجاہت اور خوبصورتی کی متاع ہمارے ہاں کے ادیبوں میں بہت کم کے حصے میں آتی ہے۔ ہم میں سے بیشتر گناہ کی طرح بدشکل ہوتے ہیں — کوتاہ قد، سوکھے ہوئے یا موٹے پلپلے، استخوانی یا پھولے چہرے، سوجی ہوئی بے نور آنکھیں عموماً چشموں سے ڈھنپی ہوئی، ہمارے جگر بالعموم کام نہیں کرتے۔ عبداللہ حسین کو دیکھتے ہی کوئی شبہ نہیں رہتا کہ ان کا ہاضمہ فرسٹ کلاس ہے اور ان کے جگر کا فعل اے ون! لیکن مجسمہ بنانے میں بہت سی مشکلات ہیں۔ ایک تو، جہاں تک میں جانتا ہوں، اگرچہ ہمارے ہاں ایک سے ایک بڑھ کر تجریدی آرٹسٹ اور معرا نظم کو بھرا پڑا ہے مگر اچھے بت تراشوں کا کلی فقدان ہے۔ ہمارا مذہب بھی اس فن کو مستحسن نہیں سمجھتا۔ پھر لاہور کارپوریشن کے خشک ذوق، جھگڑالو اور دیندار ارکان بھی بڑی دقت سے اس مجسمے کے لیے فنڈ ڈووٹ (devote) کرنے پر اُکسائے جاسکیں گے، اور پھر اس وقت وہ درختوں کو کاٹنے اور لاہور کے شہر کو خوبصورت بنانے میں

بہت مصروف ہیں۔ اس خالصتاً اسلامی تاریخی شہر میں عجائب گھر کے ان گنت بدھوں کو چھوڑ کر لے دے کے صرف ایک ہی پتھر کا مجسمہ ہے — یونیورسٹی ہال کے سامنے لوئر مال پر پنجاب یونیورسٹی کے ایک پرانے باریش وائس چانسلر ڈاکٹر وولز کا مجسمہ، عالمانہ گاؤن میں اور اپنے ہاتھ میں ایک کتاب تھامے! آزادی سے پہلے، مجھے یاد پڑتا ہے، دو مجسمے اور تھے — چیرنگ کراس کے وسط میں سیخ پا گھوڑے پر سوار سر ہنری لارنس کا بت اور اسمبلی چیمبر کے سامنے ایک گنبد والی چھوٹی سمادھ میں تخت پر متمکن بوڑھی ملکہ وکٹوریا کا، تاج اور خلعت اور شاہی عصا سے مزین، متین مجسمہ۔ وکٹوریا کا بت اب وہاں نہیں ہے: وہ اسے تخت سمیت کہیں لے گئے ہیں، اگرچہ وہ جگہ اب بھی ملکہ کا بت کہلاتی ہے۔ اور سر ہنری لارنس اور اس کا اگلی دو ٹانگیں اٹھائے ہوئے گھوڑا بھی آدمیوں کے علم سے اس طرح غائب ہو گئے ہیں جیسے وہ اس شہر کو اس کی ذلت اور عاجزی کی کھولتی ہوئی یاد دلانے کے لیے موجود ہی نہ تھے۔ یہ کہ ہم نے ڈاکٹر وولز کے مجسمے کو اپنے چبوترے پر رہنے دیا ہے، ہماری وسیع القلبی اور قدر دانیِ علم کا بین ثبوت ہے۔ وہ بھی تھا تو فرنگی مگر وہ مشرقیات کا ایک بڑا عالم تھا — اور پھر اس کی داڑھی تھی۔ اس کا باریش، شریف النفس اور پُر وقار مجسمہ یونیورسٹی ہال کے سامنے اچھا لگتا ہے اور میں اکثر وہاں سے گزرتے ہوئے اسے دیکھنے اور اسے سلام کرنے کے لیے رکتا ہوں۔ ویسے ڈاکٹر وولز بھی صاف نہیں چھوٹے — ہماری وسیع القلبی بعض وقت تناؤ سے ٹوٹنے کی حدود پر آ پہنچتی ہے — اور چار پانچ مہینے ایک بھونڈے رنگوں سے لپا ہوا، مسخ شدہ ڈاکٹر وولز غمگین آنکھوں سے اور بے بسی سے گزرنے والوں کو دیکھتا رہا۔ ایک مدت تک کسی کو بے چارے ڈاکٹر پر رحم نہ آیا اور کسی نے اس کی ہیئت کذائی کو دھوڈالنے کی طرف توجہ نہ کی۔ پھر ایک صبح ڈاکٹر پھر پہلے ہی ستھرا اور اور بجیلا dapper بن گیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی دیکھی۔ بادی النظر میں ایسا لگتا ہے کہ اب ڈاکٹر کے مجسمے کو کافی دیر تک اس کے حال پر رہنے دیا جائے گا — اس وقت تک جب تک کہ اسلامی روایات کا احیا کرنے والی کوئی جماعت 'کفر' کی اس علامت کے خلاف جہاد کا علم بلند نہیں کرتی۔ ان دنوں اگر عبداللہ حسین کا مجسمہ نصب ہو جائے تو ہر شخص کے اپنے معاملات میں مصروف ہونے کی وجہ سے اس کے ساتھ خیریت گزرے گی۔ (ممکن ہے چند ادبی لوگ حسد و عناد کی بنا پر، اور خود کو مجسمے کے لیے زیادہ اہل سمجھتے ہوئے، واویلا مچائیں۔) چند شریر لڑکے ضرور عبداللہ حسین کے کندھوں کے اوپر چڑھنے اور قلابازیاں کھانے کی کوشش کریں گے، جیسے وہ اب ٹریفک کے سپاہی کی

آنکھ بچا کر زمزمہ کے اوپر کرتے ہیں، لیکن اس سے بت کا کچھ نہ بگڑے گا۔ یہ مجسموں کے فوائد میں سے ایک ہے، اور عبداللہ حسین اس قسم کے شخص نہیں کہ لڑکوں کی ان حرکات کا برا مانیں۔

یہاں میں پڑھنے والے کو جھنجھلاتے اور برہم ہوتے ہوئے دیکھ سکتا ہوں۔ ''یہ شخص مجسموں کو لے بیٹھا ہے، مگر ناول کے متعلق اس نے اب تک ایک لفظ نہیں کہا کہ آخر یہ ناول ہے کیسا!'' پیارے پڑھنے والے! ذرا صبر سے کام لو تو میں ناول ہی کی طرف آ رہا ہوں۔ عبداللہ حسین کا مجسمہ اس لیے بننا چاہیے کہ انھوں نے پہلی بار اس زبان میں ناول کو ایک وسیع کینوس دینے اور اس میں ایک مکمل دور کی سیاسی، تمدنی اور معاشی تاریخ سمونے کی سعی کی ہے۔ 'پہلی بار' شاید بالکل صحیح نہیں، رتن ناتھ سرشار نے بہت پہلے ''فسانۂ آزاد'' کے ہزاروں شگفتہ، زرخیز صفحوں پر انحطاطی دور کو اسی طرح جیتا جاگتا پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔ سرشار کو آرٹ فارم یا تسلسل یا وحدتِ تاثر کا پتا نہیں تھا مگر وہ جینیس تھا، ایک پیدائشی داستان گو، اور اپنی بے پناہ ذہانت و فطانت سے اس نے بے شمار چھوٹے بڑے، ہر طبقے کے کردار اسٹیج پر سجائے، جو اپنی بول چال، نشست و برخاست میں بالکل ٹھیک ہیں۔ واضح پلاٹ یا کرداروں کی growth سے اسے کوئی واسطہ نہ تھا، مگر اس نے اس زمانے کی لکھنوی تہذیب کو ہر رنگ میں زندہ کرنے کے مقصد میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی۔ ''فسانۂ آزاد'' زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔ وہ پہلا مصنف ہے جس نے اردو میں پینورامک (panoramic) ناول لکھا۔ ماضی قریب میں قرۃ العین حیدر کا ''آگ کا دریا'' پینورامک ناول کی ایک اچھی مثال ہے — اگرچہ کوئی دو کتابیں اتنی مختلف نہیں ہو سکتیں جتنی ''فسانۂ آزاد'' اور ''آگ کا دریا'' ہیں۔ پہلی بے ہنگم کہانی اور پلاٹ کی کسی حس کے بغیر اور گڈمڈ، دوسری بیسویں صدی کی ایک متمدن، بے حد تربیت یافتہ، انٹلکچوئل خاتون کی لکھی ہوئی جو آرٹ فارم کے متعلق سب کچھ جانتی ہے، جس نے سب اچھے مغربی مصنفوں کا وسیع مطالعہ کیا ہے اور جگمگاتے خوبصورت اسلوب کی مالک ہے۔ پہلی کو ایک ناول کے طور پر شروع سے آگے پڑھنا ایک غلطی ہوگا، یہ ایک وسیع جھیل کی مانند ہے، جس میں آدمی مختلف جگہوں میں غوطہ لگا سکتا ہے اور ہمیشہ سچے موتیوں سے بھری ہوئی مٹھی بند کیے باہر آتا ہے۔ وہ پرانے لکھنؤ کے کنجڑے اور قصاب، اِکے والے اور ایلچی، نواب اور مصاحب اور بٹیر باز، غریب اور امیر اس کے گنجان صفحات میں چلتے پھرتے اور باتیں کرتے ہیں اور ایک پورے دور کی معاشرتی تصویر بے مثال اسلوب میں ہمارے سامنے کھنچ جاتی ہے۔ کتنی جان،

Scanned with CamScanner

دلآویزی اور دل بستگی ان مرقعوں میں ہے، اور کتنی تازگی۔ اب ''آگ کا دریا'' میں چمکیلی بھڑک دار عبارت ہے اور یہ ایک دور کے بارے میں نہیں بلکہ آرین دور سے لے کر جدید زمانے تک کی ایک مخصوص انداز میں تمدنی، ذہنی اور روحانی دستاویز ہے۔ تحریر کے بعض ٹکڑے فی الواقع brilliant ہیں کیونکہ یہ ماننا پڑے گا کہ مس حیدر لکھنا جانتی ہیں، تاہم اپنے سارے انٹلکچوئل، ہائی فیلوشن فلسفے اور بھڑکیلی نثر کے باوجود ''آگ کا دریا'' عجیب طور سے بے جان ہے۔ پڑھنے والے کے لیے ایسے کرداروں میں جو مختلف ناموں سے مختلف ادوار میں جنم لیتے ہیں، کسی دلچسپی کے پیدا ہونے کا امکان نہیں ہوتا اور کردار کبھی صحیح معنوں میں زندہ نہیں ہو پاتے۔ میں نے اس ناول کے پہلے پچاس صفحات حیرانی اور برہمی سے جوں توں کر کے پڑھے اور اس کے بعد میں نے اسے ایک کڑی آزمائش پایا۔ میں فلسفے کو چھوٹی چھوٹی چمچیوں میں چکھنا پسند کرتا ہوں، اس کے ڈول کے ڈول اپنے اندر انڈیل لینا میرے کمزور معدے کے بس کی بات نہیں۔ ایک ناول میں، اگر یہ ایک ناول ہے، حرکت کرتا ہوا، رستا ہوا گرم خون ہونا ضروری ہے — اس کے بغیر ناول میں زندگی پیدا نہیں ہو سکتی، خواہ اسٹائل بے عیب ہو اور خیال بلند۔ انٹلکچوئلز کے ناولوں کے ساتھ یہی خرابی ہے۔ وہ ہمیشہ نئے تجربوں، نئی تکنیکوں کے چھلاوے کے پیچھے بھاگتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ ان کا پہلا مقصد کہانی کہنا ہے اور کہانی کی سادگی اور پُرکاری سے پڑھنے والے کو ورغلانا اور اپنے دام میں لانا ہے۔ مس حیدر سوجھ بوجھ، طرزِ بیان کی روانی اور شگفتگی اور تکنیک کی دل پذیری میں دور دور تک اپنا ثانی نہیں رکھتیں، تاہم ایک چیز بری طرح کھٹکتی ہے — انسانیت کی مشقت، پسینہ اور خون اور تپتی ہوئی حیوانی خواہشیں ان کی تحریر میں بھولے سے بھی گزر نہیں پاسکتیں۔ ان کے کردار، دیکھے بھالے اور جانے پہچانے، سب جنسی غدود سے محروم معلوم ہوتے ہیں۔ یہ ایک عجیب فینا مینا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ آیا یہ اس تہذیبی اور اخلاقی ماحول کا اثر ہے جس میں انھوں نے تربیت پائی یا کسی اور وجہ سے، مگر اپنی تحریروں میں وہ حد درجہ پروڈ (prude) ہیں اور ایک خاص دائرے میں بیٹھ کر اپنی سنہری کہانیوں کے تانے بانے کاتتی ہیں۔ ان کی یہ وکٹورین پروڈری پچیس تیس سال پہلے خوبی شمار کی جاسکتی تھی مگر آج کل کے زمانے میں — ڈی ایچ لارنس اور عصمت اور منٹو کے بعد — یہ ہمیں جھنجھلا دیتی ہے۔ اور تو اور، جارج ایلیٹ، ایملی اور شارلٹ برانٹے اور سیزیزی ووڈ کے ناولوں کے کرداروں میں جنس کی آگاہی کی سلگتی ہوئی لو موجود ہے، جو حقیقتاً زندگی کی لو ہے۔

سب سے زیادہ یہی افسوس ناک محرومی ان کی کہانیوں اور ان کے ناولوں کو قدرے ناتواں اور بے جان بنادینے کی ذمے دار ہے۔ ورنہ ''ڈالن والا''، ''کارمن''، ''یاد کی ایک دھنک جلے'' اور ''قلندر'' اپنے ہمدردانہ مشاہدے اور اپنے اسلوب کی سحر کاری میں صحیح معنوں میں فن پارے ہیں (جن کی امیجری کو انسان آسانی سے نہیں بھلا سکتا)___ کنول کی طرح کھلتی ہوئی کہانیاں، زندگی کی مسرت، اس کے حزن و اندوہ سے دھڑکتی ہوئی!

''لیکن آخر عبداللہ حسین کے متعلق تمھیں کیا کہنا ہے؟'' صحیح الدماغ اور بے صبر پڑھنے والا پوچھتا ہے۔

ہاں ہاں، میں عبداللہ حسین کی طرف ہی آتا ہوں۔ پنورامک ناول اور قرۃ العین حیدر کے بارے میں میری باتیں ان سے غیر متعلق نہیں۔ انھوں نے بھی ایک پنورامک ناول لکھا ہے اور وہ مس حیدر کے اسلوب اور ان کے اونچے ہندوستانی طبقے کے مرقعوں سے گہرے طور پر متاثر ہوے ہیں۔ اس حد تک کہ ''اداس نسلیں'' کے باب کے باب ''میرے بھی صنم خانے'' کی کامیاب پیروڈی کے طور پر پڑھے جا سکتے ہیں اور سیدھے مس حیدر کے شہرۂ آفاق ناول میں سے اٹھائے ہوے لگتے ہیں۔ میں قطعاً مبالغے سے کام نہیں لے رہا، نہ ہی مسخرہ بننے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اگر آپ کو میری بات کا یقین نہ آتا ہو تو ''اداس نسلیں'' کے باب سی و پنجم میں صفحہ ۴۲۷ کے آخیر پر نیچے دیے ہوے اقتباس کو ملاحظہ کریں۔ (ویسے سی و پنجم کے معنی ہیں پینتیسواں، اگر آپ نے اسکول میں فارسی نہیں پڑھی۔ اس ناول کے کل ابواب کی تعداد پنجاہ یعنی پچاس ہے):

> اس خوبصورت صبح کو وہ برآمدے کے کونے میں اسٹول پر بیٹھی بے حد انہماک سے منظرکشی میں مصروف تھی کہ اس کی اکلوتی عزیز دوست فے (Fay) بھاگتی ہوئی آکر سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔
>
> ''اوہ! کس قدر گرمی ہے،'' اس نے دوپٹے کے پلو سے ہوا کرتے ہوے کہا اور اپنے کیچڑ سے لت پت جوتے اتارنے لگی۔
>
> ''اوہو ہو، کیا حبس ہو رہا ہے!'' اس نے دوبارہ کنکھیوں سے نجمی کو دیکھا جو تصویر میں غرق تھی ''اُفوہ۔ توبہ۔''
>
> نجمی نے کوئی دھیان نہ دیا۔

Scanned with CamScanner

''اللہ توبہ۔ کیا چکر میں ہیں یہ لڑکیاں،'' فے جل کر بولی۔ ''اور کماری نجمی بیگم چٹو پادھیائے صاحب، اگر آپ نے میری طرف توجہ نہ دی تو میں جوتے لے کر اوپر آجاؤں گی اور آپ کے آرٹ میں حرج واقع...''

نجمی بوکھلا گئی... فے کو بے خیالی سے دیکھتی رہی۔

''اوہ ہاؤ سلی، فے ڈیر!'' اس نے کہا، ''اچھا معاف کر دو۔ تم نے کوئی نظم لکھی؟''

اور اس طرح کی سلی نس (silliness) کے چار پانچ صفحے اور۔

اب کیا یہ صاف اور صریح قرۃ العین حیدر نہیں؟ ''میرے بھی صنم خانے'' یا ان کے کسی اور ناول کا کوئی سائکلوا؟ کیا آپ اسے ''اداس نسلیں'' سے باہر کہیں اور پڑھیں تو آپ سینے پر ہاتھ رکھ کر دعوے سے یہ نہ کہیں گے کہ یہ مس حیدر کا لکھا ہوا ہے؟ وہی اینگلو لکھنوی ماحول، وہی ہلکی پھلکی بے مقصد گفتگو، وہی سجے سجائے بے حد رومینٹک لوگ۔ اور تو اور، کرداروں کے نام بھی مس حیدر کے لوگوں کے سے ہیں۔ میں یہ تاثر ہرگز نہیں دینا چاہتا کہ عبداللہ حسین ادبی سرقے کے مرتکب ہوئے ہیں— ان کی صلاحیت بڑی اوریجنل اور منفرد ہے اور ان کے بارے میں نقل کرنے کا گمان ہی نہیں کیا جاسکتا۔ اپنے ناول کو پورا مک بنانے کے لیے، بیس تیس سال پہلے کے ہندوستان کے اونچے طبقے کا معاشرتی ماحول پیدا کرنے کے لیے، جس کے بارے میں وہ فرسٹ ہینڈ کچھ نہیں جانتے تھے، انھوں نے قرۃ العین حیدر سے رجوع کیا۔ مس حیدر کو انھوں نے اپنا استاد اور رہنما منتخب کیا اور میری رائے میں یہ انتخاب ایک سے زیادہ لحاظ سے غلط اور افسوسناک تھا۔ انھیں سرشار، نذیر احمد اور مولانا حالی کے پرانے چشموں سے اپنے علم کی سیرابی کرنی چاہیے تھی۔ یہ مصنف ہمارے اپنے ہیں۔ مس حیدر کے ناولوں کے اچھے اور قابل قدر ہونے پر شبہ نہیں، لیکن سچی بات یہ ہے کہ ان کے اونچے طبقے کے مرقعوں میں مجھے اصلیت کا روپ دکھائی نہیں دیتا۔ جب مسٹر عبداللہ حسین بڑی معصومیت سے سیکنڈ ہینڈ پر اپنے ناول کے بعض حصوں کو واقعیت اور اصلیت کا رنگ دینے کے لیے مس حیدر کی پیروڈی کرتے ہیں تو ہم مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اگر کنویں میں پانی نہیں تھا تو اونچے طبقے کی مرقع کشی چرائے ہوئے رنگوں سے کرنی کیا ضروری تھی! ایک لکھنے والے کو ان چیزوں کے متعلق لکھنا چاہیے جن کے متعلق وہ جانتا ہے۔ ادبی چوری بذاتِ خود کوئی گناہ نہیں، سب لکھنے والے شعوری اور غیر شعوری طور پر سرقہ کرتے ہیں۔ رابرٹ لوئی اسٹیونسن نے ہیزلٹ اور لیمب اور

جانسن کی نقالی کر کے اپنا بے مثل اسلوب پختہ کیا۔ اس کے ناول ''ٹریژر آئی لینڈ'' میں لکڑی کا شاکیڈ کپتان مریات کا ہے اور بحری قزاق کا پنجر ایڈ گر ایلن پو کا۔ ولیم شیکسپیئر ایک دیدہ دلیر اور ڈھیٹ چور تھا اور اس کے سب پلاٹ مستعار لیے ہوئے ہیں۔ نہیں، میں عبداللہ حسین کو اس معصومانہ سرقے کے لیے صلیب پر نہیں کھینچوں گا۔ ایک مصنف سرقے میں حق بجانب ہے بشرطیکہ وہ اپنے مواد میں نئی روح پھونک سکے اور اسے فن کے روغن سے تابناک کر سکے۔ عبداللہ حسین ان اونچی سوسائٹی کی تصویروں میں جان ڈالنے میں کامیاب نہیں ہو سکے — اور اس میں حیران ہونے کی کوئی بات نہیں۔

مسٹر عبداللہ حسین کے ناول میں وہ سب عیوب اور خامیاں موجود ہیں جو عموماً انٹلکچوئلز کے ناولوں میں پائی جاتی ہیں۔ ان کا ناول اتنا ناول نہیں ہے جتنا ناول کی شکل میں پچھلے پچاس سال کی سیاسی، معاشرتی اور ذہنی تاریخ۔ کردار اس میں ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک یا دو کردار اچھی خاصی گہرائی سے دیکھے جا سکتے ہیں، باقی سب کاٹھ کے پتلے ہیں اور اپنی ساری پُرگوئی کے باوجود کاغذ کے صفحے سے نہیں ابھرتے۔ انھوں نے ناول کو صحیح معنوں میں پینورامک بنانے کے لیے کرداروں کا ایک جمگھٹ اکٹھا کیا ہے۔ وہ ایک ہائی فیلوٹن انداز میں لمبی تقریریں کرتے ہیں اور پھر بھی دھندلے، پھیکے اور کچے سے رہتے ہیں اور ہم ان سے متعارف نہیں ہو پاتے۔ جلیانوالہ باغ کا مچھلی بیچنے والا یا ہیرا منڈی کی طوائف، جو علی کو پناہ دیتی ہے، ہمیں convince نہیں کرتے۔ یہ تخلیق نہیں بلکہ محتاط بافت سازی ہے۔ جہاں عبداللہ حسین اپنے تجربے اور مشاہدے اور اپنی ودیعتی قوت کے بل پر لکھتے ہیں (جیسا کہ پہلے ابواب میں) تو ان کی تحریر میں ایک تازگی، ایک توانائی اور ایک اچھوتا پن آ جاتا ہے اور صفحے پر تھوڑی دیر کے لیے آگ بھڑکتی ہے۔ ایسے ٹکڑے خال خال آتے ہیں کیونکہ سارا وقت وہ آزادی کی جدوجہد کی مکمل اور مفصل تاریخ کی روداد قلمبند کرنے کے قابل تعریف کام میں جٹے رہتے ہیں۔ میرا خیال ہے اگر ان کے عزائم اتنے بلند نہ ہوتے اور وہ اسے طالسطائی اسکیل پر پینورامک بنانے پر نہ تلے ہوتے تو ''اداس نسلیں'' کہیں بہتر ناول ہوتا۔

پھر بھی ناول خوبیوں کے بغیر نہیں اور اس میں کئی ایک صفحات ہیں جن میں زمینیت ہے — ایک قدرتی، ابتدائی قوت، جو متاثر کرتی ہے اور اپنا نقش چھوڑ جاتی ہے۔ میں اردو کے کسی اور مصنف کو نہیں

جانتا جس نے جنس کے متعلق اس طرح سمجھ بوجھ سے، تازگی سے اور خوبصورتی سے لکھا ہو۔ وہ بغیر کسی ڈھکی چھپی گھٹن کے، بغیر کسی اضطراب یا ملزمی کے احساس کے، اس ابتدائی، تاریک انسانی جذبے کو قبول کرتے معلوم ہوتے ہیں۔ ہمارے ادب میں یہ صحت مندانہ اندازِ فکر بالکل نیا ہے اور کچھ چونکا دینے والا۔ عبداللہ حسین پر قطعاً ٹیبوز (taboos) اور گھٹن کا سایہ نہیں اور ان کا دل صحیح جگہ پر ہے۔ منٹو نے بھی بڑی بے باکی سے جنس کے بارے میں کہانیاں لکھیں جنھیں پڑھتے ہوئے ہمیشہ یہ احساس رہتا ہے کہ منٹو کے چہرے پر ایک leer ہے، ایک شیطانی تمسخر انگیز leer، جیسے وہ کہہ رہا ہو میں نے تمھیں تمھاری complacency میں سے ہلا دیا ہے۔ عبداللہ حسین کے کردار عورت کے ساتھ اس طرح بغل گیر ہوتے ہیں جیسے وہ کھاتے پیتے، فصل بوتے اور گیہوں کو چھاج میں پھٹکتے ہیں۔ نہ مصنف پر اضطرابی کیفیت طاری ہوتی ہے اور نہ پڑھنے والے پر۔ عبداللہ حسین پر کوئی فحاشی کا الزام نہیں دھر سکتا، مگر کاش وہ بعض جنسی نوعیت کے الفاظ اور جملوں کے فراواں استعمال سے اجتناب کر سکتے۔

یہ ناول ایک بلاک بسٹر ساگا (blockbuster saga) قسم کا ناول ہے۔ جیمز مچنر (James Michner) کے "ہوائی" کی طرح یا پاسٹر ناک کے "ڈاکٹر ژواگو" کی طرح۔ قطع نظر اس کے کہ ہم اپنی تاریخ کو تاریخ کی شکل میں پسند کرتے ہیں یا ناول کے روپ میں، ہمیں عبداللہ حسین کے عظیم عزائم کی داد ضرور دینی پڑتی ہے۔ انھوں نے اپنے مقصد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک وسیع خاکہ بنایا اور اس میں بڑی لگن، بڑی عرق ریزی اور بے اندازہ صبر سے رنگ بھرنے شروع کیے۔ اس کام میں انھیں کم و بیش پانچ سال لگے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی ذکر کیا ہے کہ انھوں نے برسوں تک آدھی رات کا تیل جلایا (یہ کہنے کا ایک طریقہ ہے ورنہ کہنا چاہیے کہ انھوں نے کئی ہزار یونٹ بجلی خرچ کی) — اور میرا خیال ہے کہ ان کو کامیابی نصیب نہیں ہوئی، اگرچہ کتاب کو آدم جی انعام ضرور مل گیا۔ وہ ناکام ہوئے ہیں لیکن ایک بڑے عزم کی تکمیل میں۔ ایسی ناکامی باعزت ہے۔ ہمیں ان کی پیٹھ تھپکنا چاہیے کہ ان کے قدم نہیں تھکے اور ایل دوریدو (El Dorado) کے سنہری مینار اور بُرج ہمیشہ ان کے سامنے رہے۔ اردو کے کتنے ادیب ایسے ہیں جو اتنی ثابت قدمی اور یکجہتی سے اپنی قطبی روشنیوں کی طرف سفر کرتے رہے؟ ادبی جمود پر واویلا مچانے کے لیے تو ہر کوئی پیش پیش ہے مگر تخلیقی لگن سے ایماندارانہ کام کرنے والا کوئی بھی نہیں۔

Scanned with CamScanner

میں ''اداس نسلیں'' پڑھنے پر کیسے آمادہ ہوا؟ میں اردو کے ناول کم ہی پڑھتا ہوں اور پینتالیس سال کی عمر کے بعد لمبے ساگاز کو پڑھنا میرے لیے ایک روح فرسا مرحلہ بن جاتا ہے۔ پھر اس ناول کی قیمت غالباً سولہ روپے ہے — اور سولہ روپے سولہ روپے ہوتے ہیں۔ اس کے ناشر کی اس فیاضانہ پیشکش کے باوجود کہ وہ یہ ناول مجھے رعایتاً دے دے گا، میں متامل رہا۔ پھر ایک دن میرے دوست 'ن' نے یہ ناول مجھے لا کر دیا۔ اس نے اسے مہینوں پہلے خریدا تھا مگر زندگی کی مصروفیات میں اس کے پاس اسے پڑھنے کا وقت نہ تھا۔ میں ناول لے آیا اور وہ میرے پاس ایک مہینے تک پڑا رہا۔ اتنے میر۔تھان (marathon) ناول سے نبٹنے کی ہمت نہ پڑتی تھی، اگرچہ میں خود کو یقین دلا چکا تھا کہ یہ ورک آف جینئس ہے۔ ایک مہینے کے بعد میں نے یہ ناول اپنے دوست 'ک' کو پڑھنے کے لیے دیا، جس کا ادبی مذاق بہت ستھرا ہے اور جو آج کل اردو ادب کا ایک طالب علمانہ انہماک سے مطالعہ کر رہا ہے۔ ایک ہی دفتر میں کام کرنے کی وجہ سے 'ک' اور میں روز ملتے ہیں۔ 'ک' کے ردعمل دلچسپ تھے۔ جب وہ پہلے ابواب کو پڑھ رہا تھا تو ان کی تعریف میں بہت پرجوش تھا۔ اس نے کہا یہ اردو کا ''وار اینڈ پیس'' ہے، ہمارے ادب کا اس وقت تک عظیم ترین ناول ہے۔ میں 'ک' کی عزت کرتا ہوں سو میں مناسب طور پر متاثر ہوا۔ میں نے عبداللہ حسین سے تھوڑا سا حسد بھی محسوس کیا۔ چار پانچ دن کے بعد 'ک' کا چہرہ کچھ لٹکا ہوا تھا۔ ''ناول کے متعلق میری رائے کچھ تبدیل ہو رہی ہے۔ میں اب اٹک گیا ہوں اور آگے نہیں چل سکتا۔'' اس رائے سے مجھے ایک گونہ تشفی ہوئی۔ پھر 'ک' نے خوشخبری دی کہ وہ دلدلی حصے میں سے سلامتی سے گزر گیا ہے اور ناول کی کہانی پھر بڑھنے اور گرفت کرنے لگی ہے۔ اس نے ناول کو ہفتے میں ختم کر دیا، اور اس کی سوچی سمجھی ہوئی رائے ناول کے بارے میں یہ تھی کہ آخری ڈیڑھ دو سو صفحات کو چھوڑ کے، جنھیں بغیر کچھ گنوائے skip کیا جا سکتا ہے، کہانی کہیں نہیں رکتی اور ٹیمپو برقرار رہتا ہے۔ ''ناول بحیثیت مجموعی شان دار ہے، اردو کا عظیم ترین ناول۔'' 'ک' نے ناول واپس کر دیا، اور میری پھر بھی اسے شروع کرنے کی ہمت نہ بندھی۔ اب 'ت' نے اسے پڑھنا شروع کیا۔ 'ت' ایک عورت ہے، زیادہ ادبی عورت نہیں، اگرچہ اس نے کالج میں ''جین آئر'' اور ''وُدرنگ ہائیٹس'' اور ہارڈی کا ''ٹیس'' (Tess) پڑھے تھے اور ابھی تک ان کو نہیں بھول سکی تھی۔ ویسے وہ اے آر خاتون اور زبیدہ خاتون کے

ناولوں کی بڑی مداح ہے اور ''زیب النسا'' کو باقاعدگی کے ساتھ بڑے اشتیاق سے پڑھتی ہے۔ آپ اسے ہماری اوسط پڑھی لکھی خواتین کی ایک اچھی نمائندہ گردان سکتے ہیں۔ 'ت' کا ردِعمل ابتدا ہی سے اس ناول کے خلاف تھا۔ اس نے وقت گزارنے کے لیے ''اداس نسلیں'' کو پہلے سو یا ڈیڑھ سو صفحات تک پڑھا اور پھر کتاب کو ایک طرف پھینک دیا۔ اس نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں اسے زبیدہ خاتون کا نیا ناول ''شیریں'' لادوں۔ 'ت' نے کہا، ''اس میں کہانی تو سرے سے ہے ہی نہیں، کوئی کردار صحیح معنوں میں زندہ نہیں ہوتا۔ تاریخ اور فلسفے کے قبیل کی چیز ہے... اب 'وُدرنگ ہائٹس' کو لو، یا ہارڈی کی 'ٹیس' کو۔ کیا تم نے 'ٹیس' کو پڑھا ہے؟ وہ سچ مچ کا ناول ہے۔ 'ٹیس' کو تم چھو اور محسوس کر سکتے ہو...'' 'ت' نے اور بہت کچھ کہا جو عبداللہ حسین کے بہت حق میں نہیں تھا۔ آخر میں نے اپنے دوستوں 'ن' اور 'ک' کے شدید اصرار سے تنگ آ کر ''اداس نسلیں'' کا آغاز کیا۔ یہ ایک طور پر 'ہوم ٹاسک' بھی تھا، کیونکہ مجھے اس پر ریویو لکھنا تھا اور 'ن' نے مجھے ایک آخری ڈیڈ لائن تاریخ دے رکھی تھی۔ میں نے اسے چار پانچ روز میں ختم کر ڈالا۔

(''اور تم اس کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہو؟'' بے صبر پڑھنے والا پوچھتا ہے۔)

میں اپنی رائے تفصیل سے بتاؤں گا کیونکہ ریویو کو چند اکثر دہرائے جانے والے بے معنی جملوں پر مشتمل نہ ہونا چاہیے۔ میں اس کے لیے بیلا کین (Bellocian) طریقہ استعمال کروں گا۔ ہم مسٹر عبداللہ حسین کو ڈاک (dock) میں کھڑا کریں گے اور میں (ریویوئر) اور تم (پڑھنے والے) ایک دوسرے کی لحاظ داری کو بالائے طاق رکھ کے اور ہر قسم کی لگی لپٹی اٹھا کر یا ہم دو ٹوک جرح کریں گے۔ سو تیار ہو جاؤ اور آستینیں چڑھا لو۔

پڑھنے والا: ایک طرف تو تم یہ کہتے معلوم ہوتے ہو کہ یہ ناول شاہکار ہے اور دوسری طرف تم نے ایک سو ایک وجوہ یہ ثابت کرنے کے لیے دی ہیں کہ یہ ناول نہیں ہے بلکہ ناولائی ہوئی تاریخ۔ انگریزی روزمرہ میں اسے ایک ہی سانس میں گرم اور سرد پھونکنا کہتے ہیں۔

ریویوئر: میں اسے شاہکار کبھی نہ کہوں گا۔ یہ کوئی ''وار اینڈ پیس'' یا ''برادرز کارامازوف'' نہیں۔ خاکہ وسیع اور شوریدہ ہے، مگر رنگ دھیمے اور پھیکے۔ بلونت سنگھ اور بیدی کی طرح زندگی سے

پھڑکتے ہوے کوئی کردار نہیں جو تقریباً دیکھے اور سونگھے جا سکتے ہوں۔ وہ پڑھنے والے پر کبھی طاری نہیں ہوتے۔ ایجاد اور تخلیق کے دیپ پہلے چند ابواب میں دمکتے ہیں، لیکن خال خال۔ ناول بحیثیت ایک کہانی، پڑھنے والے کو اپنی گرفت میں نہیں لیتا — کالرج کے "قدیمی سمندری آدمی" کی آہنی گرفت، جسے تم چاہو بھی تو چھڑا نہیں سکتے۔ اسلوب میں بالعموم ایک خشک سالی، ایک بنجر پن ہے جو شاید مصنف نے ارادتاً چنا ہے۔ جب تک اس کی تخلیقی آگیں جلتی رہتی ہیں، یہ اسلوب اپنے تاثر کے بغیر نہیں، مگر جوں ہی یہ آگیں سرد پڑنی شروع ہوتی ہیں اور مصنف اپنی سیکنڈ ہینڈ پر حاصل کی ہوئی رپورتیج کا سہارا لیتا ہے، اس اسٹائل کا تاثر مرجھا دینے کی حد تک مہلک ہو جاتا ہے اور اس کی کم مائگی عیاں ہو جاتی ہے۔ آدمی بلونت سنگھ کو یاد کرتا ہے، اس کے "رات، چور اور چاند" کو جس میں ہر لفظ جگر مگر کرتا ہے اور سب مناظر تھری ڈائمنشنل اثر رکھتے ہیں۔ "اداس نسلیں" کی کہانی پڑھنے والے کو بے تابی سے، اضطراب سے، اگلے اور پھر اگلے صفحے کو پڑھنے پر مجبور نہیں کرتی۔ قاری خود اس کے دشتوں میں پھونک پھونک کر قدم دھرتے ہوے بڑھتا ہے اور اسے کتاب کو ایک طرف رکھ دینے میں کوئی خاص تامل نہیں ہوتا...

پ: تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ یہ ڈل ہے اور غیر دلچسپ؟

د: نہیں یہ ڈل نہیں ہے، مگر یہ ایسا بھی نہیں کہ آدمی ایک صفحے کے خاتمے تک پہنچے اور دھڑکتے دل کے ساتھ یہ جاننے کے لیے مضطرب ہو کہ اگلے صفحے پر کیا ہوگا۔ یہ ان کتابوں میں سے نہیں کہ جنھیں بیچ میں چھوڑ دینا ناممکن ہو جاتا ہے اور جنھیں تم سرما کی کٹیلی راتوں میں لحاف میں دبک کر پو پھٹے تک پڑھ سکتے ہو۔

پ: خوب! دلچسپ بھی نہیں اور ڈل بھی نہیں! کیا تمھارے حواس بالکل درست ہیں؟

د: جہاں تک میرا خیال ہے، میرے حواس درست ہیں۔ بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ درست نہیں مگر میں ان سے اتفاق نہیں کرتا۔ ہمیں پرسنل ہونے کی ضرورت نہیں۔

پ: ناول کا نام "اداس نسلیں" کس بنا پر چنا گیا ہے؟

د: میں نے اس پر غور کیا ہے۔ مصنف کے خیال میں پچھلے پچاس سال کی نسلیں جو اس ملک میں پیدا ہوئیں اور پروان چڑھیں، اداس تھیں۔ خصوصیت سے وہ نسلیں کیوں اداس تھیں؟ یہ میں نہیں سمجھ پایا۔ ہم سب تنہا جیتے اور مرتے ہیں اور سب نسلیں، خواہ وہ کسی زمانے کی پیداوار ہوں، اُداس ہوتی ہیں۔

Scanned with CamScanner

یہ آدمی کی قسمت ہے۔

پ: مجھے یہ نام پسند ہے، رومینٹک سا حزن لیے ہوئے۔

د: مصنف کو اس سے بہتر نام ملنا محال تھا۔

پ: کیا تم مجھے بتا سکتے ہو کہ کہانی کیا ہے اور ناول کس بارے میں ہے؟ تمھیں شیکسپیئر کا وہ مقولہ یاد ہوگا کہ اختصار ظرافت کی جان ہے۔

د: ہاں، میں مختصر ہونے کی کوشش کروں گا، اگرچہ ''اداس نسلیں'' کے مصنف نے اس سنہری اصول پر کاربند ہونا غیر ضروری سمجھا۔ میں اسے الزام نہیں دیتا۔ بات کو اَن کہا چھوڑنا اسے پوری طوالت سے کہنے سے بہت زیادہ مشکل ہے۔ اب اس ناول کا خلاصہ دینا، اس کی وسعت کو چند الفاظ میں سمیٹ کر پیش کرنا میرے بس کا روگ نہیں۔ اتنے سارے کردار ہیں اور اتنے سارے واقعات۔ پھر مجھے اس ناول کو ختم کیے ایک مدت ہو چکی ہے اور کئی ایک تفصیلات میرے دماغ میں دھندلی سی ہو چکی ہیں۔ بیشتر کردار البتہ مستعار لیے ہوئے ہیں اور وہ ناول کو صرف پینورامک بنانے کے لیے ٹھونسے گئے ہیں۔ میں انھیں خاطر میں نہیں لاؤں گا۔ دو تین اہم کرداروں کا اور ان کے ساتھ ہونے والے واقعات کا ذکر البتہ کروں گا۔

پ: ایک منٹ! تم پھر مصنف کو سرقے کا مجرم قرار دے رہے ہو۔ کوئی ثبوت؟

د: میں نے ادبی سرقے کے بارے میں پہلے بھی کہا ہے کہ ہم میں سے ایک بھی اس سے نہیں بچ سکا۔ ہر کوئی کسی نہ کسی وقت اپنے سے بہتر فن کاروں کی نقالی کرتا ہے۔ تم نے گراہم گرین کا نام سنا ہے؟

پ: ہاں! اس نے ہالی وڈ میں ایک فلم ڈائرکٹ کی ہے۔

د: وہ فلم والا الفریڈ ہچکاک تھا۔ گراہم گرین ایک ناولسٹ ہے اور میرا خیال ہے وہ اپنے فن کا استاد ہے۔ ایک ایک فقرہ جو وہ نہایت کفایت سے، نہایت تیکھے پن سے لکھتا ہے، پڑھنے والے کے خون میں ایک تیز زہر کی طرح سرایت کرتا ہے۔ گراہم گرین سے بہتر نثر کوئی موجودہ انگریزی ناولسٹ نہیں لکھ سکتا۔ تم جانتے ہو اس نے کس طرح لکھنا سیکھا؟ جب وہ سترہ سال کا لڑکا تھا اس نے فیصلہ کیا کہ وہ مصنف بنے گا اور دو تین سال وہ ایک مقبولِ عام ناول ''وائپر آف میلان'' کی ناکامیاب نقالی سے اپنی کاپیاں سیاہ کرتا رہا۔ سو اب ''اداس نسلیں'' کے بارے میں یہ کہنا مذاق نہیں کہ اسے عبدالحلیم شرر،

Scanned with CamScanner

ڈپٹی نذیر احمد، منشی پریم چند، بلونت سنگھ، مس قرۃ العین حیدر اور جواہر لال نہرو نے مل کر ترتیب دیا ہے...

پ: تم واقعی کینے کے جذبے سے اُبل رہے ہو۔

د: نہیں، یہ کینہ یا حسد نہیں۔ میں فرشتہ نہیں اور مجھ میں اتنا ہی کینہ ہے جتنا تم میں یا میرے پڑوسی میں۔ چالیس پینتالیس سال کے ایک آدمی میں شہرت کی خواہش مجھے ہمیشہ حد درجہ مضحکہ خیز لگی ہے اور مجھے اب اپنے نام کو چھپا ہوا دیکھ کر ذرا بھی خوشی نہیں ہوتی۔ نہ ہی اب میں اپنے سے کہیں بہتر لکھنے والوں سے جلتا ہوں، خصوصاً عبداللہ حسین سے جسے میں اچھی طرح جانتا بھی نہیں۔ ویسے بھی ہمارا کینہ زیادہ تر ہمارے دوستوں کے لیے وقف ہوتا ہے۔

پ: (مسکراتے ہوئے) خیر! یہ تم کیونکر کہتے ہو کہ ان سب نے مل کر عبداللہ حسین کے ناول کو لکھا ہے؟

د: ان کی تحریر میں ان سب مصنفوں کی گونجیں ہیں۔ ''اداس نسلیں'' کا باب اوّل بالکل پرانے اردو ناولوں کے روایتی انداز میں تیار کیا گیا ہے — 'تیار کیا گیا' اس لیے کہ یہ انداز اختیاری اور پُر تصنع ہے۔ عبدالحلیم شرر غالباً اپنے ناول کا یوں ہی آغاز کرتا۔ ''ابن الوقت'' کا نذیر احمد بھی تیسرے صفحے کے بعد اس کی مدد کو پہنچتا ہے اور دونوں ایک دوسرے پر حاوی ہونے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے ہیں۔ اگلے ابواب میں دیہاتی زندگی کے مختلف مرقعے ڈاکٹر اعظم کریوی اور منشی پریم چند کے ڈیزائن کیے ہوئے لگتے ہیں۔ اور ''مہندر سنگھ'' کا کردار بلونت سنگھ کی کہانیوں میں سے اٹھایا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ دہلی کے روشن محل کے لوگ، ان کی باتیں، ان کے مشاغل سب کے سب دس سال پہلے کی قرۃ العین حیدر کی پیشکش ہیں...

پ: کتنا کینہ ہے تم میں! اچھا تو تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ ''اداس نسلیں'' میں مصنف کا اپنا کچھ بھی نہیں؟

د: سب کچھ اس کا ہے۔ منفرد لہجہ، اسلوب جو موثر ہے، دیہاتی زندگی کا گہرا مشاہدہ، ایک تربیت یافتہ، انسان دوست شخص کا مزاج، بالغ سیاسی شعور، مکمل اور بے عیب ایمانداری۔

پ: اور جواہر لال نہرو — وہ کہاں آتا ہے؟

د: اس نے جلیانوالہ باغ کی ایک episode اور سائمن کمیشن کے خلاف الٰہ آباد میں مظاہرے

کے بیان میں کچھ مدد کی ہے۔ تمھیں یاد ہوگا کہ نہرو نے غالباً ۱۹۳۴ء میں اپنی آپ بیتی شائع کی تھی، جو اس کی آپ بیتی ہونے کے علاوہ جدوجہدِ آزادی کی ایک پُرکشش تاریخ بھی ہے۔ عبداللہ حسین نے اسے حوالے کے لیے ضرور پڑھا ہوگا اور اس کے ساتھ کانگریس کی تحریک کی تاریخوں اور اس دور کے سیاسی کتابچوں کو بھی۔ وہ authenticity کے پیچھے تھے جو حقائق جانے بغیر حاصل نہیں کی جاسکتی۔ اسی خاطر انھوں نے سیاسی شخصیتوں کی جھلکیاں بھی پڑھنے والے کو مختلف مقامات پر دی ہیں۔ گوکھلے اور اینی بیسنٹ اور مولانا محمد علی اور دوسرے ان کے صفحات میں سے اُڑتے ہوئے سے گزرتے ہیں، مگر وہ حقیقتاً زندگی اختیار نہیں کرتے۔

پ: میرے پلے کچھ نہیں پڑ رہا۔ تم کافی اُلٹے دماغ کے آدمی ہو۔

ر: ایسا سمجھنے میں تم تنہا نہیں ہو۔ میرے دفتر میں میرے باس کا بھی یہی خیال ہے۔

پ: تم نے مجھے ناول کی کہانی سنانے کا وعدہ کیا تھا۔

ر: مجھے یاد کرنے دو... ہاں، ناول روشن پور گاؤں کی تاریخ سے شروع ہوتا ہے جو برٹش انڈیا کے صوبہ دہلی میں واقع ہے، لیکن پنجابی لوگ بھی وہاں خاصی تعداد میں بستے تھے اور اپنا تمدن رکھتے تھے۔ گاؤں کا ماحول مخلوط تمدن کا حامل تھا۔ روشن پور کے ایک شخص روشن نے غدر کے زمانے میں ایک فرنگی کرنل جانسن کی جان باغیوں سے بچائی جس کے صلے میں سرکار برطانیہ نے اسے یہ جاگیر، جو پانچ سو مربعوں پر مشتمل تھی، عنایت کی اور ایک دربار میں آغا کے خطاب سے نوازا۔ مرزا محمد بیگ روشن کے ایک دانت کاٹی روٹی کھانے والے لنگوٹیے یار تھے۔ روشن میاں آغا بننے کے بعد مرزا محمد بیگ کو بھی اپنے ہمراہ دلی لے آئے۔ مرزا محمد بیگ کے دو لڑکے ہوئے: ایک نیاز بیگ، دوسرا ایاز بیگ۔ نیاز بیگ ان دنوں خوبصورت نوجوان تھا۔ وہ گاؤں میں زمینداری میں مصروف رہا۔ مگر ایاز بیگ کا مزاج مختلف تھا۔ اس نے ریلوے میں ملازمت کر لی اور اس سلسلے میں کلکتہ میں بھی رہا۔ نیاز بیگ کا لڑکا نعیم اپنے چچا ایاز بیگ کے ساتھ رہتا تھا اور دونوں چچا بھتیجے کے درمیان بڑی محبت تھی۔ نعیم نے کلکتہ میں سینئر کیمبرج کیا اور ایاز بیگ کے ملازمت سے فارغ ہونے پر وہ دونوں پھر دلی آئے۔ وہاں وہ ایک دن روشن محل کے نواب محی الدین کی خدمت میں گئے جہاں نعیم نواب کی نوعمر لڑکی عذرا سے بھی ملا، جسے بعد میں اس کی بیوی بننا تھا۔ اس شام نواب نے ایک دعوت دی تھی جس میں گوکھلے اور اینی بیسنٹ بھی آئے۔ اس باب

میں تفصیلات اور جزئیات نگاری متاثر کرتی ہے۔ ہم گو کھلے اور مس بیسنٹ کو قریب سے دیکھتے اور باتیں کرتے سنتے ہیں، مگر یہ باتیں کتابی ہیں۔ وہ اور دوسرے مہمان چار چار گھوڑوں کی بہلیوں میں چلے جاتے ہیں اور اہم گو کھلے اور اینی بیسنٹ سے پھر نہیں ملتے (اور ضرورت بھی کیا ہے)۔ یہ باب واقعی بریلیئنٹ (brilliant) ہے، اگرچہ فن سے زیادہ ایک اسٹیج کا سیٹ ہے۔ نعیم بعد میں بھی روشن محل جاتا رہا اور عذرا اسے اچھی لگنے لگی۔ ایک دن عذرا نے اسے طعنہ دیا کہ وہ سرکاری نوکری میں نہیں جا سکتا اور وہ غصے میں آکر اپنے چچا کو چھوڑ کر اپنے گاؤں روشن پور کی طرف روانہ ہو گیا۔ شام کے دھند لکے میں مریل گھوڑے پر سوار اور ایک باتونی کمین کی معیت میں اپنے دہقان بوڑھے باپ کے مکان پر پہنچا۔ کھردری داڑھی اور پسینے میں ڈوبے ہوئے پنڈے والا باپ گھر سے باہر آیا اور اپنے مہذب پڑھے لکھے، نرم رو بیٹے سے لپٹ گیا، اس کے گالوں اور سینے کو چومتا ہوا۔ اگلے دس باب نعیم کی دیہاتی زندگی کے متعلق ہیں اور میں اب بھی سمجھتا ہوں کہ سچ مچ شاندار ہیں۔ ان میں عبداللہ حسین اپنا اصلی genre دریافت کر لیتے ہیں۔ ان ابواب میں پرل بک کے ناول ''گڈ ارتھ'' کی سی ابدیت اور آفاقیت ہے اور ایک دبی ہوئی سی توانائی سادگی سے ڈھلے ہوئے فقروں میں مچلتی محسوس ہوتی ہے۔ موسموں کا تغیر و تبدل، 'بیل کے بھائی' دہقان کی جفاکشی اور محنت، فصلوں کی بوائی، ہل چلانا، بھینسوں کا دودھ دوہنا، اُپلے تھاپنا، رات کو تندرست اشتہا سے پیٹ بھر کر کھانا کھانا اور اپنی عورت سے بغل گیر ہونا۔ دیہاتی زندگی کی ساری تصویریں ایک نادر جزو بینی، اعتماد اور روکھے غیر جذباتی برش سے کھینچی ہوئی ہیں۔ یہ سفیدی اور سیاہی میں ہیں، صاف اور ننگی، اور واضح طور پر نقش کی ہوئی، اور ان میں کوئی رنگ نہیں۔ یہاں بیدی کے ایک ناول ''ایک چادر میلی سی'' اور بلونت سنگھ کے ناول ''رات، چور اور چاند'' سے موازنہ ناگزیر سا ہو جاتا ہے۔ وہ دونوں جگمگاتے ہوئے اور تپتے ہوئے جذبات کی حدت سے لکھے ہوئے شاہکار، جو قاری کو اپنے شوریدہ، من موہنے بہاؤ میں ایک پہاڑی ندی کی طرح بہا لے جاتے ہیں اور اس کے دماغ میں ان گنت، متنوع، رنگین سپنے جگا دیتے ہیں۔ یہ موازنہ عبداللہ حسن کے حق میں نہیں جاتا اور ان کی کچھ کچھ رکی ہوئی محدود صلاحیتیں عیاں ہو جاتی ہیں۔ اپنی خوش نصیبی کے لمحوں میں وہ اپنے سونے روکھے تاثر پیدا کرتے ہیں اور کچھ وقفے کے لیے بعض کردار شاندار طریق پر تابناکی سے زندہ ہو جاتے ہیں۔ پھر دیا گل ہو جاتا ہے اور ہر چیز بے سکت، ادھ موئی ہو کر رہ جاتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ آدمی اس روشن پور کے گاؤں کے

Scanned with CamScanner

وجود کو پوری طرح تسلیم نہیں کر سکتا جو ڈاکٹر اعظم کریوی کے بہاری اور بلونت سنگھ کے ماجھے کے گاؤں کی کچھ مرکب سی چیز ہے۔ نعیم کا اکھڑ، توانا، محنتی دہقانی باپ نیاز بیگ جو اپنے بڑھاپے میں بھی دو بیویوں کو مطمئن رکھ سکتا ہے، کاٹھ کا پتلا نہیں۔ وہ عناصر زندگی جو اس کے کھیت کے خوشوں، بیلوں کی جوڑی، بھینسوں اور گھوڑی میں ہے، اس میں بھی تڑپتی ہے۔ وہ اپنے سلجھے ہوئے خاموش، تعلیم یافتہ لڑکے کو اچھی طرح نہیں سمجھتا مگر وہ جانتا ہے کہ ایک آدمی کی فطری ضروریات کیا ہیں — کھیت کی بوائی اور کٹائی، مردانگی اور خودداری، لسی اور دودھ کی چھاگل، بیسنی روٹی، کڑوے ملے تمباکو کا کش اور گدگدے جسم والی تندرست عورت۔ آدمی محسوس کرتا ہے کہ بوڑھے آدمی میں اپنے بیٹے کے لیے بے اندازہ محبت اور غرور ہے گو وہ اس کا اظہار نہیں جانتا۔ عبداللہ حسین جگہ جگہ کرنل نیاز بیگ، نعیم اور نعیم کی دو ماؤں کے باہمی تعلقات پر چونکا دینے والے انکشافات کرتے ہیں اور وہ دونوں عورتیں، ایک جوانی سے ڈھلی اور دوسری نوجوان اور جسم کی کسی ہوئی، اگرچہ وہ ناموں کے بغیر رہتی ہیں، ان بے شمار کرداروں سے بہت زیادہ زندہ ہیں جو آگے چل کر غیر ضروری طور پر ناول کے صفحات میں داخل ہوتے ہیں اور جنھیں مصنف بڑے وثوق سے، بڑے انٹلکچوئل فخر سے پیش کرتا ہے۔ یہ کردار محض نام رہتے ہیں اور تم انھیں نہیں جانتے۔ گاؤں میں نعیم کو کئی ایک دوست مل گئے جن میں ایک مہندر سنگھ بھی تھا— بلونت سنگھ کا کردار۔ یہ مہندر سنگھ ناول میں سب سے جاندار کردار ہے اور چھیل چھبیلے تنومند سکھ لڑکے کی نیاز بیگ کے نرم پولے شہری لڑکے سے پہلی ملاقات کا حال فی الواقع مسرت انگیز ہے۔ وہ پکے دوست بن جاتے ہیں۔ ایک رات نعیم اپنے دوست کا ساتھ دینے کی خاطر مہندر سنگھ، اس کے بھائی جوگندر سنگھ اور جوگندر سنگھ کی بیوی اور ساس کے ساتھ جوگندر کے چچیرے بھائی کے قتل کا انتقام لینے گیا۔ وہ دریا کے کنارے پہنچے جہاں تین آدمی لحافوں میں لپٹے تھے۔ مردوں نے چارا کاٹنے والے ٹوکوں سے ان کے ٹکڑے ٹکڑے کیے اور عورتوں نے ان ٹکڑوں کو ٹوکریوں میں بھر کر دریا میں ڈال دیا۔ ایک سین جو اپنی ڈرامائی کیفیت اور طرزِ بیان کے قدرتی پن کی وجہ سے آسانی سے نہیں بھولتا۔ یہ سارا باب ہی غالباً ناول میں بہترین ہے اور مصنف کے جینیئس کی آگ تیز تیز بھڑک اٹھتی ہے۔

پ: آخر کار اپنے چھپے ہوئے حسد کے باوجود تم عبداللہ حسین کو جینیئس تسلیم کرتے ہو؟

د: وہ جینیئس ضرور ہے مگر سیکنڈ آرڈر کا!

Scanned with CamScanner

پ: یہ غنیمت ہے کہ تم نے اسے تھرڈ آرڈر کا نہیں کہا۔ کیا ہمارے ہاں تمھارے نزدیک فرسٹ آرڈر کے کوئی جینیئس ہیں؟

ر: ہاں، میں سمجھتا ہوں سرشار اور مرزا رسوا فرسٹ رینک کے جینیئس تھے، اور ہماری نسل میں بیدی، بلونت سنگھ اور خدیجہ یقیناً فرسٹ آرڈر کے جینیئس ہیں، جہاں تک ناول کا تعلق ہے۔

پ: اس سے یقیناً فرسٹ آرڈر والوں کو خوشی ہوگی اور بہت سوں کو دلی رنج۔ اب آگے چلو، اختصار ظرافت کی جان ہے کو پیش نظر رکھ کے۔

ر: میں بہت اختصار برت رہا ہوں۔ پھر پہلی جنگِ عظیم چھڑ جاتی ہے۔ بھرتی کرنے والے افسر روشن پور میں آئے اور کئی نوجوانوں کو زبردستی بھرتی کرنے لگے۔ نعیم بھی اپنی مرضی سے بھرتی ہوگیا، غالباً مہم جوئی کے اشتیاق سے، غالباً اپنے آپ سے فرار پانے کے لیے۔ اس کی روح ایک خاموش، سلگتی ہوئی، مضطرب روح ہے۔ ٹریننگ کے بعد اس کی پلٹن ایک جہاز میں مغربی محاذ پر روانہ ہوئی۔ قاہرہ میں وہ مشین گن ڈی ٹیچمنٹ میں لانس نائیک ہوگیا۔ فرانس میں پہنچ کر وہ بذریعہ ریل آرڈینز فرنٹ کی طرف روانہ ہوا جہاں جرمنوں سے تند اور سخت خندقی لڑائی ہو رہی تھی۔ اس کا حوالدار ٹھاکر داس، جو جنگ سے پہلے عورتوں کا دھندا کیا کرتا تھا، ایک جہاں دیدہ، ذہین اور قابلِ یقین کردار ہے۔ ایک رات فرنٹ سے دو میل اِدھر ایک مکان میں حوالدار نے اپنے لانس نائیک کو اپنی زندگی کی کہانی سنائی۔ حوالدار کی ایک محبت کرنے والی بیوی تھی اور بچے، اور وہ اپنی زندگی سے مطمئن تھا۔ اس کی طمانیت نعیم کے دل میں ایک چھری بن کر لگی۔ وہ حسد اور نفرت سے جلنے لگا۔ یہ شخص اتنا مطمئن کیوں تھا؟ اسے خوش ہونے کا کیا حق تھا؟ چند دن بعد خندقوں میں اکیلے لڑتے ہوئے ان کا بارود ختم ہوگیا اور ٹھاکر داس نے اپنے لانس نائیک کو بارود لانے کا حکم دیا کیونکہ ان کے دوسرے ساتھی مہلک جرمن فائر سے ختم ہو چکے تھے۔ جب وہ بارود لے کر پہنچا تو جرمن لائن پوری تیزی سے اُٹھ اور بڑھ رہی تھی۔ نفرت اور حسد نعیم کے سینے میں زہر گھولنے لگے۔ اس نے جان بوجھ کر خود کو زخمی ظاہر کیا۔ ٹھاکر داس اچک کر اُس کے پاس پہنچنے کے لیے خندق کی سلامتی میں سے نکلا اور وہیں ڈھیر ہوگیا۔

پ: میں یہ نہیں سمجھ سکا۔ نعیم اچھا سلجھا ہوا دلیر آدمی معلوم ہوتا ہے، وہ اپنے حوالدار کو جان بوجھ کر موت کا شکار کیوں کراتا ہے؟

Scanned with CamScanner

د: انسان کی جبلی شیطنت اور کمینگی۔ ہمارے بہترین دوستوں کی بے وقت موت سے ہمیں اک گونہ تسلی ہوتی ہے کہ ہم ان سے زیادہ دیر تک زندہ ہیں۔ محرومی انسان کو ہمیشہ تلخ اور کمینہ بنا دیتی ہے۔ نعیم حوالدار کی طمانیت اور خوشی اور بے پروا دلیری کو برداشت نہیں کر سکتا۔ لیکن اس کلائمکس کو لانے کے لیے بہت زیادہ فنی اور تخلیقی قوت کی ضرورت تھی اور مصنف اسے خوبی سے، مہارت سے نبھا نہیں سکا۔ جنگ ختم ہوئی اور نعیم لکڑی کا ایک بازو لگائے اور وکٹوریا کراس جیتے، اپنے باپ کے گاؤں میں لوٹا — پہلے سے کرخت، پختہ کار اور تنہا۔ گاؤں میں آنے کے ایک دن بعد اس نے روشن آغا کے منشی کے ہاتھوں ایک بوڑھے کسان کی بے عزتی ہوتے دیکھی۔ روشن آغا نے موٹر خریدی تھی اور منشی گاؤں والوں سے 'موٹرانہ' کے لیے تقاضا کر رہا تھا۔ نعیم کا خون کھولنے لگا۔ اس نے سکھوں کے ساتھ سؤر کا شکار کھیلا تھا۔ شکار میں اس نے مہندر سنگھ کے بھائی جوگندر سنگھ کی جان بچائی جس پر ایک سؤر نے حملہ کر دیا تھا۔ جب اگلے دن روشن آغا نواب محی الدین خاں خود اپنی جاگیر میں 'موٹرانہ' وصول کرنے آئے تو منشی نے ایک بوڑھے کسان احمد دین کو بیل کی طرح چاروں ہاتھ پاؤں پر زبردستی گرا دیا اور اس کے گلے میں پٹکا باندھ کر روشن آغا کی بگھی کے پاس گیا۔ نعیم بہت گھبرایا، اس انتہائی انسانی ذلت پر۔ ایک ماسٹر نے اسے دہشت پسندوں کے گروہ میں شامل ہونے کی ترغیب دی اور کچھ مدت تک اس نے ان کے ساتھ کام کیا۔ اسے ایک مال گاڑی کو ڈائنامائٹ سے اڑانا تھا لیکن آخری وقت اس کی ہمت جواب دے گئی۔ اس نے ان کو چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور ایک لڑکی شیلا سے، جو ان کے ساتھ رہتی تھی، اس نے سازش کی۔ وہ اور شیلا ایک دو راتیں اکٹھے رہتے ہیں اور شیلا کو اس سے محبت ہو جاتی ہے۔ وہ اس سے کہتی ہے کہ یہ تمھیں مار دیں گے، انھوں نے پہلے بھی ایک کو مارا تھا۔ پو پھٹے دونوں وہاں سے چل پڑتے ہیں۔ نعیم اس کو اپنے سے جھٹک دیتا ہے اور شیلا کی ساری منتوں کے باوجود اس کا دل نہیں پسیجتا۔ وہ پہلے بلک بلک کر روتی رہی، پھر اس نے پوری طاقت سے چلا کر کہا، ''جاؤ لنگڑ بند سؤر!'' اور ایک بھاری پتھر نعیم کی طرف لڑھکا دیا۔

یہ جنگ کے سین اچھے ہیں، مفصل، اور ان میں آنکھوں دیکھے حال کی سی اصلیت ہے۔ 'ک' ان سے بڑا متاثر ہوا اور بہت سے پڑھنے والوں نے ان کی تعریف کی ہے۔ میری رائے میں انھیں اچھا رپورتاژ تو کہا جا سکتا ہے مگر تخلیق نہیں۔ ان کا بھی اسٹیج کا سا تاثر ہے اور حوالدار ٹھاکر داس قابل یقین

ہونے کے باوجود ایک دھندلا سا، سرسری کردار ہے۔ اسی طرح دہشت پسندوں والے ابواب میں قاری کو اس تحریک کے کارکنوں کی زندگی کی جھلک تو ملتی ہے مگر یہ باب بہت پھیلائے گئے ہیں۔ شیلا البتہ ایک وائبرینٹ (vibrant) کردار ہے اور بہت زیادہ زندہ، اور آدمی نعیم سے اس کو چھوڑ جانے پر نفرت کرتا ہے۔ دہشت پسندوں کے ابواب کے بعد ناول کی دلچسپی بہت حد تک گھٹنے لگتی ہے۔ عبداللہ حسین بڑی آہستگی، میانہ روی اور سنجیدگی سے چلتے ہیں، ان کو کبھی جلدی نہیں ہوتی، اور یہ قاری کے لیے بعض وقت کافی صبر آزما ہو جاتا ہے۔ میں مانتا ہوں کہ ''وار اینڈ پیس'' میں اور ڈکنز کے ناولوں میں کئی ایک ڈل وقفے ہیں، مگر وہ نہ ہوتے تو یہ کتابیں اور بھی بہتر اور عظیم تر ہوتیں۔

پ: کہانی بتاتے جاؤ۔ تم نے ناول کے ڈل ہونے کے بارے میں کافی کچھ کہا ہے۔

د: نعیم کچھ مدت کھیتی باڑی کرتا رہا اور پھر وہ دلی گیا اور روشن محل کی چکا چوند کر دینے والی پارٹیوں میں مدعو کیا گیا۔ وہ اب بھی پرکشش اور خوبصورت شخص تھا، اور عذرا اس کی طرف اس طرح کھنچنے لگی جیسے لوہا مقناطیس کی طرف۔ روشن آغا اور خاندان کی بڑی بوڑھیوں کی شدید مخالفت اور ناراضی کی پروانہ کرتے ہوئے عذرا اپنے باپ کے مزارعے کے لڑکے سے شادی کرنے پر مصر رہی۔ ان دونوں کی شادی ہو گئی۔ عذرا ایک ضدی اور من مانی کرنے والی لڑکی ثابت ہوتی ہے۔ نعیم اور عذرا روشن پور میں نواب کی حویلی میں رہنے لگے اور نعیم نواب کی جاگیر کا انتظام کرنے لگا۔ اتنے میں جلیانوالہ باغ میں گولی چلنے کا سانحہ ہوا اور عذرا نے نعیم کو امرتسر چلنے کے لیے کہا۔

پ: گولی چلنے کے بعد وہاں جانے کا کیا مقصد تھا؟

د: یہ مصنف نہیں بتاتا۔ ظاہراً ان دونوں کے امرتسر جانے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ مگر وہ اپنی سیاسی داستان میں جلیانوالہ باغ کے سانحے کی تفصیلی رپورٹ شامل کیے بغیر نہیں رہ سکتا، اور اس لیے عذرا اور نعیم کا امرتسر پہنچنا ضروری ہے، اور وہ غالباً سانحے کے دوسرے ہی دن وہاں پہنچے۔ اس باغ میں گئے جہاں ڈائر کے گوروں کی رائفلوں کی باڑ نہتے رینگتے ہوئے لوگوں پر پڑی تھی۔ یہاں وہ ایک مچھلی بیچنے والے سے ملے جو کچھ کچھ فلسفی بھی تھا۔ اس نے ان کو جلیانوالہ کے قتل عام کا چشم دید واقعہ سنانے سے پہلے اپنی آپ بیتی سنانے پر اصرار کیا۔ اس طرح مچھلی بیچنے والے کی زبانی ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس ہولناک دن کو کیا ہوا۔ اب خدا جانے عبداللہ حسین کو یہ مچھلی بیچنے والا کہاں سے سوجھا۔ مجھے یقین

ہے کہ ایسا مچھلی بیچنے والا روے زمین پر کہیں وجود نہیں رکھتا، اور جلیانوالہ کے قتل عام کا واقعہ، جسے وہ اتنی مکمل تفصیل سے سناتا ہے، سیکنڈ ہینڈ رپورتیج ہے۔ اس میں پڑھنے والے کے لیے کوئی دلچسپی نہیں ہوسکتی، کیونکہ ہم سب اس کو اسکول کے نصاب کی تاریخ میں اور مختلف کتابوں میں پڑھ چکے ہیں۔ اور پھر یہ کہانی کہنے والا ایک اتنا bizarre اور ناممکن کردار ہے کہ ہم جلد از جلد اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی تمنا کرنے لگتے ہیں۔ اس کے چند دن بعد نعیم اور عذرا فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں لاہور سے دلّی جانے والی گاڑی میں سوار ہوے۔ صبح کو اٹھے تو انھوں نے دیکھا کہ ان کے کمپارٹمنٹ میں چند برٹش آرمی کے افسر بھی تھے۔ ان میں شب خوابی کے لباس میں ایک گستاخ خدوخال کا شخص تھا۔ یہ جلیانوالہ کا قصاب جنرل ڈائر تھا جو اونچے جارحانہ انداز میں اپنے ساتھیوں کے سامنے اپنی کارکردگی کی شیخی بگھار رہا تھا اور ہنٹر کمیٹی کو، جسے انکوائری کے لیے اس کی حکومت نے مقرر کیا تھا، تلخ الفاظ میں کوس رہا تھا۔ میں نے اس ایپی سوڈ کو بعینہٖ انھیں الفاظ میں کئی سال پہلے جواہر لال کی آپ بیتی میں پڑھا ہے۔ یہ حیرت ناک حسنِ اتفاق ہے کہ نہیں؟ مگر 'ہوریشو! آسمان اور زمین کے درمیان ایسی حیرت ناک باتیں ہوتی ہیں کہ آدمی کا تخیل ان کو سوچ ہی نہیں سکتا'۔ ایسا لگتا ہے کہ نہرو بھی اس صبح اسی کمپارٹمنٹ میں سفر کر رہا تھا جس میں نعیم اور عذرا اور جنرل ڈائر سوار تھے۔

جیسا کہ میں نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے، ناول بحیثیت ناول دہشت پسندوں کے ابواب کے بعد تحلیل ہونا شروع ہوتا ہے اور اس کے تار و پود اُدھڑنے اور بکھرنے لگتے ہیں۔ بعد میں کوئی اصل تسلسل نہیں رہتا اور نہ ہی مختلف حصوں میں کوئی، جچا تلا توازن۔ تخلیق کی آتشیں حدت جو پہلے حصے کو ایک طرح کی گتھی ہوئی شکل دیتی ہے، بے لطف تحقیق اور فنِ بافت سازی میں تبدیل ہو جاتی ہے اور وہ سب کردار — نیاز بیگ، مہندر سنگھ اور شیلا — جن میں کسی قدر زندگی کی غیر یقینی لو ہے، ہمیشہ کے لیے غائب ہو جاتے ہیں۔ ناول سے زیادہ یہ ایک تاریخ بن جاتا ہے اور نعیم آزادی کی جنگ کا انتھک سپاہی۔ وہ دونوں کلکتہ پرنس آف ویلز کے ہندوستانی دورے کو دیکھنے کے لیے گئے اور ۱۹۲۲ء میں نعیم نے جاٹ نگر کے کسانوں کے سامنے ایک تقریر کی اور گرفتار ہو کر لکھنؤ جیل میں رکھا گیا۔ جب سائمن کمیشن کی لکھنؤ میں آمد تھی تو عذرا وہاں دو دن پہلے پہنچی — ایک تو نعیم سے ملنے کے لیے، دوسرے کمیشن کے استقبال کی خاطر۔ مصنف نے اس مظاہرے کو بڑی تفصیل سے رپورٹ کیا ہے اور آدمی کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ یہ

Scanned with CamScanner

سب کچھ بہت پہلے سن اور پڑھ چکا ہے —— جواہر لال کی آپ بیتی میں۔ میں نے ناول میں آپ بیتی کے چند ایک فقرے بھی پہچانے جو ایک عجیب طور سے میرے دماغ میں اٹک گئے ہیں کیونکہ یہ آپ بیتی انگریزی ادب میں انمٹ چیزوں میں سے ہے۔ نعیم رہا ہو کر آیا اور وہ اور عذرا روشن پور کے گاؤں، حویلی میں جا کر رہنے لگے۔ اتنی کڑی قید کاٹنے کے بعد اسے اپنی چکنے شاندار بدن والی، بھرے نم ہونٹ والی، خواہشات سے سلگتی ہوئی عورت سے مل کر قوی انسانی رشتوں کا احساس ہوا جن سے وہ اتنے سال ناآشنا رہا تھا۔ انھوں نے رات کو میاں بیوی کی محبت کی مگر وہ ایک دبی دہشت کے اثر سے اپنی حیاتی خوشبودار عورت کے جسم کو اپنے وجود میں مدغم نہ کر سکا۔ جیل کی پرصعوبت زندگی اور مضر خوراک نے اس سے قوتِ مردانگی چھین لی تھی۔ گاؤں کی تندرست زندگی، کھلی ہوا اور شکار کیے ہوئے گوشت کی خوراک نے جلد ہی اسے توانا بنا دیا اور وہ اپنی بیوی کے ساتھ جسمانی اور ذہنی سکون کی زندگی بسر کرنے لگا۔ انھوں نے دلّی میں آکر آل انڈیا مسلم لیگ کے ایک بڑے اجلاس میں شرکت کی جس کی آغا خان نے صدارت کی۔ پھر مہاتما گاندھی کی سول نافرمانی کی تحریک شروع ہوئی اور روشن پور کے دہقانوں نے نعیم کی نگرانی میں نمک تیار کیا۔ نعیم پھر گرفتار ہوا اور رہائی کے بعد اپنے گاؤں میں لوٹا۔ یہاں اس پر فالج کا حملہ ہوا اور عذرا دہلی سے اس کے پاس روشن پور میں آئی۔ وہ اسے علاج کے لیے دہلی لے آئے۔ ڈاکٹر انصاری اسے روز دیکھنے کے لیے آتے اور ان کے علاج سے وہ صحت یاب ہونے لگا۔ وہ ایک معذور بوڑھا آدمی تھا، انتہائی بے بس۔ اب وہ اور عذرا ذہنی طور پر ایک دوسرے سے کوسوں دور ہو جاتے ہیں...

پ: یہ میں نہیں سمجھ سکا، اتنی شدید چاہت کے بعد اتنی اجنبیت!

د: یہ معما ہی رہتا ہے۔ شاید اس میں نفسیاتی پیچ ہے —— ان دونوں کی جذباتی اور روحانی اور ذہنی ناموافقت۔ اس میں انسانی جذبوں کے کونوں کھدروں پر روشنی ڈالنے اور ڈرامائی لمحے پیدا کرنے کے لیے ایک ناولسٹ کے لیے کتنی سنہری مواقع تھے۔ آدمی طالسطائی کی کہانیاں "ایوان ایلیچ کی زندگی اور موت" اور "فیملی ہیپی نس" یاد کرتا ہے۔ عبداللہ حسین میں ایک جھنجھلا دینے والی عادت ہے۔ وہ کہنے والی باتوں کو اَن کہا چھوڑ دیتے ہیں، وران باتوں کو جو فن کار کو اَن کہی رہنے دینی چاہییں ایک متین تفصیل اور طوالت سے کہتے ہیں۔ یہ حقیقتاً قوتِ تخلیق کی خشکی ہے، ورنہ انھیں اپنے صفحات کو غیر ضروری واقعات اور مس حیدر کے سے کرداروں سے بوجھل بنانے کی ضرورت نہ تھی۔ ان کے کردار اکثر اوپری، پرتصنع

Scanned with CamScanner

گفتگو کرتے ہیں اور حقیقتاً ان کے درمیان کوئی ایسا جذباتی تصادم نہیں ہو پاتا جو یکلخت چیزوں کو منور کر دے اور قاری کی نبض کی حرکت کو تیز کر دے۔ کردار ایک دروازے سے آتے ہیں اور دوسرے دروازے سے چلے جاتے ہیں۔ وہ کافی باتیں کرتے ہیں لیکن تمھیں ان کی باتیں یاد نہیں رہتیں اور نہ ہی ان سے کسی قسم کی رفاقت اور دل بستگی محسوس ہو پاتی ہے۔

پ: عذرا حقیقی طور پر نعیم سے محبت کرتی ہے، کیا وہ کیرکٹر کی عورت نہیں؟

د: اس گہری ہوتی ہوئی اجنبیت بلکہ نفرت کی میری اپنی explanation ہے، اور دس بھی ہو سکتی ہیں۔ مرد اور عورت دونوں کی ذہنی دنیائیں ازل سے جداگانہ رہی ہیں، اور جو کچھ ہوتا ہے اس میں نہ نعیم کا قصور ہے نہ ہی عذرا کا۔ یہ ذہنی مطابقت کی باتیں سب فضول اور لایعنی ہیں۔ عورت اور مرد سخت لوہے کے، نہ مڑنے والے دو ٹکڑے ہیں اور صرف محبت اور تپتی ہوئی خواہش کی آگ میں ہی باہم جڑتے ہیں۔ جوانی میں وہ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں اور نعیم جسمانی اور ذہنی آسودگی سے کاہل اور موٹا اور مطمئن ہو جاتا ہے۔ پھر ادھیڑ عمر اور بڑھاپے کی ناگزیر senility میں، جب خون پتلا اور سرد ہو جاتا اور جنسی غدودوں کی کارکردگی دھیمی ہونے لگتی ہے، اسے اپنی بیوی کے چمکیلے جوان جسم سے نفرت ہو جاتی ہے، اور بدقسمتی سے ان کے بچے بھی نہیں ہوتے جو ڈھلتے ہوئے برسوں میں انھیں متحد کر سکتے۔ یہ سچ ہے کہ ان کے مزاجوں اور نظریات میں زمین آسمان کا فرق ہے، مگر دو مخلص، سلجھے ہوئے، معاف کر دینے والے انسانوں کے تعلقات میں اس اختلاف سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ رشتوں کے ٹوٹنے میں ہم عذرا کو بھی قصوروار نہیں ٹھہرا سکتے۔

پ: کیا ناول یہاں ختم ہو جاتا ہے؟

د: بٹوارے میں نعیم وزارت تعلیم میں انڈر پارلیمنٹری سیکرٹری تھا۔ ہم کو اچانک اس کا علم ہوتا ہے اور میں اب بھی نہیں سمجھ سکتا کہ وہ اس عہدے پر کیسے تعینات ہوا — شاید کانگریس پارٹی میں اپنی خدمات کی بدولت۔ اس کا چہرہ سادہ لوح دیہاتیوں کی طرح بے تاثر اور صحت مند تھا۔ آنکھوں سے حماقت اور بے کسی کے سوا کچھ ظاہر نہ ہوتا تھا۔ ان سرکاری اہلکاروں میں وہ خود کو فٹ نہ کر سکا اور اپنے گاؤں اور زمین کی طرف لوٹ جانے کی خواہش اس کے لیے مستقل خلش بن گئی۔ سارا دن وہ مطالعے میں غرق رہتا اور صبح اس کی بیوی اس کا بازو تھامے اسے سیر پر لے جاتی۔ دفتر میں اس کا صرف ایک

Scanned with CamScanner

دوست بنا، پارلیمنٹری سیکرٹری انیس الرحمٰن ــــ گٹھیلا، تنومند، بال ماتھے سے نیچے آئے ہوئے اور ایک انسانی ڈائنمو۔ انیس الرحمٰن نے اسے بتایا کہ صحیح قدم اور صحیح عمل ہی میں نجات ہے۔ میرا خیال ہے کہ مصنف انیس الرحمٰن کی زبان سے اپنے فلسفیانہ خیالات کا اظہار کرتا ہے ــــ ایک وجودی، دہریت کا فلسفہ۔ انیس الرحمٰن کی باتوں میں نعیم کو صحیح سکون نہیں ملتا اور نہ ہی اپنے دکھوں کا حل، اور بعض وقت وہ اس لمبی فلسفیانہ گفتگو سے بور ہو جاتا ہے۔ تم اسے الزام نہیں دے سکتے؛ پڑھنے والا خود اُکتا جاتا ہے۔ انیس الرحمٰن تین چار ابواب پر مکمل طور پر حاوی ہونے کے باوجود قاری کے ذہن میں حقیقت کا روپ نہیں دھارتا۔ دوسرے کئی کرداروں کی طرح وہ مصنف کے مختلف خیالات کو ہوا دینے کا میگا فون ہے۔ ایک رات نعیم نے اپنے ساتھ لگی ہوئی عورت، اپنی برسوں کی بیاہی بیوی سے شدید بیزاری اور لاتعلقی محسوس کی اور کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ چاند اوپر آ گیا تھا اور رات میں جان پڑ گئی تھی۔ اس کی بیوی اُٹھی اور سہم کر اس نے شہر میں فساد ہونے کا خدشہ ظاہر کیا۔ نعیم نے یکساں سپاٹ آواز میں کہا، ''نکل جاؤ یہاں سے۔'' وہ سنسان چاند سے سفید رات میں نکل گیا اور اپنے دوست انیس الرحمٰن کی کوٹھی پر پہنچا۔ اس عقلی ڈائنمو کے سامنے وہ اُن دکھوں کا اقرار کرتا ہے جنھوں نے سالوں سے اس کی روح کو بیمار کر رکھا ہے ــــ حوالدار ٹھاکر داس جسے اس نے مارا کیونکہ وہ اتنا مطمئن تھا؛ وہ لڑکی شیلا جسے وہ چھوڑ کر چلا آیا؛ وہ اس کی بیاہی عورت جس سے وہ محبت نہیں کر سکا۔ انیس الرحمٰن کوئی رومن کیتھولک راہب نہیں جو دوسروں کے گناہوں کے اقرار نامے سنے اور انھیں ان کے بوجھ سے ہلکا کر کے پاک بنا دے۔ انیس الرحمٰن اس کے خوفوں پر ہنسا، پھر اس کے ایسی اوٹ پٹانگ باتیں سوچنے پر خفا ہوا۔ اپنے رستے ہوئے روحانی زخموں کو لیے نعیم فساد زدہ شہر میں سے گھر واپس آیا اور دوسرے روز عذرا کے ہمراہ دوسرے مکان میں منتقل ہو گیا۔ (قاری کو اس کے عذرا کو ساتھ لے کر دوسرے مکان میں منتقل ہونے کی وجہ نظر نہیں آتی۔ پہلا مکان، روشن آغا کا محل، اتنا بُرا تو نہ تھا۔) پارلیمنٹ ہاؤس میں ہندوستان کی مکمل آزادی کی بات چیت ہوئی اور نعیم نے ماؤنٹ بیٹن اور نہرو اور محمد علی جناح اور دوسرے لیڈروں کو کانفرنس روم میں جاتے دیکھا۔ پارلیمنٹ ہاؤس کے باہر بڑا ہجوم تھا ــــ نعرے لگاتا، اُمڈتا ہوا ہجوم۔ کھڑکی کے سامنے کھڑے ہوئے اس نے محسوس کیا کہ وہ ان سب سے الگ تھلگ اور تنہا کھڑا ہے۔ اس شور مچاتے ہوئے ہجوم اور مشین کی طرح کام کرتے ہوئے اہلکاروں سے اوپر، اس تنہا مقام پر جہاں وہ کھڑا ہے، فضا

خاموش اور خوبصورت ہے، روشنی سارے میں پھیلی ہوئی اور زندگی صاف نیلے آسمان کی طرح پُر امن اور وسیع ہے۔ اس نے ہجوم میں علی کے چہرے کو دیکھا۔ انیس الرحمٰن کو خدا حافظ کہہ کر پارلیمنٹ ہاؤس سے نکل کر ہجوم میں مدغم ہو گیا۔ سیاہ، غلیظ بدنوں کے ہجوم میں یہاں اس نے اپنی ٹوپی اتاری، اسے چھڑی کی نوک پر چڑھایا اور پوری شدت سے چیخا، ''آزادی زندہ باد!'' وہ آپ ہی مسکراتا ہوا چلنے لگا۔

پ: اس کا کیا مطلب ہے؟

ر: اس کا مطلب ہے کہ اسے آزادی مل گئی تھی — عقل کی دنیا سے آزادی۔ تم اسے نروان کہہ سکتے ہو، یا دیوانگی۔ جب فسادات نے زور پکڑا تو لوگوں نے دلی کو خالی کرنا شروع کیا۔ ایک قافلے میں نعیم بھی دلی سے چلا۔ قافلے کے احوال کو مصنف نے بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے، مگر یہ بے کیف، اکتا دینے والی رپورتاژ ہے اور تخلیق کہیں بھی اس میں جان نہیں ڈالتی۔ ایک اسٹیشن پر اس کا سوتیلا بھائی علی اُسے پالیتا ہے، اور وہ اور ایک پروفیسر، دیوانے نعیم کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ (ویسے پروفیسر بھی اپنی اوپری عجیب گفتگو سے زیادہ ہوش مند معلوم نہیں ہوتے۔) ایک صبح بلوائیوں نے قافلے پر حملہ کیا۔ علی اور پروفیسر تو گاڑی کی اوٹ کے پیچھے ہو بیٹھے اور نعیم — خوش بختی سے عقل اور سلامتی کی حدود سے دور — گیدڑوں اور سنبل کی گھاسوں کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ یہاں تک کہ اسے بلوائیوں نے گھیر لیا اور بندوقوں کے دستوں سے ٹھونک ٹھونک کر اسے آگے لگا لیا۔ انھوں نے اسے کیمپ سے باہر لے جا کر مار دیا۔

پ: یہ خاتمہ ہے؟

ر: تقریباً۔ تم جانتے ہو نعیم ہی ایک کردار نہیں، بہت سے دوسرے کردار بھی ہیں جن کا میں نے ذکر نہیں کیا۔ علی اور عائشہ اور بانو اور عذرا کا بھائی پرویز، نجمی، اور خالد عمران اور فے۔ علی کی اپنی کہانی ہے۔ اختتامیہ دراصل اختتامیہ نہیں، یہ علی اور نجمی اور مسعود کی نئی زندگی کا آغاز ہے۔ غالباً ہمیں اور تین برسوں میں اس مصنف کا ایک sequal ملے گا۔

پ: تم سیکوئل کا انتظار کرو گے؟

ر: نہیں، میں سیکوئلز کے حق میں نہیں اور مصنف کو سیکوئل لکھنے کا کبھی مشورہ نہیں دوں گا۔ یہ ایک غلطی ہوگی۔ ایک پینورامک ناول کافی ہے۔ ناولائی ہوئی تاریخیں تب ہی دلچسپ ہوتی ہیں جب ان

Scanned with CamScanner

کے کردار زندہ ہوں اور ہمیں ان میں دلچسپی ہو۔ اختتامیہ کے بچے کھچے کردار زیادہ زندہ ہونے کا وعدہ نہیں دیتے اور ہم حقیقتاً یہ نہیں جاننا چاہتے کہ آگے وہ کیا کرتے ہیں اور ان کے ساتھ کیا بیتے گی۔

پ: اُبلتا ہوا کینہ... ایہہ؟

د: بالکل نہیں۔ سب جانتے ہیں ''علی پور کے ایلی'' کے ساتھ کیا گزری۔ یہ ناول ـــ ایک اور بلاک بسٹر ساگا جو ''اداس نسلیں'' سے بھی زیادہ طویل ہے ـــ اونچے درجے کی قابلیت کا ایمان دارانہ مانومنٹ (monument)۔ مصنف نے غلطی یہ کی کہ اس نے کچھ بھی اَن کہا نہیں چھوڑا۔ اس نے سب کچھ بیچ میں ٹھونسنے کی کوشش کی، پوری تفصیل سے، پوری وسعت سے۔ اس چیز نے ناول کو دفن کردیا۔ چند ہی دھن کے پکے اسے پڑھ سکتے ہیں۔ یہ ناول دفن ہی نہیں ہوا بلکہ خود بھی ایک مقبرہ ہے، الالیوم کا داستانی مقبرہ۔ اب ''اداس نسلیں'' ممتاز مفتی کے ناول سے کئی ایک لحاظ سے کہیں زیادہ بہتر ناول ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ عبداللہ حسین نئے انداز میں کچھ نئی چیز دینے کے بجائے اسے ایک طرح دوبارہ لکھیں۔

پ: ایک بات اور ـــ زندگی اور مذہب کے متعلق مصنف کے نظریات کیا ہیں؟

د: میرا خیال ہے عبداللہ حسین ایک agnostic ہیں، دہریے نہیں۔ لامذہب مناسب لفظ ہوگا۔ نہرو کی طرح، رسل کی طرح اور دوسرے بہت سوں کی طرح، وہ موروثی منظم مذہب میں عقیدہ نہیں رکھتے۔ اس کے یہ معنی بھی نہیں کہ ان میں مذہبیت نہیں۔

پ: تم بھی غالباً اگناسٹک ہو۔ ہاہاہا!

یہ ہے ''اداس نسلیں'' ـــ ایک وھیل جیسی بڑی کتاب، اور اپنے بعض حصوں میں زندہ اور جیتی جاگتی، ایک ایسے شخص کی لکھی ہوئی جس کی ذہانت اور فطانت میں کلام نہیں اور جس نے زندگی کے بارے میں گہرا سوچا ہے۔ اس میں انسانی فطرت کے تاریک گوشوں کی حیرتناک revelations ہیں، کئی دانش مندانہ اور چونکانے والے تبصرے۔ یہ ناول اپنی فنی سالمیت برقرار نہیں رکھ سکا۔ اس میں کہانی کہنے کے فن اور کردار نگاری کی glaring ناقابل معافی خامیاں ہیں۔ مگر یہ حیران کن اچھی چیزوں سے بھی بھرا ہوا ہے۔ عبداللہ حسین نے اردو ادب میں ایک ایسی چیز سرانجام دینے کی کوشش کی

Scanned with CamScanner

ہے جس کی پہلے کسی نے کوشش نہیں کی۔ یہ ایک عظیم ناول ہرگز نہیں، مگر ایک عظمت کی پرچھائیں اس پر ہے اور ایک بڑے عیوب کے ساتھ بڑا ناول ہے۔ اگر چہ عبداللہ حسین اسے تصنیف کرنے پر مجسمے کے اہل نہیں ہیں، پھر بھی وہ اس کے اہل ہیں کہ ہم ان کو کندھوں پر اُٹھا کر ''ہرے ہرے'' کہتے ہوئے مال روڈ پر سے گزریں۔ یہ یقیناً ایک پُر وقار منظر نہیں ہوگا، لیکن اردو ادب کے پرستاروں کو کچھ تو کرنا چاہیے۔ تم ایک وھیل جیسی بڑی کتاب لکھتے ہو، اتنی قابلیت اور اتنی سیانی چیزوں اور اتنے حزن واندوہ سے پُر، اور کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ ایک پہلوان دوسرے پہلوان کو دنگل میں پچھاڑتا ہے اور دوسری صبح یہ event پہلوانوں کی تصویروں اور داؤ پیچ کے رموز کی تفصیلات کے ساتھ سب اخباروں میں جلی سرخی سے نشر ہوتا ہے۔ جیتنے والے پہلوان کے شاگرد اور مداح اسے ہار پہناتے ہیں اور کندھوں پر بٹھا کر اپنے پھیپھڑوں کی پوری قوت سے مسرت کا اظہار کرتے ہیں۔ جب ایک مصنف ایک منفرد فنی achievement کرتا ہے تو کوئی کسمساتا تک نہیں۔ بعض کونوں سے اِکا دُکا تالیاں پیٹنے یا تضحیک کی میاؤں میاؤں کی آوازیں آتی ہیں اور اگر وہ خوش قسمت ہے تو اسے آدم جی پرائز بھی مل جاتا ہے۔ بہت تھوڑے لوگ کتاب کو پڑھتے ہیں۔ وہ پائپ کے تمباکو یا مشکوک اثر کی ملٹی وٹامن گولیوں کی بوتل پر دس پندرہ روپے بڑی خوشی سے صرف کرتے ہیں، مگر ایک اچھی کتاب کے لیے یہ رقم بہت زیادہ لگتی ہے۔

کیا یہ سوچنے کی بات نہیں؟*

(فنون، لاہور، اکتوبر نومبر ۱۹۶۴ء)

چلے دن بہار کے

سیّد قاسم محمود

''چلے دن بہار کے'' قاسم محمود کا غالباً دوسرا ناول ہے (پہلا ہم نے نہیں پڑھا)۔ گرد پوش پیدی صبح کے

---

* ''اداس نسلیں کے تبصرے پر تبصرہ'' (از فہمیدہ ریاض) ضمیمے میں صفحہ ۵۳۶ پر ملاحظہ کیجیے۔

رنگ کا، بیچوں بیچ دو یونانی نیلمی ستون اور نکو نے پتے جھڑتے ہوے۔ ہمیں فوراً پتا چلتا ہے کہ بہار کے دن بیت رہے ہیں، بلکہ بیت چکے ہیں۔ ناول ''اپنی رضیہ'' کے نام معنون ہے، اور گرد پوش کے پہلے فلیپ پر ہیروئن میمونہ کی، اپنے دل میں کہی ہوئی باتوں کا یہ نمونہ ہے:

''کتنا اچھا ہو، اگر وہ اس وقت میرے پاس چلا آئے۔ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے، جھکے، چومے اور کہے، ''آئی لو یو''۔ پھر وہ شرمائے، اپنی آنکھیں جھکا لے، مسکرائے اور میں اسے اپنا سب کچھ بتا دوں۔ پھر وہ میرا چہرہ اوپر اٹھائے۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اور چپکے سے اپنے ہونٹ میرے ہونٹوں پر رکھ دے اور گائے، ''آئی لو یو، آئی لو یو۔''

لیکن نہیں، وہ ایسا نہیں کر سکے گا۔ وہ تو کچھ اپنی ہی زبان میں کہے گا۔ میرے بالوں کو ریشمی کہے گا، آنکھوں کو بادام کہے گا۔ بھنوؤں کو تلوار، رخساروں کو سیب، دانتوں کو یاقوت، ہونٹوں کو پھول کہے گا۔ مگر یہ نہیں، کبھی نہیں، کبھی نہیں کہے گا: ''مجھے تم سے محبت ہے۔'' وہ کہے گا، ''تم میری زندگی ہو، میں تم پر اپنی جان قربان کر سکتا ہوں۔'' مگر یہ ہرگز نہیں کہے گا: ''مجھے تم سے محبت ہے۔''

دوسرے فلیپ پر قاسم محمود کے افسانوں کے دوسرے مجموعے ''قاسم کی مہندی'' (کہانیوں کی ایک کتاب کے لیے عجیب نام!) کا تعارف نامہ ہے۔

آپ کیا امید کرتے ہیں؟ ایک رومانی نیم پختہ ناول؟ اس قسم کا ناول جس میں حسن و عشق مچلتے ہیں اور جن کی بھرمار کے بوجھ تلے اردو ادب کراہ رہا ہے؟ پڑھنے والے کی توقعات جھٹلائی تو نہیں جاتیں کیونکہ اس میں اوپر دیے ہوے نمونے کے طرز پر کئی ارغوانی ٹکڑے ہیں۔ جنسی حقیقت نگاری کے متعدد روح پرور ٹچز (touches) جو بہت سوں کے دل کی دھڑکن تیز کرنے کے لیے کافی ہیں، جا بجا بکھرے پڑے ہیں۔ ان کے لیے ہم مصنف کو معاف کر سکتے ہیں کیونکہ یہ ''لیڈی چیٹر لیز لور''، ''لولیتا'' اور آئن فلیمنگ کا زمانہ ہے اور ہم بستر پر عملی عشق کی مشقوں سے اپنی آنکھیں میچ نہیں سکتے۔ پھر ایسی 'فحش نویسی' میں حرج ہی کیا ہے! آئن فلیمنگ کے جاسوسی ناولوں کی بے انتہا مقبولیت سے ظاہر ہے کہ لاکھوں لوگوں کو ان افکار سے معصومانہ بے ضرر لذت اور خوشی حاصل ہوتی ہے۔ 'ذوقِ سلیم' اب اولڈ فیشنڈ لوگوں کے پاس رہ گیا ہے۔ حال ہی میں مجھے اے حمید کا نیا ناول پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ غالباً اس کا نام ''پیپل والی گلی'' تھا۔ کہانی تو مجھے تھوڑی بہت ہی یاد ہے، مگر جیسی کچھ بھی وہ تھی، مصنف کا جنسی شعور ہر تیسرے چوتھے صفحے

Scanned with CamScanner

پر تابانی سے بیدار ہوتا تھا اور مناسب موقعوں پر جنسی قلابازیوں کے پُرتفصیل احوال تھے۔ جزئیات نگاری کا کیسا کمال! بے چارے منٹو پر اس سے بہت کم کہہ دینے پر یار لوگوں نے مقدمے دائر کر دیے تھے۔

اس سب کچھ کے باوجود قاسم محمود کا یہ چھوٹا سا ناول حیران کن حد تک اچھا ہے۔ کردار حقیقی اور قابل یقین ہیں۔ اُن کی الجھنیں اور وسوسے اس سماجی اور معاشی ماحول میں جانے پہچانے ہیں، اور آدمی محسوس کرتا ہے کہ اگر مصنف رومان نگاری کے اثرات سے اس درجہ مرعوب نہ ہوتا تو ''چلے دن بہار کے'' ایک اچھا ناول ہو سکتا تھا۔ مگر وہ اس ڈھلی ڈھلائی مسلمہ روایت سے جسے 'مصورِ قدرت' اور 'نباضِ فطرت' ناول نویسوں کی ایک پوری کھیپ کی کھیپ نے جنم دیا ہے، کیسے بغاوت کر سکتا تھا؟

تاہم یہ ایک اچھا حقیقی ناول ہے اور اس میں ٹیلنٹ کی جھلکیاں ہیں۔

'ختم شد' دو سو چوبیسویں صفحے پر آخر میں ہے اور اختتام ایک اچھے مختصر افسانے کے انجام کی طرح apt اور اثر کرنے والا ہے۔ مجھے ''چلے دن بہار کے'' پڑھ کر مایوسی نہیں ہوئی۔

(فنون، لاہور، مئی جون ۱۹۶۵ء)

کہتے ہیں جس کو عشق

نجمہ انوار الحق

یہ کتاب کہانیوں کا مجموعہ ہے — ہلکی پھلکی، معمولی اور اپنے دل بہلاوے کے لیے لکھی ہوئی، جن میں نومشق ادیبہ کی ناپختگی تازگی بخش ہے، سیون اپ کی طرح یا 'جن اور لائم' کی طرح! یہ کہانیاں ہیں بھی اسی طبقے کے بارے میں جو جن اور لائم پیتا ہے اور جن کی دنیا مخلوط پارٹیوں، جم خانہ اور کاروں کے گرد گھومتی ہے۔ جارج آرویل کے الفاظ میں ''سب انسان برابر ہیں لیکن بعض انسان دوسرے انسانوں سے زیادہ برابر ہیں۔'' ان کہانیوں کے کردار ''زیادہ برابر'' انسانوں میں سے ہیں۔ اور چونکہ نجمہ انوار الحق بھی قدرت کے اس چنے ہوئے قبیلے میں سے ہیں، اس لیے وہ ان کی الجھنوں، جھنجھٹوں اور کارگزاریوں کے بارے میں ایک واقف کار کے انداز میں لکھتی ہیں — ہمدردی سے، دلچسپی سے، اور کبھی کبھی تیز مشاہدے سے۔ یہی کیا کم غنیمت ہے کہ وہ لکھتی ہیں۔ اس کتاب میں بہترین چیز (اور اس

سے ان کی صلاحیتوں کی تنقیص مقصود نہیں) ایم آر کیانی مرحوم کا دیباچہ یا ''فورورڈ'' ہے جو اس نادرِ روٹی اور brilliant شخص کی ہر ایک تحریر کی طرح دمکتا ہوا اور چلبلاتا ہوا ہے، ہزار شوخیوں سے بھرپور۔ کیا ہی آدمی تھا کیانی مرحوم! کتنا دلیر، شوخ اور Mephistophelean ایریل (Arial) کی طرح! آدمی تعجب کرتا ہے کہ کیسے ایسا فرد حکومت میں چیف جسٹس ہو گیا، کیونکہ وہ ایسا انسان ہرگز نہ تھا جو قانون جیسی خشک اور بے روح چیز کو سنجیدگی سے لے سکتا۔ یہ ''فورورڈ'' کہنے کو تو دیباچہ ہے لیکن اس میں ایک شگفتہ، چلبلے انداز میں مصنفہ کی اچھی خاصی خبر لی گئی ہے۔ انگریزی میں اسے chaffing کہتے ہیں۔ ایک دیباچہ اسی طرح کا ہونا چاہیے، اگرچہ ہم سب کیانی مرحوم کی مانندِ روٹی، سلجھے ہوئے اور قدرتی طور پر شوخ نہیں بن سکتے۔ (پیشہ ور دیباچہ نگار سبق حاصل کریں!) میں یہ دیباچہ سارے کا سارا نقل کرنا چاہتا ہوں، مگر کیا کروں، ایک تو یہ پریکٹس نہیں، دوسرے مجھے ڈر ہے کہ دیباچہ پڑھ لینے کے بعد کوئی نجمہ صاحبہ کی کتاب کو نہیں خریدے گا — اور یہ کئی ایک لحاظ سے اچھی کتاب ہے اور پڑھنے کے لائق۔ اس کتاب کی نو کہانیوں میں سے مجھے ''لیڈر'' کافی پسند آئی۔ یہ لیڈر قبیل کے لوگوں کا بڑا اچھا مطالعہ ہے، کافی قریب اور شگفتہ طرز سے لکھا ہوا۔ اس لیڈر کے دو چہرے ہیں، ایک پبلک چہرہ اور دوسرا اصلی چہرہ۔ وہ صبح جلسے میں کھدر پوش بن کر تلاوتِ قرآن مجید پر جھومتا ہے اور رات کو یہی دیندار شخص کلب میں وہسکی کے خم لنڈھاتا ہے اور حسین عورتوں کو بغل میں لے کر ناچتا ہے۔ اس کردار میں ایک جانے پہچانے لیڈر کا عکس ہے جو کبھی جمہوری قدروں کا ستارہ تھا اور جواب ہم میں نہیں ہے۔ ''دس سال بعد'' بھی اچھی کہانی ہے اور 'عشق دائم، عشق قائم' میں رہنے والوں کے لیے لمحۂ فکر یہ مہیا کرتی ہے۔ مسعود دس سال کے بعد ولایت سے آتا ہے، اپنی پتلی کمر اور صراحی دار گردن والی محبوبہ شاہدہ کو دیکھنے کی تڑپ لیے ہوئے۔ وہ شادی شدہ شاہدہ سے اس کے خاوند کی کوٹھی پر ملتا ہے، مگر کتنا بڑا دھکا اسے پہنچتا ہے! نازک اندام، نوخیز لڑکی کی بجائے ایک موٹی بھدی سی فیل اندام عورت جس کی دو نمایاں ٹھوڑیاں ہیں، اُسے ملتی ہے۔ مسعود کا سہانا خواب چکنا چور ہو جاتا ہے۔ دس سال انسانی زندگی میں کتنی تبدیلی لے آتے ہیں! نجمہ ایک سادہ، رواں اسلوب میں اپنی بات کہتی ہیں اور یہ سب کہانیاں دلچسپ ضرور ہیں۔ فن پیدا کرنے کا نہ انھیں دعویٰ ہے اور نہ ہی یہ چھوٹی کہانیاں فن پارے ہیں۔ ہر کہانی ایک خاص اہتمام سے آغاز ہوتی ہے۔ ایک صفحے پر کہانی کا عنوان، ورق الٹنے پر ایک حسبِ حال شعر اور پانچویں صفحے سے اصل کہانی کی

Scanned with CamScanner

حقیقتاً ہنسنے کی بات نہیں۔ وہ اچھی طرح سمجھتا تھا (اور ہمیشہ دعوت دینے والوں کو جتا دیتا تھا) کہ اسے ان قومی اور سماجی تقریبوں میں صدارت کے لیے اس لیے مدعو کیا جاتا ہے کہ وہ چیف جسٹس ہے، اس لیے نہیں کہ وہ رستم کیانی ہے۔ وہ یہ بڑے شگفتہ اور شرارت بھرے طریقے سے کہتا اور ہر کوئی ہنستا، مگر ان تقریبات کے سیکرٹری ضرور اس کی بات کی حقیقت سے اپنی کرسیوں میں بے آرام ہوتے ہوں گے۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر کیانی چیف جسٹس ایم آر کیانی نہ ہوتا بلکہ محض کوئی رستم کیانی ہوتا تو اس کی ظریفانہ قابلیتوں کے باوجود، تقریبات منعقد کرنے والے اسے بھولے سے بھی یاد نہ کرتے۔ اس ملک میں ایک آدمی کی بڑائی اس کے سرکاری عہدے اور اس کے بینک بیلنس سے تولی جاتی ہے۔ تم میں والٹیر کا wit ہو یا تم جان کیٹس کے سے آسمانی شعر لکھتے ہو، اگر تم حکومت کی کسی بھاری کرسی پر نہیں بیٹھے ہو تو کوئی تمھیں آنکھ اٹھا کر نہ دیکھے گا۔ بہت سے لوگوں کے لیے اقبال اُس دن سے قابلِ اعتنا شاعر بن گیا جب برطانوی حکومت نے اسے نائٹ بنا دیا۔ ہمارے ایک بزرگ اقبال کو ہمیشہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کہا کرتے، ان کی نظروں میں اقبال کو اپنی ڈاکٹری اور 'سری' سے اصل فضیلت ملی تھی۔ کیانی کو ان تقریبات کی صدارت کے معیار کا احساس تھا اور مجھے یقین ہے کہ یہ بات اسے رنج پہنچاتی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اسے رستم کیانی کی حیثیت سے مدعو کیا جائے، اس لیے نہیں کہ وہ چیف جسٹس ایم آر کیانی تھا۔

مگر اس کے چیف جسٹس ہونے کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ وہ ایسی باتیں کہہ سکتا تھا جو دوسرے نہیں کہہ سکتے تھے یا کہتے ہوئے ڈرتے تھے۔ وہ ایک معمولی ضلعے کا وکیل ہوتا تو چند دوست یا محلّے والے اس کے وِٹ، اس کی شوخ باتوں سے محفوظ ہوتے اور بس۔ وہ ہمارے سیٹ اپ میں بذاتِ خود ایک ادارہ نہ بن سکتا، اور نہ ہی غالباً یہ تقریروں کی کتاب چھپ پاتی — اور یہ کتنا بڑا نقصان ہوتا! ان تقریروں نے (جو اخباروں کے ذریعے ایک وسیع حلقے تک پہنچیں، آخر وہ ایک چیف جسٹس کی تقریریں تھیں) بے شمار لوگوں کو ہنسایا اور کیانی غالباً اس ملک کی سب سے محبوب شخصیت بن گیا۔ جب اخبار اس کی موت کی خبر کو سیاہ حاشیوں میں لیے ہوئے چھپے تو ہم سب کو اتنا رنج ہوا جتنا ایک قریبی دوست اور عزیز کی موت کا ہوتا ہے۔ ہم نے محسوس کیا کہ اب ہمیں کوئی بھی اپنے elegent wit سے خوش نہیں کرے گا اور ہم "نائٹین ایٹی فور" دنیا میں اکیلے اور بے یار و مددگار رہ گئے ہیں۔ کون اب اتنے شگفتہ، پُر مذاق سلجھے ہوئے انداز میں سچی بات کہے گا؟

ہی ہماری باچھیں کھلنے لگتی ہیں اور جس کی حرکات اور foibles ایک دائمی مسرت کا موجب ہیں۔ اگر شیطان اردو ادب میں زندہ رہے گا تو کوئی وجہ نہیں کہ عرفی بھی زندہ نہ رہے۔ دونوں کی عادات، خصائل، نفسیات میں بہت کچھ سانجھا ملتا ہے اور وہ فرسٹ کزن معلوم ہوتے ہیں۔ 'میں' بے چارے کا عرفی کے ہاتھوں ناک میں دم ہے جو اپنی چالاکی، عیاری اور باتوں کی وجہ سے اسے ہر بات میں نیچا دکھاتا ہے۔ 'میں' ایک لڑکی سے والہانہ عشق کرتا ہے اور عرفی 'میں' کو عشق میں کامیابی کے گر سکھلانے کا بیڑا اٹھاتا ہے۔ آخر میں لڑکی اُلٹا عرفی پر مٹنے لگتی ہے اور 'میں' صاحب کسی شمار قطار میں نہیں رہتے۔ بزرگوں کی نفسیات کو سمجھنے میں بھی عرفی صاحب بڑے ماہر ہیں اور ان کو باتوں کے طوطا مینا بنا بنا کر ایسا قائل کرتے ہیں کہ وہ (یعنی بزرگ) ان کا ہی کلمہ پڑھتے ہیں۔ 'میں' کو وہ ہر موقعے پر زک پہنچاتے ہیں اور جب کبھی انھیں کھسیانا ہونا پڑتا ہے تو جب بھی فتح ان کی ہوتی ہے۔ آدمی محسوس کرتا ہے کہ ایسے شخص کی اصلاح نہیں ہو سکتی — اور ہونی بھی نہیں چاہیے۔

سب افسانوں میں اونچے قہقہے ہیں، اور ایسی سلجھے ہوئے شگفتہ مزاح کی کتاب کا اس خشک سالی کے دور میں چھپنا باعثِ تعجب ہے۔ اردو ادب اور اردو مزاح کے مستقبل سے اب ہم قطعی ناامید نہیں ہو سکتے۔

(فنون، لاہور، مئی جون ۱۹۶۵ء)

کیانی کے پریشان افکار

آج کل 'عظیم' کا لفظ کثرتِ استعمال سے بہت حقیر ہو کر رہ گیا ہے۔ اس نے اپنے سب معنی کھو دیے ہیں۔ اس بابرکت ملک میں ہم یہ لفظ ہر کہ و مہ کے ساتھ چسپاں کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں — عظیم رہنما، عظیم فنکار، عظیم شاعر، عظیم عالم۔ اگر اس لفظ کے کچھ معنی باقی ہیں تو میرے خیال میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ رستم کیانی مرحوم ایک عظیم انسان تھا۔ اس کی موت نے فی الواقع ہمیں مفلس کر دیا اور ہم اس کا ثانی شاید پھر نہ دیکھیں گے۔ ایک تھوڑی سی مدّت میں اپنی چند چلبلی باتوں سے اس نے ہزاروں کا دل

موہ لیا۔ اس نے ہمیں ایسے وقت ہنسایا جب ہم ہنسنا تقریباً بھول چکے تھے۔ وہ ہمیشہ کڑوی کچی بات برملا کہتا تھا اور ہم آستینوں میں ہنستے ہوئے اسے داد دیتے تھے۔ اس نے ایسی باتیں کہیں جو کوئی اور نہ کہہ سکتا تھا اور اگر کوئی اور وہی باتیں کہتا تو وہ ہمیں شاید بے حد ناگوار گزرتیں اور ہم انھیں نہ سنتے۔ اس کی باتیں نہ صرف یہ کہ ہمیں ہنساتی تھیں بلکہ وہ ہمارے دلوں کو گرماتی بھی تھیں اور جارج آرویل کی اس "نائنٹین ایٹی فور" دنیا میں ہم یہ محسوس کرنے لگتے تھے کہ ہمارا ایک رفیق اور ساتھی ہے۔ انجیل کے الفاظ میں وہ ہمارا خون کا خون اور گوشت کا گوشت ہے اور یہ کہ ہم تاریک راستوں پر اکیلے نہیں۔ اس میں ایک ایریل کی روح تھی۔

اس کی تصویر کو دیکھو — ایک دبلا نحیف آدمی، پچکا ہوا نزار چہرہ، سر پر گھنے بالوں کا گچھا اور بڑے مارکس برادر کی مونچھیں مگر آنکھوں میں کتنی بلا کی تیزی، شوخی اور ذہانت ہے۔ یہ ایک پیدائشی ظریف الطبع شخص کا چہرہ ہے۔ میں نے رستم کیانی کو کبھی اصل زندگی میں نہیں دیکھا (اگرچہ ٹ' اور میں اکثر اس سے ملنے اور اسے ایک پیارے بھائی کی طرح سینے سے لگانے کی منصوبے بناتے رہے) مگر اپنی تصویر میں وہ مجھے کچھ کچھ امریکی مزاح نگار مارک ٹوین کی یاد دلاتا ہے۔ اپنے مزاج کے مزاج و رنگ میں بھی دونوں میں کافی مشابہت پائی جاتی ہے۔ "انوسنٹس ایبراڈ" (Innocents Abroad) والے ٹوین کی ساری شوخی، ظرافت اور معصوم شرارت کیانی کی 'تقریروں' میں موجود ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ بعض لحاظ سے وہ اپنے بے مثل پیشرو سے بہتر تھا۔ مگر ٹوین کی خوش بختی یہ تھی کہ وہ امریکہ میں پیدا ہوا، پیشہ ور مصنف بنا اور اس کی کتابیں لاکھوں کی تعداد میں بکیں۔ بے چارہ رستم کیانی اس ملک میں پیدا ہوا جہاں کتابوں سے کوئی اپنی گزر نہیں کر سکتا۔ آخر میں اسے جج کا چغہ اور بالوں والی ٹوپی پہننی پڑی اور بنچ پر بیٹھنا پڑا۔ لیکن اپنے اونچے منصب کی متانت اور تحمل بھی اس کی ایریل کی سی نہ دبنے والی شوخی کو نہ کچل سکے۔ وہ تقریریں کرتا تھا اور جو کچھ کہنا چاہتا تھا ایک خوبصورت طریقے سے کہہ جاتا تھا۔ اب کیا کسی نے ایک جج کو خود اپنے اوپر ہنستے ہوئے سنا ہے؟ جج متین اور سنجیدہ اور مدبر ہوتے ہیں، اور جب ایک آدمی اس منصب کی خلعت اوڑھ کے بیٹھتا ہے تو اسے ایسا ہونا ہی پڑتا ہے، مگر رستم کیانی ہر حال میں کیانی ہی رہا۔ اس کی فطرت اتنی آزاد اور کھلی تھی کہ وہ اس سانچے میں نہ ڈھلا۔ وہ بحیثیت ایک جج بڑا قابل اور فرض شناس تھا، شاید ان لائق ترین ججوں میں سے ایک جو ہائی کورٹ کے بنچ پر بیٹھے ہیں، مگر اس نے اپنی

Scanned with CamScanner

انسانیت کو کبھی نہ کھویا۔ وہ دوسروں کے foibles پر ہنس سکتا تھا کیونکہ وہ خود اپنے آپ پر ہنستا تھا۔ وہ اپنے دل میں ایک سپنا لیے رہا کہ جج سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ اپنے آبائی مکان میں آرام کرے گا اور گلابوں کو پیوند لگایا کرے گا اور جب کوئی اسے کسی تقریب میں مدعو کرنے آئے گا تو وہ اس کی باتیں سن کر نلکے کے پاس جا کر ایک جیسی فلسفی کی طرح اپنے کان دھوڈالے گا... اگر وہ امریکہ میں پیدا ہوتا تو دوسرا مارک ٹوین ہوتا (امریکہ والوں کو بھی اس وقت دوسرے مارک ٹوین کی ضرورت ہے)۔ وہ بالوں والی ٹوپی اور رنگین فیتوں والا چغہ نہ پہنتا اور تقریریں نہ کرتا، وہ ایک مزاح نگار ہوتا اور بہت سی کتابیں لکھتا۔ رستم کیانی ایک جینئیس تھا۔ مزاح اور طنز میں بجھی ہوئی ایسی تقریریں ایک جینئیس ہی کر سکتا ہے اور اس کا جینئیس (مجھے یقین ہے) مارک ٹوین یا برنارڈ شا کے پائے کا تھا، ایک ہی بھٹی میں تپا ہوا اور جوہر دیا ہوا۔

اس کی تقریروں کو کہیں سے پڑھ لو، وہ ایک بڑا کامیڈین ہے۔ چلبلا، شوخ و شنگ، ظریف۔ ان کو اب چھپی ہوئی صورت میں پڑھتے ہوئے آدمی ان میں تسلسل نہیں پاتا اور وہ ایک میوزک ہال آرٹسٹ کی پر لطف پرفارمنس لگتی ہیں۔ ہم میں سے بعض کو شاید وہ بہکی ہوئی اور بے ربط معلوم ہوں، مگر اس بے ربطی میں بھی ہیملٹ کی دیوانگی کا سا ایک مقصد ہے۔ ہر فقرے میں ایک حرارت ہے اور ہر فقرہ اپنے اندر ایک بھالے کی تیزانی لیے ہوئے ہے۔ اس کی ظرافت ایک وسیع آتش بازی کے تماشے کی طرح ہے — پھلجھڑیوں کے شرارے کبھی ہماری سماجی زندگی کے ایک پہلو پر جھڑتے ہیں اور دوسرے لمحے کسی اور پہلو یا شعبے پر برستے ہیں۔ آٹھ دس فقروں میں بھی وہ ہمیں ننگا کر دیتا ہے اور ہمارے قومی اور سماجی ڈھانچے کے کھوکھلے پن اور ریاکاری کو بے پردہ دکھا دیتا ہے۔ ہم ہنستے ہیں لیکن کچھ احساس جرم اور شرمندگی کے کرب کے ساتھ۔ ہم اپنے دلوں میں جھانکنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ رستم کیانی ایک تباہ کن ظرافت کا مالک کامیڈین ضرور تھا لیکن سب سچے کامیڈینوں کی طرح وہ اپنے دل میں ایک ٹریجیڈین تھا، زندگی کے غم و الم اور اس کے اندوہ سے بے حد آشنا۔ اس کے سب مذاق سلجھے ہوئے درد مند دل سے نکلے ہیں؛ ہر ایک پر گہری فکر کا سایہ ہے، ایک نیزے کے نوکیلے پھل کی سی چبھن۔ میں دوسروں کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا مگر مجھے ان تقریروں کو دوبارہ پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوا ہے کہ اس کے قہقہوں کے پیچھے آنسو رکے ہوئے ہیں اور اس بڑے کامیڈین کا دل رنجیدہ تھا۔ جو کچھ وہ کہتا ہے،

Scanned with CamScanner

ابتدا۔ چھتیس صفحات اس تکلف کی نذر ہوے ہیں، مگر چونکہ مصنفہ غالباً طباعت کے اخراجات پلّے سے نہیں دے رہی تھیں، اس لیے اُن کی بلا سے! پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی اس کتاب کے ناشر ہیں اور ان کے پاس فراواں روپیہ معلوم ہوتا ہے۔ کیا یہ محض حسنِ اتفاق ہے کہ وہ اپنے مصنّفین کا انتخاب ''زیادہ برابر'' انسانوں کے طبقے میں سے کرتے ہیں؟

(فنون، لاہور، مئی جون ۱۹۶۵ء)

سر راہے
مسعود مفتی

''سر راہے'' ایک سی ایس پی افسر کے ہلکے مزاحیہ افسانوں کا مجموعہ ہے اور افسانوں میں ایک وُوڈ ہاؤسین ذائقہ ہے۔ بڑی مدت کے بعد اردو میں ایک ہلکے پھلکے اصلی مزاح کی کتاب آئی ہے، اور ایک سی ایس پی افسر کی تصنیف ہونے کے باوجود پُر لطف اور فرح بخش! یہ نہیں کہ سی ایس پی لکھ نہیں سکتے۔ ان میں سے بعض سرکاری رپورٹوں اور ڈی او میموز کے علاوہ کبھی کبھار کچھ اور بھی لکھ لیتے ہیں۔ قدرت اللہ شہاب کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ یہ سب لوگ زیادہ برابر انسانوں میں سے ہیں اور ہمیں ان کی تحریروں کو کچھ جھجک اور کچھ احترام سے پڑھنا پڑتا ہے۔ اکثر انھیں پڑھ کر یہ تعجب ہوتا ہے کہ ان کی الجھنیں اور ان کے احساسات ہم عام فانی انسانوں سے بہت کچھ ملتے جلتے ہیں۔

مسعود مفتی اپنی مزاح نویسی کی منزل پر عظیم بیگ چغتائی اور رشید احمد صدیقی سے چل کر براستہ شفیق الرحمٰن پہنچے ہیں۔ ان کی کہانیاں شفیق کی 'شیطان' کہانیوں کی یاد دلاتی ہیں، اگرچہ اُن کے انداز میں شفیق کی سی سادگی، شوخی اور پُرکاری نہیں ہے۔ بعض فقرے وہ خوب مسجع، بندھے بندھائے لکھتے ہیں۔ میں مزاح میں اس عبارت آرائی کا قائل نہیں، کیونکہ عبارت کی آراستگی پیراستگی ایک سنجیدہ فعل ہے۔ سنجیدگی کی تھوڑی سی کوشش بھی ہلکے پھلکے مزاح کے لیے سمِ قاتل ہوتی ہے۔ تاہم یہ سب کہانیاں بطور مزاح کے بہت اچھی ہیں۔ مجھے ان میں خوب لطف ملا اور بہت سے دوسرے پڑھنے والوں کو ملے گا۔ شفیق کے 'شیطان' کی طرح مسعود مفتی کا 'عرفی' بھی ایک جیتا جاگتا کردار ہے۔ جس کے سین پر آتے

خواہ ہم مانیں یا نہ مانیں، یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ کیانی ایک چیف جسٹس تھا۔ یہ ہمارے سماجی نظام اور اقدار پر کتنا بڑا طنز ہے۔

ہمارے پیارے رستم کی تقریروں کی یہ کتاب اس کے رخصت ہونے کے تین چار سال بعد چھپی ہے۔ میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ یہ اس سے بہت پہلے کیوں نہ چھپ سکی، پھر بھی ہمیں اس کے ناشرین کا شکرگذار ہونا چاہیے کہ انھوں نے ہمیں یہ بے مثل تقریریں ایک کتابی شکل میں مہیا کردی ہیں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ ایک ایسی کتاب ہے جسے ہر ایک کے پاس ہونا چاہیے اور جسے ہر ایک کو دوبارہ اور سہ بارہ پڑھنا چاہیے۔ یہ ایک حقیقی طور پر بڑے انسان کی کتاب ہے۔ ایک چیز جو مجھے اس کے متعلق اچھی نہیں لگی (چھپائی اور گٹ اپ کے متعلق نہیں جو فرسٹ ریٹ ہیں)، وہ اس کا دیباچہ ہے۔ یہ غالباً عجیب ترین دیباچہ ہے جو کسی کتاب کا ہوسکتا ہے۔ دیباچہ سارے کا سارا آگے آنے والی تقریروں کے مختلف ٹکڑوں پر مشتمل ہے — مصنف کے تعارف یا کتاب کی خوبیوں کے بارے میں ایک لفظ کے بغیر۔ اگر دیباچہ یہی کچھ ہونا تھا تو دیباچے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ کتاب دیباچے کے بغیر بھی چھپ سکتی تھی۔

کیانی اپنی تقریروں کی وجہ سے اپنی موت سے چار پانچ سال پہلے ایک پبلک فِگر بنا۔ ہم اس سے پہلے اسے نہیں جانتے تھے، اور ایک معما ہے کہ وہ اتنا عرصہ خاموش کیوں رہا۔ غالباً کسی سیکرٹری نے اسے کسی تقریب کی صدارت کے لیے مدعو نہیں کیا کیونکہ وہ چیف جسٹس نہ تھا۔ پہلی تین تقاریر لاہور اور لائل پور کی بزمِ اقبال میں اس کے صدارتی خطبے ہیں، اور کتنے پُرمسرّت خطبے ہیں۔ یہ تقاریر اقبال کے سوا ہر ایک چیز کے بارے میں ہیں — ایسی بزموں کے بارے میں، انھیں منعقد کرنے والوں کے بارے میں، سیاست اور معاشرے کے بارے میں۔ ایسے خطبے کیانی کو ہماری زندگی کے مختلف پہلوؤں اور شعبوں پر بھرپور وار کرنے کے موقعے بہم پہنچاتے تھے اور وہ اپنے آپ پر اور دوسروں پر کھل کر ہنستا تھا۔ لیوس کیرل کی کہانی ''ایلس ان ونڈرلینڈ'' میں ایک والرس کا گانا ہے اور والرس کی طرح کیانی بھی یہ کہتا ہوا معلوم ہوتا ہے:

وقت آگیا ہے، والرس نے کہا،
بہت سی باتیں کرنے کا...

Scanned with CamScanner

جہازوں، جوتوں اور مُہر لگانے والی موم کے متعلق باتیں
اور گوبھی کے پھولوں اور بادشاہوں کی باتیں
اور چاند کیوں جل رہا ہے
اور آیا سؤر کے پر ہوتے ہیں یا نہیں!

وہ الم غلم بہت سی چیزوں کی باتیں کرتا تھا۔ بزمِ اقبال میں صدارتی خطبہ بظاہر بڑا عالمانہ بصیرت افروز، اور محققانہ ہونا چاہیے جس میں خودی اور نطشے اور طائرِ لاہوتی وغیرہ کا بار بار اعادہ ہو۔ سنجیدگی اور بلاغت و فصاحت کا حامل اس قسم کا خطبہ جس میں مسکرانے کی ذرہ بھر بھی گنجائش نہ ہو اور جسے سن کر لوگ اونگھنے لگیں اور یہ سوچنے لگیں کہ انھوں نے دوپہر کو کیا کھایا تھا۔ اقبال کے گرد ہم نے جو تقدیس کا ہالہ بنایا ہوا ہے اس نے اقبال کو بوڑھا ٹھوس، بڑا خشک موضوع بنا دیا ہے۔ میں اپنی طالب علمی کے زمانے میں اقبال کی پُرشکوہ شاعری کو پڑھنے کا بے حد شائق تھا۔ ''بانگِ درا'' اور ''بالِ جبریل'' اور ''ضربِ کلیم'' کے کئی اشعار مجھے ازبر تھے۔ افسوس کہ اب وہ اقبال، یومِ اقبال اور بزمِ اقبال کے باوجود، غائب ہو گیا ہے۔ اقبالیات پر محققانہ کتابیں لکھنے والوں نے اور دوسری طرف ریڈیو پاکستان نے اسے مکمل طور پر غائب کر دیا ہے۔ اقبال ایک بڑا اچھا اور قابلِ قدر شاعر ہے لیکن صبح، دوپہر اور شام ریڈیو پاکستان سے اس کی نظموں کی قوالیاں سن سن کر ہمارے کان پک چکے ہیں۔ یومِ اقبال اب منائے جاتے ہیں۔ حکیم الامت کو خراج پیش کیے جاتے ہیں۔ اس کے چند اشعار اب بھی مناسب موقعوں پر دُہرائے جاتے ہیں لیکن کوئی اس کی شاعری کو نہیں پڑھتا۔ یہ افسوس کی بات ہے کیونکہ یہ بہت خوبصورت شاعری ہے۔ ہمارے ملک میں فن یا ادب و شعر کی کوئی حقیقی قدر نہیں۔ یہاں ہر چیز، خواہ وہ مقتدر اشخاص ہوں یا ادارے، اکسپلائٹ کی جاتی ہے۔ لوگ ان کے وسیلے سے اپنا اُلو سیدھا کرتے ہیں اور ان کے سب آنسو مگر مچھ کے آنسو ہوتے ہیں۔ پاکستان بننے کے بعد جتنا بے چارے اقبال کو اکسپلائٹ کیا گیا غالباً کسی کو بھی نہیں کیا گیا۔ اور وہ لوگ جو اٹھتے بیٹھتے ہمیشہ اس کی گردان کرتے تھے، بیشتر اس کی شاعری سے بیگانہ اور بے پروا ہوتے تھے۔ اسی لیے کیانی جب یومِ اقبال میں اپنا خطبہ پڑھتا تو وہ اقبال کی خودی کا فلسفہ بیان کرنے کی بجائے اپنے سننے والوں سے کڑوی کچی باتیں کرتا تھا۔ والرس کی طرح، جہازوں اور جوتوں اور مہر لگانے والی موم کی باتیں۔

کیانی کے یوم اقبال کے خطبے کے کچھ اقتباسات سنیے:

میں سوچ رہا تھا کہ یہ تقریر کیسے شروع کروں سوائے اس کے کہ سب تعریف اللہ کے لیے ہے اور کئی صدیاں چھوڑ کر اقبال اور قائداعظم پر نگاہ پڑتی ہے... دنیا کی سیاست پر اس وقت بھینسا حاوی ہے... اگر میں فارسی یا اردو ادب کا پروفیسر ہوتا تو آپ توقع رکھ سکتے تھے کہ اقبال کے متعلق کوئی ایسی بات کروں گا جو طالب علموں کی بھی سمجھ میں نہ آسکے مگر یہ صاحبان جو مجھے یہاں لائے ہیں، خود جانتے ہیں کہ میرا سرمایۂ ادب کس قدر محدود ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ فارسی جاننے کے سبب اگر میں دو چار شعر فارسی کے پڑھ دوں تو بھی اس موقعے کے لیے کافی ہوگا۔ حضرات، اس لیے میں اپنا تعارف خود کرانا مناسب سمجھتا ہوں۔ میں اس دنیا میں نووارد ہوں۔ صرف پچاس ساٹھ برس ہوئے کہ یہاں آیا ہوں (اگر آپ نے برنارڈ شا کا کھیل **Back to Methuselah** پڑھا ہوگا تو آپ میرے نووارد ہونے پر متعجب نہیں ہوں گے) اور اس عرصے میں اقبال کے تین شعر بھی میں نے یاد کر لیے ہیں۔ اگر یاد رہا تو آپ کو سنا دوں گا۔ اس وقت تو مجھے ایک سردار صاحب کے تین راگ یاد آرہے ہیں۔ سردار صاحب کے دوستوں میں علم موسیقی سے ان کی واقفیت کا بہت چرچا تھا۔ ایک دوست نے پوچھا کہ سردار جی پکے راگ کتنے ہیں۔ سردار جی نے جواب دیا ایک تو مالکونس ہے، دوسرا کوئی اور ہے اور تیسرے کا نام میں بھول گیا ہوں۔ کتنے اچھے لوگ تھے! خود چلے گئے اور قصے چھوڑ گئے، بلکہ کچھ قصے پٹھانوں کے سپرد کر گئے۔ مگر اس ڈر سے کہ کہیں سردار جی کے تین راگوں کا قصہ یہاں نہ دہرایا جائے، میں نے تینوں شعر نئے سرے سے یاد کر لیے ہیں۔ سناؤں گا بعد میں، اگر یاد رہا، اور وہ شعر بھی یاد رہے۔ مگر یہ یاد رہے کہ میں اقبال جرم کر رہا ہوں اور یہ جرم اقبال کی شاعری کے متعلق ہو تو بڑا جرم ہے... حسن طلب کے لیے شعر ضروری نہیں۔ مجھے سوال کا یہ طریقہ پسند ہے کہ مطلب بھی حاصل ہو جائے اور خودی بھی ہاتھ سے نہ جانے پائے، وہ خودی جس کے بارے میں کسی نے کہا ہے: خودی جو خود کی مونث ہے، گھر میں رہتی ہے۔ اور شاید اسی لیے اس پردہ نشین کی حفاظت ضروری ہے۔ القصہ نمائش میں کتابوں کو دیکھتے ہوئے جس کتاب پر نظر پڑی اس کا نام تھا ”ترجمانِ اسرار“ اور جو اسرارِ خودی کا منظوم ترجمہ ہے اور جس کے مترجم ہیں ڈاکٹر جسٹس شیخ عبدالرحمٰن جنھوں نے رحمٰن کا بندہ بننے سے پہلے یہ تین ہفت خواں سر

کیے ہیں۔ وہ ہزار ہا سال سے میرے دوست ہیں مگر ان سے مجھے ہمیشہ یہ شکایت رہی ہے کہ چوری سے کام کرتے ہیں۔ انھوں نے کبھی اشارتاً بھی نہیں بتایا کہ اتنا بڑا کام کر رہے ہیں... ورنہ میں خود ان کے پاس جاتا اور ان تین اشعار میں سے جو میں نے یاد کیے ہیں ایک آدھ مصرع پڑھ کر ان کی علمیت میں اضافہ کرتا اور ان کو موقع دیتا کہ میرے متعلق بھی کچھ لکھیں۔ مگر ان صاحبان کو سوائے نطشے اور برگساں کے کچھ نظر نہیں آتا، زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ سپریم کورٹ میں جا کر لارڈ مینکی نظر آنے لگتا ہے... میری کمزوری یہ ہے کہ اگر کتاب میں کچھ پڑھ لیتا ہوں تو اسے سچے مسلمان کی طرح صحیح مان لیتا ہوں۔ میں نے اقبال کی ایک نظم ''کرم کتابی'' پڑھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے کتابیں پڑھنا ہی چھوڑ دیں۔ کرمِ کتابی اس کیڑے کو کہتے ہیں جو کتابوں میں پیدا ہوتا ہے اور ان کے اوراق کو چاٹ جاتا ہے۔ استعارے میں اس پڑھنے والے کو بھی کہتے ہیں جو کتابیں ہی پڑھتا رہے اور زندگی کی حرارت سے اور دنیا کے سوز و ساز سے ناآشنا رہے۔ پانچ شعر کی نظم آپ بھی سن لیجیے... زندگی جس چیز سے زندہ رہتی ہے وہ تپش ہے، گرمی ہے، محبت ہے، حس ہے، زندگی کی مشکلوں سے لڑنا ہے، اور یہ باتیں کتابوں کے پڑھنے سے نہیں آتیں۔ سرِ آغاز میں جسٹس رحمٰن نے جس خواب سے آغاز کیا ہے اس نے تو مجھے بے خود کر دیا۔ خواب یہ تھا کہ علامہ اقبال اپنے بے تکلفانہ انداز سے محفل جمائے بیٹھے ہیں، احباب جمع ہیں کہ اتنے میں جسٹس شیخ عبدالرحمٰن پہنچ جاتے ہیں۔ ایسی جگہوں میں پہنچنے سے وہ نہیں چوکتے اور نشست بھی اچھی حاصل کر لیتے ہیں۔ یہاں تو اقبال نے خود ان کو اپنے پاس بٹھالیا۔ خواب کے بعد خیال کی باری تھی، وہ حمید نظامی کو آیا۔ انھوں نے کچھ دن بعد جسٹس رحمٰن کو خط لکھا جس میں ''اسرارِ خودی'' کے منظوم ترجمے کی ضرورت پر اصرار تھا۔ حمید نظامی کی اس خدمت کا بھی اعتراف کرنا چاہیے کہ وہ خواب کی تعبیر بنے ورنہ جسٹس رحمٰن اب تک خواب ہی دیکھا کرتے۔ میں نے سوچا شاید میں بھی کوئی خواب دیکھوں مگر نہیں دیکھا۔ میں خواب دیکھتا ہوں تو اور چیزوں کے۔ بہت سال ہوئے جب ہندوستان میں جنگِ آزادی جاری تھی تو کسی نے تقریر کرتے ہوئے کہا میں نے خواب دیکھا ہے کہ آزادی آ رہی ہے گھوڑے پر سوار۔ یاد نہیں کہ اس نے گھوڑا کہا تھا یا بھیڑیا۔ بعد میں بھیڑیے بھی کافی آئے۔

اسی طرح اس کی ان شگفتہ، بظاہر بے ربط والرس والی باتوں میں اینٹوں کے روڑے دائیں اور بائیں اور

ہر طرف گرتے ہیں اور جن کو وہ لگتے ہیں اس وِٹ کی لطافت اور elegance کے سامنے اپنے زخم سہلانا بھول جاتے ہیں؛ وہ اسے معاف کر دیتے ہیں کیونکہ کیانی سب سے زیادہ خود اپنے حال پر ہنستا ہے۔ اس تقریر میں — اس کی ہر تقریر کی طرح — قومی زندگی کے کئی گوشے اپنی ساری بدنمائی میں منور ہو جاتے ہیں اور اقرار کرنا پڑتا ہے کہ وہ غالباً سب سے سلجھا ہوا اور ہوش مند سوشل نقاد تھا جو اس ملک نے پیدا کیا ہے۔ اسی تقریر میں آگے چل کر اس بزم کے کارپردازوں کی جس لطیف اور خوبصورت انداز سے خبر لی گئی ہے، ہمیں مسرت سے بھر دیتا ہے، بے چارے کارپردازان!

اب سوال یہ ہے کہ جب میں نے نہ خواب دیکھا، نہ خلعت کا اعزاز پایا تو پھر کس حیثیت سے اس پلیٹ فارم پر کھڑا ہوں۔ نہیں حضرات، یہ مجھے پسند نہیں کہ آپ کسی کو محض اس کے عہدے کے لحاظ سے یہاں کھڑا کریں۔ یہ ہم دونوں کی خودی کے منافی ہے۔ آپ اس چیز کی قدر کریں جو کسی کو یہاں خطاب کرنے کا اہل بناتی ہے۔ ایک رسالے کے مدیر نے ایک بار مجھ سے ملاقات کی خواہش کی۔ اس نے لکھا کہ وہ مختلف مسائل کے متعلق میرے خیالات معلوم کر کے اپنے رسالے میں شائع کرنا چاہتا ہے۔ میں نے اُسے لکھا کہ تھوڑے عرصے تک میں اپنی میعادِ ملازمت ختم کر کے اپنے گھر چلا جاؤں گا، گاؤں میں ایک چھوٹے سے باغ میں بیٹھ کر گلابوں میں پیوند لگایا کروں گا۔ اگر اس وقت بھی مدیر صاحب مجھے اس قابل سمجھیں کہ دنیا کے اہم مسائل کے متعلق میری رائے پوچھیں تو مجھے لطف آئے گا۔ اس وقت تو میری رائے سرکاری ہوگی۔ مدیر صاحب نے پھر نہیں پوچھا، اور نہ پھر گاؤں میں پوچھیں گے۔ مگر میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا عہدے کے اعزاز کے بغیر کوئی انسان زندہ نہیں رہتا؟

واقعی نہیں، مسٹر جسٹس کیانی! اس ملک میں عہدے کے اعزاز کے بغیر کوئی انسان زندہ نہیں رہتا۔ مانا کہ تم اپنی ظرافت اور خوش بیانی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے، لیکن اگر تم چیف جسٹس نہ ہوتے تو کسی کو تمھیں اس جلسے سے خطاب کرنے کے لیے دعوت کا خیال بھی نہ آتا۔

اسی تقریر میں آگے چل کر یہ ٹکڑا:

صاحبان! میں پھر بے ربطی کا شکار ہو رہا ہوں۔ میں آپ سے کہہ رہا تھا کہ میں نے ''پیامِ مشرق'' پڑھی ہے، مگر اس کتاب کو مونث باندھنا دل نے گوارا نہ کیا کیونکہ پیام نہایت مردانہ ہے۔ (اس

بات پر کہیں خواتین مجھ سے بدظن نہ ہو جائیں۔) حقیقت یہ ہے کہ تذکیر و تانیث کے جھگڑے میں اکثر مبتلا رہتا ہوں۔ کتابوں کی نمائش میں، جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں، ایک اردو ڈکشنری نظر سے گزری۔ میں نے کھول کر دیکھی تو پی ڈبلیو ڈی کا لفظ سامنے آیا۔ آپ یہ تو جانتے ہی ہوں گے کہ پی ڈبلیو ڈی سے مراد ہے پبلک ورکس ڈپارٹمنٹ یعنی تعمیر و تخریب کاری کا محکمہ۔ بریکٹوں میں لکھا تھا ''مونث''، یعنی پی ڈبلیو ڈی کا لفظ مونث کے صیغے میں استعمال ہوتا ہے۔ میں نے کہا چلو خیر ہوئی کہ یہ محکمہ ابھی مونث ہے۔ اگر مذکر ہوتا تو یہ لوگ نہ جانے کیا کر گزرتے... ہاں تو ذکر تھا ''پیامِ مشرق'' کا...

اور یہ تقریر جو ایک شگفتہ تباہ کن، دردمندانہ معاشرتی طنز ہے، اس طرح ختم ہوتی ہے:

مگر سچ پوچھیے تو فتنے کا باعث گندم کا دانہ ہے اور ہم اب بھی گندم کو نہیں چھوڑتے بلکہ اس فکر میں لگے ہیں کہ کس طرح کسی کھاد کے استعمال سے اس کی پیداوار بڑھائیں۔ البتہ بنگال والے تو اس دن سے ایسے ڈرے ہیں کہ اگر قحط سالی بھی ہو تو چاول ہی مانگتے ہیں اور سنا ہے کہ بعض اوقات تو وہ موت کو گندم پر ترجیح دیتے ہیں۔ میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ جو اختلاف مغربی اور مشرقی پاکستان میں ہے وہ دراصل زبان کا نہیں چاول کا ہے اور چاول بہشت میں نہیں ملتے۔ مگر اب تو یہ چاولوں کا جھگڑا ہے نہ زبان کا اختلاف، نہ اس بات کا کہ کراچی مرکز کے نیچے ہو یا مرکز کے اوپر، نہ اس بات کا کہ ایک یونٹ اچھا ہے یا چار۔ آپ لڑتے بھی ہیں تو کن باتوں پر مگر اب تو:

اقبال تیرے عشق نے سب بل دیے نکال

صرف کیانی ہی اس فضا اور اس ماحول میں ایسی باتیں اس سلیقے سے کہہ جاتا تھا جو کسی اور کو کہنے کی جرأت نہ ہوتی۔ اس لیے نہیں کہ وہ چیف جسٹس تھا بلکہ اس لیے کہ وہ ہر ایک کو ہنسا دیتا تھا۔ وہ ایک جسٹر (jester) تھا اور جسٹر کو مضحکہ اڑانے کا پورا لائسنس ہوتا ہے۔ اس لیے اس کے وہ دوست بھی جنھیں اس کی باتوں سے صدمہ پہنچتا تھا، اسے معاف کر دیتے تھے۔ ایسے آدمی کے خلاف کوئی کیا کر سکتا ہے؟ ہماری سول سروس، انتظامیہ اور حکومت میں بعض دفعہ ایک قدرتی حادثے سے ایسے سلجھے ہوئے تربیت یافتہ اور آزادہ رو انسان گھس آتے ہیں جنھیں بظاہر وہاں نہیں ہونا چاہیے۔ جس سرکاری عہدے پر وہ تعینات ہوتے ہیں اسے ان کے وہاں ہونے سے زینت ملتی ہے، اس عہدے میں امتیاز کی شان پیدا

ہو جاتی ہے، لیکن آدمی محسوس کرتا ہے کہ ان کی فکروں اور کارکردگیوں کا میدان زیادہ وسیع ہونا چاہیے تھا۔ ایک طریقے سے سوچیں تو ان کی زندگیاں ضائع ہو جاتی ہیں۔ ایسا ہی ایک شخص پطرس تھا — بڑی ظرافت، کشش اور صلاحیت کا مالک۔ وہ ریڈیو میں گیا اور پھر اقوام متحدہ میں، لیکن یہ ادب و فن کی دنیا کے لیے کتنا بڑا نقصان تھا۔ ایسا ہی شخص رستم کیانی تھا جس کے انتظامیہ اور جج پر جانے سے شاید ادب کا ایک بڑا مزاح نگار اور سوشل نقاد کھو یا گیا۔ ایسا ہی شخص غالباً ذلفی بھٹو ہے جو کہنے کو ہمارا فارن منسٹر ہے مگر ہم سب کو ہمارے بھائی سے زیادہ پیارا ہے۔

اس کتاب میں تیرہ تقریریں ہیں۔ تین یومِ اقبال کے خطبے ہیں (اگر مزاح، غیر سنجیدگی اور شوخی کے ان گلدستوں کو خطبے کہا جا سکتا ہے تو)، باقی ادبی اور سماجی اکادمیوں، بزموں، انجمنوں میں کی ہوئی تقریریں ہیں۔ ایک خطبۂ الوداعیہ ہے جو کیانی نے چیف جسٹس کے عہدے سے سبکدوشی پر شہریوں کی دی ہوئی دعوت میں دیا۔ بعض تقریریں دوسری تقریروں سے زیادہ اچھی ہیں لیکن ناقابلِ تقلید، اچھوتی، طنز و ظرافت کی چاشنی ہر جگہ وہی ہے۔ یہ خطبے یا تقریریں وہ سب کچھ ہیں جو ایسے خطبوں اور تقریروں کو نہ ہونا چاہیے۔ لوگ انھیں کیانی سے اس کے جسٹر کے لائسنس کی وجہ سے سن لیتے تھے، کسی اور سے نہ سنتے۔ ان میں دیوانگی کا ایک عنصر ہے جو سب اچھے مزاح کی جان ہوتا ہے۔ ان میں کوئی فصیحانہ بلیغانہ platitudes نہیں، کوئی نصیحت آموز، حیرت انگیز واقعات نہیں۔ لمبے چوڑے مروجہ علمیت کا سکہ بٹھانے والے ٹکڑوں سے وہ بالکل عاری ہیں۔ ان میں ظرافت اور شرارت اور بے ساختگی ہے اور وہ والرس کی باتوں کی طرح جہازوں، جوتوں اور مہر لگانے والی موم کے بارے میں ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ اپنی بے ربطی کے باوجود وہ ایسے موقعوں پر مستند جستہ جستہ تقریروں سے کہیں بڑھ کر اپنے نشانے پر پہنچتی ہیں۔ جہاں کہیں بھی وہ جاتا ہے لوگوں سے وہ باتیں کرتا ہے جو اُن سے کرنی چاہییں، خواہ بڑی تلخ اور کڑوی باتیں ہی کیوں نہ ہوں۔ رستم کیانی ایک بے حد غیر رواجی آدمی تھا اور یہ تقریریں حد درجہ غیر رواجی ہیں۔ ان کی قدر و قیمت کافی وقت تک چمکتے ہوئے سوشل تنقید کے مضامین کی حیثیت سے قائم رہے گی۔ پچھلے اٹھارہ برس میں غالباً ہزاروں خطبوں میں سے یہی خطبے ہیں جو زندہ رہیں گے اور جو ادب کے اتنے نزدیک ہیں۔

اس کی مقبولیت کا راز کیا تھا؟ بلاشبہ ہم ایک اچھے humourist اور جسٹر کو پسند کرتے ہیں اور اس

کی باتوں سے محظوظ ہوتے ہیں مگر اس کی مقبولیت صرف اس کی صفت کی وجہ سے ہی نہ تھی۔ اپنی ساری قومی خودفریبی، بے حسی، قول وفعل میں تضاد اور smugness کے باوجود (جس کے ہمارے خطبے پوری طرح غماز ہیں) ہم پھر بھی کبھی کبھی چاہتے ہیں کہ کوئی سچ بات کہے۔ کیانی سچ بات کہتا تھا اور اس کے ساتھ ہمیں ہنساتا بھی تھا، اور پھر ہم یہ محسوس کرتے تھے کہ اس کی ہنسی خالی خولی ظالمانہ ٹھٹھے بازی نہیں بلکہ وہ ہمارے لیے اور ہمارے معاشرتی حالات کے لیے درد رکھتا ہے اور اس کا دل الم زدہ ہے کہ چیزیں اس طرح کیوں ہیں اور اس سے بہتر کیوں نہیں ہوسکتیں۔ یہاں ہر ایک چیز، خواہ ادب ہو، خواہ قومی نعرے ہوں، خواہ انجمن سازی ہو، سب نمود ونمائش اور دکھلاوے کی خاطر ہیں اور لوگ وہ باتیں بار بار کرتے جاتے ہیں جو ان کی زبان سے نیچے نہیں اُترتیں۔ اصل مقصد کرسی یا تمغے یا شہرت ورسوخ حاصل کرنے کا ہوتا ہے۔ اسی لیے کوئی چیز اس ملک میں ڈھنگ سے، خوش سلیقگی سے، دیانتداری سے نہیں ہو پاتی، کیونکہ اس چیز کو حقیقت میں کوئی نہیں چاہتا۔ یہی ہمارے ملک میں سب بیماریوں کی جڑ ہے اور اسی لیے ڈائننگ کار کا کھانا باسی ہوتا ہے، ریڈیو کے پروگرام اتنے بے جان اور اکتا دینے والے ہوتے ہیں اور بجلی اور ٹیلی فون کے کنکشن حاصل کرنا ایک تقریباً ناممکن اچیومنٹ ہوتی ہے۔ اسی خلقی مرض کی بدولت ہمارے بعض سرکاری دفاتر تباہ شدہ درگاہوں کا منظر پیش کرتے ہیں جن پر مجاوروں کی فوج کا قبضہ ہو۔

ہم یہ پوچھ سکتے ہیں کہ ان تقریروں کی ادبی حیثیت کیا ہے اور ہم انھیں طنز ومزاح کے ادب میں کس مقام پر رکھ سکتے ہیں؟ میری رائے میں بظاہر پریشاں خیالی اور بے ربطی اور زبان کی خامیوں کے باوجود، یہ تقریریں ادب کے دامن کو چھوتی ہیں اور شاید شگفتہ ترین معاشرتی اور سیاسی طنزوں کی حیثیت سے وہ ہمارے نثری سرمایے میں اپنی مثال آپ ہیں۔ جو کچھ اکبرالہ آبادی نے نظم میں کیا کچھ اسی قسم کی چیز کیانی نے چلبلی نثر میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ دونوں سپر جسٹرز (super jesters) تھے اور دونوں سے متانت کی توقع رکھنا عبث تھا۔ کیانی ان زمانوں کا 'باغی' تھا، اس لیے اس کی ظرافت ہمارے لیے زیادہ قدر وقیمت رکھتی ہے اور ہم اسے بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ میں یہ ماننے کے لیے تیار ہوں کہ اکبر کی ظرافت ابھی تک ڈیٹڈ (dated) نہیں ہوئی اور اس کے بعض شعری تیر اس ماحول میں بھی بھرپور وار کرتے ہیں، پھر بھی صاحب لوگ اب چلے گئے ہیں اور ہمارا معاشرہ نئے افقوں کی طرف دیکھ رہا ہے۔

میں جانتا ہوں مجھے ہائی برو (high brow) کا لقب دیا جائے گا مگر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اردو

Scanned with CamScanner

ادب کا انگریزی یا کسی غیر ملکی زبان کے ادب سے موازنہ کرنا بے معنی سی بات ہے۔ انگریزی میں اعلیٰ طنز و ظرافت کا بے پایاں ذخیرہ ہے۔ وہاں سوئفٹ اور آرویل جیسے اس فن کے پریکٹیشنرز (practitioners) ہیں، سڈنی سمتھ اور ہورلیس والپول جیسے خطوط نویس، آسکر وائلڈ کے جیسے ڈراما نویس۔ ''پنچ'' میگزین کے پچھلے نمبروں میں اصل ظرافت اور مزاح کے بے شمار لطیف ٹکڑے ہیں اور انھیں پڑھتے ہوئے طبیعت کھل اٹھتی ہے۔ تب ہمیں اردو کی مفلسی اور محرومی کا خیال آتا ہے۔ صرف طنز و مزاح ہی میں نہیں بلکہ ادب کی دوسری اصناف (سوانح، تاریخ، سفرنامے) میں بھی ہم، ماسوا چند ایک گنی چنی کتابوں کے، تقریباً تہی دامن ہیں۔ اس قلیل مزاحی متاع میں رستم کی تقریریں منفرد اور اکیلی ہیں۔ ہم اسے آستانِ ادب کے بالانشینوں میں تو جگہ نہیں دے سکتے لیکن جس گوشے میں وہ بیٹھا ہے وہ یقیناً صرف اسی کے لیے مخصوص ہے۔

یہ ایسی شگفتہ تقریریں ہیں کہ میرا دل چاہتا ہے میں ان میں سے کوٹ کرتا چلا جاؤں اور کم از کم میرے لیے ان میں دائمی مسرت ہے، مگر ''فنون'' کے حدود کے خیال سے اس میں سے کوٹ کرنے کی ترغیب کی مزاحمت کروں گا۔ میں نے ایک نمونہ دیا ہے اور اس کتاب کے متامل خریداروں کے لیے یہ کافی ہونا چاہیے، مگر ایک نمونہ میں اور ضرور دوں گا، یہ دکھانے کی خاطر کہ کیسے بڑا جسٹر خود اپنے آپ پر بھی بغیر کسی رحم کے ہنس سکتا ہے۔ اسی سے معلوم ہوتا جاتا ہے کہ یہ آدمی ایک نئے ڈھلے ہوئے سکّے کی طرح اصلی اور کھرا تھا اور اس کی میک اَپ میں بناوٹ میں تصنع یا جھوٹ کا شائبہ نہ تھا۔ ہمارے اس موجودہ سیٹ اَپ میں ایسے آدمی کتنے کمیاب ہیں، آدمی ان سے کبھی کبھار ملتا ہے...اور پھر حیران ہوتا ہے!

لاہور سے آرہا تھا اور یہ اچھا موقع تھا کیونکہ سوائے ڈرائیور کے اور کوئی پریشان خاطری کا باعث نہیں ہوسکتا تھا۔ پھر ڈرائیور نے مجھے پریشان کیا۔ ایک گدھے سے جو اچھا بھلا سڑک کے درمیان جارہا تھا ٹکر لگادی، جیسے پہلے اس کے راستے میں گدھے نہیں آتے تھے۔ ہمارے تجربے میں تو بہت سے گدھے آئے ہیں اور ہر گدھا سڑک کے درمیان چلتا ہے۔ یہ قومی سڑکیں تو آخر گدھوں کے لیے ہی بنی ہیں۔ ڈرائیور میں یہ نئی بات دیکھ کر کہ گدھوں کو برداشت نہیں کرسکتا، میں نے خود موٹر ہاتھ میں لے لی۔ تھوڑی دور گئے تھے کہ ایک اور گدھا جس کی شکل وصورت ہماری ہی طرح کی تھی بالکل سامنے آگیا۔ اس سے موٹر بچانے کی غرض سے میں نے پہیہ زور سے گھمایا تو موٹر

Scanned with CamScanner

شیطان کی طرح چیخی کہ میری تخلیق آگ سے ہوئی ہے اور اس شخص کی مٹی سے، اور ناراض ہو کر احتجاجاً سڑک سے باہر نکل گئی جہاں پی ڈبلیو ڈی کے کارکن مٹی نکال کر چھوٹے چھوٹے گڑھے بنا دیتے ہیں تاکہ اگر کسی کی موٹر سڑک سے باہر نکلے تو اچھی طرح سے گرے۔

پھر بے چاری پی ڈبلیو ڈی! کیانی زندہ رہتا تو کبھی وہ پی ڈبلیو ڈی پر پوری کتاب لکھتا۔ اسے اس محکمے کے خلاف کئی 'ذاتی' رنجشیں تھیں! مگر یہ اقتباس دینے سے میرا کچھ اور مطلب ہے۔ کیانی کیسی معصومیت کیسے بے ساختہ پن سے ہم سب کو گدھے کہہ جاتا ہے اور اپنے آپ کو بھی اس زمرے میں شامل کر لیتا ہے۔ ہم میں سے کتنے ہیں جو اپنے آپ کو گدھے کا بھائی کہہ سکیں اور اس پر خوش ہوں؟ ہمارے دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں میں کتنے ہیں جو گدھے سے اپنی مشابہت (یا اس سے الٹ) کا اس گرم جوشی، اس معصومیت سے اظہار کر سکیں۔ ہم اشرف المخلوقات بننے میں اتنے مصروف اور اینٹھے ہوئے ہیں کہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ہم میں سے بیشتر اپنی فکر و نظر میں محض گدھے ہیں۔ گدھوں میں پھر بھی مزاح کی حِس ہے، ہم میں وہ بھی نہیں۔

اور یہ ایک اور چھوٹا سا ٹکڑا، ملتان اکادمی کے خطبے سے لیا ہوا:

بات یہ ہے کہ میرا اصلی نام جلندھر خان تھا (اور آپ کے فائدے کے لیے یہ بات کہتا ہوں کہ پشاور کے مشہور ڈاکو کا نام ملتان خان تھا)۔ جب پانچ چھ برس کی عمر تھی تو عید کے موقعے پر والد مرحوم نے ہم تینوں بھائیوں کے لیے بوٹ منگوائے، لیکن ہمیں تسمے باندھنے نہیں آتے تھے۔ والدہ نے سفارشاً والد سے کہا کہ بچوں کو تسمے باندھنے سکھائیے۔ انھوں نے مذاق کرتے ہوئے کہا، اگر میں تمھارے لیے دوسری ماں لاؤں تو تم اس کو سلام کرو گے؟ بڑے بھائی نے کہا ہاں، اور والد مرحوم نے اس کے تسمے باندھ دیے۔ میری باری آئی تو میں چپ ہو گیا۔ والد نے پھر سوال کیا۔ میرے بھائی نے کان میں کہا، کہہ دو نا، اس میں کیا ہے۔ تمھارے سلام سے سچ مچ سوتیلی ماں تو نہیں آجائے گی۔ پر میں نے کہا، اگر آ گئی تو؟ تیسری بار جب والد نے سوال کیا تو میں نے کہا، سلام تو نہیں کروں گا... میرے تسمے کھلے ہی رہ گئے اور میں غصے میں باہر نکل آیا اور رونے لگا۔ اس سے زیادہ کیا کر سکتا تھا۔ والد صاحب ان دنوں شاہنامہ پڑھتے تھے، اور ''من و گرز و میدان و افراسیاب'' والا مصرع ان کو پسند تھا۔ میرے نکلنے کے بعد کھلکھلا کر ہنسے اور کہنے لگے، یہ بھی بڑا

رستم بنا پھرتا ہے، اپنے باپ کو دوسری شادی کی اجازت ہی نہیں دیتا۔

اس دن سے جلندھر خان کی بجائے میں رستم خان ہوگیا اور جب ذرا مہذب ہوا تو نام کے ساتھ محمد لگالیا اور خان کاٹ دیا، مگر میرے بوٹوں کے تسمے ابھی تک کھلے ہیں۔

اور ایک معنوی انداز میں واقعی اس کے بوٹوں کے تسمے ہمیشہ کھلے ہی رہے۔ اس وقت بھی جب وہ جسٹس تھا، رستم کیانی ہی رہا، اپنے عہدے کی پوشش اور ساز و سامان کے باوجود۔ کیا آپ کسی اور کی بابت سوچ سکتے ہیں جو یہ اقرار کر سکے کہ اس کا اصلی نام جلندھر خان تھا؟ اپنے آپ پر ہنس سکنے کی اہلیت ایک بڑی کمیاب صفت ہے اور کیانی میں وہ صفت تھی۔ اسی لیے ہم اس سے محبت کرتے ہیں اور اس کے سب دوست اور ساتھی اس سے محبت کرتے تھے۔

ان تقریروں میں کیانی نے اپنے ساتھی اور دوست جسٹس رحمٰن سے کافی نوک جھونک کی ہے۔ اصل میں وہ گہرے دوست تھے اور ایک دوسرے کو سمجھتے تھے۔ جب وہ ولایت میں اکٹھے تھے تو ایک روز رحمٰن صاحب نے کیانی کا مرثیہ لکھا۔ اس مرثیے میں پیار اور کتنا حسن ہے اور ہمارے رستم کی ساری اس وقت کی شخصیت ان بندوں میں ڈھل گئی ہے۔

سوچتا تھا، کدھر گیا رستم — آئی آواز، مر گیا رستم
اک کیانی جہاں میں تھا موجود — ہائے اب وہ بھی ہوگیا مفقود
علم و آداب میں یگانہ تھا — اس کا ہر قول تازیانہ تھا
اس پہ طرّہ کہ فیلسوف بھی تھا — گرچہ تھوڑا سا بے وقوف بھی تھا
حسن کی شمع کا تھا شیدائی — عشق تھا اس کا آرٹ آبائی
ناک بھی اس کی تھی اچنبھا سی — لگ گیا ہاتھ گر تو بہنے لگی
اللہ بخشے اسے، عجیب تھا وہ — رہتا گھر سے مرے قریب تھا وہ
جب بھی یاد اس کی آئے گی — اس کی شوخی مجھے ستائے گی

ریٹائرمنٹ کے بعد رستم کیانی زیادہ دن نہ جیا۔ اس کی اپنے دیہاتی گھر میں گلابوں میں پیوند لگانے کی تمنا دل ہی میں رہی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ ایک عوامی ہیرو تھا۔ اس کی مقبولیت اور شہرت اوج

Scanned with CamScanner

پر تھی اور ہم سب کو توقع تھی کہ اب اپنے عہدے کی ذمے داریوں سے فارغ ہو جانے کے بعد وہ ہماری پبلک اور معاشرتی زندگی میں بڑا اہم کردار ادا کرے گا۔ مگر ''جن سے دیوتے محبت کرتے ہیں وہ جلد مر جاتے ہیں۔'' پندرہ نومبر ۱۹۶۲ء کو چٹا گانگ کے ایک ہسپتال میں شوخ وشنگ رستم ہمیشہ کے لیے چلا گیا اور ہم اپنی تاریک راہوں میں بھٹکنے کے لیے اکیلے رہ گئے۔

کاش وہ ان پُر اضطراب دنوں میں ہمارے درمیان ہوتا — اور وہ کیسی کیسی باتیں کہتا!

(فنون، لاہور، ۱۹۶۵ء)

اردو شاعری کا مزاج

ڈاکٹر وزیر آغا

ڈاکٹر وزیر آغا، آپ کو معلوم ہونا چاہیے، ایک معزز کسان (جنٹلمین فارمر) ہے۔ اس کا ماڈل فارم سرگودھا کے قریب ہے جہاں وہ سٹرس اور ہر قسم کے پودے اگاتا ہے، ایک ایسی انتظامی اہلیت، محبت اور شوق سے جو حیران کن ہے۔ اپنے فارم کی دیکھ بھال کے بعد وہ سرِ شام اپنی موٹر میں سرگودھا لوٹ آتا ہے جہاں اس کا ایک عمدہ گھر ہے۔ وہاں وہ اپنے دار المطالعہ میں بیٹھ کر رات کے بارہ ایک بجے تک لکھتا ہے۔ کیسی آئیڈیل زندگی ہے، جس کے ہم سب خواب دیکھتے ہیں۔

اس نے ہلکے پھلکے چارمنگ ایسے لکھے ہیں — یہ ادب کی ایک ایسی صنف ہے جس سے وہ محبت کرتا ہے۔ اس نے تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں اور وہ شعر بھی کہتا ہے۔ اس کی چھ کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں سے ایک اس کی نظموں کا مجموعہ ''شام اور سائے'' ہے۔ یہ بہت اچھی نظمیں ہیں کیونکہ ایک شخص جو سارا دن فطرت کے ساتھ ہم آہنگی میں گزارتا ہے اور جس کا ذہن سلجھا ہوا اور حساس ہے، بُری نظمیں نہیں لکھ سکتا۔ اس میں ایک تنقیدی اور تحقیقی شعور ہے جسے وسیع مطالعے نے جلا دی ہے۔ اس کی تازہ کتاب ''اردو شاعری کا مزاج'' پانچ چھ سال کی محنت کا حاصل ہے اور یہ ایک انوکھی اور بے حد اور یجنل کتاب ہے۔ آدمی اس تحقیقی کاوش اور لگن سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا جو اس کی تکمیل میں

Scanned with CamScanner

صرف ہوئی ہوگی۔

''اردو شاعری کا مزاج'' میں دیومالا اور اس کی وضاحت اتنی ہی دل آویز اور ساتھ ہی برہم کر دینے والی ہے جتنی رابرٹ گریوز کی کتاب ''سفید دیوی''۔ مگر ڈاکٹر وزیر آغا کی کتاب میں کوئی سفید دیوی نہیں ہے۔ اس کی بجائے قدیم مصر اور آسور کے دیوی دیوتا — آئی سس، تائیفون، اوسیرس، اانانا، بعل — سب موجود ہیں اور سب کا تعلق کسی نہ کسی طرح شاعری سے ہے۔ یہ کتاب اردو شاعری کی ایک داخلی تجزیاتی اناٹومی ہے اور وزیر آغا نے شاعری کی مختلف سطحیں دریافت کرنے میں وہی کام کیا جو سگمنڈ فرائیڈ نے انسانی شعور کے ضمن میں کیا تھا۔ ہم مصنف سے اتفاق کریں یا نہ کریں مگر ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ یہ وضاحتیں بالکل اوریجنل ہیں اور صرف ایک شاعر کا تخیل ہی اتنی گہرائی تک ان اشیا کو دیکھ سکتا ہے جو اندھیرے کے limbo میں تیر رہی تھیں۔ وزیر آغا ایک بہت مشکل اور ٹیکنیکل موضوع کے بارے میں محققانہ مگر سیدھے اور صاف اسلوب میں لکھتا ہے اور پڑھنے والا اس کے مفہوم اور مطالب کو بغیر کسی الجھن یا بوکھلاہٹ کے سمجھتا جاتا ہے۔ ایسے تجزیے عموماً گنجلک اور ابہام کے گورکھ دھندے ہوتے ہیں جن میں عام پڑھنے والا اپنا راستہ کھو دیتا ہے۔ وزیر آغا کی کتاب ایسی نہیں ہے؛ یہ ان سب کے لیے ہے جو اردو شاعری کی مختلف اصناف کی بنیادی حقیقت تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ یہ کتاب محض چند گنے چنے مخصوص اہلِ علم کے لیے نہیں ہے۔

کتاب کا آغاز اس بے کراں بڑھتی ہوئی کائنات کی تصویر کشی سے ہوتا ہے کیونکہ مصنف نے اپنے جائزے کو بھرپور اور سیر حاصل بنانے کے لیے نہ صرف اس سیارے زمین بلکہ کل کائنات کی ابتدا کا حال بتانا لازمی جانا ہے۔ آیا یہ ضروری تھا یا نہیں، میں نہیں جانتا۔ یہ بڑھتی ہوئی کائنات کی تھیوری جس کی رو سے ہر لمحہ نئی دنیائیں اور نئے شمسی نظام خلائی وسعتوں میں پیدا ہو رہے ہیں، برطانوی سائنس دان فریڈ ہائل نے پہلی دفعہ پیش کی۔ یہ تھیوری انقلابی اور چونکا دینے والی ہے اور یقیناً اس کا کوئی سائنٹفک جواز ہوگا۔ فریڈ ہائل یقیناً بے پر کی نہیں اُڑا رہا، اور ہمیں اس تھیوری کے اچھوتے پن کی وجہ سے ہی اسے تسلیم کر لینا چاہیے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے بھی اسے حقیقت مان لیا ہے۔ یہ ایک ایسی تھیوری ہے جو قدرتاً ایک شاعر کے تخیل کو مسخر کر لے گی — ہزاروں لاکھوں افق، اَن گنت دنیائیں، لامحدود خلا۔ کائنات اور وقت کی ابتدا، اس کی بڑھتی ہوئی وسعت کی داستان نے، بقول مصنف، انسانی

Scanned with CamScanner

سوسائٹی میں خود کو دہرایا ہے اور اگر آپ یہ پوری طرح جاننے کے خواہاں ہیں کہ اس سے مصنف کا کیا مدعا ہے تو آپ کو آگے ذرا سوچ سمجھ کر غور و فکر سے پڑھنا ہوگا۔ آگے دیو مالا اور مذہبی کتب کی روشنی میں قدیم سوسائٹی کے انسان کی ذہنی تاریخ ہے۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ میں ان دل آویز تفصیلوں کی دنیا میں مکمل طور پر بوکھلا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ فطرت کی سب چیزیں ایک ازلی اور ابدی دائرے میں مقید ہیں۔ مثلاً آپ چاند کو لیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے الفاظ میں "چاند کی تگ و تاز بھی ایک دائرے کے تابع ہے۔ چاند ہولے ہولے مکمل ہوتا ہے، پھر آہستہ آہستہ گھٹنے لگتا ہے اور ایک رات ایسی بھی آتی ہے کہ اس کا وجود باقی نہیں رہتا۔ اس رات عدم (یا رحمِ مادر) سے دوبارہ چاند جنم لیتا ہے اور پھر اسی دائرے میں سے گزرتا ہے۔" یہ واقعی بڑی cute بات ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے آگے چل کر متھ اور مذہبی علامتوں کی پرکشش دنیاؤں کی سیاحی کی ہے اور میں اس کی وسیع علمیت اور جودتِ طبع کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ کہنے کو تو یہ ایک بڑی پیش پا افتادہ سی چیز ہے، لیکن مجھے یہ کہنا چاہیے کہ مصنف کی بڑی contention یہ ہے کہ سب فنون (رقص، موسیقی، تصویر کشی اور شاعری) کی نمو اس لیے ہوئی کہ دنیا میں عورت تھی۔ یہ بالکل ظاہر ہے۔ اگر عورت نہ ہوتی تو یقیناً انسانی نسل اس کرے پر اس فراوانی سے موجود نہ ہوتی، اور انسان کے بغیر کوئی فنون پیدا نہ ہوتے ــــ نہ ڈاکٹر وزیر آغا اپنی یہ عالمانہ، چونکا دینے والی کتاب لکھتا اور نہ ہی میں اس وقت دیوار کی بریکٹ لائٹ کے نیچے اپنی چھوٹی سی کھانے کی میز پر اس کتاب کے بارے میں یہ سطور قلم بند کر رہا ہوتا۔

میں اس کتاب پر تبصرہ لکھنے کو بڑا پُرکشش محسوس کر رہا ہوں کیونکہ مجھے اس بہانے ماتھالوجی، مذہب، عمرانیات اور نفسیات کی دل آویز دنیاؤں میں سفر کرنا پڑ رہا ہے اور میں بہت کچھ سیکھ رہا ہوں۔ میری آنکھیں ایسے افقوں کی طرف اٹھ رہی ہیں جن کی موجودگی سے وہ ناآشنا تھیں۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ شاعری اور دوسرے فنون کے جنم کے بارے میں میرا اپنا نظریہ سیدھا اور صاف ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے سب سے پہلے مہذب مورث جو غاروں میں رہتے تھے اور پتھر کے اوزاروں سے شکار کرتے تھے، شام کو اپنے الاؤ جلا کر بیٹھتے ہوں گے۔ ہم دوسرے حیوانات کے متعلق کچھ نہیں جانتے مگر میرے خیال میں یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ برسات میں مینڈکوں کا شور بھی ایک مستقل یکساں قبائلی راگ ہے اور بہت سے ہوا کے پرندے بھی ایک ہی قسم کا گانا گاتے ہیں۔ جب مور اپنے سنہرے رنگ رنگیلے پروں

Scanned with CamScanner

کو پھیلا کر جنگل میں اپنی پوری شان سے رقص کرتا ہے تو کیا یہ بھی ایک طرح کی محبت کا گیت نہیں، الفاظ کے بغیر؟ صرف حیوانات ہی نہیں بلکہ سمندر اور آسمان کی ہوائیں اور درخت بھی شاید گاتے ہیں۔ یہ ایک گاتی ہوئی درخشاں کائنات ہے جو خدا نے بنائی ہے۔ سو ہمارے مورث گیت سے ناواقف نہ تھے۔ اور چونکہ کوئی نثر میں نہیں گا سکتا، اس لیے ان کو اپنے گیت سروں اور بحروں میں ڈھالنا پڑے۔ میرے خیال میں اس طرح آدمی شاعری سے روشناس ہوا۔ بے شک ہزاروں سال گزرنے کے بعد ہی اس کے لیے یہ ممکن ہوا کہ وہ شاعری کو لکھے بھی، مگر مجھے یقین ہے کہ ابتدائی انسانوں میں بھی شاعر ہوتے تھے۔ بعد کی تہذیبوں میں قبائلی بھاٹ اور جہاں نورد گویوں نے ثقافتی دنیا میں اپنا مستقل مقام پیدا کر لیا۔ گویے ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے اور لوگوں کو محبت اور جنگ کے گیت سنا کر محظوظ کرتے۔ درباری بھاٹ قبیلے کے سردار کے پاس رہتے اور اس کی بہادری اور جرأت کے قصیدے پڑھتے۔ ان کے شاگرد اور بیٹے پوتے ان نظموں کو پوری طرح یاد کر لیتے اور یہ نظمیں نسلاً بعد نسلٍ سینہ بہ سینہ چلتی رہتیں۔ جب تحریر ایجاد ہوئی تو شاعر نظمیں لکھنے لگے۔ میرے خیال میں ہمیں شاعری کے وجود یا اس کی مختلف سطحوں کو دریافت کرنے کے لیے کائنات کی تخلیق تک جانے کی ضرورت نہیں۔ ان ادوار میں انسان محض روٹی کی خاطر ہی نہیں جیا۔ اس نے اپنی روح کے لیے بھی گہرا سکون تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح مختلف فن وجود میں آئے۔ انسان نے ہمیشہ خوبصورتی کی پرستش کی ہے اور اس کی اس جبلی اور فطری تمنا کو ہمیں ''ثنویت'' اور ''ین اور یانگ'' اور مادری اور پدری نظاموں کے تصادم کی بحثوں میں الجھانے کی ضرورت نہیں۔ کیا اتنا ہی کافی نہیں کہ جب سے انسان کو زبان ملی، اس نے گیت گائے اور شعر کہے؟ میں ایک شخص کو جانتا ہوں، جو میرے ریتیلے دیس کا ایک لمبا چھریرا سا عام دہقانی آدمی ہے، پیشے کے اعتبار سے سنار ہے اور اپنے کانوں میں بالیاں پہنتا ہے اور جس کی دو بیویاں ہیں۔ وہ کبھی اسکول نہیں گیا اور ایک سطر اپنی سرائیکی زبان کی نہیں لکھ سکتا، تاہم یہ عام دیہاتی آدمی رابرٹ برنز کی طرح ایک پیدائشی شاعر ہے۔ اس نے کئی نظمیں بنائی ہیں جو شدتِ احساس کے معاملے میں رابرٹ کی نظموں سے کسی طرح کم نہیں اور جن کی تاثیر روح تک پہنچتی ہے۔ ان میں سے ایک اس قسم کی ہے:

جانی رات رہ پوتے گالیں کریسوں
دلڑیاں دے حال ہک بئے کو ڈیسوں

اس نے اپنی نظمیں نہ لکھی ہیں نہ لکھائی ہیں لیکن اس کے بعض ہمسایوں اور جاننے والوں نے انھیں زبانی یاد کرلیا ہے، ایسے phenomenon کو کیسے سمجھایا جاسکتا ہے؟ مجھے یقین ہے کہ اگر اس دیہاتی رابرٹ برنز کو وزیر آغا کی اس عالمانہ ومحققانہ کتاب کا موضوع ذہن نشیں کرانے کی کوشش کی جائے تو وہ بالکل بوکھلا جائے گا۔ اب بیسویں صدی میں آکر شاعری کو خطرہ لاحق ہوگیا ہے۔ نئے آدمی آگئے ہیں جو ہمیں چاند پر لے جانا چاہتے ہیں، جو برتھ کنٹرول پلز اور contraceptives کی باتیں کرتے ہیں، جو جوہری طاقت سے ہمیں تباہ کرنے کے آرزومند ہیں۔ ان نئے سائنسی مشینی آدمیوں میں شاعری نہیں ہے۔ وہ انسان کی گہری جبلّی اُمنگوں سے بے خبر ہیں، اس لیے اس کے حسن کے احساس کو کچلنا چاہتے ہیں، اور افسوس یہ ہے کہ وہ کامیاب ہوتے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ Doomsday Men اپنی حیرت ناک ایجادوں اور صنعتی ترقیوں سے دنیا کو سب رنگ و بو سے محروم کرنے پر تلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ دنیا کے جدید آقا تیسرے درجے کے دل ودماغ کے لوگ ہیں اور یہ میں جانتا ہوں کہ جس راستے پر وہ ہمیں لے جارہے ہیں وہ سلامتی، اچھائی، سادگی اور خوبصورتی کا راستہ نہیں ہے۔

(پیارے پڑھنے والے! میں ان جملہ ہائے معترضہ کے لیے معذرت خواہ ہوں جن کا ڈاکٹر وزیر آغا کی عمدہ کتاب کی تنقید سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں دراصل ہائیڈ پارک کے اس ''سوپ بکس'' آتشیں مقرر کی طرح ہوں جسے میں نے ایک شام سننے کی مسرت حاصل کی تھی۔ یہ شخص جو اوورکوٹ اور باؤلر ہیٹ میں ایک مسخرا معلوم ہوتا تھا، مجمعے سے مخاطب تھا: ''اب یہ آرتھر موریسن امریکہ کیا کرنے گیا ہے؟ میں تمھیں بتاتا ہوں وہ کیا کرنے گیا ہے۔'' اور اس کے بعد آرتھر موریسن کے موضوع سے ہٹ کر کسی اور سمت چل نکلتا اور ملکہ اور شہزادے اور نرم ہیٹوں والے وائٹ ہال کے گروہوں کے سخت کٹیلے مگر پُرلطف جملوں میں بخیے اُدھیڑنے شروع کردیتا۔ جب کبھی وہ موریسن کے امریکہ جانے کے موضوع سے ہٹ کر اِدھر اُدھر کی ہانکنے لگتا تو مجمعے کے کنارے پر ایک سرخ گل گوتھنے چہرے اور چھوٹی چھوٹی مونچھوں والا شخص اسے ٹوک کر چپکے سے یاد دلا دیتا: ''لیکن آرتھر موریسن امریکہ کیوں گیا ہے؟'')

ڈاکٹر وزیر آغا کی کتاب کی طرف لوٹتے ہوئے (اب میں وعدہ کرتا ہوں کہ اپنے موضوع سے نہیں بھٹکوں گا) میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس کا پہلا حصہ (۱۵۸ صفحات تک) نہ صرف اردو شاعری بلکہ اس برصغیر میں دوسرے فنون کی نمود کا تاریخی وسیاسی پس منظر میں، ایک گہرا اور اوریجنل تجزیہ ہے۔ یہ ہماری

خوش بختی ہے کہ مصنف ایک معصوم عقیدہ پرست نہیں۔ عمرانیات، فلسفہ اور تاریخ کے وسیع مطالعے کے بعد کیسے کوئی مصنف عقیدہ پرست رہ سکتا ہے؟ وہ ایک بیدار عقلیت پرست ہے اور ہر قسم کی متھ کی علامتی معنویت سے پوری طرح آگاہ۔ اس لیے یہ کتاب نہ صرف اردو شاعری کو سائیکوانیلائز (psychoanalyse) کرتی ہے بلکہ انسان کی تہذیبی تاریخ، قدیم متھ اور مذہب کی معنویت اور تمدنوں کے ٹکراؤ سے مختلف خطوں میں فنون کے خاص امتزاج پر بڑے دل آویز عملی ادراک سے روشنی ڈالتی ہے۔ میں کیوں نہ پڑھنے والے کو اس اچھی کتاب کے ایک باب ''ین اور یانگ'' کی ہلکی سی چاشنی چکھاؤں! چینی، میرے خیال میں، دنیا کی سب سے دانشور قوم ہیں۔ ان کے قدیم فلسفے کے مطابق ''ین'' اس کیفیت کا نام ہے جس میں ہر شے جامد و ساکن ہو جاتی ہے اور ''یانگ'' وہ کیفیت ہے جس میں ہر شے بے قرار اور مضطرب ہوتی ہے۔ اس کرے پر حیوانی زندگی کی ابتدا ''ین'' کی فضا سے ہوئی۔ کتابِ مقدس کا پرانا عہد نامہ ہمیں بتاتا ہے، ''آغاز کار میں زمین ویران اور سنسان تھی اور گہراؤ کے اوپر اندھیرا تھا۔'' یہ ''ین'' کا تسلط تھا۔ ''پھر خدا نے کہا کہ روشنی ہو جا اور روشنی ہو گئی اور خدا نے دیکھا کہ روشنی اچھی ہے اور خدا نے روشنی کو تاریکی سے جدا کیا، اور خدا نے روشنی کو تو دن کہا اور تاریکی کو رات۔ اور شام ہوئی اور صبح ہوئی اور پہلا دن ہوا۔ سات دن میں خداوند نے زمین و آسمان کو بنایا۔ اور پھر خداوند نے زمین کی مٹی سے انسان کو بنایا اور اُس کے نتھنوں میں زندگی کا دم پھونکا تو انسان جیتی جان ہوا...'' ہم ان دنوں ڈارون کی ارتقا کی تھیوری میں یقین کرنے لگے ہیں اور ذاتی طور پر مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ میں مچھلیوں اور بندروں کی نسل سے ہوں، مگر پرانے عہد نامے میں دنیا اور انسان کی تخلیق کا یہ بیان کتنا خوبصورت اور پُر تجمل ہے! کائنات اسی طرح ''ین'' کی کیفیت میں رہی۔ ''پھر خداوند نے مشرق کی طرف عدن میں ایک باغ لگایا اور آدم کو اس میں رکھا اور اسے کہا کہ نیک و بد کی پہچان کے درخت کو کبھی نہ کھانا کیونکہ جس روز تو نے کھایا تو تو گیا۔ پھر خداوند نے کہا کہ آدم کا اکیلا رہنا اچھا نہیں۔ اس نے اس آدم کی پسلی سے ایک عورت بنائی اور اسے آدم کے پاس لایا۔ آدم نے کہا، یہ تو میری ہڈیوں میں سے ہڈی ہے اور میرے گوشت میں سے گوشت ہے، اس لیے وہ ناری کہلائے گی کیونکہ وہ نر سے نکالی گئی۔ اس کے واسطے مرد اپنے ماں باپ کو چھوڑے گا اور اپنی بیوی سے ملا رہے گا اور وہ ایک تن ہوں گے۔''

(''لیکن آرتھر موریسن امریکہ کیوں گیا ہے؟'' چھوٹی چھوٹی مونچھوں والا آدمی پوچھتا ہے۔)

''پھر سانپ آیا، وحشی جانوروں میں سب سے چالاک۔ اس نے آدم اور اس کی عورت کو بہکایا اور انھوں نے اس کے بہکانے پر ممنوعہ پھل کھایا۔'' اس دن سے جمود اور سکون کی کیفیت ختم ہوئی اور اضطراب اور بے قراری کی کیفیت پیدا ہوئی۔ اس دن سے آدم کے بیٹے اور بیٹیاں سانپ کے بہکائے بغیر ممنوعہ پھل شوق سے کھاتے چلے آرہے ہیں جس کے نتیجے کے طور پر اب ہم اس کرے پر تین ارب کی تعداد کو چھونے والے ہیں۔ ممنوعہ پھل کی بدولت ہی سب شاعری اور سب فن پیدا ہوئے اور ''یانگ'' کی کیفیت ہم پر طاری ہوئی۔ اسی کی بدولت ہائیڈروجن بم ایجاد ہوا اور اب ہم بیسویں صدی میں مکمل سناٹے، مکمل ''ین'' کی طرف بے بسی سے بڑھے چلے جارہے ہیں، یا دھکیلے جارہے ہیں۔ وزیر آغا ''یانگ'' کے اس آغاز کے حوالے بابل کی دیو مالا میں بھی ڈھونڈتا ہے اور ان کہانیوں کے تخلیقِ حیات کے تصور کو جدید علم الانسان کی تحقیقات کی روشنی میں پرکھتا ہے۔ اس کے نزدیک اس متھ کی علامتی معنویت ہے۔ ''ین'' کا دور، جب آدم باغِ عدن میں ساتھی کے بغیر رہتا تھا اور باغ میں کوئی بہکانے والا سانپ نہ تھا، جنگل کی زندگی کا وہ طویل دور ہے جس میں انسان کو ہر شے بغیر کسی تگ و دو کے حاصل ہوتی تھی۔ اس نے باغِ عدن کا محلِ وقوع بھی متعین کیا ہے — وسطی ایشیا اور تبت کے درمیان کا علاقہ۔ وہ پھر اس کرے پر جغرافیائی تبدیلیوں، انسان کی جنگل اور شکار کی زندگی، پتھر اور دھات کے زمانے میں تہذیب کے ارتقا کے بارے میں ہمیں بتاتا ہے۔ اس کے مطابق پتھر کے زمانے میں انسان کا تخلیقی عمل غاروں کی دیواروں پر جانوروں کی تصویریں بنانا تھا۔ (میری رائے ہے کہ تصویریں بنانے سے پہلے انسان نے بولنا اور گانا سیکھا ہوگا۔) زرعی زمانے میں زرخیزی کے دیوتاؤں، دیویوں اور علامتوں کی پیدائش ہوئی — ان قدیم متھس کی جنھوں نے بعد میں مذاہب کی شکل اختیار کی۔

''ین اور یانگ'' کے باب اور اگلے بابوں کی پوری تفصیلات دینے کی گنجائش نہیں ہے مگر یہ سب پُرکشش ابواب ہیں اور گہرے مطالعے کے لائق۔ ''دو تہذیبوں کی آویزش'' کے باب میں آریاؤں کے پدری نظام کے قدیم دراوڑی نظام سے جسمانی اور تہذیبی تصادم اور اس کے اثرات کا پُرادراک جائزہ ہے۔ مصنف کے مطابق آرین خانہ بدوش تھے، آوارگی اور تحرک کے علم بردار، جن کے بندھن زمین سے کمزور تھے۔ دراوڑی تہذیب ارضی تھی، مصری تہذیب کی طرح، جس میں دیوتاؤں اور دیویوں کی کثرت تھی۔ یونانی دیوی دیوتاؤں کی طرح یہ دراوڑی دیوی دیوتا بھی ان کے ارضی تمدن اور بود و باش کی

Scanned with CamScanner

علامتیں تھے۔ آرین اس ارضی زرخیز تہذیب کے جادو سے مغلوب ہوگئے، گو وہ فطرتاً زمین کے لوازم سے بے نیاز تھے۔ پھر ایک ردّعمل ہوا۔ آریاؤں نے جسم اور خواہش کو اُبھارا اور تیاگ اور عرفان کا جذبہ جواُن کی گھٹی میں تھا پھر عود کر آگیا۔ اس طرح دو تہذیبوں کی آویزش سے دراوڑوں کی ارضیت، جسم کی لذتوں سے گہری وابستگی کا آریاؤں کی عرفانیت پر پرتو پڑا۔ دراوڑی تمدن کی ارضیت میں ایک لطافت اور بلندی داخل ہوئی۔ بقول مصنف، اس آویزش نے ہندوستان کی سنگ تراشی، نقاشی، فنِ تعمیر، مصوری، رقص، موسیقی اور ادب کو ایک نئی نکھری ہوئی کیفیت، توانائی اور رفعت عطا کی۔ وزیر آغا کی کتاب میں آگے ان فنون کی نمود اور ان کے خاص رنگ اُبھرنے پر مفصل باب ہیں۔ میں نے اس باب کو جو آریائی ادب کے متعلق ہے، بڑا دلچسپ پایا۔ ویدوں اور اُپنشدوں کی شاعری کے نمونے جو مصنف نے دیے ہیں، شاعری کی حیثیت سے خوبصورت اور سرشار کن ہیں۔ ان کی امیجری میں ایک 'ارضیت' ہے جو اب ماضی کی چیز بن کر رہ گئی ہے۔ بعد کے سنسکرت کے ایک شاعر کالی داس کے یہ اشعار شکنتلا کے بارے میں پڑھو:

وہ ایک ایسے پھول کی طرح ہے جسے سونگھا نہیں گیا\
ایک ایسی پتی کی مانند ہے جسے ہاتھ نے توڑا ہی نہیں\
وہ ایک موتی ہے جو کسی ہار میں پرویا نہیں گیا\
وہ شہد ہے جسے ابھی کسی نے چکھا ہی نہیں

مصنف نے کالی داس، بھرتری ہری، امارو، میگھ اور امارہ کے چند اقتباس دیے ہیں، اور آدمی حیران ہوتا ہے کہ کتنی اچھی شاعری ان قدیم زمانوں میں لکھی جاتی تھی، خالص ارضی شاعری جس میں زمین اور جسم کی بوباس ہے اور جس کی تشبیہیں اور استعارے اپنی سادگی سے دل کو موہ لیتے ہیں۔ کاش اب بھی ایسی شاعری لکھی جائے۔ ہماری جدید شاعری میں ایسی علامتیں استعمال ہوتی ہیں اور ایسے بوجھل استعارے گھڑے جاتے ہیں کہ آدمی کو اس کے معنی سمجھنے کے لیے باقاعدہ چلّہ کاٹنا پڑتا ہے۔ شاعری انگور کی نشیلی شراب کی طرح ہونی چاہیے جو سر کو چڑھ جائے اور ہمیں زمین کے ازلی حسن سے ہم آہنگ کر دے، جسے اگر ہم چاہیں تو گنگنا اور گا بھی سکیں۔

لیکن میں یہ باتیں کیا جانوں۔ ہمارے جدید شعرا انھیں یقیناً مجھ سے بہتر سمجھتے ہوں گے۔

Scanned with CamScanner

اور یہ بھرتری ہری ہے:

تیرے بال سنورے ہوے

تیری آنکھیں اتنی ترچھی کہ کانوں کی لووں کو چھو رہی ہیں

تیرے منھ میں دودھیا دانت قطاروں میں جڑے ہوے ہیں

تیری چھاتیاں موتیوں کے سندر ہار سے سجی ہوئی

پتلی لڑکی! تیرا اجیلا بدن یوں تو بالکل ساکت ہے

لیکن اس نے میرے ہردے میں ایک طوفانی ہلچل پیدا کر دی ہے

مصنف کے مطابق سنسکرتی شاعری کا یہ تخلیقی ابال آٹھویں صدی میں ختم ہوگیا۔ پھر وشنو بھگتی تحریک شروع ہوئی، بھگوت گیتا اور بھگوت پران سے اس تحریک کو مدد ملی۔ پھر مسلمان ہندوستان میں آئے — جس طرح ہزاروں سال پہلے آریا آئے تھے — اور تمدنوں کی آویزش کا پُرکشش عمل شروع ہوا۔

کتاب کے دوسرے حصے میں اردو شاعری کا گہرا، پرفہم مطالعہ ہے اور صدیوں کے ثقافتی، تہذیبی پس منظر میں اس کی مختلف اصناف کے بنیادی اوصاف کا سائیکو انیلسس۔ یہ باب بڑی محنت اور تحقیق سے لکھے گئے ہیں اور ایک تبصرے میں ان سے انصاف کرنا ممکن نہیں۔ میں نے انھیں پڑھا اور بے حد معلومات افزا پایا، اگرچہ میں اقرار کرتا ہوں کہ بعض دفعہ میں مصنف کی عمرانیاتی اور فلسفیانہ وضاحتوں کی پیچیدگیوں میں اپنا رستہ کھو بیٹھا۔ تقریباً سب پرانے اور نئے شاعر اس حصے میں زیرِ بحث آے ہیں۔ ظاہر ہے کہ شعرا کا مطالعہ وزیر آغا کے نظریۂ فن کے مطابق ہے اس لیے اس حصے سے اختلاف ہوسکتا ہے، مگر مصنف کی نیک نیتی پر کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ (کل مجھے ایک شاعر نے بتایا کہ یہ کتاب کسی کام کی نہیں کیونکہ اُس کا نام تو اس میں کہیں آیا ہی نہیں۔) ڈاکٹر وزیر آغا نے یہ حصہ مکمل فنی ایمان داری سے لکھا ہے اور حتی المقدور سب جانے پہچانے شاعروں کے نام دینے کی کوشش کی ہے مگر ناگزیر طور پر کئی نام رہ گئے ہیں۔ اَن گنت لوگ آج کل شاعری کر رہے ہیں۔ ردیف اور قافیے کی قیود سے آزادی نے بے شمار نوجوانوں کو نظمیں کہنے اور شاعر کہلانے کے سنہری مواقع فراہم کر دیے ہیں۔ پھر یہ تجرباتی دور ہے جس میں ہر کوئی اس میدان میں کھل کھیل سکتا ہے۔ ہمارے ادبی رسالے دوسرے اور تیسرے درجے کی نظموں سے بھرے نظر آتے ہیں۔ اگر تم ان شاعروں کو یہ بتانے کی جرأت کرو کہ جو

Scanned with CamScanner

کچھ انھوں نے لکھا ہے دوسرے درجے کا ہے تو وہ تمھیں کبھی معاف نہیں کریں گے۔ یہ کیسے فیصلہ ہو سکتا ہے کہ ایک نظم اچھی ہے یا بری؟ میرے خیال میں یہ ایسی بات نہیں کہ جس کے لیے کوئی ثالث مقرر کرنا پڑے ــــــ نظم خود بولتی ہے کہ وہ اچھی ہے یا بری۔ اگر اس میں حسن ہے، امیجری کی ارضی سادگی ہے، فارم کی خوبصورتی اور غنائیت ہے تو یہ اچھی نظم ہوگی، خواہ وہ اونٹ کے متعلق کیوں نہ ہو۔ (چیسٹرٹن نے گدھے پر ایک خوب صورت نظم لکھی ہے۔) کسی کے بتائے بغیر ہم جبلی طور پر جان لیتے ہیں کہ جان کیٹس کی ''اوڈ ٹو نائیٹنگل''، اقبال کا ''نیا شوالہ''، فیض کی ''تنہائی''، ندیم کی ''آخری سجدہ'' یا منیر نیازی کی ''سندر بن'' اچھی نظمیں ہیں۔ اسی طرح بُری نظم کی پہچان بھی آسان ہے ــــــ اس کا تصنع، بوجھل پن اور ان گھڑا پن آشکار ہوتا ہے اور خواہ سب سے بڑی بڑی ڈگریوں والے نقاد اس کی خوبیوں کا ڈھنڈورا پیٹیں، وہ عظیم نہیں بن سکتی۔ وہ کسی کے دل میں گھنٹی نہیں بجائے گی اور اگر کوئی اسے پڑھے گا تو زندگی میں صرف ایک بار پڑھے گا۔

(''لیکن آرتھر موریسن امریکہ کیا کرنے گیا ہے؟'' چھوٹی چھوٹی مونچھوں والا آدمی پوچھتا ہے۔)

نہیں، میں تمھیں اس کتاب کے بارے میں اور کچھ نہیں بتاؤں گا۔ میں تھکا ہوا ہوں۔ وقت اب دو بجے رات کا ہے اور میں شام کے چار بجے سے لکھ رہا ہوں۔ (میں نے اس عرصے میں پچیس سگریٹ پیے ہیں جو میری صحت کے لیے بُرے ہیں۔) میرا خیال ہے کہ میں نے اتنا کچھ کہہ دیا ہے کہ تم خود اس اچھوتی اور دلچسپ کتاب کو پڑھنا چاہو گے۔

مگر میں جاتے جاتے ایک بات کہہ دوں۔ مصنف نے کتاب کے آخر میں ایک باب ''حاصلِ مطالعہ'' کا دیا ہے۔ اس میں عدم اور وجود کی کیفیتوں کا ایک اچھوتا نظریہ ہے:

> جب تصادم کا زور ٹوٹ جاتا ہے اور وجود ایک چکر لگا کر دوبارہ خود کو عدم میں ضم کر دیتا ہے۔ عدم کی حیثیت رحمِ مادر کی سی ہے کہ یہیں سے وجود کی تخلیق ہوتی ہے لیکن رحمِ مادر تخم کو قبول کیے بغیر تخلیق کے عمل کو سرانجام نہیں دے سکتا۔ عدم اور وجود ایک ہی دائرے کی مختلف کروٹیں ہیں۔

مصنف نے اس تھیوری کی وضاحت کے لیے دو پورے صفحے کے ڈایاگرام بھی دیے ہیں جن میں بھنور کی قسم کے دائرے ہیں۔ یہ تھیوری دلچسپ ضرور ہے مگر اپنی پوری کوشش کے باوجود میں اس کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ میں نے ڈایاگرام کا بھی بغور مطالعہ کیا ہے۔ عروج، زوال، غزل، گیت، نظم کے الفاظ تو

Scanned with CamScanner

میں پڑھ سکتا ہوں مگر یہ ف، گ، ٹ، ج، ک، وغیرہ کیا ہیں اور وجود ایک لمبی سرخ عمودی لکیر کیوں ہے اور عدم ایک نیلا فیتا کیوں؟ مجھے اپنے اچھے دوست وزیر آغا سے یہ تھیوری (بمع اشکال) کسی فرصت کے وقت بجھنی پڑے گی۔ یہ کافی دلچسپ لگتی ہے۔

(اور یہاں ہائیڈ پارک کے مقرر نے اپنی تقریر ختم کر دی اور اپنے سوپ بکس کو بغل میں دبا، وہاں سے چل دیا، اپنے سامعین کو یہ بتائے بغیر کہ آرتھر موریسن امریکہ کیوں گیا ہے۔ ہر کوئی دل کھول کر اسے کوسنے دے رہا ہے اور یقیناً، بھائیو! وہ ہے بھی اسی لائق۔)

(فنون، لاہور، اکتوبر ۱۹۶۵ء)

دستک نہ دو

الطاف فاطمہ

بے چارہ اردو ناول گرداب میں ہے۔ اسے کون بچائے گا؟ بہت سے شناوروں نے اچھے ارادوں اور قدرتی مشاقی سے لیس ہو کر اس کو بچانے کی کوششیں کی ہیں۔ پہلے اردو ناول ___ ''قصہ چہار درویش''، ''فسانہ عجائب''، ''طلسم ہوشربا'' اور سرشار کے ناول وغیرہ ___ اس صنف کی جدید تعریف کے مطابق بمشکل ہی ناول کہلائے جا سکتے ہیں، اگرچہ یہ سب قصے اور فسانے داستان گوئی کی اعلیٰ ترین خوبیوں سے خالی نہیں اور ان کا سحر دائمی ہے۔ پھر عبدالحلیم شرر اور دوسروں نے اس صنف میں طبع آزمائی کی اور ادب کی اس بے چاری صنف کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا۔ مرزا ہادی رسوا نے البتہ ''امراؤ جان ادا'' لکھ کر ناول کو ڈوبنے سے تقریباً بچا لیا۔ ڈپٹی نذیر احمد نے اپنی ہی قسم کے ناول لکھے۔ ناول کی شکل میں وعظ و پند کے وہ اچھے جاندار تبلیغی پمفلٹ ضرور ہیں لیکن کیا وہ ناول ہیں؟ پریم چند اور سدرشن بھی ناول کی مدد کو پہنچے مگر خود گرداب میں الجھنے لگے۔ بعد کے لکھنے والوں میں ڈاکٹر احسن فاروقی نے ''شام اودھ'' میں ایک دلیرانہ کوشش کی اور ان کا ناول فارم اور کردار نگاری میں بڑا متوازن اور کامیاب ثابت ہوا، البتہ بات پھر بھی نہ بنی۔ کرشن چندر نے ''شکست'' میں 'دی گریٹ اردو ناول' لکھنے کی کوشش کی مگر یہ کوشش

کامیاب نہ ہو سکی۔ عصمت نے ''ٹیڑھی لکیر'' کے پہلے آدھے حصے میں اردو ناول کو ساکھ کی زمین پر لا کھڑا کیا، اور پھر دوسرے آدھے حصے میں سر پر ٹانگیں رکھ کر یکلخت بھاگ کھڑی ہوئیں۔ قرۃ العین حیدر آئیں۔ اپنے طول طویل اینگلو لکھنوی صنم خانوں اور جم خانوں کے ساتھ۔ ان کی خوبصورت تحریر کے باوجود ان کے ناول صنم خانے (یا جم خانے) ہی رہے۔ بلونت سنگھ اور بیدی نے البتہ ''رات، چور اور چاند'' اور ''ایک چادر میلی سی'' میں اس فارم کی رفعتوں کو چھوا اور خدیجہ مستور نے ''آنگن'' میں (سوائے اس کے آخری چند ابواب کے جہاں ناولسٹ اونگھتی ہوئی لگتی ہیں) میرے خیال میں اردو کا پہلا کامیاب اور مکمل ناول لکھا ـــ اور ہم سب کتنے خوش ہوئے کہ آخر کار ناول کو بچا لیا گیا تھا۔

لیکن ناول لکھنے والے اور بھی بہت سے تھے ـــ نقاشِ فطرت اور مصورِ جذبات کی قبیل کے ناولسٹ، ''شاباش بہادرو بڑھے چلو'' قسم کے مجاہد ناولسٹ۔ سادہ لوح پبلک نے ان کے ناولوں کو عملاً نگلا۔ ان ناولسٹوں کے ناشر امیر ہو گئے اور بہت سے نوجوانوں نے ان کے لامتناہی شاہکاروں کو لکھنے کی خاطر کتابت کا پیشہ اختیار کیا۔ ایک چندھی آنکھوں والا نوجوان جسے ''سلیم بن کریم'' کے آٹھ سو پچاس صفحات کی کتابت کرنے کا شرف حاصل ہوا، اس عمل میں اپنی بصارت ہی سے محروم ہو گیا، مگر اسے یہ روحانی تسکین ضرور ہے کہ اس کارِ ثواب سے اس کی عاقبت سنور گئی اور بہشت میں حوریں اس کا انتظار کر رہی ہیں۔ پھر اُن ناولسٹوں کی ایک کھیپ ہے جنھیں نسوانی رسائل کا مطالعہ کرنے والی لڑکیاں بڑے ذوق وشوق سے پڑھتی ہیں۔ مگر خواتین ناولسٹوں اور انھیں پڑھنے والیوں کے متعلق کچھ نہ کہنا ہی بہتر ہے۔ خواتین، بقول روزنامہ ''مشرق''، بڑی حساس اور جذباتی ہوتی ہیں اور میں ان کے نازک احساسات کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتا۔ یہ جوانمردی کی ریت کے خلاف ہے۔ انھیں ان کی معصومیت اور سادہ لوحی والی دنیا میں ہی چھوڑ دو، کیونکہ وہ بے چاری اس میں سے نکلنا ہی نہیں چاہتیں۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ بے چارے اردو ناول کے ساتھ اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی یہ ڈھیٹ ابھی تک سانس لے رہا ہے، گو سسک سسک کر۔ میسرز آدم جی نے حال میں گلڈ کے تعاون سے بار بار پٹ سن کے زریں ریشے سے اس کے کمزور جسم میں خون انجیکٹ کیا ہے۔ اس سے غالباً ناول کی ضخامت ضرور بڑھ گئی ہے مگر اس کا معیار نہیں بڑھا (البتہ اگر معیار ضخامت کا رہینِ منت ہے تو معیار بھی بڑھ گیا ہے)۔

اب الطاف فاطمہ اپنے ناول ''دستک نہ دو'' (ضخامت ۷۸۷ صفحات) کے ساتھ بڑی دھوم دھام اور

ٹھاٹ باٹ سے آئی ہیں۔ یہ ان کا دوسرا ناول ہے۔ پہلا ''نشانِ محفل'' تھا۔ وہ کئی سو صفحات پر مشتمل تھا۔ مجھے دو تین پڑھنے والوں نے یقین دلایا تھا کہ یہ ایک بہت اچھا ناول ہے، ایک نہایت شریف، سلجھی ہوئی، ایم اے پاس خاتون کا لکھا ہوا۔ میں نے اسے نہیں پڑھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ان لوگوں کے لیے ایک ناول کی اچھائی یا برائی کن باتوں سے متعین ہوتی ہے۔ بہت سی ایسی خواتین ہیں جن کے نزدیک ''شمع'' بہترین ناول ہے۔ انھوں نے اسے دو تین بار پڑھا ہے۔ اس کتاب کے دس بارہ ایڈیشن ہی اس کی مقبولیت کی دلیل ہیں۔ میں نے اسے ایک دفعہ جی کڑا کر کے پڑھنے کی کوشش کی اور پہلے دو ابواب کے بعد تحریر کی یبوست سے اکتا کر اسے رکھ دینے پر مجبور ہو گیا۔ یقیناً محترمہ اے آر خاتون بڑی قابلِ قدر خاتون تھیں لیکن انھوں نے ایک عام سا مثالی 'خواتینی' ناول لکھا تھا، اور یہ ایک بُرا ناول ہے۔ (ایکسکیوز می لیڈیز!)

ایک اچھا ناول لکھنے کے لیے یہ قطعی ضروری نہیں کہ آپ بڑے سلجھے ہوئے یا تربیت یافتہ ذہن کے مالک ہوں یا آپ کے نام کے ساتھ اعلیٰ تعلیمی ڈگریوں کے دم چھلے ہوں۔ (ہم سب علم وفن کے ڈاکٹروں میں سے ان ڈاکٹروں کو جانتے ہیں جن کا اندازِ فکر اور کند ذوق ہمیں خون کے آنسو رُلاتا ہے۔) ہاورتھ پارسینج (Haworth Parsonage) کی ایملی برانٹے یا بنگال کی ''ان پورنا دیوی کا مندر'' لکھنے والی لڑکی یا لکھنؤ کی خدیجہ مستور کبھی کسی کالج کے ایوانوں میں سے نہیں گزریں۔ انھوں نے زندگی کے مدرسے میں تعلیم پائی اور اپنے کانوں اور اپنی آنکھوں کو کھلا رکھا۔ انھیں قدرت نے کچھ ودیعت کر رکھا تھا۔ انھوں نے یقیناً ادبی اظہار کے لیے بے حد محنت کی، مگر قدرت کی اس امداد کے بغیر وہ ساری محنت اور لگن بالکل بے سود ثابت ہوتی اور وہ ایسے حقیقی ناول نہ لکھ سکتیں جو زندہ رہیں گے۔ دور کیوں جائیے، ''قصۂ چہار درویش'' (گو یہ لفظ کے جدید معنی میں ناول نہیں) کے میر امن کو لیجیے، وہ کیا تھا؟ دلی کا ایک روڑا۔ وہ پیاری روزمرہ کی زبان اس نے دلی کے بازاروں اور گلی کوچوں میں سیکھی (اور میں نہیں سمجھتا کہ اس نے کبھی کسی اسکول میں میڈل لیا) لیکن کیسا سدا بہار قصہ اس نے لکھا ہے! دنیا کے ادب میں مجھے ایسی پُرکشش اور ورغلانے والی کہانی نہیں ملی۔ جب بھی میں اداس ہوتا ہوں تو میں دلی کے اس بوڑھے روڑے کے 'باغ و بہار' کی سیر کرتا ہوں۔

یہ نہیں کہ الطاف فاطمہ نے ایک بہت بُرا ناول لکھا ہے۔ بالعموم خواتین جیسے ناول لکھتی ہیں ان میں یقیناً اس کا مقام اوّل صف میں ہوگا۔ اس میں بہت سی ایسی خوبیاں ہیں جو عموماً خواتین کے ناولوں

Scanned with CamScanner

میں نہیں ہوتیں —— سادگی، اچھوتے پن اور حسنِ بیان کی خوبیاں۔ رومینٹک ناول نویسی کے سب مرکبات، پکانے کی ترکیب کے مطابق کٹے ہوئے، چھنے ہوئے، ابلے ہوئے، اس ناول میں موجود ہیں، تحریر 'تعلیم یافتہ' ہے، رواں ہے، صاف اور ہموار ہے، اور پھر اتنے سارے جذبات سے پُرصفحات ہیں، قاری کو دنوں تک محور کھنے کے لیے۔

مگر میں ناول میں اور بہت کچھ چاہتا ہوں۔ میں اس قسم کے ڈھیلے، لچھے دار، رومینٹک ناولوں سے بدکتا ہوں۔ دراصل میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ایسے ناول اب کیوں لکھے جاتے ہیں۔ مسز آلی فینٹ اور مسز ہنری وُڈ کا زمانہ اب گزر چکا ہے۔ لیڈیز! بے شک تم سدا اس بھولپن اور سادہ لوحی کی بہاریں لوٹو، گوبھی کا سالن اور آلو کا حلوہ بنانے کی ترکیبیں سیکھو، کروشیا اور سلائی میں مہارت حاصل کرو، اور حکیم اژدر یونانی سے اپنی جذباتی اُلجھنوں کے حل دریافت کرو، مگر خدا اور اس کے رسول کا واسطہ کہ اپنے نشیمنوں میں سے باہر بھی تو جھانکو، دوسرے افقوں کی رنگینی کی طرف بھی تو نگاہ کرو۔ کتنا عرصہ تم غوں غاں کی یہ زندگی گزارنے پر قانع رہوگی؟ (ایکسکیوز می لیڈیز!) ہاورتھ پارسنیج کی ایمیلی برانٹے آخر تم میں سے ہی تھی، تمھارٗی ہی ایک بہن!

میرا یہ مطلب نہیں کہ یہ سب باتیں (گوبھی کا سالن وغیرہ) محترمہ الطاف فاطمہ کے ناول میں موجود ہیں —— نہیں، مطلقاً نہیں، گوبھی کا سالن سارے ناول میں ایک دفعہ بھی نہیں آتا۔ میرا مقصد محض یہ ہے کہ اس ناولسٹ کا ذہن اور فکر، کم سے کم اس ناول کی حد تک، عام خواتین ناولسٹوں کی لمبی قطار سے مختلف نہیں۔ اس ناول میں ایک بھی اوریجنل خیال نہیں۔ حجاب امتیاز علی کو اب ہم کم ہی پڑھتے ہیں، مگر کیسی انفرادیت، دلفریبی اور اچھوتا پن ان کی تحریر میں ہے (سارے تصنع اور بناوٹ کے باوجود)، کم از کم ان کے ناولٹوں اور افسانوں میں چوڑے فرانسیسی دریچے نیلے بدیشی ساحلوں پر تو کھلتے ہیں اور گرم ایشیائی ملکوں کا گول چاند سیاہی مائل اوقیانوسوں پر تو چمکتا ہے۔ اے آر خاتون کی قسم کے ناول لکھنے سے کہیں بہتر ہے کہ حجاب امتیاز علی کے کلاؤڈ کوکو لینڈ کے من گھڑت، تخیلی، رومان میں ڈوبے قصے لکھے جائیں۔ کم از کم حجاب کے قصوں اور ناولٹوں میں بہاروں کی تازگی تو ہے، دور پرے ساحلوں پر دیکھنے کی تمنا، جو افسوس کہ بہت، بہت دور ہیں۔

محترمہ الطاف فاطمہ کو یہ ناول لکھنے کا پورا حق تھا۔ میں اس حق پر اعتراض نہیں کر رہا ہوں بلکہ خوش

Scanned with CamScanner

ہوں کہ انھوں نے یہ ناول لکھا ہے اور اپنے فرصت کے اوقات کو ایک دلچسپ شغل میں صرف کیا ہے۔ میں ایک شخص کو جانتا ہوں جو ایک بڑی فرم میں ملازم ہے۔ وہ دفتر سے فارغ ہونے کے بعد وقت گزاری کے لیے اومنی بس میں سوار ہونے والوں کی جیبیں کترتا ہے۔ اس نے مجھے یقین دلایا ہے کہ اس شغل کی وجہ صرف یہ ہے کہ فارغ وقت اسے دوبھر معلوم ہوتا ہے۔ اور پھر ایسے لوگ ہیں جو مرغے لڑاتے ہیں، پتنگ اڑاتے ہیں یا خالی بستر پر لیٹ کر پہروں سگریٹ کے مرغولے چھوڑتے ہیں۔ ان سب کے مقابلے میں ناول نویسی معصوم شغل ہے اور میں نے کسی مرد یا عورت کے بارے میں یہ نہیں سنا کہ اسے اس شغل سے نقصان پہنچا ہو۔

''دستک نہ دو'' کا پلاٹ کیا ہے؟ بیشتر تبصرہ نگار اپنے تبصروں میں ناول کا پلاٹ مختصراً پیش کر دیتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ عادت ناولسٹ کی محنت کے ساتھ انصاف نہیں۔ اس سے ناول کی فروخت پر بھی بُرا اثر پڑنے کا احتمال ہے کیونکہ لوگوں میں پلاٹ جان چکنے کے بعد ناول پڑھنے کے لیے زیادہ شوق باقی نہیں رہتا۔ میں ایسا نہیں کروں گا، پھر بھی تبصرہ نگار کو کتاب کے موضوع وغیرہ کے متعلق کچھ نہ کچھ ضرور بتانا چاہیے ورنہ لوگ یہ کبھی یقین نہ کریں گے کہ اس نے کتاب پڑھی ہے۔ میں قسم کھانے کے لیے تیار ہوں کہ میں نے یہ ناول پڑھا ہے۔ میری بیوی نے اسے دوبار پڑھا ہے اور وہ اسے بچے کی جرابیں بننے کے بعد تیسری بار پڑھنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ (آپ جانتے ہیں کہ تبصرے کے لیے دو جلدوں کا ایڈیٹر کے پاس آنا ضروری ہے۔ فیروز سنز نے اس بہت قیمتی کتاب کی دو جلدیں ایڈیٹر ''فنون'' کو ریویو کے لیے بھجوائیں، جن میں سے ایک اس نے مجھے تبصرہ کرنے کے لیے دی۔ میں اسے ایڈیٹر کو لوٹانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ میری بیوی نے اسے پوری طرح اپنی ملکیت بنالیا ہے۔)

اس ناول کا موضوع خاموش، چپکی، گونگی محبت ہے۔ صفدر یاسین عرف لیوچو ایک پھیری والا ملازم چائنا مین ہے جو اپنی سائیکل ٹنٹناتا ہوا ایک چھوٹے شہر کی کوٹھیوں اور بنگلوں میں پلنگ پوش اور پلو کیس اور اس قسم کی چیزیں فروخت کرتا ہے۔ جب ہم پہلے اسے ملتے ہیں تو وہ سترہ سال کا بانکا چھیلا لڑکا ہے، اور غیر رواجی، باغی، چھوٹی چپٹی ناک والی ارسٹوکریٹک گھرانے کی بچی گیتی آٹھ نو سال کی۔ کہانی ان کے درمیان پروان چڑھتی محبت کی ہے، گونگی محبت جو کبھی اظہار کا راستہ نہیں پاتی۔ صفدر عرف لیوچو کبھی دستک نہیں دیتا۔ اور جب گیتی بہت سی escapades اور بغاوتوں کے بعد ایک معمر مرد سے

شادی کر لیتی ہے تو لیو چو اپنے مالک سانگ سے لمبی رخصت لے کر پیکنگ اپنے وطن کو چلا جاتا ہے۔ وہ دل شکستہ ہے۔ وہ پھر شادی نہیں کرتا۔ وہ ناول میں لاؤتزے (Laotze) کی طرح فلسفی لگتا ہے۔ دوسرے بھی بے شمار کردار ہیں مگر یہ دونوں دراصل ناول کی جان ہیں اور انھی کے لیے یہ ناول لکھا گیا ہے۔ افسوس ہے کہ دونوں کسی طرح بھی تحریر کی ساری آب وتاب کے باوجود حقیقی ہونے کا تاثر نہیں دیتے۔ ناول کے شروع شروع میں چائنا مین اور گیتی زندہ ہوتے لگتے ہیں لیکن بعد میں گیتی بالکل فینٹاسٹک ہو جاتی ہے اور صفدر یاسین فلسفی لاؤتزے کا چھوٹا بھائی۔ بے شک بیشتر خواتین کے نازک دلوں کو صفدر یاسین اور گیتی کی ان کہی محبت غم واندوہ سے اور میٹھے خوابوں سے بھر دے گی، مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ اس ناول میں اصلیت کی کوئی جھلک ہے۔ اور یہ ہیں ناول کے مختلف ٹکڑے، اِدھر اُدھر سے اُچکے ہوے، آپ کو اس کے ذائقے سے روشناس کرانے کے لیے:

ٹن ٹن... دور کہیں گھڑیال نے پانچ بجائے تھے۔ وسط نومبر کی یہ شام خنک اور خاموش تھی۔ اس نے دھیرے سے غسل خانے کا دروازہ کھولا، اِدھر اُدھر جھانکا اور چپکے سے نکل کر غسل خانے کی سیڑھیوں پر آ بیٹھی۔ اس کی نظر کے سامنے سبزیوں کی کیاریاں تھیں اور بانس کے ٹھاٹھروں پر پھیلی ہوئی سیم کی بیلیں۔ سیڑھیوں کے بائیں جانب گندے پانی کی حوضی تھی، کائی زدہ اور گندے پانی سے لبریز، جس کی سطح پر بالائی کی طرح استعمال شدہ صابن کی جھلی لرز رہی تھی۔ سبزی مائل شکن آلود، سفید سفید شکن آلود جھلی۔ اوہ! اس کا جی چاہا کہ وہ مٹی کی سکوری میں اس جھلی کو آہستہ آہستہ سمیٹ لے اور مزے سے بالائی بیچے... مگر کائیں کائیں... یکلخت ہی کوؤں کی قطار کی طرف اس کی توجہ مبذول ہو گئی۔ وہ بسیرے کے لیے جا رہے تھے۔ اونچے سبز درختوں کی سبز کاہی چوٹیوں کے مقابل نیلے آسمان پر منڈلاتے ہوے سیاہ سیاہ کوے۔

کاش مجھے کوئی کوا بنا دیتا تو بھی مزے ہی میں رہتی، چیل تو کوئی خاک بنائے گا۔

اسے چیل کی پرواز بہت پسند تھی۔ وہ گھنٹوں گھنٹوں چت پڑی حسرت سے دھیرے دھیرے بلندیوں کی طرف جاتی ہوئی چیلوں کو دیکھا کرتی۔ بالکل یہ معلوم ہوتا کہ اُڑ نہیں رہیں بلکہ تیر رہی ہیں، بس پانی کے بہاؤ کے ساتھ بہی جا رہی ہیں۔ ''اے ہے! ہمارے نصیب میں تو کوا بننا بھی نہیں!'' اس نے کڑھ کر سوچا اور فوراً ہی ایک اور خیال اس کے ذہن میں ناچنے لگا۔ یہ اماں

Scanned with CamScanner

بیگم نجانے کون سے نمونے سوئٹروں میں ڈالا کرتی ہیں۔ اور جو میری بات مانیں تو بس مجھے ایسا ہی سوئٹر بنا دیں۔ بس ہرا بورڈر ہو اور باقی کا سب نیلا ہو اور آگے تمام میں چھوٹے چھوٹے کالے کالے کوے ہوں۔ مگر ان سے کون فرمائش کرے، جھڑکیاں دینے لگیں گی یا پھر سنی اَن سنی کر دیں گی۔ اونہہ! وہ تو کوئی بات سنتی نہیں۔

اور ایک دوسرا:

صفدر یاسین عرف لیوچو نے طویل رخصت پر جاتے ہوئے اپنا سامان سمیٹتے سمیٹتے سوچا، ''میں طویل رخصت پر کبھی واپس نہ آنے کے ارادے سے جا رہا ہوں۔ اس لیے وہ ہاتھ جس کو میں نے دستک دینے سے باز رکھا تھا اس پر میرا اختیار نہیں۔ انسان کو اپنی کسی بات یا چیز پر اختیار نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ دل جیسی پنہاں اور کمزور شے بھی اس سے سرتابی کرتی ہے۔ اور اب درویش کدھر جائے! شہرِ دل تو سکڑ کر بہت مختصر ہوا چاہتا ہے...''

سوئیٹ رومینٹک سٹف — مگر یہ اتنا غیر حقیقی کیوں ہے؟

یہ اپنے انداز میں اچھا ناول ہے۔ محترمہ الطاف فاطمہ! اولیور ٹوسٹ کی طرح ہم آپ سے اور بھی مانگتے ہیں۔ کم از کم میری بیوی اتنا ہی بڑا ایک ناول آپ کے قلم سے چاہتی ہے — آئندہ سرما تک۔ اوخدا! کیا اُردو ناول میں بھی کبھی جین آسٹن اور برانٹے بہنوں کی سی کوئی لکھنے والی آئے گی؟

کون اردو ناول کو بچائے گا؟

(فنون، لاہور، فروری مارچ ۱۹۶۶ء)

آتشِ رفتہ

جمیلہ ہاشمی

جمیلہ ہاشمی کا یہ ناولٹ ''آتشِ رفتہ'' غالباً چھ سات سال ہوتے ہیں، اس چھوٹے، انگشتے سے میگزین ''داستان گو'' میں چھپا تھا جسے اشفاق اور قدسیہ بڑے پیار اور سلیقے سے نکالا کرتے تھے۔ (کتنا افسوس

ہے کہ وہ پُر مسرت میگزین اس ادبی خزاں میں زیادہ عرصہ نہ پنپ سکا اور سسک سسک کر مر گیا۔)

''آتش رفتہ'' نے اپنی پہلی نمود پر ہم سب کو قدرے چونکا دیا۔ اس دور کی عمومی افسردگی میں یہ ناولٹ گویا بہار کا تازہ جھونکا تھا — اپنی تھیم اور لطافت بیان میں بالکل اچھوتا، نیا نویلا۔ کئی پڑھنے والوں کے لیے ماجھے کے دیس کی یہ بھڑکتی محبت اور انتقام کی کہانی اتنی پُر سحر ثابت ہوئی کہ انھوں نے اسے کئی بار پڑھا۔ یہ جمیلہ ہاشمی کون تھی؟ ہر کوئی پوچھنے لگا۔ اسے ماجھے کے خطے کے سکھ سرداروں کے رہن سہن، رسوم و رواج ان کی توانا، جذبات بھری الھڑ زندگی کا اتنا گہرا، اندر سے محسوس کیا ہوا علم کیسے تھا؟ وہ وہاں کی بلوان، تانبے کے دہکتے جسموں والی عورتوں اور کڑیل، خوبصورت، زور آور مردوں کے جذبات کو اتنے قریب سے کیونکر سمجھتی تھی؟... اور پھر ماجھے کے کھلیانوں، کھلے میدانوں، میلوں ٹھیلوں کے سماں، برسات اور دھوپ اور اماوس کے راگ رنگ، اس دم سادھ دینے والی خوبصورتی اور ہڑکے سے کھنچے ہوئے تھے کہ وہ بالکل حقیقی لگتے تھے اور پڑھنے والے کو موہ لینے کی قدرت رکھتے تھے۔ وہ ان سکھ سرداروں کی زندگی، ان کے خطے کو اندر باہر سے جانتی معلوم ہوتی تھی۔ نہ صرف وہ اس تہذیب کو جانتی تھی بلکہ وہ اسے ایک نادر بانکپن اور سندرتا کی نثر میں ڈھال دینے کے گر سے بھی واقف تھی۔ اس کہانی نے ہم سب کو مسحور کر لیا کیونکہ یہ اتنی سادگی، اتنے حقیقی لگاؤ سے لکھی ہوئی تھی اور ہم شہری لوگوں کے متعلق سوشل انداز کے بے رنگ و بو نفسیاتی، جنسیاتی، مریضانہ افسانے پڑھ پڑھ کر تھک چکے تھے۔ لیکن سب سے زیادہ ہم اس لیے مسحور ہوئے کہ ''آتش رفتہ'' دل کو گرفت میں لے لینے والی غم انگیز اور تصوریت سے پُر کہانی تھی۔ میں ایمانداری سے سمجھتا ہوں کہ ہم سب کو ایسی کہانیاں اور زیادہ لکھنی چاہییں۔ میں ان کو ان سماجی نفسیاتی انٹلکچوئیل کہانیوں سے کہیں زیادہ ترجیح دیتا ہوں جو بے جان، غیر دلچسپ لوگوں کے بارے میں ہوتی ہیں اور جن میں شروع سے آخر تک کچھ نہیں ہوتا۔ مجھے ایسی کتابیں پسند ہیں جن میں میں بالکل کھویا جاؤں اور مجھے اپنے تن بدن کا ہوش نہ رہے اور جب وہ ختم ہو تو میرا ذہن گوناگوں، رنگارنگ تصویروں اور سپنوں سے دیر تک دمکتا رہے اور میں بڑی دیر تک نیند یا کسی اور چیز کے بارے میں نہ سوچ سکوں۔ سب اچھی حقیقی کتابوں میں یہ صفت ہوتی ہے۔ ''آتش رفتہ'' ایسی ہی کتاب ہے۔ ممکن ہے نقادوں کے نزدیک یہ اونچا فن نہ ہو مگر میں اسے ایک مائنر اردو کلاسک کہنے سے نہیں جھجکوں گا۔ میں اس پر نقادوں کو بل کھاتے ہوئے بھی دیکھ سکتا ہوں اور یہ بھی کہ وہ مجھ پر رحم کھا رہے ہیں، مگر میں

Scanned with CamScanner

ان کی کیوں پروا کروں؟

ایک چیز میں نہیں سمجھ سکا۔ عنوان کے نیچے اسے ''نفسیاتی ناولٹ'' بتایا گیا ہے (خدا جانے یہ ناشر کی اُپج ہے یا مصنفہ کی)۔ یہ نفسیاتی ناولٹ یا اس قبیل کی کوئی شے نہیں ہے اور ہم کو اس کے لیے ستاروں کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ یہ ماجھے کے خطے کا ایک چمکتا دمکتا رومانس ہے۔ 'رومانس' کا لفظ میں اس لیے استعمال کر رہا ہوں کہ اردو میں اس کا کوئی نعم البدل نہیں۔ وہ نعم البدل جو ہم نے تراشا ہے یعنی 'رومان' اپنے معنی میں افسوس ناک حد تک محدود اور ناکافی ہے اور اردو میں رومان فقط ایک محبت کی کہانی کے معنی میں مستعمل ہے۔ انگریزی رومانس محبت کی کہانی بھی ہو سکتی ہے اور خالصتاً ایڈونچر کی داستان بھی۔ ناقابلِ تقلید رابرٹ لوئی اسٹیونسن نے کئی ایک رومانس لکھے۔ وہ ''ٹریژر آئی لینڈ'' اور ''کڈنیپڈ'' کی طرح غیر فانی رومانس ہیں، لیکن ان میں عورت کا نام نہیں۔ وہ لڑکوں کے لیے، یا میرے جیسے آدمیوں کے لیے جو کبھی بڑے نہیں ہوتے، ایڈونچر کی کہانیاں ہیں۔ اس کے برعکس ''لارنا ڈون'' یا ''کارمن'' بھی رومانس ہیں اور زیادہ تر خالص اور سادہ محبت کی داستانیں ہیں۔ اب اگر ''آتش رفتہ'' کو ایک رومان یا ایک رومانی ناولٹ کہا جائے تو اس کا تاثر بالکل غلط ہوگا، مگر اس میں ایک رومانس کے سارے عناصر بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اور نفسیاتی ناولٹ تو یہ ہرگز نہیں۔ ماجھے کے جیالے کڑیل مرد قطعاً نفسیاتی نہیں ہو سکتے۔ وہ دھرتی ماتا کے قدرتی بچے ہیں جو اپنے جذبات سے نہیں ڈرتے۔ سگمنڈ فرائیڈ نے شہروں کے باہر ابھی سفر نہیں کیا۔

یہی وجہ ہے کہ ماجھے کے سردار اور سردارنیاں ہمارے تخیل پر چھا جاتے ہیں۔ ان میں کوئی نفسیاتی پیچ نہیں، اور ہم ان البیلے، مضبوط کلائی کے کسانوں کے تیز و تند عارضی جذبات، ان کی مسرتوں کی سادگی، قدرتی پن اور ایک حیوانی، کھلی شادمانی، ان کی شدید دشمنیوں اور دوستیوں کو رشک اور تعریف سے دیکھے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ان کے مقابلے میں ہماری اپنی زندگیاں (خواہ ہم گلبرگ کی کوٹھی اور مرسڈیز کے مالک کیوں نہ ہوں) کتنی گھٹی ہوئی اور فاقہ زدہ اور نزار ہیں۔ میں نے پچھلے دنوں ایک کتاب ''کامیاب زندگی کا تصور'' پڑھی جسے لسانیات کے ایک ماہر پروفیسر نے بارہ سال کی محنت شاقہ سے ترتیب دیا، اور میں کامیابی کے بالکل مسخ شدہ وژن پر، جو انسانیت کی ایک وسیع اکثریت کے دل و دماغ میں جڑ پا چکا ہے، تھرّا اٹھا۔ کامیابی اس بات میں نہیں کہ تم اقتدار کے ایوانوں میں گھومتے پھرتے ہو اور تمھاری

تقریریں دنیا کے اخباروں میں نقل کی جاتی ہیں یا کلفٹن پر تمھارا شیشے اور فولاد اور کنکریٹ کا محل ہے۔ ذرا یہ سوچو کہ تمھاری روح کتنی سہمی ہوئی، ناتواں اور میلی ہے۔ تھوریو نے کتنا سچ کہا ہے کہ بیشتر آدمی ایک دبی ہوئی مایوسی کے کنارے پر جیتے ہیں۔ تہذیب وتمدن کی برکات کے باوجود ہم سب اتنے غیر مطمئن اور ناخوش کیوں ہیں؟ ہم ان دیواروں کو کیوں نہیں توڑ سکتے جو ہماری روح کو قید کیے ہوے ہیں؟ جہاں خوشی اور سادگی اور مردانگی نہیں وہاں زندگی نہیں، خواہ ایک آدمی کے پاس بڑا بینک بیلنس ہو اور فرانسیسی جنوب میں ایک شاندار وِلا اور کروڑپتی اونیسس کی طرح سجے ہوے ذاتی بجروں کا بیڑا۔ وہ خوشی سے اتنا ہی دور رہے گا جتنا کہ ایک تشنہ سوکھا صحرا پانی کے زندگی بخش لمس سے۔ ایسی بیابان روح میں کچھ نہیں اُگے گا اور اگر کچھ اُگے گا بھی تو زہریلی کھمبی۔ اوہ! ہم سب کتنے گھٹے ہوے، کتنے خائف اور کتنے بےاطمینان اور بیمار ہیں۔ دیوہیکل صنعتی مشینوں اور دس سالہ تعمیری منصوبوں اور ایٹم کی ایجادوں نے مہذب آدمی کی زندگی کو کچل دیا ہے اور جلد ہی وہ صحیح اور توانا زندگی کے تصور کو بھی بھول جائے گا۔ ہنری ملر کے الفاظ میں، متمدن آدمی روح کے کوڑھ اور سرطان میں مبتلا ہیں۔ ہمارے چاروں طرف موت کی علامات ایستادہ ہیں — سپرسانک جیٹ موت ہیں، مشین موت ہے، تمھارا محفوظ دفتری عہدہ، انشورنس پالیسی موت ہے، ٹیلی وژن، کلب اور اسٹاک ایکسچینج کے حصے سب موت ہے، کالج اور کیریر کی دوڑ موت ہے اور ”اخبارِ خواتین“ کی پُرمسرت ازدواجی زندگی بھی موت ہے۔ ہم سب اس موت کے سانس کو محسوس کررہے ہیں لیکن ترقی اور کامیابی کے خیال سے اس کی طرف بڑھتے ہیں۔ ہم ایک لفظ بھی نہیں کہتے، کیونکہ ہم کامیابی کے جھوٹے چھلاوے کے تعاقب میں لگے ہیں۔ کیا یہ contraception اور بم کی باتیں صحیح اور سالم اور جیتے لوگوں کی باتیں ہیں؟ میں جانتا ہوں کہ پطرس کے دل میں کیا تھا جب اس نے اپنا وہ چھوٹا سا مضمون ایک آدمی کے مینار پر سے گرنے کے بارے میں لکھا جو ”داستان گو“ میں چھپا تھا۔ وہ گرنے والا آدمی خود پطرس تھا، پطرس جو دنیاوی لحاظ سے اتنا کامیاب تھا اور اقوامِ متحدہ میں ہمارا مستقل لائق اور فصیح نمائندہ۔ اور میں اس چیز کو جانتا ہوں، اس رینگنے والے ڈر کو، جس نے اس کامیاب ترین اور بےمثل لکھنے والے ارنسٹ ہیمنگوے کو اپنی محبوب چاندی سے مڑھی ہوئی ہسپانوی بندوق کی گولی کو اپنے حلق میں چلادینے پر آمادہ کیا۔ صرف زندگی، صرف ہستی کوئی شے نہیں، اگر ہم بھرپور جینے کی شادمانی سے محروم ہیں۔ ہمالیہ پر چڑھنے والا ایک کوہ پیما اس دس سیکنڈ میں جس میں ایک برفانی تودہ

اسے عدم وجود کی طرف بہالے جاتا ہے، زیادہ جی لیتا ہے بہ نسبت مال روڈ کے ایک تاجر کے جس کی استی سالہ زندگی روپے کی کھنک اور بینک نوٹ کی سرسراہٹ میں گزرتی ہے، یا ایک یونیورسٹی پروفیسر کے جو اپنے کمرے میں بیڈ سلیپر اور سکے کی دوات کے ساتھ رہتا ہے اور قرونِ وسطیٰ کے سماج میں بھینسوں کی اہمیت پر اپنا تحقیقی مقالہ لکھنے میں سرگرداں ہے...ڈاکٹریٹ حاصل کرنے کے لیے۔

جمیلہ ہاشمی کی ''آتش رفتہ'' کے لوگ جیالے اور زندہ ہیں جن کی رگوں میں گرم، پُرجوش خون گردش کرتا ہے، جو تندی اور شدید جذبے سے دشمنی اور محبت کرتے ہیں، جن کا اسکول اور دفتر گندم کی سنہری بالیاں اُگانے والی زمین ہے۔ یہ ماجھے کے لوگ جسم اور دل کے مضبوط ہیں، قول کے سچے اور دلیر، دوستی اور دشمنی کے پکے۔ انھوں نے سگمنڈ فرائیڈ اور جدید شاعری کو نہیں پڑھا۔ ان کی عقابی آنکھوں میں حسرتیں نہیں جھانکتیں۔ وہ لڈی کھیلتے ہیں، گھوڑوں پر سواری کرتے ہیں، پاٹھ کرتے ہیں اور للکار کر کرپان چلاتے ہیں۔ وہ شاعر نہیں ہیں مگر ماہیا گاتے ہیں، اور زندگی کی ساری شاعری، سارا لوچ ان کے رگ و ریشے میں رچا ہوا ہے۔ ماجھے کی سرزمین سے وہ بڑ کے درختوں کی طرح سیدھے اور تناور اُگتے ہیں، اپنی داڑھیاں زمین میں گاڑتے ہوے، اور جب وقت آنے پر وہ مرجھا کر گرتے ہیں تو ایسے ہی آدمیوں کی ایک نئی نسل ان کی جگہ لینے کے لیے توانائی سے اُگ آتی ہے۔ ان کی عورتیں چکی چلاتی ہیں، اُپلے تھاپتی ہیں اور چاٹی میں مکھن بلوتی ہیں اور رنگین چرخے کاتتی ہیں۔ وہ فریج، ٹیلی وژن، فلم اور میک اپ کے بغیر بھرپور صحت مند، پُرسکون زندگیاں گزارتی ہیں۔ ان کے بچے سینٹ انتھنی میں نہیں پڑھتے۔ وہ گاؤں کے دوسرے بچوں کے ساتھ کبڈی کھیلتے ہیں یا کھلی جگہوں میں اپنے بیلوں اور مویشیوں کو چراتے اور تالاب میں نہلاتے ہیں۔ خوش قسمت بچے! ایک بچے کے لیے ڈھور ڈنگر کی گلہ بانی کتنی اچھی تعلیم ہے۔ تعلیم داں جو کچھ بھی کہیں، ایک بچے کے لیے اس سے بہتر تعلیم کوئی اور نہیں (یہی تعلیم موسیٰ علیہ السلام اور یسوع علیہ السلام اور ہمارے رسول ﷺ نے بچپن میں پائی تھی اور کتنے عظیم آدمی تھے وہ! قوموں اور دینوں کو بنانے والے اور دنیا کے لیے اچھائی اور نیکی کے پرچارک!) ایسے کڑیل لوگوں کے بارے میں جمیلہ ہاشمی کی یہ کہانی ہے اور ایک آبدار، درخشاں اور پُرکشش کہانی ہے، بڑی حساسیت اور خوبصورتی سے بُنی ہوئی۔ اس کے الفاظ رنگدار تصویروں کی طرح صفحے میں سے ابھر کتے ہیں اور خیرہ کردیتے ہیں اور نثر کہیں کہیں شاعری کو چھو جاتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جمیلہ ایک قدرتی

Scanned with CamScanner

کہانی لکھنے والی ہے لیکن یہاں (میں سمجھتا ہوں) فنکار کی خوش بختی بھی اس کے ساتھ تھی جیسے وہ جان کیٹس کے ساتھ تھی جب اس نے اپنی چھوٹی دائمی نظم ''لا بیلے ڈیم سانز مرسی'' لکھی۔ سب فن کاروں کو اس خوش بختی کی ضرورت ہوتی ہے تب ہی جادو پیدا ہوتا ہے اور ناممکن وقوع پذیر ہونے لگتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ جب جمیلہ نے اپنا ناول ''تلاشِ بہاراں'' لکھا تو خوش بختی اس کے ساتھ نہ تھی۔ تحریر کی لطافت ورنگینی کے باوجود ''تلاشِ بہاراں'' میں آگ فروزاں نہ ہوسکی اور کہانی یا کردار کوئی جادو نہ جگا سکے۔ یہ ناول غیر حقیقی اور بے جان اور اکتا دینے والا ہے، سچے تپے ہوئے احساس اور علم کے بغیر لکھا ہوا۔ صرف تحریر کے رنگ روپ سے ایک کتاب پڑھنے والے کو اپنے دام میں نہیں لے لیتی۔ ایسی ہی خوش بختی بیدی کے ساتھ تھی جب اس نے ''ایک چادر میلی سی'' لکھی — بیدی نے اس سے بہتر کہانی نہیں لکھی — اور بلونت سنگھ کے ہمراہ بھی ''رات، چور اور چاند'' کے پہلے باب لکھتے وقت یہی خوش بختی تھی جس کی بدولت اس کے منظروں میں وہ تیسرا بُعد (third dimension) پیدا ہوگیا اور لکھنے والا اور پڑھنے والا اپنی گرویدگی اور محویت میں یکجان ہوگئے اور الفاظ جیتی جاگتی شکلیں، رنگ اور بوئیں بن گئے۔ ''رات، چور اور چاند'' میں یہ معجزہ رونما ہوتا ہے کہ ہم بعض دفعہ نہ صرف کرداروں کو اپنے سامنے چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے دیکھتے ہیں بلکہ ان کی بو بھی گویا سونگھنے لگتے ہیں۔

میں ''آتش رفتہ'' کا ان دو شاہکاروں سے موازنہ نہیں کر رہا، اور حقیقتاً اس کا ان سے موازنہ کیا بھی نہیں جاسکتا، کیونکہ ''آتش رفتہ'' ایک رومانس ہے۔ ایک رومانس میں واقعات اور فضا پہلے آتے ہیں، کردار نگاری اور فکر انگیزی بعد میں، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایک رومانس میں زندہ، قابلِ یقین کردار نہیں ہوسکتے اور وہ محض پتلے ہوتے ہیں۔ رومانس میں کردار اتنی گہرائی اور باریکی سے پیش نہیں کیے جاسکتے جتنے ایک ناول میں؛ پھر بھی ان کا قابلِ یقین ہونا ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر ساری چیز جھوٹی ہوجاتی ہے۔ وہ البتہ کہانی کی فضا اور واقعات کی محیر العقولی کے تابع ہوتے ہیں، اور اپنے رومانی نمونے اور سانچے کے مطابق اپنا مقصد پورا کرتے ہیں۔ انھیں حقیقی کرداروں کے سے رنگ ڈھنگ سے چلنا، پھرنا، گفتگو کرنا لازم ہے اور وہ قابلِ یقین ہونے چاہییں، لیکن ان کے شعور وفکر کا گہرا مطالعہ رومانس کے تاثر کو خراب کردے گا۔ ''برادرز کارامازوف'' کے طریقے ''کڈنیپڈ'' جیسے رومانس میں بروئے کار نہیں لائے جاسکتے، جو لڑکوں کے لیے ایک ایڈونچر کی کہانی ہے اور پھر بھی چچا اینڈر، ہائی لینڈر ایلن اور ڈیوڈ جیسے زندہ کردار لیے

ہوئے ہے۔ ان کرداروں کے متعلق ہم اتنا ہی جانتے ہیں جتنا کہانی کے مقصد کے لیے ضروری ہے، نہ کم نہ زیادہ۔ نسیم حجازی اور بہت سے دوسرے بھی تاریخی رومانس لکھتے ہیں جن میں چال ڈھال یا گفتگو میں ایک کردار سے دوسرے کردار میں کوئی تمیز نہیں ہوسکتی۔ یوسف بن تاشفین یا محمد بن قاسم یا سعد بن غلام رسول یا عمر بن عبدالعزیز ایک ہی آدمی معلوم ہوتے ہیں اور بالکل ایک ہی قسم کی تقریریں کرتے ہیں۔ نتیجہ مضحکہ خیز اور انتہائی مکینکل ہوتا ہے اور رومانس ایک تبلیغی پمفلٹ بن کے رہ جاتا ہے۔

''آتش رفتہ'' کے کردار — شیر دل بوڑھی کرتار کور، سردارنی کلدیپ کور، سفید گھوڑی والا مہر سنگھ، دیپو اور دلدار سنگھ — اپنے طور طریقے اور انداز گفتگو میں صحیح اور قابل یقین ہیں۔ ان کی اپنی عادتیں، طبیعتیں، مزاج کی کیفیتیں ہیں اور ایک کردار گفتگو میں دوسرا نہیں بن جاتا۔ مگر ہم ان کے متعلق کوئی گہرا علم حاصل نہیں کرتے (ایک رومانس میں یہ غیر ضروری ہے)۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے یہ نفسیاتی ناولٹ نہیں، نہ ہی یہ کرداروں کا ناول ہے، لیکن ماجھے کی ایک جذباتی محبت اور انتقام کی رومانس کی حیثیت میں یہ اول درجے کا ہے اور میں اس میں کوئی نقص نہیں پاتا۔ یہ کہانی پڑھنے میں مصنفہ کا ایک دن کو دیکھا ہوا سپنا لگتی ہے، لیکن کیسا حیرت ناک رنگارنگ سپنا! نثری تصویروں کی خوبصورتی اپنی چمک دمک چھوڑ جاتی ہے اور کہانی کا ذہن سے وابستہ ہوجانے والا تاثر ہے۔ دیہاتی زندگی کی مختلف کیفیتوں کی اتنی اچھوتی رنگین منظر کشی اردو کی چند ہی کتابوں میں مل سکے گی۔ مصنفہ کا انداز بیان موضوع سے مکمل طور پر مطابقت رکھتا ہے اور ہندی اور پنجابی الفاظ جہاں بھی آتے ہیں، تحریر میں ایک نیا رچاؤ لے آتے ہیں۔ کڑیے، مٹیار، نیلی ڈھوڑ، ڈونگھے ہنیرے، سون پوت جیسے پنجابی الفاظ ماجھے کے ایک رومانس میں خوبی سے سجتے ہیں اور انھیں اردو زبان میں مدغم کرلینے میں کوئی ہرج نہیں۔ ماہر القادری جیسے بزرگ جو اردو کو لال قلعے میں بند رکھنا چاہتے ہیں، اس پر بھنا اٹھیں گے، مگر زبان ایک ٹھہری ہوئی جامد شے نہیں۔ اس کے لیے بڑھنا، پھولنا اور تبدیل ہونا ناگزیر ہے۔

''آتش رفتہ'' بے جان، بے سکت، شہری لاشوں کی ایک گھسی پٹی فرسودہ سماجی کہانی نہیں۔ (ایسی سماجی کہانیاں کوئی کیوں لکھے اور کیوں پڑھے؟) یہ ایک دمکتا دل گداز رومانس ہے اور میری رائے میں ہمارے ادب کی ایک مائنر کلاسک۔

(فنون، لاہور، جولائی اگست ۱۹۶۶ء)

دیواریں

حمید کاشمیری

کتابوں کے گرد پوش ہمیشہ صاحبِ کتاب کو یونانی دیوتاؤں کی طرح اولمپیا کی دھندلی بلندیوں پر بٹھاتے ہیں اور اپنی خاص مروجہ ڈھنگ عبارت میں اس کے مکمل جینئیس ہونے کی نوید دیتے ہیں۔ گرد پوشوں کی لنکا میں ہر کوئی باون گزا ہوتا ہے۔ "دیواریں" کا گرد پوش بھی اپنا روایتی مقصدِ سخن بخوبی پورا کرتا ہے۔ مصنف کے فوٹو کے نیچے یہ ہمیں بتاتا ہے کہ حمید کاشمیری افسانہ نگاری کے شاندار قلعے کی دیواریں توڑ کر فاتحانہ طریقے سے اندر داخل ہوا ہے۔ میں اس نوجوان لکھنے والے کے قلعے سر کرنے کے متعلق تو کچھ نہیں کہہ سکتا مگر اس میں شک نہیں کہ اس نے بڑے اچھے مختصر افسانوں کی کتاب لکھی ہے۔ اس کی صلاحیت اور ہونہاری میں کلام نہیں اور سچی بات یہ ہے کہ سیدھے سادے پُر خلوص اسلوب اور ستھری تکنیک سے لکھے ہوئے یہ افسانے ان بیشتر افسانوں سے خوشگوار طور پر مختلف ہیں جو آج کل اردو میں لکھے جا رہے ہیں۔ حمید کاشمیری کی کہانیوں میں ایک تازگی ہے، نئے ڈھلے ہوئے سکے کی کھنک اور چمکیلا پن۔

اس کتاب میں اُنیس کہانیاں ہیں۔ ان میں سے وہ کہانیاں جو کراچی کی سیٹنگ رکھتی ہیں، نمبر لے جاتی ہیں اور وہ مجھے بڑی اچھی لگتی ہیں۔ یہ کہانیاں اس ہوشربا، کلبلاتے ہوئے لاتشخص میٹروپولس (Metropolis) کی نچلی زندگی کے نہایت تیکھے، ترشے ترشائے چھوٹے مرقعے ہیں۔ حمید کاشمیری اس بغداد کا ایک حقیقی کرانیکلر ہے — غالباً سب سے ذہین اور پُر فن جو اسے پچھلے دس پندرہ سالوں میں میسر ہوا ہے۔ وہ انتشار کا شکار نہیں اور وہ کم سے کم الفاظ میں تاثر پیدا کرتا ہے۔ وہ چھوٹی، محدود تصویر جو وہ دکھانا چاہتا ہے، اس کے تخیل اور احساس کی روشنی اُسی کو روشن کرتی ہے اور ارد گرد کی تصویریں اور نقوش تاریکی میں رہتے ہیں۔ میری رائے میں یہ فن ہے اور بڑا قابلِ تعریف فن۔ ایرانی کیفوں، چھوٹی کتابوں کی دکانوں، روشن ٹیکسیوں، اونچی پتھریلی عمارتوں کی رُومانس اُن کراچی کے مرقعوں میں زندہ ہو جاتی ہے۔ تنہا، غریب، روندے ہوئے آدمی اس پتھر کے وسیع جنگل میں اپنی روزی اور زندگی کے لیے نبرد آزما ہیں۔

Scanned with CamScanner

ان کہانیوں میں ایک کہانی جو مجھے اچھی لگی ''شاہزادی'' ہے۔ میں نے اسے پہلے پہل پڑھا تو وہ مجھے کچھ کچھ جذباتی اور رومینٹک محسوس ہوئی۔ پھر جب میں نے پروفیسر ممتاز حسین کا پیش لفظ پڑھا تو مجھے معلوم ہوا کہ حمید کاشمیری ایک چھوٹا بک سیلر ہے اور پیومنٹ پر ایک ولایتی میگزینوں اور پیپر بیکس کے کیاسک (kiosk) میں بیٹھتا ہے۔ یہ سوانح عمری معلوم کرنے کے بعد میں نے ''شاہزادی'' کو دوبارہ پڑھا اور اب اس کے معنی ہی کچھ اور تھے۔ یہ ایک خوبصورت کہانی ہے اور دمک چھوڑ جاتی ہے۔ ''بندگلی'' کراچی کے غنڈوں، پٹھان چوکیداروں اور ایک ایرانی کیفے کے متعلق ہے اور میری رائے میں اسے ہیمنگوے کی کہانی The Killers کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے۔ یہ کہانی اپنے کرداروں کے حقیقی رنگ روپ، اپنی ڈرامائی کیفیت، اپنی اندوہناکی میں تقریباً مکمل ہے — اس میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں جس کے متعلق احساس ہو کہ وہ وہاں نہ ہونا چاہیے۔ ''خودکشی''، ''زیرِ تعمیر''، ''آپ کو کہاں جانا ہے'' سب کراچی کی زندگی کے مرقعے ہیں اور کافی جاندار۔ حمید کاشمیری نے اسی شہر میں مایوسی اور تنہائی کاٹی ہے، روزی کے لیے جدوجہد کی ہے، اپنے بھائی بندوں کا ہمدردی اور محبت سے مطالعہ کیا ہے۔ وہ خوش قسمت ہے کہ الفنسٹن اسٹریٹ میں اس کی چھوٹی سی بک شاپ ہے، اور وہ اس لیے بھی خوش قسمت ہے کہ وہ اتنے حساس، غیر مرئی انداز میں سوچ اور لکھ سکتا ہے۔

ممتاز حسین نے اپنے ''پیش لفظ'' میں کہا ہے کہ مصنف کو ابھی اپنی زبان پر پوری قدرت حاصل نہیں۔ میں ان سے اس حد تک ضرور متفق ہوں کہ حمید کاشمیری کی زبان اتنی زیادہ صاف اور منجھی ہوئی نہیں اور ان کہانیوں میں بعض جگہ خام طرزِ بیان کے ٹکڑے آ جاتے ہیں — مگر پھر کیسا حساس، پُرخلوص، پُرفن لکھنے والا وہ ہے، اور کتنی محبت کے قابل شخصیت اس کی کہانیوں میں ابھرتی ہے! میری رائے میں وہ ایک سچا لکھنے والا ہے، ایک فیک نہیں۔ (ہمارے ادب میں اتنے سارے فیک ہیں جو اصل احساس اور انسانی محبت سے نہیں لکھتے اور صرف عبارت آرائی کرتے ہیں۔)

اب جب میں کراچی گیا تو اس اچھے اور حساس انسان کے ولایتی رسالوں کے کیاسک پر ضرور جاؤں گا۔ مجھے اس کی پروا نہیں کہ اسے ابھی زبان پر عبور حاصل نہیں ہوا، وہ لکھ سکتا ہے اور یہ ایک بڑی چیز ہے — بلکہ سب کچھ ہے۔

(فنون، لاہور، جولائی اگست ۱۹۶۶ء)

بجنگ آمد

کرنل محمد خاں

ادب کا مقصد ہمیں زندگی کے تنوع، اس کی رنگا رنگی، اس کی شادمانی اور اس کے اندوہ سے دوچار کرنا ہے۔ اس کا مقصد ہمیں ہنسانا اور رُلانا اور ہمیں یہ احساس دلانا ہے کہ کوئی شخص اپنے آپ میں ایک جزیرہ نہیں ہوتا بلکہ یہ کہ اپنے احساسات وجذبات میں ہم سب ایک دوسرے کے اعضا ہیں۔ ادب کا مقصد یقیناً ہمیں کسی خاص مسلک یا عقیدے کو اپنانے کی تبلیغ کرنا نہیں۔

میں آغاز ہی میں اس بحث کو اس لیے لے بیٹھا ہوں کہ میں محسوس کرتا ہوں کہ آج بھی ادب اور غیر ادب میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔ بے شمار لوگوں کے لیے وہ سب کچھ جو ڈائجسٹوں میں چھپتا ہے 'ادب' ہے اور نسیم حجازی کے ناول 'ادبِ عالیہ'۔ اس کے برعکس جب ایک ادبی مجلّے میں عباس رضوی کی کہانی ''لے پیویں گے'' شائع ہوتی ہے تو کوئی اس کا نوٹس تک نہیں لیتا۔ یہ ننھی سی شاہکار کہانی اُردو کے سب ضخیم اسلامی تاریخی ناولوں پر جواب تک لکھے گئے ہیں، بھاری ہے، اور اس کے باوجود مجھے یقین ہے کہ کوئی تنقید نگار اردو افسانے پر تنقید کرتے وقت اسے درخورِ اعتنا نہیں سمجھے گا۔ یہ سچ ہے کہ اس ملک میں کوئی ادب کی دوکوڑی جتنی پروا بھی نہیں کرتا۔ کسی کو پڑھنے سے دلچسپی ہے نہ لکھنے سے۔ اردو لکھنے والوں کو کسی قدر عجیب خبطی قبیل کی مخلوق سمجھا جاتا ہے جو صرف اپنا وقت ضائع کرنا جانتے ہیں۔ اچھی کتابیں برسوں میں بھی نہیں بک سکتیں کیونکہ تعلیم یافتہ لوگ کالج یا یونیورسٹی سے باہر آنے کے بعد روزانہ اخبار اور ڈائجسٹوں کے علاوہ کچھ اور پڑھنا گناہ سمجھتے ہیں۔ خلاصوں اور فرہنگوں کی مدد سے پڑھی ہوئی چند ادبی کتابیں ان کا کل ذہنی سرمایہ ہوتی ہیں۔ یہ فرضی تعلیم ان کے تخیل کو بھڑکانے اور صحیح ادبی ذوق پیدا کرنے کی بجائے ان کی ذہنی صلاحیتوں کو ہمیشہ کے لیے کند کر دیتی ہے۔ کالج کے کلاس روم میں 'ادب' سے تھوڑی بہت شناسائی ان کے لیے کافی ہوتی ہے اور تحصیلِ علم کے بعد وہ ایک ادبی کتاب کی شکل ہی سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ کیا یہی تعلیم ہے جس پر تعلیم داں اتنا زور دیتے ہیں اور جس کو سیاسی بے شعوری سے لے کر طفلانہ بے راہ روی تک کا تریاق گردانا جاتا ہے؟ کیا یہ تعلیم فیک (fake)

نہیں جس کے بغیر ہم موجودہ حالت سے ہزار درجہ بہتر ہوں گے؟

کرنل محمد خاں کی کتاب ''بجنگ آمد'' کو شکرانے اور انتہائی مسرت کے ساتھ پڑھتے ہوئے مجھے اکثر یہ خیال آتا رہا کہ ہمارے پڑھے لکھے لوگوں میں سے کتنے اس سے صحیح طور پر لطف اندوز ہوں گے؟ کتنوں کو اس انوکھی نادر کتاب کی خوبیوں کا احساس ہوگا؟ ایسی کتابیں اول تو ہمارے معاشرے میں تقریباً ناپید ہیں۔ کوئی انھیں نہیں لکھتا، اور اس سلجھے ہوئے، شگفتہ، منجھے اسلوب میں تو مطلقاً نہیں لکھتا۔ اس فوجی کے طرزِ بیاں میں ایک ایسی قدرتی کیفیت ہے جس پر ہمارے بہترین لکھنے والے رشک کر سکتے ہیں۔ یہ مکمل طور پر دل و دماغ کو مسخر کر لیتی ہے۔ ''بجنگ آمد'' ایک نیم لفٹین کی فوجی زندگی کی داستان ہے۔ سوانح اور سفری تاثرات اور کھلنڈرے پن کا اتنا کھلتا ہوا امتزاج کہ اسے شروع کر کے بیچ میں چھوڑنا آسان بات نہیں۔ اور جب آدمی اس کے اختتام پر پہنچتا ہے (اور اس آخری کلپانے والے فقرے پر: ''یہاں سے ایک اور داستان کا آغاز ہوتا ہے'') تو وہ اتنے اچھے اور پُرمذاق ساتھی سے اتنی جلدی جدا ہو جانے پر رنج محسوس کرتا ہے۔ میں نے اس کتاب کو اول تا آخر ایک نشست میں پڑھا اور اس سارے عرصے میں اکتاہٹ یا کوفت کا ایک لمحہ بھی نہ آیا۔ ختم کر چکنے کے بعد میں نے چاہا کہ کاش یہ کتاب اس سے دگنی لمبی ہوتی جتنی کہ یہ اب ہے، اور میرے دل میں اس دوسری داستان کو پڑھنے کے لیے جس کی مصنف نے خوش خبری دی تھی، ایک بے تابی کا احساس پیدا ہوا۔ اردو میں پچھلے پندرہ بیس برسوں میں کم ہی ایسی کتابیں شائع ہوئی ہیں جن کے متعلق میں یہ کہہ سکتا ہوں اور جنھوں نے میری 'اور کے لیے ہوس' کو اس قدر تیز کیا ہو۔ یہ ایک ٹور ڈی فورس (tour de force) ہے، بے حد چمکیلا، دلچسپ، پُرظرافت اور بے دم کر دینے والا تماشا۔

کیا میں اس کتاب کو بہت چڑھا رہا ہوں؟ میرے خیال میں بالکل نہیں۔ اردو میں اول تو اس نوع کی کتابیں ہیں ہی کتنی؟ تم ان کو انگلیوں پر گن سکتے ہو۔ میرے ذہن میں دو تین ہی اس وقت آتی ہیں۔ ایک ''داستانِ غدر'' تھی جو دلی کے ایک مغل شاہزادے کی خود نوشت آپ بیتی ہے اور جسے لاہور اکادمی نے چھاپا تھا۔ دوسری جو مجھے یاد ہے تھانیسر کے ایک سیاسی قیدی کی انڈیمان میں اسیری کی کہانی تھی۔ ان دونوں کتابوں نے مجھے مسحور کیا، لیکن ان میں قدیم رنگ اور متانت تھی اور وہ اِس زمانے میں عجائبات کے ضمن میں جگہ پاتی ہیں۔ ''بجنگ آمد'' دوسری جنگ عظیم کے ایک لیفٹیننٹ کی ذاتی، چندھیا

دینے والی کہانی ہے۔ ایک لیفٹیننٹ جو صحت مند، نارمل اور خوش ذوق ہے اور اس کے ساتھ ہی ایک اول درجے کا پُرفن داستان گو بھی۔ ہم اردو ادب کی دولت مندی، اور زرخیزی کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتے، تاہم کبھی کبھی ہمیں اپنے دامن کی تنگی کا احساس ہوتا ہے اور ہم پوچھنے لگتے ہیں کہ یہ اردو ادب کہاں ہے؟ اردو میں دو تین اچھے ناول ہیں اور بلاشبہ چند ایک اعلیٰ پائے کے مختصر افسانے جنھیں یورپی ادب کے شاہکاروں کے سامنے پیش کیا جا سکتا ہے۔ ان کو چھوڑ کر ہمارا ادبی چمن کتنا ترسا ہوا، کتنا خشک ہے۔ ہمارے سارے ادب میں ایک بھی سوانح یا سفر و سیاحت یا بیل لیٹرز (belle lettres) کی فرسٹ ریٹ کتاب نہیں جو ایک ماڈرن، سلجھے ہوئے پڑھنے والے کو مطمئن کر سکے۔ ہم ایک بھی ڈاؤٹی فریا سٹارک، تھیسیجر (Thesiger) پیدا نہیں کر پائے۔ اسٹیونسن کی ''ٹریولز وِد اے ڈنکی'' سی ایک بھی کتاب ہماری زبان میں ڈھونڈے سے نہیں مل سکتی۔ (محمد حسین آزاد ایسی کتاب شاید لکھ سکتے، اگر ان پر آخری عمر میں جنون حملہ آور نہ ہوتا۔) وہ لوگ جو یہاں ان اصناف میں طبع آزمائی کرتے ہیں، بالعموم ان کی اعلیٰ توانا روایات سے بے بہرہ ہوتے ہیں اور اسی لیے غیر دلچسپ، بے جان چیزیں لکھتے ہیں جنھیں کوئی ضعیف العقل ہی پڑھ سکتا ہے۔ ایک شخص سوانح لکھنے بیٹھتا ہے اور اپنے اور اپنے اسلاف کے کارناموں کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملانے لگتا ہے۔ ایک سفرنامہ لکھنے کا نیک ارادہ باندھتا ہے اور اس کی بجائے ایک تیسرے درجے کی گائیڈ بک لکھ ڈالتا ہے جس میں قابل دید مقامات کے تذکرے سیدھے سفری بروشرز میں سے ترجمہ کر دیے جاتے ہیں۔ جدید ادب میں ساری ذہنی اُپج لے دے کے تنقیدوں اور مقالوں پر صرف ہو رہی ہے۔ جیسا کہ شفیق الرحمٰن نے ایک دفعہ مجھ سے ہنستے ہوئے کہا، ''اردو میں ادب اتنا نہیں جتنے اس پر مقالے لکھے جاتے ہیں۔''

جس صنف اور طرز میں ''بجنگ آمد'' لکھی گئی ہے، اس میں وہ ہمارے جدید ادب میں منفرد ہے۔ انگریزی میں اس مقبول صنف میں بہت سی کتابیں ہیں اور ان میں سے چند ایک مائنر کلاسک کا مرتبہ رکھتی ہیں۔ میجر ییٹس براؤن کی ''بنگال لانسر'' ان میں ایک ہے۔ یہ کتاب جب چھپی تو فوراً ایک بیسٹ سیلر بن گئی۔ پھر اس پر طویل فراموشی کا دور آیا اور اب میں سنتا ہوں کہ یہ پھر پیپر بیک میں آئی ہے۔ ناولسٹ جان ماسٹرز کی ''بیوگلز اینڈ اے ٹائیگر'' بھی، جو کرنل محمد خاں کی کتاب کی طرح دوسری جنگ عظیم کے زمانے کی ایک ذاتی آپ بیتی ہے، ایک ناول کی طرح دلچسپ ہے۔ ونسٹن چرچل کی ''اسٹوری

آف مالاکنڈ رائفلز'' اور ''ریوروار'' بھی اسی طرح کی سوانحی تاریخیں ہیں مگر امپیریلسٹ چرچل کی پُرشکوہ فصیح نثر مزاح کے عنصر سے عاری ہے اور صرف اس کے خاص پرستار ہی اس کی کتابوں کو پڑھ سکتے ہیں۔ درجنوں اور کتابوں کا نام لیا جا سکتا ہے، کیونکہ انگریزی زبان اس خاص صنف میں بے حد مالا مال ہے۔ ''بنگال لانسر'' کو میں نے چودہ پندرہ سال پہلے پڑھا تھا، میں یہ اقرار کرتا ہوں کہ ''بجنگ آمد'' ہر لحاظ سے ییٹس براؤن کی کتاب سے بہتر کتاب ہے۔

کرنل محمد خاں اپنی کہانی بڑی خوش طبعی، بے تکلفی اور شگفتگی سے بیان کرتا ہے اور ایک ایسے منجھے ہوئے طرزِ بیان میں جس کی ایک فوجی سے توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس کی نثر سورج کی چمک اور صاف ستھری ہوا کی طرح ہے اور جب ضرورت پڑتی ہے تو اس میں خوف کا ذائقہ بھی آ جاتا ہے اور کھائی کے کنارے پر اُمڈتی ہوئی زندگی کی خوفناک خوبصورتی کا بیان بھی (کیونکہ ہمارا ایم لفٹین شمالی افریقہ کے محاذ جنگ میں رومیل سے نبرد آزما ہونے کے لیے بھیجا گیا اور دو تین دفعہ موت سے اس کی بڑی قریبی علیک سلیک ہوئی)۔ سدی رزیغ سے صولوم کی طرف پسپائی کے دوران وہ بال بال بارود سے اُڑتے ہوئے بچا اور جب ہم اس کے سارے بریگیڈ کی تباہی کا حال پڑھتے ہیں تو کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے۔ ہمیں کرنل محمد خاں کے بچ کر آنے پر خدا کا شکر بجا لانا چاہیے۔ اگر وہ مارا جاتا تو ہمارے لیے اتنی پُرمسرت کتاب کون لکھ سکتا۔

''بجنگ آمد'' میں دوسری جنگ عظیم کی بیرک لائف کی روشن، ذہن میں رہ جانے والی جھلکیاں ہیں۔ ساتھی افسروں کے تیکھے، اُستادی سے کھینچے ہوئے مرقعے، جن میں محبت اور مزاح کی رنگ آمیزی ہے، ہمیشہ مسرت دیتے ہیں۔ درشت، کھردرے کرنل بلمپ (Blump) ان صفحوں میں کبھی کبھی آ نکلتے ہیں مگر محمد خاں ہمیں ان پر خوب ہنساتا ہے۔ کس قدر humane لکھنے والا وہ ہے! اس کی کتاب خود اس کی اپنی داستان نہیں۔ یہ ان ہزاروں یم لفٹینوں کی ذاتی، اندرونی کہانی ہے جو پچھلی جنگ عظیم میں انڈین آرمی میں بھرتی ہوئے، ان کے وسوسوں، ان کے جذبات، ان کی اُمنگوں اور ان کی ذہنی اُٹھانوں کی کہانی، بناوٹ کے شائبے کے بغیر لکھی ہوئی، اور کافی تندرست مزاح کے ساتھ۔

یہ محض ایک فوجی کے جنگ کے سالوں کے لیے میمائر (memoir) ہی نہیں، ایک اوّل درجے کی مزاحیہ تخلیق بھی ہے۔ یہ مزاح استادی اور روایتی مزاح کی طرح عبارت آرائی کا محتاج نہیں۔ یہ ایک

قدرتی جھرنے کی طرح اُبلنے والا مزاح ہے۔ ''بجنگ آمد'' کو شروع کرنے سے چند دن پہلے میں نے ایولین واہ کا جنگی ناول Men at Arms پڑھا تھا۔ واہ ایک بڑا قدرتی مزاح نگار ہے اور کرنل محمد خاں کا مزاح بھی کچھ کچھ واہ کی طرح کا ہے۔ میری رائے میں Men at Arms اور ''بجنگ آمد'' ایک ہی ذائقے اور ایک ہی قسم کے ذہنی انداز کی کتابیں ہیں۔ اگرچہ ایک ناول ہے اور دوسری کہنے کو ایک میمائر، مگر ان دو کتابوں کی صداقت، ان کی قدرتی بے لاگ مزاجی کیفیت، ان کی گہری، غیر محسوس اچھائی، سانجھی ہیں۔ (اور مجھے جس طرح کچھ کچھ شک ہے کہ Men at Arms کا پیٹر کروشنک خود ایولین واہ ہے، اس طرح یہ ناول بھی تھرڈ پرسن میں ایک میمائر ہے۔)

مصنف ۱۹۴۰ء میں فوج میں بھرتی ہوا۔ بقول اُس کے، اسے نہ تو ہٹلر کی دلآزاری مقصود تھی نہ انگریز کی دلجوئی، دونوں سے اس کے مراسم دوستانہ تھے؛ صرف لفٹین بننے کا شوق تھا۔ ایک ہلکے پھلکے مفرح انٹرویو کے بعد وہ کمیشن کے لیے منتخب ہوا اور ۸ اگست کو اسے او ٹی ایس مہو میں ٹریننگ کے لیے حاضری کا تار ملا۔ لفٹینی کی شان کو ذہن میں لیے جب وہ فرسٹ کلاس کے ڈبے سے مہو کے ریلوے اسٹیشن پر اُترا تو ایک کھردرے، تین پٹیوں والے گورے سارجنٹ نے اسے اور چند اور دوسرے ہم جنس حضرات کو ایک قطار میں کھڑا کیا اور ''ایک دو تین بولو!'' کا حکم دیا۔ نوجوان محمد خاں اور اس کے ساتھیوں کو اس سلوک کی توقع نہ تھی۔ انھیں کچھ اس قسم کا خیال تھا کہ فوجی بینڈ سے ان کا استقبال ہوگا۔ نو مہینے کی سخت ٹریننگ کے بعد ایک دن لفٹینی کا حکم آ ہی گیا اور کندھے پر پھول جگمگانے لگے۔ اس کی پوسٹنگ پشاور ڈسٹرکٹ سگنلز میں ہوئی، جہاں پہلے ہی روز ریڈیو پر اردو گانے سننے اور ایڈجوٹنٹ سے ایک قدرے معصوم سوال کرنے پر وہاں کے بلمپ اس سے کشیدہ خاطر ہو گئے۔ ان بلمپوں نے دس پندرہ دن کے بعد ہی اسے بنوں کی طرف فقیر ایپی کے خلاف لڑنے کے لیے چلتا کیا۔ اصل وجہ یہ تھی کہ لیفٹیننٹ ٹام کے بغیر، جو فقیر ایپی کی سرکوبی کرنے والے ٹوپی کالم میں تھا، ان بلمپوں کی برج کی چوکڑی پوری نہ ہوتی تھی اور وہ ٹام کو کسی طرح واپس بلانا چاہتے تھے۔ اپنے بیرے شیر باز کے ساتھ جب وہ میران شاہ پہنچا تو لال اور لمبی مونچھوں والا ٹام پہلے ہی اس کا منتظر تھا۔ ٹام اسے دیکھتے ہی بولا، ''قصور تمھارا ہے، تمھیں برج آنی چاہیے تھی۔'' ٹام برج کی چوکڑی پوری کرنے پر پشاور چل دیا اور محمد خاں بریگیڈ کے ہمراہ فقیر ایپی کا قرب حاصل کرنے کے لیے دتا خیل روانہ ہو گیا۔ کچھ دن کی سرحدی قبائلی جنگ کے بعد

Scanned with CamScanner

اسے وائرلیس پیغام پہنچا کہ ''پشاور پہنچو، تمھاری جگہ ٹام آرہا ہے۔'' جب وہ پشاور پہنچا تو بلمپوں نے اسے سمندر پار جانے کا حکم سنایا۔ اس کے دوست جان وائٹ نے اسے کہا، ''یہ ان سارجنٹوں کی سازش ہے۔ سمندر پار دراصل ٹام کو جانا چاہیے تھا۔ وزیرستان کی لڑائی اب ختم ہونے والی ہے۔ دو دن کے لیے ٹام کو وہاں بھیج دیا ہے۔ وہ کل پرسوں آجائے گا اور یہ مزے سے برج کھیلیں گے۔''

محمد خاں پشاور سے بمبئی پہنچا، جہاں وہ کچھ دن ٹرانزٹ کیمپ میں رکھے جانے کے بعد ایک جہاز میں سوار کر دیا گیا۔ جہاز کی منزلِ مقصود ''ٹاپ سیکرٹ'' تھی لیکن ہر ایک کو جلد ہی معلوم ہو گیا کہ وہ بصرہ جا رہے ہیں۔ ایک صبح وہ جاگا تو جہاز بصرے کی بندرگاہ میں لنگر ڈالے ہوئے تھا۔ بصرے نے نوجوان لیفٹیننٹ کو کافی مایوس کیا۔ الف لیلہ کی رومان انگیز سرزمین میں اس کی نظر ایک نوٹس بورڈ پر پڑی: ''سامان پر نگاہ رکھیں اور چوروں سے خبردار رہیں...'' مگر یہ ایک لمبی داستان ہے۔ بصرے سے شائبہ کیمپ اور پھر حبانیہ کیمپ، وہاں سے صحرائے کیارہ۔ ہمارا نیم لفٹین کچھ دن بغداد کی رنگینیوں سے بھی بہرہ ور ہوا۔ موصل سے اس کا بریگیڈ طبرق کی سمت روانہ ہوا جہاں جنرل رومیل ان کی مزاج پرسی کے لیے انتظار کر رہا تھا۔

لیکن، جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، یہ ایک جنگ کی کتاب (وار بک) نہیں ہے۔ یہ نیم لفٹین محمد خاں کی اپنی پرکشش داستان ہے اور توپوں کی باڑ اور ٹینکوں کی گرج میں بھی اس کی باچھیں کھلی رہتی ہیں۔ میری نظر سے کبھی کوئی ایسی وار بک نہیں گزری جس میں اتنے ناقابل فراموش human واقعاتی ٹکڑے ہوں اور اتنا خوش طبعانہ مزاح۔ یہ ٹکڑے اس کتاب میں جا بجا بکھرے پڑے ہیں۔ کیڈٹ ارجن سنگھ اور اس کا کرنل شراب میں دُھت اور ایک دوسرے کے گلے میں باہیں حمائل کیے ناچتے ہوئے؛ کپتان راجندر سنگھ بتالیہ کبھی اپنی آرمرڈ کار اور کبھی ٹینک میں شائبہ کیمپ سے بصرہ کیبرے دیکھنے کے لیے جاتا ہوا (اس نے فردِ جرم لگنے پر اپنی صفائی میں کورٹ کے سامنے یہ بیان دیا کہ وہ ٹریننگ پر جا رہا تھا اور کیبرے پر غلطی سے جا پہنچا کیونکہ اس کے قطب نما میں خرابی تھی)؛ سکھ سپاہی رم لنڈھانے کے بعد ڈھولک اور چمٹے کی تال پر ''تیری لونگ دا پیا لشکارا تے ہالیاں نے ہل ڈک لئے'' گاتے ہوئے؛ صولوم کی طرف پسپائی کے دوران چند من چلے پنجابی مزے سے چائے کی کیتلی رکھے، ماہیا الاپتے ہوئے، جیسے کوئی جنگ نہ ہو اور وہ اپنے گراں کی چوپال میں بیٹھے ہوں۔ ایسی funny اور ہیومن اور پرسوز کہانیاں

اس کتاب میں بہت سی ہیں۔ آدمی کس کا ذکر کرے اور کس کو چھوڑے۔

''بجنگ آمد'' ایک سرخ اور نیلے دیدہ زیب گرد پوش میں آئی ہے اور ایک اُلٹی رکھی ہوئی آہنی فوجی ٹوپی کی تصویر کے ساتھ جس میں سپاہی کی محبوبہ کی تصویر جھانک رہی ہے۔ یہ وِنڈائک پر نہایت خوبصورت چھپی ہے۔ یہ جنگ کی کہانی ہے، مگر زندگی کی باتیں کرتی ہے۔

اور اب لفٹین محمد خاں! تمھاری اگلی داستان ہمیں کب پہنچے گی؟ خدا کے لیے لکھتے رہو، لکھتے رہو۔ ہماری بھوک کبھی نہیں مٹے گی۔

(فنون، لاہور، دسمبر ۱۹۶۶ء)

نئے ناولوں کی کھیپ

دودِ چراغِ محفل (ذکاء الرحمٰن) کیا وہ ناچ رہی تھی؟ (عثمان علیم) قربانی (مہدی علی صدیقی) دیدۂ تر (عابدی جعفر) انکار (عابدی جعفر) نوشاد (ایک معاشرتی ناول) (انجم پرواز) داغوں کی بہار (اختر سلیمی) اور بہت سے دوسرے ناول جو چھپ چکے یا چھپنے والے ہیں۔

ہمارے نوجوان، امنگ رکھنے والے ناولسٹوں میں کیا خرابی ہے؟ آخر اتنے بُرے ناول ــــ ٹرالوپ کے الفاظ میں ''لکڑی کے ناول'' ــــ کیوں لکھے جاتے ہیں؟ کیا یہ عجیب نہیں کہ اردو میں پچھلے پندرہ بیس برس میں صرف ایک دو ناول ایسے لکھے گئے ہیں جنھیں صحیح معنی میں ناول کہا جا سکتا ہے اور جن کے کردار جیتے جاگتے اور قابلِ یقین لگتے ہیں؟ کسی نے لکھا ہے کہ ہر شخص میں ایک ناول ہے، لیکن ہر کوئی ناول نہیں لکھ سکتا۔ ناول لکھنے کے لیے زندگی کا وسیع، گوناگوں تجربہ، زرخیز اور گہری قوتِ تخیل، فراواں تخلیقی جودت اور کہانی کہنے کی قدرتی صلاحیت ضروری ہیں، اور بہت تھوڑے لوگ ان صفات کو حاصل کر پاتے ہیں۔ کوئی صرف خواہش کرنے سے موپاساں، طالسطائی یا ہارڈی نہیں بن سکتا۔ ہم سب البتہ اپنے نام کو جلی حروف میں ایک کتاب کے سرورق پر چھپا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہم سب ابدی حیات پر اپنی کمند ڈالنا چاہتے ہیں تاکہ ہم سے بعد میں آنے والے یہ جان سکیں کہ ہم بھی کبھی اس راستے پر سے گزرے

ہیں۔ ہمارے ناولسٹوں کے ساتھ یہی مصیبت ہے — وہ ادبی آسمان پر تارے بن کر بھڑکنا چاہتے ہیں اور اس خواہش سے تلملائے جاتے ہیں کہ ادب کے شہسواروں میں ان کا شمار ہو۔ مجھے اس خواہش سے پوری ہمدردی ہے۔ میں نے بھی اپنے خوابوں میں موپاساں سے ڈوئلیں لڑی ہیں اور اسے گھائل کیا ہے، میں نے بھی اپنا نام کئی شاہکاروں کی جلدوں پر سونے کے حروف میں دمکتا ہوا دیکھا ہے، مگر خواہش سے مراد تکمیل نہیں۔ سالوں کی اذیت کوشی کے بعد میں حقیقت کی اس کڑوی گولی کو نگل سکا کہ میں ناولسٹ نہیں بن سکتا، کہ میری قسمت میں روشنیوں کے نیچے اسٹیج پر ظاہر ہونا نہیں لکھا، بلکہ یہ کہ میں ان گیلری میں بیٹھے ہوئے ہزاروں تماشائیوں میں سے ہوں جو تالیاں پیٹتے اور واہ واہ کر کے تماشے سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس حقیقت کو جاننے کے بعد میں اپنے تماشائی کے رول پر قانع ہو گیا اور مزے کی نیند سونے لگا۔

مگر یہ سچ ہے کہ تمنا کے بغیر کوئی منزل پر پہنچ بھی نہیں سکتا۔ اس لیے میں ان ناولسٹوں کے ورود کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ ان کی امنگ کی میرے دل میں قدر ہے۔ ان کے ناول خاصے بُرے اور جھوٹے اور بناوٹی ہیں، مگر اس میں حرج ہی کیا ہے؟ ناول لکھنا ایک معصوم، بے ضرر شغل ہے اور اس سے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ اگر ناول بُرا یا غیر دلچسپ ہے تو تم اسے ٹھپ کر سکتے ہو اور اپنے آپ کو بہلانے کے لیے کچھ اور کر سکتے ہو۔ ایسا کرنے سے ناول لکھنے والے کے جذبات کو ٹھیس لگنے کا بھی کوئی خدشہ نہیں، اسے یہ پتا نہیں چل سکتا کہ سیکڑوں میل دور ایک پڑھنے والے نے اس کے عظیم الشان ناول کو لائق توجہ نہیں جانا۔ اور اگر اسے کسی طرح یہ پتا بھی لگ جائے تو وہ یقیناً تمھاری کور ذوقی پر دستِ تاسف ملے گا۔ اسے یہ گمان بھی نہ ہوگا کہ اس نے بُرا ناول لکھا ہے۔ سب ناول ان کے لکھنے والوں کے نزدیک شاہکار ہوتے ہیں۔ اس طرح ناول نویس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ اس کا نام ناول کے سرورق پر سرخی میں اپنی آب و تاب دکھاتا ہے اور وہ خوشی سے پھولا نہیں سماتا۔ میرا خیال ہے، ہیو والپول نے کہا ہے کہ ناول لکھنا، خواہ برا ناول لکھنا، اعصابی تشنج کے لیے مفید ہے اور پانچ فل اسکیپ صفحے لکھنے کے بعد آدمی ایک مطمئن ضمیر کے ساتھ سو سکتا ہے۔

میرا ان ناولسٹوں سے جھگڑا یہ ہے کہ اگر انھیں ناول لکھنا ہی تھے تو وہ مختلف قسم کے ناول لکھتے۔ انھوں نے وہی رومانی، سماجی اور جنسی زمین روندی ہے جو ہزار بار پہلے روندی جا چکی ہے۔ میں نہیں سمجھتا

ایسا کرنے میں انھیں کیا لطف ملا ہوگا، اور جب کسی چیز میں کوئی لطف نہ ہو تو آدمی اسے کیوں کرے۔ انھیں پٹے ہوئے تاریک راستے سے ہٹ کر اردگرد سبز جنگلوں میں بھٹکنا چاہیے تھا، جہاں وہ درختوں میں پرندوں کو گاتے اور گلہریوں کو پھدکتے دیکھتے...اور اس میں بھی کوئی حرج نہ تھا اگر وہ اپنے کرداروں کو عام نارمل انسانوں کی طرح بولنے چالنے دیتے، اور اتنے ادبی ہونے کی صریحاً کوشش نہ کرتے۔ اگر تمھیں ایک کہانی کہنی ہے تو اسے سادگی سے، صفائی سے اور قدرتی طریق سے کہو، جیسا کہ بوڑھا میرامن کہتا ہے۔ اگر کہانی کہے جانے کے لائق ہے تو پھر وہ پڑھنے والے کو گرفت میں لے لے گی، مگر اس میں شاعرانہ ارغوانی ٹکڑے ٹانکنا، دور از کار تشبیہیں ڈھونڈ کر جڑنا اور فلسفیانہ موشگافیاں بگھارنا اسے ناقابلِ برداشت اور جھوٹا بنا دے گا۔

ذکاء الرحمٰن کے ناول کو لو۔ یہ بڑے دیدہ زیب ٹائپ میں چھپا ہے اور مجھے اس کی جلد کافی پسند آئی۔ جلد کے اندر جو کچھ ہے وہ مبتدیانہ بافت سازی ہے — ایک ناقابلِ یقین کہانی، کردار سب الٹ پلٹ اور کوئی فقرہ ایسا نہیں جس سے کھرے ہونے کی کھنک آئے۔ اس ناول کے متعلق ہر چیز جھوٹی ہے۔ میں نے اسے بڑی جھنجھلاہٹ سے پڑھا اور ذکاء الرحمٰن کو اچھے خاصے کوسنے دیے۔ مجھے امید ہے کہ اگلی بار وہ بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرے گا، اُس ماحول کے بارے میں لکھے گا جس میں وہ پلا بڑھا ہے اور جسے وہ جانتا ہے، اور اپنے بیان کو نقلی کرب اور سستے جذبات سے بوجھل نہیں کرے گا۔ اس کی خواہش توانا لگتی ہے لیکن اپنے نام کو سرورق پر دیکھ لینے کے بعد اسے اب ادبی شہرت پیدا کرنے کے لیے بے تابی سے کام نہ لینا چاہیے۔ اسے ابھی کافی دور چلنا ہے۔ اگر وہ حقیقی چیز لکھنا چاہتا ہے تو اسے اس فن کی ابجد ایک طالب علمانہ لگن سے سیکھنی ہوگی اور مغربی کلاسیکی اور جدید ناولوں کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔ لکھنا اتنا آسان نہیں جتنا ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ہے۔ جیسا کہ اسٹیونسن نے کہا ہے، لگن ایک ڈھلانی پہاڑی پر چڑھنے کی طرح ہے، بے حد صبر آزما اور مشقت طلب کام، اور لکھنے والے کے لیے اتنی کھوئیں اور گڑھے جابجا آتے ہیں جن میں اس کے اوندھے منھ گر پڑنے کا ہمیشہ خطرہ رہتا ہے۔

دوسری کتابوں کے متعلق میں کچھ نہیں کہوں گا مگر چونکہ میں نے اسٹیونسن کا ذکر کیا ہے سو میں اس بڑے اور ناقابلِ تقلید کہانی کہنے کی لازوال رومانس کے آغاز کے باب کا ترجمہ دینا چاہوں گا۔ اس نمونے سے کہانی کہنے کے فن کے بارے میں بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے اور مجھے سارے انگریزی ادب

میں اس باب سے بہتر کسی ناول کا آغاز نہیں ملا۔ کاش سماجی اور جنسی خرافات کے بجائے سارے نئے ناولسٹ ہمیں Kidnapped جیسے ناول دیں۔ ہمیں بہار کے تازہ جھونکوں اور چمکیلی دھوپ کی ضرورت ہے اور قطبی روشنیوں کی۔ ہم ایسی کتابیں چاہتے ہیں جو پہلے فقرے سے ہمیں اپنے دام میں لے لیں، جن پر ہم ندیدے پن سے پل پڑیں، جو ہمیں اپنے آپ سے باہر لے جائیں۔ حقیقتاً کوئی بھی ناول کی شکل میں ناپختہ فلسفہ، فرائڈ کی تحلیل نفسی یا اخلاقی و معاشی پند و نصائح نہیں چاہتا، اور جو ناول پڑھنے والے کو یہ بتانے کے لیے لکھے جاتے ہیں کہ مصنف کے سوشلزم، تمدنی اور سیاسی مسائل، جنسی محبت اور فن کے تقاضوں کے بارے میں کیا خیالات ہیں، لفظ کے اصل معنی میں ناول ہوتے ہی نہیں۔ آلڈس ہکسلے نے ایسے ناول اپنی پوری ذہانت اور طبیعت کی براقی کو بروئے کار لا کر لکھے، اور گو ان کے خیالات نے ایک وقت میں ایک پوری نسل کے طرز فکر اور اخلاقی نظریے کو متاثر کیا مگر وہ اب بطور ناول مر چکے ہیں۔ ممکن ہے وہ کچھ مدت اور فلسفیانہ یا سماجی رسائل کی حیثیت میں پڑھے جاتے رہیں، مگر وہ ناول نہیں ہیں کیونکہ ان کے لوگ عام لوگوں کی بجائے مخصوص رنگ کے ذہنی اور فکری اندازوں کے علامتی اجسام ہیں۔ بوڑھے میر امن کی ''چہار درویش'' یا اسٹیونسن کی ''کڈنیپڈ'' اس وقت بھی زندہ رہیں گی اور ہمارے دلوں کو لبھاتی رہیں گی جب کئی موٹے، فصیح و بلیغ اور بھڑک دار فنی شاہکار کبھی کے بھلائے جا چکے ہوں گے۔

اور یہ ہے کہ کڈنیپڈ کا پہلا باب:

کڈ نیپڈ
(پہلا باب)

میں شاز کی حویلی کو اپنے سفر پر روانہ ہوتا ہوں:

میں اپنی قسمت آزمائیوں کی کہانی کا آغاز ۱۷۵۱ء کے بابرکت سال کے ماہ جون کی ایک خاص صبح سے کرتا ہوں جب میں نے آخری بار اپنے باپ کے دروازے میں سے چابی نکالی۔ میں سڑک پر تھوڑی دیر ہی چلا ہوں گا کہ سورج پہاڑیوں کی چوٹیوں پر دمکنے لگا اور میرے پادری کے مکان پہنچتے پہنچتے بلیک برڈ (پرندے) باغیچے کے بنفشی پودوں میں سیٹیاں بھر رہے تھے اور کہرا جو پو پھٹنے کے وقت وادی کے گرد اترا تھا، اٹھنا اور بکھرنا شروع ہو گیا تھا۔

Scanned with CamScanner

مسٹر کیمبل، ایسڈین کا پادری، باغ کے پھاٹک پر کھڑا میرے انتظار میں تھا۔ اچھا آدمی! اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں نے کچھ کھایا پیا ہے اور یہ سننے کے بعد کہ میں سب انتظام کر کے چلا ہوں، اس نے میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور اسے شفقت سے اپنے بازو کے نیچے دبا دیا۔

''اچھا تو ڈیوی لڑکے،'' اس نے کہا، ''میں تمھیں رستے پر لگانے کے لیے تمھارے ساتھ فورڈ تک چلوں گا۔''

اور ہم خاموشی سے آگے چلنے لگے۔

''کیا تمھیں ایسڈین چھوڑنے کا افسوس ہے؟'' اس نے تھوڑے عرصے کے بعد کہا۔

''جناب، سچ یہ ہے،'' میں نے کہا، ''کہ اگر میں یہ جانتا ہوتا کہ میں کہاں جا رہا ہوں اور میرا کیا بنے گا، تو میں آپ کو صاف صاف بتا دیتا۔ ایسڈین بلاشبہ ایک اچھی جگہ ہے اور میں یہاں بڑا خوش رہا ہوں لیکن پھر یہ بات بھی تو ہے کہ میں اب تک کہیں اور نہیں گیا۔ چونکہ میرے باپ اور میری ماں دونوں مر چکے ہیں، میں ان سے ایسڈین میں اس سے زیادہ نزدیک نہیں ہوں گا جتنا ہنگری کی سلطنت میں۔ اور سچ کہوں کہ اگر مجھے یہ پتا ہوتا کہ جہاں میں جا رہا ہوں، وہاں مجھے اپنے حالات کو بہتر کرنے کا موقع ملے گا تو میں عیش و مسرت سے جاتا۔''

''ہاں!'' مسٹر کیمبل نے کہا، ''بہت اچھا ڈیوی لڑکے! اور اب یہ میرے لیے مناسب ہے کہ تمھیں تمھاری قسمت پر مطلع کر دوں، یعنی اس حد تک جتنا میں کر سکتا ہوں۔ جب تمھاری ماں اٹھ گئی اور تمھارا باپ (وہ رحم دل پارسا آدمی) اپنی آخری بیماری میں مبتلا ہو گیا، اس نے مجھے ایک خاص خط سونپا جس کے بارے میں اس نے کہا کہ تمھارا ورثہ ہے۔ 'جونہی'، اس نے کہا، 'میں رخصت ہو جاؤں اور گھر صاف ہو چکے اور اسباب وغیرہ ٹھکانے لگ جائے (اور ڈیوی، یہ سب کچھ ہو چکا ہے) اس خط کو میرے لڑکے کے ہاتھ میں دے دو اور اسے شاز کی حویلی کی طرف روانہ کر دو جو کریمانڈ سے زیادہ دور نہیں ہے۔ وہی جگہ ہے'، اس نے کہا، 'جہاں سے میں آیا تھا اور مناسب یہی ہے کہ میرا لڑکا وہیں لوٹ جائے۔ وہ ایک مستقل مزاج لڑکا ہے'، تمھارے باپ نے کہا، 'اور ایک ہوشیار راہرو، اور مجھے یقین ہے کہ وہ سلامت رہے گا اور جہاں کہیں بھی جائے گا لوگ اسے پسند کریں گے۔'''

''شاز کی حویلی!'' میں چلایا۔ ''میرے غریب باپ کا بھلا شاز کی حویلی سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟''

Scanned with CamScanner

''نہیں،'' مسٹر کیمبل نے کہا، ''اس کے بارے میں کوئی یقین سے کیا کہہ سکتا ہے؟ لیکن اس کنبے کا نام، ڈیوی لڑکے، وہی ہے جو تمھارا ہے۔ شاز کے بالفور ——ایک قدیم ایماندار اور باعزت گھرانہ جو شاید ان بعد کے دنوں میں تنزل پذیر ہو گیا ہے۔ تمھارا باپ بھی ایک صاحبِ علم آدمی تھا جیسا کہ اس کے مرتبے کے آدمی کے شایانِ شان تھا۔ کوئی شخص اس سے زیادہ لیاقت سے مدرسہ نہیں پڑھاتا تھا۔ اس کی وضع اور بات چیت بھی عام آدمی کی سی نہیں تھی لیکن (جیسا کہ تمھیں خوب یاد ہوگا) میں اسے اپنے مکان میں بڑی خوشی سے معزز لوگوں کو ملنے کے لیے بلایا کرتا، اور وہ جو میرے اپنے گھرانے کے تھے —— کلرینٹ کے کیمبل، ونسزار کا کیمبل اور مینیج کا کیمبل اور دوسرے سارے اچھے جانے پہچانے معزز آدمی ——اس کی صحبت میں لطف اٹھاتے۔ اب آخر میں اس سارے معاملے کے اجزا کو تمھارے سامنے رکھتے ہوئے، یہ اس کی وصیت کا خط ہے اور جس پر تمھارے جنتی بھائی نے خود اپنے ہاتھ سے بند کر کے پتا لکھا ہے۔''

اس نے خط مجھ کو دیا جس پر پتا ان لفظوں میں لکھا ہوا تھا: ''شاز کی حویلی کے ایبنز ر بالفور اسکوائر کے ہاتھوں میں یہ دستاویز یں میرا لڑکا ڈیوڈ بالفور پہنچائے گا۔'' میرا دل اس بڑے امکانِ ترقی پر زور زور سے دھڑک رہا تھا جو ایک سترہ سالہ لڑکے کے سامنے یوں اچانک ظاہر ہو گیا تھا۔ اترک کے جنگل میں ایک غریب دیہاتی استاد کے بیٹے کے لیے یہ درخشاں مستقبل!

''مسٹر کیمبل،'' میں لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں بولا، ''اگر آپ میری جگہ ہوتے تو کیا جاتے؟''

''یقینی طور پر!'' پادری نے کہا، ''ضرور میں جاتا۔ تمھارے جیسے ہوشیار ہٹے کٹے لڑکے کو دو دن کے سفر میں کریمانڈ پہنچ جانا چاہیے (جو اڈنبرا کے پاس ہے)۔ اگر بری سے بری بات بھی واقع ہو جائے اور تمھارے یہ اونچے قرابت دار (کیونکہ میں یہ خیال کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وہ تمھارے خون سے ہیں) تمھیں دروازہ دکھا دیں تو تم دو دن اور چلتے چلتے پھر واپس آ کر 'مینس' کے دروازے پر دستک دے سکتے ہو۔ لیکن میں یہ امید کرتا ہوں کہ وہ لوگ تم سے تپاک سے پیش آئیں گے (جیسا کہ تمھارے بے چارے باپ نے تمھارے لیے پیش گوئی کی تھی) اور کیا پتا ہے کہ تم کبھی بڑے آدمی بن جاؤ۔ اور یہ، ڈیوی لڑکے، میرے ضمیر پر یہ بات پڑی ہے کہ میں اس جدائی کو بہتر بناؤں اور تمھیں اس دنیا کے خطروں سے خبردار کر دوں۔''

یہاں اس نے آس پاس بیٹھنے کی ایک آرام دہ جگہ ڈھونڈنے کے لیے دیکھا۔ آخر سڑک کے کنارے ایک برچ کے درخت کے نیچے پڑے ہوئے پتھر پر اس کی نظرِ انتخاب پڑی۔ وہ اس پر ایک بڑے پُر متانت بالائی ہونٹ کے ساتھ بیٹھ گیا اور سورج سے بچنے کی خاطر (جواب ہم پر دو چوٹیوں کے درمیان سے چمک رہا تھا) اس نے اپنی جیبی رومال کو اپنے کلغی دار ہیٹ کے اوپر ڈال لیا۔ وہاں بیٹھے ہوئے، اٹھی ہوئی انگلی سے اس نے سب سے پہلے مختلف قسم کی بدعقیدگیوں کے خلاف خبردار کیا جن کے لیے میرے دل میں پہلے ہی کوئی کشش نہ تھی، اور پھر اس نے مجھے تاکید کی کہ اپنی نمازوں اور انجیل کے پڑھنے میں کوتاہی نہ کروں۔ یہ ہو چکا تو اس حویلی کا جہاں مجھے جانا تھا، لفظوں میں ایک نقشہ کھینچا اور مجھے سمجھایا کہ اس میں رہنے والوں کے ساتھ میرا طور طریقہ کیا ہونا چاہیے۔

''عام باتوں میں، ڈیوی، نرم مزاجی دکھانا،'' اس نے کہا۔ ''یہ تم ہر دم ذہن میں رکھنا کہ اگرچہ تم اچھے گھرانے کے ہو، تمھاری تربیت ایک گاؤں میں ہوئی ہے۔ ہمیں شرمندہ نہ کرنا۔ اس بڑے لمبے چوڑے گھر میں اوپر تلے کئی نوکر ہوں گے۔ خود کو اتنا اچھا، اتنا چوکس، سمجھنے میں اتنا تیز اور بات کرنے میں اتنا کم گو ظاہر کرنا جتنا کہ کوئی اور۔ باقی رہا لیرڈ — تو یہ کبھی نہ بھولنا کہ وہ لیرڈ ہے۔ زیادہ میں کچھ نہیں کہتا سوائے یہ کہ عزت جس کا حق ہے اس کی عزت کرنا واجب ہے۔ ایک لیرڈ کی اطاعت و فرماں برداری کرنے سے دلی خوشی ملتی ہے، جو کم از کم تمھارے جیسے کو ملنی چاہیے۔''

''اچھا جناب!'' میں نے کہا، ''میں نے آپ کی باتیں پلّے باندھ لی ہیں اور میں ان پر عمل کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔''

''خوب کہا، بہت خوب!'' مسٹر کیمبل نے جان و دل سے کہا، ''اور اب کام کی باتوں سے معمولی باتوں کی طرف آتے ہوئے، میں تمھارے لیے یہ پیکٹ لایا ہوں جس میں چار چیزیں ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے بڑی دقت سے اپنے کوٹ کی حاشیے کی جیب سے کھینچ کھانچ کر کچھ برآمد کیا۔ ''ان چار چیزوں میں سے پہلی چیز تو وہ ہے جس پر قانونی طور سے تمھارا حق ہے، تھوڑی سی نقدی تمھارے باپ کی کتابوں اور فرنیچر کی فروخت کی جنھیں میں نے (اور میں نے یہ تمھیں پہلے ہی سمجھا دیا تھا) اس ارادے سے خرید لیا ہے کہ انھیں اگلے آنے والے استاد کو کچھ منافعے پر بیچ دوں۔ باقی تین چھوٹی تحفیاں ہیں جنھیں اگر تم قبول کر لو گے تو مسز کیمبل اور مجھے مسرت ہوگی۔ پہلی، جو گول ہے، تمھیں پہلی ملازمت

میں غالباً سب سے زیادہ خوش کرے گی لیکن، ڈیوی لڑکے، یہ سمندر میں ایک قطرے کے مصداق ہے۔ یہ بس ایک قدم تک ہی تمھارے کام آئے گی اور صبح کی طرح شام کے دم میں اڑ جائے گی۔ دوسری جو چپٹی شکل میں مربع ہے، جس پر کچھ لکھا ہوا ہے اور جو سڑک کے لیے ایک مضبوط لاٹھی کی طرح، اور بیماری میں تمھارے سر کے لیے ایک اچھے تکیے کی مانند، زندگی بھر میں تمھارا آسرا ثابت ہوگی۔ اور اب آخری چیز، یہ مکعب نما آخری چیز۔ میری یہ دعائیہ تمنا ہے کہ یہ تمھیں ایک بہترین زمین میں دیکھے گی۔''

یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا، اپنے ہیٹ کو اتارا۔ وہ تھوڑی دیر اونچی آواز میں دعا پڑھتا رہا اور اس کے الفاظ ایک ایسے نوجوان کے لیے جو پہلی بار دنیا میں قدم رکھنے لگا تھا، بڑے بروقت تھے۔ پھر اچانک اس نے مجھے اپنے بازوؤں میں لے لیا اور مجھے اپنے سینے کے ساتھ لگا کر خوب زور سے بھینچا۔ پھر اس نے مجھے ایک بازو کے فاصلے پر الگ کر کے پکڑے رکھا، مجھے ایسے چہرے سے دیکھتے ہوئے جس پر رنج و غم کی علامات ثبت تھیں، اور پھر وہ کوڑے کی سی تیزی کے ساتھ گھوما اور روہانسی آواز میں الوداع پکارتا ہوا اس راستے پر سے واپس چلنے لگا جس پر سے ہم آدھے دوڑتے ہوئے آئے تھے۔ کسی دوسرے کے لیے شاید یہ منظر ہنسنے کی بات ہوتی لیکن میرا دل ہنسی سے بہت دور تھا۔ میں اسے اُس وقت تک دیکھتا رہا جس وقت تک وہ نظر میں رہا، اور اس نے اپنے پورے قدم نہ روکے اور نہ ہی ایک بار پلٹ کر دیکھا۔ تب میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ میرے جانے پر یہ اس کے رنج کا اظہار ہے، اور میرے ضمیر نے مجھے چوٹ کی، کیونکہ میں دل ہی دل میں اس خاموش بستی سے باہر نکلنے، اپنے ہی نام اور خون کے امیر اور باعزت لوگوں کے درمیان بڑے معروف گھر کو جانے پر غایت درجہ خوش تھا۔

''ڈیوی، ڈیوی!'' میں نے اپنے آپ سے کہا، ''کیا اتنی ناشکری بھی کبھی کسی نے کی ہوگی؟ تم ایک نام کی چمک کے لیے سب پچھلی شفقتوں اور پرانے دوستوں کو بھول گئے، یہ کتنی شرم کی بات ہے!''

اور میں اس پتھر پر بیٹھ گیا جسے اُس اچھے آدمی نے ابھی ابھی خالی کیا تھا اور پارسل کو کھول لیا تاکہ دیکھوں کہ میرے یہ تحفے کس قسم کے ہیں۔ وہ جسے اس نے مکعبی کہا تھا اس کے بارے میں تو میرے دل میں شک نہ تھا، یقیناً یہ ایک خانے کے جزدان میں رکھنے کی ایک انجیل تھی۔ وہ جسے اس نے گول بتایا تھا شلنگ کا ایک سکہ تھا۔ اور تیسری چیز جسے زندگی بھر صحت اور بیماری دونوں حالتوں میں میرا آسرا بننا تھا، کھردرے بھورے کاغذ کا پرزہ تھا جس پر سرخ سیاہی سے یہ لکھا ہوا تھا:

Scanned with CamScanner

''وادی کے پانی کی گل سوسن بنانے کی ترکیب: وادی کے سوسن کے چند پھول لو اور انھیں ایک پوٹلی میں رکھ کر نتھار لو، اور جب ضرورت پڑے ایک دو چمچے اس کے پیو۔ زبان کے لقوے سے جن کی طاقت گویائی جاتی رہی ہو یہ اسے بحال کر دیتی ہے۔ گٹھیا میں اس کا استعمال مفید ہے، یہ دل کو ٹھنڈک پہنچاتی ہے اور حافظے کو تیز کر دیتی ہے۔ اور پھولوں کو ایک مرتبان میں ڈالو جو اوپر سے خوب بند ہو اور اسے چیونٹیوں کی ایک پہاڑی میں پورا ایک مہینہ رکھو۔ پھر اسے باہر نکالو اور تم ایک شربت مرتبان میں پاؤ گے جو پھولوں سے پیدا ہوتا ہے۔ اسے ایک چھوٹی بوتل میں رکھو۔ یہ ایک اچھی چیز ہے، خواہ اسے تندرستی میں استعمال کرے یا حالتِ بیماری میں، خواہ مرد ہو یا عورت۔''

اور پھر پادری کے اپنے ہاتھ سے یہ فقرہ بڑھایا گیا تھا:

''اسی طرح اگر موچ آجائے تو اس کی مالش کرو اور پیٹ کے درد کے لیے گھنٹے میں ایک چمچہ پینا ہر مرض دور کرتا ہے۔''

اور یقیناً میں اس پر خوب ہی ہنسا۔ لیکن میری ہنسی کچھ کپکپاتی ہوئی ہنسی تھی اور میں نے خوشی سے اپنے بنڈل کو اپنی لاٹھی کے سرے پر لٹکایا اور فورڈ کے اوپر اور پرلی طرف کی پہاڑی کے ساتھ ساتھ روانہ ہو گیا۔ جب میں اس بڑی پہاڑوں کی سڑک پر آنکلا جو سرخ ہیڈر میں سے پھیلی ہوئی جاتی ہے تو میں نے ایسڈین کے چھوٹے گرجے، پادری کے مکان کے درختوں اور گرجے کے قبرستان میں بڑے پہاڑی کووں کو آخری بار نظر بھر کر دیکھا، جہاں میرا باپ اور میری ماں سوئے پڑے تھے۔

❁

ایک ناول کا کتنا دل لبھانے والا، اور گرفت میں لے لینے والا انداز یہ ہے! کہتے ہیں، آسانی سے اور دلچسپی سے پڑھی جانے والی تحریر مشکل سے لکھی جاتی ہے اور اسٹیونسن کے بارے میں یہ بے حد سچ ہے۔ وہ ایک ایک فقرہ بے اندازہ کاوش اور محنت سے لکھتا تھا، لیکن اسے پڑھتے ہوئے کبھی اس چیز کا احساس نہیں ہوتا۔ اسلوب کی سادگی اور اس کا لوچ ہمیں اپنے ساتھ بہالے جاتا ہے اور کہانی کی دل بستگی ہمیں نہ صرف اپنی مٹھی میں لے لیتی ہے بلکہ ہمارے تخیل کو بھی دھکا دیتی ہے۔ اس ''کڈ نیپڈ'' کے آغاز میں ایک بھی بناوٹی اور جھوٹا فقرہ نہیں۔

ہمارے اُمنگ رکھنے والے ناولسٹ اگر ادبیت اور فن بگھارنے کی بجائے سیدھے سادے اور

Scanned with CamScanner

صاف لہجے میں اپنی بات کہتے تو ان کے یہ ناول یقیناً بہتر اور زیادہ پڑھنے کے لائق ہوتے۔

ہر کوئی اسٹیونسن نہیں بن سکتا۔ لیکن اگر میں اور ذکاء الرحمٰن (اینڈ کمپنی) کبھی زندگی بھر میں اس سے آدھی کتاب بھی لکھ سکے جیسی کہ ''کڈ نیپڈ'' ہے تو ہم فی الواقع خوش نصیب ہوں گے اور شاداں موت مر سکیں گے۔

(فنون، لاہور، مئی جون ۱۹۶۷ء)

رگِ سنگ

مسعود مفتی

''رگِ سنگ'' مسعود مفتی کی بھارت اور پاکستان کی سترہ روزہ جنگ کے پس منظر پر لکھی ہوئی کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ ان میں ''جنگ سے پہلے اور جنگ کے حالات'' موضوع بنے ہیں۔ آخری افسانے ''معاشرے کی دراڑوں میں جھانکتے ہیں۔'' (واوین کے توضیحی الفاظ مصنف کے ہیں۔) کتاب کا انتساب ستمبر ۱۹۶۵ء کے نام ہے۔ ذاتی طور پر مجھے تاریخوں، دریاؤں یا عمارتوں کے نام کتابوں کے منسوب کرنے کی رسم بالکل پسند نہیں۔ میں نہیں سمجھ سکتا ہمارے لکھنے والے ایسا کیوں کرتے ہیں۔ کیا ان کے کوئی اتنے عزیز دوست نہیں ہوتے جن کے نام وہ کتاب کے پہلے صفحے پر دے سکیں؟ ایک اچھے دوست کو اس طرح بے پایاں مسرت بخشنے میں کوئی حرج نہیں اور ایک تاریخ یا نہر کو کتاب منسوب کرنا انتساب کو ضائع کرنا ہے۔

مگر مجھے مصنف سے اس انتساب کی پسند پر خواہ مخواہ جھگڑنا نہیں چاہیے۔ میرا یہ خدشہ کہ ایسے انتساب کے بعد وہ ایک شدید جذباتی لب ولہجہ اختیار کرے گا اور ہر صفحے پر برین گنوں کی تڑتڑ تڑتڑ لا کر مجاہدانہ اسپرٹ کو جگانے کی کوشش کرے گا، بے بنیاد ثابت ہوا۔ مجاہدانہ اسپرٹ کی بیداری اچھی چیز ہے اور اس وقت تقریباً ہر کوئی اس نیک کام میں لگا ہوا ہے — کیا لیڈر، کیا صحافی، کیا علمائے کرام۔ گوریلے اور سرفروش جا بجا سر اٹھا رہے ہیں اور ملک کو 'بچانے' کے لیے جہاد کی تیاریاں زوروں پر ہیں۔ ایک

Scanned with CamScanner

بزدل اور پُر امن شہری ہونے کی حیثیت سے میں اپنی اور بہت سے لوگوں کی بھلائی اسی میں سمجھتا ہوں کہ اس مجاہدانہ جذبے کو تھپکی دے کر سلا دیا جائے اور ڈنڈے اٹھا کر گلیوں اور بازاروں میں مارچ کرنے اور گلے پھاڑ کر نعرے لگانے سے یہ بدرجہا بہتر ہے کہ آدمی کسی تنہا کنج میں لیٹ کر میری جوانا پیے۔

ستمبر کے دوسرے تیسرے ہفتے کا لاہور اب ایک مبہم یاد ہے — ویران مال، تختہ لگی دکانیں، اکادکا ٹہنیوں اور پتوں سے ڈھکی، مٹی سے لپی پتی کاریں، شہر کے موڑوں پر شہریوں کے چھوٹے چھوٹے گروہ کسی چیز کا انتظار کرتے ہوئے۔ انڈس ہوٹل کا واحد بیرا اور ٹھنڈے دودھ کی چائے، میریا ڈھول سپاہیا تینوں رب دیاں رکھاں! اب وقتِ شہادت ہے آیا! — ہم سب اُن دنوں مجاہد تھے یا خود کو مجاہد محسوس کرتے تھے۔

میں اور میرا ایک دوست ایک دن گلبرگ گئے۔ سب شیشے اور سیمنٹ کی کوٹھیاں خالی بھائیں بھائیں کرتی تھیں اور سوائے چند ملازموں کے کسی ذی روح کا نام ونشان تک نہ تھا۔ ان کوٹھیوں کے مکین چھ ستمبر ہی کے دن اپنے کنبوں کو کاروں میں بھر کر محفوظ جگہوں میں لے گئے تھے۔ سات ستمبر کو ہم ریلوے اسٹیشن پر گئے۔ وہاں ایک مجموعی خروج (exodus) کا سماں تھا۔ پلیٹ فارم لوگوں سے پٹے پڑے تھے اور لوگ اس جنگ زدہ شہر سے بھاگنے کی فکر میں تھے۔ اسٹیشن کے باہر لوگوں کا مجمع ایک مفروضہ جاسوس کے گرد اکٹھا تھا۔ ان دنوں اَن گنت بے ضرر لوگوں پر دشمن کے جاسوس یا چھاپا بردار ہونے کا گمان کیا گیا۔ دراز پٹوں اور لمبی داڑھی والے لوگوں کے لیے اکیلے نکلنا نہایت پُر خطر تھا۔

اور تقریباً سب حکومت کے وزیر اُن دنوں اپنے اپنے علاقوں میں دورے پر چلے گئے تھے — وہاں کے لوگوں کا مورال اونچا کرنے کے لیے۔ وہ آج اپنے اخباری بیانوں میں سب سے بڑے مجاہد ہیں۔

ہماری فوجیں محاذ پر بے جگری سے لڑیں۔ انھوں نے اپنی جانیں اس شان اور البیلے پن سے دیں کہ لاہور بچ گیا، اور اس کے ساتھ ملک بھی۔ مگر میرے ایک دفتری شریکِ کار نے مجھے یقین دلایا کہ اگر 'سبز پوش' ہمارے سپاہیوں کی مدد کو نہ آ پہنچتے تو ہندوستانی یلغار کے سامنے ان کے قدم اکھڑ جاتے۔ یہ سبز پوش کون تھے؟ بعض لوگوں کی عینی شہادت کے مطابق وہ سفید براق گھوڑوں پر سوار اور تیر و تلوار سے لیس پہلے پہل راوی کے پل پر نمودار ہوئے اور پھر سیدھے محاذِ جنگ پر پہنچے۔ ہر ایک پاکستانی سپاہی کے ساتھ سات سات سبز پوش تلوار مارتے تھے اور تیر چلاتے تھے اور ان کی شمولیت نے جنگ کا رخ پلٹ دیا۔ جنگ نے کیسی کیسی myths کو جنم دیا! بہت سے اچھے بھلے پڑھے لکھے لوگ اب بھی اس

Scanned with CamScanner

متھ پر یقین رکھتے ہیں کہ جیت سبز پوشوں کی بدولت ہوئی۔ان سے بحث کرنا فضول ہے، کہ اس طرح کفر کا فتویٰ لگ سکتا ہے۔

کیا پاکستانی شہریوں کا موریل بھی اتنا بلند تھا جتنا ہماری فوج کا؟ میں اس کو نہیں مانتا۔ جنگ کے بعد ساری قوم خود تعریفی کی گرفت میں آ گئی اور پاکستان کونسل میں ایک لیکچرر نے دعویٰ کیا کہ جنگ میں ہم کندن ہو گئے ہیں — فرشتوں کے سے پاک، بے غرض، فرض شناس، ایک دوسرے کے دکھ درد کا احساس رکھنے والے۔اس قسم کی خود تعریفی بے معنی ہے اور ایک لحاظ سے خطرناک بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے قومی کردار میں کچھ تبدیلی نہیں آئی۔ رشوت ستانی، لوٹ کھسوٹ، مطلب براری، عیاری اور بے حسی، سب معاشرتی بیماریاں جوں کی توں قوم کے رگ و پے میں رچی ہوئی ہیں۔ مسعود مفتی کی کہانیوں میں یہی حقیقت جگہ جگہ جھلک مارتی ہے اور ہمیں اپنے اصلی چہرے نظر آنے لگتے ہیں جو ہم دیکھنا نہیں چاہتے۔

اس کتاب کی کہانیاں کچھ تو سرحد کے اُس پار کی ہیں اور کچھ اِس پار کی، لیکن بیشتر ان لوگوں کی جو جنگ سے کسی نہ کسی اثر پذیر ہوئے ہیں۔ان معنی میں جنگی کہانی کہ اس کے واقعات محاذ پر رونما ہوں، اس مجموعے میں کوئی نہیں۔ مجھے یہ کہانیاں بہت اچھی لگی ہیں۔موضوع بیان کی قدرتی سادگی کے پیچھے اکثر کہانیوں میں واضح تخلیقی صلاحیت اور بے رحم مشاہدے کی کارفرمائی ملتی ہے۔

''خط'' سرحد کے اُس پار کی کہانی ہے۔سین دہلی اور کردار میاں بیوی۔احمد ایک متمول کاروباری مسلمان ہے، کوٹھیوں اور مکانوں کا مالک، اور سب متمول آدمیوں کی طرح قدرے بزدل اور محفوظ راہ اختیار کرنے والا۔ بیوی کا بھائی ریاض کشمیر کی تحریکِ آزادی میں پاکستانی گوریلوں کی مدد کر رہا ہے اور جب بھارتی پولیس انسپکٹر ان کو ہدایت کرتا ہے کہ احمد کی پتنی ریاض کو خط لکھے کہ وہ گوریلوں سے تعاون نہ کرے تو میاں بیوی میں شکر رنجی پیدا ہو جاتی ہے۔ احمد کی بیوی وہ خط نہیں لکھنا چاہتی۔ احمد جانتا ہے کہ وہ خط نہ لکھا گیا تو وہ دشمن کے ایجنٹ متصور ہو کر دھر لیے جائیں گے اور احمد کی سب جائیداد بھارتی حکومت ضبط کر لے گی۔ بہر حال خانگی سکون درہم برہم ہو جاتا ہے۔ میں اس کا انجام نہیں بتاؤں گا مگر جذبات کا تصادم مہارت سے بیان کیا گیا ہے اور کہانی حقیقت کی آئینہ دار ہے۔ یقین ہونے لگتا ہے کہ سب کچھ اسی طرح ہوا ہوگا۔

بعض کہانیوں میں منٹو کا سا اختصار بیان اور چونکا دینے والا انجام ہے مگر مسعود منٹو نہیں۔ اس

Scanned with CamScanner

نے منٹو سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ ہاں، کوئی چیلا اپنے گرو سے بڑا نہیں بن سکتا۔ اگرچہ مفتی نے اپنے استاد کے سے ترشے ترشائے فن پارے نہیں لکھے، پھر بھی وہ پڑھنے والے کے دل میں اپنے لیے منزلت اور انسیت ضرور حاصل کر لیتا ہے۔

اس مجموعے میں ایسی کہانیاں بھی ہیں مثلاً ''جائیداد''، ''نئے پیمانے'' جن کا جنگ سے کوئی تعلق نہیں اور جو لکھنے والے کے بحیثیت حاکم ضلع ذاتی تجربے پر مبنی ہیں۔ وہ اتنی ہی اچھی ہیں جتنی جنگی کہانیاں۔

ایک پیاری فینٹسی ''تعبیر'' بھی ہے۔ اور ایک ہمارے پرانے دوست عرفی بھیا کے کارناموں کی کہانی ''بہادر'' کے عنوان سے۔ لب و لہجے کے لحاظ سے ووڈ ہاؤسین، اور کافی ہنسانے والی۔ اس میں عرفی بھیا ایک ہندوستانی جاسوس کو پکڑتے ہیں جو رائٹر نیوز ایجنسی کا رپورٹر نکلتا ہے۔ عرفی بھیا اپنی گفتگو، والہانہ پن اور اوٹ پٹانگ حرکتوں میں شفیق الرحمٰن کے پُر بہار مسخرے کردار روفی عرف شیطان سے بہت کچھ ملتے جلتے ہیں۔ اسے طنزیے کے طور پر بھی پڑھا جا سکتا ہے کیونکہ عرفی بھیا کی طرح اور بہت سے 'بہادر' جنگ کے دنوں میں بھارتی جاسوسوں اور چھاتا برداروں کو پکڑنے اور ان کی داڑھیاں نوچنے کا شغل کر رہے تھے اور اگر ہم اپنے ارد گرد دیکھیں تو عرفیوں اور روفیوں کی کمی نہیں۔

ان پڑھنے والوں کو جو اس پر آشوب سیاست زدہ ایام میں بھی ادب کی پروا کرتے ہیں ''رگِ سنگ'' ضرور پڑھنی چاہیے۔

(فنون، لاہور، ۱۹۶۷ء)

کرنافلی

علاؤالدین الآزاد

جب میں نے پہلا بنگالی ناول پڑھا تو میں اسکول میں غالباً چھٹی جماعت کا طالب علم تھا۔ تب سے میں بنگال کے جادو تلے آ گیا اور بنگلہ دیش کی شاداب سرزمین اپنے ڈابوں، دریاؤں اور ٹاپوؤں کے ساتھ

Scanned with CamScanner

میرے تخیل کا حصہ بن گئی۔ یہ ناول ''ان پورنا دیوی کا مندر'' تھا، ایک بنگالی لڑکی کا لکھا ہوا جس کا نام اب مجھے بھول گیا ہے، مگر مترجم پروفیسر رام سروپ کوشل ایم اے کا نام مجھے اب تک یاد ہے۔ اُس کا تخیلی حلیہ جو میں نے بنایا وہ ایک پگڑ پہنے، جھکی ہوئی لمبی گپھے دار مونچھوں والے متوسط عمر شخص کا تھا جو عینک لگاتا تھا۔ میں دارالاشاعت کی چھپی ہوئی اس چھوٹی کتاب کے پیلے کاغذی سرورق کو اب بھی دل کی دھڑکن کے ساتھ اپنی یاد کی آنکھ سے دیکھ سکتا ہوں۔ یہ کتاب ''ان پورنا دیوی کا مندر'' میرے لڑکپن کی یادوں کے دور تک پھیلے ہوئے سفید غبار میں سرسبز خوابی جزیرے کی طرح اُبھرتی ہے اور میں جانتا ہوں کہ جب میرے اس دنیا سے رخصت ہونے کا وقت آئے گا اور میں اُن چیزوں کا سوچوں گا جنھوں نے مجھے اپنے لمبے کٹھن سفر میں سب سے زیادہ مسرتیں بخشیں تو یہ چھوٹی، سادہ، اداس کہانی بھی ان چیزوں سے ایک ہوگی؛ اس وقت وہ خوابی، ہرا بھرا جزیرہ میری ڈوبتی آنکھوں کے سامنے ہوگا۔ ہم سب اپنے بچپن اور لڑکپن میں پڑھی ہوئی کتابوں سے محبت کرتے ہیں اور انھیں آسانی نہیں بھول پاتے، مگر ''ان پورنا دیوی کا مندر'' حقیقتاً ایک سادہ، خوبصورت اور دل کو موہ لینے والی کتاب تھی — ماںجھیوں، مچھیروں اور جنگلوں کے متعلق جو کاروں والے امیر آدمیوں، اونچے عہدیداروں اور فلک بوس پتھریلی عمارتوں سے کہیں زیادہ دلچسپ ہیں۔ ''ان پورنا... '' کے بعد میں نے کئی ایک بنگالی ناولوں کے ترجمے پڑھے۔ میرے اسکول کے پاس ہی بازار میں ہوتو مل کی دکان تھی جہاں سے ہر قسم کے ناول ایک آنہ یومیہ پر پڑھنے کے لیے کرائے پر مل جاتے تھے۔ میں نے ان میں چھانٹ چھانٹ کر بنگالی ناول پڑھ ڈالے، بنکم چندر چٹر جی اور دوسرے مصنفوں کے! لیکن ان میں سے کسی نے مجھے ''ان پورنا... '' کی طرح متاثر نہ کیا۔ اس وقت بھی میں یہ تمیز کر سکتا تھا کہ یہ بنگالی ناول ہر لحاظ سے اردو ناولوں سے کہیں زیادہ اصلیت، خوبصورتی اور دلچسپی سے لکھے ہوئے تھے۔ جب ہوتو مل کا اسٹاک ختم ہوگیا تو میں نے ایک مدت تک بنگالی ناول نہ پڑھے۔ نویں دسویں جماعت تک میرا مذاق بھی بدل چکا تھا۔ میں نے اسکول کی لائبریری میں آر ایل اسٹیونسن، رائیڈر ہیگرڈ اور فینی مور کوپر کو دریافت کر لیا تھا جو ایک مضطرب کن مہماتی کہانی کو ایک مضطرب کن پیرائے میں بیان کرنے کی قدرت رکھتے تھے، اور جو اُن باتوں کے متعلق لکھتے تھے جو ایک لڑکے کے دل سے زیادہ قریب ہوتی ہیں۔ میں انگریزی ادب کا رسیا بن گیا۔

''ان پورنا... '' اور دوسرے بنگالی ناولوں نے میرے تخیل میں جو جوت جگائی تھی وہ البتہ کبھی نہ

بجھ سکی، مگر میں نے پھر کئی سالوں تک بنگالی ناول نہ پڑھے۔ اس کی غالباً ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سوائے ٹیگور کی کتابوں کے دوسرے بنگالی مصنفوں کی کتابوں کے ترجمے آسانی سے دستیاب نہ ہوتے تھے۔ کالج کے زمانے میں ''نیوتھیٹرز'' کی کئی ایک فلمیں دیکھیں جن میں ''دیوداس'' اور ''بڑی دیدی'' سرت چندر چٹرجی کے ناولوں پرمبنی تھیں، لیکن انگریزی ادب میں منہمک ہونے کی وجہ سے میں نے ان ناولوں کے اردو ترجموں کی جستجو میں کچھ دوڑ دھوپ نہ کی۔ سرت چندر کو میں نے حال ہی میں پڑھا ہے اور وہ بھی ایک تلخیص شدہ صورت میں اور ایک کاروباری انداز کے ترجمے کے روپ میں، جو اتنا بُرا تو نہ تھا لیکن اُسے اچھا بھی نہیں کہہ سکتے۔ پچھلے سے پچھلے سال نیلے گنبد کے ایک فٹ پاتھ کے کباڑیے کے پاس میں نے ''بڑی دیدی'' کی درجنوں جلدیں دیکھی اور میں نے ایک جلد غالباً چھ آنے میں خرید لی۔ چھ آنے میں اس سے اچھا سودا میں نے کبھی نہیں کیا، کیونکہ جب میں نے ''بڑی دیدی'' کو پڑھا تو محسوس کیا کہ میں نے دنیاوی ادب کے ایک شاہکار کو پڑھا ہے۔ ''بڑی دیدی'' اُن معدودے چند ناولوں میں سے ہے جنھوں نے میرے دل کو ہلایا۔ ادھیڑ عمر میں آدمی سخت دل اور کلبی بن جاتا ہے اور انسانی محبت کے سوز پر آسانی سے نہیں روتا، لیکن جب سرت چندر کی اس سیدھی سادی جذباتی محبت کی کہانی کے خاتمے پر پہنچا تو میں آدمی کی ازلی تنہائی اور اس کی محرومی پر ایک بچے کی طرح رو پڑا اور کتاب کا صفحہ میرے آنسوؤں سے بھیگ گیا۔ دوسروں کے متعلق تو میں نہیں کہہ سکتا، میرے لیے ''بڑی دیدی'' ایک سچی اور عظیم کہانی ہے اور سرت چندر ایک استاد کہانی کہنے والا، ایک بے مثل جذبات کا مصور۔

ایک اور بنگالی ناول جو مجھے پانچ چھ سال پہلے پڑھنے کا اتفاق ہوا اور وہ بھی اسی دیس میں جس میں وہ تخلیق ہوا، قاضی نذرالاسلام کا ناول تھا۔ نذرالاسلام کو ایک آتشیں، انقلابی شاعر کی حیثیت میں تو سب جانتے ہیں مگر، بہت کم لوگوں کو اس کا علم ہوگا کہ وہ ناول اور کہانیاں بھی لکھتا تھا۔ اس ناول کا بنگلہ نام تو مجھے یاد نہیں مگر اردو میں اس کا ترجمہ ''جوع الاجل'' کے نام سے ہوا ہے (جو کچھ بھی جوع الاجل کا مطلب ہو)۔ غالباً نذرل نے یہی ایک ناول لکھا۔ اس میں کچھ تکنیک نہیں، کوئی فنی ضبط نہیں، مگر یہ حقیقی اور پُرگداز اور گرفت میں لینے والا ناول ہے۔ سادے، غریب، گھاس پھوس میں رہنے والوں کی یہ سادہ کہانی جس کا کوئی واضح انجام بھی نہیں، اپنے اندر بنگال کی دکھی روح کو سموئے ہوئے ہے۔ نذرالاسلام ایک ناولسٹ نہیں، وہ ناول کی تکنیک اور اصول کی ابجد سے بھی ناواقف ہے، پھر بھی ''جوع الاجل''

Scanned with CamScanner

میرے لیے ایک انسانیت پرست انسان کی دل ہلا دینے والی پکار ہے اور کئی ناولوں سے ہزار درجہ زیادہ موثر۔ بُری طباعت اور نااہل ترجمہ بھی اس ناول کی خوبصورتی کو نہیں بگاڑ سکے اور نذرل کی دکھ کی پکار کسی نہ کسی طرح ہم تک راہ پا لیتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کا یہ تاثر اس لیے ہے کہ کردار حقیقی، چلتے پھرتے لوگ ہیں اور ان کی کہانی کو پڑھنا بنگلہ دیش کی روح کے حسن اور دکھ کو محسوس کرنا ہے۔ ایک شاعر ہی ایسا آتشیں ناول لکھ سکتا تھا۔

''کرنافلی'' بھی انھی عوامی بنگالی ناولوں کی خوبصورت روایت میں ہے جن کے تانے بانے ایسی سدھاوٹ، سادگی اور پُرکاری سے بُنے جاتے ہیں کہ ان پر 'تصنیف' کیے جانے کا گمان نہیں ہوتا اور جو گویا قدرتی ندیوں کی طرح پُرسکون شاداب کناروں کے بیچوں بیچ بہتے جاتے ہیں۔ (میں اکثر تعجب کرتا ہوں کہ ایسے ناول ہمارے مغربی خطے میں کیوں نہیں لکھے جاتے یا لکھے جا سکتے؟ ہمارے بیشتر ناول کیوں اتنے بناوٹی، غیر حقیقی اور جھوٹ موٹ کے ہوتے ہیں؟ وہ کیوں اس قدر جامد، تخیل سے پاک اور بھونڈے ہوتے ہیں؟ کیا اس خطے میں اچھے اور قدرتی ناول نویس نہیں پیدا ہو سکتے؟ یا ہماری آب و ہوا، طرز زندگی، ہمارے ضمیر میں کوئی ایسی چیز ہے جو ہمیں زندگی کے گداز، شادمانی، قدرتی مناظر کے حسن، اور ان سب چیزوں سے جو زندگی کو رہنے کے قابل بناتی ہیں، بیگانہ کر دیتی ہے؟) ''کرنافلی'' کا مصنف علاؤالدین الآزاد بھی دوسرے بنگالی مصنفوں کی طرح اپنے دیس کی عوامی زندگی، اس کے باسیوں کے دکھوں اور خوشیوں، اس کے شاداب جنگلوں، دریاؤں اور گھاٹوں سے اپنے ناول کا تانا بنتا ہے۔ سب کردار حقیقی ہیں اور اسی طرح جیتے، سوچتے اور بولتے ہیں جیسا کہ ان کرداروں کو کرنا چاہیے۔ انھیں زیادہ گہرائی سے نہیں دیکھا گیا مگر وہ بالکل مستند ہیں، اور یہ اس ناول میں کوئی عیب نہیں۔ ''کرنافلی'' طویل مختصر افسانے کے اصول پر لکھا ہوا ناول ہے، پورے فنی ضبط اور اختصار کے ساتھ، اور اس لحاظ سے اپنے پیشرو بنگالی ناولوں سے بہت مختلف۔ علاؤالدین الآزاد ایک ماڈرن ہے، اس لیے ایک ناول کی تکنیک کی مقتضیات سے پوری طرح بہرہ ور۔ سرت چندر اور نذرل سے اس کا موازنہ کافی دلچسپ ہے۔ سرت چندر اور نذرل تکنیک کے متعلق کچھ نہیں جانتے اور نہ ہی اس کی پروا کرتے ہیں۔ وہ پرانے داستان گویوں کی طرح پڑھنے والے سے براہِ راست مخاطب ہونے میں بھی برائی نہیں سمجھتے، نہ ہی وہ جذباتیت کا اظہار کرنے سے شرماتے ہیں۔ جدید ناول میں تکنیک پر بڑا زور دیا جاتا ہے مگر سرت چندر اور نذرل

نے اس کے بغیر ایسے ناول لکھے جو سچے، حقیقی اور اثر کرنے والے ہیں۔ علاؤالدین الآزاد ایک جگہ بھی پڑھنے والے سے براہِ راست مخاطب نہیں ہوتا۔ وہ یہ لکھنے کا روادار نہیں کہ 'اب فلاں فلاں کا سنو کہ اس کے ساتھ کلکتہ میں کیا بیتی!' اس کی تحریر میں جذباتیت کے ارغوانی ٹکڑے بھی کہیں ٹنکے ہوئے دکھائی نہیں دیتے۔ وہ سرت چندر اور نذرل سے مختلف برش اور موقلم سے اپنا مرقع تیار کرتا ہے مگر object وہی ہے، بنگلہ دیش کے عام لوگ، ان کے کڑے ایام، ان کی غم وخوشی اور دریاؤں اور ٹاپوؤں کا بے زوال منظر۔ اس کی کہانی بھی مضطرب کرنے والی ہے اور وہ اُسے ایک مضطرب انداز میں کہتا ہے۔ بنگال کے حسین مناظر کی لفظی تصویریں اتنے احساس اور گہرائی سے کھنچی ہوئی ہیں کہ آدمی کو جوزف کانریڈ کے ناول یاد آجاتے ہیں۔ (کانریڈ ایک پول تھا۔ اس نے انگریزی میں exotic ناول لکھے ہیں جن میں اکثر کی سیٹنگ استوائی جنگلی علاقے ہیں۔) ''کرنافلی'' میں وقفے ڈرامائی تاثر کو تیز کرتے ہیں اور تسلسل کو کوئی دھچکا نہیں پہنچتا۔ ہم سب کچھ تو نہیں دیکھتے مگر مصنف وہ جو کچھ بھی ہمیں کرداروں کی بول چال، چلت پھرت سے دکھانا چاہتا ہے، اسے ہم مکمل طور پر دیکھ لیتے ہیں۔

تم اس ناول کے صفحات میں بنگلہ دیش کے پُرحسرت سوگوار چہرے کو دیکھتے ہو۔ ایک اگزاٹک، بھڑکیلی دنیا جس میں انسان ہی قاتل ہے اور انسان ہی مقتول، انسان ہی بھیڑیا ہے اور انسان ہی بھیڑ کا بچہ، اور سب ایک غیر انسانی، نامنصفانہ تمدنی نظام کی چکی میں پس رہے ہیں۔ کہانی میں سدھاوٹ ہے، کوئی اینچ پینچ نہیں، لیکن استادانہ فن کاری سے مرقعے کے خاکوں میں رنگ بھرے گئے ہیں۔ آہ، ہمارے اِس خطے کے ناول! جنھیں پڑھ کر ہمیشہ ایسا لگتا ہے کہ آدمی یہ سب کچھ پہلے پڑھ چکا ہے اور جن کو عوامی زندگی سے کوئی نسبت نہیں ہوتی۔ ''کرنافلی'' کا مرکزی کردار اسماعیل ایک فاقہ زدہ، بے پرواجیب کترا ہے، اپنے فن میں طاق؛ اس کی روح بدنما نہیں اور اس کے دل میں بھی سب جوانوں کی طرح خواہشیں اور اُمنگیں ہیں۔ وہ ایک جہاز کا سارنگ بننا چاہتا ہے (اور یہاں مجھے اپنی نوجوانی کے خواب یاد آئے: میری تمنا بھی بحری قزاقوں کے جہاز کا کپتان بننے کی تھی)۔ اسماعیل کو ایک شخص رمضان، جو کبھی ٹھیکے دار تھا اور اب عورتوں کی خرید وفروخت کا دھندا کرتا ہے، اپنی حفاظت کے لیے چکمہ دیس میں لے جاتا ہے اور وہ اکٹھے کشتی میں سفر کرتے ہیں اور اپنی منزلِ مقصود پر کیمپ کرتے ہیں۔ رمضان کی آنکھ ایک چکمہ لڑکی رانگا میلا پر ہے — ایک نرم وگداز بدن کی لڑکی جسے وہ اُڑانا چاہتا ہے — لیکن رمضان کو اس سے

Scanned with CamScanner

محبت ہو جاتی ہے اور وہ اس کو اپنے ذہن سے نہیں نکال سکتا۔ رانگامیلا ایک چکمہ جوان نیل متی سے پیار کرتی ہے۔ ایک رات جب رانگامیلا اور نیل متی اپنی مسرت ڈھونڈنے کی خاطر بھاگ رہے ہوتے ہیں تو رمضان کو پتا چل جاتا ہے اور وہ انھیں جنگل میں دریافت کر لیتا ہے۔ وہ نیل متی کو ختم کرنے کے لیے اس پر حملہ کرتا ہے، مگر آخر اچھائی کا شعلہ اس میں بیدار ہوتا ہے اور وہ اپنی جان پر کھیل کر ان دو عاشقوں کو رمضان کے غنڈوں سے بچا کر آزادی اور نئی زندگی کی طرف روانہ کرتا ہے۔ کہانی فقط اتنی ہے، لیکن human insight کی چکاچوند سے روشن۔ علاؤالدین الآزاد اپنے کرداروں کو اندر باہر سے جانتا ہے اور ان کی قلبی و ذہنی کشمکشوں سے حیران کن حد تک واقف ہے۔ اس کی کارکردگی اور مواد کی handling متاثر کرنے والی ہے، اور ہمیں اس کے قلم سے جلد ایک اور ناول ملنا چاہیے۔

احمد سعدی کا ترجمہ مثالی ہے۔ یہ اتنا اچھا ہے کہ اس پر ترجمے کا گمان نہیں ہوتا۔ اس نے بنگالی ناول کے لب و لہجے اور مزاج کو بڑی خوبی سے اردو کے قالب میں ڈھالا ہے اور یہ ایک طرح علاؤالدین کی خوش قسمتی ہے کہ اسے اتنا اچھا مترجم دستیاب ہوا۔

(فنون، لاہور، جنوری فروری ۱۹۶۸ء)

حسرتِ عرضِ تمنا

فرخندہ لودھی

مجھے یہ کہتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ فرخندہ لودھی نے ایک بُرا ناول لکھا ہے۔ وہ ایک اچھی مختصر افسانہ نویس ہیں اور ان کی ایک کہانی ''گولڈ فلیک'' جو ''فنون'' میں چھپی تھی، فنی لحاظ سے اوّل درجے کی تھی۔ اس کہانی کو پڑھتے ہوئے وہ مجھے ایک پیدائشی لکھنے والی لگیں اور میں ان کے فن کی سادگی اور پُرکاری پر رشک کیے بغیر نہ رہ سکا۔ ''گولڈ فلیک'' میں ماحول حقیقی تھا، کردار حقیقی تھے اور مصنفہ کی طرف سے ارغوانی ٹکڑے جڑنے کی کوئی کوشش نہ تھی جو اکثر خواتین افسانہ نویسوں کی بیشتر تحریروں کی صورت بگاڑ کر رکھ دیتی ہے۔ ان کے ناول میں حقیقت کو بالائے طاق رکھ دیا گیا ہے۔ اس میں اچھے، پڑھتے جانے والے

ناول کی سب خصوصیات ناپید ہیں۔ میں حیران ہوں کہ انھوں نے یہ ناول کیوں لکھا؟ کیا اسے لکھتے ہوے ان کا دل اس مصنوعی بافت سازی سے اکتا نہیں گیا تھا؟

تم اس ناول کے متعلق کیا کہہ سکتے ہو جس کے کرداروں کے نام پونا، تارا، مونگا، مٹھو، سپنا، سونا، گوری، کالو وغیرہ ہوں؟ ان میں چند ایک پالتو چوپائے اور پرندے ہیں، اور پڑھنے والے کو معاف کیا جاسکتا ہے اگر وہ کبھی کبھی پالتو حیوانات اور انسانی کرداروں میں تمیز کرنا بھول جائے۔ مصنفہ کی ایک جھنجھلا دینے والی عادت یہ ہے کہ مونگا کے متعلق چار پانچ صفحے لکھنے کے بعد یہ واضح کرتی ہیں کہ مونگا کتیا ہے۔ پڑھنے والا اس مدت میں اس گمان میں رہتا ہے کہ مونگا کوئی لڑکی ہوگی۔ ویسے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا — حیوانی کردار بھی اتنے ہی بے رنگ اور مصنوعی ہیں جتنے انسانی کردار۔ ناول کے اختتامیے میں مصنفہ نے اس کے لکھے جانے کا جو احوال قلم بند کیا ہے اس میں وہ بڑی معصومیت سے کہتی ہیں کہ اس کہانی کے کردار، واقعات، مقامات سب فرضی ہیں... میں ان سے قطعی اتفاق کرتا ہوں، واقعی سب کردار، واقعات اور مقامات اصلاً فرضی ہیں، حقیقت سے ان کو دور کا بھی واسطہ نہیں، اور یہی اس ناول کی مصیبت ہے۔ اس ناول کو کون دلچسپی سے پڑھ سکتا ہے جس میں سب کچھ فرضی ہو — اس کے لوگ بھی، واقعات بھی اور مقامات بھی۔ مقامات تو اس ناول میں ہیں ہی نہیں۔ صرف تقریباً سو صفحے کے بعد ایک مقام سندر گڑھ کا نام آتا ہے، باقی شہر اور گاؤں جو ناول میں آتے ہیں، شہر اور گاؤں ہی ہیں۔ پچھلے پچاس صفحات تک میں یہی سمجھا کہ یہ غالباً ناگالینڈ یا چکمہ قبیلے کی کہانی ہے۔ سو ڈیڑھ سو صفحات کے بعد ماحول آزادی سے پہلے کے ہندوستان کا معلوم ہوتا ہے (سپنا کے ریل میں سفر کرنے سے اس امر میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی کہ جس زمانے کا یہ ناول ہے اس میں ریل موجود تھی اور لوگ اسے اکثر ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لیے استعمال کرتے تھے)۔

پونا اور تارا اور سپنا دیہاتی ماحول کے کردار ہیں جنھوں نے اسکول یا کالج کا منھ نہیں دیکھا۔ اپنی عام بات چیت میں وہ ہمیشہ دور کی کوڑی لاتے ہیں۔ ان کی گفتگو پُریاس فلسفیانہ خیالات سے معمور ہوتی ہے۔ پونا میں ایک یوگی کی روح ہے اور آلڈس ہکسلے کا ذہنِ رسا۔ اس کی بیوی تارا اور چھوٹی منھ بولی بیٹی سپنا بھی جب باتیں کرتی ہیں تو آسمانِ فکر سے تارے توڑ کر لاتی ہیں۔ وہ سب کے سب طرفہ معجون اور پڑھنے والے کے لیے قطعی فرضی اور ناقابلِ اعتبار ہیں۔ وہ اکثر تعجب کرنے لگتا ہے کہ یہ کردار

Scanned with CamScanner

عام انسانوں کی طرح بات چیت کیوں نہیں کرتے اور خود پر اتنی خفقانی کیفیت کیوں طاری کیے ہوے ہیں۔ ہم سب اپنے نصیبوں کو کبھی کبھی روتے ہیں، مگر ہم ایسا ہر وقت اور ہر موقعے پر نہیں کرتے۔ اس ناول کے کردار اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کرتے۔ اس بات چیت کے کچھ نمونے جن سے یہ ناول اٹا ہوا ہے (باقی کچھ قدرتی مناظر ہیں اور غیر اغلب واقعات) درج ذیل ہیں:

سپنا: ابا میاں! کہانیوں کی دنیا اتنی خوبصورت ہے تو ہماری کیوں نہیں؟

پونا: بیٹا ہماری دنیا بھی اتنی ہی اچھی اور خوبصورت تھی۔ پھر ہولے ہولے لوگ پاپی ہوتے گئے، ان کے گناہوں کے دھویں سے ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ پھر آگ لگ گئی۔ دریاؤں کا دودھ جل گیا۔ زمین کی چاندی پگھل کر مٹی ہوگئی۔ ہر طرف راکھ اڑنے لگی۔

پونا: آج کام کی باتیں الفاظ کی صورت میں اس کے کان میں پڑیں گی تو کل ان کے معنی سمجھنے کی کوشش کرے گی، پرسوں انھیں عملی جامہ پہنانا مشکل نہ ہوگا۔

تارا: اچھے نتیجے کے حصول کے لیے خام مال کا بڑھیا ہونا شرط ہے۔

پونا: میں یہ کہتا ہوں میرے پاس آنکھیں تو ہیں پر نگاہ بدل گئی ہے۔ میں جب تیری عمر کا تھا تو یہ ساری دنیا بڑی نئی اور حسین لگا کرتی تھی۔ اس کی ہر ایک چیز دیکھنے، سیکھنے اور پانے کے قابل تھی۔ ہر دن نیا اور امید افزا نظر آتا تھا۔ اب تیرا زمانہ ہے تو دیکھ اور سمجھ... ہر شخص کے اندازِ فکر و نظر میں فرق ہوتا ہے۔

پونا: (سپنا کی سہیلی کے پیچھے بھاگتے ہوے) سیپ بیٹا؟ گھبرانا مت۔ بھلا تو کیوں روتی ہے؟ تیرے سامنے نئی زندگی ہے۔ ہم سب نے مل کر آج اس کی مہورت کر دی ہے۔ اس کے نت نئے بدلتے رنگ تجھے مسحور اور محصور رکھیں گے اور تو ہمیں بالکل بھول جائے گی۔ ایسا ہی ہوتا ہے۔ ماں باپ صرف ماضی ہوتے ہیں۔ ماضی کی حقیقت بس اتنی ہے کہ اس میں نئی عمارت کے لیے بنیادیں اچھی اور مضبوط رکھی جائیں۔ اصل چیز تو حال ہے اور حال کا بہاؤ ہے، کھلی فضا۔ میں نے آج تجھے کھلی فضا کے حوالے کر دیا ہے۔ تمھیں تمھارے حال پر چھوڑ دیا ہے اور بیٹی کا مقدر ایک سے زیادہ جیون ہیں، ایک سے زیادہ مرن۔

تارا: کہاں ہیں تمھارے باوا؟

Scanned with CamScanner

سپنا: نہیں ماں۔ یہ تو وہ ہے، وہی ماں، جس کا تم اتنا ذکر کیا کرتی ہو۔ ویسا ہی جیسا میں نے کہانیوں کی کتابوں میں بار بار پڑھا اور دیکھا ہے [اگرچہ ناول میں کہیں بھی ایسا اشارہ نہیں کہ سپنا کوئی کتاب پڑھتی ہے یا پڑھ سکتی ہے] اور ان کہانیوں میں جو تم نے مجھے بچپن سے اب تک سنائی ہیں۔ ان میں جو شہزادے ہوتے ہیں نا، یہ ان سب جیسا ایک ہے۔ ویسا ہی جیسا برسوں کی سوئی ہوئی شہزادی کو جگانے کہیں سے آپ ہی آپ آگیا تھا اور اس کے ایک لمس سے وہ موت کی نیند سے جاگ اٹھی تھی...

لیکن آدمی کب تک ان گفتگوؤں اور سوچوں کو لکھتا چلا جائے۔ ناول ان سے بھرا ہوا ہے اور اس کے کل پانچ سو چوبیس صفحات ہیں۔ اب محض نثری سخن سنجی اور جذباتِ دلی کے مبہم اظہار کی بنا پر کبھی کوئی اچھا ناول نہیں بن سکا۔ ناول کے لیے ضروری ہے کہ اس میں ایک یقین میں آنے والی کہانی ہو، جیتے جاگتے قابلِ اعتبار کردار ہوں، واقعات کا ایک ڈرامائی تسلسل ہو جو پڑھنے والے کی توجہ کو صفحے سے ہٹنے نہ دے۔ مضمون آفرینی اور انشا پردازی بذات خود بہت اچھی چیزیں ہیں، مگر ناول میں ان کو جا بجا بروے کار لانا اس کے لیے مہلک ہے۔ ناول نویس بے شک کتنا ہی بلند خیالی کی ہوا میں اُڑے، کتنے ہی فرضی لطافت کے مضمون باندھے، اگر اس ناول میں واقعات کی وضاحت اور کرداروں کی حقیقت نہیں تو سب کچھ فضول ہے۔ ہماری خاتون لکھنے والیاں خدا جانے یہ کیوں بھول جاتی ہیں۔ ان ناولوں میں جن میں چھوٹے بڑے کردار سب مصنف کی زبان میں بناوٹی گفتگو کرتے ہیں، کبھی جان نہیں پڑ پاتی۔ ایسے جھوٹے ناولوں کی تاثیر دل میں کھٹکے تو کیونکر! کوئی ناول اس لیے تو نہیں پڑھتا کہ مصنف (یا مصنفہ) کے دل اور ذہن میں جو خیالات و تصورات اُبھرتے ہیں ان کی سیر کرے۔ میں جانتا ہوں کہ ایسے لوگ ہیں جو نیم پختہ رومانیت اور جذباتیت سے چھلنی نثر کے سیروں کے سیر چاٹ سکتے ہیں (کہانی اور کرداروں کی حقیقت کی پروا کیے بغیر) اور اسے عمدگیِ تحریر سمجھتے ہیں۔ آدمی ان کی ذہنی حالت پر ترس ہی کھا سکتا ہے۔ انھوں نے غالباً زندگی بھر کوئی حقیقی کتاب نہیں پڑھی۔ فرخندہ لودھی نے اپنا یہ ناول ایسے ہی اذہان کی تسکین اور داد کے لیے لکھا ہے۔ وہ اختتامیے میں اقرار کرتی ہیں کہ ان کے ناشر نے ان کو حوصلہ دلایا کہ محترمہ، ضرور لکھیے، ہم آپ کو چھاپیں گے۔ خواتین کے ناول کی مارکیٹ گرم ہے، ناشروں کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا، ان بے چاروں کے ساتھ بھی سب کی طرح پیٹ لگا ہوا ہے، لیکن یہ اس

Scanned with CamScanner

امر کا جواز نہیں کہ ایک فن کار اپنے فن کو بکاؤ مال کی سطح پر لے آئے اور پانچ سو سے اوپر صفحات صرف اس لیے لکھ مارے کہ اس کے ناشر کی رائے میں یہ خاتونی ناول کے لیے مناسب ضخامت ہے۔ مجھے حیرانی ہے تو اس بات کی کہ مصنفہ کا قلم اتنے سو صفحوں تک بے تکان چلا اور نہ تھکا۔ کم از کم ایک پڑھنے والا تو دس بارہ صفحوں کے بعد ہی تھک گیا اور صرف اس لیے پڑھتا رہا کہ اسے اس ناول پر تبصرہ لکھنا تھا۔ فرضی لوگ اور نقلی واقعات آخر کب تک ذہن پر گرفت قائم رکھ سکتے ہیں اور کیونکر کوئی ناول نویس اس کے متعلق اس فراوانی سے لکھ سکتا ہے (یہ جانتے ہوئے کہ وہ ماورائے حقیقت ہیں اور مردہ قالب)۔ شاید فرخندہ لودھی کو ان کے کردار بڑے حقیقی اور سچے لگے، اسی لیے تو وہ کردار ان کو کسی ظاہری اکتاہٹ کے بغیر اس طول طویل ناول کے خاتمے تک لے آئے — اور اگر ناشر کی طرف سے پابندی نہ ہوتی تو مزید پانچ سو صفحات تک لیے چلے جاتے۔

ناشروں کو بہت کچھ بُرا بھلا کہا جاتا ہے۔ ایک خوبی ان میں یہ ہوتی ہے کہ جو کچھ وہ چھاپتے ہیں اس کی تعریف میں ہرگز بخل نہیں برتتے۔ ''حسرتِ عرضِ تمنا'' کے ناشر نے بھی فلیپ پر اپنی عرض میں بڑے فخر کے ساتھ ایک ادبی اور معاشرتی ناول قارئین کی خدمت میں پیش کیا ہے۔ ناشر کی رائے میں ''حسرتِ عرضِ تمنا'' ایسی داستان ہے جو عملی زندگی کی کشمکش اور جذباتی زندگی کی کیفیات کا حسین امتزاج پیش کرتی ہے، اور اسے دعویٰ ہے کہ ناول کی کہانی میں قارئین زندگی کے اہم مسائل کے ساتھ ادب کی اعلیٰ اقدار بھی پائیں گے۔ یہ سب کچھ تم دس روپے میں حاصل کر سکتے ہو۔ ناشر کا اس میں کچھ قصور نہیں۔ کاغذ میں روپیہ لگتا ہے اور طباعت کی لاگت بہت بڑھ چڑھ گئی ہے۔ اور پھر اتنے علم کے لیے دس روپوں کی وقعت بھی کچھ نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم میں سے بیشتر ناول میں حقیقی کہانی ڈھونڈتے ہیں، ایک ایسی کہانی جو ذہن میں کچھ دیر کے لیے کہانی کے مناظر اور واقعات کا تلاطم پیدا کر دے، جس کے کرداروں کی بول چال اور حرکات کی کیفیت لطف دے اور ہماری مدھم اُمنگوں کو چمکائے۔ گولڈ اسمتھ کی ''وکر آف ویکفیلڈ'' ایمیلی برانٹے کی ''وُدرنگ ہائیٹس''، اسیٹونسن کی ''ویئر آف ہرمسٹن'' اور ''ماسٹر آف بیلنٹرے'' ایسی ہی کتابیں ہیں۔ ان کے کردار اور مناظر ہمارے دل و دماغ میں زندگی بھر کے لیے رچ بس جاتے ہیں۔ ایسے ناول اردو میں کیوں نہیں لکھے جاتے؟ مجھے اس کی پروا نہیں کہ ایک کتاب میں سخن پردازی کے جلوے جابجا ٹنکے ہوئے ہیں یا نہیں، نہ ہی کتاب لکھنے والے سے اس بات کا متوقع

ہوتا ہوں کہ وہ جگہ جگہ نکتہ سنجیوں کے گلدستے سجائے اور اس کا طائرِ فکر ملکی مسائل اور مبہم تصورات کے طبقوں میں گرمِ سیر رہے۔ اس قسم کے ناول بے شمار لکھے جاتے ہیں لیکن ان میں سے زندگی کی حدّت نہیں پھوٹتی۔ معاشی اور ملکی مسائل کا حل ناول نویس کا کام نہیں، اس کا کام پڑھنے والے کو مسرت دینا ہے اور اسے زندگی سے زیادہ قریب لانا ہے۔ ہمارے لکھنے والوں میں کتنے پڑھنے والے کی مسرت کا خیال رکھتے ہیں؟

'حسرتِ عرض تمنا'' کا انتساب ڈاکٹر وزیر آغا کے نام ہے، اس لیے کہ انھوں نے مصنفہ کے ''قلم کو اعتماد بخشا۔'' ڈاکٹر صاحب ایک ذہن رسا رکھنے والے، لائق فائق، خوش معاش انشا پرداز ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس انتساب سے ان کی شہرت میں کوئی اضافہ ہوا ہوگا، نہ ہی ان کے نام منسوب ہونے سے ''حسرتِ عرضِ تمنا'' کے چھپے ہوئے گن اُجاگر ہو سکے ہیں۔ یہ ایک مردہ ناول ہے اور ڈاکٹر وزیر آغا اس میں چاہیں بھی تو روح نہیں پھونک سکتے۔ ڈاکٹر وزیر آغا سے الٹا ہمدردی ہونے لگتی ہے اور خواہش پیدا ہوتی ہے کہ کاش وہ مصنفہ کے قلم کو اعتماد نہ بخشتے۔ یہ اعتماد انھوں نے اس لحاظ سے ضرور بخشا کہ مصنفہ کی کہانیوں کو (اور وہ واقعی اچھی کہانیاں تھیں) اپنے ادبی مجلّے ''اوراق'' میں جگہ دی۔ ان کو کیا معلوم تھا کہ ان کو ایک دن اس کی کیا سزا بھگتنی پڑے گی۔

''حسرتِ عرض تمنا'' تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ ''دھیان'' ہے، دوسرا ''گیان'' اور تیسرا ''نروان''۔ اگر چوتھا حصہ اور ہوتا تو وہ غالباً ''بلیدان'' کہلاتا۔ یہ جدید خاتونی ناول نویسی کا سب سے نیا فیشن ہے کہ ناولوں کو حصوں میں تقسیم ہونا چاہیے۔ اس کی طرح میرے خیال میں قرۃ العین حیدر نے ڈالی اور اب سب ناول نویس خواتین اس ڈگر پر چل نکلی ہیں۔ ناول کے حصوں کے لیے اُجلے عارفانہ اور عموماً ہم قافیہ الفاظ چنے جاتے ہیں اور یہ لحاظ نہیں رکھا جاتا کہ ان الفاظ کا نفسِ مضمون سے کچھ واسطہ بنتا ہے یا نہیں (یہ واسطہ تلاش کرنا پڑھنے والے کی جودتِ طبع پر چھوڑ دیا جاتا ہے کہ یہ اس کا کام ہے)۔ پہلے حصوں کے اچھوتے ہندی یا فارسی نام چنو اور پھر آنکھیں موند کر ناول لکھنا شروع کر دو — یہ آج کل کا مروجہ فارمولا ہے۔

''دھیان'' کسی پہاڑی گاؤں میں پونا اور تارا کی ادھیڑ عمر کی گرہستی زندگی سے شروع ہوتا ہے۔ پڑھنے والے کو بڑی مدت تک یہ پتا نہیں چلتا کہ پونا اور تارا کون ہیں۔ کہاں سے آئے ہیں، ان کا مولد و

Scanned with CamScanner

مسکن کس خطے میں ہے اور کس نظامِ معاشرت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ابھی یہ مسئلہ حل نہیں ہو پاتا کہ بہت سے حیوانی کردار، مونگا وغیرہ، جو شروع شروع میں انسانوں کی سی حرکات کرتے ہیں، کہانی میں آٹپکتے ہیں اور ہمارے ذہن میں پونا اور تارا سے خلط ملط ہونے لگتے ہیں۔ نثر ابتدا میں شعریت سے بھیگی ہوئی ہے، ایک اس قسم کا ابہام لیے ہوئے جو اولین دور کی قرۃ العین اور جیلہ ہاشمی کی یاد دلاتا ہے، ایسی نثر جو ذہن و دل سے چمکیلی گوٹا کناری کی طرح پھسلتی چلی جاتی ہے۔ یہ نثر کچھ اظہارِ مطلب کے لیے نہیں لکھی جاتی، یہ اپنا انجام خود ہی ہے۔ یہ یقیناً فرخندہ لودھی کا اپنا طرزِ نگارش نہیں، محض اپنایا ہوا ہے اور اس لیے قطعی اوپرا۔ وہ اپنے بیان میں کبھی کبھی ہندی الفاظ بھی لے آتی ہیں —— سجاؤ اور تیاگ اور جوگ اور سورکھ جیسے الفاظ۔ قرۃ العین حیدر اور جیلہ ہاشمی بھی اپنے نثر پاروں میں ہندی الفاظ سے وقتاً فوقتاً آنچ دیتی رہتی ہیں، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اُجلے اور اچھوتے لگتے ہیں۔ فرخندہ لودھی بھی یہی سمجھتی ہیں کہ ہندی الفاظ ان کے اسلوب کا رنگ چوکھا کر دکھائیں گے، مگر وہ بھول جاتی ہیں کہ طرزِ تحریر کو مضمون سے ملا ہوا ہونا چاہیے، اسے بے ضرورت گنگا جمنی بنانے سے خواہ مخواہ تحریر میں خودنمائی کی جھلک آجاتی ہے۔ موضوع اور اسلوب میں تناسب لازمی ہے اور ایک اسلامی طرزِ تمدن کے ناول میں اُجلے خوبصورت ہندی الفاظ بھی بے جوڑ اور انمل سے لگتے ہیں۔ (یہ ایک اسلامی معاشرے کا ناول نہیں، مگر پونا مسلمان ہے اور تارا ہندو۔ بعض وقت ان کی گفتگو فصیح اردو میں ہوتی ہے اور کبھی ان کی بات اور خودکلامیوں میں ہندی الفاظ اُمڈ آتے ہیں۔) مصنفہ عموماً ''ہردے'' کے لفظ پر جان دیتی ہیں۔ ''دل'' کی جگہ وہ ہمیشہ ''ہردے'' استعمال کرنے پر مصر ہیں۔ اب ''ہردے'' اپنی جگہ اچھا لفظ ہے مگر رواں فصیح اردو نگارش میں اس قسم کے جملوں کا آجانا کہ اس نے اپنے ہردے میں سوچا، یا اس کے ہردے میں ہلچل پیدا ہوگئی، زبان کو خوش رنگ نہیں بناتا۔ اس ناول میں کل بتیس ''ہردے'' ہیں۔ ایک کردار جو اس قسم کی گفتگو کرتا ہے: ''لمس کا حظ تم خوب سمجھتی ہوگی، کیا ہوتا ہے۔ بھرپور بدن کو میری انگلیاں اچھی طرح چکھ لیتی ہیں۔ پھر میرا ذہن اس لذت کو وجود دینا چاہتا ہے۔ میں موقلم پکڑ لیتا ہوں اور تصویر بننے لگتی ہے۔ جھوٹا وجود، وجود کا عکس، مسخ اور بھونڈا...'' کبھی یہ نہیں کہے گا کہ میرے ہردے پر چوٹ لگی۔ اس ناول میں وہ اپنا اظہارِ جذبات بعینہٖ اس طرح کرے گا۔ قرۃ العین حیدر کی طرح وہ لفظ ''اور'' (بمعنی طرف) کی بھی بڑی شائق ہیں: اندھیرا چاروں ''اور'' پھیلتا ہے اور سپنا سیڑھیوں کی ''اور'' بڑھتی ہے۔

ذاتی طور پر میں سمجھتا ہوں کہ ''طرف'' بھی کوئی بُر الفظ نہیں۔ قرۃ العین حیدر تو پھر بھی ان الفاظ کو نگینوں کی طرح جڑتی ہیں اور ان کے اسلوب میں وہ نہیں کھٹکتے۔ ان کی حال کی تحریروں میں ایک خوش آئند پختگی آ گئی ہے اور وہ یہ سمجھ گئی ہیں کہ اصل بات کے بغیر اسلوب کی مہک کچھ معنی نہیں رکھتی۔ ناول نویس خواتین ان کی پیروی یا پیروڈی کرنے کی کوشش تو کرتی ہیں مگر یہ بھول جاتی ہیں کہ قرۃ العین حیدر اچھی نثر کی استاد ہیں جس کا لکھنا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں اور وہ اپنے ماحول سے ہٹ کر کبھی نہیں لکھتیں۔

پونا اور تارا کسی پہاڑی گاؤں میں ایک جھونپڑے میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کی کوئی اولاد نہیں، اس لیے تارا نے اپنے دل (یا ہردے) کو بہلانے (یا آنند کرنے) کی خاطر مونگا، کالو اور دیگر چرند پرند کو پال رکھا ہے۔ ان میں بعض بکریاں ہیں، بعض کتے اور بعض بلیاں، ایک طوطا مٹھو بھی ہے۔ تالا کے سر میں ''کپاس پھولنے لگی'' تو ایک دن پونا ایک سچ مچ کی لڑکی سپنا کو گھر میں لے آیا جسے کوئی اجنبی اغوا کر کے لا رہا تھا۔ پونا کے دل میں شبہات نے جنم لیا۔ اس نے پولیس میں رپورٹ درج کرا دی اور بچی برآمد ہو گئی۔ دیالو تھانیدار نے بچی کو پونا کے سپرد کر دیا کہ وہ تحقیق و تفتیش کی فکر نہ کرے اور بچی کو اپنے پاس رکھے۔ یہ سارا واقعہ جس انداز میں مصنفہ نے قلم بند کیا ہے اس حد تک غیر حقیقی اور خیالی ہے کہ ان کے تجربے اور تخیل کی خوابی کیفیت پر حیرت ہوتی ہے۔ ایسی سحرکاری بھی کیا کہ بالکل قابلِ یقین واقعات بھی فرضی بن جائیں۔ میرا خیال ہے کہ انھوں نے کبھی اصلی تھانیدار کو روبرو نہیں دیکھا، اور نہ ہی کبھی پولیس اسٹیشن گئی ہیں۔ بردہ فروشوں سے تبادلۂ خیالات کرنے کا اتفاق تو مجھے بھی نہیں ہوا مگر قصے کا اجنبی عجیب و غریب گفتگو کرتا ہے۔ وہ الفاظ جو مصنفہ بردہ فروش اور تھانیدار کے منھ میں ڈالتی ہیں، کسی بردہ فروش اور تھانیدار نے کبھی استعمال نہیں کیے ہوں گے۔ میں جانتا ہوں کہ تھانیدار بھی بھاگوان اور دیالو ہو سکتے ہیں، مگر میں نے ابھی تک کسی تھانیدار کو یہ کہتے نہیں سنا، ''تم لوگوں کو عورت کے لیے غیر مرد کے ہاتھ میں ہمیشہ لال جھنڈی نظر آتی ہے۔'' ریلوے گارڈ یا اسٹیشن ماسٹر بھی یہ جملہ ترنت طریق پر نہیں بول سکتے۔ پونا تارا کو بانہوں میں اٹھا کر اپنے جھونپڑے میں آیا تو تارا نے ''صبح کاذب کا اجالا پونا کے چہرے پر بکھرتے دیکھا... ایک مسکراہٹ، اداس سی آنکھوں میں چمک، دھند میں بسی ہوئی۔'' کیا سمجھے؟

مجھے یہ ساری ڈرامائی تفصیل دوبار پڑھنا پڑی۔ کاپی جوڑنے والے یا جلد ساز نے اپنا کام خوش اسلوبی سے نہیں کیا اور ۸۱ سے ۹۲ تک کے صفحات دُہرا دیے گئے ہیں۔ پڑھنے والے کو یہ گمان ہوتا ہے

کہ یہ واقعہ دوبارہ ہوا ہے، حالانکہ یہ حقیقتاً ایک بار ہوتا ہے۔ سپنا بڑھتی پھولتی ہے، تارا خودکلامی کرتی ہے اور آخر مر جاتی ہے۔ سپنا کے دل (ہردے) میں وہ ارمان مچلتے ہیں جو ہر جوان لڑکی کو بےکل کیے رکھتے ہیں (کم از کم ناول نویس خواتین ہمیں یہی بتاتی ہیں)۔ انوکھی جذبات کشی اور مناظرِ قدرت کی مصوری کے متعدد صفحوں کے بعد آخر پونا سپنا کے ہاتھ پیلے کر دیتا ہے اور وہ اپنے دولھا کے ساتھ بہلی میں بیٹھ کر بس کے اڈے پر چلی جاتی ہے۔ وہ اس بڑے شہر میں جا کر اترتے ہیں جہاں سے انھیں گاڑی پکڑنا ہے۔ پونا نے اپنی طرف سے لڑکا اچھا ڈھونڈا ہے۔ درمیانہ قد اور چوڑی گردن، سر کے بال کچھ اور طرح کے تھے، پونا جیسے نہ تھے۔ وہ لٹھے کی گھیر دار شلوار جھلاتا، پاؤں میں نیا چپل چرچراتا، سرخوشی کے عالم میں چل رہا تھا) مگر جو گفتگو دولہا دلہن کے مابین ہوتی ہے (لو یہ لیمن پی لو۔ دیکھو ہم تم سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ گاڑی کے چلنے میں دیر ہے، تمھیں کیوں نہ شہر کی کوئی مٹھائی کھلائی جائے، تم برفی ضرور پسند کرو گی،) اس سے وہ بالکل گاؤدی معلوم ہوتا ہے اور جب وہ اپنی دلہن کے لیے برفی لاتے ہوئے کسی لاری کے تلے آ کر کچلا جاتا ہے تو اس پڑھنے والے کی آنکھ سے ایک آنسو نہ ٹپکا اور نہ ہی اس کے ہردے پر کوئی کچوکا لگا۔ مسافر خانے میں انتظار کرتی سپنا کو البتہ یوں محسوس ہوا جیسے چاروں اور اندھیرا ہے۔ (ایک مسافر کی گفتگو جو اس کے کان میں پڑی یہ ہے: ''اس کے ہاتھوں میں شگون کی مہندی اور کنگن تھا، چچ چچ چچ... برفی کا دونا... ہائے کھانا نصیب نہ ہوا۔ سر بالکل کچلا گیا۔ ہائے ہائے۔'')

اب ہم ناول کے دوسرے حصے میں ''گیان'' کے تقریباً بیس صفحے طے کر چکے ہیں۔ سپنا ٹرنک پر لڑکھڑا کر گر پڑی اور بے سدھ سوئی رہی۔ ایک کانسٹیبل نے اس کی پسلی میں چھڑی چبھوتے ہوئے کہا، ''باوا کا محل سمجھ کے سوئی ہے۔ ہم تمھارا پہرہ دیں!'' خوانچے والا یا کوئی اور کہتا ہے، ''اول تو تو بڑے چاؤ سے یار کے ساتھ نکلی تھی۔ چھوڑ گیا نہ آخر... اجی مرد کا منھ دیکھتی دور نکل آتی ہیں اور جب وہ پیٹھ دکھا جاتا ہے تو کھڑی جس تس کا منھ تکتی ہیں، ہے کوئی اللہ والا جو گرتی کو تھام لے۔'' کانسٹیبل نے زور کا گھونسا سپنا کی کمر میں دیا (وہ تھانیدار کا سا بھاگوان نہ تھا)۔ ''چل لچی، روتی ہے؟'' اور پھر صبح ہونے والی ہوگئی اور مصنفہ کے الفاظ میں ''خاموش رات کا سیاہ سینہ سلگتے سلگتے سفید راکھ میں بدلنے کو تھا۔'' (میں آنے والی خواتین ناول نویسوں کو مشورہ دوں گا کہ وہ یہ جملہ نوٹ کر لیں۔ ان کے لکھے جانے والے ناول میں اسے کہیں نہ کہیں پیوند کیا جا سکتا ہے۔)

Scanned with CamScanner

سپنا اب طوائفوں کے کوٹھے پر پہنچ جاتی ہے اور ''گیان'' کے باقی صفحات کوٹھے کی زندگی اور وہاں کی دنیا کی فرخندہ لودھی اسٹائل پر عکاسی کرتے ہیں۔ مجھے کبھی کوٹھے یا اس کوچے کی سیر کرنے کا اتفاق نہیں ہوا مگر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ مصنفہ نے جو کچھ لکھا ہے اس کا حقیقت سے ذرہ بھر بھی تعلق نہیں۔ نہ طوائفیں اس طرح باتیں کرتی ہیں اور نہ ہی وہ ہربرٹ اسپنسر اور شوپنہار کے انداز میں سوچتی ہیں۔ سب کچھ فرضی اور بناوٹی ہے — گفتگو، محسوسات اور کردار، سب۔ کردار بولتے ہیں تو مصنفہ کی زبان سے اور سوچتے ہیں تو مصنفہ کے ذہن سے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ ایک لکھنے والا (یا لکھنے والی) اس ماحول سے ہٹ کر جس میں اس کا خمیر گندھا ہے اور جس سے اس کی آگاہی اس کی طبیعت کا حصہ بن چکی ہے، کوئی حقیقی چیز لکھ سکتا ہے۔ ایملی برانٹے یارک شائر کے ویران موروں (Moors) کا تند اور تلخ ناول ''وُدرنگ ہائیٹس'' اس لیے لکھ سکی کہ اس نے ان موروں کی تیز ظالم ہوا کے سانس کو اپنے ماتھے پر محسوس کیا تھا اور پارسنیج کی سرد تنہائی میں ریڈکلف جیسے کرداروں سے ملی تھی۔ اس لیے کتاب اس کے اندر میں سے ایک بچے کی طرح اذیت اور کراہٹوں کے ساتھ نکلی، اپنی زندگی لیے ہوئے۔ فرض کرو ایملی برانٹے لندن کی فیشن ایبل زندگی کو اپنا موضوع بناتی یا ایک ایسی کہانی وضع کرتی جس کے کردار اور واقعات اس کے اپنے تجربے اور مشاہدے سے ہٹ کر ہوتے تو کیا وہ کوئی حقیقی چیز لکھ پاتی؟ ایک لکھنے والے کو اپنی ذہنی اور جذباتی حدوں کو پہچاننا چاہیے اور ایسے میدانوں اور کھلیانوں میں قدم نہ مارنا چاہیے جن کی پگڈنڈیوں اور راستوں سے وہ واقف نہ ہو۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو وہ جھوٹ موٹ کی لفاظی کے ماسوا کچھ نہ ہوگا۔ جین آسٹن نے ویسے ہی مزاحیہ سوشل ناول لکھے جو وہ پورے وثوق سے اور قدرتی طور پر لکھ سکتی تھی۔ وہ صنعتی انقلاب یا نپولین کی جنگوں یا ملکی سیاست کے بارے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتی اور ان تاریخی واقعات کا اس کے ناولوں میں کہیں شائبہ تک نہیں ملتا۔ فرخندہ لودھی خدا جانے کس بوتے پر اپنی ہیروئن کو طوائفوں کے کٹڑے میں لے آئیں۔ ان کی معصومیت پر ہنسی بھی آتی ہے اور جھنجھلاہٹ بھی ہوتی ہے۔ جب ہادی رسوا یا سرشار یا منٹو یا بابر بٹالوی طوائفوں کے کوٹھے کے بارے میں لکھتے ہیں تو وہ اس زندگی کی تصویر کشی کرتے ہیں جس کے رگ و ریشے سے وہ کما حقہٗ آگاہ ہیں۔ وہ کوٹھے پر گئے ہیں، انھوں نے طوائفوں سے کھل کر باتیں کی ہیں اور ان کا قریب سے مشاہدہ کیا ہے۔ اور پھر ان میں کہانی کہنے کا جوہر خداداد (genius) ہے، ایک ایک فقرے میں کھرے پن کی کھنک ہے اور حقیقی لوگ

جنم لے آتے ہیں۔ منٹو کی سب طوائفوں میں جان ہے اور وہ ایک دوسرے سے الگ پہچانی جاتی ہیں، اور موذیل جیسی عورت تو لافانی بن جاتی ہے۔ ''حسرتِ عرضِ تمنا'' میں جو طوائفیں آتی ہیں — مندرا، زہرہ، سہدرا اور دوسری — مصنفہ کے تخیل کی پیداوار ہیں۔ وہ اور ان کے جذبات و محسوسات غیر حقیقی ہیں۔ افسوس، خالی خولی تحریر کی عمدگی سے مردہ قالبوں یا محض ناموں میں جان نہیں ڈالی جاسکتی۔ یہ کوٹھے والا ''گیان'' سب سے طول طویل ہے، کوئی دو سو چالیس صفحات، جن کو پھاندنے کے لیے لا انتہا صبر درکار ہے۔ آخر میں کوئی سردار صاحب (مسلمان سردار صاحب) آتے ہیں، جو فن کار ہیں اور تصویریں بناتے ہیں۔ مجھے کچھ مبہم سا خیال ہے کہ سپنا سردار صاحب سے شادی کرنا چاہتی ہے لیکن سردار صاحب کے خیالات (سب فن کاروں کی طرح) پُریاس ہیں۔ وہ سپنا کو ساتھی کی حیثیت سے رکھنے پر تو تیار ہیں مگر یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا سفر بے آب و گیاہ صحرا میں ہے اور سپنا اُن کے ساتھ پُرکیف زندگی کیسے گزارے گی۔ (ان کی عمر ابھی صرف چالیس سال کی ہے۔) ان کی ہابی بھرپور بدنوں کو ٹٹولنا اور پھر اپنے موقلم سے لذت کو وجود دینا ہے۔ وہ غالباً سیٹھ یا جاگیردار قبیل کے فرد ہیں اور اس ہابی میں کھل کر وقت گزار سکتے ہیں۔

آخری حصہ ''نروان'' ہے۔ میں نے اسے کچھ آنکھیں موند کر پڑھا۔ اس میں بھی کافی کردار ہیں — بیگم صاحبہ، مالن، منی، زینت، امین، گلاب دین بیرا، وغیرہ۔ خالصتاً اسلامی ماحول، ''اور پھر نیم مدہوشی میں کسی نے اسے بانہوں میں جکڑ لیا... یہ سلمان تھا، سلمان ثانی...'' (میں یہ کہنا بھول گیا کہ یہ ثانی بارش کا کوٹ پہنے دھیان والے حصے میں بھی آتا ہے اور پھر کئی سو صفحات تک اس کا وجود نہیں ملتا۔)

سو ناول حصولِ مراد اور خوشی کے نوٹ پر انجام پذیر ہوتا ہے۔ خواتین پڑھنے والیوں کو اس سے بڑی دلی تسکین ملے گی کہ یہ المیہ نہیں۔ سب محسوسات، تمنائیں، امنگیں آخر ازدواجی بندھن یعنی اپنے منطقی نتیجے پر پہنچتی ہیں۔

مگر ٹھہرو! انجام کے بعد اصل اختتامیہ ہے، اور یہ حقیقتاً پڑھنے کی چیز ہے!

میں نے ''حسرتِ عرضِ تمنا'' کے بارے میں جو باتیں لکھی ہیں وہ غالباً بیشتر خاتونی ناولوں پر کم و بیش صادق آتی ہیں۔ میں نے پچھلے سالوں میں زیادہ خاتونی ناول تو نہیں پڑھے مگر چار پانچ ایسے ناول

Scanned with CamScanner

میری نظر سے ضرور گزرے جنھیں کافی شہرت ملی اور جن کی خوبیوں پر رسالوں اور مجلسوں میں تعریف کے ڈونگرے برسائے گئے۔ ان کے نام میں اب یاد کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ جیلہ ہاشمی کا ''تلاشِ بہاراں''، خدیجہ مستور کا ''آنگن''، قرۃ العین حیدر کا ''آگ کا دریا''، بانو قدسیہ کا ''شہرِ بے مثال'' اور اب فرخندہ لودھی کا ''حسرتِ عرضِ تمنا''... ان کے علاوہ الطاف فاطمہ کا بھی ایک ناول میں نے پڑھا، جس کا نام اب مجھے یاد نہیں آرہا۔ ''تلاش بہاراں'' میں روانی اور حلاوت ضرور ہے مگر کہانی میں واقعات اور کردار واضح نہیں ہو پاتے اور ناول دھیمے سروں میں پیچ وخم کے بغیر بہتا چلا جاتا ہے۔ کہانی قاری کے ذہن پر گرفت نہیں کرتی اور دو ڈھائی سو صفحات کے بعد وہ اسے رکھ دیتا ہے اور پھر کبھی نہیں اٹھاتا۔ سارا ناول عمدہ تحریر کی ایک مشق ہے اور بس۔ ''آنگن'' ایک بہت اچھا ناول ہے، اپنے محدود دائرے میں تقریباً مکمل۔ اس میں جیتے جاگتے، ذہن میں رہ جانے والے حقیقی کردار ہیں اور کہیں بھی سخن طرازی اور آرائشی نثر نگاری کے ٹکڑوں کی پیوندکاری نہیں کی گئی (جو خاتون ناول نویس کی سب سے بڑی کمزوری ہے)۔ بیان سادہ اور ایماندارانہ ہے، ناول میں جی لگ جاتا ہے اور پڑھنے کے بعد آدمی اسے نہیں بھول سکتا۔ قرۃ العین حیدر کا ناول ''آگ کا دریا'' ایک میراتھان تجرباتی ناول ہے، ایک وسیع کینوس لیے، فلسفے اور کیا کیا کچھ سے معمور! زرق برق اور جگمگاتی نثر آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے اور بالآخر ذہن کو سراسیمہ اور پریشان۔ کہانی میں دل بستگی کا کوئی سامان نہیں اور کردار محض نقش برآب۔ یہ ایک مردہ ناول ہے۔ کوئی مصمم ارادے والا مداح بھی اسے شروع سے آخیر تک نہیں پڑھ سکتا۔ بانو قدسیہ کے ''شہرِ بے مثال'' نے مجھے مایوس کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بیشتر خاتونی ناولوں سے کسی طرح بہتر نہیں اور مجھے تعجب ہے کہ شائع ہوتے ہی اس کی اس قدر دھوم کیونکر مچ گئی۔ ہماری ناول نویس خواتین اپنی صلاحیتوں کو پوری طرح بروئے کار نہیں لاتیں، وہ لکھتے وقت یہ فراموش کر دیتی ہیں کہ ناول کا سب سے اولیٰ مقصد کہانی کہنا ہے، کہانی جو دل کو موہ لے۔ ہم محض ان کے دلی جذبات اور خیالات وتصورات سے آگاہ ہونے کے لیے انھیں نہیں پڑھتے۔ وہ اپنی ارغوانی اڑانوں کو چھوڑ کر سادگی اور سچائی سے وہ کیوں نہیں کہتیں جو وہ کہنا چاہتی ہیں؟ زندگی ان کے اردگرد ہے، اور اگر ان میں ہمدردی کا مادہ ہے تو وہ اپنے ماحول اور تجربے سے ہی ایک اچھے پڑھے جانے والے ناول کا تانا بانا بن سکتی ہیں، 'سندر گڑھ' کے پہاڑی گاؤں یا بدھ گیا میں نروان حاصل کرنے کی ضرورت نہیں۔ غیر حقیقی اور فرضی چیز لکھنے سے بہتر

Scanned with CamScanner

ہے کہ آدمی بالکل نہ لکھے۔

لیکن میری التجا (میں جانتا ہوں) صدا بہ صحرا ہوگی (ممکن ہے مجھے سچی بات کہنے پر آڑے ہاتھوں بھی لیا جائے)۔ خاتونی ناولوں میں (جیسا کہ ملکی فلموں میں) بعض روایات ایسی مضبوطی سے ٹھکی ہوئی ہیں کہ کوئی ایمیلی برانٹے سی لڑکی ہی ان سے انحراف کر سکتی ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ یہ فرضی تصوراتی سخن طرازی ہمارے ناولوں اور کہانیوں میں سے دودھ کے بال کی طرح باہر نکال کر پھینک دی جائے۔ اس سے اب اُبکائی کی کیفیت ہوتی ہے، ان خاتون (اور دوسرے) ناول نویسوں کو جنھیں فطرت نے عطیہ دیا ہے، اب نئے افق ڈھونڈنے چاہییں۔

ممکن ہے کہ ناول نویس خواتین کے لیے یہ خبر ہو، مگر آدمی اب چاند پر جا پہنچا ہے۔

(فنون، لاہور، نومبر دسمبر ۱۹۶۹ء)

بازگشت

بانو قدسیہ

قدسیہ اور اشفاق میرے پرانے دوست ہیں۔ میں اشفاق سے پہلی بار غالباً ۱۹۵۷ء یا ۱۹۵۸ء میں ''داستان گو'' کے دفتر میں ملا، اور اس کے بعد جب بھی کبھی مجھے لاہور جانے کا اتفاق ہوتا میں اپنی اٹی نریری (itinerary) میں اشفاق سے ملاقات ضرور رکھتا۔ وہ چھوٹا خوبصورت ادبی ماہنامہ ان دنوں باقاعدگی سے چھپتا تھا اور بے اعتنائی کی سرد ہوا کے باوجود قدسیہ اور اشفاق اسے زندہ رکھے ہوئے تھے۔ (''داستان گو'' اب نہیں چھپتا، مگر اس کا بورڈ ابھی تک مال پر ایک سوداگری کی دکان پر آویزاں ہے، کچھ سالخوردہ اور مٹی سے اٹا، اور جب بھی میں اسے دیکھتا ہوں میرا دل اُچھلنے لگتا ہے۔) ''داستان گو'' دراصل قدسیہ کا ذہنی بچہ تھا اور اسی نے اسے سینچا، اور بڑی لگن اور بہادری سے اسے اپنی قسم کا واحد ادبی میگزین بنایا۔ میں نے ''داستان گو'' کے دفتر ہی میں قدسیہ کو ایک دفعہ دیکھا۔ وہ وہاں ایک شام اپنے شوہر کو لینے کے لیے آنکلی۔ انھیں غالباً کسی ادیبہ کے ہاں کھانے پر جانا تھا۔ وہ مجھے ایک دُبلی پتلی، سانولی، کالج کی

لڑکی لگی، قدرے شرمیلی ور خوش اخلاق۔ میں نے سوچا کہ وہ ایک بڑے تخلیقی ادیب کی بیوی ہے اور تخلیقی ادیبوں کے ساتھ زندگی نبھانا کوئی مذاق نہیں۔ وہ اس تجربے کو ضرور کٹھن اور پُر ابتلا محسوس کر رہی ہوگی (اگرچہ اشفاق بالکل 'نارمل' ہے، دنیا کے خندہ مزاج اور چمکیلے لوگوں میں سے ایک)۔ تب میرے ذہن میں یہ خیال تک نہ گزرا کہ یہ دبلی سانولی لڑکی بھی کبھی ایک تخلیقی ادیبہ کا روپ دھارے گی اور یادگار کہانیاں لکھے گی۔ وہ "داستان گو" میں اچھی شستہ نثر میں معقول کہانیاں تو لکھتی تھی، مگر وہ ایسی کہانیاں ہوتی تھیں جنھیں آدمی پڑھتا ہے اور بھول جاتا ہے۔ اس کی صلاحیتیں معمولی اور دوسرے درجے کی معلوم ہوتی تھیں۔ میں یہی سمجھتا تھا کہ وہ اپنے طباع اور خلقی طور پر ذہین شوہر کی بے آب پرچھائیں ہی رہے گی اور بس سیدھی معقول سی کہانیاں ہی اس کے قلم سے نکل سکیں گی۔ جب قدسیہ کا پہلا مختصر ناول "پُروا" چھپا تو مجھے اس میں کوئی ایسی بات نظر نہ آئی کہ میں اس کی صلاحیتوں کے بارے میں اپنی رائے کو تبدیل کرتا۔ میں اس قسم کے نام والے ناول کو مطلقاً نہ پڑھتا (میری لغت محدود ہے، میں اب تک وثوق سے نہیں بتا سکتا کہ پُروا کس ہوا کو کہتے ہیں) مگر مجھے مصنفہ سے اس کی ایک جلد تحفتاً اور باقاعدہ طور پر دستخط شدہ ملی۔ ابتدائی خالی ورق پر میرے لیے کچھ اچھے شفیقانہ الفاظ بھی تھے۔ فطری طور پر میں نے ناول کو پڑھنے سے پہلے ہی اس کے لیے اپنے دل میں ایک نرم گوشہ تیار کر لیا مگر چند صفحے پڑھتے ہی اس کی فرضی ہیئت مجھے کھلنے اور برہم کرنے لگی۔ ناول کے کردار اور واقعات دلچسپی پیدا نہ کر سکے اور یہ واضح تھا کہ مصنفہ اس سوسائٹی کے متعلق بہت محدود اور سطحی واقفیت رکھتی ہے جس کے متعلق وہ لکھ رہی ہے۔ عام پڑھنے والے کی حیثیت سے مجھے ان ناولوں سے چڑ ہے جو معاشرے کے گھناؤنے چہرے کی نقاب کشائی کی غرض سے لکھے جاتے ہیں اور ہمیں 'انسان' بننے کی تلقین کرتے ہیں۔ قدسیہ کا ناول ایسا ہی ناول تھا اور اس پر طرہ یہ کہ کافی بُرا لکھا ہوا۔ ایک دو منظر تو ایسے مضحکہ خیز تھے کہ میں نے کتاب کو ایک طرف دھر دیا اور ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گیا۔ ان میں سے ایک میں سابق صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کی دیوار پر لگی تصویر میں ہیروئن کو دکھ اور رنج میں نڈھال ایک مرد درویش کا پرتو دکھائی دیتا ہے۔ یہ مرد درویش پھر ہیروئن کو خویش و کنبہ پروری کی لعنت، نیکی اور ایمانداری پر ایک خاصا لیکچر دیتا ہے اور قدسیہ جیسی معصوم ہیروئن اتنی متاثر ہوتی ہے کہ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ جاتی ہیں۔

قدسیہ اس کے بعد بہت کچھ لکھتی رہی — افسانے، ریڈیو ڈرامے، ٹیلی وژن کھیل۔ میں نے

اسے نہیں پڑھا اور نہ ہی اس کے ٹیلی وژن ڈرامے دیکھے۔ ریڈیو کے ڈرامے مجھے از حد بورنگ لگتے ہیں، اور بڑی مدت تک میرے پاس ٹیلی وژن نہیں تھا۔ یقیناً وہ ٹیلی وژن پلیز اچھے ہوں گے کیونکہ میرے وہ دوست جن کے ہاں ٹیلی وژن تھا ہمیشہ اس کے کھیلوں کی تعریف کرتے تھے۔ ان ہی دنوں اس کا ناول ''شہرِ بے مثال'' چھپا۔ حسبِ معمول ایک بڑے ہوٹل میں اس کی افتتاحی تقریب منائی گئی۔ تالیاں پٹیں اور ادیب لوگوں نے شہ نشیں پر چڑھ کر مائیکروفون میں ناول کے گنوں کے طومار باندھے۔ ان میں سے بعض نے ناول کو نہیں پڑھا تھا، مگر ایسی تقریبوں میں وثوق سے بولنے کے لیے ناشر کی لکھی ہوئی گرد پوش کی عبارت ذہن میں رکھنے سے کام چل جاتا ہے۔ ڈاکٹر سیموئیل جانسن کے سکاٹس (Scotts) کی طرح ادیب لوگوں نے باہم گٹھ جوڑ کر رکھا ہے کہ وہ ایک دوسرے کی کھل کر تعریفیں کریں گے (کم از کم ہوٹل کے شہ نشینوں پر سے)۔ ہوٹل سے باہر جاتے ہی وہ اپنے کہے کو نگل جانے کی کوشش کرتے ہیں اور شہ نشیں کا 'عظیم ادیب' یکایک ایلس (Alice) کی طرح بالشتیا بن جاتا ہے۔ مجھے اس تقریب پر مدعو کرنا کسی کو نہ سوجھا، مگر میں نے بعد میں ان تقریروں کو لطف اور حیرت سے پڑھا جو وہاں نامی ادیبوں نے کی تھیں۔ کیا واقعی اب قدسیہ دوسری طالسطائی، جارج ایلیٹ اور ایمیلی برانٹے بن چکی تھی؟ میں نے ناول کو پڑھنے کا فیصلہ کیا اور حقیقتاً اسے خریدا۔ یہ ناول عام خاتونی ناولوں سے کسی طرح بہتر نہیں تھا۔ میں قدسیہ سے قطعی مایوس ہو گیا۔

مگر اس کی کہانیوں کے مجموعے ''بازگشت'' نے جو حال ہی میں حسین حمائلی سائز میں چھپا ہے، مجھے اس کی صلاحیتوں کے متعلق پر امید کر دیا ہے۔ ''بازگشت'' میں کل دس کہانیاں ہیں۔ قدسیہ کی مصیبت یہ ہے کہ وہ ایک بڑی ناہموار افسانہ نگار ہے۔ اس مجموعے میں دو تین کہانیاں اول درجے کی ہیں اور میں ان کو پورے نمبر دوں گا۔ ''دانت کا دستہ'' بلاشبہ اپنے مشاہدے کی باریک بینی، بیان کی روانی اور ذکاوت اور طنز کی لطافت کے لحاظ سے ہماری زبان کی بہترین کہانیوں میں جگہ پانے کی مستحق ہے۔ ''گڈریا'' کو چھوڑ کر (جس کو میں نے کم از کم تین بار پڑھا ہے اور میرے مرحوم باپ نے بیسیوں بار پڑھا تھا) میں نہیں سمجھتا کہ اشفاق نے اپنی بیوی کی اس کہانی سے بڑھ کر کوئی چیز لکھی ہو۔ بعض کہانیاں ایسی ہیں جنھیں میں گڈی گڈی (goody goody) کہانیاں کہوں گا۔ تین چار — ''کاغذی ہے پیرہن'' اور ''نیلوفر'' کی طرح — خالصتاً میلو ڈراما ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ اصل زندگی میں بھی کبھی کبھی

میلوڈرامیٹک واقعات رونما ہو جاتے ہیں، مگر افسانے میں میلوڈراما کو سمونا اکثر اس کے لیے مہلک ہوتا ہے اور اسے ناقابل یقین بنا دیتا ہے۔ ایڈگر ایلن پو یا اسٹیونسن جیسے استاد اس راہ سے کامیابی اور سرخروئی سے گزر جاتے ہیں اور میلوڈراما کو موثر اور کارگر کیفیت کے طور پر پیش کرتے ہیں، لیکن ہر کوئی ایسا نہیں کر سکتا۔ پھر پو یا اسٹیونسن نے ''فال آف دی ہاؤس آف اشر'' یا ''اولالا'' میں حقیقت پسندانہ معاشرتی کہانیاں نہیں لکھیں؛ وہ رومینٹسٹ تھے۔

میں نے ''بازگشت'' کی ساری کہانیاں نہیں پڑھیں (میں ایک ایماندار تبصرہ نگار ہوں)۔ سچی بات کہوں تو گھریلو معاشرت کی مرقع نگاری، خواہ وہ کتنے تیکھے رنگوں سے کی ہوئی ہو، میرے دل کو نہیں موہتی اور مجھے اکتا دیتی ہے۔ 'حقیقت پسندی' کے ان گہرے بادلوں کو اب چھٹنا چاہیے۔ قدسیہ کی تحریروں میں اپنے کئی معاصرین کی تحریروں کی طرح یہ عیب ہے کہ وہ ایک ہی ساز پر مختلف دھنیں ہیں۔ ان سب کو اس محدود دائرے سے نکل کر اب کھلی ہوا میں آنے کی ضرورت ہے جہاں سورج چمکتا ہے اور پرندے گاتے ہیں۔ کب تک ہمارے اوپر لکھنے والے ہماری تواضع ایک ہی قسم کے کھانے سے کرتے رہیں گے؟ مانا کہ جنسیت یا محبت (محبت اب پرانا قصہ ہے!) انسانوں کی اکثریت کے لیے دائمی دلچسپی رکھتی ہے، مانا کہ یہ جنس ہی ہے جس کی بدولت زمین اپنے محور کے گرد گھومے جا رہی ہے، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہمارے افسانہ نگار اپنی کہانیوں میں جنسیت کی بھٹی کو ہی تپائے رکھیں۔ ہمارے ادب میں جنسیت اب بور ہو چلی ہے۔ پچاس سال کی عمر کا ہونے کی وجہ سے میں اسے برداشت نہیں کر پاتا۔

قدسیہ ایسی مصنفہ نہیں جسے اسلوب کے لیے پڑھا جائے۔ اس کے صفحوں میں اشفاق یا قرۃ العین حیدر کی نثر کی طرح شعلے نہیں بھڑکتے، مگر اسے اظہار پر پوری قدرت ہے اور جو کچھ وہ کہنا چاہتی ہے، بڑی صفائی، سادگی اور بےباکی سے کہتی ہے۔ وہ یہ کبھی نہیں سوچتی، ''یہ لفظ اچھا نہیں لگتا، مجھے اسے استعمال نہ کرنا چاہیے۔'' بات کہنے کے ڈھنگ میں نازک مزاجی سے کام نہیں لیتی۔ دبلی پتلی، سانولی، شرمیلی لڑکی اب ایک دنیاوی سوجھ بوجھ والی عورت بن گئی ہے اور ایک گہری نظر رکھنے والی افسانہ نگار۔

''بازگشت'' افسانوں کا ایک بڑا اچھا مجموعہ ہے۔ وہ سب لوگ جو حقیقت پسندانہ معاشرتی افسانے پسند کرتے ہیں اسے خریدنے میں دیر نہ کریں۔

(فنون، لاہور، نومبر دسمبر ۱۹۶۹ء)

Scanned with CamScanner

روہی

جمیلہ ہاشمی

جمیلہ ہاشمی کی ''روہی'' پہلے پہل ایک طویل مختصر افسانے کے طور پر رسالہ ''نیا دور'' میں چھپی تھی۔ زیادہ لوگوں نے اس کا نوٹس نہیں لیا کیونکہ اس مملکتِ خداداد میں ادبی رسالوں کو آج کل کوئی نہیں پڑھتا۔

''روہی'' اب کتابی شکل میں ایک دیدہ زیب کور ڈیزائن کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ آپ اسے طویل مختصر افسانہ قرار دے سکتے ہیں اور ایک ناولٹ یا ''ناولا'' بھی۔ مصنفہ، جیسا کہ ہم جانتے ہیں، ایک پختہ کار داستان گو ہے اور اپنی کہانیوں کے تانے بانے بڑی پُرکاری اور صناعی سے بنتی ہے۔ ہم میں سے کتنے اس کے افسانوں ''آتشِ رفتہ'' اور ''لال آندھی'' کے جادو کو اتنے سال گزرنے کے بعد بھی بھلا سکے ہیں؟ ''روہی'' یقیناً ''آتشِ رفتہ'' کا سا جادو نہیں جگاتی، گو مصنفہ نے بیان کا بہاؤ قائم رکھا ہے اور اپنے پلاٹ کو محنت اور مہارت سے تیار کیا ہے۔ میرے خیال میں ''روہی'' کو لکھتے ہوئے وہ شے جسے ہیمنگوے ''رائٹرز لک'' (لکھنے والے کی خوش قسمتی) کہا کرتا تھا، مصنفہ کے ساتھ نہیں تھی۔ پلاٹ، کردار، ٹوپوگرافی سب درست ہیں مگر وہ بے نام فنی آگ جو نثر میں حدت پیدا کرتی ہے اور پڑھنے والے کو گویا وحشی گھوڑے پر اُڑا کر لے جاتی ہے، کسی طرح پیدا نہیں ہو سکی۔ ''آتشِ رفتہ'' پڑھتے ہوئے یوں لگتا ہے جیسے کہانی خود اپنے آپ کو لکھ رہی ہے، مصنفہ اور پڑھنے والے دونوں اس کی دمکتی سنہری فضا میں گم ہیں۔ اس کے برعکس ''روہی'' ایک قاعدے اور ترتیب پر سوچی اور بنائی ہوئی کہانی لگتی ہے، پڑھنے میں دلچسپ ضرور ہے مگر اسٹیج کا شائبہ لیے۔ ''روہی'' کا ''آتشِ رفتہ'' سے موازنہ غالباً بے مقصد اور لاحاصل ہے۔ پہلی عمیق تحت الشعور سے ایک جنگلی چشمے کی طرح پھوٹی، دوسری شعور کی سطح پر وقفوں سے ایک جگ سا پزل (jigsaw puzzle) کے طور پر تیار ہوئی۔

تاہم مصنفہ اپنی ساری اہلیت اور پختہ کاری سے روہی کے رومانس کو مسخر کرنے میں ضرور کامیاب ہوئی ہے۔ روہی وہی روہی ہے جسے سن کر آدمی کا دھیان سرائیکی شاعر خواجہ غلام فرید کی طرف جاتا ہے اور جو اس کے دوہے اور نظم میں جاوداں ہو چکی ہے۔ چٹیل میدانوں اور ریتیلے بنوں کی روہی،

Scanned with CamScanner

جہاں ہوا چاروں طرف سے مضبوط اور تند اور صاف چلتی ہے، جہاں ہرنوں کی ڈاریں اُڑانیں بھرتی ہیں اور برفانی سائبیریا سے آئے ہوئے تلور ستانے اور صحرائی جھاڑیوں میں چگنے کے لیے اترتے ہیں، جہاں البیلے تیکھے نقوش اور ستھرے جسموں والے روہیلے اونٹوں پر اپنی دور دراز ٹوبوں والی بستیوں کی طرف سے سفر کرتے ہیں اور ان کی بیویاں اور محبوبائیں گپھاؤں میں ان کا انتظار کرتی ہیں۔ روہی میں بیابانی وحشت اور سختی ہے مگر روہی کے مناظر — اس کے ٹیڑیاں جے ڈار، اس کے بھورے ریتیلے ٹیلے، اس کے اِکادکا جھنڈ اور کنیر کے درخت — انتہائی خوبصورت ہیں اور آدمی کو مبہوت کر دیتے ہیں۔ اور روہی سمندر سے زیادہ خوبصورت اور پرتجمل ہے کیونکہ روہی کے رنگ مختلف موسموں اور مختلف اوقات میں بدلتے رہتے ہیں۔ اور روہی کی عورتیں بانکی، ہونٹوں پر مسی لگائے، چاندی کے گہنوں سے بجی جل پریوں سے کہیں زیادہ دلوں کو موہ لینے والی ہوتی ہیں۔ وہ روہی کی ایک عورت ہی تھی جس نے ایک شاعر کو اپنے عشق میں وارفتہ بنادیا اور جس کے فراق میں اس نے سرائیکی میں دنیا کی چند لازوال تپتی ہوئی نظمیں لکھیں۔

ایک مصنوعی پلاٹ اور بیشتر فلیٹ (flat) کرداروں کے باوجود روہی اس ناولا میں موجود ہے کیونکہ مصنفہ روہیوں کے دیس میں شادی شدہ ہے اور وہیں رہتی ہے۔ اب رائٹرز لک اس کے ساتھ نہ تھی تو ہم اسے الزام نہیں دے سکتے۔ یہ واردات یا بدبختی ہم سب کو اکثر آن لیتی ہے۔

مگر ناولا دلچسپ ہے اور ایک بار پڑھنے کے لائق۔ روہی سے محبت کرنے والوں کے لیے اس کا پڑھنا ایک مسٹ (must) ہے۔

(فنون، لاہور، نومبر ۱۹۷۰ء)

لمحے کی بات

منیر احمد شیخ

"لمحے کی بات" ٹائپ میں چھپی ہوئی ایک حسین وجمیل کتاب ہے جسے خواہ مخواہ اٹھا لینے، اُلٹنے پلٹنے اور پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ اس میں چودہ کہانیاں ہیں، قریب قریب سب کی سب پڑھنے کے لائق، کیونکہ ان

میں عجیب باتیں ہیں جنھیں انوکھے پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔ یقیناً اس مصنف کا طریق اظہار بے حد اوریجنل اور نیا ہے — اس طریق اظہار سے مختلف جس سے ہم اردو افسانے میں اب تک شناسا تھے۔

منیر احمد شیخ ایک نوجوان مصنف ہے جو چند برس سے لکھ رہا ہے۔ میں اس سے پہلے پہل ''فنون'' میں اس کی ایک کہانی کے توسط سے متعارف ہوا۔ تب بھی میں اس کی تحریر کے اُجلے پن اور اس کے اسلوب کی انفرادیت پر چونکا تھا۔ یہ کہانی ان کہانیوں سے کچھ مختلف تھی جو ادبی رسالوں میں نظر سے گزرتی ہیں۔ یہ ایک نارمل کہانی نہیں تھی اور میں نے محسوس کیا تھا کہ منیر احمد شیخ ہمارے صحیح الخیال اور ضابطے کے پابند افسانہ نگاروں کے گروہ سے ہٹ کر کھڑا ہے۔ اب اس کے افسانوں کے مجموعے ''لمحے کی بات'' کی مختلف کہانیاں پڑھنے کے بعد مجھے اس کے مشاہدے اور تخیل کی اپنا رلٹی کے بارے میں کوئی شبہ نہیں رہا۔ اس کی ایک اپنی الگ رنگین عینک ہے، اپنی آواز ہے، اپنا انفرادی جھنڈا ہے۔

مگر کیا منیر کی کہانیاں، کہانیاں ہیں — مروجہ اصولوں کی تکنیک میں ڈھالی ہوئی، ایسی کہانیاں جو 'مختصر افسانے' کہلاتی ہیں؟ میں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مصنف نے اپنی کتاب کے دلچسپ اور پُر ادراک دیباچے میں، جسے وہ ''سیاہ حرف کا فسانہ'' کہتا ہے، اسی خدشے کا اظہار کیا ہے:

> یہ لمحوں کی کہانیاں افسانے ہیں بھی کہ نہیں۔ انشائیے ہیں کہ محض تحریریں، یہ میرا مسئلہ ہی نہیں۔ یہ مسائل شعر و ادب کے مسائل ہیں اور مجھ کو شعر و ادب سے طالب علمانہ سروکار ہے اور بس —

اس سے پہلے وہ ہمیں بتاتا ہے کہ:

> یہ افسانے میرے لمحوں کی کہانیاں ہیں، اُن مجبور لمحوں ن[illegible]نیاں جن میں نئے سے نیا دن، نویلی سی نویلی شام کبھی نہیں آئی۔

یہ ایک حساس اور درد آشنا نوجوان کا مایوسی اور بے مرادی کے عالم میں نوحہ ہے، یا کیا یہ محض ایک پوز ہے یا جواں سالی کی ڈرامائیت؟ مگر منیر کی ان کہانیوں میں جو کچھ بھی ہو، قنوطیت نہیں ہے، زندگی کی تردید نہیں ہے۔ یہ سب سچی کہانیوں کی طرح زندگی کے حزن اور شادمانی میں رچی بسی کہانیاں ہیں۔ مجھے ان میں کہیں بھی کوئی ایسا عنصر دکھائی نہیں دیا جسے قطعیت کے ساتھ یاس کا نام دیا جا سکے۔

مجھے کہانی یا مختصر افسانے کی تعریف نہیں آتی۔ بچپن سے کہانیوں کا رسیا ہونے کی وجہ سے میں

Scanned with CamScanner

نے کئی سو کہانیاں پڑھی ہوں گی — اچھی اور بری، المیہ اور مزاحیہ، طویل اور مختصر۔ چند کہانیاں میں نے خود بھی لکھی ہیں — بہت معمولی اور شاید بے ہودہ۔ لیکن اگر آپ مجھ سے کہانی کی تعریف کرنے کے لیے کہیں تو میں بغلیں جھانکنے لگوں گا۔ میں تعریفوں کے معاملے میں بالکل کورا ہوں۔ میں نے ہمیشہ ان لوگوں پر رشک کیا ہے جو صاف شفاف، منطقی اور قواعد داں ذہن کے مالک ہوتے ہیں اور ادب کی مختلف اصناف کی بے ٹوک حتمی تعریفیں کر سکنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ بدقسمتی سے میرا ذہن نہایت پراگندہ، گنجلک اور بے ترتیب ہے اور میرا سرمایہ لغت قابل رحم۔ تاہم، جیسا کہ میں نے کہا ہے، میں کہانیاں بڑے ذوق وشوق سے پڑھتا ہوں اور 'کہانی' اور 'نا کہانی' میں تمیز کر لیتا ہوں۔ اب جہاں تک میں سمجھتا ہوں، کہانیاں کئی قسم کی ہوتی ہیں اور انھیں کہنے کے ایک سو ایک ڈھنگ ہیں۔ ایک تو وہ جچی تلی، ترشی ترشائی کہانیاں جیسی موپاساں، ماہام یا منٹو لکھا کرتے تھے۔ یہ وہ کہانیاں ہیں جو آغاز، وسط اور انجام رکھتی ہیں، جن میں کرداروں کے نام، حلیے، وضع قطع اور بول چال کے پہچانے جانے والے اوصاف واضح ہوتے ہیں اور یہ کردار ایک خاص واقعے یا پلاٹ کی حدود میں اپنے اپنے مقررہ پارٹ ادا کرتے ہیں۔ پھر وہ کہانیاں ہیں جیسی کافکا، ورجینیا وولف، ڈی لا میئر اور کئی دوسرے لکھتے تھے۔ یہ کہانیاں ایک ذہنی جھٹپٹے کی سرنگ میں سفر کرتی ہیں اور ان کے دریچوں میں سے سنگ میل، تار کے کھمبے، کوہ ودرخت کے مناظر روشن اور واضح تو دکھائی نہیں دیتے مگر ان کی موجودگی محسوس کی جاتی ہے۔ ان کے کردار فوکس سے قدرے باہر ہوتے ہیں — عادتوں، گفتگو اور موڈ کے ہیولے جن میں اپنے خالق کی ودیعت کی ہوئی ایک الہامی قوت ہوتی ہے۔ ان کہانیوں میں کوئی معین پلاٹ نہیں ہوتا: ہوتا ہے تو اس کی اہمیت برائے نام اور ثانوی ہوتی ہے۔ کرداروں، مناظر اور واقعات پر ایک دھندسی ہوتی ہے۔ اس کے باوجود ان میں سے بعض کا تاثر ناقابل فراموش اور بے کل کر دینے والا ہوتا ہے۔

برطانوی ناول نویس ای ایم فارسٹر نے ایک بار، اپنی افسردہ اور ملول آواز میں، افسانے کے متعلق لکھتے ہوئے کہا تھا، "ہاں پیارے، ہاں، افسانے میں کہانی ہوتی ہے..." آگے چل کر اس نے اقرار کیا تھا کہ افسانے کا یہ ایک بنیادی وصف ہے جس کے بغیر افسانہ بے وجود رہتا ہے۔ لیکن پھر وہ خواہش کرتا ہے کہ کاش کہانی، کہانی کی بجائے کچھ اور بن سکے: "ایک سریلا گیت — صداقت اور حقیقت کا گیان — مگر اے خدا! یہ پست پر کھاروگی روپ (فارم)... نہیں، نہیں!" ماہام نے فارسٹر کو اس پر ایک تیکھا

جواب دیا تھا جس میں انگوروں کے کھٹا ہونے اور لومڑی کی دم کٹ جانے کی باتیں تھیں۔ ماہام، جو آغاز، وسط، انجام قسم کی کہانی کا استاد تھا، یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ کہانی کہانی کے بغیر بھی کہانی ہو سکتی ہے۔ اس نے فارسٹر پر واضح کیا کہ فارسٹر اس لیے ماتم کر رہا ہے کہ وہ خود آغاز، وسط، انجام والی کہانی نہیں لکھ سکتا۔ یہ طعنہ درست نہیں۔ فارسٹر کے ناولوں اور افسانوں میں اچھے خاصے ترشے ڈھلے پلاٹ ہیں۔ ہاں، جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، دوسرے کئی فن کار تھے، مثلاً ورجینیا وولف یا جیمز جوائس جیسے، جنھوں نے کہانی میں کہانی بھرنے کی کبھی پروا نہ کی۔

منیر، میں سمجھتا ہوں دوسری قسم کے افسانہ نگاروں میں سے ہے — وہ جو فارسٹر کے الفاظ میں، کہانی کو 'سریلا گیت، صداقت یا حقیقت کا گیان' بنانا چاہتے ہیں۔ یہ بات نہیں کہ ان کہانیوں میں پلاٹ نہیں ہے؛ پلاٹ ان میں ہے، مگر ڈھیلا ڈھالا اور محض ایک روایت کے احترام کے طور پر۔ کرداروں کے نام بھی ہیں، ان میں صورت و سیرت کی خصوصیات بھی موجود ہیں، مگر وہ راؤنڈڈ (rounded) کردار نہیں ہیں۔ وہ جان بوجھ کر آؤٹ آف فوکس ہیں۔ اس طرح وہ غیر حقیقی نہیں ہو جاتے کیونکہ ان کی بات چیت کی گونجیں ہمارے تحت الشعور کی تھاہ تک پہنچتی ہیں۔ اکثر کہانیوں میں شہر اور مقامات بے نام اور ایبسٹر کٹ ہیں۔ اس کے باوجود ان کے ماحول، ان کی فضا، ان کے انسانی اطوار پر عجیب آسیبی اثر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یہ کہانیاں پڑھتے ہوے میں نے دریافت کیا کہ منیر شہروں سے ایک ایبنارمل (abnormal) طریق پر آبسسڈ (obsessed) ہے۔ وہ اسے یا اس کے کرداروں کو خوش کرتے، ستاتے اور ڈراتے ہیں۔ ایک دو کہانیوں میں تو شہر ہی اصل غالب کردار ہیں، کبھی دل جوئی کرنے والے اور کبھی زہریلے اور پُر قہر! منیر کے شہر ٹیڑھی میڑھی گلیوں والے فصیل دار شہر بھی ہو سکتے ہیں، اور شفاف سڑکوں اور شیشے اور فولاد کے مکانوں کے شہر بھی — کافکائسک شہر!

منیر کی دوسری آبسیشن محبت ہے — رُکی ہوئی، سہمی ہوئی، اجر سے محروم محبت جس میں دل کی ہوک اور نامعلوم سی تڑپ ہے۔ ایسی محبت اس مجموعے کی کئی کہانیوں کا موضوع ہے۔ منیر ان لوگوں میں سے ہے جن پر ان کے ماضی کی یادیں، احساسات اور تاثرات ہر دم شدید طور پر مسلط رہتے ہیں، جو صحیح معنوں میں صرف اپنے ماضی ہی میں جی سکتے ہیں اور مثالی زمینی کیڑے کی طرح اپنے ماضی کی جانب ہی اگتے اور پروان چڑھتے ہیں۔ کہانیاں لکھنے والوں کی باتوں پر فوراً یقین نہیں کر لینا چاہیے، مگر میرے

خیال میں آپ فلیپ پر مصنف کے تعارف میں اس بیان کو کہ اس کے شب و روز شبانہ سیریں ہیں جو ماضی بن گئی ہیں، سچ مان سکتے ہیں۔ یہ فقرہ فلیپ پر بیشتر عبارتوں کی طرح یقیناً محض نمائش اور 'تھیٹر پنے' کا اثر پیدا کرنے کے لیے درج نہیں کیا گیا اور ایسی کوئی وجہ نہیں کہ مصنف محض سنسنی کے مقصد سے جھوٹ بول رہا ہو۔ اس کی کہانیوں میں ماضی کی طرف اس کے رجحان کا کافی ثبوت موجود ہے۔ ایک آدمی جھوٹ بول سکتا ہے مگر اس کی تحریریں جھوٹ نہیں بول سکتیں، اور پھر ایسی تحریریں جن میں آپ بیتی کے عنصر کو چالاکی اور سلیقے سے افسانوی فارم میں گوندھ دیا گیا ہو اور جو قلم کی بجائے مساموں سے لکھی گئی ہوں۔ منیر عام قلم سے نہیں لکھتا؛ وہ سچ مچ اپنے مساموں سے لکھتا ہے اور ایک ایسی خود فراموشی اور تندی کے ساتھ جو پڑھنے والے کو بے سکون کر دیتی ہے۔ اس مجموعے کی کم اچھی لکھی ہوئی کہانیوں میں بھی یہ پراسرار آسیبی سی صفت موجود ہے۔ یہ کہانیاں پریوں کی کہانیاں تو نہیں ہیں لیکن پریوں کی کہانیوں اور ان میں ایک عنصر سانجھا ہے — فینٹسی اور حیرت کا عنصر۔

مصنف کے کردار ایک محدود طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ عموماً اس کے الفاظ میں، کلاس تھری اور فور کے شہری، متوسط الحال افسر، بس کنڈکٹر، 'باؤ لوگ' (یہ باؤ لوگ اس کی ایک اور آبسیشن ہیں!)۔ اس کے افسانے میں ایسے لوگ نہیں ملتے جو ہوائی جہاز چلاتے ہوں، کوہ پیمائیاں کرتے ہوں، پانچویں چھٹے منصوبے بلکہ بجٹ تیار کرتے ہوں۔ نہ ہی ان شہری کہانیوں میں پربتوں کی طوفانی، زندگی بخش ہوائیں چلتی ہیں۔ کھلے آسمان اور لامحدود میدان ان میں نہیں۔ گندم کے سنہری کھیت ان میں نہیں لہلہاتے۔ منیر کے کردار 'گلاس ہاؤس' کردار نہیں ہیں۔ آپ شاید کہیں کہ یہ ایک مصنف کے لیے زبردست ہینڈی کیپ (handicap) ہے اور ایسی کہانیاں یک رنگ اور حد درجہ افسردہ کرنے والی ہوں گی۔ بالکل نہیں، یک رنگ وہ قطعی نہیں اور ان میں موضوعات و مناظر کی بڑی گونا گونی ہے۔ وہ قریب قریب ہمیشہ دلچسپ ہوتی ہیں اور ان کی ایک گرفت ہوتی ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، یہ کرداروں اور پلاٹ کی کہانیاں نہیں ہیں اور اپنی دلچسپی کے لیے افسانہ نگاری کے مسلمہ سہارے نہیں لیتیں۔ وہ سریلے گیت ہیں۔ صداقت اور حقیقت کی چھٹپٹی، پُرحیرت جھلکیاں!

مثلاً اس مجموعے کی پہلی کہانی ''شہر نا پرساں'' کو لیجیے۔ یہ اس کتاب کی زیادہ اچھی اور متوازن کہانیوں میں سے نہیں، مگر اپنی شہروں اور بے اجر محبتوں کی تقسیم کے ساتھ آپ اسے مصنف کی ایک

typical کہانی کہہ سکتے ہیں۔ پہلے ہی صفحے سے پڑھنے والا منیر شیخ کی عجیب جھٹپٹی دنیا میں داخل ہو جاتا ہے۔ مصنف اس غیر مشخص شہر کو بیان کرنے میں تین چار صفحے لیتا ہے — شہر، جو دن میں اپنے ٹریفک کے ہجوم اور ہنگامے کے باوجود، پتھر اور اینٹ کا ایک پُر وحشت ویران جنگل ہوتا ہے اور راتوں کو چاند کی روشنی میں اپنی سب عشوہ طرازیوں اور سحر انگیزیوں کے ساتھ جاگ اٹھتا ہے۔ چھوٹی اینٹوں سے چنی ہوئی حویلیاں، برج اور جھروکے اور چھجے آپس میں سرگوشیاں کرنے لگتے ہیں اور عجیب کہانیاں سناتے ہیں۔ یہ مصنف کا خاص انداز ہے کہ اس شہر کا کوئی نام نہیں ہے۔ اگر اس شہر کا نام ہوتا تو وہ سارا غیر دنیاوی اثر جو مصنف پڑھنے والے کے ذہن پر طاری کرنا چاہتا ہے، زائل ہو جاتا۔ دو دوست — ایک دوسرے کے رازداں — رات کو اس شہر میں ایک ریستوراں کے کونے میں مل بیٹھتے ہیں (وہ دن کو نہیں ملتے؛ دن کو وہ ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہوتے ہیں)۔ ریستوراں کا بھی کوئی نام نہیں ہے۔ ان دوستوں میں سے ایک افتخار ہے، نہایت کم آمیز، مصنف کے الفاظ میں:

> بند کمرے کی طرح جس پر صدیوں سے تالا پڑا ہو۔ اس تالے کو اس کا کوئی دوست نہیں کھول سکتا تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ وہ اسے کھولنے کی اجازت نہ دیتا تھا۔ اس کے بہت سے جاننے والوں نے ہر طرح کی کنجیاں آزمائی تھیں لیکن وہ تالا کنجیوں سے کھلنے والا تھا ہی نہیں۔ یہ تالا جب لگا تھا تو اس پر طلسم پھونک دیا گیا اور اس کے دوستوں کے پاس اسم اعظم نہیں تھا۔ باری باری ہر ایک اپنی قسمت آزما چکتا تو یہ کہہ کر چپ ہو جاتا کہ یار یہ تو ٹھنڈا اور بند آدمی ہے، اس کا تو خانہ ہی خالی ہے۔ لیکن جب خانہ ہوتا ہے تو کبھی خالی نہیں ہوتا۔ افتخار کے خانے میں صدیوں کی سوئی ہوئی خواہشیں دبی پڑی تھیں اور ان خواہشوں کو اس نے اس بے رحمی کے ساتھ سلایا ہوا تھا کہ وہ اس کی آنکھوں میں بھی کبھی نہیں جاگی تھیں۔

یہ دو دوست ریستوراں کے کونے میں کیا باتیں کرتے ہیں؟ ان کی باتیں بے حصول، بے اجر محبت کے متعلق ہوتی تھیں۔ ان بے نام لڑکیوں کی جو بازوؤں میں نہیں آسکتی تھیں اور جن کو دور سے ہی پوجا جا سکتا تھا۔

اور جب صغیر اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہتا، ''یار، یہ سالی زندگی بھی کیا زندگی ہے۔ بس بیٹھے ہوئے ہیں الو کے پٹھوں کی طرح! کچھ کرنا چاہیے، کچھ ہونا چاہیے...'' — ''کیا کرنا چاہیے؟''

Scanned with CamScanner

افتخار تلخی سے بول اٹھتا۔ ''تمھارا مطلب ہے ان لڑکیوں کے پیچھے سائیکلیں اور موٹریں لے کر بھاگا جائے؟ یہ تو لونڈوں کے شغل ہیں۔ یا اسکولوں اور کالجوں کے دروازوں پر اور بس اسٹاپ پر انتظار کیا جائے؟ یہ ایک خاص عمر کے کھیل ہوتے ہیں۔ اب ہم سیانے ہیں اور سیانی اور سمجھدار لڑکیوں کو خود سے جاننا چاہیے کہ وہ ہم سے ملنے کے مواقع پیدا کریں اور جب ملیں تو چھوٹی چھوٹی انجان بچیوں کی سی حرکتیں نہ کریں۔ ذرا کھل کر ملیں۔ میرا مطلب ہے نارمل طریقے سے، جیسے ایک عورت مرد سے ملتی ہے۔

[اور صغیر افتخار سے کہتا] ''لیکن میری جان! یہ تم کیوں نہیں سوچتے کہ تم لڑکیوں سے ایسے ملو جیسے ایک مرد عورت سے ملتا ہے، میرا مطلب ہے نارمل طریقے سے۔''

[اور افتخار جواب دیتا ہے] ''نارمل طریقے پر بھی مل کے دیکھ لیا ہے۔ وہ دور سے اچھی لگتی ہیں — خطوں میں، ٹیلی فون پر، اپنے ماں باپ کے گھروں میں — لیکن ان سے باتیں کرو تو سارا جادو ٹوٹ جاتا ہے۔ لڑکی کتنی پڑھی لکھی اور کتنی حسین کیوں نہ ہو، وہ ایک نہ ایک مقام پر اسٹوپڈ ہوتی ہے۔ دو چار دن دلچسپی قائم رہتی ہے اور جب مل بیٹھنے کا موقع ملتا ہے تو میں ایک آدھ دن ہی میں بور ہونے لگ جاتا ہوں۔ بس اب تو تاکنے جھانکنے ہی میں لطف باقی رہ گیا ہے۔ کسی ایک لڑکی کے ساتھ زندگی کرنا اب ہمارے بس کا روگ نہیں رہا۔

صغیر اور افتخار جنسی لحاظ سے ہمارے گھٹے ہوئے معاشرے کے دو نوجوان ہیں۔ ان کے کردار ویل راؤنڈڈ نہیں اور ان کی گفتگو کچھ رُکی ہوئی سی، ترچھی سی، ''انگور کھٹے ہیں'' کا سا لہجہ لیے ہوئے ہے۔ اس کے باوجود آپ محسوس کرتے ہیں کہ بہت سی اَن کہی باتیں کہہ دی گئی ہیں۔ ''شہر نا پرساں'' کی ایک کو دوسرے سے جدا کرنے والی تنہائی پس پردہ منڈلاتی ہے اور میں نے صغیر اور افتخار کی باتوں میں ان باتوں کی ایک دھیمی گونج سنی جو دو ایسے ہی دوست کبھی لاہور کے ایک ریستوراں کے کونے میں بیٹھ کر کرتے تھے!

افتخار صغیر سے کہتا ہے کہ اس شہر میں اب کچھ نہیں رکھا ہے۔ صغیر ایک اور شہر میں چلا جاتا ہے مگر پہلا شہر اسے پکارتا رہتا ہے۔ نئے شہر میں اس کا کوئی واقفِ حال نہیں۔ وہاں ہر چیز اجنبی، سرد، گھناؤنی ہے اور آدمی سنگ دل اور بدوضع۔ پھر اس کی دوست لڑکیوں کے خط اسے آتے ہیں۔ سب میں اس کے چلے جانے کا رنج ہے، اور سب کہتے ہیں، ''واپس آ جاؤ، واپس آ جاؤ''۔ وہ چھٹی لے کر پہلے شہر میں

Scanned with CamScanner

اپنے دوست افتخار کے پاس پہنچتا ہے۔ سارے خط اس کے سامنے ڈال کر کہتا ہے:

''اب بول، میرے لیے کون سی جائے پناہ ہے؟ اب اس شہر میں میری واپسی کیسے ممکن ہے؟ میں کہاں چلا گیا ہوں؟ اور اب چلا گیا ہوں تو اس شہر نے اپنے سارے خزانے کیوں اُگل دیے ہیں؟ یہ سب کیا ہوا؟ —— مجھے سمجھا تو!''

افتخار نے خط واپس کرتے ہوئے، ننگی سی ہنسی ہنس کر کہا: ''دروازے تمھارے آگے نہیں، پیچھے کھلے ہیں۔ ہجرت میں دونوں ہی باتوں کا امکان ہے۔ ان آوازوں کو سنو لیکن پیچھے مڑ کر نہ دیکھنا، پتھر بن جاؤ گے۔''

صغیر اس شہر سے باہر نکلا تو پرچھائیوں سے آواز آئی:

''تو نہیں جانتا کہ تو کیا چھوڑ کے جا رہا ہے۔ تو چند پیسوں کے لیے اپنا اطمینان ہمیشہ کے لیے کھو دے گا۔ روحانی سکون کی قیمت سکون میں مت ڈھونڈ۔ ٹوٹے ہوئے رشتوں کو جوڑنا آسان نہیں۔ اب بھی وقت ہے۔ رک جا! رک جا!''

آنسو اس کی آنکھوں سے بہے جا رہے تھے لیکن وہ اس خوف سے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتا تھا کہ وہ آوازیں کہیں پتھر کی نہ بن جائیں۔

میں نے اس کہانی کا ذکر تفصیل سے کیا ہے کہ اس سے لکھنے والے کا ڈھنگ، اسلوب، انداز تخیل واضح ہو جائے۔ ایک تنقید نگار کے الفاظ ناگزیر طور پر گھسے پٹے cliches ہو جاتے ہیں اور شاذ و نادر ہی ایک کتاب کی روح اور اس کے ذائقے کو پڑھنے والے کے شعور میں منتقل کر پاتے ہیں۔ اب یہ کہانی آغاز، وسط، انجام والے مختصر افسانے کی کسوٹی پر پرکھی جائے تو کوئی اسے ایک اچھی یا خالص (pure) کہانی نہیں کہے گا۔ اس میں کوئی ایسی شے نہیں جسے پلاٹ کہا جا سکے۔ کوئی سچویشن، کوئی ارتقا، کوئی ڈویلپمنٹ نہیں، کوئی غیر مبہم اور واضح کردار نہیں جسے چھوا اور ٹٹولا جا سکے۔ اس کے مختلف اجزا ایک بے نظمی اور بھونڈے پن سے اکٹھا کر دیے گئے ہیں۔ اس کے باوجود اس کا مجموعی تاثر haunting ہے۔ بات یہ ہے کہ یہ رن آف دی مل مختصر افسانہ نہیں؛ یہ معاشی چکی، ازلی تنہائی، جنسی گھٹن، سنگ دل انسانیت کا ایک نغمہ ہے جو نثر میں لکھا گیا ہے۔ یہ کہانی —— اگر یہ کہانی ہے —— دل پر ضرب لگاتی ہے اور یہی کافی ہے۔ یہی فن کا مقصد ہے۔

Scanned with CamScanner

دوسری کہانیاں مزاح اور حزن اور مسرت سے پر ہیں اور سب پڑھنے کے لائق ہیں۔ وہ قلب و ذہن پر اثر کرتی ہیں اس لیے مجھے پسند ہیں۔ ان میں سب سے اچھی مجھے "باؤبس" لگی اور باؤبس کے کنڈکٹر چاچے سے مجھے محبت ہوگئی۔ چاچے کو میں بھی جانتا ہوں۔ برسوں پہلے، کراچی کی ایک بس روٹ نمبر ۳۶ میں میں چاچے سے ملا تھا۔ اس کے وجود سے بس میں زندگی اور زندگی کی حدت تھی۔ بچے اس سے پیار کرتے تھے۔ وہ چاچا بھی باؤبس کے چاچے کی طرح اب مر چکا ہے۔ میں نے اس پر ایک کہانی لکھی تھی، "روٹ نمبر ۳۶"، مگر وہ اچھی کہانی نہیں تھی اور پھر میری لاتعداد ڈائریوں میں کہیں کھو گئی۔ منیر کی خوبصورت کہانی کے بعد اب مجھے اسے دوبارہ لکھنے کی ضرورت نہیں رہی۔ اس نے وہ سب کچھ کہہ دیا ہے جو میں کہنا چاہتا تھا۔ چاچے جیسے لوگ ہی دنیا کے اصل عظیم آدمی ہیں، اگرچہ ان کے بیانات اور تذکرے اخباروں میں نہیں چھپتے۔ ایسے لوگ نہ ہوں تو دنیا منیر کے ایک شہر کی طرح گھناؤنی اور بھیانک ہو جائے — ایک ایسی سرائے جو لحظہ بھر رکنے کے لیے بھی ناقابل ہو۔ مکمل اور قطعی مایوسی یا پھر خودکشی کا جواز تبھی پیدا ہو سکے گا جب دنیا چاچے کے سے لوگوں سے خالی ہو چکے گی (اور غالباً وہ وقت کچھ ایسا دور نہیں!)۔

'تیسرا روپ'، کسی قدر فارمل ہے۔ کہانی کا 'میں' بستے گوجر کی لڑکی چھیموں کو، جو اس کی بچپن کی محبوبہ تھی اور جس کی دودھیا سڈول پنڈلیوں کو دیکھ کر اس کا دل پرندے کی طرح پھڑپھڑانے لگتا تھا، برسوں کے بعد اسی بسے گوجر کے مکان کے باہر دیکھتا ہے۔ وہ جو وانڈھو کے ایک نوجوان گوجر کے ساتھ بھاگ گئی تھی اور اس کی بیوی بن چکی تھی، اب اپنے روتے ہوئے بچے کو لیے کھڑی ہے۔ 'میں' وہاں رک جاتا ہے۔ چھیموں اپنا کرتا اٹھاتی ہے اور بڑی بے نیازی سے 'میں' کو نظرانداز کر کے اپنی چھاتی بچے کے منھ میں ڈال دیتی ہے۔

"ون اصغر مال" اور "پی بی ایل ۵۳۶" پر بھی شہر کا بھیانک، آسیبی تسلط ہے۔ دوسری کہانی میں اس کا واحد کردار سڑک پر چلتے چلتے اپنی ٹانگوں کو ہاتھ لگا کر اور خود کو ایک اسکوٹر گمان کرتے ہوئے، یہ جاننے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ کون سے گیئر میں ہے۔ وہ فرسٹ گیئر میں چلتا ہے اور پھر سیکنڈ اور تھرڈ گیئر میں، اور پٹرول پمپ پر اپنی ٹینکی میں پٹرول ڈلوانے کھڑا ہو جاتا ہے۔ وہ یقیناً پاگل ہے۔ مگر اس مشینی، بے مہر، ناپرساں دنیا میں ہم سے کون ہوش مند ہے؟ ہم سب بے روح، احمق مشینیں ہیں یا بنا دیے گئے

ہیں ـــــ اسکوٹر اور بسیں اور ڈیزل انجن۔ یہ درست ہے کہ اس کہانی میں واحد کردار کا نام نہیں۔ اس کی نمبر پلیٹ ہے: پی بی ایل ۵۳۶۔

''لمحے کی بات'' ایک اور بہت اچھی کہانی ہے۔ اس میں ایک لڑکی فلسفے کا ایم اے کرنے اور سارتر کی تحریروں اور فلسفۂ موجودیت پر عبور حاصل کرنے کے بعد اپنی زندگی کو اسی فلسفے پر ڈھالنے کی کوشش کرتی ہے۔ وہ روایت سے باغی ہے اور شادی کے ادارے کو دقیانوسی اور مضحکہ خیز سمجھتی ہے۔ (یہاں میں اس سے اور جان اپڈائیک کے ناول Couples کے کرداروں سے کلی اتفاق کرتا ہوں۔ ''کپلز' میں تو اس ادارے کو زیادہ لچکدار اور عقلی بنانے کا حل بھی موجود ہے!) اس لڑکی کی باتیں کافی انٹلکچوئل اور شاکنگ (shocking) ہیں۔ مثلاً وہ کہتی ہے کہ ہمارے باپ دادا کی زندگی فلمی تھی اور ہم سب کو ماضی اور مستقبل کو بھول کر لمحے کے لیے جینا چاہیے۔ وہ آخرکار ایک کالج لیکچرار سے جو ایئر فرانس کا اسٹیورڈ لگتا ہے، شادی کر لیتی ہے اور، حیرت ثم حیرت یہ کہ ایک روایتی عورت اور ماں بن جاتی ہے۔ جب اس کا ایئر فرانس کا اسٹیورڈ ایک پڑوسن سے یارانہ گانٹھتا ہے تو اس میں ایک عام عورت کی تلخی، حسد اور غصے کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس سے بڑا دکھ یہ ہے کہ پڑوسن کا خاوند صاحب بیچتا ہے اور وہ ولگر (vulgur) عورت ہے۔ وہ کہانی کے 'میں' کے سامنے اپنا رونا رونے آتی ہے، جو ہنستا ہے اور پڑوسن کا واقعہ سن کر کہتا ہے کہ خدا کا شکر ہے پڑوسن اور ایئر فرانس کے اسٹیورڈ نے سارتر کو نہیں پڑھا۔ ''لمحے کی بات'' ان لوگوں پر طنز ہے جو فلسفیانہ آئیڈیل کا کنٹوپ پہن کر یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ گوشت پوست کے کمزور بودے انسان ہی تو ہیں ـــــ انسان کی سب بنیادی ازلی جبلتوں کے ساتھ!

''پرانی بستی نئی دیوار'' ایک اور اچھی کہانی ہے ـــــ ایک قسم کی الیگری (allegory) جو بہت سی ان کہی باتیں کہتی ہے۔ پرانی بستی کے مکین ایک ڈیم بننے پر ایک نئی بستی میں منتقل کیے جاتے ہیں کیونکہ پرانی بستی کی طرف ڈیم کی جھیل کے پانی چڑھتے آ رہے ہیں۔ سب لوگ، سوائے تین رواقی فلسفیوں کے، پرانی بستی چھوڑ جاتے ہیں۔ یہ ماسٹر کرم دین، سائیں بودے شاہ اور ایک بوڑھی ضعیف الاعتقاد عورت مائی حاجن ہیں۔ یہ بہادر اپنی پرانی بستی میں ڈٹے رہتے ہیں اور آخرکار امڈتے ہوئے سیلاب میں غرق ہو جاتے ہیں اور عجیب بات یہ ہے کہ قاری ان لوگوں کی بے ہودہ کوئکزاٹک (Quixotic) جرأت کو پسند کرتا ہے۔ پرانی بستی کو نہ چھوڑنے کی ان کے پاس مختلف وجوہ ہیں۔ ماسٹر کرم دین تو سرے

Scanned with CamScanner

سے یہ یقین ہی نہیں کرتا کہ پانی بسی بسائی بستیوں میں گھس سکتا ہے؛ سائیں بودے شاہ اپنے پیر سائیں قلندر شاہ کے مزار کو نہیں چھوڑنا چاہتا، اور مائی حاجن آخر دم تک اپنے اعتقاد پر قائم، دھاگے پر کلام پڑھ کر پھونکتی رہتی ہے۔ اس کہانی کے وسیع مفہوم اور متنوع معانی ہیں جو ہر قاری کو خود سوچنے چاہییں۔

''قیمتی آدمی'' ایک دفتری افسر کا پورٹریٹ ہے اور ہمیں برطانیہ سے ورثے میں ملے ہوئے سارے بیوروکریٹک سیٹ اَپ پر ایک بے رحم اور تمسخر انگیز طنز ہے۔ چھوٹے اور گھسے ہوئے جسم کا کفیل الرحمٰن بدبودار اور نفرت کی پوٹ ہے جو کتابیں رٹ کر کلاس ون گزیٹڈ افسر بن جاتا ہے۔ یہاں اس کے کلرک ہیں جن کو شاباشی دے کر سب کام کراتا ہے۔ اس کا بڑا افسر ہے جسے وہ پکنک پر ہاٹ کیس میں تلی ہوئی مچھلی کھلاتا ہے۔ دو بابو ہیں جو کفیل الرحمٰن کی صرف تنخواہ اور ٹی اے بل بنانے کے کام پر مقرر ہیں اور سارے مہینے اور کچھ نہیں کرتے۔ خانساماں ہے جو تلی ہوئی مچھلی ہاٹ کیس میں بند کرتا ہے۔ کفیل الرحمٰن کی گھنٹی ہے اور چپراسی ہے اور اس کے کمرے کو گرم اور سرد رکھنے کا اہتمام ہے۔ کفیل الرحمٰن ہمیشہ کام کی زیادتی کا ذکر کرتا ہے حالانکہ سب کام اس کے دفتر کے کلرک کر دیتے ہیں۔ یہ کسی کو معلوم نہیں کہ کفیل الرحمٰن خود کیا کرتا ہے مگر اس کے بڑے افسر کی رائے میں وہ ان قیمتی افسروں میں سے ہے جن کی وجہ سے حکومت کے انتظام و انصرام کے پہیے گھومتے رہتے ہیں۔ کفیل الرحمٰن دراصل ڈرپوک ہے — اپنے ماضی سے خوف زدہ، رشتہ داروں سے خوف زدہ، ماتحتوں سے خوفزدہ۔ اُدھر اُس کے ماتحت اس سے خوفزدہ ہیں اور سارے سیٹ اَپ میں کام کرنے والوں کے درمیان کوئی انسانی رشتہ نہیں، اُنسیت اور ہمدردی کی ایک رمق تک نہیں۔ خانساماں کفیل الرحمٰن کو صرف اس حد تک جانتا ہے کہ وہ اس کا صاحب ہے جو سرکاری ٹیلی فون پر اسے اپنے بڑے صاحب کے لیے مچھلی بنانے کی ہدایت کرتا ہے۔ یہ ایلی گری بیوروکریٹک سیٹ اَپ کی ایک نہایت سچی اور جتاہ کن تصویر ہے۔ افسوس کہ ہمارے طائرِ لاہوتی محض کفیل الرحمٰن بن کر رہ جاتے ہیں، اور ہم سب چاہتے ہیں کہ ہمارے لڑکے بڑے ہو کر کفیل الرحمٰن بنیں۔

'سلاما لیکم'' ایک خوبصورت کہانی ہے اور دوسری ''سرگیان'' ہے۔ ان کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں کہ یہ کہانیاں قاری سے اپنے آپ کو پڑھوا لیں گی۔

یہاں میں مصنف کی ایک خوبی کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔ وہ ایک انسانیت پرست ادیب کی سوچ اور ذہن سے لکھتا ہے۔ اس کی وفاداریاں کسی ایک مسلک یا مکتبِ فکر سے وابستہ نہیں ہیں۔ وہ خود

Scanned with CamScanner

کو بعض قومی یا ملکی نظریات میں محدود کیے بغیر، جیسا چاہتا ہے لکھتا ہے۔ سب دیانت دارانہ اور سچی تحریریں اسی طرح لکھی جاتی ہیں۔ تنگ تعصبات اچھے فن کے لیے مہلک ہیں۔ یہ عرض کرنا یوں ضروری ہے کہ بہت سے عالی مرتبہ اور فاضل لوگ جن کی نگاہ اسکول اور کالج میں فقط گولڈ میڈل اور زریں کرسی پر رہی، اور جنھوں نے قطبی روشنی کی جوت اپنے اندر کبھی دمکتی محسوس نہیں کی، اب آئے دن ہمیں یہ نصیحت کرتے رہتے ہیں کہ اس ملک میں ہمیں کس قسم کا ادب لکھنا چاہیے۔ گویا ادب بھی محض قبائلی اور محض ملکی ہو سکتا ہے۔ گویا ادب ایک ٹوتھ پیسٹ یا کپڑے دھونے کا صابن ہے جو گنے چنے مخصوص اجزا سے ایک فیکٹری میں تیار کیا جا سکتا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ یہ برخود غلط ذی شان لوگ ادب کا مطلب نہیں سمجھتے۔ انھوں نے زندگی میں کوئی اچھی کتاب نہیں پڑھی، کسی کتاب کو پڑھ کر ان کے تخیل میں آگ نہیں بھڑکی۔ اگر ایک شخص نے فقہ و حدیث، رومن لا اور جیورسپروڈنس کی ہزاروں کتابیں پڑھی ہیں تو یہ لازم نہیں آتا کہ وہ تربیت یافتہ اور سلجھے ہوئے ذہن کا مالک ہو چکا ہے اور ادب کے بارے میں برملا اظہارِ خیال کر سکتا ہے۔ فن کار اکثر برے اور سرپھرے اور دیوانے لوگ ہوتے ہیں۔ رابرٹ برنز یا منٹو کی طرح وہ پہاڑیاں یا گلیوں میں زندگی کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ رابرٹ برنز کبھی اسکول گیا تھا۔ ہم سب جانتے ہیں کہ سعادت حسن منٹو تعلیم ادھوری چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ تخلیقی فن تدریسی یونیورسٹیوں کا محتاج نہیں ہوتا۔ مجھے یقین ہے کہ جدید تعلیم ایک زبردست فراڈ ہے۔ اس سے بیشتر صرف کفیل الرحمٰن ہی پیدا ہوتے ہیں —— متعصب اور محدود اور مفلوج ذہنوں کے لوگ جو منصوبے اور بجٹ تو تیار کر سکتے ہیں مگر کیٹس کی سانیٹ اور غالب کا شعر بھی ان کے ہیچ، پروزیک (prosaic) دلوں کا کوئی تار نہیں چھیڑ سکتا۔ یہ فاضل لوگ، یقین مانیے، ادب کو محض تضیع اوقات سمجھتے ہیں۔ ہر وہ چیز جو ان کے بٹوؤں میں پیسے اور اخباروں میں ان کا نام نہیں لاتی ان کے نزدیک تضیع اوقات ہے۔ مگر یہ قدرت کا طنز ہے کہ ایسے ہی لوگ ہمیں بتاتے ہیں کہ ہمیں کیا لکھنا چاہیے۔ انھیں چاہیے کہ وہ ادیبوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیں۔ وہ ہوتے بھی برے، پاگل اور غیر مہذب لوگ ہیں۔ ان ذی شان بزرگواروں کو اسی ملک میں کئی ڈاکٹر آف لٹریچر اور عالم پروفیسر مل جائیں گے جو معقول مشاہرے کے عوض ان کا نام نہاد 'ادب' ترتیب دیں گے —— نظریاتی مملکت کی تاریخیں، قومی شعور کو بیدار کرنے کی نظمیں، ترانے اور کیا کچھ الا بلا!

ایک لکھنے والے کو پوری کامیابی نصیب نہیں ہوتی اور ہمیں امید کرنی چاہیے کہ منیر ایک اچھی کتاب لکھنے اور چھپوانے کے بعد ایک فاتحانہ آسودہ خاطری سے الگ نہیں بیٹھ جائے گا۔ یہ یہاں کا عام المیہ ہے جس نے کئی لکھنے والوں کو ایک آدھ کتاب کے بعد خاموش کر دیا ہے۔ مصنف نے خود ''سرگیان'' میں ایک ایسے ہی آدمی کی کہانی لکھی ہے جسے موسیقی اور موسیقاروں سے والہانہ شیفتگی ہے۔ موسیقی ہی اس کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ وہ سخت، تنگ ودو کے بعد ایک انٹرویو میں کامیاب ہو کر کلاس ون افسر ہو جاتا ہے اور جب کہانی کا 'میں' اسے ایک دو سال کے بعد ملتا ہے تو اس کی شادی ہو چکی ہوتی ہے اور ان مصروفیات میں موسیقی کے ساتھ اس کی لگن ماضی کی چیز بن چکی ہوتی ہے۔ فن موسیقی پر اس کے بعد اس کا کوئی مضمون نہیں چھپتا اور وہ آدمی اتنا ہی ڈل اور مردہ ہو جاتا ہے جتنا کوئی اور کلاس ون افسر۔ لٹریچر دوسرے پیشوں سے کہیں زیادہ محنت طلب اور جان لیوا پیشہ ہے۔ یہ تو باقاعدہ ایک روگ ہے۔ لکھنے والے کا فن تبھی بڑھتا اور پروان چڑھتا ہے جب وہ صحیح لگن اور تندہی سے اپنے ایلڈوریڈو کے برجوں اور میناروں کی راہوں پر قدم مارتا جائے۔ ہم میں سے بہت سے، ایک سہل معاش کا آسرا پا کر اپنی ہمت کھو دیتے اور تھک ہار کر بیٹھ جاتے ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ منیر کے ساتھ ایسا نہیں ہوگا۔

(فنون، لاہور، نومبر ۱۹۷۰ء)

اُردو کی آخری کتاب

ابنِ انشا

میں ابنِ انشا کو ایک مدت سے جانتا ہوں۔ اس سے پہلے، بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح، میں اسے میر انشاء اللہ خان انشا کے پوتوں پڑپوتوں میں سے سمجھتا تھا جو فغفورِ چین اعلیٰ حضرت چیانگ کائی شیک کے زمانے میں چین کے ملک میں متوطن ہوا۔ اس نے چینیوں کو نظم معرا سے روشناس کرایا، چیانگ کائی شیک سے سیاسی اختلافات کی بنا پر وہ باغیوں میں شامل ہو گیا، کچھ عرصہ ماؤسی تنگ کے ساتھ غاروں میں رہا اور جب سرخ فوج نے شنگھائی کو آزاد کرایا تو بلاشبہ ہمارا ابنِ انشا اس ہراول دستے کے ساتھ تھا جو

سب سے پہلے اس شہر میں داخل ہوا۔ شنگھائی کی فتح سے چند ہفتے پہلے اس نے ایک عمدہ لمبی نظم اس شہر کے سقوط پر کہی۔ اس کی پیش گوئی حرف بحرف درست ثابت ہوئی اور کئی لوگوں نے اس سے اپنی ہونے والی بیویوں کے نام، متوقع جائیداد کی مالیت، بچوں کی تعداد اور اس قسم کے ضروری کوائف جاننے کی کوشش کی۔ اس وقت ابنِ انشا چاہتا تو ایک کامیاب نجومی کے طور پر نام حاصل کر سکتا تھا۔ اس کی پریکٹس خوب چمکتی کیونکہ خواتین کے اور بعض دوسرے رسائل کے مواد سے اندازہ ہوتا ہے کہ ملک کی اسی فیصد آبادی نجومیوں اور ستارہ شناسوں کی بدولت جی رہی ہے۔ ابنِ انشا نے اس سنہری موقعے کو کھو دیا اور شنگھائی سے لوٹنے کے بعد شعر و ادب کی دنیا میں اپنا نام پیدا کرنے کی ٹھانی۔ اس کی طبیعت ان مشاغل کے لیے موزوں تھی۔ برسوں کی کاوش اور لگن نے اسے نہ صرف ہمارے بہترین قدرتی شاعروں میں سے ایک بنا دیا بلکہ ایک مشاق، صاحبِ طرز نثر نگار بھی۔ وہ عام بخیل اور گھٹے ہوئے لکھنے والوں میں سے نہیں جو دو سال میں ایک شاہکار کو جنتے ہیں۔ وہ فیاضی سے، فراوانی سے اور آسانی سے لکھتا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اسے کبھی اپنی تحریر میں کاٹ چھانٹ کرنے یا اسے نوک پلک سے درست کرنے کی ضرورت پڑی ہو۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس نے لکھنے کے لیے مناسب ماحول یا خاص آمد کا انتظار کیا ہو۔ وہ اخباروں میں پچھلے بیس بائیس سال سے باقاعدگی سے لکھ رہا ہے۔ وہ ان خوش نصیب لکھنے والوں میں سے ہے جنھیں لوگ سب سے پہلے پڑھتے ہیں اور اس نے اب تک لاکھوں الفاظ لکھے ہوں گے۔ چونکہ اس میں صحیح اور باشعور ادبی پرکھ ہے اور ایک جھرنے کی اُبلتی ہوئی شگفتگی، اس لیے پیشہ وارانہ بسیار نویسی نے اس کے اسلوب میں پختگی اور روانی پیدا کر دی ہے۔ اس کی نثر میں کہیں بھونڈا یا بے وضع فقرہ نہیں ملے گا، کیونکہ اس نے اردو شعر و نثر کے استادوں کو دھیان سے پڑھا ہے۔ ایک قدرتی مزاح نگار کی حیثیت سے میرے خیال میں اگر اس دور میں اس کا کوئی ہمسر ہے تو وہ شفیق الرحمٰن ہے، مگر پھر ایک مدت سے شفیق الرحمٰن نے لکھنا چھوڑ رکھا ہے۔ شفیق کو اس کے پیشے کی مصروفیتیں کچھ لکھنے کی مہلت نہیں دیتیں۔ ابنِ انشا کا پیشہ ہی لکھنا ہے اور کافی عرصے سے ''جنگ'' اور دوسرے روزناموں میں اس کی مزاحیہ یا سفری کالم نگاری اس کا ذریعہ مُعاش ہے۔ ایک عملی سوجھ بوجھ رکھنے والا شخص ہونے کی بدولت اس نے اکثر روپے کے لیے لکھا ہے اور اس کے قلم نے بھوک کے بھیڑیے کو دروازے سے دور رکھنے میں شروع شروع میں کافی مدد کی۔ اب وہ ایک صاحبِ حیثیت ادیب ہے۔ یونیسکو میں ایک اعلیٰ عہدہ

سنبھالے ہوئے ہے۔ تہذیب کی جدید سہولتیں اسے حاصل ہیں۔ بنگلہ، موٹرکار(؟)، فرتج، ٹیلی ویژن سیٹ اور ایک پڑھی لکھی بیوی — ان نعمتوں نے اسے تن آسان اور تعیش کوش نہیں بنایا۔ وہ اسی کثرت سے لکھ رہا ہے، اور جتنا زیادہ وہ لکھتا ہے اتنا ہی اس کا اسلوب نکھرتا جاتا ہے۔ وہ ادیب جو سمجھتے ہیں کہ اخبار نویسی سے بہترین ادبی صلاحیتیں کچلی جاتی ہیں اور آدمی سہل انگاری اور زود نویسی کا شکار ہو جاتا ہے، اس سے سبق حاصل کریں۔ ابنِ انشا ایک قدرتی نثر نگار ہے۔ غیر ملکی لکھنے والوں میں ایسے کئی لکھنے والے ہیں — بلیر بیلاک اور پریسٹلے کی طرح، سو سے اوپر کتابوں کے مصنف اور سب کتابیں ایک امتیازی ادبی معیار کے حامل۔ اس ملک میں ایسے لکھنے والے بہت ہی کم ہیں۔ ماہام کا مقولہ درست معلوم ہوتا ہے کہ بہترین ادبی تخلیقات پیشہ ور ادیبوں کے قلم ہی سے نکل سکتی ہیں۔

''اردو کی آخری کتاب'' بذاتِ خود اس کا دل خوش کن ثبوت ہے۔ یہ خوبصورت (لفظ کے ہر معنی میں) کتاب ہمارے بہترین مزاح نگاروں — پطرس، کپور اور شفیق الرحمٰن — کی شگفتگی تحریر اور اندازِ بیان کی یاد دلاتی ہے، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ابنِ انشا نے اپنے ان ہم سفروں سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اس کی تحریر محض بندر کی نقالی نہیں بلکہ اس میں اپنی بے ساختگی، رنگینی اور رچاؤ ہے جو لطف دے جاتا ہے۔ اُستادوں کے آگے زانوے تلمذ تہہ کرنے سے ابنِ انشا کی اوریجنیلٹی اور جودتِ طبع کو قطعاً کوئی گزند نہیں پہنچا۔

''اردو کی آخری کتاب'' کے مصنف یا مرتب دو ہیں — ایک ابنِ انشا، اور دوسرا انجمی جس کی شوخ و شنگ سفید سیاہ لکیروں نے متن کی عبارت کو بڑی خوبی سے مصور کیا ہے۔ ان کارٹونوں کے بغیر اس کتاب کی دلپذیری بڑی حد تک کھو جاتی۔ انجمی کے کارٹونوں سے ابنِ انشا کی تحریر اور زیادہ بہار دکھانے لگتی ہے۔ میرا خیال ہے مزاح کی سب کتابوں کو اسی طرح مصوّر ہونا چاہیے۔ لیکن ہمارے ہاں کرواک شینک اور ٹینیل جیسے کتابوں کے مصوّر نہیں جو مصنف سے خود کو ہم آہنگ کر کے ذہن میں رہ جانے والی تصویریں بنا سکیں۔

''اردو کی پہلی کتاب''، جسے ہم نے بچپن میں پڑھا تھا، اور جس کا وہ مشہور فقرہ — ماں بچے کو گود میں لیے بیٹھی ہے، باپ حقہ پی رہا ہے — ہر کسی کو یاد ہوگا، مولوی محمد حسین آزاد نے لکھی تھی۔ یہ بانکی، بے مثال کتاب غالباً گورنمنٹ کے محکمۂ تعلیم سے منظور شدہ تھی۔ ابنِ انشا کی ''اردو کی آخری کتاب''

Scanned with CamScanner

نامنظور شدہ چیئر مین ٹیکسٹ بورڈ ہے اور بورڈ کے چیئر مین کے مراسلے کی نقل، جس میں اسے باقاعدہ نامنظور کیا گیا ہے، کتاب کے آغاز میں درج ہے۔ بورڈ کے چیئر مین میر نسیم محمود نے خدشہ ظاہر کیا ہے کہ اسے پڑھ کر استاد طالب علم اور طالب علم استاد بن جائیں گے۔ مولف ابن انشا نے اپنی پیاری سی شرارت کو مستند کرنے میں کوئی کسر نہیں رکھی۔ مثلاً پاک پبلشرز لمیٹڈ نے اسے بصرفِ زرکثیر شائع کیا ہے، بغیر اجازت کوئی اسے نہیں چھاپ سکتا، چھاپے گا تو بیچ نہیں سکتا، اور اگر بیچے گا تو بتائے گا نہیں۔ سب سے پہلے ''انشایئے انشاجی کے'' عنوان سے اردو مزاح نگاروں کے قبیلے کے سرخیل مشتاق احمد یوسفی کا تعارف ہے۔ بعد میں ''باعثِ تحریر آنکہ'' کے تحت ابن انشا نے اپنی تعارفی تحریر میں حسبِ معمول اوٹ پٹانگ باتیں کہی ہیں۔ ان سے پتا چلتا ہے کہ ابن انشا کا جنرل نالج اور تاریخ کا علم کافی وسیع ہے۔ ان سے اگر آپ ملکہ نور جہاں کے حالات پوچھیں گے تو وہ ملکۂ ترنم نور جہاں کے حالات بتائیں گے۔ سکندر اعظم ان کے ذہن میں سر سکندر حیات اور سابق مرد آہن اسکندر مرزا سے خلط ملط ہے اور اکبر کے بعض نورتن موجودہ قومی اور سیاسی لیڈروں سے حیرت ناک مشابہت رکھتے ہیں۔

ترتیب کے تحت بعض اسباق سے بھی اس کتاب کی افادیت اور علوم دنیاوی پر مولف کے کامل عبور کا اندازہ ہوسکتا ہے — ماں بچے کو گود میں لیے بیٹھی ہے (مولوی محمد حسین آزاد کے لافانی سبق کا جدید ورشن)، مینڈکوں کا بادشاہ، کچھوا اور خرگوش، ابتدائی حساب، ابتدائی الجبرا، ابتدائی سائنس، بیان جانوروں کا۔ (ابن انشا بھیس، گائے بکری، بھیڑ، گدھے، اونٹ، کتے اور آدمی وغیرہ کے بارے میں نہایت مفید اور کارآمد معلومات مہیا کرتے ہیں جنھیں پڑھنے کے بعد آدمی کے علاوہ سب جانور بہ تخصیص اونٹ اشرف المخلوقات نظر آتے ہیں۔) پھر احوال چند پرندوں کا ہے جن میں میرے چہیتے پرندے اُلّو پر بھی چند فقرے ہیں۔ مؤلف نے البتہ الّو کی بیوقوفی یا حکمت و دانش کے بارے میں اپنی رائے محفوظ رکھنے سے کسی کا بھلا نہ کیا — نہ الّو کا جو ابن انشا کی رائے جاننے کے لیے بے چین ہے اور نہ ہی اپنا۔ یہ تحقیق بھی غلط معلوم ہوتی ہے کہ سمجھ دار اور دانشور لوگ اکثر بھوکے مرتے دیکھے گئے ہیں۔ کوئی الّو بھوکا نہیں مرتا کیونکہ اس کا اُلٹ بھی اکثر دیکھنے میں آیا۔ اس ملک میں بیشتر سمجھدار اور دانشور حضرات موٹر کاروں میں اڑے پھرتے ہیں، بھوکے اکثر الّو اور گدھے ہی مرتے ہیں۔ خیر، میں بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ کاش ابن انشا الّو کے بارے میں زیادہ تحقیق سے لکھتے۔ مجھ سے ہی مشورہ لے لیتے، میں نے

Scanned with CamScanner

خود الوؤں کے نشیمن میں بیٹھ کر اس پرندے کی عادات وخصلات کے مطالعے میں ایک عمر گزاری ہے۔

تاریخ کے تحت ابن انشا نے پتھر کے زمانے، غزنویوں لودھیوں کے معرکوں، مہاراجا رنجیت سنگھ وغیرہ کے بارے میں ایک مورخ کی حیثیت سے قلم فرسائی کی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہم میں سے بیشتر کی طرح اسکول میں پڑھی ہوئی تاریخ کافی حد تک بھول چکے ہیں۔ لودھیوں کے متعلق ان کا اندازہ کہ ان کا مورثِ اعلیٰ لدھیانے سے آیا تھا، بالکل غلط ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ مولانا حبیب الرحمٰن اور ساحر کو بھی لودھی کہلانا چاہیے تھا۔ خیر یہ علمی اور تاریخی بحث ہے جس میں میں اس تبصرے کے قاری کو نہیں اُلجھانا چاہتا۔ ''اردو کی آخری کتاب'' میں چند اسباق جغرافیے اور علم ہیئت کے بھی ہیں۔ اس میں حکایات سعدی کی دو تین کہانیوں کو نئے پیرائے میں پیش کیا گیا ہے جن میں اصل حکایات سے بالکل اُلٹ سبق حاصل ہوتا ہے۔

میں ''اردو کی آخری کتاب'' میں سے چند فقرے نقل نہیں کروں گا، کیونکہ یہ مفید کتاب ہر اچھے کتاب فروش کے ہاں دستیاب ہے۔ کوئی خاص مہنگی بھی نہیں، قیمت صرف دس روپے ہے، عوام، روسا اور والیانِ ریاست سے ایک ہی دام وصول کیے جاتے ہیں تاکہ کسی طبقے کو دوسرے طبقے سے شکایت کا موقع نہ ملے۔ قیمت کا سوال تب ہے جب تم اسے قیمتاً پڑھنا چاہو، تم اسے مانگ کر یا چرا کر بھی پڑھ سکتے ہو۔ مصنف کی دستخط شدہ جلدیں مولف سے بلا قیمت اور مفت بھی حاصل کی جاسکتی ہیں۔ لکھ کر دیکھو۔

بہر حال اس کتاب کو پڑھو ضرور۔

(فنون، لاہور، اکتوبر نومبر ۱۹۷۱ء)

آوارہ گرد کی ڈائری

ابن انشا

''آوارہ گرد کی ڈائری'' اس دور کے شہرۂ آفاق سیاح ابن انشا کے سفروں کی داستان ہے۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں، مارکو پولو اور ابن بطوطہ کے بعد سیاحت کے میدان میں اگر کسی شخص نے اپنا سکہ جمایا

ہے تو وہ ہمارا ابن انشا ہے۔ مارکوپولو وغیرہ ساری عمر میں دنیا کے ممالک کے اتنے دارالخلافوں میں نہیں گھومے پھرے جتنے دارالحکومتوں میں ابن انشا چند ایک مہینوں میں گھوم آیا ہے۔ ابن بطوطہ بے چارہ تو کسی شمار قطار میں نہیں۔ وہ ہندوستان میں غالباً گھوڑوں کی سوداگری کی خاطر آیا اور پھر ہمارے دوست محمد تغلق کی مہمان نوازی دیکھ کر ایک مدت دلی میں پڑا رہا اور ایک طرح سے بادشاہ کا مشیر سا بھی بن گیا۔ کاغذ کے سکّے چلانے اور دارالخلافے کو دہلی سے دولت آباد دکن میں لے جانے کے مشورے غالباً اسی نے محمد تغلق کو دیے ہوں گے۔

پرانے سیاح گھوڑوں، اونٹوں یا گدھوں پر سفر کرتے تھے۔ اگرچہ یہ سب سواری کے جانور اب بھی خریدے یا کرائے پر حاصل کیے جاسکتے ہیں مگر ابن انشا ایک دارالخلافے سے دوسرے دارالخلافے تک جانے کے لیے جیٹ ہوائی جہاز کو ترجیح دیتا ہے۔ یہ افسوسناک ہے کہ یہ عظیم سیاح اپنے پیشروؤں کی روایات کو قائم نہیں رکھ سکا۔

قصور یقیناً یونیسکو کا ہے جس کی پُر اسرار اسائنمنٹس (assignments) ابن انشا کو ایک پل چین سے نہیں بیٹھنے دیتیں۔ یونیسکو والے اس کے ہاتھ میں ایئر ٹکٹ تھما دیتے ہیں، اس کی سفری اٹی نریری (itinerary) طے کرتے ہیں اور پاسپورٹ، ویزوں اور زرمبادلہ کا انتظام کر دیتے ہیں۔ پھر وہ اسے بلغراد، وی آنا یا پیرس میں چند ہفتے گزارنے، وہاں کی لائبریریوں اور میوزیموں کی سیر کرنے اور کسی بوڑھے پروفیسر سے ملاقات کرنے کے لیے بھیج دیتے ہیں۔ اس سے غالباً یونیسکو کے بعض اعلیٰ مقاصد پورے ہوتے ہوں گے۔ بہرحال ابن انشا کو یورپی دارالحکومت میں پہنچ کر سوائے گھومنے پھرنے کے اور کوئی کام نہیں کرنا پڑتا۔ بوڑھے پروفیسروں سے ملاقات کرنے میں کوئی حرج نہیں، یہ کافی دلچسپ ہوسکتی ہے اگر پروفیسر قدرے خبطی ہوں اور تم دونوں ایک دوسرے کی زبان سے ناواقف ہو۔

بلغراد یا استنبول پہنچنے پر ابن انشا کو کوئی محیر العقول یا سنسنی خیز واقعات پیش نہیں آتے۔ ایئر پورٹ سے ہوٹل کو جاتے ہوئے کوئی سیاہ چمکیلی مرسڈیز اس کی ٹیکسی کا تعاقب نہیں کرتی۔ وہ ٹیکسی کے ڈرائیور کو میٹر کے حساب سے پورے پیسے دیتا ہے۔ ہوٹل کے کمرے میں کاؤنٹر ایجنٹ پردوں کے پیچھے نہیں چھپے ہوتے اور نہ ہی اسے بستر میں زہریلے سانپوں یا اس قسم کے دوسرے ذرائع سے ہلاک کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ سنہری بالوں اور سبز آنکھوں والی مہوش حسینائیں کبھی اپنا سب کچھ اس کے حوالے کر دینے کی پیشکش

Scanned with CamScanner

نہیں کرتیں۔ یونیسکو کی اسائن منٹس معصوم اور بے ضرر ہوتی ہیں اور ابن انشا بھی کوئی ۰۰۷ نہیں۔ وہ ہم سب کی طرح قدرے بزدل، بوکھلایا ہوا اور مرنجاں مرنج مسافر ہے، بلکہ میں کہوں گا ضرورت سے زیادہ محتاط اور کفایت شعار۔ وہ ہر دم اپنے ڈالروں، فرانکوں اور لیروں کو گنتا رہتا ہے۔ یہ بلاشبہ ایک اچھی قابل قدر عادت ہے خصوصاً پردیس میں مگر ایک حد تک؛ اسے آب سیشن (obsession) نہیں بننا چاہیے۔

میں نہیں سمجھ سکا کہ یونیسکو والے جن کی دعوت پر ہمارا سیاح یورپ اور مشرقِ وسطیٰ کے دورے پر گیا تھا، اسے زادِ راہ اور قیامِ وطعام کے لیے پونڈ، فرانک، مارک اور لیرے وغیرہ فراہم کرنے میں اس قدر کمینے کیوں تھے کہ اسے کبھی ایک اچھے ریستوران میں معقول کھانا نصیب نہ ہو سکا اور بیشتر سینڈوچ اور کافی سے پیٹ کی آگ بجھانی پڑی۔ یہ سچ ہے کہ یونیسکو والوں نے ظاہراً اسے چند بڈھے پھونس پروفیسروں سے ملنے کے لیے بھیجا تھا مگر انھوں نے ضرور اسے کافی جیب خرچ مہیا کیا ہوگا۔ یونیسکو والے اچھے لوگ ہیں اور وہ یقیناً چاہتے ہیں کہ مہمان یورپ میں تھوڑے بہت گل چھرے اڑائے۔ وہ یقیناً یہ نہیں چاہتے کہ وہ فاقوں سے مرے۔ اگر ابنِ انشا وہاں فی الواقع کھانا نہ کھا سکنے کی وجہ سے مر جاتا تو یونیسکو والے کسی کو منھ دکھانے کے قابل نہ رہتے۔ ان میں سے چند ایک چلو بھر پانی میں ڈوب مرتے۔

ہمیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ یہ المناک سانحہ وقوع پذیر نہیں ہوا اور ابنِ انشا وزن گھٹنے کے باوجود زندہ رہا، ورنہ ''آوارہ گرد کی ڈائری'' سا باغ و بہار، شگفتہ اور دل پذیر سفرنامہ ہمیں کبھی پڑھنے کو نہ ملتا۔ ہم میں سے کون ہے جو اتنی سلاست، بے ساختگی اور ظرافت سے جگہوں اور لوگوں کے بارے میں لکھ سکتا ہے؟ ''آوارہ گرد کی ڈائری'' میں بمشکل ہی کوئی ایسا فقرہ ملے گا جو شوخی اور شرارت سے بھرپور نہ ہو، اور ساری کی ساری ڈائری سادہ کھلتی ہوئی عمدہ نثر کا نمونہ ہے، پطرس کی طرح قدیم رنگ اور جدید اسلوب کا حسین امتزاج۔ پھر جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ ڈائری کے مختلف باب، بیشتر سخت رواروی کی حالت میں، ایک ملکی اخبار میں قسط وار چھپنے کے لیے لکھے گئے اور مصنف کے پاس ان پر نظرِ ثانی کرنے یا 'ق' اور 'ش' سے درست کرنے کا وقت نہیں تھا، تو اس کی عمدگی تحریر پر تعجب ہوتا ہے۔ ڈائری ساری کی ساری اونچے ادبی معیار کی حامل ہے۔ ابنِ انشا کے ایک اصلی اور قدرتی ادیب ہونے میں کوئی کلام نہیں۔

ترتیب کے تحت عنوانات بذاتِ خود اچھوتے اور شریر ہیں، مثلاً ''آنا فائر بریگیڈ کا مرزا نسیم بیگ کے گھر''، ''کچھ قصہ دال چپاتی کا''، ''کلچر کی چکھوتیاں''، ''لغاتِ عاشقاں سے گھمکول شریف تک''،

"ہائے بشیرا ہائے بشیرا"، "کھانا ہمارا سیب"، "برلن ہمارا اور منشی جی کا"، وغیرہ وغیرہ۔

اس آخری عنوان کے منشی جی منشی محبوب عالم، ایڈیٹر پیسہ اخبار تھے۔ منشی محبوب عالم نے ۱۹۰۲ء میں ممالکِ فرنگ کا سفر کیا تھا اور واپسی پر ایک ضخیم سفرنامہ لکھا اور چھاپا تھا۔ (چھاپہ خانہ ان کا اپنا تھا۔) ہم میں سے بہت سوں نے منشی محبوب عالم کا نام تو سن رکھا ہے مگر یہ کسی کو معلوم نہیں کہ انھوں نے کوئی ایسی کتاب بھی تصنیف کی ہے۔ منشی صاحب کا سفرنامہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ غالباً اس کی واحد جلد اب ابنِ انشا کے پاس ہے۔ ابنِ انشا اس سفرنامے کو یورپ کے سفر پر بطور گائیڈ بک ساتھ لے گیا تھا اور خصوصاً برلن پہنچ کر اس نے اس گائیڈ بک کی مدد سے ان کوچوں، ہوٹلوں اور اخبار کے دفتروں کو کھوج نکالا جن کا تذکرہ منشی محبوب عالم نے اپنے سفرنامے میں کیا تھا۔ منشی محبوب عالم بھی اپنے زمانے کے لحاظ سے کافی محیر العقول اور ماڈرن بزرگ تھے، سرسید احمد اور سر عبدالقادر کی طرح۔ ڈائری کے صفحہ ۱۳۵ کے مقابل ان کی عکسی تصویر بھی شامل ہے — گول کھڑی ترکی ٹوپی جس کا پھندنا پیچھے کی طرف ہے، بغیر فریم کے بیضوی چشمے، حیران کن بڑی ناک، خشخشی داڑھی (بمع داڑھی میں ضم ہوتی مونچھوں کے)، حساس موٹے ہونٹ، پہناوا وکٹورین انداز کا، یعنی کھڑے کالروں پر ٹائی بندھی ہوئی اور واسکٹ اور فراخ کالروں کا چست کوٹ۔ منشی صاحب تصویر میں سر عبدالقادر لگتے ہیں اور مجھے کچھ کچھ شک ہے کہ ابنِ انشا نے سر عبدالقادر کی تصویر چھاپ کر اپنا کام نکالا ہے۔ جو کچھ بھی ہو، یہ قدیم وکٹورین بزرگ تھے ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے۔ ماحول اور تربیت کے سانچے جن میں وہ ڈھلے تھے، ایک ہی تھے۔ وہ ایک ہی قسم کی مناسب حد تک مسجع سلیس اردو لکھتے تھے۔ اور جب وہ یورپ کے ممالک کی سیاحت پر جاتے تو ایک ہی نظر سے وہاں کے مناظرِ قدرت اور حیرتناک مشینوں کو دیکھتے۔ وہ مخرب اخلاق مشاغل سے پرہیز کرتے اور کبھی تقاضائے بشری سے مغلوب ہوتے بھی تو اس کا تذکرہ بھولے سے بھی اپنی تصنیف میں نہ کرتے۔ کئی ایک لحاظ سے وہ بہت معصوم اور قابلِ محبت لوگ تھے، مثلاً ہمارے منشی محبوب عالم کو لو۔ ڈائری میں ذکر ہے کہ منشی صاحب وی آنا بھی گئے تھے۔ وہاں انھوں نے وی آنا کے عجائب گھر دیکھے، تھیٹر دیکھے، پارلیمنٹ ہاؤس دیکھا، پرائر کے عجائبات دیکھے کہ ایک وسیع پارک ہے جس میں تفریح کی بے شمار چیزیں ہیں اور جس میں میلہ لگا رہتا ہے۔ وی آنا کی خوش دل عورتوں نے ان سے چہلیں بھی کیں۔ ابنِ انشا مولوی (یا منشی) صاحب کے ردِ عمل کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا مگر اس نے مولوی

Scanned with CamScanner

صاحب کے وی آنا کے سفر کا جو احوال نقل کیا ہے اس سے ردِ عمل کے بارے میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔ مولوی صاحب کے الفاظ میں:

پارک میں سڑک پر دونوں طرف درخت ہیں۔ درختوں کی تمام شاخوں پر سرخ، سبز اور سفید روشنی کے برقی لیمپ لگے ہیں۔ ایک بٹن دبانے سے سب لیمپ روشن ہو جاتے ہیں اور بالکل طلسمات کا باغ معلوم ہوتا ہے۔ لوگ مختلف رنگوں کے باریک کاغذوں کے گول ٹکڑوں کی مٹھیاں بھر بھر کر ایک دوسرے پر پھینکتے ہیں، عموماً مرد خوبصورت عورتوں پر اور عورتیں مردوں پر۔ پہلے سے واقفیت اور آشنائی کی کوئی شرط نہیں۔ جس پر تمھارا جی چاہے پھینکو، کوئی داد فریاد نہیں، بلکہ سب لوگ خوش ہوتے ہیں۔ زمین پر دو انگل موٹا فرش ان کاغذی پھولوں کا ہو جاتا ہے۔ ایک دو عورتوں نے مجھ پر پھینکے۔ جب میں نے جواب نہ دیا، ایک کمبخت نے پشت کی طرف سے میرے کالر کو اُٹھا کر ایک مٹھی اس میں پھینک دی جو میں نے مکان پر جا کر نکالی۔ معلوم ہوا اس ذریعے سے بعض عورتیں مردوں سے آشنائی پیدا کرتی ہیں۔ یہ ایک پرستان کا نظارہ تھا۔ یہ سچ ہے کہ انسان ان کے آسیب سے مشکل سے بچ سکتا تھا۔ ہاروت و ماروت کی آزمائش کا قصہ اگر صحیح ہے تو وہ معذور تھے۔

اوہ! مولوی محبوب عالم، جیتے رہو! کون یہ ٹکڑا پڑھنے کے بعد تم سے محبت نہیں کرنے لگے گا۔ اور کتنا اچھا تم لکھتے ہو، کتنی معصومیت سے، حیرت سے، اور خوبصورتی سے۔ سر عبد القادر بھی بڑی عمدہ اردو نثر لکھتے تھے، مگر وہ کبھی اوپر والا ٹکڑا نہ لکھ سکتے۔ وہ مناظر قدرت پر رنگیں بیانی ضرور کرتے مگر کاغذی پھول کے پہلے ہی وار پر اپنی جامہ زیب پر وقار ہستی کو اس پرستان سے صاف بچا کر غائب ہو جاتے اور ان کے سفرنامے میں اس کا ذکر تک نہ ہوتا۔

منشی محبوب عالم کا تذکرہ میں نے زیادہ تفصیل سے اس لیے کیا ہے کہ ''آوارہ گرد کی ڈائری'' کی اصل روح و رواں ان کی ہی ذات گرامی ہے۔ ڈائری کی جاذبیت کسی حد تک ان کی موجودگی کی مرہونِ منت ہے۔

ابن انشا جس واقعے کے بارے میں بھی لکھتا ہے، خواہ وہ غیر ملکی زبان سیکھنے کی مشکل ہو، خواہ ہوٹل میں قیام کا حال ہو، خواہ کسی پروفیسر سے ملاقات کا ذکر، اس کا انداز اتنا پُر مزاح اور پُر لطف ہوتا ہے کہ پڑھنے والے کو ذرا بھی اکتاہٹ کا احساس نہیں ہوتا۔ وہ ایک خوش دل اور شوخ و شنگ ساتھی ہے جو

Scanned with CamScanner

کبھی بور نہیں کرتا۔" "آوارہ گرد کی ڈائری" میں کئی ایسے مزیدار اور ہنسانے والے واقعات ہیں کہ ان کو نقل کرنے کو دل چاہتا ہے مگر اس تبصرے میں اس کی گنجائش نہیں۔ چند نمونے پیشِ خدمت ہیں جنھیں میں نے خاص طور پر نہیں چنا۔

ہالینڈ:

اس ہوٹل کا انتظام ہماری ایئر لائن نے (ہمارے خرچ پر) کیا تھا۔ لوگ بااخلاق ہیں، نائی بھی اچھے ہیں۔ ہم نے یہاں آ کر بال کٹائے۔ لندن والے نائی سے تو بہتر نکلا، پیسے بھی کم لیے۔ تھینک یو بڑے تپاک سے کہا۔

ہم ہوٹل البرز سے چلے آئے اور وہ بند ہو گیا، کم از کم عارضی طور پر، کیونکہ اس ہوٹل میں ہم تنہا مسافر تھے۔

سوئٹزر لینڈ:

اب رہا برف پر پھسلنے کا شوق تو ہر شوق کی ایک عمر ہوتی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب ہم بھی جس چیز کو، جس صورت کو دیکھتے تھے، اس پر پھسل پڑتے تھے۔ اب وہ بات نہیں۔ آج ہی شام جنیوا کی جھیل کو بھی چل پھر کر بنظرِ غائر ہم نے دیکھ لیا۔ اس میں ہمیں پانی تو نظر آیا اور کوئی خاص بات دکھائی نہ دی۔

بازار میں شیشوں کے پیچھے گھڑیوں کے ڈھیر کے ڈھیر نظر آئے۔ ہر شکل و صورت کی گھڑیاں، ہر قیمت کی گھڑیاں۔ سو گھڑیوں کے تاجروں کو یہاں ضرور آنا چاہیے۔ باقی لوگ کیوں آتے ہیں، یہ ہماری سمجھ میں نہ آیا۔

پیرس:

کمرہ نمبر ۸ ڈربی ہوٹل۔ ڈربی کے نام پر ہم گھوڑے کی طرح ہنہنائے۔ اپنے سوٹ کیس پر دولتی جھاڑی۔

دمشق:

یا تو ہمیں ایک لفظ عربی کا نہ آتا تھا یا ہر زبان اتنی رواں ہوئی کہ ہم راستے بھر مس فریان المدنی سے عربی میں باتیں کرتے گئے۔

تمھیں یقین تو نہیں آئے گا لیکن بعض وقت ہمارا یہ حد درجہ مسخرا اور غیر سنجیدہ سیاح، تبلیغ اور سنجیدگی کا لبادہ

Scanned with CamScanner

اوڑھ لیتا ہے۔ تب وہ اپنے احوال میں ایسے جذباتی، ارغوانی ٹکڑے ٹانکتا ہے جو اس سفرنامے کے عام موڈ اور اسلوب سے میل نہیں کھاتے اور جن میں نسیم حجازی اور دوسرے عظمتِ ماضیِ اسلام کے نوحے تحریر کرنے والے مصنفین کی مدھم گونج سنائی دیتی ہے۔ ہم سب نے نظم و نثر میں اس قسم کی عبرت و غیرت دلانے والی تحریریں پڑھی ہیں اور ہماری کتابیں اور رسالے ان سے بھرے پڑے ہیں۔ مثلاً دمشق میں عشق رچاتے ہمارا سیاح اپنے احوال کو یوں ختم کرتا ہے:

دمشق تو گنج شہیداں ہے، چلو فاتحہ پڑھو۔ حضرت بلال حبشی کے مزار پر، عبداللہ ابن مکتوم کی تربت پر، عمر ابن عبدالعزیز کی قبر پر، سیدہ زینب، سیدہ سکینہ، اسما بنت ابوبکر، سیدہ فاطمہ صغیرہ بنت امام حسین۔ ان قبرستان کے پھیلے ہوئے کھنڈروں میں کس کس موتی کو تلاش کرو گے۔ اور پھر ایک طرف سے تلاوت کی شیریں آواز آنی شروع ہوئی۔ اے دمشق رخصت! اے جامع اموی، اے عظمت رفتہ کی سجدہ گاہ السلام! لیکن ابھی تو دمشق کی گلیاں باقی ہیں...

اب یہ قابلِ قدر، سج دھج رکھنے والا نوحہ ہے، اور پڑھنے والوں کو اپنے دینی جذبے اور اسلامی تاریخ پر عبور سے مرعوب کرنے میں کوئی حرج بھی نہیں۔ کئی پڑھنے والے واقعی چاہتے ہیں کہ کوئی عظمتِ رفتہ کی یاد دلا کر ان کے دلوں پر رقت طاری کرتا رہے۔ مجھے ابنِ انشا کے ایک سچے اور دردمند مسلمان ہونے میں بھی کوئی شک نہیں۔ مگر کیا یہ تقریر اس سفرنامے میں ہونی چاہیے تھی؟

میرا خیال ہے کہ اپنے بیان میں ایسے ٹکڑے ٹانکتے وقت ہمارے سیاح کے ذہن میں اپنے وطن کے وہ اخبار بین تھے جو ہر ہفتے ''جنگ'' میں اس کے سفر کی قسط پڑھتے تھے۔ اخبار پڑھنے والے عموماً ایسی رقت آمیز تحریروں پر جان چھڑکتے اور ان سے مناسب طور پر متاثر ہوتے ہیں۔ اور پھر اخبار میں قسط کی جگہ تو کسی نہ کسی طور سے بھرنا ضروری ہے۔

اتنے مسرت بخش لکھنے والے سے گلے کرنا ہے تو بے جا، مگر دوسری شکایت مجھے اس ڈائری سے یہ ہے کہ یہ بہت زیادہ اکسٹروورٹ (خارجی) ہے۔ بہترین سفری کتابیں — سٹیونسن کی ''ٹریولز وِد اے ڈنکی'' یا گراہم گرین کی ''لائیس روڈز'' کی طرح واقعاتی سفر کے علاوہ پڑھنے والے کو لکھنے والے کی روح اور ذہن کی سیر بھی کراتی ہیں۔ ''ڈائری'' میں اندر والے ابن انشا کا کچھ پتا نہیں ملتا، ہمیشہ باہر والے ابن انشا کا سامنا ہوتا ہے، جو ہمیشہ ہنستا اور ہنساتا رہتا ہے۔ مولوی محبوب عالم کو لو۔ انشا نے ایک

جگہ اس کے سفرنامے کو گفتنی گزٹ کہا ہے، کیا اس کا سفرنامہ بھی ایک طرح گفتنی گزٹ نہیں؟ میں اقرار کرتا ہوں کہ یہ ایک ذاتی شکایت ہے۔ بعض اچھی کتابیں، مارک ٹوین کی ''انوسنٹس ابراڈ'' کی طرح، تمھیں ہنسانے اور دنیا کو چمکیلی بنانے کے لیے لکھی جاتی ہیں۔ ہر ایک لکھنے والا اپنے رنگ میں لکھتا ہے، اور ایک کتاب کی صفت کو جانچنے کی ایک ہی کسوٹی ہے —— پڑھنے والے کی خوشی اور حیرت۔

تیسری شکایت —— یہ قدرے احمقانہ ہے اور بالکل ذاتی۔ تم بھی اس پر ہنسو گے۔ یہ صیغۂ جمع متکلم ہے۔ جس کو ہمارے مزاح نگار اپنے مضامین اور احوال لکھتے ہوئے استعمال کرتے ہیں۔ عظیم بیگ چغتائی اور ملا رموزی سے لے کر مشتاق احمد یوسفی اور ابنِ انشا تک ''ہم'' کے بغیر بات نہیں کرتے۔ ایسا لگتا ہے جیسے ان کو ڈر ہو کہ صیغۂ واحد متکلم سے بات نہیں بنے گی اور اس کے استعمال سے ان کی تحریر سے مزاح کا عنصر کند ہو جائے گا۔ مثلاً ایک مزاح نگار مزاحیہ کہانی لکھتے ہوئے یوں شروع کرے گا: ''لیجیے، ہو گئی ہماری شادی'' وغیرہ وغیرہ۔ جب وہی لکھنے والا ایک سنجیدہ کہانی لکھے گا تو وہ اسے یوں آغاز کرے گا: ''آخر میری شادی ہو گئی''۔ میں مزاح نگاروں کی صیغۂ جمع متکلم کی اس ترجیح کو نہیں سمجھ سکا اور اس میں کوئی ضرر نہیں اگر اس مسلمہ اور دیرینہ روایت کو اب بدل دیا جائے۔

یہ سب فضول گلے ہیں۔

ابنِ انشا ''آوارہ گرد کی ڈائری'' جیسی مسکراتی، کنول کی طرح کھلتی درجنوں کتابیں اور لکھ سکتا ہے، بغیر کسی کاوش کے۔ مجھے امید ہے کہ یونیسکو والوں سے اس کے تعلقات استوار رہیں گے اور وہ ابھی اسے دنیا کے اور حصوں کی سیر کرائیں گے۔ ابھی تک انھوں نے ٹمبکٹو نہیں بھیجا، لومبا کے دیس لیوپولڈوِل بھی وہ نہیں گیا جس کے پاس ہی مردم خور ممگنے اب تک بستے ہیں۔ یونیسکو کا صحرائے کالاہاری میں بھی غالباً کوئی مشن یا نمائندہ نہیں۔ آسٹریلیا کا وسطی خطہ بھی سیر و تفریح کے لیے موزوں جگہ ہے اور چند ایک بڈھے ایبوریجن (Aborigine) شعر بھی کہتے ہیں۔ ہمارا باہمت سیاح ابھی تک قطب شمالی بھی نہیں گیا۔ (اب اس کے اوپر سے پرواز کی جا سکتی ہے۔ جیٹ جہاز میں وہیل مچھلی یا قطبی سفید ریچھوں کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔) یونیسکو والوں کو ابھی ہمارے انتھک سیاح کی سیاحت کے سلسلے میں بہت کچھ کرنا ہو گا۔ انھیں ذرا چوکسی اور عجلت برتنی چاہیے کیونکہ ہمارا سیاح اب شادی شدہ ہے، پینتالیس کے پیٹے میں ہے اور قدرے موٹاپے کی طرح جا رہا ہے۔ چند سالوں تک اگر یونیسکو والے اسے بھیجنا

Scanned with CamScanner

بھی چاہیں تو شاید وہ راضی نہ ہو۔ اگر وہ مزید سیاحت پر جانے کے لیے مان بھی جائے تو وہ اپنی بیوی اور بچوں کو لے جانا چاہے گا، جو یونیسکو والوں کے لیے کسی بھی طرح سود مند نہیں ہوگا۔ ان کے پاس ابھی سے پونڈوں، ڈالروں، مارکوں وغیرہ کی قلت معلوم ہوتی ہے۔ (کیا وہ ہمارے سیاح سے زیادہ فراخ دل نہیں ہو سکتے تھے؟)

نوٹ: میں نے جمشید کے کارٹونوں کا ذکر نہیں کیا۔ اس سفرنامے میں ۱۰۱ کارٹون متن کی وضاحت کرتے ہیں، اور نہایت خوبی سے۔ بعد تلاش مجھے محترم مصنف کا کارٹون کہیں نہیں ملا۔ ایک کارٹون کے نیچے ابنِ انشا ضرور لکھا ہے، لیکن کارٹون والا آلتی پالتی مارے بیٹھا ہوا شخص باریش ہے — ممکن ہے یہ مستقبل کے ابنِ انشا کا کارٹون ہو۔

(فنون، لاہور، اکتوبر نومبر ۱۹۷۱ء)

جنگل

اکرام اللہ

یہ کتاب اردو کے مختصر افسانوں کا ایک غیر معمولی، چونکا دینے والا مجموعہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا چالیس سالہ مصنف اکرام اللہ حیرت انگیز صلاحیتوں کا مالک ہے۔ میں فی الواقع اتنی جدت طرازی، دردمندی اور قدرتِ بیان کو دیکھ کر جن کی یہ کہانیاں حامل ہیں، مبہوت ہوں، اور بے حد خوش بھی۔ دل چاہتا ہے اُسے ایسے افسانے لکھنے کے لیے دونوں گالوں پر چوم لوں۔ ایک مدت سے ہم سعادت حسن منٹو کے فنی ورثے کے جائز وارث کی راہ تکتے تکتے مایوس ہو چکے تھے اور اب اس بات پر قانع ہونے لگے تھے کہ وہ شاید کبھی نہ آئے گا۔ معلوم ہوتا ہے وہ اب ہمارے اردگرد تاریکی کو دور کرنے کے لیے آن پہنچا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ اس وقت منٹو جتنا بڑا نہ ہو، مگر بلاشبہ وہ الوہی آتش جسے 'جینیئس' کا نام دیتے ہیں، اس میں موجود ہے اور اس مجموعے میں دو تین کہانیاں ایسی ہیں جن کی تراش خراش پر منٹو بھی غرور کرتا۔

Scanned with CamScanner

اس مجموعے کی پہلی کہانی ''اتم چند'' یقیناً ہمارے ادب کی بہترین کہانیوں میں جگہ پانے کی مستحق ہے اور اردو کے عظیم افسانوں میں سے ایک جو پچھلے چوبیس پچیس برس میں لکھے گئے ہیں۔ اسے آسانی سے بھلایا نہیں جا سکتا۔ یہ ایک استاد کا، ایک حقیقی انسانی درد رکھنے والے انسان کا شہ پارہ ہے — اور اکرام اللہ کی یہ پہلی کہانی ہے جو اس نے کبھی لکھی۔ اکرام اللہ کی لکھنے کی عمر بڑی مختصر ہے۔ جب اس نے اپنی اوّلین کہانی ''اتم چند'' لکھی تو وہ تینتیس چونتیس سال کا تھا اور اس سے پیشتر اس کی کوئی چیز لکھی یا چھاپی نہیں گئی۔ اب اُس کی عمر چالیس برس کی ہے۔ ایک صحت مند، خوش دل، دوستوں پر جان دینے والا شخص، اور وہ چھ سال سے اس قسم کی کہانیاں لکھ رہا ہے جو صرف وہی لکھ سکتا ہے: کہانیاں جن میں گہرائی ہے، درد اور انسانی ہشت پہلوؤں کی آگہی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ قدرتی فن کا جادو ہے۔ اگر میں کہوں کہ اس کی کہانیاں ادب اردو کی خزاں زدہ فرسودگی میں بہار کا تازہ جھونکا ہیں تو یہ ایک گھسی پٹی، رواجی سی بات ہوگی جو بار بار دہرائے جانے کی بدولت سب معنی کھو چکی ہے۔ مگر بلاشبہ ان افسانوں میں ایک اجلا پن ہے، خیال و اسلوب کی ندرت، نگارش کی دلربائی ہے جو یقیناً کمیاب ہے۔ وہ پڑھنے والے جو اردو مختصر افسانے کی رواجی ساخت، اس کی یک رنگی سے اکتا کر اسے پڑھنا چھوڑ چکے ہیں، ان کہانیوں کو پڑھ کر خوشگوار طور پر متعجب ہوں گے۔ انھیں اس امر کا احساس ہوگا کہ ایک بالیاقت، جدت پسند فنکار ہمیشہ اس اہم ادبی صنف کو ایک نیا موڑ، ایک انوکھا رُخ عطا کر سکتا ہے، موضوع و بیان میں ایسے پہلودار، تہہ در تہہ معانی سمو سکتا ہے جو دیر تک تخیل میں اپنی جولانی قائم رکھتے ہیں۔ انگریزی مثل کے مطابق، حلوے کی خوبی کا ثبوت اس کو کھانے میں ہے اور اکرام کی کہانیوں کی اچھائی کو جاننے کے لیے آپ کو ان کہانیوں کو صرف ایک بار پڑھنے کی ضرورت ہے۔ آپ انھیں دوبارہ پڑھنا چاہیں گے۔ 'اچھائی' کا لفظ میں نے خصوصاً جان بوجھ کر استعمال کیا ہے۔ ان کہانیوں کے لیے یہ مناسب چسپاں لفظ ہے۔ وہ ایک اچھے آدمی کی اچھی کہانیاں ہیں۔

میں استادوں کی بات نہیں کر رہا۔ عمدہ اور ناقابلِ تقلید، مختصر افسانہ نگاری کے ہنرمند، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، قرۃ العین حیدر، غلام عباس، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، ڈاکٹر احسن فاروقی وغیرہ ابھی جیتے ہیں اور ہمارے درمیان موجود ہیں۔ اردو افسانے کی نمود، اس کا ارتقا، اس کی ایک پُرمسرت فنی فارم ان کی ہی محنت اور جانکاہی کی مرہونِ منت ہے۔ ان میں سے بعض اب تخلیقی

تھکن کا شکار ہو چکے ہیں، بعض ابھی تک تخلیقی طور سے توانا ہیں اور ان کا فن ابھی تک پختگی اور رسیلے پن کی طرف رواں ہے۔ جو کچھ وہ لکھتے ہیں اسے ہر کوئی پڑھتا ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ پچھلے پندرہ بیس برس میں کئی نئے بالیاقت افسانہ نگار اُبھرے جو کئی ایک وجوہات کی بنا پر شہرت اور ناموری کی منزل پر نہ پہنچ سکے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس میں ان کا قصور تھا۔ اس روح فرسا ادبی بے حسی کی فضا میں لیاقت کے پنپنے کا موقع کہاں ہے؟ استاد اس لحاظ سے خوش نصیب تھے کہ انھوں نے ہمارے ادب کے زریں دور میں لکھنے کا آغاز کیا، جب ادبی رسائل پڑھے جاتے تھے اور جب کرشن چندر جیسے افسانہ نگار ''جہلم میں ناؤ پر'' لکھ کر راتوں رات مشہور ہو جاتے تھے۔ برسوں پہلے میں نے ''فنون'' میں کسی عباس رضوی کا ایک چھوٹا سا افسانہ ''لے بیویں گا'' پڑھا تھا اور میں اس کے تاثر کو ابھی تک نہیں بھول سکا۔ میں اس کو خط لکھنا، اس سے ملنا چاہتا تھا، مگر اپنی کاہلی کی وجہ سے کچھ بھی نہ کر سکا۔ عباس رضوی کون ہے، اب کہاں ہے اور آیا اس نے اس شاہکار افسانے کے بعد کچھ اور بھی لکھا ہے؟ میں نہیں جانتا۔ پھر ''فنون'' ہی میں میں نے ایک شرمیلے، کم گو پروفیسر آغا سہیل کی لکھنوی تہذیب کی ایک کہانی پڑھی جو مجھے شاہکار لگی، مگر جس کا جہاں تک مجھے معلوم ہے، چنداں نوٹس نہیں لیا گیا۔ اور پچھلے سال کراچی کے ہفتہ وار رسالے ''اخبارِ جہاں'' میں مجھے مشرقی پاکستان کے بارے میں ایک ایسا افسانہ پڑھنے کا اتفاق ہوا جس کا لکھنے والا قطعاً نامعلوم تھا۔ افسانے کا عنوان میں بھولتا ہوں مگر مجھے یقین ہے کہ اگر مشرقی پاکستان کے بارے میں کوئی شاہکار افسانہ لکھا گیا ہے تو وہ اس نامعلوم مصنف کا افسانہ تھا۔ کتنوں نے اس کو پڑھا؟ کتنوں کو وہ افسانہ یاد ہے؟ میں نے چند ایک کہانیوں کا ذکر کیا ہے۔ یقیناً ادبی رسائل کا طالب علم پچھلے پندرہ بیس برس میں بہت سے افسانوں کی نشان دہی کر سکتا ہے جن میں 'فنی عظمت' کی دمک تھی اور جو اب وقت کی دھند میں گم ہو چکے ہیں۔ (ان میں سے ایک ''سائیں موسم'' کے نام کا افسانہ تھا، ایک لمبے بالوں والے بوسیدہ کپڑوں میں ملبوس، دبلے پتلے، بائیس سالہ نوجوان کا لکھا ہوا۔ میں اسے صرف ایک بار ''فنون'' کے دفتر میں ملا اور وہ پھر غائب ہو گیا، میں نے اس کی بابت پھر کچھ نہیں سنا۔)

سو نئے افسانہ نگاروں میں لیاقت اور صلاحیت کی کمی نہیں اور یہ اوصاف ان افسانہ نگاروں میں بھی موجود ہیں جو تجریدی افسانے لکھتے ہیں، جنھیں میں ذاتی طور پر مشکل سے پڑھتا ہوں۔ میری شکایت تجریدی افسانہ نگاروں سے (جن میں سے بعض بے حد ذہین اور پڑھے لکھے ہیں) محض یہ ہے کہ وہ کہانی

کے عنصر کو علامت پسندی اور آئیڈیا پر قربان کر دیتے ہیں۔ جس کسی نے بھی پہلے پہل مختصر افسانے کی فارم کو دریافت کیا، وہ یقیناً یہ نہیں چاہتا تھا کہ اسے ایک بوجھل معما بنا دیا جائے۔ انتظار حسین کو میں ہمیشہ دلچسپی سے پڑھ سکتا ہوں کیونکہ اشاریت کے پیچھے ہمیشہ ایک سیدھی سادی، اسٹریٹ (straight) کہانی ہوتی ہے اور جو وہ کہنا چاہتا ہے معمولی سوجھ بوجھ رکھنے والے قاری کو بھی ذہن نشین ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس ڈاکٹر انور سجاد کے افسانوں کو میں بڑی دقت سے پڑھتا ہوں۔ ان میں کہانی کا عنصر نہیں ہوتا، نہ ہی قابل یقین کردار، اور علامت پسندی سارے افسانے پر اس طور مسلط ہوتی ہے کہ اصلیت کا رنگ ہی غائب ہو جاتا ہے۔ کیا یہ پُرتکلف استادی اس لیے ہے کہ لکھنے والا اپنے تخیل کے افلاس کو چھپانا چاہتا ہے اور ایک اسٹریٹ کہانی کہنا اس کے بس کا روگ نہیں؟ میں افسانہ نگاری کی تجریدی فارم کو مطعون نہیں کر رہا۔ ایک استاد کے ہاتھ میں یہ فارم حیرتناک ممکنات کی اہل ہے۔ ایک طرح سے کامیو کے افسانے اور ناول سب تجریدی ہیں اور ذہن پر ان کا نقش پائیدار رہتا ہے۔ فرانز کافکا کے تجریدی ناول ''کاسل'' کا پڑھنا ایک ہیبت ناک، بھلایا نہ جانے والا تجربہ ہے اور پڑھنے والا یوں محسوس کرتا ہے جیسے وہ ایک ڈراؤنے خواب میں سے سفر کر رہا ہو۔ ان سب افسانوں اور ناولوں میں زندگی کی واقعیت آس پاس رہتی ہے اور ان کی کہانی ذہن پر طاقتور گرفت رکھتی ہے۔

اکرام اللہ (جو کافکا اور کامیو سے بے حد متاثر ہے اور جس نے خود بھی تجریدی افسانے لکھے ہیں) نئے افسانہ نگاروں میں اس لحاظ سے خوش قسمت ہے کہ اس کے مختلف رسائل میں مطبوعہ افسانے اب کتابی صورت میں ہمارے سامنے آ گئے ہیں اور ہم نہ صرف ان افسانوں سے دل جمعی اور فراغت کے احساس سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں بلکہ ان کے مصنف کی ادبی حیثیت متعین کر سکتے ہیں۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، وہ وسیع صلاحیتوں کا مصنف ہے جسے قطعاً نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اس تقریباً ڈیڑھ سو صفحے کی کتاب میں سات افسانے ہیں اور ایک تمثیل۔ ''اتم چند'' اور 'محتاج'' ایک طرح سے رواجی مختصر افسانے ہیں اور پہلا افسانہ ہر لحاظ سے ایک بڑا افسانہ ہے۔ ''ایک دوپہر'' میں احمد ندیم قاسمی کی ''رم جھم'' کی سی شعریت ہے اور ہیمنگوے کا پنچ۔ آپ اسے مرزا صاحباں کے المناک انجام کی ایک جدید نقش کشی کہہ سکتے ہیں، اتنی فنی صناعی سے پیش کی ہوئی کہ اس کا دوپہر کا سارا منظر گویا خود آپ کی نگاہوں کے سامنے وقوع پذیر ہوتا ہے اور کہانی میں آفاقی عالمگیر صفت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ ہر

Scanned with CamScanner

اُس دیہاتی لڑکی کی کہانی ہے جو اپنے البیلے ماہی کے ساتھ بھاگ کھڑی ہوتی ہے اور پھر اپنے باپ اور بھائیوں کے ہاتھوں پکڑے جانے پر ایک معصوم پاک باز بیٹی بن کر اپنے البیلے سے منھ موڑ لیتی ہے۔ کتنی خوبصورتی اس کہانی میں ہے اور کتنی اَن کہی باتیں یہ کہتی ہے! ''احتیاج'' جنسی آگہی کی ایک اوّل درجے کی کہانی ہے۔ اس رنگ کی بہترین کہانیوں میں سے ''نقلی چوکیدار'' اور ''جنگل'' دونوں ایک طرح سے تجریدی افسانے ہیں، تنہا ہجوم اور تنہا فرد کے المیے۔ ان دونوں میں ایک ہانٹنگ (haunting) اور دل میں رہ جانے والی صفت ہے اور ان کے جوڑ بند بڑی فنی مہارت سے بٹھائے گئے ہیں۔ محبت پسندی اور دردمندی (فنی مہارت کو چھوڑ کر) ان تجریدی افسانوں کو اس فارم کے دوسرے افسانوں میں ممتاز کرتی ہے۔ اگر تجریدی افسانے اتنے پر تاثیر اور دل آویز ہو سکتے ہیں جتنے یہ دو افسانے ہیں تو میں ان کے لکھے جانے کے خلاف اپنے تعصب سے دست بردار ہونے کو بالکل تیار ہوں۔ ''لے گئی پون اُڑا'' ایک لمبی کہانی ہے —— بہت اچھی۔ ''راہ کا پتھر'' ایک تمثیل کے روپ میں وارث شاہ کی ہیر کی ایک اپی سوڈ کا ایک انوکھا، دم بخود کرنے والا ورشن (version) ہے جس میں ہیر کا خاوند سیدا ہیرو ہے اور ہماری ہمدردیاں اس کے ساتھ ہونے لگتی ہیں۔ میری رائے میں یہ ایک شاہکار ہے۔ بڑے تخیل اور انسانی نفسیات کے شعور کے بغیر ایسی تمثیل کوئی سوچ، کوئی لکھ نہیں سکتا تھا۔

آخری کہانی ''پکنک'' تین دوستوں کے متعلق ایک کہانی ہے جو دریا پر مچھلیاں پکڑنے جاتے ہیں، جو جزئیات نگاری میں بڑی فنی پرکاری اور کاریگری سے لکھی گئی ہے۔ اس میں مزاح کا عنصر ہے —— اور ایک آخری ہولناک تاثر۔

میں اس سچے اور بالیاقت فن کار کو سلام کرتا ہوں۔ اس کی آمد اردو مختصر افسانے کی نمود و ترقی کے لیے نیک فال ہے اور اب اس تبصرے کو ختم کرنے کے بعد اکرام اللہ کی کہانیوں کو ایک بار پھر پڑھوں گا —— یہ جاننے کے لیے کہ کن منتروں سے وہ ان میں جادو جگانے میں کامیاب ہوا ہے۔ وہ منتر ہم سب کو جو اصلی اور حقیقی نگارش سے لگاوٴ رکھتے ہیں، سیکھنے چاہییں۔ مگر دیوتا وہ منتر غالباً صرف انھی کو بتاتے ہیں جن سے وہ محبت کرتے ہیں۔

(فنون، لاہور، جنوری فروری ۱۹۷۳ء)

Scanned with CamScanner

نکلے تری تلاش میں

مستنصر حسین تارڑ

اردو میں سفرنامہ لکھنے کی مروّجہ ترکیب یوں معلوم ہوتی ہے: دو باب اپنے سفر کی تیاری کو دو، پاسپورٹ کا حصول، زرِ مبادلہ کا انتظام، عزیزوں اور احباب سے پُرحسرت الوداع۔ اس کے بعد طیارے میں اپنے سفر کا حال (ورجینیا وولف تکنیک استعمال کرو)۔ طیارے پر تناول کیے ہوئے لنچ اور ڈنر کا مینو بھی درج کیا جاسکتا ہے۔ اور ایئرہوسٹس کے ناک نقشے، چال ڈھال کا بیان مطلقاً نہ بھولو۔ اس سے پڑھنے والے کے جذبات کو گدگدی ہوگی۔ تیسرے یا چوتھے باب میں تم اس مقام یا ملک کی سرزمین پر قدم دھرو جہاں کسی فیاض حکومت کی خصوصی عنایت کی بدولت تم پہنچے ہو۔ باقی کام آسان ہے۔ اپنی اٹی تریری لکھتے جاؤ۔ ان میناروں، دریاؤں، کلبوں ریلوے اسٹیشنوں، عجائب گھروں، پاگل خانوں پر کھل کر دو دو صفحے لکھو جہاں جانے کا اتفاق ہوا ہو۔ اگر جانے کا اتفاق نہ ہوا ہو تو پھر بھی کوئی حرج نہیں، ایسی جگہوں کی مکمل تاریخ انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا یا مختلف گائیڈ بکس سے نقل و ترجمہ کی جاسکتی ہے۔ اس تفصیل سے تمھارے سفرنامے کو جسامت اور متانت میسر آئے گی اور پڑھنے والا مناسب طور سے تمھارے ذخیرۂ معلومات اور حافظے سے مرعوب ہوگا۔ یاد رکھو، تمھارا اصل مقصد صرف پڑھنے والے کو مرعوب کرنا ہے۔ مثال کے طور پر اگر تم پیرس میں ناٹرڈیم کا گرجا دیکھنے جاتے ہو تو اس کا سن تعمیر، معمار کا نام، میناروں، برجوں کی تعداد، اس کے پیش پر راکھشسوں، اوتاروں کے بتوں کے سائز، وکٹر ہیوگو وغیرہ کا ذکر پانچ چھ صفحوں میں کرو۔ (انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا میں ''این او ٹی'' کی پٹی دیکھو۔) تم پیرس کی زمین دوز ریلوے کے ذریعے ایفل ٹاور سے لاطینی کوارٹر جاتے ہو۔ یہاں پیرس کی زمین دوز ریلوے کی مکمل تاریخ درج کرنے کا موقع ہاتھ سے بالکل نہ دو۔ ممکن ہے تمھارا پڑھنے والا کچھ کچھ بور ہوجائے، تمھاری بلا سے! آخر تم پانچ سو صفحات محض اپنی بے معنی، بے مقصد بھاگ دوڑ کے ذکر سے کیونکر بھر سکتے ہو؟

یہ ترکیب پہلے متعدد سفرناموں میں انتہائی مجرب ثابت ہوچکی ہے اور مجھے دو ضخیم یورپی سفرناموں کا علم ہے جو سیاحوں کے یورپ سے کراچی لوٹنے سے پہلے لکھے ہوئے تیار رکھے تھے اور ان

میں صرف بعض بعض مقامات پر اِٹی نزیری کی تاریخیں اور اوقات بھرنا باقی تھا۔ کم وبیش اسی فارمولا پر لکھا ہوا ایک سفر نامہ ہمارے ادب میں منفرد قرار دیا جا چکا ہے اور نقادوں نے اس کی تعریف وتوصیف میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کی ہے۔ دو سال ہوئے ادب کی سفری صنف میں پنجاب یونیورسٹی کے ایک ڈاکٹر صاحب نے سفر نامہ لکھ کر گراں بہا اضافہ کیا۔ اس میں غالباً تیرہ یا چودہ باب ہیں۔ گیارہویں باب تک سیاح ابھی تک اپنے حسین وطن سے بوئنگ میں مائل بہ پرواز نہیں ہوا۔ یہ سارے باب اس کے رختِ سفر درست کرنے، زادِراہ کے انتظام میں پریشان حالی، احباب کی دعوتیں کھانے اور مبارک بادیں لینے کی مشغولیت کے بارے میں ہیں۔ صرف آخری دو باب اس کی سیاحت کے ملک کے متعلق ہیں۔ میں اس ڈاکٹر کے سفرنامے کو آئیڈیل سفر نامہ متصور کرتا ہوں اور بہ دل وجان اس کے پڑھنے کی سفارش کرتا ہوں۔ پبلشر یا مصنف نے مجھے ایک عنایتی کاپی سے نوازا ہے، قیمت صرف ساڑھے چار روپے ہے اور آخری باب میں ٹرافالگر سکوائر کی مدھم تصویر مصنف کے لندن میں ہونے کا حتمی ثبوت ہے۔ یہ یقیناً بادشاہی مسجد کے مینار کی تصویر نہیں ہے۔

اور اب مستنصر حسین تارڑ نے اپنا سفر نامہ "نکلے تری تلاش میں" میں لکھ کر سب کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے۔ اس پُر تخیل، رومینٹک نوجوان نے یہ سفر نامہ لکھتے وقت مروجہ ترکیب کو استعمال میں لانے کی پروا نہیں کی اور روایت کی کھلم کھلا خلاف ورزی کی ہے۔ اسی لیے اس کا سفر نامہ اپنے پیشروؤں سے کہیں زیادہ اوریجنل، دلچسپ اور اُجلا ہے۔ وہ جذبات نگاری یا ارغوانی ٹکڑے ٹانکنے سے نہیں ڈرتا اور اس کا مچلتا ہوا جوشیلا پن، نوعمری کا رومانی انداز اور مکمل بھولپن پڑھنے والے کو اپنے دام میں لے لیتے ہیں۔ تم تارڑ اور اس کی کتاب کو پسند کرنے لگ جاتے ہو۔ اس کا چہیتا مصنف، میرے خیال میں، شفیق الرحمٰن ہے اور اس نے اپنی سفری اپی سوڈز میں وہی نیم مزاحیہ رومانوی آہنگ اختیار کیا ہے جو شفیق الرحمٰن کے بیرونی ممالک کے افسانوں — "برساتی"، "ڈینیوب" وغیرہ — میں جادو جگاتا ہے۔ مگر قابل فہم طور پر، ہونہار شاگرد اپنے استاد کی گرد کو نہیں پہنچ سکتا۔ تارڑ کی سفری اپی سوڈز دلچسپ ضرور ہیں لیکن ان کو پڑھتے وقت میں اکثر یہ سوچتا رہا کہ ان میں واقعاتی اصلیت کی مقدار کتنی ہے؟ بہت سی اپی سوڈز یقیناً تارڑ کے نوجوان پُر از تخیل ذہن کی پیداوار ہیں۔ یہ امر کہ اس کا سفر نامہ حقیقت اور فکشن کا معصومانہ مرکب ہے، جو غالباً باہر جانے کے بغیر لاہور کے کسی مکان کے بالائی کمرے میں بیٹھ کر لکھا جا

Scanned with CamScanner

سکتا تھا، اس کی قدر و قیمت اور دلکشی میں کمی نہیں کرتا۔ تارڑ بیرون ملک ضرور گیا تھا— کب اور کیوں اور کتنی بار، یہ میں نہیں جانتا۔ اس لیے یہ سفرنامہ یقیناً فیک (fake) نہیں، یہ حقیقی ہے، اور اگر تارڑ نے اپنی کتاب کو دلچسپ بنانے کی خاطر واقعاتی ترتیب میں کچھ رومانی افسانے جڑ دیے ہیں تو ہم اسے معاف کر سکتے ہیں۔ کم از کم اس کا سفرنامہ ان فطری حقیقی جذبات سے تو عاری نہیں جن کا پہلے سفرناموں میں شائبہ تک نہیں ملتا اور جو سب کے سب ادھیڑ عمر کے، گانٹھ کے پورے، دانشور سیاحوں کے لکھے ہوئے تھے۔ اگر تم میں جوانی کا لاابالی پن اور رومانٹی سزم نہیں تو سیاحت پر نکلنے کا کیا فائدہ! تارڑ پر بھی کبھی کبھی پوز کرنے، بننے کا جذبہ عود کر آتا ہے، مگر اس کی بناوٹ (جو انسان کی بناوٹ ہے) لبھانے والی اور قابلِ درگزر ہے۔ جوانی میں ہم سب پوزر اور رومینٹسٹ ہوتے ہیں اور تارڑ کا بعض موقعوں پر خود کو اسٹیونسونین (Stevensonian) ویگا بانڈ یا محبت میں گھلتا ہوا نائٹ ظاہر کرنا خندہ انگیز بھولپن ہے۔

ہم اس کے ان پوزوں پر جھنجھلاہٹ میں ناک نہیں سکوڑتے بلکہ زیرِ لب مسکراتے ہیں اور اس پر جوش، پر اُمنگ لڑکے کے لیے خوشی کی تمنا کرتے ہیں۔ اس نے یہ کتاب لکھ کر (جس کی مقبولیت نے مجھے مطلق حیران نہیں کیا) اردو کے روایتی، ترکیب کے پابند، سفرنامے لکھنے والے گروہ کے بادبانوں میں سے ہوا پلٹالی ہے۔ ان کو اب یا تو تارڑ کی نئی ترکیب بروے کار لانی پڑے گی (متوسط عمر کے توندیل سیاحوں کے لیے یہ آسان کام نہیں) یا اپنا بوریا بستر سمیٹ کر سیاحت کا میدان چھوڑنا پڑے گا۔ آؤ دیکھیں، وہ کون سا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔

اور مستنصر حسین تارڑ کی اس صنف کی ترکیب کیا ہے؟ میں پہلے ہی اس کی وضاحت کر چکا ہوں۔ مجملاً یہ اس طرح ہے: کسی نہ کسی طرح گھر سے نکل جاؤ اور ''کڈنیپڈ'' کے ڈیوڈ بالفور کی طرح اپنے مکان کے قفل میں آخری بار چابی گھماؤ۔ پہلے باب کے بعد تم اپنے سفری تھیلے کو کندھے پر لادے سڑک پر ہو— پرندوں کی رفاقت میں، سیٹیاں بجاتے، پہاڑوں، ریگزاروں، نخلستانوں کے قدرتی مناظر کے درمیان۔ یہاں تم کھل کر ارغوانی ٹکڑے ٹانک سکتے ہو، اپنے رومینٹک حزن پر بے بہا آنسو بہا سکتے ہو۔ پڑھنے والے تمھارے ان پُر از شعریت پیراگرافوں سے محبت کریں گے۔ تم بوئنگ طیارے سے پرواز نہیں کر رہے ہو— تم کیسے کر سکتے ہو؟ تمھیں فورڈ فاؤنڈیشن یا برٹش کونسل نے کوئی ایئر ٹکٹ نہیں دیا— اور تم ایک غریب ٹریمپ (tramp) ہو، اس لیے تم بس سے بچ ہائیکنگ (hitch-hiking) کر کے

Scanned with CamScanner

درۂ خیبر کے راستے ایران پہنچتے ہو۔ ایران سے تم بس اور ریل کے ذریعے استنبول جاتے ہو اور استنبول سے تمھیں یورپ کے حسین خطوں میں لے جانے کے لیے پُر اسرار اور رینٹ ایکسپرس یا استنبول ٹرین ہے جس کے بارے میں گراہم گرین نے ایک رگوں کو یخ کر دینے والا، ہوش ربا ناول لکھا ہے۔ ہر یورپی شہر میں جس میں تم جاتے ہو، تمھارا کوئی پرانا دوست، واقف کار موجود ہوتا ہے جو تمھیں اپنے پاس ٹھیرانے پر اصرار کرتا ہے۔ پھر ہر جگہ تم دوست بنا لیتے ہو۔ لوگ تمھیں پسند کرتے ہیں — تم اتنے چارمنگ ہو۔ پیرس اور برلن اور کوپن ہیگن اور ہر بڑے شہر میں ایک مکمل شفیق الرحمٰن اسٹائل رومانی ایپی سوڈ تمھاری راہ دیکھتی ہے، اور نیلی آنکھوں اور سنہری بالوں والی یورپی لڑکیاں مسٹر مستنصر حسین تارڑ کے رومانٹک اور وجاہت آمیز چارم کے سامنے اپنے پہلے بوائے فرینڈز کو بھلا دیتی ہیں، اور اس سے بچھڑنے پر غم زدہ اور مجبور ہو جاتی ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ تارڑ سا سیلانی ایک جگہ نہیں رک سکتا، گھر لوٹنے سے پہلے اسے اور کئی شہروں اور خطوں کی خاک چھاننی ہے۔

اس ترکیب سے لکھے سفرنامے میں رومانی تخیل کی پرواز کے لیے کافی مواقع ہیں، اور تارڑ نے ان کا پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ ان ایپی سوڈز میں ایک معصومانہ فن کاری ضرور بروے کار لائی گئی ہے کیونکہ وہ افسانوی رنگ میں بھی قابلِ یقین رہتی ہے اور ٹین ایج لڑکیوں کو خود رحمی کے جذبے سے رلانے کا ان میں کافی سامان ہے۔ ایک ایسی ایپی سوڈ ''اپاہج وینس'' ہے۔ جو وینس کے شہر کے بارے میں نہیں — وینس پر ایک باب ہے بمع ایک الگ رومانی ایپی سوڈ کے!

اپاہج وینس ایک موپاساں، شفیق الرحمٰن، ماہام رنگ کا جذبات اور رومانس سے رِستا رومان ہے۔ ہمارا نوجوان ہیرو پیکٹ اسٹیمر پر رودبارِ انگلستان کو عبور کرتے ہوئے ایک خوبصورت پیریسین لڑکی کو ملتا ہے۔ وہ عرشے کی بنچ پر بیٹھے ایک دوسرے کو دریافت کرتے ہیں اور جب ہیرو کو کچھ وقفے کے بعد پتا چلتا ہے کہ یہ وینس کی طرح خوبصورت لڑکی لنگڑی اپاہج ہے تو اس کا جوان دل اس کے لیے محبت اور رحم کے جذبات سے معمور ہو جاتا ہے۔ یخ ٹھنڈی سرد رات، طوفانی چینل میں لڑھکتا ہوا اسٹیمر، ایک اکیلا پُرحزن ٹریمپ اور ایک دکھی کچلی ہوئی ٹانگ کی پیریسین خوبصورت لڑکی — ایک مکمل رومانس کے سارے اجزا یہاں موجود ہیں۔ پیرس ٹرین پر مستنصر اور اپاہج وینس کی باہمی دلسوزی اور رفاقت مزید بڑھتی ہے اور گارڈ و نارڈ (پیرس کا مشہور اسٹیشن) پر ایک دوسرے سے جدا ہونے سے پہلے وہ طے کرتے

Scanned with CamScanner

ہیں کہ وہ ایک دن شام کے وقت ایفل ٹاور کے پاس ایک مقررہ جگہ ملیں گے اور لڑکی وہاں اس کا انتظار کرے گی۔ مگر مستنصر کے دوست اسے اس طرح گھیر لیتے ہیں کہ وہ اپنی اپائنٹمنٹ کے مطابق ایفل ٹاور پر نہیں پہنچ سکتا۔ اس طرح اپاہج وینس پیرس کے پتھر اور کنکریٹ کے وسیع جنگل میں کھوئی جاتی ہے۔ ہیرو سمجھ لیتا ہے کہ اس کی آنکھیں اب شاید اس دکھی اپاہج لڑکی پر نہیں پڑیں گی۔ یقیناً اس کا وسوسہ بے سود ہے، کیونکہ کئی روز بعد ایفل ٹاور کے پاس شانز الیزے (یا کسی اور سڑک) پر سے گزرتے ہوئے وہی لڑکی اسے ایک کار میں بیٹھی نظر آتی ہے۔ اس کا دل اُچھلتا ہے اور تارڑ اور وہ لڑکی ایک دوسرے کو دیکھ کر خوشی سے تمتما اٹھتے ہیں۔ اس کے بعد وہ کئی شامیں اکٹھی بسر کرتے ہیں اور تارڑ کی پیرس سے روانگی سے دو تین دن پہلے سارا دن سین کے کنارے پکنک مناتے اور جھوٹ موٹ کی فلشنگ کرتے ہیں (اس سے زیادہ کچھ نہیں، کیونکہ تارڑ آزاد جنسی تعلقات میں یقین نہیں رکھتا اور پھر وہ ایک ڈائجسٹ میگزین کے لیے لکھ رہا ہے جس کے شریف، باوضع پڑھنے والے ایسی باتیں برداشت نہیں کر سکتے)۔ اپاہج وینس غالباً تارڑ سے فلشنگ اور رومینٹک گفتگو کے علاوہ کچھ اور کی طلبگار ہے جو تارڑ اسے نہیں دیتا۔ تارڑ گارڈونارڈ میں گاڑی میں سوار ہوتا ہے۔ یہ لڑکی اسے الوداع کرنے آتی ہے اور جب گاڑی حرکت کرتی ہوئی اسٹیشن سے باہر جاتی ہے وہ رومال ہلا کر پلیٹ فارم پر کچھ دور گاڑی کے ساتھ بھاگتی ہے اور پھر اپاہج ہونے کی وجہ سے پلیٹ فارم پر ڈھیر ہو جاتی ہے... اور گاڑی مغموم اور اداس تارڑ کو پلیٹ فارم پر ڈھیر اپاہج حسینہ سے ہمیشہ کے لیے دور لے جاتی ہے۔

اوہ! اوہ! مسٹر مستنصر حسین تارڑ! ٹین ایج لڑکیاں اس ایپی سوڈ کے لیے تم سے کتنی محبت کرنے لگیں گی! خود تم نے اپنی معصومیت اور رومینٹی سزم سے اس ریویئر کا دل جیت لیا ہے۔ میں تمھاری کتاب کو پسند کرتا ہوں — اس کی پروا کیے بغیر کہ اس کا بیشتر حصہ تخیلی کارنامہ ہے! لاما لوب سنگ رمپا کی تبت کی سیاحت اس کی خانقاہوں کے جادو اور اسرار کے متعلق کتابیں شاید تمھاری نظر سے گزری ہوں۔ لاما کی کتابیں بے عیب ادبی انگریزی میں لکھی ہوئی ہیں اور اس نے ایسی چھ کتابیں لکھی ہیں جن کو مشتاق پڑھنے والوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا ہے۔ یہ کتابیں اس ممنوع اور پُراسرار خطے کی خانقاہوں، ان کے لاماؤں، عجیب رسموں کے بارے میں ذخیرۂ معلومات ہیں اور پیرایہ اتنا دلچسپ ہے کہ انھیں شروع کر کے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ یہ لاما لوب سنگ رمپا کون تھا؟ ہر کسی کو یہ جاننے کی جستجو تھی۔ حال ہی

Scanned with CamScanner

میں ایک کسی قدر ہوشیار نقاد کو شبہ گزرا کہ لاما کے روپ میں کوئی شخص برٹش پبلک کو تبت کی فرضی کہانیاں سنا کر عملی مذاق کر رہا ہے۔ اس نے ایک شکاری کتے کی طرح اس لاما کا کھوج لگایا اور آخر کار ان تبت کی سفری کتابوں کے مصنف کو ڈھونڈ کر چھوڑا۔ لاما لوب سنگ رمپا ایک خاموش کنوارا بوڑھا لندنی وکیل تھا جو تبت تو درکنار، کئی برس سے اپنے شہر لندن سے بھی باہر نہیں گیا تھا۔ اس بھانڈے کے پھوٹ جانے کے بعد بھی میں لاما لوب سنگ رمپا کی کتابوں سے محبت کرتا ہوں اور انھیں تبت کے متعلق بہترین سفری کتابیں مانتا ہوں۔

نہیں نہیں! میں ہرگز یہ تاثر نہیں دینا چاہتا کہ مستنصر حسین تارڑ دوسرا لاما لوب سنگ رمپا ہے اور اس کا سفرنامہ لاہور میں بیٹھ کر لکھا گیا ہے۔ میں نے تارڑ کی کتاب پڑھنے کے بعد اپنے شبہات کو دور کرنے کی خاطر اس معاملے میں بالواسطہ پوچھ گچھ کی۔ اپنی تحقیق کی بنا پر میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اس پُرجوش رومینٹک نوجوان نے یورپی ممالک کی سیاحت ضرور کی اور اگر اس نے اپنے سفروں کی روئیداد میں رنگ آمیزی کی ہے تو صرف اس لیے کہ وہ اپنی کتاب کو پڑھنے والے کے لیے زیادہ دلچسپ اور پُرمسرت بنانا چاہتا تھا۔ اس کے لیے ہم میں سے بہت سے اسے معاف کر دیں گے۔

ان رومانی اپی سوڈز کے باوجود تارڑ کی کتاب حقیقی سفری کتاب ہے اور یہ کوئی معمولی بات نہیں کہ اس نے مروجہ ترکیب کے تار و پود بکھیر ڈالے ہیں۔ آئندہ آنے والے سیاح اب تارڑ کی ترکیب کو نظر انداز نہیں کر سکیں گے۔ اس ترکیب کے ممکنات حیرت انگیز ہیں۔ ''نکلے تری تلاش میں'' ایک لمبی کتاب ہے، ایک دلچسپ کتاب ہے، اور اس میں شفیق الرحمٰن کی ان کہانیوں کی گونج ہے جن سے ہم اپنے لڑکپن میں اتنی محبت کرتے تھے۔ اس کی روئیداد میں رومان کا رنگ چوکھا ہے، جنس بالکل نہیں۔ تارڑ ان راست گو، صحت مند، صالح نوجوانوں میں سے ہے جو اقبال کی دعا کے مطابق اپنی جوانی بے داغ رکھتے ہیں۔ اس کے لوٹنے کے بعد یورپی دارالخلافوں میں کم و بیش آدھ درجن لڑکیاں اس کی یاد میں سسک اور تڑپ رہی ہیں، مگر تارڑ اپنے وطن میں اپنی عصمت کو صحیح سلامت بچا کر لوٹتا ہے۔ کیا وہ کبھی اپاہج وینس کے بارے میں سوچتا ہے؟ کیا اپاہج وینس اور دوسری وینسوں کا وجود ہے؟

کتاب کے دیباچے میں جواں سال مصنف نے ہمیں اپنے سرزمین اندلس کے سفرنامے کے جلد چھپنے کی نوید دی ہے، ہم اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ، کیری آن! رنگ کی تختی پر اور

زیادہ شوخ اور گاڑھے رنگ ملاؤ اور تصویر کو لال چھبھا بناؤ۔ ہسپانوی سینوریتائیں دنیا میں سب سے زیادہ ملیح، سڈول جسم، خوبصورت ہیں۔ اگر ہماری ساجھی انسانی کمزوری سے کبھی تمھاری جوانی پر داغ لگ جائے تو غم نہ کرو۔ تمھیں اس کا اپنے اندلسی سفرنامے میں ذکر کرنے کی ضرورت نہیں جو شاید تمھارے ڈائجسٹ میں سلسلہ وار شائع ہوگا۔ (یا کیا شائع ہو چکا ہے؟)

(فنون، لاہور، اگست ستمبر ۱۹۷۲ء)

اپنا اپنا جہنم

جمیلہ ہاشمی

تین ناولٹ یا طویل مختصر افسانے — "زہر کا رنگ"، "لہو رنگ"، "شب تار کا رنگ" — اس کتاب کو مکمل کر بناتے ہیں۔ ان کے عنوانوں کی طرح ان افسانوں میں تھیم اور اسلوب بیان اور برتاؤ (treatment) کی ایک یک رنگی ہے۔ ماسوا پہلے افسانے کے، کسی افسانے میں جائے وقوع یا واقعات کے زمانے کا اشارہ نہیں ملتا، اور پہلے افسانے میں بھی ہندو ناموں کے کردار مذکورہ شہر کراچی میں چلتے پھرتے، محبت کرتے، اپنے جہنم میں جلتے، کچھ کچھ اوپرے اور اجنبی لگتے ہیں۔ دوسرے دو افسانوں میں ان کی خالق نے کسی مقام یا شہر کا نام لیے بغیر اپنے کرداروں اور ان کو پیش آنے والے واقعات کو پڑھنے والی چشم تخیل کے سامنے پھرایا ہے اور یہاں بھی کردار سب کے سب مذہباً ہندو ہیں، گو اکثر واقعات ان واقعات سے چونکا دینے والی حد تک مشابہ ہیں جو چند سال پہلے ایوب خاں کے زمانے میں لاہور اور کراچی میں رونما ہوئے تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ مقام اور وقت کا عدم تعین ان افسانوں کو کسی قدر فینٹاسٹیکل (fantastical)، بے اصل تاثر دیتا ہے جو دمکتے جگر جگر کرتے الفاظ کی روانی کے کہرے میں اور گہرا ہو جاتا ہے۔ ایک تیسرے درجے کے فنکار کے لیے یہ دھندلا پن، یہ فراوانی الفاظ مہلک ثابت ہو سکتے تھے۔ مگر ان افسانوں کی مصنفہ، جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں، ایک اعلیٰ پائے کی آرٹسٹ ہے۔ وہ ایک پیدائشی ادیبہ ہے، ایک حقیقی لکھنے والی۔ وہ الفاظ میں جادو جگانا خوب جانتی ہے۔ اور اگر

Scanned with CamScanner

اکثر حسین، اور ہندی کی آنچ لیے، پر شور روانی سے اس کی نثر بہنے لگتی ہے اور الفاظ منھ زور گھوڑے بن کر، مصنفہ اور پڑھنے والوں کو سوار کیے، ہوا ہو جاتے ہیں تو یہ اس کے مخصوص جینیئس کی اپنی ریت، اپنا ڈھنگ ہے۔ وہ، میں یقین کرتا ہوں، ان ادیبوں میں سے ہے جو اپنے تخلیقی ڈیمن (demon) کے ہاتھوں بے بس اور لاچار ہوتے ہیں۔ ایک بار جب وہ کاغذ پر قلم دھرتے ہیں تو انھیں الفاظ پر قابو نہیں رہتا۔ وہ اپنی من مانی کرتے ہوئے کہیں اسکے بغیر بگٹٹ دوڑنے لگتے ہیں۔ مختصر افسانہ نگاری، جو اختصار اور انتہائی ضبط کی متقاضی ہے، ایسے جینیئس کو راس نہیں آسکتی اور اس لیے مختصر افسانہ اس مصنفہ کا genre نہیں۔ وہ طویل افسانے یا ناولٹ میں خود کو ایٹ ہوم پاتی ہے اور اسی فارم میں اس کے کمال کے جوہر پوری طرح کھلتے ہیں۔ کس کو اس کا ناولٹ ''آتش رفتہ'' یاد نہیں؟ اس کے جوہر اس میں اپنے پورے عروج پر ہیں اور ناولٹ اس قدرتی قوت اور زور سے لکھی گئی ہے کہ پڑھنے والے کو دم لینے کا لمحہ نہیں ملتا۔ یہ یقیناً اردو زبان کی ایک مائنر کلاسک ہے اور اپنے تاثر میں کبھی نہ بھلائی جانے والی۔ یہاں جادو جاگ اٹھتا ہے، جیسے کرشن چندر کی ''زندگی کے موڑ پر'' یا بلونت سنگھ کے ناول ''رات، چور اور چاند'' کے اولیں بابوں میں۔ ''آتش رفتہ'' کے بعد اس کا طویل ناول ''تلاشِ بہاراں'' چھپا، چھ سات سو صفحات کی کتاب جس کو سال کا ادبی انعام ملا۔ اس میں کئی عمدہ، دلکش نثر کے ٹکڑے ہیں مگر اس کے ساتھ ہی منظر اور واقعات کی یکسانی، جمیل الفاظ کا کہرا، ایک مجموعی انتشار کا تاثر... رفتہ رفتہ پڑھنے والا دلچسپی کھونے لگتا ہے اور میں یقین کرتا ہوں کہ بہت کم لوگوں نے یہ مکمل ناول پڑھا ہوگا۔ پھر اس کے کردار قدرے اوپرے اور ہیولائی سے ہیں جن کی کارکردگیاں زیادہ معنی نہیں رکھتیں اور جو حقیقی طور پر ہم پر گرفت نہیں کر پاتے۔ نگارش کے اعلیٰ معیار کے باوجود ناول کا بے جا پھیلاؤ اور دھندلی خوابی فضا اسے ناکامیاب کرتی ہے۔ اس کی اگلی کتاب ''روہی'' تھی، جس کا منظر بہاولپور کا وہ ریتلا، ڈاہروں سے پٹا ہوا چولستان کا صحرائی خطہ ہے جسے خواجہ غلام فرید نے اپنی کافیوں اور گیتوں میں امر کیا ہے۔ یہ ''آتش رفتہ'' کی ضخامت کا ناولٹ ہے۔ اس میں اچھی خوبصورت تحریر کے ٹکڑے ہیں، مگر اس میں پہلے ناولٹ کا سا جادو کہیں بھی نہیں جاگ سکا۔ مصنفہ نے یہ ناولٹ، یوں لگتا ہے، شعوری طور پر لفظ بہ لفظ جوڑا ہے۔ اس کا دل اس کے لکھنے میں نہیں تھا۔ نہ کردار، نہ ہی واقعات اصلیت کا اثر رکھتے ہیں، اور ساری چیز ایک میلوڈراما ہے ـــــ بے جان اور قدرے بے ہنگم۔ ''روہی'' پڑھنے کے بعد اس تبصرہ نگار کو یوں لگا جیسے

Scanned with CamScanner

مصنفہ کا طلسمی صندوقچہ اپنے دمکتے جھلملاتے نوادر سے خالی ہو چکا ہے اور اس میں صرف کانسی اور پیتل کے بے وقعت زیور بچ رہے ہیں۔ مائی داس (Midas) کا لمس، جس سے چیزیں سونے کی بن جاتی تھیں، کھو چکا تھا۔

''اپنا اپنا جہنم'' کے طویل افسانوں نے میرے گمان کو جھٹلا دیا ہے۔ ان افسانوں کے پیچیدہ پلاٹوں کی گتھیاں بڑے استادانہ تیقن سے سلجھ جاتی ہیں، کردار خاصی نفسیاتی بصیرت سے دیکھے گئے ہیں اور اسلوبِ بیان کی بے کاوش روانی خاصا حیران کرتی ہے۔ یقیناً مصنفہ اپنی ہم عصر قرۃ العین حیدر کی طرح، جس کے ایک خط کے اقتباس سے اس کتاب کا فلیپ بنا ہے، آگے بڑھی ہے، اور کون کہہ سکتا ہے کہ اپنی آئندہ تصنیفات میں وہ فن کی نئی بلندیاں نہیں چھو لے گی۔ یہ صاف اور سیدھی کہانیاں نہیں، جیسی ''آتش رفتہ'' ہے اور جیسے منٹو، کرشن چندر، بیدی اور ندیم کی کہانیاں ہوتی ہیں۔ ان میں گہرے ہیر پھیر اور اڑن گھائیاں ہیں — یونانی دیومالا کی کہانیوں کی بھول بھلیاں کے انداز کی تکنیک (اگر مصنفہ کے ذہن میں تکنیک کوئی شے ہے تو!) کچھ کچھ اپنی پیچیدگی اور بہاؤ میں پراؤسٹین (Proustian)۔ غیر متوجہ، غیر سنجیدہ پڑھنے والا اس سبک پا طرزِ بیان کے ساتھ قدم نہیں مار سکتا اور قدرے پریشان اور بوکھلایا ہوا، پیچھے رہ رہ جائے گا۔ مگر وہ پڑھنے والے جو اس کے ساتھ قدم ملا کر چل سکتے ہیں اور سارے چکروں، غلام گردشوں میں سے اکھاڑے میں کھڑے مائنوٹار (Minotaur) کو دیکھ سکتے ہیں ان کے لیے بیش قیمت صلے ہیں۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو پراؤسٹ (Proust) نہیں پڑھ سکتے اور اس کا مطلب یہ نہیں کہ پراؤسٹ ایک کم رتبے کا لکھنے والا ہے۔ میں سمجھتا ہوں، کچھ الجھاؤ (کہانی کہنے کی تکنیک کو چھوڑ کر) ہندو ناموں کے کرداروں اور مقام اور وقت کی عدم وضاحت کی وجہ سے ہے۔ یہ بڑی عجیب بات ہے (جس کا ذکر کرنے میں کوئی حرج نہیں) کہ اس مصنفہ کے سب افسانوں اور ناولوں میں (میلوڈریمیٹک ''روہی'' کے استثنیٰ کے ساتھ) سب کردار، مرد اور عورت، سکھ اور ہندو ہوتے ہیں، یا سکھوں اور ہندوؤں کے نام رکھتے ہیں۔ اگر کبھی کبھی کوئی مسلمان کردار ٹپکتا ہے تو اتفاقی حیثیت میں — محض ایک نام، گوشت اور خون کے بغیر۔ میں مصنفہ پر بحیثیت فنکار اس بارے میں معترض نہیں ہو سکتا کہ اس کے کردار ہمیشہ ہندو کیوں ہوتے ہیں۔ منٹو اور بیدی اور کئی دوسرے لکھنے والوں کے بڑے افسانوں میں کردار اکثر ہندو اور سکھ ہوتے ہیں اور پھر رتن ناتھ سرشار کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ جس

کے ''فسانۂ آزاد'' میں پرانے لکھنؤ کے نوابوں کے معاشرے اور تمدن کی بوقلموں، شوخ مرقع کشی ہے۔ مذہبی تعصب بہت چھوٹے دل کے لوگوں کی اساس ہوتا ہے اور پاکستانی ادب کی رٹ لگانے والے میرے نزدیک قابل رحم، ضعیف العقل مخلوق ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ طالسطائی اور دوستووسکی کے ناول جتنا روسی ادب ہیں اتنا ہی پاکستانی ادب۔ دراصل پاکستانی ادب کی دہائی دینے والے ادب کی آفاقیت سے بے بہرہ ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ ادب کس کو کہتے ہیں یا وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ اس کے باوجود مجھے اس بات سے اچنبھا ضرور ہوتا ہے کہ اس مصنفہ کے کردار مسلمان کبھی کیوں نہیں ہوتے، اور کبھی ہو جاتے ہیں تو زندگی ان میں سے چلی کیوں جاتی ہے۔ ایک بار، محض curiosity کے طور پر، میں یہ سوال مصنفہ سے پوچھ بیٹھا۔ اس نے (میں نے ایسا ہی محسوس کیا) اس سوال کا برا مانا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ میں نے جانا کہ سب بڑے چھوٹے لکھنے والوں کی طرح وہ اپنی تخلیقات کی نکتہ چینی کے معاملے میں بے حد حساس ہے۔ اور پھر وہ مجھ سے اس قسم کے سوال کی توقع بھی نہیں کرتی تھی۔ اس نے مجھے ضرور ہلکا آدمی سمجھا ہوگا — ترس کے قابل اور تنگ خیال۔ پھر اس نے ایک بات کی، جو مجھ سے ایک سوال تھا یا اس کے مسلک کا اظہار جس کو میں یہاں دہرانا نہیں چاہتا۔ مجھے اس کی نہج فکر سے پوری ہمدردی تھی، میں خود اس میں اس کا ہم نوا تھا، اور اس کے بعد ہم ایک دوسرے کو بہتر سمجھنے لگے — لیکن میرے معصوم سوال پر اتنی رنجیدگی کیوں؟

جگہ کی کمی کی وجہ سے، اور کچھ یہ جانتے ہوئے کہ پیشہ ور نقاد کا مخصوص الفاظ کا تھیلا میری دسترس سے باہر ہے، میں ان افسانوں کا تفصیلی جائزہ لینے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ تینوں افسانے انسانی کردار کے مشاہدے میں غیر معمولی باریک بینی کے حامل ہیں، بے حد اوریجنل ہیں اور عام اردو افسانوں کی ڈگر سے قطعاً مختلف۔ وہ شاعر کی نثر لگتی ہے جس میں رومانی ذائقہ ہے۔ وہ دل میں اصلاً رومینٹک ہی ہے۔ پہلے افسانے ''زہر کا رنگ'' میں، جس کا محل وقوع کراچی ہے، کئی موقعوں پر کوئل اپنے راگ الاپتی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ کراچی میں کوئلیں موجود نہیں — ملیر اور منگھوپیر کے خطوں میں، جہاں کھجور اور دوسری نامعلوم اقسام کے درختوں کے جھرمٹ ہیں، چند کوئلیں ضرور ہوں گی۔ ایک عرصہ پہلے میں چند سال کراچی میں چاکیواڑہ کے آس پاس رہا، اور اگرچہ میں اکثر سڑک پر ہوتا تھا، میں نے کسی کوئل کو کوکتے نہیں سنا۔ میں تو کوئل کو دیکھنے سے بھی محروم رہا۔ ہو سکتا ہے یہ محض اتفاق ہو، یا کوئل صرف گوتم، منوہر اور

مایا جیسے خوبصورت ناموں والے لوگوں کو ہی اپنی مدھ بھری کوک سے محظوظ کرتی ہو۔

یہ کہ وہ ایک رومینٹک ہے، اس کے کرداروں کے ناموں سے بھی ظاہر ہے، جن کو وہ نہایت احتیاط سے چنتی ہے۔ ان کرداروں کے ناموں کی ایک مختصر فہرست ہندوستان میں رہنے والوں کو اپنے بچوں کے لیے ہندو نام چننے میں کارآمد ہو سکتی ہے۔ شیام، تارا، کدم، پرکاش، پدمنی، رمیش، چنڈی، بھگوتم، مرلی — وہ اپنے کسی کردار کا نام وساکھا سنگھ یا پشوری مل رکھنے کا سوچ ہی نہیں سکتی۔ ناموں کے متعلق اس کی عجیب سنابری (snobbery) کا ایک دلچسپ قصہ ہے۔ ان سطور کے لکھنے والے کے ایک دوست نے اپنے مختصر افسانوں پہلا مجموعہ، مصنفہ کے اصرار پر، مصنفہ کی خدمت میں پیش کیا۔ وہ ایک صاحبِ جوہر نوجوان کی بڑی جاندار اور brilliant کہانیاں تھیں اور میرا خیال تھا کہ مصنفہ ان سے کافی متاثر ہوں گی اور ایک نئی talent کو سراہیں گی۔ دو تین دن بعد جب میرا دوست ان سے ملنے اور اپنی کتاب کے متعلق رائے سننے کے لیے گیا تو مصنفہ، جس نے صرف ایک دو کہانیاں پڑھی تھیں، تعریف میں قدرے مربیانہ اور متامل تھیں۔ اس نے اقرار کیا کہ ان کہانیوں میں جان ہے مگر میرے دوست سے پوچھا، "مجھے یہ سمجھ نہیں آتی کہ آپ اپنے کرداروں کے نام اتنے عام اور بے ہودہ سے کیوں رکھتے ہیں۔ مثلاً فتو، موجو، بھاگ بھری۔ یہ مجھے سخت ناپسند ہے۔ ایسے ناموں سے کہانی کا مزہ خراب ہو جاتا ہے۔" مصنفہ کو یہ خیال تک نہ آیا کہ ایک دیہاتی کردار کا نام فتو کی بجائے جاوید، طارق جمیل یا پرشوتم رکھنے سے ساری چیز جھوٹی ہو جاتی اور کہانی کا تاثر مکمل طور پر تباہ ہو جاتا۔ جس علاقے میں فتو، موجو، بھاگاں اور زینبے رہتے ہوں ان کو انھی ناموں سے بلایا جائے گا۔ بھاگاں کو گلنار، پروین یا مس مارجری کہنے سے افسانہ نگار اور اس کے قاری کے لیے ایسی الجھنیں پیدا ہو سکتی ہیں جن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ افغانستان کے متعلق ناول میں ہیرو کا نام میزان الرحمٰن چودھری رکھنے سے ناول نویس اپنے سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دے گا۔

پچھلے دو افسانوں میں یونیورسٹی رائٹرز، انقلابی سرگرمیوں اور جلسے جلوسوں کا بھی ذکر ہے۔ یوں لگتا ہے کہ مصنفہ اپنی کہانی کے ساتھ ساتھ ان وقتوں کی سیاسی اور سوشیالوجیکل تاریخ بھی پیشِ نظر رکھنا چاہتی ہے۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ہمارے افسانہ نگاروں کے اپنے افسانوں کو سیاسی اور سوشیالوجیکل ملفوظات بنانے کا رجحان افسوسناک ہے۔ جین آسٹن نے اپنے سوسائٹی ناول نپولین کی

Scanned with CamScanner

جنگ آزمائیوں کے دوران لکھے، اور ان میں بیٹل آف دی نائل اور واٹرلو کے معرکے کا کوئی ذکر نہیں۔ ان کے پرسکون، پُرظرافت صفحات میں بندوق اور توپ کی گھن گرج کہیں سنائی نہیں دیتی۔ اور میرا خیال ہے قرۃ العین حیدر نے اردو میں سیاسی اور سوشیالوجیکل ناول لکھنے کا رواج قائم کیا۔ اس کے اسلوب اور طرزِ بیان کے بہت سے مقلد پیدا ہو گئے (یا ہو گئیں) مگر ان میں مس حیدر کا سا جینیئس نہ تھا۔ ان میں سے سب سے نامور عبداللہ حسین ہے۔ اس نے آٹھ نو سو صفحات کا ایک ضخیم سیاسی اور سوشیالوجیکل ناول ''اداس نسلیں'' تعمیر کیا جس میں کرداروں کو مصنف کے اپنے نقطۂ نظر سے نمایاں کرنے کے لیے راجہ رام موہن رائے سے لے کر برٹش راج کے آخری دنوں تک کی سیاسی تاریخ کو بروے کار لایا گیا ہے۔ اس ساگا کے صفحات مس حیدر کی طرز پر لکھے ہوئے ہیں، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مصنف نے دس گھوڑوں کا بوجھ کھینچا ہے۔ کردار پُتلے ہیں اور ان کی زبان مصنف کی اپنی زبان ہے۔ مجھے اس کے کسی صفحے میں شعلہ بھڑکتا نظر نہیں آیا، ہیومن interest عنقا ہے — ایک نقلی ناول، ان ناولوں میں سے ایک جنھیں انتھنی ٹرالوپ 'لکڑی کے ناول' کہا کرتا تھا۔ تب سے بہت سے لکھنے والے اور (لکھنے والیاں) انھی سنسان راہوں پر چلے ہیں اور ان میں مارے گئے ہیں۔ بعض خواتین پاکستان و ہند کے مسائل چھیڑنے پر قانع نہیں ہوئیں؛ انھوں نے مشرقِ وسطیٰ اور کل اسلامی دنیا کی سیاسی اور معاشی تاریخ سمونے کی ٹھانی۔ اب ایک لکھنے والے میں سیاسی اور سماجی شعور کا ہونا کوئی بری بات نہیں مگر ناول اصلاً ایک ہیومن ڈاکومنٹ ہے — سوسائٹی کا ایک زندہ اور تخلیقی مرقع۔ یہ تاریخ نہیں، نہ ہی سیاسی، معاشی مسائل پر مصنف کے اپنے زاویۂ نگاہ کی اشاعت کا وسیلہ۔ افسانے اور ناول کا فن بالکل مختلف مقاصد کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔ ممکن ہے ہمیں اسپین کی جدید تاریخ سے کوئی دلچسپی نہ ہو مگر ہیمنگوے کے ''فار ہوم دی بیل ٹولز'' قسم کا ناول ہمارے قدرتی احساسات اور جذبات کو اسی قوت سے ہلاتا ہے جیسے ایک ہسپانوی یا فرانسیسی یا ایک اسرائیلی کے احساسات اور جذبات کو۔ مذہب اور ملت اور نظریے کے پتلے ملمع کے نیچے فطرتِ انسانی، اس کے محرکاتِ عمل، اس کی خوشیاں غمیاں ایک سی ہیں۔ اور ''ایوان ایلیچ'' یا ''ایک آدمی کو کتنی زمین درکار ہے'' جیسی کہانیاں ہمارے لیے بھی اتنی حقیقی اور گرفت کرنے والی ہیں جتنی ایک روسی کے لیے جس کی زبان میں وہ لکھی گئی تھیں۔ میں اس بات کو طول نہیں دینا چاہتا — میرے لیے یہ صداقت دن کی طرح صاف ہے اور اسی طرح میں امید کرتا ہوں سب کے لیے ہو گی۔

Scanned with CamScanner

چونکہ یہ افسانے ایک اعلیٰ درجہ کی فنکار کے ہیومن ڈاکومنٹس ہیں، ان کی خامیاں (جو ظاہر ہیں) ہمیں نہیں کھٹکتیں، نہ ہی ان افسانوں کے مجموعی تاثر میں کھنڈت ڈالتی ہیں۔ اتنے اوریجنل فنکار، جو دوسروں کے اتباع سے ہٹ کر اپنے ذہن سے سوچتے اور اپنے اسلوب میں بات کرتے ہیں، ہمارے ادب میں کم ہیں۔ اس نے یقیناً اپنے جوہر اصلی سے سلامی کے چبوترے پر کھڑے اردو ادب کے پالٹ برو (Politburo) کے اہم ارکان میں جگہ حاصل کی ہے۔ وہ وہاں عقبی دروازے سے یا خود تحسینی کے ہتھکنڈوں سے نہیں پہنچی اور ہم — اس کے شکر گذار پڑھنے والے — سلامی کے چبوترے کے سامنے مارچ پاسٹ کرتے ہوئے اسے سیلوٹ کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔

کیری آن بہادر خاتون! کہ کسی وقت تم پالٹ برو کی چیئرمین بن سکتی ہو اور تمھاری جگہ اس illustrious قطار کے وسط میں ہوگی۔ پھر میں امید کرتا ہوں، خود رائی اور خود پسندی اور غرور تم میں نہیں آئے گا کیونکہ ادبی شہرت بڑی فکل (fickle) شے ہے — اور اس وقت اس ملک میں لوگ کتابیں، خواہ وہ کتنی اچھی ہوں، نہیں پڑھتے۔ ان کے پاس وقت نہیں۔ تمھاری کتاب شاید میں نہ پڑھتا اگر تم نے مجھے یہ تحفتاً نذر نہ کی ہوتی — تمھاری عنایت سے میں محرومی سے بچ گیا۔ اتنی حسین تفریح اور مسرت عطا کرنے کا شکریہ!

(فنون، لاہور، اپریل مئی ۱۹۷۴ء)

آوازِ دوست

مختار مسعود

جنابِ عالی!

آداب بجالاتا ہوں۔ آپ کی تصنیف کا رسالہ ''آوازِ دوست'' نظر نواز ہوا۔ سبحان اللہ! نثرِ اردو زبان کو لباسِ تکلف اور زیورِ سخن سے آراستہ کر کے روکشِ ماہِ تمام بنایا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ تم کو سخن طرازی میں یدِ طولیٰ حاصل ہے اور الفاظ کے طوطا مینا اس صناعی سے تراشے ہیں کہ دل الجھنے لگتا ہے۔ ہزار کوشش سے شاہدِ معنی ہاتھ نہیں آتا، اور یہی وجہ ہے دیدہ وروں کی نظر میں اس نگارش کے آنا فانا کارنامۂ اردو کا درجہ

حاصل کرنے کی۔ صاحب! تم نے نثرِ گل فشاں میں وہ رنگ دکھایا کہ ابوالکلام آزاد نے خلد میں پانی پھرا اور نیاز فتح پوری نے سر پر دھول ڈالی۔ یہ رسالہ فنِ تاریخ نویسی و سوانح نگاری کا اعجاز ہے اور اس فن کا اس سلطنتِ پاکستان میں آج تمھارا مثیل نہیں۔ جیتے رہو۔ تمھارا اور تمھارے مداحوں کا دم غنیمت ہے۔ سنتے ہیں اس رسالے کے نقشِ اوّل کے انطباع کے دو ماہ بعد سب نسخے ختم ہو گئے اور نقشِ ثانیہ کی نوبت آئی۔ خدا کرے اس رسالے کے پے بہ پے نقوش صفحۂ دہر پر ثبت ہوں اور اس کے ساتھ تمھارا نام چہار دانگِ عالم میں پھیلے۔ کیونکر کہوں فقیر کو اس مقبولیت پر رشک نہیں آیا، کہ فقیر کا ایک رسالہ موسوم بہ ''کھویا ہوا اُفق'' پانچ سال ہوئے کسی نہ کسی طور سے چھپ کر بازار میں آیا تھا، وہ اب تک مہتمِ مطبع کے گودام میں پڑا سڑتا ہے۔ میرا کیا منھ کہ پوچھوں کہ رمزِ اردو کتابوں کو سپید چکنے کاغذ پر طبع کرانے اور ہاتھوں ہاتھ بکوانے کی کیا ہے۔ یہ رمز کس ولی باکرامت نے تم کو سجھائی؟ باور کرتا ہوں کہ جو مصنف بلند منصب ہوگا، اس کی نگارش بھی بلند ہوگی، اخوانِ باصفا بڑھ چڑھ کر اس کی تعریفوں کے پل باندھیں گے، صف آرا ہو کر مجرے عرض کریں گے۔ جو کچھ حضرت کے اس صحیفۂ دانش و آگہی کے بارے میں ابعاض اشخاص نے لکھا ہے، اسے پڑھتا ہوں اور اپنا سر پیٹتا ہوں۔ خللِ دماغ کی کئی صورتیں ہیں۔ میں نہیں کہتا کہ اس عمر میں میرے حواس بجا ہیں۔ البتہ تمھارے ثنا خواں اگر فی الواقع صادق الودود ہوش مند ہیں اور ان کے دعوے سچے ہیں تو اس سال کے ادب کے نوبل پرائز کا تمغہ تم کو ملنا چاہیے تھا، لیکن وہ ایک صاحب آسٹریلیا کے پیٹرک وہائٹ لے اڑے۔ وہ سعادت حسن منٹو کی طرح جھوٹی سچی داستان طرازی کرتے ہیں، یعنی فضول بیکار کی قصہ گوئی جس سے کچھ حاصل نہیں۔ وہ فنِ تاریخ نگاری اور مردم پرستی سے بیگانۂ محض ہیں۔ اس دنیاے دوں کی پُر فریب نظارگی سے بے بادہ مست جھومتے ہیں۔ ہر آدمی کو والہانہ محبت سے گلے لگاتے ہیں اور قوم و ملت، کالے گورے، ہندو عیسائی میں تمیز نہیں کرتے۔ ان بے چاروں کو تاریخِ امم سے کیا علاقہ، ضوابطِ اخلاق کی تعلیم سے کیا تعلق۔ خلاصۂ کلام یہ کہ ادب کا نوبل پرائز ملا تو ایک افرنگی اہلِ نصاریٰ کے یاوہ گو شخص کو جو فسانۂ فسوں کہنے میں اپنا اور دوسروں کا ضیاعِ اوقات کرتا ہے۔ خیال باندھتا ہوں کہ سعادت حسن منٹو شراب کی بوتل چولے کی جیب میں ڈالے، سر پر تولیہ لیے، تم کو ٹھنڈی سڑک پر ملا۔ تم اپنی پتلون کوٹ، اینٹھے کالر میں اور اکڑے۔ ایک نگاہِ تمسخر انگیز، تحقیر آمیز اس شرابی کبابی پر ڈالی اور اپنا منھ پھیر لیا۔ مابعد اس کے عدالتِ عالیہ کے سامنے ایک نیم تلے رُکے، بڑی نفاست

Scanned with CamScanner

دوسرا مضمون بھی اس رسالے کا فنِ تاریخ اور فنِ سوانح اور فنِ خود پرستی کا اعجاز ہے۔ اللہ اللہ! کیسے آپ کو یقین دلاؤں کہ اردو کی نثر میں یہ مضمون گراں بہا و لاجواب ہے۔ گو کہ ہر دو مضامین مشہور ایک طرح اور ایک قماش کے ہیں، دوسرے میں، کہ کتاب نے اس سے نام پایا، آپ نے، چشم بددور، کشتِ زبانِ اردو میں وہ چمن آرائی کی ہے کہ باید و شاید۔ اساطیر اہلِ یونان کی حیرت افزائیوں کے بارے میں کس تحقیق و کاوش سے لکھا ہے۔ کون ہے جو یہ حصہ پڑھ کر حضرت کے وسیع المطالعہ، معلوماتِ زمانہ کا خزینہ ہونے سے منکر ہوگا۔ بالتخصیص علم اساطیر میں اس ملک میں ماسوا عبدالعزیز خالد کے اور کسی کو آپ کا ہم پلہ نہیں گردانتا، مگر عبدالعزیز خالد شاعر ہیں اور نثر و شاعری کے روپ اور آہنگ مختلف ہیں۔ ویسے زبان کے انشا پردازوں میں ڈاکٹر وزیر آغا صاحب بھی علم اساطیر پر عبور میں کسی سے پیچھے نہیں، ہاں یہ ضرور ہے کہ ان کا میدانِ مخصوص چین اور ہند کی سلطنتوں کے اساطیر ہوئے، یونان کے اساطیر سے ان کو سروکار نہیں۔ اب یاد نہیں پڑتا کہ اس مضمون موسوم بہ ''آوازِ دوست'' میں یونانی اساطیر کا نزول کس ضمن میں ہوا، کیونکہ فقیر کے گمان کے مطابق بیشتر مضمون آپ کی آٹوگراف کی کتاب کی کارفرمائیوں کا صحیفہ ہے۔ جس طرح افریقہ میں بگ گیم کے شکاری رائفل و بندوق سے ضیغمِ ایال دار اور نہنگِ دریائی کا شکار کرتے ہیں، اس طرح تم اپنی آٹوگراف کی کتاب کے ہتھیار سے عظیم ہستیوں کے جان لیوا ہو۔ آٹوگراف البتہ کسی خوش نصیب کا اس وقت تک نہیں لیتے جب تک تم کو اس کی عظمت کے بارے میں اطمینانِ کامل نہ ہو جائے۔ صاحب! اس میدان میں کیا پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہو۔ یہ نہیں کہ ہرا یرے غیرے کے سامنے آٹوگراف کی کتاب کھول کر رکھ دی کہ صاحب اس میں دو حرف اپنی منشا کے تحریر کردو۔ پہلے اس ہستی کی عادات و خصلات، علم و اخلاق، عقائدِ دینی و سیاسی وغیرہ کے بارے میں بالتفصیل کوائف جمع کرتے ہو اور پھر غالباً اس کو مختلف صفات کے بدرجۂ فضیلت نمبر دے کر اس کے عظیم یا حقیر ہونے کا فیصلہ کرتے ہو۔ ماشاء اللہ، آپ کا کسی کی عظمت کا تعین کرنے کا معیار ازبس کڑا ہے، غلطی اس میں ہو نہیں سکتی۔ اہلِ ہنود، خواہ قابل اور اچھے ہوں، اور اکثر اہلِ نصاریٰ آپ کو آٹوگراف دینے کی حسرت دل میں لیے اس جہاں سے گزر گئے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کو آپ نے گھاس نہ ڈالی، ہر چند کہ ان کی تمنائے دلی آپ کی آٹوگراف بک میں اپنا نام لکھنے کا اعزاز حاصل کرنے کی تھی۔ بی بی سروجنی نائیڈو کو طوعاً و کرہاً آٹوگراف بک اس لیے پیش کی گئی کہ وہ اہلِ اسلام کی

طرف داری ہر معاملے میں کرتی تھیں اور حافظِ قرآن تھیں۔ صاحب انگلستان عالی شان کے ٹائن بی، مصنف تاریخ عالم نے آٹوگراف کی کتاب میں اپنے دستخط کرنے کی سعادت پائی۔ آپ اور ان میں تاریخ دانی قدرِ مشترک تھی۔ ان کے خیالات اہلِ اسلام کے بارے میں تعصب سے بالاتر تھے۔ خوشا نصیب کہ حضرت قائداعظم محمد علی جناح بانیِ پاکستان بھی آپ کے عظمت کے پیمانے پر پورے اترے۔ انھیں بھی آٹوگراف میں اپنا نام لکھنے کا شرف حاصل ہوا۔ علامہ اقبال بے چارے رہ گئے۔ واحسرتا! وہ آپ کی نظروں کو جچے نہیں۔ فقیر منش، درویش صفت، قلندرانہ وضع کے شاعر تھے۔ میو روڈ پر اپنی شکستہ حویلی کی ایک کوٹھری میں پڑے حقہ پیتے رہتے تھے اور اکثر گھر پر میلی بنیان اور چادر پہنے رہتے۔ یوگوسلاویہ کے صدر الصدور مارشل ٹیٹو سرکاری دورے پر پاکستان آئے اور شہر لاہور میں ایک دن قیام کیا۔ آپ تب حسنِ اتفاق سے لاہور احاطے کے کمشنر صاحب بہادر تھے۔ آپ کے فرائض میں مارشل ٹیٹو صاحب کی مہمان نوازی اور لاہور شہر کے تاریخی مقامات کی سیر کرانا داخل تھا۔ وہ اشتراکی، دہریے عقیدے کے، آپ ان سے آٹوگراف بھلا کیوں لینے لگے۔ مارشل ٹیٹو ایک ہی کائیاں آدمی، سرد گرم چشیدہ، وہ آپ کی نیت کو بھانپ گئے اور آپ کی آٹوگراف بک دیکھنے کی درخواست نہ کی۔ جب مارشل ٹیٹو بادشاہی مسجد دیکھنے گئے تو انھوں نے اور ان کی بیگم نے خوش دلی سے جوتے اتار کر موزے چڑھائے اور مسجد میں داخل ہوئے۔ ان کی نگاہ اٹھی تو مسجد کے تجمل و شکوہ کی نظارگی سے ان پر سکتہ طاری ہوگیا۔ جب قدرے ہوش میں آئے تو آپ کو ساتھ لے کر موزہ چڑھے پاؤں میں ایک گھنٹہ گھومتے رہے۔ ان کی یہ ادا، اہلِ اسلام کے شعائر سے دلچسپی، آپ کو بھائی۔ وہ عظیم ہستیوں کے زمرے میں آ گئے۔ آپ نے آخر ان کو اپنی آٹوگراف بک پیش کر ہی دی اور وہ مارشل ٹیٹو کے دستخطوں سے اب تک گہر بار ہے۔ جن اشخاص کو اس میں شک ہو وہ آپ کی آٹوگراف بک کے ایک ورق پر اس امر کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ اور ہاں صاحب! حسرت موہانی کے سامنے آٹوگراف بک کیونکر رکھ دی؟ کیونکر آٹوگراف ان سے لینے پر خود کو آمادہ کیا؟ ان کی ناموری، سیاست ہندوستان میں اہمیت، شعائرِ اسلام کی پابندی، سب تسلیم، لیکن مولانا عمر کا بیشتر حصہ کھرے کانگریسی رہے۔ اہلِ ہنود کے معتبرین سے ان کا یارانہ تھا۔ پھر لباس کی طرف سے بے پروا تھے، سوٹ اور ٹائی کبھی نہ پہنا، بکس کی بجائے پرانے ٹین کے کنستر میں کپڑے اور سامان رکھ کر اور ہاتھ میں لوٹا لے کر ریل کا سفر کرتے۔ ریل میں

تھرڈ کلاس کے ڈبے کو دوسرے ڈبوں پر فوقیت دیتے۔ وہ عظیم آپ کی نگاہِ ژرف نگاہ میں کس رو سے ہو گئے؟ صاحب! وہ ورق پھاڑ نہیں سکتے؟

جستہ جستہ یہ مضمون دیکھنے سے مجھ پر یہ منکشف ہوا کہ آج کل آپ نے اپنی آٹوگراف بک ٹھپ کر رکھی ہے، اس واسطے کہ چار سوے عالم میں آپ کو کوئی عظیم آدمی نظر نہیں پڑتا جو آٹوگراف دینے کا استحقاق رکھتا ہو۔ فقیر کو آپ کے اس فیصلے سے سخت حیرت ہوئی۔ یہ کیسے تم سمجھتے ہو کہ عظیم آدمی سب مر گئے؟ فقیر تا حال جیتا ہے۔ ایک عرصے سے ملتان میں محلہ شمس آباد میں قیام پذیر ہے۔ حال ہی میں ایک دوست کی عنایت سے قیمتی لارنس پور کی ٹویڈ اور گرے فلالین کا جوڑا خرید کر ایک درزی کو دیا ہے، وہ چند دنوں تک سل جائے گا۔ دیکھو! آٹوگراف بک کو ہوا دو اور جب دل چاہے آ کر آٹوگراف لے جاؤ۔ میں بالعموم گھر پر ہی موجود ہوتا ہوں، کہیں آتا جاتا نہیں۔ لیکن تم کو جلدی کرنا پڑے گی، خدا جانے کب بارگاہِ ایزدی سے حکمِ رہائی آ جائے اور تم ہاتھ ملتے رہ جاؤ۔ چار پانچ اور عظیم اشخاص بھی فقیر کے پڑوس میں رہتے ہیں۔ وہ بھی آٹوگراف دینے میں تامل نہیں کریں گے۔ دو اُن میں سے صرف اپنے انگوٹھوں کے نشان لگائیں گے۔ میں نے ان کو کہلا بھیجا ہے کہ چند دن ملتان سے باہر نہ جائیں۔ خدا جانے تم کب آٹوگراف لینے وارد ہو جاؤ۔

واہ واہ! ہمارے حضرت مختار مسعود صاحب دام اقبالہٗ نے عظمتِ انسان کو پرکھنے کی خاطر کیسی کسوٹی بنائی! اوّل آدمی کا مشہور و معزز ہونا، دوم اس کا اہلِ اسلام ہونا یا اہلِ اسلام سے مہر و محبت رکھنا، سوم خوش پوش ہونا اور پوشاک میں اعلیٰ ذوق رکھنا، چہارم جامعہ علی گڑھ کا سند یافتہ ہونا، پنجم... مگر کہاں تک شمار کرتا جاؤں۔ علامہ محمد اقبال لاہوری رحمۃ اللہ علیہ میں دو اوصاف تو کچھ کچھ موجود تھے، بقیہ دو کے باب میں وہ کورے تھے۔ آپ کی نگاہ میں وہ چڑھتے کیونکر؟ حکیم الامت کہلائے مگر خالی خولی باتیں بنانے والے، شعر گھڑنے والے، عمل سے کوسوں دور۔ ہر چند کہ دوسروں کو شاہین ہی متصور کر کر پہاڑوں کی چٹانوں میں بسیرا کرنے پر اُکساتے رہے مگر خود لاہور کی میو روڈ کی کوٹھی میں اپنی چارپائی سے نہ سرکے۔ دراصل یہ بات بھی ہے کہ مردانِ باعمل و باجبروت تم کو پسند ہیں۔ شعرا اور ادبا کو خاطر میں نہیں لاتے، اس واسطے کہ عمل سے گریزاں رہتے ہیں۔ آپ کو اپنا عظمت کا معیار مبارک! ایک رند مشرب سعادت حسن منٹو کا معیار عظمتِ انسانی کے بارے میں جداگانہ تھا۔ اس مرحوم نے ایک بار

Scanned with CamScanner

نشۂ شراب میں فقیر سے کہا، ''یار، بابو گوپی چند بہت بڑا آدمی تھا...'' جو باتیں اس نے مجھ کو اپنے یار گوپی چند کی سنائیں، تم ان کو سنو تو غضب سے لرزنے لگو۔ اس سعادت حسن منٹو کے نزدیک بمبئی کی ایک ادھیڑ عمر کی طوائف موذیل بھی عظیم عورت تھی۔ سنو صاحب، آپ کس لیے منھ بناتے ہو؟ وہ شخص بھی تو اسی ڈھنگ وقماش کا تھا۔ تماشا گاہِ عالم میں بے راہ روی سے سیر کرنے والا، اوباشوں، اُچکوں میں مہر ووفا ڈھونڈنے والا۔ آٹوگراف بک اس نے ساری عمر جیب میں نہ رکھی اور نہ کسی کو پیش کی۔ وہ ملاقاتی کی ظاہری اور باطنی آٹوگراف اپنی لوحِ ذہن پر محفوظ کر لیتا تھا اور ایک عالم کو بے باکی سے دکھلاتا تھا۔ الغرض حضرت، یہ آوارہ مزاج، عیاش طبع شخص ہتھے سے اکھڑا تھا۔ توبہ توبہ! بابو گوپی چند، ذات کا کھتری، کسبی موذیل، آتش پرست پارسن — یہ عظمتِ انسانی کا تاج ان زندیقوں کے سر پر دھرتا ہے!

بہرحال کتاب تم نے دھوم دھام کی لکھی ہے۔ گلشن فصاحت کی باغبانی اس طور کی کہ آگے کسی نے کی نہیں۔ بلند پروازی و نازک خیالی اس روپ کی مولانا ابوالکلام کو کہاں میسر! حساس طبع لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ اس نگارش میں سراسر تصنع وآورد ہے اور خیالات اس کے کم نظری اور خود بینی کے مظہر ہیں تو وہ بکتے ہیں۔ یقین مانیے گا، فقیر تمھارے اس رسالے کو تکیے کے نیچے رکھ کر سوتا ہے اور راتوں کو اٹھ کر پڑھتا ہے۔ وائے حسرت! گزرگاہِ ہستی کی ترپن منزلیں طے کر چکا، آج تک کسی کو فقیر سے آٹوگراف لینے کی توفیق نہیں ہوئی ماسوا ایک موقع پر۔ شیخی بگھارنے کی خاطر نہیں کہتا۔ میں ایک بار جہاز میں سوار ہو کر انگلستان عالی شان میں گیا۔ وہاں چند طالب علم، ممالک شرق وغرب وجبش سے آئے ہوئے، ویلز کے صوبے میں بغرض سیر گئے۔ میں اس جماعت میں شامل تھا۔ ہمارے ٹور کے منصرم ہمیں ایک کوئلے کی کان میں کام کرنے والوں کے گاؤں میں لے گئے۔ بچوں کی ایک فوج ہمیں عجوبے گمان کر کر ہمارے جلو میں ہوئی۔ انھوں نے غالباً گمان کیا کہ ہم اہلِ جبش کے مطرب وتواسنج ہیں جو وہاں کے اسکول میں بینڈ باجا بجا کر بچوں کے دل شاد کریں گے۔ یہاں ایک چھوٹا سا چپٹی ناک والا لڑکا میری صورت سے متاثر ہو کر میرے پاس آیا اور کہا، ''معاف کیجیے، کیا آپ مجھ کو آٹوگراف دیں گے؟'' اس نے اپنی آٹوگراف بک میرے سامنے کر دی۔ میں نے مسرت سے فخر کی مونچھوں پر تاؤ دیا۔ حضرت یہ میری زندگی میں پہلا موقع تھا کہ کسی نے مجھ سے آٹوگراف کی درخواست کی۔ میں چاہتا تھا اس چھوٹے لڑکے کو سینے سے لگالوں، کندھوں پر بٹھاؤں۔ جب میں آٹوگراف بک میں دستخط

Scanned with CamScanner

رقم کر رہا تھا، وہ بھنّنا بولا، ''پلیز، کیا آپ اس بینڈ کے ماسٹر ہیں؟'' باور کیجیے، یہ سن کر ساری سرخوشی پر اوس پڑ گئی۔ جذباتِ دلی سخت مجروح ہوئے۔ خیر یہ تو دل لگی ہے۔ تم بتاؤ، آٹوگراف دینے میں وہاں خود پہنچوں یا تم یہاں آؤ گے؟ اس شہر کے ریسٹ ہاؤس میں قیام وطعام کا اچھا انتظام ہے۔

جواب آنے پر اگلا خط لکھوں گا۔

زیادہ حدِ ادب

طالبِ کرم، خضر قطب

(فنون، لاہور، جون جولائی ۱۹۷۴ء)

کپاس کا پھول

احمد ندیم قاسمی

ان لکھنے والوں میں، جنھوں نے قیامِ پاکستان سے پہلے مختصر افسانہ نویسی کے فن میں نام پیدا کیا اور پریم چند کے اُگائے ہوئے پودے کو سینچ کر اس میں نئی تراشیں، نئے پھول اور پتیاں لائے، غلام عباس اور احمد ندیم قاسمی اب سرحد کے اِس طرف ہمارے درمیان موجود ہیں۔ خوش قسمتی سے وہ اس ادبی بے حسی کے دور میں بھی لکھ رہے ہیں اور ان کی تخلیقی قوتوں میں کوئی کمی آتی معلوم نہیں ہوتی۔ یہ ضرور ہے کہ غلام عباس کے قلم سے دو تین برس میں ایک آدھ کہانی نکلی ہے — مہارت سے ترشے ترشائے ایک ہیرے کی طرح آبدار، فنی لحاظ سے بے عیب — اور احمد ندیم نے پچھلے دس سال میں صرف سترہ کہانیاں لکھی ہیں یعنی برس دو برس میں دو کہانیوں کا اوسط، مگر ہمارے نئے لکھنے والے آج بھی ان دو استادوں سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ نئے لکھنے والوں میں اتنا صبر وحوصلہ نہیں۔ وہ جلدی سے ایک ہی ہلّے میں ادب کی دنیا سے اپنا سکہ منوالینا چاہتے ہیں۔

ندیم کی اوّلین کتاب ''چوپال'' کی 'دیہاتی' کہانیاں اُس زمانے میں لکھی گئیں جب وہ جواں سال تھا اور کالج سے بی اے کر چکنے کے بعد تلاشِ روزگار میں سرگرداں تھا۔ ''چوپال'' دارالاشاعت پنجاب سے غالباً ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی اور اب مدت سے نایاب ہے۔ ''کپاس کا پھول'' اس کا حالیہ

Scanned with CamScanner

کہانیوں کا مجموعہ اب ہمارے سامنے کتابی شکل میں آیا ہے، اور دونوں کتابوں میں وقت کا بڑا فاصلہ ہے — کوئی بتیس تینتیس سال کا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ''کپاس کا پھول'' کی کہانیاں پختگی فن اور فارم کی استادی کی مظہر ہیں۔ ندیم نے اس مدت میں اپنی مشق سخن جاری رکھی اور اپنے تخلیقی سوتوں کو خشک نہیں ہونے دیا، لیکن ایک شے پہلی کہانیوں اور ان بعد کی کہانیوں میں مشترک ہے — اور وہ ہے جادو — اس شے کو جو سب اچھے فن کی جان ہے، اور کیا نام دیا جا سکتا ہے؟ جب کسی فن پارے میں جادو کا عنصر مفقود ہوتا ہے تو اپنی ساری ذکاوت اور صنعت گری کے باوجود اس میں جان نہیں پڑتی۔ ادب کے ہر پڑھنے والے کو ایسی کتابوں کے نام یاد ہوں گے جنھیں شائع ہونے پر شاہکار قرار دیا گیا مگر جن کو اب دوبارہ پڑھنا بڑا کٹھن کام لگتا ہے — محض تضیعِ اوقات۔ وہ مر چکی ہیں۔ ان کی دھوم دھام اور چکا چوند نقلی اور مصنوعی تھی۔ میر امن کی ''باغ و بہار'' میں، غالب کی غزلوں اور خطوط میں، اقبال کی شاعری میں اس جادو کا عنصر موجود ہے — ان مختلف اندازِ فکر اور اسلوبِ بیان میں لکھی ہوئی تخلیقات کا واحد سا نجھا عنصر۔

''کپاس کا پھول'' ندیم کے پچھلے دس برس میں لکھے ہوئے سترہ مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے — ایک ایسا ہار جس میں سترہ رنگا رنگ سدا بہار پھول پروئے گئے ہیں۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں، ندیم کی ہر ادیب کی طرح اپنی ایک خاص دنیا ہے۔ ندیم کی دنیا میں تازگی، حسن، دردمندی اور معصومیت کارفرما ہے۔ یہ کہانیاں ملائم ہاتھوں سے گھڑی ہوئی، سیدھی سادی، بجری نثر میں لکھی ہوئی ہیں اور پڑھنے والے کو ابتدا سے ہی اپنے دام میں لے لیتی ہیں۔ کبھی کبھی عبارت میں شعریت آجاتی ہے (کیونکہ ندیم ایک شاعر ہے) اور اس میں رنگینی کے نقش و نگار جھلک مارنے لگتے ہیں۔ یہ زرق برق ٹکڑے جو شاید بعض پڑھنے والوں کو چبھیں (مجھے ذاتی طور پر وہ مزہ دے جاتے ہیں) بہت کم اور خال خال ہیں۔ زیادہ تر ان کہانیوں کا اسلوب بے آرائش، سیدھا سادا اور ننگا بچا ہے لیکن کتنا تاثیر کا طلسم اس میں ہے! اور ہمارے اردو کے نئے اور پرانے لکھنے والوں میں کتنے اتنی ظرافت، اتنی دل سوزی، اتنی صفائی سے کہانی کہنے کا گر جانتے ہیں؟ یہ ایک قدرتی نگارش ہے جو محض جانکاہی اور کاغذ سیاہ کرنے سے نہیں آتی۔

میں نے ''کپاس کا پھول'' کی تقریباً ساری کہانیاں اس وقت پڑھی تھیں جب وہ مختلف ادبی مجلوں میں اشاعت پذیر ہوئیں اور اب میں نے انھیں کتابی شکل میں پڑھا ہے۔ دوبارہ پڑھنے میں وہ

Scanned with CamScanner

اپنی تازگی، اپنا اُجلا پن کھو نہیں دیتیں بلکہ میرے لیے ان کی دل پذیری اور سحر آفرینی پہلے سے بھی بڑھ چڑھ کر تھی۔ دوسری بار پڑھنے پر میں نے ان میں حسنِ بیان کے کئی اچھوتے، مٹی کے بولتے ٹکڑے دریافت کیے جو پہلی بار پڑھنے پر میری نظر میں نہیں آئے تھے اور جن کی طرف میں نے دھیان نہیں دیا تھا۔ اچھے جاندار ادب کی یہی پرکھ ہے کہ اس کا تاثر دوسری یا تیسری بار پڑھنے پر بھی کم نہیں ہوتا۔ وہ باسی اور بے مزہ نہیں ہوتا۔ میر امن کی ''چہار درویش'' ایک ایسی کتاب ہے جسے میں ہمیشہ پڑھتا رہتا ہوں اور غالب کی ''عودِ ہندی'' کی تو میں بیسیوں بار سیر کر چکا ہوں۔ سعادت حسن منٹو، بیدی اور کرشن کی بعض کہانیاں دل و ذہن میں اٹک جاتی ہیں اور تم ان کی طرف دوبارہ سہ بارہ لوٹتے ہو۔ میرے پاس میرے چہیتے انگریزی مصنف رابرٹ لوئی اسٹیونسن کی کتابوں کا مکمل سیٹ ہے۔ ''ٹریژر آئی لینڈ''، ''کڈ نیپڈ''، ''ماسٹر آف بیلنٹرے'' اور ''اولالا'' اور ''میری مین'' کو میں نے کم از کم چھ بار پڑھا ہوگا۔ ''ویرَ آف ہرمسٹن'' کو میں نے دس بار پڑھا ہوگا اور ایک وقت میں یہ کتاب مستقل میری جیب میں رہتی تھی — ریلوے اسٹیشنوں اور لمبے سفروں میں میری واحد رفیق۔ انگریزی، فرانسیسی اور روسی ادب میں کئی ایسے مصنف ہیں جنھیں مسلسل پڑھنے سے ان کے طلسم کی تاثیر میں کمی نہیں آتی — اور ان کی فہرست نہ ختم ہونے والی ہے۔ ان لوگوں کو جنھوں نے طالسطائی کی عظیم کہانیاں ''ایوان ایلیچ کی زندگی اور موت'' یا ''آدمی کو کتنی زمین کی ضرورت ہے'' کبھی پڑھی ہیں، میں صلاح دوں گا کہ وہ انھیں دوبارہ پڑھ کر دیکھیں — پہلے کی طرح وہ پھر اس مصنف کی گرفت میں جکڑے جائیں گے اور وہ اسی کیفیتِ اضطراب و حیرت سے ان کے کرداروں کے ساتھ جئیں گے جس نے غالباً برسوں پہلے ان فن پاروں کو پڑھتے ہوئے انھیں ہلایا تھا۔ تم یہاں کہو گے، ''درست! مگر زندگی میں اتنی فرصت کہاں اور کسے ہے جو ہم شاہکاروں کو دوبارہ اور سہ بارہ پڑھیں؟ آخر کئی دوسرے کام بھی تو کرنے کے ہیں۔'' میں اس عذر کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اس مشینی دور میں بھی ہمارے پاس بے اندازہ فرصت ہے اور ہم میں سے بیشتر اپنے اس فراغت کے وقت کو خفیف مشاغل، بے منفعت سوچوں اور اکتاہٹ کی نذر کر دیتے ہیں۔ میں نے ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جو صبح اٹھ کر بستر پر لیٹے لیٹے چار پانچ اخباروں کو اوّل سے آخر تک پڑھتے ہیں۔ سیاسی لیڈروں کے بیانات کا اس توجہ سے مطالعہ کرتے ہیں جس طرح دنیا کے مستقبل کا مدار ان دھواں دھار یاوہ گوئیوں پر ہو۔ ان کا بیشتر وقت سگریٹ پی پی کر اور وزارتوں کے

ردّ و بدل پر گفتگو کرنے میں گزرتا ہے۔ اکثر لوگ، خصوصاً ہمارے سیاست دان، بے کار اور فارغ رہتے ہیں اور انھیں اپنے وقت کا کوئی مصرف نظر نہیں آتا۔ میں مانتا ہوں کہ ادب زندگی کا ایک بے حرارت و خون بدل ہے، مگر جس قسم کی زندگی اس ملک میں اکثر لوگ بسر کرتے ہیں وہ زندگی کی توہین ہے۔ میں سیاست دانوں، لیڈروں، حکومت کے اعلیٰ کار پردازوں کی بات نہیں کرتا۔ ہمارے دانشور بھی دل و دماغ سے کورے، جنون و تعصب میں گھٹے، ایسی افلاس زدہ، پوچ اور خود پرستانہ زندگیاں گزارتے ہیں کہ سر پیٹ لینے کو جی چاہتا ہے۔ افسوس کہ ہم ایک اندھی، بے ذوق، مردہ قوم ہیں۔

ندیم کو خصوصی طور میں پنجاب کی دیہاتی زندگی کا افسانہ نگار کہا جاتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی دیہی پس منظر کی کہانیاں ہماری دیہاتی معاشرت، رہن سہن، طبقاتی ظلم، معصومیت اور الھڑ پن کے جیتے جاگتے، پُر درد، پُر مزاح، دلکش مرقعے ہیں۔ اردو ادب میں پنجاب کے دیہات کی اس سے بہتر کہانیاں کسی نے نہیں لکھیں، اور یہ لکھتے ہوئے میں بلونت سنگھ کو نہیں بھول رہا ہوں جس کے فن میں نادر قوت اور تومندی ہے اور جس نے ماجھے کے سکھ دیہات کو چھپے ہوئے صفحے پر ہمیشہ کے لیے درخشاں کر دیا ہے۔ میں بلونت سنگھ کا بڑا مداح ہوں، مگر اس کے دیہاتی افسانے زیادہ نہیں۔ ندیم نے اَن گنت دیہاتی افسانے لکھے ہیں، اور یہ اس کا خاص میدان ہے۔ بلونت اور ندیم مختلف قوتیں اور صلاحیتیں رکھنے والے خالق ہیں۔ ان کا موازنہ لاحاصل اور بے کار ہوگا۔ بلونت کے افسانے سکھ کرداروں اور سکھ معاشرے سے متعلق ہیں۔ ندیم کے دیہاتی تقریباً سب کے سب مسلمان ہیں۔ ندیم کی کہانیوں میں دھیما پن، شعریت، رومان، طبقاتی کش مکش کا احساس رچا بسا ہے۔ بلونت میں ایک سہ بعدی کردار تخلیق کرنے کی ایک وحشیانہ طاقت ہے — کرداروں کے لب و لہجے، بول چال، چلت پھرت کا پُر اسرار علم۔ ندیم low key میں لکھتا ہے۔ اس کی کہانیوں میں زیادہ سج، دردمندی اور ظرافت ہے، اور بعض تو نثر میں نظمیں ہیں — "رم جھم" کے خوبصورت قطعوں کی داستانی تفسیریں۔ یہ کہ وہ زیادہ تر دیہاتی کہانیاں لکھتا ہے اور اس پُر فضا کھلے ماحول اور اپنے معصوم اور الھڑ کرداروں کے بارے میں لکھتے ہوئے کشادگی اور مسرت اور سکون محسوس کرتا ہے، باعثِ استعجاب نہیں ہے۔ وہ ایک دہقانی ہے جس کا سارا بچپن اور لڑکپن انگہ کے پہاڑی گاؤں میں گزرا۔ اسی ماحول میں وہ بڑھا اور بلوغت کو پہنچا۔ انگہ کی گلیاں اور گاؤں کے آس پاس کے مناظر — یہ ماحول اس کا اصل اسکول تھا۔ اسی نے ایک

Scanned with CamScanner

بے حد حساس لڑکے کو مستقبل کا دردمند شاعر اور افسانہ نگار بنایا۔ اور جب وہ شاعر اور افسانہ نگار ایک بڑے شہر میں رہنے لگا اور معزز و مشہور ہو گیا تو جب بھی اپنی روح میں وہی پہلے کا سادہ دہقانی لڑکا رہا جو انگہ کے گلی کوچوں میں کھیلا کرتا تھا۔ وہ اسی فضا کے نغمے اور افسانے لکھتا رہا جو اس کے خون میں رچی تھی اور جس کی دھڑکن وہ اپنے دل میں اپنی شہری مصروفیتوں میں بھی محسوس کرتا تھا۔ اس کے وہی نغمے، وہی افسانے میرے خیال میں بہترین ہیں۔ یہ نہیں کہ اس نے شہری ماحول کی کہانیاں نہیں لکھیں۔ اس نے بہت سی ایسی کہانیاں لکھی ہیں، اور ان میں سے بعض بہت عمدہ ہیں مگر میں سمجھتا ہوں کہ انھیں لکھتے ہوئے وہ حقیقی مسرت اور سکون اور آسودگی جو لکھنے والے کا دل بھی شاد کرتی ہے اور پڑھنے والے کا بھی، اسے حاصل نہیں ہو سکی۔ یا شاید میں غلط ہوں۔ چونکہ ''کپاس کا پھول'' کا ایک بہت ہی اچھا افسانہ (''مشورہ'')— ایک چھوٹا سا شاہکار جسے میں تین دفعہ پڑھ چکا ہوں اور اس کی تکنیک اور فریب کو پانے کے لیے پھر پڑھوں گا— ایک شہری کردار کی شخصیت کے کئی پرت کھولتا ہے۔ ختم ہونے پر سارا کردار ایک چھپی ہوئی کتاب کی طرح پڑھنے والے کے روبرو ہوتا ہے۔ میں نے اردو میں اس سے بہتر کسی شخصیت کا طنزیہ خاکہ نہیں پڑھا— اتنا بے رحم، اتنا پُر درد، اتنا مضرت رساں، اتنا مختصر اور اتنا سارا کچھ کہہ دینے والا۔ اس کے کردار راجہ صاحب کو میں نے ایک بار کراچی میں دیکھا— ایک چھوٹا سا نحیف آدمی جو اپنی بے چین عجلت زدہ حرکات سے ایک قسم کا پرندہ لگتا تھا جس نے چیک سوٹ میں اپنا راستہ پا لیا ہو۔ وہ ایک بڑی حکومتی اسائنمنٹ پر باہر جا رہا تھا۔ اس تہذیب یافتہ، سلجھے ہوئے انٹلکچوئل کا روپ مجھے بالکل ٹھیک اور کسی قدر مضحکہ خیز لگا۔ مملکتِ پاکستان کا یہ دساور کو بھیجا جانے والا چنا ہوا نادر تحفہ قطعاً غیر موثر تھا اور وہ اس حد تک متانت اور سنجیدگی کا پیکر تھا کہ معلوم ہوتا تھا وہ زندگی بھر کسی ہنسی کی بات، کسی کھلنڈری حرکت کا مرتکب نہیں ہوا۔ ندیم نے اپنی آدھ گھنٹے کی ملاقات میں اس شخصیت کے سراپا کو دیکھ لیا ہے اور اسے چار پانچ صفحے کے ایک افسانے میں اپنے بے عیب قصہ گوئی کے فن سے متحرک کر دیا ہے۔ یہ نہ صرف راجہ صاحب کا بلکہ ایک پوری کلاس کا مزیدار، نشتر کا سا تیز پورٹریٹ ہے، اور ہم اب بھی اس کلاس کے ریاکارانہ، بے حد تہذیب یافتہ، مرض زدہ گھٹے ہوئے نظریات کے بدنصیب تختۂ مشق بنے ہوئے ہیں۔ اخباروں سے، تقریروں سے، اپنی بے روح، تبلیغی کتابوں سے وہ مسلسل ہم پر برستے رہتے ہیں کہ ہم راہِ راست پر آ جائیں— یعنی ان کے فرسودہ، جامد اندازِ فکر کو اختیار

Scanned with CamScanner

کریں اور مودب اور دوزانو ہو کر ان کی عظمت اور تبحرِ علمی پر حیرت کا اظہار کریں! سب سے زیادہ یہی برخود غلط کلاس آزاد خیالی اور آزادہ روی کا گلا گھونٹنے کی ذمہ دار ہے۔ چونکہ وہ اپنی پیشانی پر 'دانشور' کا لیبل چسپاں کیے ہوئے ہے اور ان نام نہاد 'دانشوروں' کے اردگرد ایسے لوگ ہیں جو ان کی باتوں، تقریروں اور تحریروں کو عظمت کا رنگ دے کر اڑاتے ہیں۔ جب تک یہ کلاس اور اس کو ہوا دینے والے موجود ہیں، وسعتِ خیال اور اصل انس انسانی کی جاں بخش ہوائیں چلنا شروع نہیں ہوں گی اور سورج نہیں چمکے گا اور بہار نہیں آئے گی۔

اس مجموعے میں پانچ خالصتاً دیہاتی کہانیاں ہیں اور باقی شہری ماحول اور معاشرت کی کہانیاں۔ یہ سب اچھی کہانیاں ہیں جنھیں دوبارہ اور سہ بارہ پڑھا جا سکتا ہے، مگر چار پانچ کہانیاں ایسی ہیں جو اپنی شعریت اور پُرکاری اور فسوں سازی میں اردو افسانوی ادب میں ممتاز مقام پانے کی حق دار ہیں۔ دیہاتی کہانیوں میں گو ''تبر''، ''تھل''، ''کپاس کا پھول''، ''ماسی گل بانو'' اپنے اونچے فن کی وجہ سے نقش چھوڑ دینے والی کہانیاں ہیں، مگر میں سب سے زیادہ ''لارنس آف تھلیبیا'' سے مسحور ہوا۔ ممکن ہے اس لیے کہ میری میک اَپ رومینٹک ہے۔ اگر میں ان کہانیوں کی نسبتی عمدگی کا ممتحن ہوتا تو ''لارنس آف تھلیبیا'' دس میں سے دس نمبر لے جاتی۔ ہوسکتا ہے دوسرے پڑھنے والوں کی پسندیدہ کہانی کوئی اور ہو۔ اور یہ اکثر ہوا ہے کہ جن کتابوں نے مجھے بے اندازہ مسرت اور دل بہلاوے کا سامان مہیا کیا، ان میں دوسروں کو کوئی خاص دلچسپی محسوس نہ ہوئی۔ میں نے رابرٹ لوئی اسٹیونسن کی ''کڈنیپڈ'' کو دس بار پڑھا ہے اور یہ مجھے لبھانے میں کبھی ناکام نہیں ہوئی۔ مگر اپنے ایک جدید ادبی ذوق رکھنے والے دوست کو میں نے یہ کتاب بڑی امیدوں سے دی تو اس نے اسے دوسرے دن لوٹا دیا۔ اس نے اس کا آدھا حصہ پڑھا اور اسے کمسنی کا ادب کہہ کر رد کر دیا۔

یہ نہیں کہ ''لارنس آف تھلیبیا'' کمسن لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے ایک کہانی ہے۔ یقیناً ایسی کہانی یہ ہرگز نہیں، مگر کمسن لوگ اسے دلچسپی اور بڑھتے چڑھتے اضطراب سے پڑھ سکتے ہیں۔ ندیم کی اکثر کہانیوں میں وہ رومانی، ڈرامائی رنگ موجود ہے جسے کمسن پسند کرتے ہیں اور جوان کے تخیل کو مشتعل کرتی ہیں اور ان کے ذہنوں کو بوقلموں تماشوں اور کرداروں کی تصویروں سے پُرہیجان بناتی ہیں۔ میری آٹھ سالہ بیٹی سارا کہانیاں سننے کی بڑی شوقین ہے اور مجھے ہر رات سونے سے پہلے اسے بچوں کی کسی

Scanned with CamScanner

اردو یا انگریزی کتاب سے پڑھ کر کوئی کہانی سنانا پڑتی ہے۔ پچھلے دنوں جب اس کی پسند کی کہانیاں پڑھی جا چکی تھیں اور مجھ کو مقامی کتب فروش کی دکان پر اس کے سنانے کو کوئی نئی کتاب لانے کا موقع نہیں ملا تھا اور وہ میرے پاس اپنی ہر روز کی کہانی سننے کے لیے آلیٹی تو میں نے اس سے کہا کہ آج اسے سنانے کی کوئی کہانی نہیں۔ ندیم کی ''کپاس کے پھول'' میرے سرہانے کے پاس پڑی تھی۔ میرا دھیان اس کی طرف گیا، مگر پھر میں نے گمان کیا، بڑوں کی یہ کہانیاں اپنی نفسیاتی اور معاشرتی گرہوں کی وجہ سے اس کے چھوٹے فہم سے بالا ہوں گی، اور بمشکل ہی اس کو پسند آئیں گی۔ پھر وہ چڑ چڑ ہر قسم کی باتیں کرنے لگی۔ اور اس نے کہا، ''بابا! مجھ کو پتا نہیں اس گڑیا سے کیوں اتنا ڈر لگتا ہے۔ ہے تو گڑیا نا بابا، کوئی زندہ تو نہیں ہے؟ اس کے لمبے پریشان بال، نیلی جھپکنے والی آنکھیں۔ بابا، میں پوچھتی ہوں بھلا میں اس سے کیوں ڈرتی ہوں؟'' مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ اور میں اسے کیسے سمجھاتا کہ وہ اس خاص گڑیا سے کیوں ڈرتی ہے۔ پھر مجھے ''کپاس کا پھول'' کی کہانی ''گڑیا'' کا خیال آیا، اور میں نے ردِعمل پانے کے لیے اسے وہ کہانی پڑھ کر سنانے کا فیصلہ کیا۔ یہی میں نے کیا، کہانی کے کچھ پیچوں کی تھوڑی وضاحت کے ساتھ۔ اس نے کھلی کھلی آنکھوں سے وہ کہانی سنی اور مکمل فریفتگی کی کیفیت کے ساتھ — کئی بچوں میں تخیل اور حیرت کا مادہ[21] سے کہیں زیادہ ہوتا ہے جتنا ہم یقین کرتے ہیں اور اس لیے بچپن اور لڑکپن میں پڑھی ہوئی کتابوں جیسی اور کوئی کتابیں نہیں ہوتی۔ میری بیٹی سارا نے وہ کہانی مجھ سے تین بار سنی۔ دوسری کہانی جو اس کے پڑھنے کے لیے میں نے منتخب کی اور اسے سنائی 'ماسی گل بانو' تھی — ایک اور ڈرانے والی کہانی۔ یہ کہانی بھی اسے بہت اچھی لگی (بدہیئت اعضا کے لوگ بچوں کو بے حد مسخر کرتے ہیں) اگرچہ اتنی اچھی نہیں جتنی کہ ''گڑیا''۔ گڑیا اس کے اپنے تحت الشعوری خوفوں کے زیادہ قریب تھی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ رابرٹ لوئی اسٹیونسن کی ''تھران جینٹ'' (Thrawn Janet) کی طرح یہ ایک حقیقی ہارر اسٹوری، خوف کی کہانی ہے — خون کو رگوں میں برف کر دینے والی کہانی۔ بہت کم بڑے بھی اسے جھرجھری کے بغیر پڑھ سکتے ہیں۔

''لارنس آف تھلیبیا'' — گوتم اسے ہارر کہانی نہیں کہہ سکتے — صحیح تناسب میں آمیختہ فسانہ گوئی کے سب اجزا رکھتی ہے — ایک استاد کے ہاتھ کا ملایا ہوا قوی الاثر کاک ٹیل۔ یہ ہمارے جاگیردار طبقے کی احمقانہ بے دردی، رعونت اور نکمے مشاغل کی آئینہ دار ہے اور ندیم کی کہانیوں میں یہ

Scanned with CamScanner

بار بار عود کر آنے والی تھیم ہے۔ ندیم کے کئی نکتہ چیں بڑی مسرت سے یہ کہنے کے شوقین ہیں کہ اس کی کہانیوں میں جذبات کے رنگ بڑے چوکھے ہوتے ہیں، اور دو دفعاں اتنا گاڑھا سیاہ کہ جیسے وہ زبردستی رقت پیدا کرنے کے درپے ہے۔ یہ پُر کینہ عیب جوئی کوئی اصل نہیں رکھتی، نہ ہی اس سے ندیم کا جوہر فن نیست و نابود ہو جاتا ہے۔ جھوٹ موٹ کے رنگ روغن چڑھا کر وہ اپنی کہانی کو تابدار بنانے کی کوشش نہیں کرتا، اور اگر جیسا کہ اس کے ناقد اعلان کرتے ہیں، جذبات اس کی تحریر میں شدت سے ابھرتے ہیں، تو یہ ایسا عیب ہے جسے ذاتی طور پر میں ایک لکھنے والے میں خوبی گردانتا ہوں۔ میں ان لکھنے والوں کی زیادہ پروا نہیں کرتا جن کے جذبات سرد اور شوربے کی طرح پتلے ہوتے ہیں، جن کی رگوں میں خون کی بجائے پانی گردش کرتا ہے۔ توانا اور تنومند جذبات ہمیشہ ایک لکھنے والے کی تحریر میں جان اور زور پیدا کرتے ہیں، اور جب تک وہ راب کی طرح صفحے سے نہیں رستے تحریر پوری طرح جمال اور قوت نہیں پکڑتی۔ ''لارنس آف تھلیبیا'' کو پڑھتے وقت چند ایک محفوظ شہری پڑھنے والے شاید یہ سوچیں کہ موٹے تھل تھل بڑے ملک صاحب کا مرقع جو مصنف نے کھینچا ہے، اصلیت سے رشتہ نہیں رکھتا اور انسانی روپ میں ایسے گلدار تیندوے روئے زمین پر وجود نہیں رکھتے۔ ممکن ہے انھیں ان صاحب کا اپنے گاؤں کے جلا ہے کے ایک معصوم سے جملے پر اسے گالیاں دینا اور سفا کی سے پیش آنا ایک نرالا اور بے اصل وقوعہ لگے، مگر میں ان سے اتفاق کر لیتا اگر میں نے بڑے ملک صاحب (اور چھوٹے ملک صاحب) کو خود اپنی ان آنکھوں سے نہ دیکھا ہوتا۔ میں ایک ایسے ملک صاحب کو جانتا ہوں جس کے نوابانہ رعب، دبدبے اور درشت مزاجی کی اتنی دھاک مچی تھی کہ اسے ایک بڑے اونچے سرکاری عہدے کو پُر کرنے کے لیے منتخب کیا گیا۔ اس کی چند سو مربعوں کی جاگیر اب ایک پورا ملک بن گئی اور اس نے دہشت اور تعدی کا ایسا بازار گرم کیا کہ ایک دنیا اس کے نام سے کانپتی تھی۔ اس کی ان حکمرانی کی صفات کی بے حد تعریف کی گئی۔ اس کے ہزاروں جاسوس تھے اور اس کے اشارے پر جیتے جاگتے لوگ غائب غلہ ہو جاتے تھے۔ یہ ملک خود بزدل تھا — جان کے خطرے سے سہما ہوا — اور اپنے چار مسلح محافظ حاشیہ نشینوں کے بغیر، جن کو اس نے اپنے سے مشابہت کی بنا پر چنا تھا اور جو اس جیسا لباس پہنے رہتے تھے، کہیں آتا جاتا نہیں تھا۔ اس کی عمل داری کے ایک ڈاکٹر نے کسی مجبوری کی وجہ سے اس کے کسی فرمان کی فوری تعمیل میں تاخیر کی۔ ضوابط اور قوانین کے باوجود عدم تعمیل اس غریب کے ذہن میں نہیں تھی کیونکہ

ملک صاحب کے دور میں ایسی چیز ناممکن تھی۔ ملک صاحب نے اس ڈاکٹر کو جو اپنے پیشے میں ممتاز تھا، اپنے قلعے میں بلوا بھیجا۔ جب وہ اندر داخل ہوا تو انھوں نے اسے جابر تھانے داروں کے طور پر ماں، بہن کی گالیاں دیں — اور بعض کہتے ہیں کہ گھونسوں اور لاتوں سے اس کی تواضع کی۔ وہ آدمی زار و قطار رو پڑا اور جب وہ قلعے سے باہر نکلا تو ذہنی صدمے سے اس کے حواس جواب دے چکے تھے۔ اس کے اقربا اسے دماغی اسپتال میں داخل کرا گئے مگر وہ ایک ہوپ لیس کیس (hopeless case) تھا اور اس کے حواس پوری طرح بحال نہ ہوسکے۔ یہ ملک صاحب شیخی بگھارا کرتے تھے کہ انھوں نے اپنے ہاتھوں سے کم از کم بارہ پلیدوں کو جہنم واصل کیا ہے۔ ایک بار ان کی خانگی جاگیر میں چند ملازمین کارندے سلام کرنے کے لیے پیش ہوئے۔ ان میں سے ایک کشیدہ قامت خوبصورت دہقان بھی تھا جس کی مونچھیں شاندار تھیں اور جو اپنی پگڑی بانکے پن سے اپنے سر پر ترچھی جمائے ہوئے تھا۔ ملک صاحب نے اس وضع قطع کو گستاخی اور بے ادبی پر محمول کیا اور غضب ناک ہوکر پوچھا، یہ شخص کون ہے۔ ان کے حواریوں نے 'مجرم' کا نام گوش گذار کیا۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد ملک نے اپنے ایک کارندے کو بلا کر حکم دیا کہ وہ آدمی اب نظر نہیں آنا چاہیے — اور وہ شخص فی الواقع غائب ہوگیا اور پھر اسے کبھی کسی نے نہ دیکھا۔ اس کے اعزا و اقارب آج تک نہیں جانتے کہ اس کو کیا ہوا — یا وہ جانتے ہیں اور زبان پر خونی کا نام لانے کی جرأت نہیں کرسکتے۔

سو بڑے ملک صاحب اور چھوٹے ملک صاحب کے پروٹو ٹائپ، اس فیوڈل سیٹ اَپ میں آج بھی اپنی دنیا بسائے ہوئے ہیں اور ایک آدمی کی زندگی یا ایک لڑکی کی عزت ان کے نزدیک کوئی قیمت نہیں رکھتی۔ ان کی سرفرازی اور سرداری کے منھ آنے والا ان کی جاگیر پر جی نہیں سکتا۔ نامعلوم سمت سے رائفل کی گولی یا اندھیرے میں چھرے کا گھاؤ اس کی روح کو جسم کی قید سے رہا کردیتا ہے۔

اس کتاب میں بوقلموں رنگوں اور مختلف کیفیتوں کی کہانیاں ہیں — اور سب سیدھی سادی قدرتی سادگی سے لکھی ہوئی اور ہنر کے الجھاووں کے بغیر (وہ الجھاوے جن میں تم پڑھتے پڑھتے پچھلے سروں اور کرداروں کے ارادوں کو گم کر بیٹھتے ہو اور خود کو ایک بھول بھلیاں میں پاتے ہو)۔ پہلی کہانی ''تمز''، جس کا ہیرو ایک مضحکہ خیز گھی سے مونچھیں چپڑنے والا، بونا دیہاتی، شہباز ہے، جلنے والی تند محبت اور خونی انتقام کی کہانی ہے — ہنسانے والی بھی، خوفناک بھی اور مطلقاً حقیقی بھی۔ ''فیشن''، میں فیشن پر

جان دینے والی ایک شہری لڑکی ایک پڑوسی سے عشق لڑاتی ہے اور اس کی ہمراز نوجوان خادمہ اپنی مالکن کے رقعے پڑوسی کو پہنچاتی ہے اور ان کے جواب لے کر آتی ہے۔ پڑوسی، جو کاروباری آدمی ہے اور ننگی تصویروں کی کتابوں اور رسالوں کی مدد سے اپنے کنوارے دن رات کاٹتا ہے، خادمہ کو اُدھالتا ہے اور اسے حرامی بچے کی ماں بناتا ہے۔ بعد میں جب بات طے پا جانے کے بعد لڑکی کی شادی اس پڑوسی سے ہوتی ہے تو تب اس لڑکی کو ساری بات کا پتا چلتا ہے۔ ''سفارش'' شہری معزز لوگوں کی بے حسی اور ایک ناکردہ سفارش کی کہانی ہے — مختصر، پُرلطف اور ماڈل شارٹ اسٹوری۔ ''مائیں'' اور ''پہاڑوں کی برف'' بھی شہری ماحول کی کہانیاں ہیں۔ ''گڑیا'' ایک عمدہ ہارر کہانی ہے اور ''قتل'' شعریت سے پُر ایک دیہاتی ایپک۔ ''پاگل'' گلبرگ میں رہنے بسنے والی پرانی اور نئی نسل کی نفسیات اور ذہنی تصادم کے بارے میں ہے، اور میں اقرار کرتا ہوں کہ اس کا تاثر قدرے مصنوعی اور بوجھل ہے۔ ''گل بانو'' ہارر کہانی بھی ہے اور نفسیاتی بھی — واقعی ایک خوبصورت کہانی۔ ''بے نام چہرہ'' اچھی ہے اور ٹائٹل کہانی ''کپاس کا پھول'' جنگ کی لپیٹ میں آنے والے ایک سرحدی کا شاہکار ایپک۔ ''سفید گھوڑا''، ''سکوت وصدا''، ''آسیہ'' سب فنی قابلیت سے لکھی ہوئی کہانیاں ہیں۔ پھر ''لارنس آف تھلیبیا'' میری چہیتی کہانی ہے جس کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں (یہ بتادوں کہ لارنس آف تھلیبیا ایک شکاری باز کا نام ہے)۔ ''قرض'' کے بعد اس مجموعے کی آخری کہانی ''مشورہ'' ہے۔ میں اسے ایک چھوٹے سے شاہکار کا درجہ دینے میں تامل نہیں کروں گا۔

ندیم کے حریف اس کے منفرد فن میں ہزار کیڑے ڈالیں (وہ اسے فرض الٰہی سمجھے ہوئے ہیں)، سو خامیوں کا پتا دیں، مگر اس کا کیا کیا جائے کہ اس کی کہانیوں میں فسوں کا منتر ہے اور وہ پڑھنے والے کے دل کو برچاتی اور مسرت بخشتی ہیں۔ اس کی کہانیاں مدت تک پڑھی جائیں گی اور چاندنی جو اُن میں چمکتی ہے، چار دن کی نہیں ہے۔

اور میری چھوٹی لڑکی سارا بھی ان کہانیوں سے محبت کرتی ہے۔

(فنون، لاہور، جون جولائی ۱۹۷۴ء)

Scanned with CamScanner

فاختہ

مستنصر حسین تارڑ

کہتے ہیں کہ وہ زمانے لد گئے جب خلیل خاں فاختہ اُڑایا کرتے تھے۔ مگر مستنصر حسین تارڑ نے تو اس زمانے میں فاختہ اُڑائی ہے۔ نہ صرف فاختہ اُڑانے کی چھب اور شان ایسی ہے کہ بے چارے خلیل خاں کے علم میں نہیں تھی بلکہ تارڑ کی فاختہ بھی خلیل خاں کی فاختہ سے اعلیٰ حسب ونسب کی ہے — سفید فام، روسی الاصل۔ روسی فاختائیں ساری دنیا میں مشہور ہیں۔ وہ ان کو دیو قامت کیکوں میں بند کر لیتے ہیں اور مے ڈیز (May Days) اور اشتراکی تہواروں کے موقعوں پر کیکوں کو کاٹ کر چھوڑ دیتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر سائبیریا کا رخ کرتی ہیں اور چند ایک مختلف سوویٹ ریاستوں پر طرارے بھرتی، کوہ ہندوکش کو عبور کر کے، پاکستان میں بھی آ پہنچتی ہیں۔ کل میں نے لاہور میں چیرنگ کراس کے پرانے ملکہ کے بت کے استھان میں ایک فاختہ دیکھی۔ اس کی شریفانہ شکل وصورت اور طریق نشست و برخاست سے میں فوراً بھانپ گیا کہ یہ روسی فاختہ ہے۔ میں اس کے نظارے سے کافی خوش ہوا۔

میرے دوست تارڑ نے اس فاختہ پر ایک کتاب لکھی ہے اور ہم اس مہتم بالشان کارنامے کی خوشی میں یہاں تارڑ کو دیکھنے اور کتاب کی تہنیت میں تقریریں کرنے اور مقالے پڑھنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ جب سے لوگوں نے کتابیں پڑھنا ترک کر دیا ہے، کتابوں کی افتتاحی تقریبوں کی ادبی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ کتاب کی افتتاحی تقریب دراصل کتاب لکھنے والے کی افتتاحی تقریب ہوتی ہے۔ ہم میں سے بیشتر جنھوں نے فقط مصنف کا نام سنا ہوتا ہے، اس تقریب میں پہلی بار اس کی زیارت کرتے ہیں۔ اس کے دوستوں سے اس کے منہ پر تعریفیں سنتے ہیں جس سے وہ خوشی سے پھولا نہیں سماتا۔ مگر ہم اس کی خاطر شرم سے پانی پانی ہو جاتے ہیں اور کسی طویل تجزیاتی مقالے کے درمیان چپکے سے اونگھتے، سگریٹ پیتے اور انتظار کرتی ہوئی چائے کی پیالی کا سوچتے ہیں۔ اس سلوک کے بعد کیسے ایک مصنف زندہ رہ سکتا ہے، میرے لیے یہ ایک راز ہے۔ تقریب کے بعد ہم کتاب نہیں خریدتے۔ جہاں تک میں گمان کرتا ہوں، افتتاحی تقریب نے شاذ ہی کتاب کی فروخت میں مدد کی ہوگی۔ بلاشبہ اس تقریب سے لکھنے

Scanned with CamScanner

والے کے جذبہ ' خودنمائی کو تسکین ملتی ہے، اسے احساس ہوتا ہے کہ اس کی کتاب مناسب کروفر اور احباب کی قرناسرائیوں اور دعاؤں کے درمیان سلامتی سے زندگی کے متلاطم پانیوں میں ڈال دی گئی ہے اور اس کا نام کم از کم تقریب میں آئے ہوئے لوگوں کو معلوم ہو چکا ہے۔ البتہ کتاب نہیں بکتی اور تقریب کے بعد کتاب اور اس کے مصنف کے بارے میں کچھ سننے میں نہیں آتا۔

یہ بالعموم سب لکھنے والوں اور ان کی کتابوں کا حال ہے، لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ واردات مستنصر حسین تارڑ پر نہیں گزرے گی۔ وہ ایک likable نوجوان ہے — خوبصورت، صحت مند اور دلکش — اور وہ likable کتابیں لکھتا ہے۔ likable لوگوں کی کتابیں ہم سب پڑھنا چاہتے ہیں، اور پھر اب وہ محض نومشق ایمچر (amateur) ادیب نہیں ہے۔ اس کی تحریریں پڑھنے والے کو مسرت سے ہمکنار کرتی ہیں۔ ان میں جان ہے، زندگی کی تب وتاب اور تڑپ ہے اور عبارت میں نوجوانوں کو لبھانے والی دبی دبی اداسی۔ ہمارے نئے لکھنے والوں میں مستنصر حسین تارڑ میں یقیناً وہ پراسرار چیز موجود ہے جسے انگریزی میں ٹیلنٹ (talent) کا نام دیتے ہیں اور جو یقیناً نایاب ہے۔ اس نے ہمارے ادب میں ایک نہایت دلچسپ سفری کتاب لکھ کر اپنی جگہ بنائی — اگرچہ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ سفری کتاب جو اس نے لکھی ہے سفرنامہ ہے یا خالص ناول۔ تارڑ کے اسلوب میں ایک تازگی ہے، بیان میں ایک ہتھیار ڈلوا دینے والی طفلانہ معصومیت، اور وہ ایسی عمر میں ہے جب آدمی ایک رومانی حزن اور خودرحمی میں مگن، دنیا کی تماشا گاہ میں چلتا ہے — ایک تن تنہا، بے مثل، رومینٹک شاہزادہ۔ اردگرد کی اشیا ابھی اس کے لیے ایک رومانی ہالے کا گھیرا لیے ہوتی ہیں اور ہر چیز میں سنہری دمک ہوتی ہے۔ اس عمر میں آدمی سب سے زیادہ خود اپنے آپ سے محبت کرتا ہے اور انانیت، تخیلات اور تصورات گھر لوٹتے ہوئے کبوتروں کی طرح اس کی اپنی ذات میں آبسیرا کرتے ہیں۔ اگر وہ آدمی لکھ کر اپنا اظہار کرنے والوں میں سے ہوتا ہے تو اس کی تحریریں ایک سلگتے ہوئے درد سے چھلکی ہوتی ہیں اور ان میں جذباتیت کا گارا موٹے رڈوں میں چڑھا ہوتا ہے۔ ''نکلے تری تلاش میں'' میں یہ عیب (اگر اسے عیب کہا جا سکتا ہے) کسی حد تک ہمیں بے صبر اور برہم کرتا ہے مگر بیان ونگارش میں مسرت، جوش اور لاابالی پن اس طرح بھرے ہیں کہ ہم تارڑ کو سب کچھ معاف کر دیتے ہیں۔ غالباً یہی ٹیلنٹ ہے۔ ''نکلے تری تلاش میں'' ایک عظیم کتاب نہیں مگر یہ ایک بڑی خوش مزہ کتاب ہے، ایک likable کتاب۔ اس دور

کی کتنی اردو کتابوں کے متعلق یہ کچھ بھی کہا جا سکتا ہے؟ کتابیں جنھیں عظیم ادبی تخلیقات کا مرتبہ دے کر اچھالا جاتا ہے اور جو بے روح، جامد عبارت آرائی کے ماسوا کچھ بھی نہیں ہوتیں۔ تیسرے درجے کے اذہان کی پر تصنع، بے معنی، پوچ بڑیں — کیا اس ملک میں ایسی ہی کتابوں کو پڑھنا ہمارا مقسوم ہے؟

تارڑ شفیق الرحمٰن کی ادبی روایت میں پہلا صاحبِ لیاقت لکھنے والا ہے (اس کی سفری کتاب میں ''برساتی'' کی گونجیں ہیں)۔ شفیق نے ہمارے ادب میں داستانی رومینٹیسائزڈ (romanticised) سفرنامے کا آغاز کیا، اور اگر اردو میں اس خاص صنف میں ''برساتی'' اور ''ڈینیوب'' سے بڑھ کر فرح بخش، سحر انگیز، دل لبھانے والی کہانیاں لکھی گئی ہیں تو کم از کم میری نظر سے نہیں گزریں۔ شفیق جیسی اردو نثر بہت کم لوگ لکھ سکتے ہیں — نکھری ہوئی، دمکتی اور صاف — اور کسی کو ہمارے لکھنے والوں میں سے اس جیسی قدرتی ظرافت اور شگفتگی ودیعت نہیں ہوئی۔ تارڑ فی الحال اپنے گرو کا جوڑ تو نہیں، پر وہ اس کا سب سے لائق اور ہونہار چیلا ہے۔

تارڑ کی حالیہ طویل کہانی ''فاختہ''، جسے وہ ناول کہتا ہے، ایک اسی قسم کی رومینٹیسائزڈ سفری روئیداد ہے۔ میں اسے شاہکار ہرگز نہیں کہوں گا لیکن اس کی نگارش میں اس کی پہلی تحریروں سے زیادہ گہرائی، پختگی، رچاؤ اور جمعیت کا پتا ملتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک فنکار کی حیثیت سے وہ آگے بڑھا ہے۔ اس ناولچے کا ہیرو اب بھی تارڑ ہے۔ سین اس دفعہ ماسکو ہے — مارشل اسٹالن کی موت اور بت شکنی کے بعد کا ماسکو — اور ریڈ اسکوائر میں نقاب پوش طالب علموں کے رقص کا منظر بڑی خوبصورتی اور فنی مہارت سے کھینچا گیا ہے — ایک سیٹ پیس جس کی brilliance کی داد نہ دینا یقیناً ناانصافی ہوگی۔ اس ناولچے کی اساس، اس کا جواز، یہی سیٹ پیس ہے۔ جذباتیت کے گارے کے روڑے کسی کسی مقام پر تحریر کی عمدگی کو بگاڑتے ہیں لیکن اس دفعہ تارڑ نے خود کو قابو میں رکھنے کی پوری کوشش کی ہے۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ اس ناولچے کا سمبالزم، بین السطور پیغام، عمدہ احساسات مجھ تک نہیں پہنچ سکے۔ (قصور سراسر میرا ہے، جواں سال مصنف کا ہرگز نہیں۔) مجھ کو اس کا افسوس نہیں کیونکہ میں نے اس ناولچے کی دوسری خوبیوں سے لطف حاصل کیا۔ کہانی کچھ کچھ مصنف کی ایک اور سفری داستان ''اپاہج وینس'' کی یاد دلاتی ہے۔ ''اپاہج وینس'' میں ہیروئن (ہم تارڑ کی ہر گرل فرینڈ کو ہیروئن ہی کہہ سکتے ہیں) ایک مفلوج ٹانگوں کی اپاہج ہے۔ اس میں ''فاختہ'' کا نقاب اوڑھے ہیروئن اندھی نکلتی

ہے۔ (دوسری دو ہیروئنیں —— ریچھ اور غالباً زرافہ —— ان دونوں کو اکیلا چھوڑ کر چلی جاتی ہیں۔) اس ناولچے کو پڑھنے کے بعد میں یہ سوچے اور تعجب کیے بغیر نہ رہ سکا کہ تارڑ کی ہیروئنیں اکثر اندھی لولی لنگڑی کیوں ہوتی ہیں؟ اپاہج لڑکیوں سے اتنی ان فیچوایشن (infatuation) کیوں؟ کیا وہ اپنی کہانی میں ایک حزنیہ پُراندوہ رومانی خوبصورتی پیدا کرنے کے لیے ایسا کرتا ہے، یا یہ خود مصنف کی اپنی ذات میں کسی نفسیاتی گتھی کی غماز ہے؟ ہیرو ہمیشہ جنسی fulfilment (محبت کے منطقی نتیجے) سے کنارہ کش رہنا چاہتا ہے، اور ایک اپاہج ہیروئن اس سچویشن سے باعفت اور بے داغ نکلنے کے لیے نہایت کارآمد اور ہینڈی (handy) ہے۔ جلد ہی، مجھے یقین ہے، تارڑ ایک کہانی لکھے گا جس میں ہیروئن گونگی اور بہری ہوگی، اور اس میں ڈائیلاگ نہیں ہوگی، ہوگی تو بہت کم، اور وہ بھی ہیرو (یعنی تارڑ) اور گونگی اور بہری محبوبہ کی والدہ کے درمیان۔

تفنن برطرف، ''فاختہ'' رومینٹیسائزڈ فکشن کی صنف میں ایک اچھی کتاب ہے، بہت اچھی کتاب، اور میں نے اسے دلچسپی اور احساسِ مسرت سے پڑھا۔ کہانی کے بارے میں تم جو کچھ بھی کہو، اس کی صنعت گری ایماندارانہ محنت اور فنی مہارت سے کی گئی ہے۔ فنٹاسٹک ماسکوسین اپنے سارے رنگ و بو، شور و شغب کے ساتھ پڑھنے والے کی آنکھوں کے سامنے جی اٹھتا ہے، اور یہ کوئی معمولی طلسم نہیں۔ چند سال پہلے ہماری ایک خاتون ناول نگار نے ایک ناول لکھا جس کی جائے وقوع شہر لاہور تھا لیکن یہ لاہور ایک اوپرا، بے رنگ اور مردہ شہر تھا، وہ لاہور نہیں جسے ہم جانتے ہیں اور اس کے مختلف روپوں میں ہم جس کے ساتھ محبت کرتے ہیں۔ اور حال ہی میں میں نے کراچی کی جائے وقوع رکھنے والا ایک ناولٹ پڑھا، حیرت اور استعجاب کے ساتھ، کیونکہ ناولٹ کا کراچی بڑی آسانی سے کوئی ہندوستانی ساحلی شہر ہوسکتا تھا —— بمبئی، مدراس یا سورت۔ کردار بھی اپنے ناموں اور بول چال کے لحاظ سے انھی شہروں میں بسنے کے لائق تھے۔ ناولٹ کی لکھنے والی نے غالباً اس ماحول اور کرداروں کی اس عدم مطابقت کو محسوس کیا ہوگا یا کسی باہوش پڑھنے والے نے اس بے جوڑپن کی طرف توجہ دلائی ہوگی چنانچہ اس کے بعد کے دو ناولٹوں میں جائے وقوع کے شہر کا نام ہی نہیں ہے۔ پڑھنے والے کو ایک غیر مرئی احساس ہوتا ہے کہ ناولٹ کے واقعات ایک ایسے شہر میں رونما ہو رہے ہیں جو کرۂ ارض پر کہیں موجود نہیں ہے۔

Scanned with CamScanner

تارڑ ایک بالیاقت فنکار ہے، اس میں یقیناً کوئی شک نہیں۔ کون جانتا ہے کبھی وہ سچ مچ ایک شہ پارہ لکھے اور ادب کے میدان میں اپنا جھنڈا گاڑے۔ اگر وہ ایسا کرے تو مجھے ہرگز تعجب نہ ہوگا۔ ممکن ہے وہ ہم سب سے زیادہ خوش بخت نکلے۔

ایک دو باتیں میں اس سے کہنا چاہوں گا۔ سفری فکشن یا سفر کو 'ناولانے' کی صنف کے میں خلاف نہیں، شرط فن پیدا کرنے اور جادو جگانے کی ہے۔ یہ اتنی ہی جائز اور مناسب صنفِ ادب ہے جتنی انشائیہ نگاری جسے چند لوگوں نے حال ہی میں ایجاد کر کے اصنافِ ادب کے شجرے میں مخصوص مقام عطا کیا ہے۔ تاہم میں چاہتا ہوں کہ ایک سفری کتاب سفری کتاب ہی رہے، اس میں فکشن کے ٹکڑوں سے رنگ بھرنا اچھی پریکٹس نہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ اسٹیونسن کی ''ٹریولز وداے ڈنکی''، موپاساں یا ماہام کی کہانیوں کا مزہ بھی دے۔ ایک ناول اور افسانے لکھنے والے کو اپنے تخیل کو کھلی ڈھیل دینے کی اجازت ہے، وہ اگر چاہے تو دل کھول کر جھوٹ بول سکتا ہے۔ ایک سفری کتاب لکھنے والے کو یہ لائسنس حاصل نہیں۔ واقعات میں رنگ آمیزی یا داستان سازی کسی طور سفری کتاب کو نہیں سدھارتی۔

اور دوسری بات —— تارڑ میں بلاشبہ ٹیلنٹ ہے مگر آسودہ خاطری، کاہلی یا دنیاوی کامیابی کے لیے دوڑ دھوپ کی وجہ سے اس میں زنگ بھی لگ سکتا ہے۔ ایک لکھنے والے سے تخلیقی قوت چھن بھی سکتی ہے۔ یہ ایک حقیقی خطرہ ہے اور یہ المیہ کئی بالیاقت فنکاروں کے ساتھ، جن کا میں نام نہیں لینا چاہتا، بیت چکا ہے۔ لکھنا بے حد کٹھن، بے حد مشکل کام ہے اور پیہم کوشش اور جانکاہی کے بغیر اس فن کا حصول ممکن نہیں۔ میں تارڑ سے یہ کہوں گا، اگر تم لکھنا چاہتے ہو تو ادبی لوگوں کے حلقوں سے دور رہو۔ کافی ہاؤس میں، چائے خانوں میں مل بیٹھنے والے ادیب جرثوموں کی طرح ایک دوسرے کو کھا کر پلتے ہیں اور جلد ہی مشاہدے، تجربے اور تازگیِ تخیل سے گورے ہو کر وہ تھوڑی بہت ٹیلنٹ بھی جو شاید ان میں تھی، گنوا بیٹھتے ہیں۔ ایک لکھنے والے کا اسکول زندگی کا کھلا، پُرشور اسکول ہونا چاہیے۔ اسے نئے تجربوں میں سے گزرنے سے ڈرنا نہیں چاہیے۔ اس کی آنکھیں ہمیشہ کھلی رہنی چاہییں۔ دلجمعی اور مردم بیزاری اس کے لیے نہیں۔ یہ ایک کل وقتی کام ہے۔ ایک لکھنے والا دن کے ہر لمحے لکھنے والا ہے۔ جان مارنے کے بغیر یہاں کبھی کوئی کہیں نہیں پہنچ سکا۔ سو تارڑ، تمھیں چوکنا رہنا پڑے گا۔ لکھو، لکھتے رہو اور پھر اگر تم اپنی خوداظہاری اور دل بہلاوے کے ماسوا کسی اور مقصد کے لیے لکھو گے تو تم احمق ہو گے۔ لکھو، اور لکھو، اور

Scanned with CamScanner

پھر اگر تم خوش بخت ہو تو تمھاری تحریر کے کسی صفحے میں آگ بھڑکے گی، جادو وجود میں آئے گا، اور تم ایسی قلبی مسرت سے ہمکنار ہو گے جو تمھیں تمھاری کتابوں کی افتتاحی تقریبوں اور نقادوں کی تعریفوں سے کبھی نہیں مل سکتی۔ تم پھر ان چیزوں سے بے نیاز ہو گے۔ تم پروا نہیں کرو گے۔

(فنون، لاہور، اگست ۱۹۷۴ء)

تین بہنیں

چیخوف

چیخوف کا نام اردو پڑھنے والوں کے لیے انوکھا اور اجنبی نہیں۔ اس کی کہانیاں ایک زمانے میں موپاساں کی کہانیوں کی طرح اکثر ترجمہ کی جاتی تھیں اور ادبی رسائل میں چھپتی تھیں۔ وہ بڑے روسی مصنفین میں سے ہے ___ طالسطائی اور دوستوو سکی کی طرح کا ادبی دیو نہیں کیونکہ اس میں ان کی فراواں اور محیر العقول تخلیقی قوت اور زور آوری نہ تھی، مگر جین آسٹن کی مانند اس کی اپنی ایک چھوٹی ضلعی دنیا تھی اور عام متوسط لوگوں کی خوشیوں، غموں اور امیدوں میں جھانکنے کی ایک پُر اسرار نظر۔ چیخوف نے کوئی ناول نہیں لکھا ___ جیسے ہمارے سعادت حسن منٹو نے نہیں لکھا۔ شاید ان دونوں میں وہ روزانہ لگاتار مشقت کی ہمت، بے انتہا صبر آزمائی اور اپنے ذہنی پیکروں میں ایک بڑے کینوس پر رنگ بھرنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ شاید ان کی بُری اور گرتی ہوئی صحت (یا سیمابی بے چینی) ان کو کسی بھی لمبے کام میں ہاتھ ڈالنے سے روکے رہی۔ چیخوف نے کئی سو کہانیاں لکھیں اور متعدد ڈرامے بھی، جن میں سے بیشتر اس کی زندگی ہی میں اسٹیج پر کھیلے گئے۔ کہانیاں، جن میں سے کئی ایک اچھوتے حسن کے شاہکار ہیں، اس نے آسانی اور روانی سے لکھیں۔ وہ ایک قدرتی لکھنے والا تھا اور پیدائشی افسانہ طراز، مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے اپنے چند ایک بے مثل ڈرامے بڑی دقت سے، بڑی جان جوکھوں سے لکھے یا بنائے۔ ڈراما نگاری ہمیشہ اس کے لیے ایک کٹھن چڑھائی رہی۔ ان میں پوری کیفیت بھرنے کی لگن میں اس نے انتھک جانکاہی کی اور خون پسینہ بہایا۔ ان کا ہر ایک لفظ، ہر ایک فقرہ دل کے لہو سے لکھا ہوا ہے۔ غالباً اس کی

Scanned with CamScanner

وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ایسے ڈرامے لکھنا چاہتا تھا جو اسٹیج ہو سکیں (ورنہ ڈراما لکھنے کا فائدہ) اور انھیں لکھتے ہوئے دکھائی نہ دینے والے تماشائی اس کے پیش نظر تھے۔ ڈرامانگاری کا فن ایک مشکل فن ہے، جس کے لیے ایک خاص مزاج، ایک گھٹی میں پڑی مناسبت درکار ہے اور یہ کوئی محض اتفاق نہیں کہ بہت کم بڑے ناول نویسوں اور مختصر افسانہ نویسوں نے اچھے اور قابل ذکر ڈرامے لکھے ہیں۔ موپاساں نے کبھی کوئی ڈراما نہ لکھا، اور طالسطائی نے دو تین ڈرامے لکھے جو اس کی زندگی میں اسٹیج ہوئے مگر جنھیں اب کوئی نہیں جانتا۔ انگریزی ناول نویسوں میں صرف آلیور گولڈ اسمتھ کا She Stoops to Conquer اب تک اسٹیج کیا جاتا ہے اور سومرسٹ ماہم نے تین چار اچھے ڈرامے لکھے، مگر پھر اپنے اصل میدان، مختصر افسانے، کی جانب لوٹ گیا۔ زندہ ناول نویسوں میں جے۔ بی۔ پریسٹلے نے یقیناً کئی اچھے ڈرامے ضرور لکھے ہیں لیکن ایسی ہمہ فنی غیر معمولی ہے۔ پھر اس کا الٹ بھی سچ ہے ــــ بڑے ڈراما نگار اچھے مختصر افسانے یا ناول نہیں لکھ پائے۔ ولیم شیکسپیئر اور برنارڈ شا کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ آرتھر ملر، ٹیرنس رٹیگان، ٹینیسی ولیمز اور دوسرے مشہور ڈراما نگاروں نے وقتاً فوقتاً مختصر افسانے لکھے۔ وہ میری نگاہ سے نہیں گزرے مگر مجھے یقین ہے کہ وہ نہ لکھے جاتے تو بہتر ہوتا۔ چیخوف ایک ایسا لکھنے والا ہے جس کا مرتبہ مختصر افسانے میں بھی اتنا ہی اونچا ہے جتنا ڈرامے میں۔ ہر دو اصناف میں اس کو ایک جیسی قدرت اور مشاقی حاصل رہی۔ اس کے بعض افسانے اور ''چیری آرچرڈ'' اور ''تھری سسٹرز'' جیسے ڈرامے سدا بہار ہیں اور ان کی پُر فریب سادہ پُرکاری دل کو موہ لیتی ہے۔

سنے ہوئے گیت مدھر ہوتے ہیں مگر اَن سنے گیت سنے گیتوں سے بھی مدھر ہوتے ہیں۔ بڑا فن سب کچھ کہہ دینے میں نہیں بلکہ بہت کچھ اَن کہا چھوڑ دینے میں ہے، اور چیخوف اس سچائی کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اسی لیے اس نے اپنے ڈراموں میں باتوں کو نہ کہنے کے فنکارانہ جتن کیے اور اس کے بیشتر ڈرامے تین تین چار چار بار لکھے گئے۔ وہ ان میں مسلسل کانٹ چھانٹ کرتا رہتا اور اپنی تخلیق سے کبھی مطمئن نہ ہو پاتا۔ وہ ایک پیہم بے سکونی کی حالت میں رہتا تھا اور تکمیل فن کی فکر میں اس کی راتوں کی نیند چھن جاتی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ اسٹیج پر ہر بات بیک وقت اتنی ہی پیچیدہ اور اتنی ہی سیدھی سادی ہونی چاہیے جتنی کہ وہ زندگی میں ہے۔ زندگی کی گمبھیر الجھاہٹوں کو کھول کر رکھ دینے والی یہ سادگی کیسے قابو میں لائی جائے؟ ایک فن کار کے لیے اس سے زیادہ مشکل کام اور کوئی نہیں اور یہ پری ہر ایک کے شیشے

میں نہیں اترتی۔ بڑے فن کار ہی اسے اپنی خوش نصیبی کے لمحات میں حاصل کر پاتے ہیں اور خبطی چھوٹے دکاندار کا بیٹا انتون چیخوف ایک بہت بڑا فن کار تھا۔ وہ جینئیس تھا۔

ہاں، انتون چیخوف ایک جینئیس تھا — اقبال کی طرح جو سیالکوٹ کے ایک ٹوپیاں بیچنے والے دکاندار میاں نتھو کے گھر پیدا ہوا۔ میں جانتا ہوں کئی امارت پسند کھوکھلے لوگ اقبال کے بارے میں میرے اس بیان سے سیخ پا ہوں گے۔ وہ لوگ جو اس کی مجلد تصنیفات کو اپنے ڈرائنگ روم میں سجاوٹ کے لیے رکھتے ہیں اور انھیں کھول کر دیکھنے کی نوبت نہیں آتی، اور یہ یقین کرتے ہیں کہ اقبال بھی ان کی مانند متمول، معزز، کھاتے پیتے والدین کی اولاد تھا۔ انتون چیخوف چھ بھائی بہنوں میں تیسرا تھا اور کنبے کی گزران غربت و عسرت میں ہوتی تھی۔ ان کی بدقسمتی کہ ان کے باپ پاؤل کو فنونِ اعلیٰ سے طبعی لگاؤ تھا، اور جیسا کہ ہم جانتے ہیں، سچے آرٹسٹ فن کے حصول کے شوق میں اپنے بیوی بچوں کو فاقوں سے مرنے دینے میں زیادہ حرج نہیں سمجھتے۔ اس دھن میں پاؤل کا کاروبار تقریباً چوپٹ تھا اور اس کی دکان نام ہی کو چلتی تھی۔ اولڈ بوائے نے بڑی لگن سے اپنے آپ کو وائلن بجانا سکھلایا (یہ اس بیچارے کا قصور نہیں تھا کہ وہ بیتھوون یا باخ نہ تھا) اور مقدس مورتیوں پر نقش و نگار رنگنے میں کافی مہارت بہم پہنچائی (اگر وہ مائیکل اینجلو نہ تھا تو ہم اسے الزام نہیں دے سکتے)۔ مذہبی راگ کا یہ جوش پاؤل کے سر پر یوں بھوت بن کر سوار تھا کہ مدرسے جانے کی عمر سے پہلے ہی اس نے اپنے بیٹوں کو کلیسا میں کیرول گانے کی تربیت دی۔ اس کے بچوں کو پو پھٹتے ہی بستر سے اُٹھنا اور ہر موسم میں اپنے باپ کے پیچھے لین ڈوری میں کلیسا کی طرف پیدل گھسٹنا پڑتا تھا۔ ہمارے انتون نے ۱۸۹۲ء میں، جب اس کی عمر تیس سال کی تھی اور وہ افسانے اور ڈرامے میں اپنے جوہر دکھا چکا تھا، ایک بار لکھا: ”جب میرے بھائی اور میں بنگرم میں گرجے میں گاتے تھے تو لوگ ہمیں پُرتحسین نظروں سے دیکھتے اور ہمارے والدین پر رشک کھاتے معلوم ہوتے اور ہمارا یہ حال کہ ہم ننھے مجرموں کی طرح محسوس کرتے جو قید بامشقت کی سزا بھگت رہے ہوں۔“

اولڈ پاؤل قدرے خبطی اور اپنی بیوی اور بچوں کے لیے بگ بیر (big bear) تھا اور وہ اس سے سہمے رہتے اور خوف کھاتے۔ وہ چھوٹے انتون اور اس کے بھائیوں کی اکثر بید سے تواضع کیا کرتا اور بڑے ہونے پر چیخوف اس تلخی اور ذلت کو کبھی نہ بھول سکا۔ پاؤل ان کی ماں سے اکثر بدسلوکی اور سختی سے پیش آتا۔ یہ خوفناک گھریلو تماشے چیخوف کے ذہن پر ہمیشہ کے لیے اپنا نقش چھوڑ گئے۔ انتون چیخوف

نے ۱۸۸۹ء میں اپنے بھائی سکندر کے نام ایک خط میں لکھا: "میں چاہتا ہوں تم اس استبداد اور الزام تراشی کو کبھی نہ بھلاؤ جس نے ہماری ماں کی جوانی کو تباہ کیا۔ اسی استبداد اور الزام تراشی نے ہمارے بچپن میں زہر بھرے رکھا۔ میں اپنے بچپن کا سوچتا ہوں تو مجھے ہول آتا ہے اور طبیعت اُلٹنے لگتی ہے۔ اس دہشت اور کراہت کو یاد کرو جو ہم اس وقت محسوس کرتے تھے جب کھانے پر ہمارا باپ اس بات پر کہ شوربے میں نمک زیادہ ہے، غصے سے بے قابو ہو کر ہماری بے چاری ماں پر بے طرح برس پڑتا تھا۔ کیسی جلی کٹی وہ سناتا تھا اسے۔ استبداد و ظلم.... یہ اصل جرم ہے۔"

میرا خیال ہے ہمیں چیخوف کی ان تحریروں سے پاؤل گھرانے کا زیادہ تاریک تاثر قائم نہیں کرنا چاہیے —— بہت سے والدین اور بہت سے گھرانے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ گھریلو ماحول جیسا بھی تھا، اس نے چیخوف کو تباہ نہیں کیا، اس کے شعلے کو نہ بجھایا۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ اس کا باپ تلخی ایام کا شکار تھا۔ اس کی اپنی محرومیاں، مایوسیاں، ہزیمتیں تھیں اور وہ ان کا غصہ گھر آ کر اپنے بیوی بچوں پر نکالتا تھا۔ اور پھر وہ کاروباری آدمی سے زیادہ ایک آرٹسٹ تھا —— زندگی کی معاشی جدوجہد میں بے عمل اور غیر موثر۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ آرٹسٹ ہونے کے باوجود اس نے اپنے بیوی بچوں کی کفالت سے ہاتھ نہ کھینچا۔ ان کے رہنے کے لیے چھت اور کھانے کے لیے موٹی جھوٹی روٹی مہیا کی اور انھیں گلی میں نہیں پھینکا۔ نہیں، پاؤل ایک ذمے دار باپ تھا۔ اپنی نااہلی کے باوجود اس نے ایک سخت سوسائٹی میں اپنی روزی کمانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے اور اپنے کنبے کا پیٹ پالا۔ اس تنگی میں بھی جب بچے بڑے ہوئے، اس نے انھیں اسکول میں تعلیم دلائی اور چیخوف پڑھ لکھ کر ڈاکٹر بنا۔ چیخوف کو، جو ڈاکٹر سے زیادہ ایک افسانہ نویس اور ڈراما نگار تھا، یہ فنی مزاج یقیناً بوڑھے پاؤل سے وراثت میں ملا جو اپنے بیٹے کی اچیومنٹ پر بے حد نازاں تھا۔ چیخوف نے شاید اسے کبھی معاف نہیں کیا مگر پھر کتنے ہی گھرانے، ہم سب جانتے ہیں، سر پھٹول اور جنگ و جدال کی آماجگاہ ہیں —— دم گھونٹ دینے والے جہنم۔ ایسے ہی جہنموں میں پھول کھلتے ہیں اور جینیئس بھی جنم لیتے ہیں۔

انھی بچپن اور لڑکپن کے تاثرات سے چیخوف میں زارسٹ روس کے متوسط الحال خاندانوں (یا دڑبوں) کی بے مصرف زندگی کی ڈگر کے خلاف وہ شدید نفرت پیدا ہوئی جو پھر کبھی نہ گئی۔ اس کی کہانیوں اور ڈراموں میں ایک اداسی، بے حسی، شکست خوردگی کی جھٹپٹی فضا تیرتی ہے۔ ہم کبھی زندگی

Scanned with CamScanner

کی تنگ و تاز، اس کے سوز، اس کے حسن کے وقتی اور چند روزہ ہونے کو بھول نہیں سکتے۔ چیخوف کو پڑھتے ہوئے ہم جانتے ہیں کہ بلبل باغ میں سدا نہیں بولے گی اور جلد ہی پت جھڑ میں درختوں کے پتے جھڑنے لگیں گے اور یاروں کی محفلیں سونی ہو جائیں گی۔ چیخوف ایک دھیمی لے کا فنکار ہے۔ وہ عام آدمیوں کی مسرتوں، حسرتوں، امنگوں سے اپنی کہانیوں اور ڈراموں کے لطیف، سبک تانے بانے بنتا ہے۔ اس کے صفحات میں بادلوں کی کڑک دمک اور طوفانوں کا شور کہیں نہیں۔ ڈراموں میں اس کے کردار عام سادہ سے انداز میں بات کرتے ہیں۔ اس سادگی میں انسانی زندگی کی کتنی ہی پیچیدگیاں اپنی جھلک دکھا دیتی ہیں اور کردار ہمارے سامنے اپنی حسرتوں اور خواہشوں کے ساتھ اس طرح روشن ہو جاتا ہے جیسے تیز سرچ لائٹ نے اسے آ ڈھونڈا ہو۔ چیخوف کے ڈراموں میں کوئی دھوم کا ڈراما نہیں: دھواں دھار تقریریں اور توپوں کی گھن گرج... نہیں، میں غلط کہہ رہا ہوں، چیخوف کے ڈراموں میں وہ سب ڈراما ہے جو ہم عام انسانوں کی بظاہر بے کیف پھیکی بیزار زندگیوں میں تڑپتا رہتا ہے۔

''تین بہنیں'' چیخوف کے اچھے ڈراموں میں سے ہے۔ (یہ نہیں کہ اس نے کوئی بُرے ڈرامے بھی لکھے۔) اس نے یہ ڈراما ۱۹۰۰ء میں لکھا۔ (وہ اس وقت چالیس سال کا تھا اور ایک مانا ہوا مقبول ڈراما نویس۔) اسے یہ ڈراما لکھنے میں تقریباً ایک سال لگا۔ وہ اس ڈرامے سے خوش اور مطمئن نہیں تھا۔ اسے ڈر تھا کہ یہ اداس، طویل، بے ہنگم سا ہے اور ماسکو کے تماشائیوں کے مزاج کو نہیں بھائے گا۔ ایکٹرس سرجسکا کو، اپنی بے اطمینانی کا اظہار کرتے ہوئے، وہ لکھتا ہے: ''بے ہنگم اسے یوں کہتا ہوں کہ اس کی ہیروئنیں تین ہیں، بلکہ چار، اور ایک تیرہ و تار، یاس انگیزی کی کیفیت اس میں رچی ہے۔'' یاس انگیزی اس ڈرامے میں ضرور ہے مگر پھر زندگی میں یاس انگیزی کے سوا کیا ہے! اور چیخوف کو غالباً اس بات کا یقین نہ تھا کہ اس نے ایک لطیف خوبصورت شاہکار ... موت نہیں آ سکتی۔

''تین بہنیں'' میں ہم فانی انسانوں کے سارے کرب و اندوہ کی تصویر اس لطافت اور خوبصورتی سے کھینچی گئی ہے کہ ڈرامے کا تاثر haunting ہے۔ ہماری عمر بھر کی محرومی، بے اجر محبت، روح کو کچلنے والے ازدواجی بندھن، دوبارہ ملنے کی امید کے بغیر جدائیاں — انسانی زندگی کا سارا ڈراما اس مکمل مرقعے میں پُرکاری سے سمو دیا گیا ہے۔ بہت کچھ نہیں کہا گیا لیکن سب کچھ کہہ دیا گیا ہے۔ کہانی فقط اتنی ہے کہ تین بہنیں، ایک بھائی اور اس کی بیوی ایک ضلعی، بے رونق سے شہر میں رہتے ہیں۔ بڑی بہن

اولگا، جو کچھ کنبے کی ماں کا رول ادا کرنے لگی ہے، اسکول مسٹرس ہے۔ مجھلی ماشا لڑکوں کے ہائی اسکول میں ایک ماسٹر کولائی غن سے بیاہی ہے جو ماشا پر جان چھڑکتا ہے اور ماشا اس نیک دل، موٹیلے، غیر ضروری طور سے پُر جوش، باتونی شوہر سے قطعی بیزار اور بورڈ ہے، اور جھنجھلاہٹ کے بغیر بے چارے سے بات نہیں کرتی۔ ایرینا، سب سے چھوٹی، ایک جوان، چنچلی رومینٹک تمناؤں سے بھری لڑکی ہے، ہر ایک کی لاڈلی۔ وہ ڈاک خانے میں ملازم ہے۔ ان کا بھائی آندرے شہر کا کونسلر ہے اور برانٹے بہنوں کے اکلوتے بھائی، بے چارے براموییل کی طرح بے مصرف، گڈ فار نتھنگ۔ اس کی بہنیں اس کی سرفرازی کی بڑی آس لگائے رہیں مگر آندرے نے براموییل کی طرح ان کی امیدوں کو مٹی میں ملا دیا۔ اس کی بیوی نتاشا کسی قدر بے وقوف، فسی (fussy) بیوی اور ماں ہے، گھر کی مالکن بننے کی ترکیبیں لڑانے والی۔ بھائی اور بہنیں ہر وقت ماسکو لوٹ جانے کی پُر حسرت باتیں کرتے ہیں جہاں انھوں نے اپنے مرحوم بریگیڈیر باپ کے گھر میں بڑے عیش دیکھے تھے۔ بریگیڈیر باپ اس ضلعی شہر میں ایک گیریزن کا جرنیل بن کر تعینات ہوا اور اپنی تبدیلی کے ایک سال بعد ہی اس کی موت واقع ہوگئی۔ وہ اس بے جان ضلعی شہر سے نفرت کرتے ہیں اور ماسکو جانے کی اس طرح تمنا کرتے ہیں جس طرح برف کے تودوں میں پھنسے جہاز کے ملاح بہار کے آنے کی۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی امنگیں، ولولے اس بے جان شہر میں دب رہے ہیں اور ماسکو جاتے ہی ان کے دکھ اور رنج مٹ جائیں گے اور ہر ایک چیز مختلف ہو جائے گی۔ مگر خوشی، قوس قزح کی مانند، جہاں کہیں بھی ہم کھڑے ہوں وہاں سے کچھ دور ہی رہتی ہے۔ آندرے ایک جگہ ضلعے کے دفتر کے بوڑھے چپراسی کے سامنے پھٹ پڑتا ہے (جو اس کو نہیں سمجھ سکتا): ''آہ! میری وہ ساری پچھلی زندگی کہاں گئی؟ وہ دن جب میں نوجوان اور ہنس مکھ اور ہوشیار تھا، وہ دن جب میں ہر وقت ایک سے ایک عمدہ خواب دیکھتا تھا اور بڑے بلند پایہ خیالات رکھتا تھا، اور حال اور مستقبل میں ہر طرف امید کا اجالا نظر آتا تھا۔ وہ اب کہاں ہے؟ اس کی کیا وجہ ہے کہ ہم ابھی ٹھیک طرح جینا شروع بھی نہیں کر پاتے کہ بے دل اور گھٹیا اور غیر دلچسپ بن کر رہ جاتے ہیں؟ ہماری اس سستی، بے تعلقی، بیکاری اور ناخوشی کا سبب کیا ہے؟ یہ شہر دو سو سال سے موجود ہے، اس میں ایک لاکھ انسان آباد ہیں، لیکن کوئی ایسا نہیں جو باقیوں سے ذرا بھی مختلف ہو۔ اس جگہ کبھی کسی عالم یا فنکار یا ولی نے جنم نہیں لیا، کبھی کسی شخص کو اتنی امتیازی حیثیت بھی حاصل نہیں ہوئی کہ تمھارے دل میں اس کی برابری کرنے کا

Scanned with CamScanner

ولولہ ہی اُٹھ سکے... یہاں لوگ کھانے پینے اور سونے کے سوا کچھ نہیں کرتے... پھر وہ مر جاتے ہیں اور ان کی جگہ ان ہی جیسے اور آجاتے ہیں، اور وہ بھی کھاتے پیتے اور سوتے رہتے ہیں۔ چونکہ بیکار پڑے رہنے کی وجہ سے کوڑھ مغز ہو جانے کا ڈر ہے اس لیے گھناؤنی خوش گپیوں اور ووڈکا نوشی اور قمار بازی اور مقدمہ بازی میں پڑ کر اپنی زندگیوں کو چوں چوں کا مربہ بنائے رکھتے ہیں۔ بیویاں شوہروں کو جُل دیتی ہیں، شوہر بیویوں سے جھوٹ بولتے ہیں، اور ظاہر یہ کرتے ہیں جیسے انھوں نے کچھ دیکھا اور سنا ہی نہیں۔ اور یہ عام بے امان خفیف الحرکتی اور عامیانہ پن بچوں کے حق میں زہر قاتل ہے، اور ان میں اگر کچھ جولانی ہو بھی تو اسے باقی نہیں رہنے دیتی۔ چنانچہ وہ بھی بالکل ایک دوسرے کی طرح اور بالکل اپنے والدین کی طرح ناشاد اور نیم جاں مخلوق بن کر رہ جاتے ہیں..." (جب چیخوف نے آندرے کے منہ سے یہ الفاظ کہلوائے تو کیا وہ تاگن روگ کے چھوٹے دکاندار، اپنے باپ بوڑھے پاؤل کا سوچ رہا تھا؟)

ڈرامے میں سب کردار جیتے جاگتے ہیں، اُبھرے، دُہرے اور تہرے۔ مجھے سب سے اچھا کردار پچاس سالہ توپ خانے کے کمانڈر لیفٹیننٹ کرنل ویرشی نن کا لگا اور میں چاہتا ہوں کہ ڈرامے میں کہی گئی اس کی باتیں چیئرمین ماؤ یا چیئرمین بھٹو کے اقوال کی طرح ایک کتابچے میں فراہم کر کے چھاپ دی جائیں۔ وہ ایک پُر شفقت، سلجھا ہوا، سرد و گرم چشیدہ فوجی ہے — ایک خوبصورت آدمی جسے زندگی کے حزن واندوہ نے بددل اور تلخ کام نہیں بنایا، محرومیوں نے اس کے وجود میں زہر نہیں بھرا۔ اس کی باتوں میں پھولوں کی خوشبو ہے اور کتنی اچھائی، دانائی اور حقیقت! وہ مجھے ڈاکٹر سموئیل جانسن کی یاد دلاتا ہے۔ ان دونوں میں، میں سمجھتا ہوں، بہت سی باتیں سانجھی ہیں۔ جانسن الہامی لے میں فیصلہ کرتا ہے، ویرشی نن میٹھی معقولیت کے انداز میں۔ دونوں human اور robust فلسفی ہیں۔ ویرشی نن جو اپنی جوانی میں دل پھینک میجر مشہور تھا اور جواب دو بچوں کا باپ ہے، ان تینوں بہنوں کے پھولوں اور روشنی کے کنج میں آکر صحیح معنوں میں خوشی محسوس کرتا ہے۔ آؤ جاتے جاتے لیفٹیننٹ کرنل الکساندر اگناتے وچ ویرشی نن کی باتوں کا مزہ لیتے چلیں۔

ماشا ویرشی نن کے سامنے اپنا دکھڑا روتی ہے۔ اسے اپنے خاوند اسکول ماسٹر کولائی گن سے کوئی شکایت نہیں کیونکہ وہ اب اس کی عادی ہو چکی ہے۔ "جب میری کسی ایسے آدمی سے ملاقات ہوتی ہے جو نفاست اور آداب اور شائستگی سے بالکل بے بہرہ ہو تو مجھے سچ مچ اذیت پہنچتی ہے۔ جب دوسرے

استادوں کے ساتھ، جو میرے میاں کے یار دوست ہیں، اٹھنے بیٹھنے کا اتفاق ہوتا ہے تو اتنی کوفت اٹھانی پڑتی ہے کہ کیا کہوں۔"

"ہاں، یہ ظاہر ہے،" ویرشی نن جواب دیتا ہے، "لیکن میں یہ سمجھوں تو کیا برا ہے کہ اس شہر میں، یہ جیسا کیسا بھی ہے، شہری اور فوجی دونوں ہی یکساں طور پر غیر دلچسپ ہیں۔ ان میں انیس بیس کا فرق بھی نہیں۔ یہاں کسی پڑھے لکھے آدمی سے، فوجی ہو یا عام شہری، بات کرو تو بالعموم یہی سننے میں آئے گا کہ وہ عاجز آچکا ہے۔ کس سے عاجز آچکا ہے؟ یا تو بیوی سے یا گھر بار سے یا جائیداد سے یا اپنے گھوڑے سے یا کسی اور چیز سے... ہم روسیوں کے خیالات تو بڑے ارفع و اعلیٰ ہوتے ہیں... تو پھر عملی زندگی میں ہم اتنی پست ہمتی کا ثبوت کیوں دیتے ہیں؟ اس کا کیا سبب ہے؟ ایسا کیوں ہے؟"

اور ویرشی نن ماشا اور ایرینا اور نتاشا کی محفل میں ماشا کے دکھڑے کے جواب میں کہتا ہے، "میں نے ابھی ابھی فرانسیسی کابینہ کے ایک وزیر کی ڈائری پڑھی جو اس نے قید خانے میں لکھی تھی۔ اسے پناما نہر والے فراڈ کے سلسلے میں سزا ہو گئی تھی۔ جب قید خانے کی کھڑکی سے چڑیاں اڑتی دکھائی دیتی ہیں تو ان کا ذکر کرتے وقت وہ بڑی جوشیلی خوشی کا مظاہرہ کرتا ہے... اور جب کابینہ کا وزیر تھا تو ان ہی چڑیوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اب جو وہ رہا ہو چکا تو اسے آئندہ بھی ان چڑیوں کا خیال تو آنے سے رہا... اور بالکل اسی طرح، تمھارے ایک بار ماسکو پہنچنے اور وہاں دوبارہ آباد ہو جانے کی دیر ہے، پھر ماسکو تمھارے لیے کچھ بھی نہ رہے گا۔ ہم لوگ خوشی سے محروم ہیں، اور خوش رہنا ممکن بھی نہیں۔ ہمیں خوشی کی صرف تمنا ہی تمنا ہے۔"

مگر اس طرح تو میں ویرشی نن کو کوٹ کرتا ہی چلا جاؤں گا۔ ویرشی نن کو ہی نہیں، فوجی ڈاکٹر جیوتائی کن کو بھی (آندرے کی بات پر کہ شادی وبالِ جان ہے، جیوتائی کن کہتا ہے، "شادی وبال جان ہی ہو شاید، مگر تنہائی کے بارے میں کیا خیال ہے؟ تنہائی بڑی ڈراؤنی شے ہے!") اور لیفٹیننٹ سیرن توزن باخ کو... اور تینوں بہنوں کو... اور میرا یہ ریویو ختم ہونے میں نہیں آئے گا، اور مجھے اسے ختم کرنا چاہیے۔ ریویو اتنے لمبے نہیں ہونے چاہییں جبکہ کتابیں موجود ہیں۔

چیخوف کا یہ خوبصورت ڈراما ہمارے پاس دھیمے، کم گو اسکالر اور شاعر محمد سلیم الرحمٰن کے بے عیب اردو ترجمے کے روپ میں آیا ہے۔ یہ ترجمہ در ترجمہ ایلیسا ویتا فین (Elisa Veta Fen) کے انگریزی

Scanned with CamScanner

ترجمے کا اتباع کرتا ہے۔ میں اسے اردو میں کیے گئے چند ایک عمدہ ترجموں میں شمار کروں گا۔ محمد حسن عسکری کے ''مادام بوواری''، ''سرخ و سیاہ'' اور ''موبی ڈک'' کے ترجمے، شفیق الرحمٰن کا ''ہیومن کامیڈی'' کا ترجمہ، ابن انشا کے ایڈگرایلن پو اور او ہنری کے افسانوں کے ترجمے، سب فرسٹ ریٹ ہیں۔ سلیم الرحمٰن کا یہ ترجمہ اسی گروہ میں جگہ پائے گا۔ البتہ یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں (ویسے کہنے کی ضرورت بھی نہ تھی) کہ احمد شاہ بخاری پطرس کا گالزوردی کی کہانی ''ایپل ٹری'' کا ترجمہ ابھی تک غالباً اردو زبان میں سب سے خوبصورت ترجمہ ہے ــــ واحد ترجمہ جو اور یجنل کی شاعری اور لطافت کو دو چند کرتا ہے۔

مجلس ترقی ادب نے یہ کتاب اپنے جدید ڈراموں کے سلسلے میں اپنی صوفیانہ عالمانہ روش سے ہٹ کر بڑے دیدہ زیب اجلے ٹائپ میں چھاپی ہے اور انھیں اس پر مبارک باد دینی چاہیے۔ یہ البتہ میں نہیں سمجھ سکا کہ کتاب انھوں نے اتنی کم تعداد میں کیوں چھاپی ہے، صرف چھ سو نسخے! کیا عالمی ادب کے شاہکاروں کو پڑھنے والے اتنے تھوڑے ہیں؟ چیخوف کا ڈراما زارسٹ روس کا ڈراما ہی نہیں، اس میں ایک ہمہ گیری ہے اور اس کے کردار ہمارے ماحول اور معاشرے میں اب بھی چلتے پھرتے، سانس لیتے، پہچانے جا سکتے ہیں۔ وہ ہماری زبان میں باتیں کرتے ہیں اور ہمارے درمیان رہتے ہیں۔

(فنون، لاہور، اگست ستمبر ۱۹۷۶ء)

اندلس میں اجنبی

مستنصر حسین تارڑ

مستنصر حسین تارڑ کی دوسری سفری کتاب ''اندلس میں اجنبی'' مسرت انگیز ہے، ''نکلے تری تلاش میں'' سے زیادہ پختہ، زیادہ رسیلی اور زیادہ ادبی انداز میں لکھی ہوئی ہے۔ اسے پڑھتے ہوئے اس تبصرہ نگار کو یہ احساس ہوا کہ مصنف نے ہسپانیہ کی ٹوپوگرافی، مور حکمرانوں کی تاریخ اور رومانی فسانہ گوئی پر بڑی جان ماری ہے، اور اس کا یہ خون پسینہ رائیگاں نہیں گیا۔ ایک طرح یہ کہا جا سکتا ہے (اور اس سے کتاب کی خوبیوں کا استخفاف میرا مقصود نہیں) کہ تارڑ کی اس اندلسی مہم کا پلاٹ باربرا کارٹ لینڈ نے ترتیب دیا

Scanned with CamScanner

ہے، سینری جارج بارو اور لاری لی نے ڈیزائن کی ہے، سانڈوں سے لڑائیوں کے سائیڈ ایفیکٹس (side effects) ارنسٹ ہیمنگوے نے دیے ہیں اور تاریخی حصے واشنگٹن ارونگ اور سٹینلے لین پول نے سج دھج سے سجائے ہیں۔ ہدایت کاری اور پیشکش ہمارے دوست مستنصر حسین تارڑ کی ہے، اور آدمی کو اس میں کوئی عیب دکھائی نہیں دیتا۔ مہم اس کی اپنی ہے اور بینش، ذہن، تخیل اس کا اپنا، اور ہر صفحے پر (لین پول اور ہیمنگوے حصوں کو چھوڑ کر) وہ وہی قدرے خود پرست، نرگسیت زدہ، خائف نوجوان ہے جو ایک ہی وقت میں سب کچھ بننا چاہتا ہے، اور جس سے ہم اس قدر محبت کرتے ہیں۔ وہ اندلس میں قرطبہ اور غرناطہ اور موروں کی شان و شوکت کے مٹے ہوئے نشان دیکھنے کے لیے وارد ہوا، مگر میرا خیال ہے کہ اس کی مہم کا ایک مقصد بُل فائٹنگ میں اپنے جوہر دکھا کر اہل ہسپانیہ پر اپنی ہمت و جرأت کا سکہ بٹھانا بھی تھا۔ ایک اور مقصد (جو سب سیاحوں کا ہونا چاہیے) غزال چشم، چنبیلی کے پھول بالوں میں سجانے والی ہسپانوی سینوریتاؤں کے جذبات کو تہہ و بالا کرنے اور ان سے ان کی خواہش پر ہم آغوش ہونے کا بھی ہوگا، لیکن تم جانتے ہو، ایسے مقاصد کا اظہار کھل کر نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے باوجود کہ سان سباستیان، ثوریا، قشتالیہ، میڈرڈ، قرطبہ اور غرناطہ میں امریکی، لبنانی، اندلسی، خوبصورت ستم پیشہ لڑکیاں اس کی راہ دیکھتی تھیں اور اس کے شانے پر اپنی زلفیں بکھیر کر ان شہروں کے ہر کونے کھدرے میں ہر دم اس کے ہمراہ چلنے کو تیار رہتی تھیں، میں نہیں سمجھتا کہ اسے اس مقصد میں کوئی نمایاں کامیابی ہوئی۔ دل کی حسرت دل ہی میں رہی، اور مجھے یہ کہنا پڑتا ہے کہ قصور تارڑ کی اپنی کم ہمتی کا تھا۔ سینوریتاؤں کو یقیناً اپنا اتنا وقت بیکار کی آوارہ گردی میں ضائع کر کے بڑی مایوسی ہوئی ہوگی... لیکن ٹھہرو! ایک جگہ مصنف نے چند اشاروں سے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ قرطبہ کی ایک بند تاریک گلی میں ایک لبنانی لڑکی ناثلا (پورا نام ڈاکٹر ناثلا سعد) نے اسے ورغلا کر انبساطِ وصال سے ہمکنار کیا، مگر اس نے وصال کے جائے وقوع اور اس کے طریقے کی تفصیلات سے پُر اشتیاق پڑھنے والے کو آگاہ کرنا ضروری نہ جانا۔ یہ تبصرہ نگار دوسرے ڈرٹی بوڑھے آدمیوں کی طرح بے حد مایوس ہوا۔ مسٹر ہنری ملر اور مسٹر ہیرلڈ رابنس ہوتے تو یہاں کھل کھیلتے اور ساری لذیذ، گدگدانے والی تفصیلات بیان کر کے دم لیتے... مگر مجھے کچھ کچھ شک ہے کہ تارڑ نے یہاں جھوٹ بولا ہے۔ یہ پُرمسرت سانحہ وقوع پذیر نہ ہوسکا اور تارڑ اور ڈاکٹر ناثلا سعد (اگر واقعی اس کا وجود تھا) اس بند، شکستہ محرابوں کی گلی میں سے نکل کر پھر کیا لیوروفو کے ریستوراں میں قہوہ

Scanned with CamScanner

پینے آ بیٹھے ہوں گے جو سینور مستنصر حسین تارڑ اور سینوریتا ڈاکٹر ناڑلا سعد جیسے خوبصورت جوڑوں کے لیے تمام شب کھلا رہتا ہے (بقول بیرا ریستوراں)۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارا مصنف چند پستہ قد اور لانبی سینوریتاؤں سے چہلوں اور غیر موثر دست درازیوں سے آگے قدم مارنے کی ہمت نہ کر سکا اور ایک جگہ تو اپنی ساری ڈینگ اور معصوم بریویڈو (bravado) کے باوجود سچی بات اس کے منہ سے نکل ہی پڑی۔ وہ ثوریا کے ایک پاسلو میں ایک منجھے ہوئے سیاح کی طرح لڑکیوں کا جائزہ لے رہا ہے (ان کے نقش و نگار سراسر مشرقی ہیں — قد نسبتاً چھوٹے، رنگت کھلتی ہوئی، آنکھیں سیاہ اور بھوری، بدن صحت مند، چال پروقار وغیرہ وغیرہ)۔ یہاں وہ کسی مصنف ایڈورڈ ہٹن کو کوٹ کرتا ہے: ''انگریز عورت چائے بناتے وقت، فرانسیسی عورت رقص کرتی ہوئی، ولندیزی باورچی خانے میں، اطالوی کھڑکی میں اور ہسپانوی بستر میں... بے حد خوبصورت لگتی ہے۔'' اور لکھتا ہے کہ ''واللہ اعلم بالصواب! میں اس خاصیت کے بارے میں حتمی فیصلہ دینے کے قابل نہیں۔'' اس سے یہ یقین ہو جاتا ہے کہ ہمارے دوست مستنصر حسین تارڑ نے ناحق آدھی آدھی رات تک اپنا اور ہسپانوی سینوریتاؤں کا وقت ضائع کیا۔ ان گھڑیوں کو وہ بل فائٹنگ کی مشق کرنے میں بہتر طریق پر صرف کر سکتا تھا۔ بل فائٹر بننے کا مقصد بھی وہ پورا نہ کر سکا کیونکہ پامپلونا کے سانڈوں نے اسے پسند نہیں کیا — وہ اجنبیوں کو پسند نہیں کرتے، خواہ وہ پاکستان سے ہی کیوں نہ ہوں۔ گھنگھریالے بالوں اور غلافی آنکھوں والے خوبصورت پاکستانیوں کے لیے تو ان کے جذبات خصوصاً کافی پُر کدورت ہوتے ہیں۔ پہلے دو مقصد ہمارے مصنف نے سیر ہو کر پورے کیے اور قرطبہ اور غرناطہ کی تنگ ٹیڑھی میڑھی گلیوں کی جی بھر کے خاک چھانی۔ ان بابوں میں اس کی نثر نظم کی منزل کو جا چھوتی ہے، کیونکہ (یہ اقرار کیے بغیر چارہ نہیں) وہ خوبصورت نثر نگار ہے اور لکھنے کے فن کی پرکھ رکھتا ہے۔

'اجنبی' (ہمارے دوست مستنصر حسین تارڑ کے سوا اور کوئی نہیں) اپنے سامان کے تھیلے کو لیے اور گاگلز پہنے، فرانس سے اپنے خوابوں کے دیس عربوں کے اندلس میں ایرون کے سرحدی قصبے کے راستے سے داخل ہوا۔ پیرس سے، جہاں سے وہ چلا تھا، اس کی بستی سان سباستیان چار پانچ سو میل دور تھی اور اس لیے اس نے فرانسیسی ریل میں سفر کرنے کو ترجیح دی۔ یہ سفر اپنی مسرتوں کے بغیر نہیں تھا، کیونکہ ایک گٹھے ہوئے جسم اور تپتے ہوئے سانس والی فرانسیسی دوشیزہ کا سر رات بھر اس کے شانے پر ٹکا رہا۔ وہ یا تو نیند میں مدہوش تھی اور یا غیر مردوں کے شانوں کو اپنے شوہر کے شانے پر فوقیت دیتے ہوئے جان بوجھ

کر یوں کیسے ہوئے تھی۔ تو روز سے پہلے ایک چھوٹے اسٹیشن پر اجنبی کا ڈبے سے باہر جانے کو دل چاہا۔
''معاف کیجیے گا!'' اس نے آہستہ سے شانہ ہلایا۔''اوں!'' عورت نے نیند میں ڈوبی ہوئی دائیں آنکھ کھول کر کہا، اور پھر مسکرا کر اس کے اور قریب ہوگئی۔ ارے! الکی مسٹر تارڑ! اگر وہ اپنے شوہر کے ساتھ نہ ہوتی تو ہم اس خوش آئند آغاز کی مزید نشوونما سے بھی بہرہ ور ہوتے۔ ممکن ہے وہ جوان عورت تارڑ کو ایرون کے سرحدی قصبے میں، جہاں اس کا گھر تھا، توقف کرنے پر مجبور کردیتی (اگرچہ بعد میں بڑی پچھتاتی) اور تارڑ کی اشبیلیہ، قرطبہ، غرناطہ وغیرہ کی مراجعت کچھ عرصے کے لیے کھٹائی میں پڑ جاتی۔ ایرون کے کسٹمز سے نبٹنے کے بعد وہ سان سباستیان کی گاڑی میں سوار ہوگیا۔ یہاں بھی تارڑ کی خوش بختی نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا اور دو خوش شکل امریکی لڑکیاں اس کی برابر کی نشست پر آن پساریں (حالانکہ ڈبے میں اور بھی کئی نشستیں تھی)۔ ان میں سے ایک لڑکی ایک کالا سکڑا ہوا سوئٹر پہنے تھی اور وہ اسے کھینچ کھانچ کر جتنی بھی اپنی پتلون سے ملانے کی کوشش کرتی، وہ پھر اس کے سفید پیٹ کے زیریں حصے کو ننگا کرتا ہوا اپنی پہلی حالت پر آجاتا۔ جیسا کہ پڑھنے والے نے قیاس لگالیا ہوگا، سان سباستیان میں وہ دونوں لڑکیاں اس کے ساتھ چپکی رہیں۔ انھوں نے ایک ہوٹل سے (بانکوں یعنی بینک تعطیل کی وجہ سے بند تھا) ہسپانوی پیسے خریدے۔ پستہ قد سوئٹر والی لڑکی اجنبی سے زیادہ قربت کی توقع کے پیش نظر سان سباستیان میں ایک رات کے لیے رکنا چاہتی تھی، مگر اجنبی بھی کچی گولیاں نہیں کھیلا تھا۔ اس نے دونوں سے ہاتھ ملایا اور تھیلا لٹکا کر سان سباستیان کے یوتھ ہوسٹل کی طرف چل دیا۔ تارڑ نے حسبِ دستور انھیں گھاس نہ ڈالی، اور ہم سب جانتے ہیں کہ لڑکیاں خواہ کتنی ہی حسین وجمیل اور عشوہ طراز کیوں نہ ہوں، وہ کسی طور ان کی خاطر اپنے مجوزہ ٹائم ٹیبل میں ردوبدل قبول نہیں کرتا۔ اتوار کو اس نے سان سباستیان کی 'کوریدا' یعنی بل فائٹ بھی دیکھی (جلدی سے سمندر میں ڈبکی لگانے کے بعد، کیونکہ ہسپانوی سمندروں میں شارک مچھلیاں بہت ہیں اور اجنبیوں کی تاک میں رہتی ہیں)۔ اس نے بل فائٹنگ کے ضابطوں، قواعد اور سانڈوں سے نبرد آزمائی کی تکنیک کا بغور مطالعہ کیا اور میرا خیال ہے بل فائٹر بننے کے بارے میں اپنا ارادہ ترک کردیا۔ ہیمنگوے کی کتابوں کو پڑھنے والے ان دو تین ابواب کو مزے سے اسکپ (skip) کر سکتے ہیں۔ چھ تند سانڈوں نے سورج غروب ہونے تک سان سباستیان کی کاریدو میں جامِ شہادت نوش کیا اور جب تارڑ جانے کے لیے اٹھا تو ایک سنہری بالوں والی لڑکی نے

Scanned with CamScanner

اپنا فلیش کیمرا اپنی آنکھ سے ہٹایا اور ورغلاتی مسکراہٹ اس کی سمت پھینکی۔ وہ بے حد خوبصورت تھی — دریں چہ شک — اور اجنبی جانتا تھا کہ اس طرح اس کی تصویر اتارنے سے اس لڑکی کا اصل مقصد کیا ہے۔ وہ ایسے کھیل کا آغاز کرنا چاہتی تھی جس میں وہ بل فائٹر ہو اور اجنبی بُل، مگر اجنبی اپنی آنکھوں سے چھ ہٹے کٹے سانڈوں کا حسرت ناک انجام دیکھ چکا تھا اور ساتواں نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے وہاں سے تیر ہونے میں مصلحت جانی۔ بُل فائٹروں کو لوگوں نے کندھوں پر اٹھا رکھا تھا اور سفید بالکونیوں پر جھکی بڑی بڑی آنکھوں والی دوشیزائیں ان پر پھول نچھاور کر رہی تھیں۔ تارڑ بھی بُل فائٹرز کے جلوس میں شامل ہو گیا۔ پانچ چھ پھول اس پر بھی پڑے اور اس نے انھیں اپنے گھنگھریالے بالوں میں سجا لیا۔ اس نے غالباً پراکسی (proxy) سے خود کو بُل فائٹر محسوس کیا۔ وہ سمندر کے پاس مچھیروں کی ایک بستی میں ایک سرراہ ہوٹل میں پیٹ پوجا کے لیے جا گھسا اور ایک خوش باش موٹی تازی ویٹرس اس کا ہاتھ تھام کر اسے میز کے سرے پر ایک اونگھتے ہوئے بوڑھے کے پاس لے گئی۔ وہ ہڑبڑا کر چلتا بنا۔ اس نے وہاں تلی ہوئی مچھلی ضرور کھائی مگر میں سینے پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتا ہوں کہ اس نے مشکیزے کی سرخ انگوری شراب کی ایک بوند تک نہ چکھی۔ ایک سچا پاکستانی مسلمان ہونے کی وجہ سے وہ ایسی حرکت کیونکر کر سکتا تھا... بریو مسٹر تارڑ!

سان سباستیان سے اس نے جھاڑ دار ٹونی کی جیپ میں قشتالیہ، پامپی، لونا، میڈرڈ تک بچ ہائیکنگ کی۔ ٹونی نے، جو "ٹریژر آئی لینڈ" کے میرون ملاح بین گن سے بے حد مشابہ تھا اور لندن کا ایک ریٹائرڈ قصاب تھا، تارڑ سے آدھے پیٹرول کے پیسے رکھوا لیے۔ پامپی لونا — اسے ہم سب جانتے ہیں، وہ ہیمنگوے کے لافانی ناول ***Fiesta*** کا شہر ہے۔ اگر تم نے "فیسٹا" پڑھا ہے تو تم جانتے ہو گے کہ اس تہوار کو سانڈوں کی ایک دوڑ بھی ہوتی ہے۔ ٹاؤن ہال سے ایک راکٹ چھوٹنے پر شہر سے باہر ایک اصطبل سے چھ خونخوار سانڈ ڈکراتے ہوئے چھوڑے جاتے ہیں اور پامپی لونا کے ایک کوچے میں، جو بُل رنگ تک جاتا ہے، بگٹٹ بھاگتے ہیں۔ سانڈوں کے باہر آتے ہی بے شمار ہسپانوی اور غیر ملکی ان کے آگے آگے دوڑ لگاتے ہیں۔ جب کسی بھینسے کا خمدار سینگ کسی دوڑ لگانے والے کے جسم کے قریب خطرناک حد تک پہنچتا ہے، وہ لکڑی کی باڑھ پھلانگ کر اپنی جان بچا لیتا ہے — "فیسٹا" میں یہ سب کچھ ہے۔ پامپی لونا کے اس جشن میں سانڈوں کے آگے دوڑنا تارڑ کے پروگرام میں بھی شامل تھا مگر وہ

Scanned with CamScanner

بقول اس کے چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر اس کوچے میں وقت پر نہ پہنچ سکا۔ سانڈ پہلے ہی دوڑ ختم کر کے بُل رنگ میں داخل ہو چکے تھے۔ بہر حال اچھا ہی ہوا، ورنہ یہ کتاب اَن لکھی رہ جاتی... تم جانو میں نے اس مہم کا پلاٹ ہی بتانا شروع کر دیا۔ پامپیلونا سے ثوریا، مدینہ سالم، میڈرڈ، دور افتادہ قرطبہ، اشبیلیہ، قرمونہ، غرناطہ، فلیمنکو — جارج بارو اور لاری لی کی ڈیزائن کی ہوئی لینڈ اسکیپ، واشنگٹن ارونگ اور لین پول کی تاریخ، جھمکتی ہوئی غلافی آنکھوں والی لڑکیاں (کوئی امریکی، کوئی لبنانی، کوئی خالص الاصل دیسی)، انگور کی سرخ شراب کے مشکیزے (جو دوسرے پیتے تھے) — اتنی گندمفت رنگ مورتیں تمھارے ذہن کو چندھیا دیتی ہیں... تارڑ نے اپنی مہم کے ایک ایک لمحے کا مزہ لیا — اور اسی طرح اس غریب تبصرہ نگار نے بھی۔ جو کچھ بھی تم کہو، تارڑ اب ایک منجھا ہوا لکھنے والا بن چکا ہے اور داستان گوئی کے تارو پود بننے میں ماہر۔ "اندلس میں اجنبی" کو کئی سطحوں پر پڑھا جا سکتا ہے — ایک رومینٹک باربرا کارٹ لینڈ ناول کی سطح پر، جس میں ہرجائی ہیرو ایک ہے اور فتنے ڈھانے والی ہیروئنز تقریباً چھ، اور سین آف ایکشن ہسپانیہ کی زیتون کے درختوں سے لدی، تیز بجھتے ہوئے رنگوں کی مسطح سرزمین ہے؛ ایک سفری کتاب کی سطح پر جس میں سیاح اپنی عفت کو محفوظ رکھنے اور اپنی اٹی نرِیری پر پابند رہنے کی فکر میں رہتا ہے؛ بُل فائٹنگ پر معلوماتی کتاب کی سطح پر، اور اندلس میں موروں کی تاریخ کے عروج و زوال کی سطح پر۔ یہ کتاب لازمی طور پر بیسٹ سیلر ہوگی اور تارڑ فینز کے لیے (یہ تبصرہ نگار بھی ان میں سے ایک ہے) ایک غزال چشم ہسپانوی سینوریتا جیسی وجد آور۔ وہ اسے اپنے ساتھ بستر میں لے جائیں گے... اور رنگین خواب دیکھیں گے۔

مگر جاتے جاتے میں ایک سوال مسٹر تارڑ (یا اجنبی) سے ضرور پوچھنا چاہوں گا — اپنے تجسس کی آسودگی کی خاطر۔ جب تم ایک صبح سوئمنگ کا سٹیوم پہنے پول یا الکبیر کے کنارے ریت پر اوندھے لیٹے تھے اور پاس لیٹی ہوئی مہکتی ہوئی ناظورۂ دلفریب نے تمھیں اپنی پشت پر بدن سنولانے کے لوشن سے مالش کرنے کی دعوت دی تھی (جیمز بانڈ اصولاً اس کے برعکس حسیناؤں کی مالش کرنے کی بجائے ان سے مالش کرایا کرتا ہے) تو تم نے اسے کل پر ٹال دیا تھا۔ اس نے تمھیں زیتون کے باغ میں پکنک منانے کا لالچ دیا تھا اور بے چاری نے اپنی بکنی ڈھیلی کر کے کولھوں سے نیچے کر دی تھی — وہ یقیناً سیڈیوس (seduce) ہونا چاہتی تھی۔ تم نے اسے بتایا کہ "مجھے جنگل سے صدا آ رہی ہے۔" اس نے

Scanned with CamScanner

مایوس ہو کر کہا، ''مشرقی لڑکے بڑے پُراسرار ہوتے ہیں''... کیا سب مشرقی لڑکے اتنے ہی پُراسرار ہوتے ہیں، مسٹر تارڑ؟ کیا یہ تمھاری طرف سے اَن اسپورٹنگ نہیں تھا اور کیا ہم مشرقیوں کو شرم کے مارے ڈوب نہیں مرنا چاہیے؟ کیا اس اندلس کی زلیخا کی پُرانبساط ورغلاہٹ کے سامنے تمھارا پاکدامن یوسف بننا اس وقت کفرانِ نعمت نہیں تھا جب زیتون کے باغ پانیوں پر امڈے آتے تھے اور ہسپانیہ کا آسمان نرل، الماس کی رنگت کا تھا؟ قرمونہ تم سیڈیوس ہونے کے بعد بھی چلے جاتے تو کون سا فرق پڑ جاتا؟

شیم مسٹر تارڑ! مجھے ڈر ہے کہ ماسوا اس کے کہ تم نے واپس آ کر یہ حیرت خیز کتاب لکھی، تم نے اندلس میں اپنے پندرہ دن محض ضائع کیے۔ تمھاری کتاب کی کسی سطر میں مشکیزے کی سرخ انگوری شراب کی دھار کا بھی مزہ نہیں جسے پی پی کر ہیمنگوے کی ''فیسٹا'' کے پڑھنے والے (بھی) سرشار ہو جاتے ہیں۔ کیا تم سچ مچ اندلس گئے تھے؟ کس مہینے میں اور کس برکت کے سال میں؟ تمھاری کتاب اس بارے میں خاموش ہے اور مجھے کچھ اس مہم میں شک ہونے لگا ہے۔

بہر حال اشبیلیہ کی کیمپنگ پر جو سلوک تم نے کولھوں سے نیچے بکنی کرنے والی دوشیزہ سے کیا وہ طبقہ اُناث کی توہین ہے۔ میں پھر کہتا ہوں، مسٹر تارڑ، شیم!

(فنون، لاہور، نومبر دسمبر ۱۹۷۶ء)

پکھیرو

مستنصر حسین تارڑ

•

مجھے مستنصر کے پنجابی ناول پکھیرو کی ایک جلد اسی روز موصول ہو گئی تھی جس روز اس کی طباعت مکمل ہوئی۔ میں نے اسے اپنے بریف کیس میں رکھ لیا— فرصت کے وقت پڑھنے کے ارادے سے— اور رکھ کر بھول گیا۔ یہ میرے بریف کیس میں دو مہینے پڑی رہی۔ پنجابی الاصل ہونے کے باوجود مجھے پنجابی الفاظ پڑھنے میں دقت ہوتی ہے اور مجھے احساس تھا کہ ''پکھیرو'' سے نپٹنا جان جوکھوں کا کام ہوگا۔ میں جان جوکھوں کا کام کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

اور پھر میں بیمار پڑ گیا— کھانسی اور دھیما سلگتا ہوا بخار جو مجھے چھوڑنے کا نام نہ لیتا تھا۔ میں

Scanned with CamScanner

تکیے سے ٹیک لگا کر، ہیٹر کی آگ سینکتا، پڑھتا رہتا اور ان دنوں میں نے چند ایک ایسی کتابیں پڑھ ڈالیں جنھیں میں عرصے سے پڑھنے کی خواہش رکھتا تھا مگر وقت نہیں پاتا تھا۔ میں نے ہیمنگوے کے شاندار آخری ناول ''آئی لینڈز ان دی اسٹریم'' کو پڑھا (کیا خوبصورت نثر وہ لکھتا تھا، اور ہمارے لکھنے والے اس سے سبق کیوں نہیں لیتے؟) میں نے کے میلکم لاوری کا بڑا ناول ''انڈر دی والکینو'' (آتش فشاں کے نیچے) ختم کیا اور نائی جل نکلسن کی ''پورٹریٹ آف اے میرج'' جو ایک بیٹے کی اپنے والدین کی ازدواجی محبت پر لکھی ہوئی کہانی ہے — یہ سب پُرمسرت اور ذہن کو خوبصورت صورتوں سے پُر کر دینے والی کتابیں تھیں۔ اور پھر میں نے ''پنچ'' پڑھے جن کا ایک موٹا بنڈل شفیق الرحمٰن نے مجھے چند روز پہلے پنڈی سے بھجوایا تھا۔ (میں انگریزی مزاح کا عاشق ہوں اور مجھے یقین ہے کہ ہمارے مزاح نگار باقاعدگی سے ''پنچ'' پڑھیں تو اس سے انھیں مطلقاً نقصان نہیں ہوگا۔) جب ''پنچ'' ختم ہو گئے تو مجھے ''پکھیرو'' کا خیال آیا۔ ہلکا سلگتا بخار جاری تھا اور اس میں ''پکھیرو'' کی پنجابی تحریر سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے بے اندازہ وقت تھا۔

اس طرح میں ''پکھیرو'' کو پڑھنے بیٹھا۔ یہ ہوا میں پر تولتے ہوئے دو گِدھوں کے مکالمے سے شروع ہوتا ہے اور اگر تم یہ جاننے کا تجسس رکھتے ہو کہ گدھ کسی لاشے کی بو پا کر آپس میں کس قسم کا تبادلۂ خیالات کرتے ہیں تو وہ سب کچھ یہاں موجود ہے۔ پہلے چند صفحات پڑھنے میں مجھے دقت ہوئی (پنجابی ڈکشن سے ناآشنائی کی وجہ سے) اور پھر پنجابی الفاظ اردو رسم الخط میں صاف ہو گئے اور میں اسے اتنی ہی آسانی اور روانی سے پڑھنے لگا جتنا کسی اردو کی کتاب کو۔ پکھیرو ایک مختصر ناول ہے، ایک سو دس صفحات کا، اور میں نے اسے شام سے پہلے پڑھ لیا — میں نے اپنا وقت ضائع نہیں کیا۔

''پکھیرو'' ایک اچھی کتاب ہے مگر میں اسے ناول نہیں کہوں گا۔ اگر ''منطق الطیر'' یا ''گلیور'' یا جوناتھن لِونگ سٹون کی ''سی گل'' (جو مغرب میں غالباً بائبل سے بھی زیادہ بکتی ہے) ناول ہیں تو پھر مستنصر کی کتاب کو بھی اس صنف میں جگہ پانے کا حق ہے۔ اس داستان میں ماسوا دو گدھوں اور ایک سپاٹ میدان میں ایک اکیلے مرتے ہوئے آدمی کے دوسرا کردار نہیں۔ یہ ایک parable، الیگری ہے اور کافی فنکارانہ اور خوبصورت۔

تین باتوں نے، میں سمجھتا ہوں، اس کتاب کے لکھنے کا خیال مستنصر کے دل میں ڈالا۔ ایک تو

لاہور کی ضلع کچہری، جہاں اوقاتِ کار میں گدھوں کے غٹ کے غٹ احاطے میں منڈلاتے اور چمکتے نظر آتے ہیں۔ دوسری فریدالدین عطار کی ''منطق الطیر'' اور تیسری بلاشبہ جوناتھن لونگ سٹون کی ''سی گل'' جو ایک سمندری ابابیل کا قصہ ہے جو اپنے سنگیوں سے زیادہ، زیادہ اونچا اڑنا چاہتا ہے — دھندلے افق سے پرے، آسمان کی پہنائیوں سے اونچا۔ مستنصر پنجابی ادب کے میدان میں بھی کرتب دکھانے کا آرزومند ہوگا۔ اس سب کچھ سے میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مصنف نے ''منطق الطیر'' یا لونگ اسٹون کے ''سی گل'' سے اپنی تمثیل کا فلسفہ اڑایا ہے یا اس میں مستعار رنگ بھرے ہیں۔ ''پکھیرو'' ایک طبع زاد، اوریجنل تصنیف ہے — ایک اخلاقی علامتی حکایت یا مثالیہ — مگر ایک ناول نہیں۔ وہ تکنیک اور اسلوب بھی جو اس تمثیل کو شکل دینے میں بروئے کار لائے گئے ہیں، بالکل اوریجنل اور جرأت مندانہ ہیں۔

پکھیرو کا سب سے دلچسپ حصہ مجھے وہ لگا جس میں 'بندے' کی بچپن، ایامِ طفولیت اور شباب کی زندگی پڑھنے والے کے سامنے جھلکیوں، ٹکڑوں، اشاروں میں دکھائی گئی ہے۔ ممکن ہے اس تصویر سازی میں مصنف نے اپنی آپ بیتی اور اوّلین تاثرات سے مدد لی ہو، مگر خارجی واقعات کو چھوڑ کر یہ اصلاً ہر ایک اکیلے انسان کی کہانی ہے، تمھاری اور میری، جس سے قدرت اپنا آخری مذاق کرنے سے نہیں چوکتی اور جس عرصے تک وہ جیتا ہے یا ایک گھٹی ہوئی مسموم ہوا میں سانس لیتا ہے، موت اس کی پائینتی پر بیٹھی اسے ٹکر ٹکر دیکھتی ہے۔ گدھ اوپر منڈلاتے رہتے ہیں۔

اس تمثیل کے پڑھنے والے اس کے انجام تک پہنچ کر جان جائیں گے کہ مصنف نے کیا کہنا چاہا ہے۔ اس نے اسے بڑی خوبی، تیکھے پن، شدتِ احساس اور اوریجنلٹی سے کہا ہے، اور کوئی کتاب کو استہزا کے ایک جملے سے مسترد نہیں کر سکتا۔ (میں اسے ایک ہانٹنگ کتاب کہوں گا۔)

بندے کی گھر گرہستی کی تصویر اس کی گھر والی کی ان تلخ جلی کٹی مسلسل باتوں سے یوں مکمل طور پر کھینچ دی گئی ہے کہ جس کی مثال ادب میں روز روز نہیں ملتی:

''تہاڈی تنخواہ وچ گھار دا خرچہ نئیں ٹردا۔ بالوں لئی دودھ کدوں تیک اُدھار آوے گا؟ کھنڈ وی چاہی دی اے۔'' ''میں کم کر کر کے لسی ہوگئی ہاں۔ ڈاکٹر نیں طاقت دے ٹیکے لخ دتے نیں۔ اوہوی چاہی دے نیں۔'' ''مینوں ایس مہینے گھنوگھٹ ترے سو چاہیدا اے۔ کندھ ول کی ویکھدے او، میرے ول ویکھو۔ میں جھلّی تے نئیں ہوگئی جے بک بک پئی کرنی آں۔ سُندے او پئے، تنخواہ وچ

گنذر نئیں ہوندی۔ کوئی ہور کم کیوں نئیں کر لیندے؟ سکولوں مڑ کے ویلم ویلے منجی اتے لتے پے کے کتاباں پڑھدے رہندے او۔ کتاباں — میریاں سوکناں، تہاڈیاں سکیاں!'' ''کوئی ہور کم کیوں نئیں کر لیندے؟ بس سٹاپ تے پان سگرٹ آلا وی تہاڈے نالوں ودھ کمائی کر لیندا اے۔'' ''جے گھار آلی نوں شریفاں ہار رکھ نئیں سو سکدے تے ویاہ کاہدے لئی کیتا سی؟ بال کاہدے لئی جمے سان؟ میرے جیہجاں تتیاں، بالاں سنیں نہراں وچ چھالاں مار دیندیاں نیں۔''

یہ 'بندے' کی نہیں، ہر پکھیرو کی 'مسرتوں سے بھرپور' ازدواجی زندگی ہے۔ جس کی برکتوں کے گن گائے جاتے ہیں۔ ہم سب نے بالکل ایسے ہی جملے کبھی نہ کبھی سنے ہیں۔ کانوں کے لیے یہ جملے کتنے آشنا ہیں اور کتنے ہی وجودوں کی رگ رگ میں ان سے زہر بھرا ہے اور کتنی ہی زندگیاں گھٹ کر رہ گئی ہیں۔ برٹرینڈ رسل نے کسی جگہ کہا ہے — غالباً ''کنکویسٹ آف ہیپی نس'' میں — کہ شادی کی رسم ۱۹۷۶ء تک متروک ہو جائے گی۔ جہاں تک مغرب کا تعلق ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ وہاں ازدواجی گٹھ بندھن کا فرسودہ تصور بالکل بدل چکا ہے اور شادی — 'دو روحوں کا ازلی روحانی، جسمانی ملاپ' — اپنے آخری دموں پر ہے۔ ہمارے مشرقی معاشرے میں میاں بیوی کے اس نام کے مقدس رشتے کا پول کھلنے میں وقت لگے گا۔ شادی کی جگہ کون سا ضابطہ لے گا، میں نہیں کہہ سکتا، مگر یہ مروجہ دستور جو ایک مہیب جھوٹ ہے اور دنیا کے پکھیروؤں کے پر و بال قینچ کر کے رکھ دیتا ہے، زیادہ دیر تک نہیں پنپ سکے گا۔ نوجوان لوگ اپنے رفیق ڈھونڈیں گے، اور اکٹھے رہیں گے — دوستوں کی طرح، ہوا میں زقندیں بھرتے آزاد پکھیروؤں کی مانند۔

میرا خیال ہے کہ یہ ناول پنجابی زبان کی بجائے اردو میں لکھا جاتا تو یہ شاید اپنی بہت ساری تند قوت اور شکتی گنوا دیتا۔ پنجابی میں ایک ان گھڑ ابتدائی مردمی ہے (وارث شاہ اور میاں محمد بخش کے پڑھنے والے میرا مطلب پالیں گے) جو اردو کے مزاج کو نصیب نہیں۔ اپنی کتاب کی زبان پنجابی رکھ کر مستنصر بیبا کی اور دھڑلے پن سے ایسی 'غیر شائستہ' باتیں کہہ گیا ہے جو وہ اردو میں اس انداز سے کبھی نہ کہہ پاتا۔ ہمارے لڑکپن میں ''نیرنگِ خیال'' اور ''عالمگیر'' میں چھپنے والے کئی مصنفوں کے بارے میں کسی نہ کسی وقت یہ ضرور کہا جاتا تھا کہ وہ کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی زبان کے موتی کاغذ پر رولتے ہیں اور کوئی ایسا جملہ ان سے سرزد نہیں ہوتا جس سے شائستگی اور تہذیب کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے پائے اور طبعِ سلیم الٹ

پڑے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ وہ مصنف کھانے پینے کو چھوڑ کر، دوسری جبلی، حیوانی اور جسمانی ضرورتوں کا ذکر بالکل نہیں کرتے۔ عصمت اور منٹو کے اردو زبان کی پاکیزگی اور طہارت کو ناگفتنی باتوں سے آلودہ کرنے کے باوجود اردو زبان ابھی تک قدرے چھوئی موئی اور حیادار چلی آ رہی ہے۔ بہت سی باتیں جو مستنصر نے پنجابی میں بے باکی سے لکھ دی ہیں، ان کا اردو میں یوں کہہ دینا ممکن نہ ہوتا۔ اردو کے دامن پر ناشائستگی کی چھینٹیں پڑ جاتیں اور اخلاق کے محاسبوں کے کان کھڑے ہو جاتے۔

ہمیں مصنف کی صلاحیتوں، اس کی اپج، اس کی طباعی کی داد دینا پڑے گی۔ ''پکھیرو'' کوئی کم درجے کی اچیومنٹ نہیں اور اس میں کئی ٹکڑے بڑی طاقت اور خوبصورتی کے حامل ہیں۔ میں سمجھتا ہوں، پنجابی کی بزمِ ادب میں اس کتاب سے رونق آ جائے گی۔

آؤ ہم سب نئے پنجابی ناولسٹ مستنصر حسین تارڑ سے ہاتھ ملائیں۔ ویل ڈن!

(فنون، لاہور، جون جولائی ۱۹۷۹ء)

کھوئی ہوئی شام

شیریں

میں نے شیریں کی اس پُر فریب کتاب کو سواد لے کر سہج سہج پڑھا، تا کہ میری مسرت کے لمبے تارِ عنکبوت کی طرح کھنچتے چلے جائیں۔ اس ناول کا (اگرچہ میں اسے صحیح تکنیکی تعریف کی رو سے ناول کہنے میں متامل ہوں) دوسرا نام ناسٹیلجیا (nostalgia) ہونا چاہیے۔ اس میں مصنفہ کہانی کہنے سے زیادہ کشمیر کی جنت نظیر گل پوش وادی میں اس بیس بائیس سال کی دلہن کو اپنی حیرت اور امنگوں کے ساتھ ڈھونڈنے نکلی ہیں جو تقسیم ملک سے کچھ عرصہ قبل اپنے خاندان کے افراد کے ساتھ وہاں سیر و تفریح کے لیے گئی تھی اور پھر ہمیشہ کے لیے کھوئی گئی۔ ایک طرح یہ المیہ ہم میں سے بہت سوں کے ساتھ پیش آتا ہے، اور کیا ہم سب اپنے گم شدہ افق، اپنے شنگری لا (Shangri-la) کی تلاش میں سرگرداں نہیں؟ شیریں کا طرزِ تحریر تصنع، بناوٹی آرائش اور بناؤ سنگھار سے بالکل پاک ہے۔ وہ کبھی بھی شعوری طور پر ''لکھتی'' معلوم نہیں

ہوتیں۔ ان کے ناول میں فنی دستکاری کا شائبہ نہیں جو ہمارے کئی ایک جدید افسانہ نگاروں کو بڑی مرغوب ہے اور جو میرے لیے ان کی نگارشات کو جھوٹی اور اکتا دینے والی بنا دیتا ہے۔ اس ناول کو پڑھتے ہوئے مجھے بار بار خیال آتا رہا کہ سادہ پرکاری ہی سچا اور اعلیٰ فن ہے۔

شگفتگی اور شانتی سے بہتی ہوئی اس سفری یادداشت یا کہانی میں مصنفہ نے اپنے گداز قلم سے وادی کی نیلی جھیلوں، برف سے ڈھکے پہاڑوں، چنار اور شمشاد کے پر تجمل درختوں اور خواب آلود باغوں کی جو تصویریں کھینچی ہیں وہ مجھے کرشن چندر سے باہر کہیں اور نظر نہیں پڑیں۔ وہ کم از کم ایک پڑھنے والے کو کچھ دیر کے لیے ایک طلسم کی دنیا میں لے گئیں، جس کے لیے وہ سحر ساز مصنفہ کا مرتے دم تک شکر گذار رہے گا۔

ان کی یادیں بے قرار اور مضطرب جہلم پر امڈتے ہوئے ڈومیل کے چھوٹے ڈاک بنگلے میں جولائی ۱۹۴۷ء کی ایک شام سے شروع ہوتی ہیں، جب ایک بیرے نے ان سے پیشین گوئی کی: ''اب اس جہلم میں پانی کی جگہ خون چلے گا۔ بڑا برا حال ہے، کون جانے کیا ہوگا؟'' یہ ان کی پارٹی کی کشمیر کے خطے میں پہلی شام تھی۔ ڈومیل سے وہ چناری، اوری، رام پور کے ڈاک بنگلوں میں چائے نوشی کرتے ہوئے بارہ مولا پہنچے، اور پھر سری نگر، جس کے پہلے منظر نے مصنفہ کو قدرے مایوس کیا لیکن پھر شہر کے لازوال حسن نے آہستہ آہستہ اپنی جھلک دکھائی جیسے کوئی شرمیلی دلہن ہولے ہولے گھونگھٹ اونچا کرتی جائے۔

میں اقرار کرتا ہوں کہ اس ناول نے میرا دل موہ لیا۔ اس کا سبب میرا ناسٹیلجیا بھی ہو سکتا ہے۔ شیریں آخری بار ۱۹۴۷ء میں کشمیر گئی تھیں۔ میں بھی پہلی اور آخری بار جولائی ۱۹۳۹ء میں اپنے والدین اور بھائی بہنوں کی معیت میں کشمیر گیا، جب میں لاہور کے لا کالج میں قانون پڑھتا تھا، اور میرا دل ابھی تک اس طلسم میں اٹکا ہے۔ (افسوس کہ میرے پاس شیریں کا قلم نہیں کہ میں ان نظاروں اور کیفیتوں کی یادگار نثر میں تصویر کشی کر سکوں۔) ہم نے ایک بڑی ہاؤس بوٹ کرائے پر لی کیونکہ ہم کنبے کے دس بارہ افراد تھے۔ ''ریور کوئین'' یعنی دریا کی ملکہ، اس ہاؤس بوٹ کا نام تھا جو اس کے دنبالے پر سفید حروف میں پینٹ کیا ہوا تھا۔ ہم نے اسے جھیل ڈل کے کنارے ایک پُر برگ کنج کے پاس لنگر کرایا۔

ایک چھوٹے ہاؤس بوٹ میں ہماری ''ریور کوئین'' کا مالک اور اس کا کنبہ رہتے تھے۔ مجھے وہ چمکتی ہوئی آنکھوں والا شوخ وشنگ لڑکا سونا اب بھی یاد ہے، جس کا بدن واقعی سونے کی طرح دمکتا تھا اور

Scanned with CamScanner

جو ایک اود بلاؤ کی طرح ڈبکی لگا کر پانی میں پھینکے ہوے سکے نکال لاتا تھا، اور کبھی ناکام نہ ہوتا تھا۔ دریا کی ملکہ، ایک قصر کی طرح پردوں اور تصویروں سے بجی ہوئی تھی، اور تم یہ سن کر حیران ہو گے کہ یہ ساری عیش وعشرت، یہ نوابانہ راحت ہمیں صرف دس روپے یومیہ پر میسر تھی۔ پیش عرشے کے دالان (ڈرائنگ روم) میں ایک بک کیس میں پچاس، سو کے لگ بھگ انگریزی کی کتابیں بھی تھیں — بیشتر زین گرے (Zane Grey) کے ویسٹرن ناول — اور میں پہروں بیٹھا انھیں پڑھتا رہتا، اور پانی پر شکاروں کے جلوس کو دیکھتا رہتا۔ پھر میرا اسکول کا دوست شفیق الرحمٰن، جو تب لاہور میڈیکل کالج میں پڑھتا تھا، اپنی گرمیوں کے چھٹیوں کا کچھ حصہ گزارنے کے لیے آ پہنچا۔ میں نے پانچ روپے ماہانہ کرائے پر کہیں سے چپوؤں سے چلنے والی ایک چھوٹی سی سرخ کشتی حاصل کر لی تھی، جس میں دو آدمی بیٹھ سکتے تھے، ایک کھویا اور دوسرا اس کا ساتھی۔ وہ اب ہمارے کافی کام آئی۔ اس میں شفیق اور میں گھنٹوں جھیل ڈل اور کنول بھچے یا قوتی آبی راستوں کی سیر کرتے رہتے۔ اس طلسمات سے ہمارا جی نہ بھرتا۔ جب ہم میں سے ایک تھک جاتا، دوسرا چپو سنبھال لیتا۔ کبھی کبھار ہم اپنی کشتی کو چناروں اور سفیدوں کے کسی زمردیں کنج پر ٹھہراتے، اور مہکتے ہوے فسوں زدہ جنگلوں میں دور نکل جاتے۔ اسی کشتی میں ہم جہانگیر کے بنائے ہوے نشاط اور شالیمار باغوں میں بھی گئے۔ شفیق شاید دنیا کا سب سے اچھا اور مسرت بخش آوٹ ڈور ساتھی ہے۔ وہ مجھے اپنے کالج کے کئی لمبے، پُر لطف قصے سناتا، اور مجھے گمان ہے کہ آغازِ شباب کے وہ بے فکر قہقہے، جب زندگی اپنی امنگوں کے ساتھ ہمارے سامنے پھیلی تھی، اب بھی ان جھیلوں اور چمنستانوں کی فضا میں بکھرے ہوں گے، اور زریں سہ پہروں اور عنابی شاموں میں کوئی انجانا نوخیز راہی انھیں سنتا ہوگا اور رک جاتا ہوگا۔ جھیل ڈل کے وسط میں ایک پیراکی کا قصر مستقل طور پر لنگر انداز تھا، جہاں سے تم معمولی کرائے پر سوئمنگ کاسٹیوم لے کر جھیل کے پانیوں میں جی بھر کر تیر سکتے تھے۔ ہم اکثر وہاں جاتے، جہاں شفیق جست لگانے والے تختے سے غوطے لگاتا اور اپنی تیراکی کے جوہر دکھاتا۔ میں گزارے کا تیراک ہونے کی وجہ سے جھیل کے گہرے پانیوں میں تیرنے کی ہمت نہ کر پاتا اور قصر کے عرشے سے اسے رشک سے دیکھتا رہتا۔ شفیق دس پندرہ دن بعد چلا گیا۔ ہم وادی میں ایک لمبے قیام کے لیے آئے تھے۔ ہم پہلگام تو نہ جا سکے، جیسا کہ میرا دل چاہتا تھا، مگر ہم وولر جھیل، چشمہ ویری ناگ، جہاں سے پُرشور طاقتور دریائے جہلم ایک ننھے سے جھرنے کی صورت میں پھوٹتا ہے، اور گلمرگ اور

دوسری ٹورسٹ گاہوں میں ضرور گئے۔ ٹنمرگ سے گلمرگ تک ٹٹوؤں پر جاتے ہوئے، ہم نے ایک ٹٹو پر سوار سولا ہیٹ لگائے، برجس پہنے، ایک چھوٹے مجوکڑے سے شخص کو جالیا۔ وہ اپنے ٹٹو کی زین سے گرتا آتا تھا اور دوسرے ٹٹو پر اس کے ساتھی کو اسے تھامنے میں کافی وقت پیش آرہی تھی۔ استخوانی چہرے میں دھنسی ہوئی اس کی آنکھوں میں عجیب چمک سی تھی اور وہ ہماری طرف مڑ کے دیکھتا ہوا، نامی انگریزی میں اول فول بکتا جاتا تھا، جس کا ایک لفظ بھی ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ شخص شراب میں دھت ہے، جو صحیح تھا، کیونکہ ہر پانچویں منٹ پر وہ اپنی برجس کی جیب میں سے وہسکی کی چھوٹی شیشی نکالتا، جو اس نے وہاں رکھی ہوئی تھی، اور اسے منھ سے لگالیتا۔ اس کا ساتھی اس کی اس بیہودگی پر شرمسار اور پریشان تھا اور اس نے میرے باپ سے معذرت کی۔ ہم ایک 'وکٹورین' کنبہ تھے، اور ہم اس شرابی کی گراوٹ اور لچرپن کے رویے سے مکمل طور پر سکینڈے لائز (scandalise) ہوگئے۔ راستے میں تین چار بار اس نے قے کی، جس نے میری چھوٹی بہن کو اس درجہ ڈرایا کہ وہ رونے لگی۔ اس شخص کے چہرے کے حیوانی تیور میں اتنے سال گزرنے کے بعد بھی نہیں بھول سکا، اور خدا جانے کیوں میں اب بھی گاہے گاہے اسے ایک پرنٹ (print) کی طرح واضح اپنے سامنے دیکھتا ہوں۔ اس کا سوچ کر مجھے اس سے گھن نہیں آتی، رحم کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ ہم کو کبھی یہ پتا نہ چلا کہ یہ حیوانی صورت والا باخوس (Bacchus) کون تھا، کہاں سے وہ آیا تھا اور اس کا پیشہ کیا تھا؟ کون سی بدروحیں اس کی جان کو دق کیے تھیں کہ وہ الکاہلزم کی عافیت اور خودفراموشی پانے پر مجبور ہوا؟ کیا وہ ناکام محبت کا مارا کوئی آرٹسٹ تھا جو اپنی امنگ کو نہ پاسکا اور جس کے لیے اب زندگی میں کچھ نہیں تھا؟... یہ میں کبھی نہیں جان سکوں گا۔

دیکھا تم نے! شیریں کی کتاب پر تبصرہ مجھے کہاں سے کہاں لے گیا۔ میں اپنی کھوئی ہوئی شام کو ڈھونڈنے چل پڑا۔ اور سنہری بیتے دنوں کی ان خوبصورت یادوں کی دنیا میں لحظہ بھر کے لیے گم ہوگیا جو کبھی میری تھی۔ پیارے پڑھنے والے، مجھے معاف کردو!

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، گو مصنفہ اسے ناول کہتی ہیں، ''کھوئی ہوئی شام'' حقیقتاً ایک سفرنامہ ہے اور سفرنامے سے بھی ہٹ کر ایک ناسٹیلجک تحریر۔ بیشتر کتاب صیغۂ حال میں لکھی گئی ہے جو ایک فرانسیسی تکنیک ہے، گو میں اسے ایک کہانی کہنے کے لیے پسند نہیں کرتا۔ عجیب بات یہ ہے کہ یہ تکنیک ''کھوئی ہوئی شام'' میں پڑھنے والے کو نہیں کھلتی اور اس قسم کی کہانی کے مناسب لگتی ہے اور اس کے حسن

اور تاثر میں اضافہ کرتی ہے۔ تم اس سفرنامے کو ناول بھی کہہ سکتے ہو۔ وہ یوں کہ لکھنؤ کی ایک مارکسسٹ شاعر لڑکی راجکماری اور شانتی نکیتن میں پڑھے ہوئے مصور شاہد کی دبی، خاموش محبت کی کہانی اس کے تار و پود میں ایک سنہری تاگے کی مانند پروئی ہوئی ہے... اور پھر فسادات کے بھیانک ہون کنڈ کی نمود، جب یہ طلسمی سپنا ٹوٹ جاتا ہے اور عجلت اور افراتفری میں روپے اور پٹرول مانگ تانگ کردہ خوبصورت وادی کو خیرباد کہتے ہیں۔ آخری صفحات میں تقسیم پر بہت کچھ کہہ دیا گیا ہے لیکن اس سے زیادہ وہ ہے جو اَن کہا رہا ہے۔

بہت سے پڑھنے والے پوچھیں گے: لیکن یہ شیریں ہیں کون جن کی کتاب کی تعریف میں تم نے حسب معمول زمین آسمان کے قلابے ملا دیے ہیں؟ شیریں کا اصل نام بلقیس جہاں آرا بیگم ہے (گھر میں ان کے پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں انھیں ''بی بی'' کہہ کر پکارتے ہیں)۔ ان کا خاندان ۱۹۴۷ء کے خونیں ہنگامے میں ہجرت کر کے پاکستان میں آ آباد ہوا۔ ان کو اپنے بچپن ہی سے لکھنے پڑھنے سے شغف تھا۔ پہلی کہانی جو انھوں نے لکھی، اس کا نام ''شہید عروس'' تھا۔ یہ ۱۹۳۷ء میں اختر شیرانی کے ''رومان'' میں چھپی۔ اس کے بعد ان کی کہانیاں ملک کے مختلف ادبی مجلوں ''ساقی''، ''ہمایوں''، ''ادیب''، ''ادب لطیف'' اور ''افکار'' وغیرہ میں چھپتی رہیں اور کافی مقبول ہوئیں۔ ان کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ ''پنکھڑیاں'' کے عنوان سے ۱۹۴۵ء میں مکتبۂ علم و ادب دہلی سے طبع ہوا۔ اس زمانے کی اہم ادبی شخصیتوں نے — جن میں سر شیخ عبدالقادر مرحوم اور ''ہمایوں'' میں لکھنے والے فلک پیما بھی تھے — ان کے افسانوں کی خوبیوں کو سراہا۔ پاکستان آنے کے بعد انھوں نے بہت کم لکھا، مگر جن لوگوں کی گھٹی میں لکھنا ہو وہ لکھے بغیر کیونکر رہ سکتے ہیں۔ بہت کچھ جو انھوں نے لکھا وہ چھپ نہ سکا۔ ان کا تازہ ترین افسانہ ''لمحوں کی دنیا'' اکتوبر ۱۹۷۸ء میں ''افکار'' میں آیا۔ اور پھر یہ کتاب ''کھوئی ہوئی شام'' ہے جو چار پانچ برس پیشتر انھوں نے لکھی، اور اس امر کی غماز ہے کہ پرانی آگیں (fires) اب بھی جلتی ہیں اور بجھی نہیں۔ ملنے میں وہ ایک نہایت سلجھی ہوئی پڑھی لکھی، ذہین و فطین، دردمند خاتون ہیں۔ ان کی حس ظرافت بڑی تیز ہے، اور ان کی باتیں جن میں ان کے مطالعے اور مشاہدے کی آنچ ہوتی ہے، مزہ دے جاتی ہیں۔ وہ اپنے لکھنے کی کبھی کوئی بات نہیں کرتیں۔

ایسی کتابیں ہوتی ہیں جن سے تم محبت کرنے لگ جاتے ہو۔ ''کھوئی ہوئی شام'' بہت سوں کے

Scanned with CamScanner

لیے جو میری نسل سے تعلق رکھتے ہیں، ایک ایسی ہی کتاب ہے!

(فنون، لاہور، ستمبر اکتوبر ۱۹۷۹ء)

بستی

انتظار حسین

میں ایک انتھک اور عمر بھر کا ناول پڑھنے والا ہوں، اور میں نے ہزاروں ناول پڑھ ڈالے ہوں گے۔ یہ کوئی ڈینگ نہیں بلکہ اسے ایک لت گردانا جاسکتا ہے، ایک زندگی بھر کی عادت جو اسکول اور کالج کے ایام میں مجھے پڑی اور بعد کے آنے والے برسوں میں پختہ ہوتی گئی۔ اس کا آغاز بچپن اور لڑکپن میں دارالاشاعت پنجاب اور فضل بک ڈپو کی چھپی ہوئی کہانیوں اور جاسوسی ناولوں سے ہوا، مگر دسویں جماعت میں آنے تک میں انگریزی مہماتی رومانوں اور ناولوں سے متعارف ہو چکا تھا اور وہ میرا اوڑھنا بچھونا بن گئے تھے۔ میں نے رابرٹ لوئی اسٹیونسن کو دریافت کیا اور رائیڈر ہیگرڈ، فینی مور کوپر، فریڈرک مریات اور دوسروں کو، جن کے نام میرے لیے جادو کے بول تھے اور جن کی ہوشربا کتابیں مجھے حیرتناک دنیاؤں میں لے جاتی تھیں اور راتوں کو جگائے رکھتی تھیں۔ کیسے کہانی کہنے والے یہ لوگ تھے! کالج کی تعلیم ختم کرنے تک میں تقریباً سارا موپاساں پڑھ چکا تھا اور بہت کچھ وکٹر ہیوگو اور ڈوما، جس کا ضخیم ناول ''کاؤنٹ آف مانٹی کرسٹو'' آج بھی میرے تخیل کو آتشیں کر دیتا ہے۔ عظیم طالسطائی، دستوو سکی، چیخوف، ترگنیف میری زندگی میں بہت بعد میں آئے۔ میں نے اردو ناول بہت کم پڑھے ہیں اور بعض لوگ میرے یہ کہنے پر میرے لتے لیں گے کہ ناول کی صنف میں اردو میں پڑھنے کے لیے ماسوا چند گنتی کی کتابوں کے کوئی قابلِ ذکر چیز نہیں۔ ہم نے بڑے ناول نہیں لکھے۔ رتن ناتھ سرشار کے ''فسانۂ آزاد'' کو ایک بڑا ناول کہا جاسکتا ہے اور محمد ہادی رسوا کی ''امراؤ جان ادا'' ایک فنی شہپارہ ہے، مگر عبدالحلیم شرر کے اسلامی تاریخی ناول ایک مذاق ہیں اور ڈپٹی نذیر احمد کے اصلاحی تبلیغی ناول — اپنی ظرافت کی چاشنی اور بیان کی لطافت کے باوجود — محض پند و موعظت کے صحیفے۔ وہ ہمارے دلوں کو

Scanned with CamScanner

نہیں بلاتے۔ منشی پریم چند نے اردو میں چند اچھے ناول لکھے مگر انھیں اب کوئی نہیں پڑھتا اور وہ کسی کو یاد نہیں... اور یہاں ایک طرح ہماری کلاسیکی ناول نگاری کی تاریخ اپنے انجام کو پہنچتی ہے۔ ناول کے ایک رسیا کی حیثیت سے میرے نزدیک ایک ناول ایسا ہونا چاہیے جو پڑھنے والے کو پہلے صفحے سے اپنی گرفت میں لے لے۔ اس میں سچے چلتے پھرتے کردار ہوں اور اس میں کہنے کے لیے ایک کہانی ہو۔ پڑھنے کے دوران یہ تمھیں اپنی تگ وتاز اور رنگارنگی سے مضطرب اور بے کل سا رکھے، اس طرح کہ تمھیں کھانے پینے کا ہوش نہ رہے۔ اور جب تم اسے اپنے ہاتھ سے رکھو تو اس کے مختلف نقوش، اس کے مناظر اور واقعات دیر تک تمھارے ذہن میں لو جگاتے رہیں۔ تم محسوس کرو کہ تم ایک انوکھے، خوبصورت تجربے میں سے گزرے ہو اور نئے نظاروں پر تمھارے دل کی کھڑکی وا ہوئی ہے اور تم نے کچھ نئے دوست بنائے ہیں، تمھاری زندگی کی حیرت فزائیوں اور انسانوں کی خوشیوں اور غموں کا گیان زیادہ گہرا ہوا ہے۔ اردو میں ایسے کتنے ناول ہیں؟ تم انھیں ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گن سکتے ہو۔ جو کچھ میں نے ناول کے بارے میں کہا ہے یہ ناول کی تعریف نہیں، مگر اس سے سب اتفاق کریں گے کہ دنیا کے بڑے ناول جن کی مہک ہمارے ذہن سے نہیں مٹتی اور جن سے ہم محبت کرتے ہیں سب میں یہ صفتیں مشترک ہوتی ہیں۔

میں نے حال ہی میں تین ناول پڑھے ہیں۔ فیرل کا ''سیج آف کرشنا پور''، نوبیل پرائز ونر یہودی مصنف آئی بی سنگر کا ''سیو'' (Sieve) اور ایچ ای بیٹس کا ''اسکارلٹ سورڈ'' (Scarlet Sword)۔ پہلا غدر کے زمانے میں لکھنؤ کی ریجنسی کے محاصرے کے بارے میں ہے۔ آئی بی سنگر کا ناول سترھویں صدی کے پولینڈ کی ایک خوبصورت محبت کی کہانی ہے۔ تیسرا ناول ۱۹۴۷ء میں پٹھانوں اور آفریدیوں کی مقبوضہ کشمیر پر یلغار اور ان کے ایک کیتھولک مشن کے محاصرے کی دہشت ناک کہانی بتاتا ہے۔ تینوں ناولوں میں کردار چلتے پھرتے، جیتے جاگتے ہیں اور تم ان کو تقریباً دیکھ سکتے ہو۔ ناولوں کا زمانہ اور سین آف ایکشن منور اور روشن ہے، گویا واقعات ہمارے سامنے رونما ہو رہے ہیں اور ہم خود وہاں موجود ہیں۔ ان کی کہانیوں کی دلآویزی تمھیں پہلے صفحے سے اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ سوائے سنگر کے ناول کے (جسے عظیم کہا جا سکتا ہے) دوسرے دو ناول exceptional نہیں، مگر وہ اچھے اور خوبصورت ناول ہیں اور اگر کوئی اردو میں ایسے ناول بھی لکھ سکے تو میرا جی بہت خوش ہوگا۔

انتظار حسین کا ناول ''بستی'' ابھی تزک واحتشام سے چھپا ہے۔ ہمارے ایونٹ گارڈ (Avant

(Garde) نقادوں نے ملک کے رواج کے مطابق اس ایونٹ گارڈ لکھنے والے کو خوب چڑھایا ہے اور ناول کی خوبیوں کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے ہیں۔ ایک تبصرہ نگار نے اسے اردو کے دس عظیم ناولوں میں ایک ہونے کی نوید دی ہے (اگرچہ اس نے یہ نہیں بتایا کہ دوسرے نو عظیم ناول کون سے ہیں)۔ ایسی تعریف و تحسین کے ڈونگروں میں ''بستی'' کے متعلق میری توقعات قدرتاً بہت اونچی ہو گئی تھیں، مگر جب میں نے اس ناول کو پڑھنا شروع کیا اور پچاس صفحات سے آگے تک پڑھ چکا تو برہمی اور جھلاہٹ نے مجھے آن لیا۔ مجھے جُل دیا گیا تھا اور میری مایوسی شدید تھی۔ اگر اردو میں ایسے ہی عظیم ناول ہمارا مقدر ہیں تو ہم ان سے لنڈورے ہی بھلے۔ صاف بات یہ ہے کہ ''بستی'' میری طبیعت کا ناول نہیں (اگر یہ فی الواقع ناول ہے)۔ میری رائے میں ''بستی'' بے نصیب اردو ناول کے تابوت میں ایک اور کیل ہے۔ اردو ادب کے آسمان پر سے اس اداس اور بیمار ناسٹیلجیا کے تنگ و تاریک بادل کب چھٹیں گے؟ کب سورج چمکے گا اور پرندے درختوں پر گائیں گے؟ مجھے یاد ہے، انتظار حسین نے ایک دفعہ تحقیر سے سومرسٹ ماہام کو ایسا بزرگ مصنف بتایا تھا جو بیسویں صدی میں اٹھارویں (یا انیسویں) صدی کے انداز میں افسانے لکھا کرتا تھا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ ایک بڑے اور بے مثل کہانی لکھنے والے کو اس اوچھے پن سے اُڑانے سے ماہام کے ادبی کارنامے یک قلم ملیامیٹ ہو جائیں گے اور اس بے چارے اٹھارویں صدی کے انداز میں لکھنے والے کو کوئی نہیں پڑھے گا۔ شاید انتظار حسین اس خود رائی اور خود پسندی کے جذبے کے تحت جو بدقسمتی سے ہمارے ادبی سورماؤں میں عام ہے، ایک استاد کی اچیومنٹ کو گھٹا کو اپنی قامت بڑھانے کا خواہاں تھا... ''میری طرف دیکھو میں ایک افسانہ نگار ہوں جو بیسویں صدی میں بیسویں (یا اکیسویں) صدی کی کہانیاں لکھ رہا ہوں، اس لیے ماہام وغیرہ سے بڑا افسانہ نگار ہوں۔'' سومرسٹ ماہام عظیم ناول نگار ہو یا نہ ہو اس کے *Cakes and Ale* اور *Moon and Sixpense* جیسے ناولوں اور گرفت میں لے لینے والی کہانیوں نے دنیا کے لاکھوں لوگوں کو بے اندازہ مسرت دی ہے، ان کے دلوں کو پرچایا اور رجھایا ہے۔ کیا انتظار حسین نے کبھی اس پائے کی ایک چیز لکھی ہے جس پائے کی وہ اٹھارویں صدی کے انداز میں لکھنے والا ایک مصنف اتنے قدرتی طور پر اور اتنی فراوانی سے لکھ لیا کرتا تھا؟ کبھی وہ *Cakes and Ale* یا ''آف ہیومن بانڈیج'' جیسے ناول لکھ سکنے کا سوچ بھی سکتا ہے؟ ادبی اُمنگ اونچی رکھنے میں کوئی حرج نہیں مگر اپنی صلاحیت اور حدِ پرواز کی کچھ

Scanned with CamScanner

سوجھ بوجھ ضرور ہونی چاہیے۔ اپنے سے کہیں اچھے اور بڑے لکھنے والوں پر تراہ تراہ کرنے سے آدمی صرف اپنی ہی ہنسی اڑاتا ہے اور بڑا لکھنے والا نہیں بن جاتا۔

میں اقرار کرتا ہوں کہ "بستی" کے پہلے چالیس پچاس صفحات، جو اس کے ہیرو ذاکر کے روپ نگر میں بچپن اور لڑکپن کا حال، اس کی گھریلو محبت، دو بچوں کی سلگتی ہوئی چاہت کا حال بتاتے ہیں، impressive ہیں۔ وہ اچھا ادب ہیں۔ ہم ان میں ناول کو پھیلتے اور پروان چڑھتے دیکھتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ ہم ان کرداروں اور ان کی وابستگیوں اور نفرتوں کو قریب سے جاننے لگیں گے اور کہانی ہمیں اپنے دام میں لے لے گی۔ ناول اسی رنگ ڈھنگ اور طاقت سے چلتا تو کوئی شک نہیں کہ اردو میں ایک اچھا قابلِ وقعت ناول ہوتا، مگر جلد ہی ہم ہماری امیدیں زمین پر پٹخی جاتی ہیں۔ چالیس پچاس صفحات کی اس تخلیقی اُپج کے بعد کہانی نئے ملک پاکستان سے شروع ہوتی ہے تو ناول کے ساتھ کوئی 'گھپلا' (ایک لفظ جس کا انتظار حسین بڑا مشتاق ہے) ہو جاتا ہے۔ "ناول کہاں گیا؟" ہم پوچھتے ہیں کیونکہ بقیہ صفحات میں ہمیں شیراز ہوٹل (جو پاک ٹی ہاؤس ہے) میں ذاکر اور اس کے دوستوں کی بے رنگ نیم انٹلکچوئل گفتگوئیں سننی پڑتی ہیں جو انتہائی اُکتا دینے والی ہیں۔ ایک ناول زندہ کرداروں کے متعلق ہوتا ہے مگر شیراز ہوٹل کے لوگ سائے سے رہتے ہیں، ناولسٹ کی ساری کاریگری اور کرتب بازی کے باوجود ان پتلیوں میں جان نہیں پڑ پاتی۔ ہمیں ان میں یا ان کی insipid گفتگو سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی... اور ہم اس طرح دھوکا دیے جانے پر ناولسٹ کی گردن ناپنا چاہتے ہیں۔ اسے پڑھنے والوں کو یوں let down کرنے کا کوئی حق نہ تھا۔

جو گھپلا ہوا اس کے بارے میں میرا اپنا اندازہ ہے۔ ہیمنگوے نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ایک لکھنے والے کو اس وقت کبھی نہیں لکھنا چاہیے جب اس کے کنویں میں پانی نہ ہو۔ "بستی" کے پچاس صفحات میں سے گزرنے کے بعد انتظار حسین کے کنویں میں پانی نہ رہا، یادوں اور ناسٹلجیا سے سیراب سوتے خشک ہو گئے۔ مگر اسے اپنا ناول مکمل کرنا تھا اور اس نے پاک ٹی ہاؤس اور اپنی ٹولی کے دوستوں کا سہارا لیا۔ ایک طرح اس ناول کا المیہ بھی پاک ٹی ہاؤس میں بیٹھنے والے ادیبوں کا المیہ ہے، جہاں اپنے وطن سے ہجرت کے بعد ناولسٹ نے اپنی زندگی کی بیشتر گھڑیاں ادب و فن پر گفتگو کرنے میں گزاریں۔ ہیمنگوے ہی نے کہیں ان ادیبوں کا ذکر کیا ہے جو زندگی کے رواں دواں تماشے اور اچھے برے تجربے

سے بچ کر کافی ہاؤس اور چائے خانوں میں پہروں بیٹھے اونچے انٹلکچوئل مباحث حل کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے ذہنوں پر جرثوموں کی طرح پلتے ہیں۔

اور انتظار حسین کی تخلیقی صلاحیتیں میرے خیال میں ایک خاص قسم کی اور بہت محدود ہیں۔ ''بستی'' پڑھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ جیتے جاگتے کردار تخلیق کرنے، ایک وسیع کینوس میں دلآویزی سے رنگ بھرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ اس کی قابلیت ایک ناول نگار کی ہے ہی نہیں۔ حال میں انتظار حسین نے قرۃ العین حیدر کے ناول ''آخر شب کے ہم سفر'' کا قدرے مربیانہ نوٹس لیا ہے۔ قرۃ العین حیدر کا ناول ایک عظیم ناول نہیں مگر ایک شاداب، رنگین، تازہ ہوا سے لہکتا ہوا ناول ہے۔ یہ فراواں تخلیقی قدرت کا حامل ہے اور میرے خیال میں یہ ہمارے ادب میں زندہ رہے گا۔ کیا انتظار حسین یہ چیز اپنے ناول ''بستی'' کے بارے میں کہہ سکتا ہے؟ قرۃ العین حیدر کے شاندار ناول کے سامنے ''بستی'' محض ایک خامکارانہ کوشش لگتا ہے۔ انتظار حسین کو اپنے ہی خواہ تبصرہ نگاروں کے بھرے میں نہیں آنا چاہیے۔ ایک لکھنے والے کو کچھ حاصل نہیں ہوتا اگر وہ اپنے آپ کو اپنی صلاحیتوں سے بڑھ کر دیکھے۔

کیا اردو میں کبھی بڑے ناول لکھے جائیں گے؟ کون یہ ناول لکھے گا؟ پاکستان میں آزادی کے بعد چند بہت اچھے ناول لکھے گئے ہیں — خدیجہ مستور کا ''آنگن''، اکرام اللہ کا ''گرگِ شب'' (توانائی اور طاقت سے لکھا ہوا ایک غیر معمولی ناول جسے تبصرہ نگاروں نے نظر انداز کرنا مناسب جانا) میرے دھیان میں آتے ہیں۔ مگر ایک شگوفے کے چٹکنے سے بہار نہیں آتی اور اردو ناول کا مستقبل بظاہر bleak ہے۔

کہا جا رہا ہے کہ اب اردو میں ناول کے دور کا آغاز ہو رہا ہے۔ بہت سے انٹلکچوئل لوگ ناول لکھ رہے ہیں، اور اگر ان کو ناشر میسر آئے تو وہ چھپ بھی جائیں گے۔ میں انھیں نہیں پڑھوں گا، کیونکہ مجھے اٹھارویں صدی کے انداز میں لکھے ہوئے ناول پسند ہیں، اس قسم کے ناول جیسے جین آسٹن، انتھنی ٹرالوپ، اسٹیونسن اور کانریڈ لکھا کرتے تھے، اور جیسے اس صدی میں گراہم گرین، جان فاؤلز اور آئی بی سنگر لکھتے ہیں۔ ویسے یہ یقینی ہے کہ انیس سو اسی کے بہترین اردو ناول کا آدم جی ادبی انعام ''بستی'' کو ملے گا۔

(فنون، لاہور، جنوری فروری ۱۹۸۰ء)

Scanned with CamScanner

گردِ راہ

اختر حسین رائے پوری

"گردِ راہ" پیہم درخشاں زندگی کا بچپن ہے۔ اس کا مصنف جانتا ہے کہ ایک آدمی اس دنیا میں درس و تدریس دینے، حیثیت والے لوگوں میں شادی کرنے، روپیہ کمانے، بنگلہ بنانے یا یادگار کتابیں لکھنے کے مقصد سے نہیں آیا۔ وہ یہاں دوسروں کا دکھ محسوس کرنے، خوبصورتی اور تابانی اور دردمندی سے جیون کا سفر بِتانے اور اس وقتی میلے کی رونقوں میں بھرپور طور پر شریک ہونے کی خاطر آیا ہے۔ اور اگر وہ ان جذبوں سے کورا ہے تو بہتر تھا کہ اس نے اس حیرت ناک دنیا میں آنکھ ہی نہ کھولی ہوتی۔ مصنف کے نزدیک لکھ کر اپنی ذات کا اظہار اہم ہے مگر اچھی طرح جینا اس سے بھی اہم ہے۔

یہ پڑھنے والے کی توجہ کو جذب کرنے والی آپ بیتی کئی لحاظ سے ایک حیران کن کتاب ہے — شاید اردو زبان کی دلچسپ ترین آپ بیتی جو جدید دور میں کسی نے لکھی ہے۔ یہ ایک قندھاری انار کی طرح رسیلی اور بھری پُری ہے۔ یہ محض آپ بیتی نہیں ہے، جگ بیتی بھی ہے، یادداشتوں کی کتاب بھی، نصف صدی کی، ادبی، سیاسی، تہذیبی داستان بھی، اور نابغۂ روزگار ہستیوں کے چلتے پھرتے مرقعوں کا رنگ محل بھی۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری ایک نادر انسان ہیں اور انھوں نے ایک نادر کتاب لکھی ہے۔

کتاب کے دل پذیر اور عالمانہ حرفِ آغاز سے پڑھنے والا مصنف کے دام میں آجاتا ہے۔ اس کے کئی پیرے چونکا دیتے ہیں اور ہم جان لیتے ہیں کہ ہم ایک بے حد دردمند انسان، تربیت یافتہ ذہن کے مالک، دنیا کے شہری کی رفاقت میں ہیں جس کی باتیں دل لبھانے والی سچی اور عقل و دانش سے پُر ہیں۔ ان پیروں کو یہاں پورے کا پورا درج کرنا تو ممکن نہیں، مگر چند اِدھر اُدھر سے اٹھائے ہوئے فقروں کو نقل کیے بغیر بھی نہیں رہا جا سکتا جن سے مصنف کی ذہنی افتاد اور اسلوبِ فکر کی غمازی ہوتی ہے۔

> گوتم بدھ کے ایک شاگرد نے کہا، آپ نے سب کچھ بتایا، لیکن یہ معما حل نہ کیا کہ آفرینش سے پہلے کیا تھا اور موت کے بعد کیا ہوگا۔ گوتم بدھ نے کہا کہ اس طلسم کی کلید انسان کے پاس نہیں۔ اس کا مقدر فقط یہ ہے کہ حیاتِ مستعار کے مسائل کو سمجھے اور حل کرے۔ یعنی، بقول کارل مارکس، فلسفی زندگی کو سمجھنے میں بہت سر کھپاتے ہیں، اصل مسئلہ اسے بدلنے کا ہے۔

Scanned with CamScanner

اس شکست و ریخت میں انسان کی تعمیر کے دو ستون باقی ہیں، جمہوریت اور اشتراکیت۔ ایک کے بغیر دوسرے کا تصور تشنہ ہے۔ فرد کا جواز فرد کی اصلاح ہے۔ میرا ذہن جمہوریت پر سرمایہ داری کے تسلط کو مسترد کرتا ہے جس طرح اشتراکیت پر کسی قسم کی ڈکٹیٹرشپ کو...

مشرقی ذہن کو بالعموم اور اسلامی ذہن کو بالخصوص فقہ اور شاعری نے یوں نقصان پہنچایا کہ ایک نے تنقید کی صلاحیت کو اور دوسرے نے اس کے اظہار کو مسدود کر دیا ہے... شاعری کی لغت محدود ہے کیونکہ یہ اصلاً عالمِ بیداری کی نہیں، عالمِ خواب کی لغت ہے۔ اس کا مقصد گفتگو نہیں سرگوشی ہے...

اور جب اثریت اور اشاریت کی گرہ خالی ہونے کو آئی تو، دائرہ اور خط، آواز اور سرگم، لفظ اور معانی کا ربط ٹوٹنے لگا... اب ہم ایک بے صدا، بے رنگ، بے معنی دور میں داخل ہو گئے...

میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ دنیا کو زیادہ نقصان نیم خواندگی سے پہنچا ہے...

اختر حسین اس عالمِ رنگ و بو میں ۱۲ر جون ۱۹۱۲ء میں آئے۔ وہ پیدا تو رائے پور (متوسطِ ہند) میں ہوئے، مگر اُن کے والد اکبر حسین کا تعلق پٹنہ کے ایک پرانے خاندان سے تھا۔ اکبر حسین علی گڑھ کالج اور ٹامسن انجینئرنگ کالج سے فارغ التحصیل تھے اور محکمۂ آب پاشی میں ایک اچھے عہدے پر فائز۔ اختر حسین تین سال کے تھے کہ والدہ اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ اُن کے ایک بھائی اور تھے، مظفر حسین شمیم، ان سے تین سال بڑے۔ والدہ سے وراثت میں دو گاؤں اور اچھی خاصی شہری جائیداد دونوں بھائیوں کے حصے میں آئی جس میں سے بہت سی ان کے رشتے دار کھا پی گئے۔ ایک آیا، پیرن جی نے دونوں بھائیوں کو پالا پوسا۔ جب ان کے والد اکبر حسین نے دوسری شادی کر لی تو وہ اپنے لڑکوں سے دور ہو گئے اور انھیں اپنے حالوں چھوڑ دیا۔ اکبر حسین خوب مزے کے آدمی تھے۔ آزاد خیال، وسیع المشرب، رنگین مزاج، شطرنج کے کھلاڑی، قوم پرست، ''الہلال'' اور ''کامریڈ'' کے خریدار۔ اختر کو چھ سال کی عمر میں مکتب میں داخل کیا گیا۔ قرآن شریف کا درس شروع ہوا تو مولوی صاحب کے پیچھے پڑ گئے کہ انھیں عربی عبارت کے معنی بھی بتائیں۔ مولوی صاحب کو طیش آ گیا اور کہنے لگے، بڑے بڑوں کی سمجھ میں خدا کا کلام نہیں آتا، تیری سمجھ میں خاک آئے گا۔ اختر کی افتادِ طبع بچپن سے یہ تھی کہ جب تک اُن کا دماغ قائل نہ ہوتا، کسی دعوے کو قبول نہ کرتے تھے۔ انھوں نے مکتب جانے سے انکار کر دیا۔ لوگوں

Scanned with CamScanner

نے کہا، باپ تو علی گڑھ میں پڑھ کر نیچری ہو گیا تھا، بیٹا بھی نیچری رنگ پکڑ رہا ہے۔ ان کے والد اکبر حسین پر اس واقعے کا اتنا اثر ہوا کہ انھوں نے بیٹے کو اردو نہیں، بلکہ ہندی کے پرائمری اسکول میں داخل کو دیا۔ وجہ یہ بتائی کہ جب ہندو اردو، فارسی پڑھنے سے دریغ نہیں کرتے تو مسلمان ہندی کیوں نہ پڑھیں۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ باپ بیٹا فطرتاً کڑیل، باغی اور ہٹیلی طبیعت کے تھے جو اپنا جھنڈا الگ اٹھا کر چلتے تھے اور اس بات سے بے پروا تھے کہ لوگ ان کے متعلق کیا سوچتے اور کہتے ہیں۔ وہ ان مرنجاں مرنج، مصلحت کوش اور دھیمے لوگوں میں سے نہ تھے جو زندگی کے راستوں پر بچ بچا کر چلتے ہیں۔ مصنف نے اپنے والد کے بارے میں ہمیں تفصیل سے نہیں بتایا۔ جو کچھ بتایا ہے، وہ کافی ہے۔ مجھے اکبر حسین ایک دل کش شخصیت لگتے ہیں جو خود اس قابل ہیں کہ ان کی سوانح عمری لکھی جائے۔ بیٹا بھی اپنے باپ سے مختلف نہیں۔ وہ دونوں ہتھیار ڈالنا نہیں جانتے، مگر میرا کچھ ایسا خیال ہے کہ بیٹے میں حالات کا سامنا کرنے کی قوت کچھ زیادہ تھی۔

اسکول میں اختر نے بہت تھوڑے عرصے میں ہندی میں اچھی خاصی استعداد پیدا کر لی۔ پھر مطالعے کا جنون سوار ہوا اور کتابوں کی تلاش میں سرگرداں رہنے لگے۔ ایک مندر کی لائبریری دریافت کر لی اور اس کی سب ہندی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ تاریخ سے انھیں رغبت تھی۔ اس لائبریری کی طلسماتی اور جاسوسی نوعیت کی کتابوں میں انھیں نپولین بوناپارٹ کی زندگی پر ایک کتاب مل گئی، جسے انھوں نے بار بار پڑھا۔ جب وہ ساتویں میں تھے تو ان کے مطالعے کا رخ اردو اور انگریزی کتابوں کی طرف ہو گیا۔ اسکول کی تعلیم ختم کرنے تک وہ انگریزی کتابوں کے رسیا ہو گئے۔ جب وہ سولہ سال کی عمر میں میٹرک کے امتحان سے امتیاز کے ساتھ فارغ ہوئے تو انھیں انگریزی، ہندی اور اردو پر اچھا خاصا عبور حاصل ہو چکا تھا۔ ان کے والد اکبر حسین نے قبل از وقت پنشن لے لی تھی اور مہینوں کے لیے ان کی سوتیلی ماں کے پاس پٹنہ چلے جاتے۔ عملی طور پر وہ بیٹوں کی زندگی سے نکل چکے تھے، ان کے مستقبل سے بے نیاز۔ پھر اکبر حسین، جو دنیاوی معاملات اور کاروبار سے ناواقف تھے، اپنی جمع شدہ عمر بھر کی پونجی کا بیشتر حصہ ایک جنگل کے ٹھیکے میں گنوا بیٹھے اور قلاش ہو گئے۔ گاؤں اور زمین کا نظام انھوں نے ایک مختار کے سپرد کر دیا جس نے سب مختاروں کی طرح خوب ہاتھ رنگے۔ جو کچھ وہ دے دیتا یہ چپکے سے لے لیتے اور خود گاؤں میں داخلے کی ہمت کبھی نہ ہوئی۔ جب بھوک کا بھیڑیا دروازے پر منڈلانے

Scanned with CamScanner

لگا تو اکبر حسین نے بیٹے کو ایک ملازم بہشتی میاں کے ہمراہ بیل گاڑی پر گاؤں روانہ کیا اور اس جائیداد کے سنبھالنے کی ذمے داری بیٹے پر ڈال دی۔ وہاں مفلوک الحال کسان جو مالک کا انتظار کر رہے تھے، اُن کے پاؤں پر جھکے، جس نے اختر کو دکھی اور پس ماندہ انسانوں کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیا۔ اختر کے بڑے بھائی پہلے ہی تعلیم و معاش کی خاطر کلکتہ جا چکے تھے۔ اب میٹرک کے بعد اختر نے بھی علم کی تلاش میں وہاں جانے کا قصد کیا۔ والد کی خدمت میں حاضر ہوئے تو وہ بولے، ''میری بھی یہی آرزو ہے کہ تم اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرو لیکن میں فی الحال اس قابل نہیں کہ تمھاری کچھ مدد کر سکوں۔'' اکبر حسین نے بیٹے کو والدہ کی جائیداد سنبھالنے اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی تلقین کی۔ یہ نصیحت کر کے وہ گویا سب ذمے داریوں سے سبک دوش ہو گئے۔ انھوں نے کہیں سے بیٹے کو دو سو روپے دیے اور اختر دو سو روپے جیب میں ڈالے، قسمت آزمائی کرنے ریل سے کلکتہ روانہ ہو گئے۔ چند ماہ تو سیر سپاٹے اور بے فکری میں گزارے۔ جب باپ کے دیے روپے ختم ہو گئے تو فکرِ معاش نے آن دبوچا، کیونکہ بھائی کی آمدنی کم تھی۔ ہندی میں اپنے مطبوعہ مضامین کے تراشے اور غیر مطبوعہ مضامین کے مسودے لے کر ہندی کے سب سے مقبول روزنامے 'وشوامتر'' کے دفتر جا دھمکے۔ انھوں نے جونیئر ایڈیٹری کی درخواست دے دی، اور پنڈت مول چند ان کی ہندی دانی اور ذہانت سے بھونچکے رہ گئے اور انھیں رکھ لینے کی ہامی بھر لی۔ گو ایک مسلمان کا ایک ہندی روزنامے میں کام کرنا حیران کن بات تھی، مول چند نے انھیں کام دیا اور اختر نے اپنی خداداد لیاقت اور ذہانت سے انھیں گرویدہ کر لیا... یہیں سے ان کی سیاسی تعلیم کا آغاز ہوا۔

میرا ارادہ یہاں اختر حسین کی آپ بیتی کا مکمل خاکہ دینے کا نہیں۔ اس کے لیے پڑھنے والے کو اس حیرت ناک کتاب کا خود مطالعہ کرنا پڑے گا۔ مگر 'پڑے گا' شاید صحیح لفظ نہیں کیونکہ یہ اس قسم کی کتابوں میں سے ہے جو خود اپنے آپ کو پڑھواتی ہیں۔ یہ راتوں کی نیند حرام کر دینے والے ایک ناول سے زیادہ دلچسپ داستان ہے، اور اختر سے بہتر اس داستان کو کون بیان کر سکتا ہے؟ جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے یہ آپ بیتی کے ساتھ جگ بیتی اور ان وقتوں کی تاریخی اور تہذیبی دستاویز بھی ہے۔ ان کی زندگی کی کہانی کا سلسلہ ان پر بصیرت، دلچسپ سیاسی اور اخلاقی نوعیت کے تذکروں سے بار بار ٹوٹتا ہے۔ مگر یہ ٹکڑے جگ بیتی میں اس طرح گندھے ہیں کہ اختر حسین نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوتے۔ ان ٹکڑوں سے اس

Scanned with CamScanner

دور کی سیاست کا رنگ صفائی سے اور شوخی سے سامنے آتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ سیاست سے شوق انھیں اپنے والد اکبر حسین سے ورثے میں ملا۔ اخبار میں کام کرنے اور ان موضوعات پر لکھنے سے ان کا اسلوب منجھا اور انھیں حالات کو سوئی کے سے تیکھے فوکس سے دیکھنے اور مجمل روشن نثر میں بیان کرنے کا ملکہ حاصل ہو گیا۔ میرا خیال ہے کہ اخبار میں کام کرنا ایک تخلیقی ادیب کے لیے بڑی اچھی تربیت ہے اور اس سے اس کی اوریجنل صلاحیت کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ ہیمنگوے کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ جو پہلی جنگِ عظیم میں ایک اخبار کا جنگی مراسلہ نگار تھا۔ ہمارے ہاں چراغ حسن حسرت اور ابنِ انشا بنیادی طور پر اخباری لوگ تھے۔

''گردِ راہ'' اس دور کے ادیبوں، سیاسی و دیگر ہستیوں کے مرقعوں کی ایک گیلری بھی ہے۔ دو چار تیکھے رواں جملوں میں وہ اُن جانے پہچانے لوگوں کا ایسا اسکیچ تیار کر دیتے ہیں کہ وہ ذہن میں رچ بس جاتا ہے۔ جب وہ کلکتہ ہندی اخبار میں کام کرتے تھے، ان کی رہائش صدرالدین اسٹریٹ کے ایک چہار منزلہ مکان کے تیسرے طبق پر ایک چھوٹے سے کرائے کے کمرے میں تھی۔ ساتھ کے کرائے کے کمرے میں تین دوست، مظفر حسین شمیم، چراغ حسن حسرت اور سلیم اللہ فہمی براجمان تھے۔ کلکتہ پر سیاست کا سرسام طاری تھا جس نے مالیخولیا کی شکل اختیار کر لی تھی۔ ہر کس و ناکس جھنڈا لے کر جلسہ رچا رہا ہوتا اور فضا نعروں کے شور سے لرزتی رہتی۔ ایک دن انھوں نے چراغ حسن حسرت کو سڑک پر للکارتے ہوئے سنا، ''وہ سامنے ہے حریت کا راستہ، بڑھے چلو بڑھے چلو۔'' حسرت اپنی بڑی بڑی سرخ آنکھوں سے اوپر کسی چیز کو گھورتے اور انگلی سے اوپر اس طرح اشارہ کرتے جیسے حریت نام کی کوئی دوشیزہ منڈیر پر بیٹھی ہو۔

اختر حسین میں بعض لوگوں کی طرح نئی زبان جلد سیکھ لینے کی فطری صلاحیت تھی۔ چند ماہ میں بنگالی پڑھنے، بولنے لگے۔ انھوں نے قاضی نذر الاسلام کی منتخب نظموں کے ترجمے کیے جو ''نگار''، ''ساقی''، ''اردو'' وغیرہ میں شائع ہوتے رہے۔ اس طرح وہ اردو سے قریب آتے گئے، گو ہندی سے ان کا ناتا اصلاً نہ چھوٹا کیونکہ وہ پہلے ہندی کے ادیب تھے اور بعد میں اردو کے ادیب بنے۔ پھر بی اے کے پہلے زینے پر پہنچ کر انھوں نے کلکتہ کو خیرباد کہا اور علی گڑھ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ علی گڑھ جاتے ہی انھوں نے چند دوستوں سے مل کر ''پیام'' کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار نکال ڈالا — وہ اس لیے کہ

Scanned with CamScanner

خوابیدہ علی گڑھ میں بیداری اور آزاد خیالی کی رو دوڑے۔ سر راس مسعود وائس چانسلر تھے۔ انھوں نے اس باغی طالب علم سے آنکھ میچ لی اور ان کے کان نہ اینٹھے۔ اسرار الحق مجاز کا یہاں ان سے یارانہ ہوا۔ مجاز بہت پرانے انداز کی غزل سرائی کرتے تھے۔ اختر حسین اس فرسودہ شاعری سے بیزار تھے، اور ان کے کہنے سے مجاز نے اپنی راہ بدلی اور نظم لکھنے لگے۔ مجاز کی پہلی نظم ''گدڑی کا لال'' کی شانِ نزول یوں ہے: دونوں دوست ریلوے اسٹیشن کو سیر کرنے گئے تو ریل گاڑی کے تیسرے درجے کے ایک ڈبے کے آگے ٹھٹک گئے۔ اس میں ایک نوخیز گوجر حسینہ گلے میں چاندی کا کنٹھا، کانوں میں پیتل کا بالا، پھٹے حالوں اس آن بان سے بیٹھی تھی کہ خوانچے والے تک دم بخود تھے۔ ریل چلی تو گوجر حسینہ نے انھیں نگاہِ غلط انداز سے خدا حافظ کہا اور دونوں دوست اس پر درود وسلام بھیجتے ہوے لوٹے۔ اختر حسین نے اپنے دوست کو اس گدڑی کے لال پر نظم لکھنے کو کہا اور اس کے چند ہفتے بعد مجاز نے انھیں ''رات اور ریل'' کا مسودہ دکھایا۔ س طرح مجاز کی اصل شاعری کا آغاز ہوا۔ مجاز نے ان کی محبت میں (ساغر نظامی نے ان کی دعوت کی تھی) پہلی بار شراب (بیئر) پی۔ چاندنی چٹکی ہوئی تھی، چند بوتلوں کے بعد مجاز عین غین ہو گئے اور اختر حسین اور ساغر مجاز کو یکے میں لاد کر آفتاب ہوسٹل لے آئے۔ اس کے بعد مجاز دخترِ زر کے ہمیشہ کے لیے غلام ہو گئے اور بے تحاشا پینے لگے۔ اختر حسین کو مجاز اور اختر شیرانی دونوں کی شخصیت اور شاعری میں حیرت ناک مماثلت نظر آتی ہے اور انھوں نے ہم عصر شاعروں میں ان دونوں سے زیادہ محروم اور معصوم لوگ نہیں دیکھے۔ علی گڑھ میں ان کے استاد پروفیسر حبیب اور رشید احمد صدیقی تھے جنھوں نے انھیں تاریخ اور کلاسیکی ادب کا صحیح ذوق بخشا اور ان کی شوریدہ سری کو لگام دی۔ اسی زمانے میں ان کا پہلا افسانہ ''زبانِ بے زبانی'' نیاز صاحب کے ''نگار'' میں چھپا۔ ۱۹۳۲ء کی گرما میں کلکتہ میں آغا حشر سے مڈھ بھیڑ ہو گئی۔ بقول ان کے آغا صاحب کے ضلع جگت اور پھکڑپن میں جو ادبی شان تھی، وہ سودا اور انشاء اللہ خاں کے سوا اور کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ خوش گفتاری میں اُن کا ثانی نہ تھا۔ علی گڑھ میں طالب علمی کے دوران یہ اور سبطِ حسن دلی جا پہنچے اور کسی طرح پنڈت جواہر لال نہرو کو علی گڑھ آنے پر راضی کر آئے۔ وائس چانسلر سر راس مسعود کو بعد میں پتا چلا کہ یہ حرکت ہوئی ہے۔ جس طرح انھوں نے پنڈت جی کو اسٹریچی ہال کے دریچے میں سے چھلانگ لگوائی اور عملی طور پر ایک نامعلوم موٹر گاڑی میں 'اغوا' کر کے لے گئے، وہ واقعہ بہت دلچسپ ہے اور پنڈت جی ہمیشہ اسے یاد کر کے ہنسا کرتے تھے۔

Scanned with CamScanner

علامہ اقبال سے وہ ڈاکٹر انصاری کے گھر جا کر ملے اور ان کی خوب سمع خراشی کی۔ وہ بے لطف نہ ہوئے اور بوقتِ رخصت تاکید کی کہ لاہور آؤ تو مجھ سے ملو۔ جب ان کی ملاقات دوبارہ ۱۹۳۶ء میں پانی پت میں ہوئی (جب ان کا مقالہ ''ادب اور زندگی'' علامہ پڑھ چکے تھے) تو کسی نے ان کا تعارف علامہ سے ان الفاظ میں کرایا کہ یہ آپ کی شان میں سخن گسترانہ بات لکھ گئے ہیں۔ علامہ نے شفقت سے کہا، ''ایسے مخلص نوجوانوں کی میں قدر کرتا ہوں۔ بے جان لوگوں کے اتفاق پر جان دار لوگوں کے اختلاف کو ترجیح دیتا ہوں۔'' کچھ کم دو سال کا عرصہ اختر حسین نے حیدر آباد اور اورنگ آباد میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کی نگرانی میں لغت نویسی میں گزارا اور انھوں نے مولوی صاحب صاحب کے شب و روز کا حال جس مزے اور لطف سے لکھا ہے اس کی داد نہیں دی جا سکتی۔ مولوی صاحب کے مکان پر باہر سے آنے والے عالموں اور دانشوروں کی گہما گہمی رہتی تھی اور ان کا دستر خوان وسیع تھا۔ شعرائے کرام ان کی مہمان نوازی سے محروم رہتے تھے کیونکہ عہدِ حاضر کے اردو شعرا میں مولوی صاحب اقبال کے سوا کسی کو جانتے نہ تھے۔ ایک دن ڈاک میں مولوی صاحب کے نام ''نیلی چھتری''، ''بہرام کی گرفتاری'' وغیرہ جاسوسی ناولوں کے مشہور مصنف ظفر عمر کا خط آیا جو پولیس کے اعلیٰ افسر تھے۔ علی گڑھ سے چلتے وقت اختر حسین ان کی صاحبزادی حمیدہ کے خواستگار ہوئے جس پر ظفر عمر بڑے ناراض ہوئے مگر فیصلہ مولوی صاحب پر چھوڑ دیا۔ مولوی صاحب نے انھیں وہ خط دکھایا اور پوچھا، ''کیا تم اس لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہو؟'' اختر حسین کے اقرار کرنے پر مولوی صاحب بولے، ''شادی کی ذمہ داری تم نہیں جانتے، تمھارا تجربہ کیا ہے، عمر کیا ہے؟'' اختر حسین بولے، ''وقت کے ساتھ یہ ذمہ داری اٹھانے کا تجربہ ہو جائے گا۔ آپ کو میری ثابت قدمی پر بھروسا ہے تو سفارش کر دیجیے۔'' مولوی صاحب کی سفارش پر ان کا گھر آباد ہو گیا اور جب تک ان کی بیوی حیدر آباد میں رہیں، مولوی صاحب نے ان سے بیٹی کا سا سلوک کیا۔ اس قصے کے آخر میں اختر حسین نے ایک خوبصورت جملہ لکھا ہے:

> حمیدہ میری رفیقۂ حیات ہیں اور گو میں تا عمر پتنگ کی طرح دور دور اڑتا رہا لیکن انھوں نے نہ ڈور چھوڑی، نہ پتنگ کٹنے دی۔

حیدر آباد میں وہ اس حیرت ناک خاتون مسز سروجنی نائیڈو کے دولت کدے پر بھی آنے جانے لگے۔ مسز نائیڈو کے بڑے صاحبزادے ڈاکٹر جیسوریہ سے، جنھیں سب بابا کہتے تھے، ان کی خوب دوستی ہو گئی

Scanned with CamScanner

اور بابا نے انھیں مغربی موسیقی کی لذت سے آشنا کیا۔ اس وقت تک وہ موسیقی کے کوچے میں نہ آئے تھے۔ بابا غیر مقلد اشتراکی تھے اور حیوانوں کے عاشق۔ ان کے چھوٹے فلیٹ میں چرند پرند امن و آشتی سے رہتے تھے۔ یہی شوق مولوی عبدالحق کو تھا۔ حیدرآباد میں وہ باغ عامہ جاکر ایک شیرنی کے دو نوزائیدہ بچوں کے ساتھ کھیلتے تھے۔ مولوی صاحب کہتے تھے کہ جب وہ اورنگ آباد میں نگرانِ تعلیم تھے، انھوں نے ایک السیشین کتا پالا تھا جس سے انھیں بڑا انس تھا۔ ایک بار ایک شکاری جنگل سے ننھی سی شیرنی پکڑ لایا اور مولوی صاحب کو دے گیا۔ جب شیرنی بڑی ہوگئی تو مولوی صاحب کو بھی اس سے لگاؤ ہو گیا۔ مگر شیرنی کو السیشین کتا زہر لگتا تھا اور کتے کو بھی شیرنی کی صورت اور وضع قطع سے نفرت تھی۔ مولوی صاحب نے اپنے دونوں محبوب حیوانوں میں صلح کرانے کے سب جتن کیے مگر وہ نہ مانے۔ ایک دن موت السیشین کو شیرنی کے پنجرے کے قریب لے گئی۔ (پہلے وہ اکثر پنجرے سے کچھ دور کھڑے ہو کر شیرنی کو گھر کا کرتا تھا۔) شیرنی نے پنجے سے اس کی گردن کو پکڑ اس طرح مروڑا کہ کتا مر گیا۔ مولوی صاحب کو اتنا افسوس ہوا کہ انھوں نے پھر جانور نہ پالنے کا عہد کیا۔ مولوی صاحب کی پیرانہ سالی پر طفلانہ معصومیت کا پرتو باقی رہا اور وہ اصلاً بھولے بھالے آدمی تھے۔ ایک دن اختر حسین قاضی عبدالغفار سے ایک کتیا مانگ لائے جس کے نرم نرم سفید، کالے اور گھنگریالے بال تھے اور آنکھیں مہر و وفا میں تیرتی تھیں۔ مولوی صاحب نے اسے پال لیا اور اختر حسین کے پُرزور احتجاج کے باوجود نازی اس کا نام رکھ دیا۔ اختر حسین نے سوچا میں کیوں پیچھے رہوں، وہ بھی مسز سروجنی نائیڈو کے ہاں سے ایک کالا کلوٹا بلونگڑا اٹھا لائے کیونکہ مسز نائیڈو نے انھیں یقین دلایا تھا کہ ان کی حسین و جمیل سیامی بلی کا فرزند ہے۔ اختر حسین نے مولوی صاحب کے مشورے کے بغیر اس بدصورت بلونگڑے کا نام 'لاما' رکھ دیا۔ نازی اور لاما کے دل کبھی ایک دوسرے کی طرف مائل نہ ہوئے۔ بعد میں لاما گھر سے ناراض ہو کر چلا گیا اور آوارہ بلوں کی ایک ٹولی کا مکھیا بن گیا۔ مولوی صاحب نے ایک دفعہ ہرن بھی پالے۔ جب کام کرتے کرتے تھک جاتے تو کتب خانے کے برآمدے میں کھڑے دیر تک ان وحشیوں کو تکتے رہتے اور میر کا یہ شعر پڑھتے:

دور بہت بھاگو ہو ہم سے سیکھ طریق غزالوں کا
وحشت کرنا شیوہ ہے کیا اچھی آنکھوں والوں کا

Scanned with CamScanner

کتاب میں ایسے قصے جگہ جگہ جواہر کی طرح ٹنکے ہوئے ہیں جنھیں پڑھ کر جی شاد ہوتا ہے اور دل نہیں بھرتا۔ اختر حسین کو یہ گزری ہوئی باتیں اتنی اچھی طرح یاد ہیں جیسے وہ کل کی باتیں ہوں۔ ان کا حافظہ بلا کا حافظہ ہے۔

اُن کی زندگی کی کہانی جاری رہتی ہے۔ ۱۹۳۷ء میں وہ ڈاکٹریٹ کرنے کی خاطر اپنی حوصلہ مند شریکِ حیات حمیدہ کے ہمراہ یورپ کا پہلا سفر کرتے ہیں۔ اس غرض کے لیے وہ انگلستان نہیں جاتے کیونکہ انگریز کی محکومی کا انھیں اتنا احساس ہے کہ اس کے ملک میں رہنا تک انھیں گوارا نہیں۔ وہ پیرس جاتے ہیں کیونکہ فرانس کی فضا آزاد ہے، اور اس غریب پرور شہر کے لیٹن کوارٹر کے ایک ہوٹل میں کرائے پر رہتے ہیں، جیسے ان سے پہلے ارنسٹ ہیمنگوے وہاں رہا کرتے تھے۔ وہ پیرس کے جادو تلے آجاتے ہیں۔ یہاں امتیاز اور برجیش سنگھ، جنھوں نے آگے چل کر اسٹالن کی بیٹی سویتلانا سے بیاہ رچایا، ان کی زندگی میں آئے۔ (برجیش سنگھ جو پکے اشتراکی تھے، اپنی رندمشربی اور شب باشی کے باوجود ماسکو میں جا مرے اور سویتلانا ان کی راکھ ہندوستان لے کر آئی۔) وہ یہاں ہمت سنگھ، فیروز گاندھی اور جلاوطن ترکی ادیبہ خالدہ ادیب خانم سے بھی ملتے رہے۔ فرانسیسی میں وہ چند ماہ میں رواں ہو گئے اور جب زبان کے وسیلے سے ان کی فرانسیسی ادب تک رسائی ہوئی تو ان کی سمجھ میں آیا کہ فرانسیسی نثر اتنی بے ہمتا اور مکمل کیوں ہے۔ پیرس کے قیام کے دوران سب سے مسرور کرنے والا واقعہ انڈین ایسوی ایشن کے زیرِ اہتمام (جس کے یہ صدر تھے) یونیورسٹی یونین میں ایک مدراسی کا رقص ہے۔ مدراسی نے خود کو ماہرِ رقص بتایا اور جب وہ کشن جی مہاراج کی سج بنائے اور کمر کے نیچے دھوتی لٹکائے اسٹیج پر وارد ہوا تو ہجوم نے داد و تحسین کے ڈونگرے برسائے۔ جب اس نے ساز کی گت پر ٹھوکر لگا کر جھونکا بھرا تو دھوتی پاؤں کے انگوٹھے میں پھنس کر کھل گئی اور وہ سرِ عام ننگا کھڑا تھا۔ ایک لمحے کے لیے تو پیرس کے تماشائی سناٹے میں آگئے مگر مدراسی نے ننگ دھڑنگ وہ اچھل کود کی کہ سب عش عش کر اٹھے۔ اس کے اسٹیج سے رخصت ہو جانے کے بعد اختر حسین نے اسٹیج پر آکر تماشائیوں سے وضاحت کی کہ یہ رقص اس عاشقِ مہجور کی کیفیت بیان کرتا ہے جو ہماری آب و ہوا میں کوچۂ یار میں چاک دامن ہو کر ناچتا پھرتا ہے۔ وہ فرانس کی ایک خفیہ تنظیم کے رکن الفانسو دی فکیر یڈ (جوان کا دوست تھا) کی محبت میں کئی نامور لوگوں سے بھی ملے جن میں یگانۂ روزگار پابلو پکاسو، پابلو نیرودا اور کرنل وائڈ مین (جو ایک حیران کن جرمن حریت پسند تھے)

سے بھی ملے۔ سر عبدالقادر اور حفیظ بھی پیرس آئے۔ پیرس کے قیام میں انھوں نے انگریزی اخبار نویسی بھی کی۔ یورپ سے واپسی کے بعد وہ احمد شاہ بخاری کے کہنے پر آل انڈیا ریڈیو میں ملازم ہوئے۔ ن م راشد، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو اور دوسرے لوگ اسٹیشن کے کارپرداز تھے، مگر یہ تذکرے آپ مصنف کی زبانی ہی سنیں تو مزہ آئے گا۔

اس آپ بیتی کو پڑھ کر ایک ایسے تیز پسند، شوریدہ سر، حوصلہ مند، جمالیات کے عاشق شخص کی تصویر سامنے آتی ہے جس نے کبھی زندگی سے ہار نہیں مانی، جس نے زندگی اور انسانوں سے محبت کی ہے، جو گہرا تہذیبی اور سیاسی اور ادبی شعور رکھتا ہے اور شگفتہ اور جان دار نثر میں اپنے مشاہدات اور تاثرات بیان کرنے کا سلیقہ بھی۔ ان کو زبان پر قدرتِ کاملہ حاصل ہے اور جس مضمون کا بیان مقصود ہو، اُسے بے تکان اور بے تکلف کاغذ پر پرو دیتے ہیں۔ جاہلیت، کور ذوقی اور استبداد سے انھیں نفرت ہے اور تیسری دنیا کے تیسرے درجے کے دل و دماغ رکھنے والے بندوقچی آمروں پر جو اپنے تخت کے تحفظ کے لیے پوری قوم اور ملک کی تذلیل کرتے ہیں، ان کا خون کھولتا ہے۔ وہ انسانیت کے مستقبل سے مایوس نہیں اور ان کے نزدیک وہ وقت دور نہیں جب تاریخ کا سیلِ رواں رجعت پسند طاقتوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جائے گا اور ایک جگہ انھوں نے اپنے نظریۂ حیات کو چند سطروں میں یوں سمیٹا ہے:

> جب میں اپنی زندگی کے سود و زیاں کا حساب کرتا ہوں تو اس میں مجھے نام و نمود، جاہ و منصب کا شائبہ نہیں ملتا، البتہ دنیا کے بڑے بڑے مفکروں، ادیبوں، شاعروں کے مطالعے سے جو فیض اٹھایا ہے، وہ حاصلِ حیات ہے۔ اس طرح ان آوازوں کی یاد جو مغنیوں کی گلوکاری یا پردۂ ساز سے یا کسی پرندے کی کوک یا پہاڑی جھرنے کی گنگناہٹ میں سنی، اب تک کانوں میں گونج رہی ہے۔

سچ پوچھئے وہ ورڈز ورتھ کی طرح فطرت (نیچر) اور مہم جوئیوں کے عاشق ہیں۔ ۱۹۴۲ء میں آل انڈیا ریڈیو سے چھٹکارا ہوا تو چترال اور کافرستان جا بھاگے (اس زمانے میں چترال کے دور دراز اور دشوار گذار حصے میں کوئی نہیں جاتا تھا)۔ اس مہم جوئی نے ان کی کہانی ''کافرستان کی شہزادی'' کا مواد دیا۔ وہ طبعاً ایک رومینٹک ہیں۔ کشمیر کی وادی اور پہاڑیوں کی دشت نوردی کی۔ زوجی لا کے درّے سے گزر کر سولہ ہزار فٹ اونچے کولاہائی گلیشیر کے دامن میں خیمہ زن ہوئے، لیکن راتوں رات برف کا ایسا طوفان آیا کہ گلیشیر کی چوٹی سر نہ کر پائے۔ تین ہفتے کے پیدل سفر کے بعد سری نگر میں نواب جعفر علی خاں اثر کی کوٹھی

Scanned with CamScanner

پروار ہوے تو حلیہ ایسا بگڑا ہوا تھا کہ ان کے ملازموں کو ان فقیروں کو پہچاننے میں دشواری ہوئی۔ (اثر ریاست کشمیر میں وزیر تھے اور بقول مصنف کے آنے والے والوں کو اس اطمینان سے اپنا کلام سناتے تھے کہ دیر تک اردو شاعری سے دل اُچٹ جاتا تھا۔) بلاشبہ اس آپ بیتی کے آخری ابواب انھیں جہانیاں جہاں گشت کے روپ میں دکھاتے ہیں اور یونیسکو میں تقرری کے بعد انھوں نے جی بھر کر سیرِ عالم کی۔ دو سال صومالیہ افریقہ میں رہے اور افریقہ نے ان پر جادو کر دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ مغرب کی زندگی نظر کو فوراً خیرہ کرتی ہے مگر وقت کے ساتھ ساتھ چمک ماند پڑتی جاتی ہے۔ افریقہ کی کشش دیر میں محسوس ہوتی ہے اور دیر تک باقی رہتی ہے۔ صومالی لوگ انھیں پسند آئے۔ مہم جوئی تو ان کے خون میں تھی۔ کس مایو کی چھوٹی بندرگاہ سے بادبانی کشتی میں وحشی جانوروں کے دیدار سے آف موگو نامی سنسان جزیروں کی طرف روانہ ہو گئے اور پانچ دن تک کھلے سمندر میں تھپیڑے کھاتے رہے... پھر ایران میں چار سال رہے۔ شاہی خاندان کے افراد کی فرعونیت اور خفیہ پولیس 'ساواک' ہر جگہ موجود۔ انھیں اپنی خوش وقتی اور آسودگی کے باوجود اکثر روحانی اور ذہنی خلا محسوس ہوا، کیونکہ شاہ کا ایران ایک وسیع زنداں تھا۔ یہاں بھی انھوں نے ایک خفیہ انقلابی تنظیم کے ایک مفرور انقلابی کو تین دن اپنے گھر میں چھپائے رکھا... فلسطین بھی گئے اور اسرائیلی پایۂ تخت تل ابیب میں بھی رہے جہاں ہوٹل میں کمرے کا کرایہ تیس ڈالر تھا۔ جملہ آسائشوں کے علاوہ دیوار میں خفیہ مائیکروفون بھی نصب تھا... اسپین میں ایک ماہ گزارا۔ بارسلونا میں ایک قہوہ خانے کے مالک سے دوستی ہو گئی۔ وہاں کلیسا کے مظالم کا ذکر ہوا تو ایک عمر رسیدہ شخص بول اٹھا کہ کلیسا نے بے شک بڑے ظلم ڈھائے لیکن آج جنرل فرانکو کی حکومت میں کیا تشدد کم ہے۔ اس شخص نے مصنف سے مخاطب ہو کر کہا، ''میں بھی یونیورسٹی کا پروفیسر تھا لیکن آمریت کی مخالفت کی پاداش میں نہ صرف ملازمت سے برطرف ہوا بلکہ قید و بند کی سختیاں بھی جھیلیں اور اب اس قہوہ خانے کے سوا میرے لیے کوئی جائے پناہ نہیں۔'' پھر ایک تلخ قہقہہ لگا کر اس نے کہا، ''کیا ستم ظریفی ہے کہ چوکیدار گھر پر یہ کہہ کر قبضہ کر لے کہ اہلِ خانہ اس قابل نہیں کہ انتظام سنبھال سکیں...'' وہ اطالیہ بھی گئے۔ یہاں انھیں وائلن سیکھنے کا شوق ہوا۔ میلان کے ایک پرانے ہم جماعت برٹو نے انھیں اپنے ایک رشتے دار کی دکان سے ایک پرانا وائلن دلا دیا۔ یہ ''اسٹراویڈیس'' مارکے کا وائلن تھا جس کی قیمت آج کئی ہزار ڈالر ہے... وہ امریکہ بھی گئے۔ وہاں انھوں نے کئی خوش حال امریکیوں سے پوچھا کہ کیا وہ زندگی سے

خوش ہیں تو جواب ملا، ”خوشی ایسی کیفیت ہے جس سے ہم آشنا نہیں۔ البتہ ہم آرام سے رہتے ہیں کیونکہ آرام کا سامان بازار سے خریدا جاسکتا ہے۔“ جاپان میں یہ ایک شناسا کے ہاں دعوت کھانے گئے۔ جب جوتے اتار کر اندر داخل ہوئے تو ملازمہ 'کیمونو' پہنانے آئی۔ یہ اسے سوٹ پر ڈالنے لگے تو ہنس کر کہنے لگی، یہ برہنہ جسم پر اوڑھا جاتا ہے۔ وہ ان کو بے لباس کر کے کیمونو پہنانے پر مصر تھی۔ کولمبو میں وہ ”بریو نیو ورلڈ“ کے مصنف آلڈس ہکسلے سے ملے۔ نیپال اور برما بھی ہو آئے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اپنے سفروں کی اُن کی یہ یادیں کتنی دل آویز اور خوبصورت ہیں۔ کاش وہ ہر اس ملک کا ایک مکمل سفرنامہ لکھ سکیں جہاں وہ گئے، کیونکہ ان کی سی آنکھ اور اُن کا سا قلم اور کوئی کہاں سے لائے گا۔ اُن کی بچے کی سی حیرت ابھی تک تازہ ہے اور ان کا تاریخی شعور ان سفروں کو بھرپور اور اعلیٰ رپورتاژ (reportage) بنا دیتا ہے۔

آپ بیتی کے آخری تین ابواب کے عنوانات یہ ہیں، ”ادب کا ماضی و حال“، ”حسن کی تلاش“ اور ”حقیقت کی تلاش“۔ وہ عالمانہ اور فکر انگیز 'ایسے' یا انشائیے ہیں، بڑے ادراکی اور پڑھے جانے کے لائق۔ وہ کہتے ہیں کہ انھوں نے ہمیشہ حسنِ بے پروا کو حسنِ خود آرا سے زیادہ دل آویز پایا اور ان کو جلوہ گاہوں کے حسن میں وہ تابانی نظر نہیں آئی جو کوہ و صحرا میں ان کی نظروں کو خیرہ کر گئی۔ وہ دماغ اور عقل کی رسائی کے قائل ہیں اور ان کی رائے میں انسانیت کی تعمیر و تخریب کی ذمے داری خود انسان پر عائد ہوتی ہے اور انسان ہی اپنا سب سے بڑا دوست اور اپنا سب سے بڑا دشمن ہے۔ جمہوریت ہی وہ قابلِ عمل طریقۂ کار ہے جو فرد اور جمعیت کے مفاد میں توازن پیدا کر سکتا ہے... قدرت نے جب اس کرۂ ارض کی تشکیل کی تو بظاہر اس کا منشا نہ تھا کہ اسے صدہا چھوٹے بڑے ملکوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ لیکن تاریخ انسانی کا سب سے بڑا المیہ قومی تعصب اور وطن پرستی کا وہ جذبہ ہے جو انسانیت پر مہیب آسیب کی طرح سایہ فگن ہے۔ پیغمبروں اور مفکروں نے انسان کو جن عداوتوں اور نفرتوں سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی، وہ نسل، رنگ اور زبان کا پرچم اٹھائے ہر طرف ان آدرشوں کو پامال کر رہی ہیں۔

مشہور ڈاکٹر سیموئیل جانسن نے جب یہ کہا تھا کہ وطن پرستی ایک بدمعاش کی آخری پناہ گاہ ہے، تو اس نے بھی کم و بیش وہی بات کہی جو اختر حسین نے کہی ہے۔ حرفِ آخر میں وہ امیرِ اندلس عبدالرحمٰن ثالث کے وزیر المنصور کے متعلق ایک حکایت نقل کرتے ہیں کہ جب وہ کسی مہم سے لوٹتا تو اپنی قبا کی گرد کو کوزے میں جھٹک دیتا۔ جب مہم جوئی ختم ہوئی اور اس نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا تو کوزے کی خاک

Scanned with CamScanner

اس کے کفن پر چھڑک دی گئی۔ اختر حسین پھر کہتے ہیں، ''میں اتنی گرد کہاں سے لاؤں لیکن بساط میں جو باقی رہ گئی اسے ان اوراق پر جھٹک دیا ہے۔''

اختر حسین کی اس روحانی اور ذہنی سفر کی کہانی اس شعر پر ختم ہوتی ہے:

کفن بیار تو تابوت و جامہ نیلی کن
کہ روزگار طبیب است و عافیت بیمار

اپنی اس حیران کن آپ بیتی میں اختر حسین نے بہت سی باتیں کہہ دی ہیں، مگر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بہت سی باتیں انھوں نے نہیں کہیں۔ شاید اس لیے کہ فن بات کہنے میں نہیں بلکہ اسے اَن کہا چھوڑ دینے میں ہے یا شاید وہ باتیں ہمارے تہذیبی اور ثقافتی ماحول میں کہی ہی نہ جا سکتی تھیں۔ ہم ان خالی خانوں کو خود پُر کر سکتے ہیں...

(ماہنامہ افکار، کراچی)

رئیس امروہوی (فن اور شخصیت)

مرتب: صہبا لکھنوی

یہ بائیس ستمبر انیس سو اٹھاسی کی ایک سہ پہر ہے۔ ایک لاغر اندام، لمبے قد کا آدمی گارڈن ایسٹ کے مکان کی اسٹڈی میں اپنی میز پر جھکا کچھ لکھنے میں منہمک ہے۔ اونچی چھت والے ایک کمرے میں قدرے جھٹپٹا سا ہے کیونکہ بجلی کے واحد سو واٹ کے بلب کی روشنی اتنے بڑے کمرے کو پوری طرح روشن کرنے کے لیے کافی نہیں۔ کراچی کی گرمیاں اس مہینے میں اپنا زور دکھاتی ہیں اور میز کے اوپر کمرے کے وسط میں لٹکا چھت کا پرانا پنکھا، جسے ایک مدت سے گریس (grease) نہیں کیا گیا، کلکا کلیک، کلکا کلیک کی آواز دیتا آہستہ آہستہ گھوم رہا ہے — بہت تھوڑی ہوا دیتا ہوا۔ اس آدمی کے کچے انڈے کی زردی کی رنگت والے چہرے پر شکنیں ہیں اور پہلی نظر میں وہ کسی طلسماتی داستان کے صفحات میں سے نکلے ہوئے فسوں گر کا تاثر دیتا ہے جسے حیات و موت کے سارے رموز معلوم ہیں۔ مگر وہ فسوں گر نہیں۔

Scanned with CamScanner

وہ پیشے کے لحاظ سے ایک رائٹر ہے اور اس نے اپنی زندگی کے پچھلے ساٹھ ایک برس سے لکھنے کے سوا اور کوئی کام نہیں کیا۔ اس نے بلا مبالغہ لاکھوں اشعار کہے ہیں اور رواں دواں نثر کے ہزاروں فل اسکیپ صفحات۔ اس کی چالیس سے اوپر تصانیف کتابی صورت میں چھپ چکی ہیں۔ جو کچھ چھپا ہے اس کا دسواں حصہ بھی نہیں جو اس نے لکھا ہے۔ اُسے لکھنے میں، جو اس کے لیے اتنا ہی فطری ہے جیسے دوسروں کے لیے سونا جاگنا، کوئی دقت نہیں ہوتی۔ الفاظ اس کے قلم سے بہتے آتے ہیں — وہ خوش نصیبوں میں سے ایک ہے۔ یہ حیران کن شخص اپنی آنکھیں کاغذ سے چپکائے کیا لکھ رہا ہے؟ یہ اس کی اپنی سرگزشت ہے۔ جلد ہی بعض لوگ اس کی ادبی عظمت کو خراجِ عقیدت ادا کرنے کی خاطر ابوظہبی میں ایک جشن منانے کا اہتمام کر رہے ہیں اور وہ اس میں سے بعض ٹکڑے اس جشن میں پڑھے گا۔ سرگزشت جشن کے موقعے پر شائع ہونے والی کتاب میں چھپے گی جس کی ترتیب وطباعت کے ذمے داری "افکار" کے انتھک مدیر صہبا لکھنوی کو سونپ دی گئی تھی۔ لکھنے کے دوران وقتاً فوقتاً ایک مسکراہٹ سی اس کے ہونٹوں پر نمودار ہو جاتی ہے۔ ایک دو بار وہ گنگنا بھی ہے۔ وہ اپنی جوانی کے مزے دار ایام دوبارہ جی رہا ہے۔ جب وہ اس طرح اپنے ماضی میں ڈوبا ہوا ہے تو اَدھ کھلے دروازے میں کھٹ کھٹ سی ہوتی ہے، جیسے کوئی اندر داخل ہوا ہو۔ وہ کوئی توجہ نہیں دیتا اور اپنے کام میں مگن، سر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ پھر ایک گولی کی آواز آتی ہے... پھر ایک اور گولی کی... میز پر پڑے کاغذ کے ساتھ آنکھ چپکائے وہ آدمی ایک لحظے کے لیے اُبھرتا سا ہے اور پھر کرسی میں سے پھسل کر نیچے فرش پر خون کی ایک تلیا میں ڈھیر ہو جاتا ہے، کیونکہ سر کے زخم سے ابلنے والا خون تھمتا نہیں جاتا... اسے کچھ پتا نہیں کہ کیا ہوا ہے، اسے شدید درد کا احساس نہیں ہوتا۔ رفتہ رفتہ زندگی اس کے نحیف وخستہ بدن سے باہر ٹپکتی جاتی ہے۔ اسے ایک اندھیرے کنویں میں نیچے، اور نیچے جانے کا احساس ہوتا ہے اور وہ پروا نہیں کرتا۔ یہ احساس کربناک نہیں بلکہ کچھ راحت پرور ہے — کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس وقت وہ کیا سوچ رہا تھا۔ جیسا کہ لوگ کہتے ہیں، کیا مرتے وقت اس کا سارا ماضی اس کے ذہن میں سے ایک بھبھوکے کے مانند گزر گیا؟

انھوں نے کوئی آدھ گھنٹے بعد خون آلود جسم کو کرسی کے پایوں کے پاس تہہ در تہہ لپٹی ہوئی گٹھری کی شکل میں پڑا ہوا پایا۔ ابھی اصل موت واقع نہیں ہوئی تھی۔ زندگی کی رمق ابھی باقی تھی۔ لوگوں کے پکارنے پر اس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ ایک بار اس کے ہونٹ ہلے... اور سرگوشی سی میں "پنکھا،

پنکھا،'' کے الفاظ سنے گئے — شاید وہ سمجھ رہا تھا کہ چھت کا پنکھا اوپر سے گر کر اس کو لگا ہے۔ وہ اسے ایمبولینس میں عباسی شہید ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں لے گئے جہاں ڈاکٹر نے اس کی زندگی بچانے کی کوشش کی مگر وہ کچھ نہ کر سکا۔ وہ آدمی مر گیا اور رات کو ملک کے مبہوت شہریوں نے ٹیلی وژن کی خبروں میں سنا کہ وہ ایک حادثے میں جاں بحق ہو گیا ہے، اور یہ کہا گیا کہ وہ اپنی دیوار گیر الماریوں میں سے کوئی کتاب ڈھونڈ رہا تھا کہ بجلی کا گھومتا ہوا پنکھا اس کے سر کو لگا! قاتل کی گولی کا کوئی ذکر نہ تھا۔

اس آدمی کا ماں باپ کا رکھا ہوا نام محمد مہدی تھا اور اس کے لڑکپن اور جوانی میں سب اسے پیار سے اچھن میاں بلاتے تھے۔ بہت کم لوگ اس کا یہ نام جانتے تھے اور وہ ملک کے طول و عرض میں رئیس امروہوی کے نام سے مشہور تھا۔ صہبا لکھنوی کی مرتب کی ہوئی یہ کتاب اسی، کئی لحاظ سے حیران کن آدمی کی زندگی، شخصیت اور شاعری کے بارے میں ہے، عجلت اور عدیم الفرصتی میں ترتیب دیے جانے کے باوجود اسی معیار کی حامل جس کا ہم ''ارمغانِ مجنوں'' اور ''مجاز ایک آہنگ'' کے مرتب سے توقع رکھتے ہیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ کوئی اس طرح کا کام صہبا سے بہتر نہیں کر سکتا۔ ''ارمغانِ رئیس'' کے نام سے اصل کتاب اگلے سال ماہِ جنوری میں ہونے والے ''جشنِ رئیس'' کے انعقاد سے پہلے طبع ہو جانی تھی اور صہبا نے اس کے لیے تقریباً سب کام مکمل کر لیا تھا کہ رئیس چل بسا۔ ''ارمغان'' کی تجویز بیچ میں رہ گئی۔ رئیس میموریل ٹرسٹ اکیڈمی کی خواہش کے مطابق کتاب کا سارا نقشہ یکسر بدلنا پڑا اور کتاب ایک تہنیت نامے کی بجائے جانے والے کا نوحہ بن گئی۔ فراہم کردہ مواد کو از سرِ نو مرتب کیا گیا اور مرحوم کے دوستوں، مداحوں اور متعلقین سے نئے مضامین لکھوائے گئے۔ یہ کوئی آسان کام نہ تھا، مگر صہبا ان لوگوں میں سے نہیں جو حوصلہ ہار جاتے ہیں۔ آخر یہ کتاب نئے نام اور ایک نئے روپ میں چھپ کر سامنے آ گئی۔

اور کتنی دلچسپ ہے یہ کتاب اور کتنے دلچسپ آدمی کے بارے میں! ایک آدمی جو محض نظم اور نثر کا ایک انتھک ادیب ہی نہیں تھا بلکہ اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ تھا۔ یوگی اور نفس پرور، عارف اور ڈھکوسلے باز، درویش بے نوا اور جاہ و جلال پر جان دینے والا، لکھ لٹاؤ اور انتہائی کنجوس... اس یادگاری کتاب کا آغاز ''گفتنی ناگفتنی'' کے عنوان سے صہبا لکھنوی کی تمہید سے ہوتا ہے۔ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ کیونکر اس کام کی داغ بیل پڑی اور اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کیا کیا دقتیں پیش آئیں۔ پھر تیس کے لگ بھگ فوٹو تصویروں کا البم ہے جن میں رئیس اپنی عمر کی مختلف منازل میں اپنے دوستوں،

Scanned with CamScanner

ادیبوں یا اہلِ خاندان کے ساتھ کھڑا اور بیٹھا نظر آتا ہے۔ بیشتر تصویریں کسی تقریب، مشاعرے یا محفل میں کھینچی ہوئی ہیں ـــــ ڈھلتی عمر کے دور کی جب وہ اپنے ملک کا ایک واجب التعظیم ادبی گرو بن چکا تھا۔ ان میں وہ ایک کچھ کچھ شرمیلا، حساس چہرے والا اور نزار و خمیدہ شخص لگتا ہے جو شاید تصویر کھنچوانے کا زیادہ شائق نہ تھا۔ البم کے بعد صہبا لکھنوی کا لکھا ہوا محمد مہدی عرف اچھن میاں کا تفصیلی بایوڈیٹا ہے جو من وعن اس آدمی کی ایف آئی اے کی فائل میں نتھی ہو سکتا ہے۔ اسے پڑھنے سے ایک نظر میں اس کی زندگی کے سارے اہم احوال اور موڑ ہمارے سامنے آجاتے ہیں ـــــ امروہے میں ۱۲ ستمبر ۱۹۱۴ء کے روز علامہ شفیق حسن ایلیا کے ہاں اس کی پیدائش، گھر کے مکتب ہی میں تعلیم و تربیت (اس نے اسکول یا کالج کا منھ کبھی نہ دیکھا)، سولہ برس کی عمر میں ہی ادبی زندگی کا آغاز اور اس کے شاعرانہ کلام کا لکھنؤ اور امروہہ کے روزناموں اور رسائل میں چھپنا، بیس برس کی عمر میں اپنی چچازاد زینب سے شادی جس سے پانچ بیٹیاں پیدا ہوئیں، انیس سو سینتالیس میں جب وہ تینتیس برس کا نوجوان تھا، کراچی میں آمد، یہاں آکر صحافتی اور ادبی سرگرمیاں، شوق و اشغال وغیرہ۔ آخر میں اس کی مطبوعہ کتابوں کی فہرست ہے۔ کوئی درجن کے قریب شعری مجموعے اور بے حساب نثری تصانیف اور کتابچے۔

آگے ایک طویل سیکشن پیغامات اور تاثرات، تبصروں اور تذکروں کا ہے جس میں ملک کی مقتدر ادبی شخصیات نے اس کی فنی عظمت کو تسلیم کیا ہے۔ (جوش اور فیض بھی اس کی قادرالکلامی کے قائل تھے۔) چیئرمین پیپلز پارٹی ذوالفقار علی بھٹو کے ایک خط سے اقتباس دیکھ کر میں حیران ہوا۔ انھوں نے اپنے خط میں رئیس کے قطعات کی داد دی ہے اور خط غالباً ان کے سیکرٹری کا لکھا ہوا ہوگا۔ اسی طرح، ایک لمبا پیغام رئیس کی شاعری کی تحسین میں کمشنر آف انکم ٹیکس کراچی کا ہے جس میں وہ رئیس کے رزمیہ ترانوں، جذبۂ حب الوطنی اور علمِ نفسیات پر عبور کی ستائش کرتے ہوئے ہمیں اطلاع دیتے ہیں کہ "ہمارے صدرِ مملکت نے بھی شعرا کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے انھیں انکم ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دے دیا ہے۔" میں نہیں جانتا کہ وہ کون سے صدرِ مملکت تھے جنھوں نے شاعروں کی حالتِ زار دیکھتے ہوئے ان پر یہ کرم فرمائی کی، کیونکہ پیغام کے نیچے کوئی تاریخ درج نہیں۔ لیکن اگر یہ سچ ہے اور سب شاعر انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں تو یہ ان کے لیے بھی ایک اچھی خبر ہے! قدرتاً یہ سب پیغامات اور تاثرات تعریفی اور ستائشی ہیں کہ یہ دستور زمانہ ہے صرف خواجہ شہاب الدین نے پہلے جشنِ رئیس منانے والے منتظمین کے نام ایک

Scanned with CamScanner

پیغام میں اس رسم سے انحراف کیا ہے اور رئیس صاحب کو یہ مشورہ دیا ہے کہ اگر وہ مابعدالطبیعیاتی قصے کہانیوں کی بجائے اس دنیاوی زندگی کے مسائل پر قلم اٹھائیں تو بہتر ہوگا۔

اگلے سیکشن میں رئیس کے فکروفن پر بہت سے مضامین ہیں۔ چند لکھنے والے: سید ذہین شاہ تاجی، پروفیسر شور علیگ، ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی، محمد علی صدیقی، حمایت علی شاعر۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ مضامین اور مقالے قابلِ قدر اور دلچسپ نہیں یا یہ ناقدانہ بصیرت سے نہیں لکھے گئے؛ لکھنے والوں نے ان کو بھرپور اور مستند بنانے میں پوری محنت صرف کی ہے، تقریباً سب میں رئیس کی شاعری اور شعر کی تعریفوں کے پل باندھے گئے ہیں اور جا بجا superlatives کا استعمال کیا گیا ہے — ''قادرالکلام''، ''برصغیر کا مشخص فنکار''، ''قلمروے سخن کے فرمانروا''، ''اپنے عہد کا سب سے بڑا شاعر''۔ رئیس کی ادبی اچیومنٹ کو پرکھتے ہوئے ناقدانہ انصاف کو ایک طرف رکھ دیا گیا ہے، اور یہ نہیں ہونا چاہیے۔ ابوالخیر کشفی کا مضمون البتہ مجھے متوازن لگا۔ انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ میں نے رئیس امروہوی سے یہ بات کئی بار عرض کی کہ رئیس صاحب! اگر آپ کم قادرالکلام ہوتے تو زیادہ بہتر شاعر ہوتے۔ وہ مسکرا کر رہ گئے۔

میرے لیے کتاب کا اگلا سیکشن، جو رئیس کی خودنوشت سوانحی تحریروں اور انٹرویوز پر مشتمل ہے، سب سے زیادہ دلچسپی کا حامل بنا۔ ان کے پڑھنے سے کئی راز افشا ہوئے ہیں اور انگریزی ضرب المثل کے مطابق بلا تھیلے سے باہر آ گیا۔ یہ آدمی سناب، چھچھورا اور خود پرست نہیں تھا اور نہ ہی مذہبی جنونی اور ریاکار۔ وہ اپنے بارے میں سچا اور کھرا ہے اور اگر کبھی بھی اس کی باتوں میں ڈینگ کا لہجہ آ جاتا ہے تو ہم میں سے کون شخص اس فطری کمزوری سے مبرا ہے اور اپنے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر اپنا قد اونچا نہیں کرتا؟ اس سیکشن کے آغاز میں سید صمد حسین رضوی کا دلچسپ مضمون ''رئیس کا زائچہ'' ہے۔ رئیس عجیب طور سے عقلیت پسندی اور اوہام پرستی کا مرکب تھا اور زائچوں، جنم پتریوں، بھوت پریت، ہپناٹزم اور سارے روحانی ممبو جمبو میں اعتقاد رکھتا تھا۔ اس مضمون میں رئیس کے مشہور منجم اور ستارہ شناس سید صمد حسین رضوی کے نام دو خط ہیں۔ دوسرے خط میں منجم کی درخواست پر رئیس نے اپنی زندگی کے خاص خاص حالات اس کو لکھ کر بھیجے تا کہ وہ (منجم رضوی) ان واقعات کی مدد سے رئیس کے یومِ ولادت کا صحیح وقت متعین کر سکیں اور اس کے مطابق از سرِ نو زائچہ تیار کریں (پہلا زائچہ صحیح نہیں بنا تھا)۔ اس خط سے ہم اصل آدمی، محمد مہدی عرف اچھن میاں کے بارے میں بہت کچھ جان لیتے ہیں، مثلاً وہ اقرار کرتا ہے کہ

Scanned with CamScanner

اس کی شادی کامیاب نہیں ہوئی اور اسے ازدواجی زندگی سے کوئی سکھ نہیں ملا۔ وہ بتاتا ہے کہ گو وہ کسی خاص جسمانی حادثے سے بچارہا ہے (وہ ہمیشہ ہی محسوس کرتا رہا کہ کوئی اجنبی نادیدہ طاقت اس کی حفاظت کررہی ہے)، خطرات سر پر منڈلاتے رہنے کا اسے ہر دم احساس رہا۔ وہ مانتا ہے کہ روپے کمانے کی دھن اس کے سر پر سوار رہی اور اس کی ہمیشہ یہ کوشش اور خواہش رہی کہ وہ زیادہ سے زیادہ پیسہ کما کر عیاشانہ اور شاہانہ زندگی بسر کرے۔ اسے اس بات کا قلق ہے کہ اربابِ اقتدار اس کو منھ نہیں لگاتے۔ وہ اپنے خط میں اپنی آرزوؤں، امنگوں اور کمزوریوں کے بارے میں اتنا فرینک (frank) ہے جتنا کوئی ہوسکتا ہے اور ایسی فرینک نیس، راست گوئی بالعموم لوگوں میں نہیں پائی جاتی۔ (منجم نے صرف اس سے اس کی زندگی کے اہم حالات مانگے ہیں۔) منجم نے اس کے خط میں مختلف سوالات کے جو محتاط اور گول مول جوابات دیے ہیں، ویسے ہی جواب کچھ سوچ بچار کے بعد میں بھی دے سکتا تھا، گو مجھے زائچہ بنانا آتا ہے نہ جنم پتری۔ (کیا وہ ایک ہی چیز ہیں؟) منجم کا انگریزی میں بنا ہوا زائچہ بڑا دلچسپ ہے اور کاش میں اس کو یہاں درج کرسکتا۔ رئیس کی یہی فرینک نیس اس کی سرگزشت کے ٹکڑوں میں ہے۔ اس میں بناوٹ اور مصلحت کوشی کا شائبہ نہ تھا اور اس کو یہ خیال نہیں آتا کہ اس کے یہ اعترافات اور احوال اس کے متعلقین اور احباب کے لیے پریشانی کا موجب ہوسکتے ہیں۔ جب آسیہ سحر اس سے انٹرویو لیتے ہوئے اس سے اس کی پہلی محبت، پہلی خراش کے متعلق پوچھتی ہے تو اس کا جواب انوکھا اور معصوم ہے — غیرارادی ظرافت کا ٹکڑا جس پر ہم ہنسے بغیر نہیں رہ سکتے۔ وہ قہقہہ لگاتے ہوئے جواب دیتا ہے کہ محبت کا تجربہ اسے خود کرنے سے نہیں ہوا بلکہ ابتدا میں لوگوں نے اس سے محبت کی۔ اس کے اپنے الفاظ میں، ''مزے کی بات یہ ہے کہ ہم بچپن میں بہت خوبصورت تھے۔ محلے میں کچھ لڑکیاں تھیں اور وہ ہمارے ہاں پتھر پھینکا کرتی تھیں۔ بعد میں تو باقاعدہ اینٹیں آنے لگیں۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا چکر ہے اور پھر میں محبت سے خوف زدہ ہوگیا... حقیقت یہ ہے کہ میں نے عشق کیا، اب سے کوئی تیس سال قبل۔ وہ بڑا سنجیدہ عشق تھا، اور اب بھی ہے مگر میں اس میں اتنا شدید نہیں ہوا کہ گھر سے بھاگ گئے، پاگل ہوگئے... ابھی کل ہی ان سے ملاقات ہوئی۔ ان کے شوہر کو بھی علم ہے اور میری بیوی کو بھی۔ اصل میں اُن کی شاعری میں دلچسپی، ذہانت، بصیرت اور اعلیٰ ذوق کی وجہ سے ان سے متاثر ہوں...''

ظاہر ہے کہ رئیس کا یہ سنجیدہ عشق خالصتاً افلاطونی تھا۔ محبت کی آگ میں وہ کبھی نہیں جلا اور ساری

Scanned with CamScanner

عمر میں کسی ڈومنی نے اسے نہیں مارا۔ شاید بچپن کے خوفوں اور خاندانی ماحول سے جنم لینے والے ٹیبوز کی وجہ سے شدید تپتی ہوئی جنسی محبت (passionate love) کی کتاب اس پر ہمیشہ ٹھپ رہی۔ وہ واحد عشق جس کے بارے میں وہ اپنے انٹرویو میں اتنی ڈینگ مارتا ہے، انٹلکچوئل رفاقت سے زیادہ کچھ نہیں تھا اور غالباً دوسرا فریق اس سے لاعلم تھا — ایک دھیما، شریفانہ افیئر (affair) جس پر کسی معقولیت پسند شوہر کی غیرت جوش میں نہیں آسکتی۔ اور رئیس کی شاعری میں بھی اس تند عشقیہ تپش کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ اس کی شاعری اپنی عمدگیِ الفاظ، چست بندش اور حسنِ فکر کے باوجود عجیب طور سے سرد ہے۔ انگریزی ناول نویس سومرسٹ ماہم نے، جو ایک بڑا دانا آدمی تھا، کہیں کہا ہے کہ محبت کا انحصار انسانی جسم میں چند مخصوص غدود کے افرازی فعل سے ہے، اور رئیس کبھی ایک بہت صحت مند آدمی نہیں تھا۔ اس کی صحت ہمیشہ گری گری اور کمزور رہی۔ اس جیسے لوگ کاسانوا نہیں بن سکتے، خواہ وہ ایسا ہونے کی کتنی ہی حسرت رکھتے ہوں۔ اس سیکشن میں ''بنظرِ خود، بقلمِ خود'' کے عنوان سے رئیس کی وہ آخری تحریر بھی ہے جس پر وہ قاتل کی گولی لگنے سے پہلے کام کر رہا تھا اور جس کو ابوظہبی میں جشن سے پہلے صہبا کی ترتیب دی جانے والی کتاب ''ارمغانِ رئیس'' میں جگہ پانی تھی۔ رئیس نے اسے بڑے مزے سے لکھا ہے اور یہ شستہ شگفتہ اردو نثر کا نمونہ ہے۔ وہ فی الواقع ایک منجھا ہوا نثار تھا اور اگر زندگی اسے اس سرگزشت کو مکمل کرنے کی مہلت دیتی (اس نے ابھی دسواں حصہ بھی نہیں لکھا تھا) تو یہ یقیناً اس کا شاہکار ادبی کام ہوتا۔ اس سرگزشت کے آغاز میں اس نے لکھا، ''دوستوں کی فرمائش ہے کہ مجھے اپنی شخصیت اور فن کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور لکھنا چاہیے کہ آرزدنِ دل دوستاں جہل ہے وکفارہ عین سہل... شاید پھر یہ موقع ملے یا نہ ملے، امکانِ قوی یہی ہے کہ نہ ملے...'' اس کی چتاونی صحیح ثابت ہوئی اور اسے موقع نہ ملا۔

آگے ''شخص و عکس''، ''یادیں اور باتیں'' کے عنوان سے وہ شخصی خاکے اور نثری نوحے ہیں جو اس کی موت کے سوگ میں متعلقین، احباب اور مداحوں نے لکھے۔ اس ماتم داری کی محفل میں اس کے بڑے بھائی محمد تقی، بھاوج زاہدہ حنا، بیٹی شاہانہ رئیس، قاسم محمود، بزم انصاری، نظر علی خاں، نجمی الہ آبادی، مختار زمن، اسلم فرخی اور بہت سے دوسرے شریک ہیں۔ آدمی کی موت ایک اندوہناک چیز ہے اور یہ تعزیتی خاکے اندوہناک ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ جانے والا آدمی بڑا چاہا جانے والا تھا اور اس کے جاننے والے اس سے محبت کرتے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی رسمی اور عیارانہ نہیں۔ ان درد اور اصل

Scanned with CamScanner

احساسِ زیاں میں ڈوبے خاکوں سے ایک سادہ، نیک دل، غم خوار انسان کی تصویر ذہن میں ابھرتی ہے جس پر اس کے جاننے والے اس کی خوش گفتاری اور دلداہی کے لیے جان دیتے تھے، جو مصیبت زدہ بیواؤں، یتیموں، بے کسوں کے دکھ درد بانٹتا اور دامے درمے سخنے اُن کی مدد کرتا تھا، جو اپنے معاملات میں سچا اور کھرا تھا، جس نے ساری عمر سخت کلمے سے کسی کا دل نہیں توڑا، جس کے دروازے ہر آنے جانے والے کے لیے کھلے رہتے تھے — بنیادی طور پر ایک اچھا آدمی! ہمیں اس تصویر کی اصلیت میں شبہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کی زندگی میں اور اس کے مرنے کے بعد بھی سو باتیں اس کے خلاف کہی جاتی رہیں کہ وہ بہروپیا اور چکر باز تھا، کہ اس نے عامل روحانی اور نفسیاتی معالج کا روپ لوگوں کو اُلو بنانے اور ان سے روپیہ بٹورنے کی خاطر رچا رکھا تھا، کہ اس نے آنے والے بیماریوں کا ہمدرد بن کر اپنے لیے گورنمنٹ سے بہت سی زمین حاصل کی اور اس سے لاکھوں بنائے، کہ اپنی اکادمیوں، ٹرسٹوں اور بینک کا چکر چلا کر اس نے دوسروں سے ادھار لی ہوئی رقمیں ہضم کر لیں۔ قبر کھودنے والے سدا اپنے کام میں لگے رہتے ہیں اور کسی کو نہیں بخشتے۔ اسے بدنام کرنے کے لیے یہ بہتان یقیناً غلط ہیں کیونکہ یہ آدمی کبھی امیر نہ بنا۔ اس کا رہن سہن modest تھا، مالدار لوگوں کے ٹھاٹھ باٹھ کے بغیر۔ اس راحت اور آسائش کے لیے جو روپے سے حاصل ہوتی ہیں وہ روپے سے محبت کرتا تھا، مگر یہ شاذ و نادر ہی ہاتھ آتا۔ وہ بہت زیادہ غیر عملی تھا۔ اگر ان الزامات میں صداقت کا کچھ شائبہ ہے تو ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ انسانی جانور ایک نہایت پیچیدہ مخلوق ہے، تضادات کا مجموعہ۔ اکثر ایک آدمی کے اندر ڈاکٹر جیکل اور مسٹر ہائیڈ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چلتے ہیں اور ہمارے کسی عمل کے لیے محرک جذبہ سادہ اور بے غرض نہیں ہوتا۔ بہت سوں نے یہ مشاہدہ کیا ہوگا کہ ایک آدمی جو ایک وقت میں انتہائی نیک دلی اور کریم النفسی کا ثبوت دیتا ہے، ایک دوسرے لمحے میں اس سے ایسی کمینگی اور کم ظرفی کا فعل سرزد ہوتا ہے کہ ہم ششدر رہ جاتے ہیں کہ کیا یہ وہی شخص ہے! انسانی جانور کے instincts — حسد و رقابت، بقائے حیات، تولید، تناسل، دوسروں پر غلبہ اور طاقت حاصل کرنا — ہم سب میں سانجھے ہیں اور ہر کوئی ان instincts کا تابع اور غلام ہے۔ ولی اور عارف بھی ان سلاسل میں جکڑے ہوئے ہیں، اس لیے وہ یوٹوپیا جس کے ہم خواب دیکھتے ہیں کبھی حقیقت نہیں بنے گا اور ہر ایک دور میں جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات ہی رہے گی... اس لیے ہمیں اس آدمی محمد مہدی کی روپے سے محبت اور عیش و راحت کی زندگی کی خواہش پر چیں

بہ جبیں نہیں ہونا چاہیے۔ روپیہ سب برائیوں کی جڑ ہو سکتا ہے، مگر اس کے بغیر اس جدید معاشی نظام میں زندہ رہنا ناممکن ہے۔ روپیہ سونے جاگنے، کھانے پینے اور محبت کرنے کی مانند ایک ضرورت ہے۔ دانا سومرسٹ ماہم کے لیے روپیہ چھٹی حس تھا جس کے نہ ہونے سے باقی پانچ حواس بے کار ہو جاتے ہیں۔ سو اس آدمی نے جو کراچی شہر کے ریلوے اسٹیشن پر کل پینتیس روپے اپنی جیب میں لیے اترا تھا، اسے حاصل کرنے کے لیے سب پاپڑ بیلے اور سخنوری کے بے پناہ ٹیلنٹ سے اپنی قسمت بنائی۔ اس کی شوخ طبعی اور حاضر دماغی کے دو واقعات نے جو اس کے جوانی کے ایک دوست فہمی الٰہ آبادی نے اپنے خاکے میں لکھے ہیں، میرا جی خوش کر دیا اور میں نے سوچا کہ اگر ہم کبھی اُن دنوں مل جاتے تو پکے دوست بن جاتے۔ ۱۹۲۲ء کے اوائل میں جب رئیس ستائیس اٹھائیس برس کا تھا وہ مراد آباد سے ایک ادبی ماہنامہ ''مسافر'' نکالتا تھا۔ فہمی کے مطابق یہ ماہنامہ اختر شیرانی کے ''رومان'' طرح بڑا مقبول ہوا اور گھر گھر پڑھا جانے لگا۔ فہمی نے نیا نیا لکھنا شروع کیا تھا۔ ایک دن فہمی کے نام اس ماہنامے کے شعبۂ ادارت کی 'مدیرہ' ریحانہ جمال ہاشمی کا خط آیا جس میں اس سے ایک افسانے کی فرمائش تھی۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ نوجوان فہمی کی باچھیں کھل گئیں۔ فہمی نے راتوں رات ایک بے حد جذباتی افسانہ لکھا (وہ جذبات میں ڈوبے رومانی افسانے لکھنے میں طاق تھا — جیسے اس زمانے میں سب نوجوان لکھنے کی کوشش کرتے تھے)۔ فہمی کے اس شاہکار افسانے کا عنوان تھا ''تو نے کھایا ہے مگر دلکش فریب... اے پرستار 'جمال'' دوسری صبح اس نے اسے ماہنامہ ''مسافر'' کے پتے پر ریحانہ جمال قریشی کے نام بھیج دیا۔ فہمی کو ریحانہ جمال قریشی کے خط متواتر آنے لگے۔ ''مسافر'' میں اب اس کے رومانی افسانے متواتر چھپنے لگے اور اس نے رسالے کے لیے بے شمار خریدار بنائے۔ پھر ریحانہ جمال قریشی کا ایک خط آیا کہ مراد آباد آ کر صورت دکھا جاؤ۔ ساتھ ہی یہ تاکید تھی کہ اس کے بھائی رئیس امروہوی کو اس خط و کتابت کا علم نہ ہونا چاہیے۔ فہمی کہیں سے کرایہ ادھار لے کر افتاں و خیزاں مراد آباد پہنچا۔ گاڑی مراد آباد رات کو دو بجے پہنچی۔ فہمی اسٹیشن سے ''مسافر خانے'' گیا اور ڈرتے ڈرتے دروازہ کھٹکھٹایا (مضمون میں یہ واضح نہیں ہوتا کہ یہ کوئی مکان تھا یا واقعی مسافر خانہ)۔ وہاں اسے چارپائی مل گئی اور وہ بستر لگا کر سو گیا۔ ریحانہ جمال قریشی کی ہدایت کے بموجب اس کی آٹھ سالہ بھتیجی سیدہ بھی ساتھ میں تھی جس کے وسیلے سے اس کا رابطہ محبوبہ سے ہونا تھا۔ اگلی صبح وہ جاگا تو قریب ہی رئیس کو سوتے ہوئے پایا۔ اس کے بستر پر

چنبیلی اور گلاب کے پھول بکھرے تھے اور وہ نہایت حسین وجمیل اور خوبرو تھا (رئیس سے اس کی یہ پہلی ملاقات تھی)۔ رئیس اسے مل کر بہت خوش ہوا۔ بھتیجی سیدہ کو "مسافر" کے کاتب کے گھر بھیج دیا گیا۔ پھر نیچے "مسافر" کے دفتر میں محفل جمی۔ ساحر مرادآبادی، کوثر چاندپوری، راز ہاشمی اور دوسرے احباب سے فہمی کا تعارف کرایا گیا۔ ادھر بے چارے فہمی پر کش مکش کی حالت طاری تھی۔ ریحانہ جمال قریشی کا کوئی ذکر تک نہ تھا اور نہ ہی اس کے وجود کے کوئی آثار۔ اس دفتر کے کمرے میں کوئی چلمن بھی نہیں تھی جس کی اوٹ سے ریحانہ جمال ہاشمی کی جھلک دکھائی پڑ جاتی۔ اس مکان میں ایک خاتون ضرور تھی — "مسافر" کے کاتب کی جورو جو بدوضع موٹی سی عورت تھی، گھر کے کام کاج اور ہانڈی چولھے کی انچارج۔ رات کو کھلی چھت پر سونے سے پہلے رئیس نے خود ہی داستان چھیڑی کہ اسے فہمی کے اور اپنی بہن ریحانہ کے درمیان خط وکتابت کا معلوم ہے کیونکہ اس نے فہمی کے کچھ خطوط اپنی بہن کی میز کے دراز میں دیکھے تھے۔ فہمی بے چارے پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ مگر رئیس نے اس کو تسلی دی کہ وہ ان معاملات میں بڑا آزاد خیال ہے اور اسے خوشی ہے کہ فہمی اور اس کی بہن ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ رئیس کا لہجہ دھیما، پُرسکون اور شفقت آمیز تھا۔ فہمی کی کچھ ڈھارس بندھی۔ دوسری صبح اس کی آنکھ کھلنے سے پہلے رئیس اٹھ کر نیچے "مسافر" کے دفتر میں جا چکا تھا۔ اور جب فہمی جھینپتا جھانپتا دفتر میں اترا اُسے رئیس سے آنکھ ملانے کی ہمت نہ ہوئی۔ دفتر میں رئیس اور عامل ادیب مرادآبادی بیٹھے حقہ پیتے تھے۔ وہ آپس میں چپکے چپکے باتیں کر رہے تھے اور کبھی کبھی کنکھیوں سے میاں فہمی کو دیکھ لیتے تھے۔ پھر عامل چلا گیا اور اس کے جانے کے بعد رئیس نے نہایت معصومیت سے فہمی کو بتایا کہ یہ سارا مذاق تھا۔ ریحانہ جمال ہاشمی ایک خیالی اور افسانوی خاتون تھی جس کا کوئی وجود نہ تھا اور فہمی کے نام جو خطوط آتے تھے وہ رئیس کے لکھے ہوتے تھے۔ یہ ایک عملی مذاق تھا مگر بالکل معصوم اور کینے کے بغیر۔ وہ بڑے اچھے دوست بن گئے۔ رئیس اسے ایک فوٹوگرافر کے یہاں لے گیا جہاں انھوں نے اکٹھے تصویر کھنچوائی — رئیس کی واحد جوانی کی تصویر جو تادمِ مرگ اس کی اسٹڈی میں آویزاں رہی۔

دوسرا واقعہ اور بھی مزے کا ہے۔ ایک سال بعد فہمی کا پھر مرادآباد جانا ہوا۔ تب "مسافر" دم توڑ چکا تھا اور رئیس حافظ محمد تقی کے ہفتہ وار رسالے "جدت" کا پیٹ اپنی تحریروں سے بھرتا تھا۔ فہمی رئیس کے ہاں اترا۔ وہ وہاں کوئی ایک ہفتہ بھر رہا اور اس دوران جو دو چار روپے اس کی جیب میں تھے خرچ ہو گئے،

واپسی کا کرایہ بھی نہ رہا۔ اس نے رئیس سے اپنی تہی دستی اور بے نوائی کا رونا رویا۔ رئیس کا اپنا حال پتلا تھا۔ حافظ محمد تقی توکل پر ایمانِ کامل رکھتے تھے اور ملازموں کی روپے پیسے کی بات سنی ان سنی کر دیتے تھے۔ رئیس نے تھوڑی دیر اس صورتِ حال پر غور و فکر کیا، پھر ایک پلان تیار کیا۔ فہمی سے کہا، "تمھیں مرادآباد میں کوئی نہیں جانتا۔ تم میری سیاہ شیروانی اور سیاہ ٹوپی پہن کر جمعے کے روز جامع مسجد کے پیش امام کے پاس جاؤ اور ان سے یہ کہو کہ میں شیعہ عقیدے سے توبہ کرتا ہوں اور سنی مذہب اختیار کرتا ہوں۔ مگر میرے خاندان والے مجھے عاق کر دیں گے۔ میں امروہے کا رہنے والا ہوں اور رئیس امروہوی کے خاندان سے میرا تعلق ہے۔ اگر تم گھر سے نکال دیے جانے کی داستان دلگداز لہجے میں سنانے میں کامیاب ہو گئے تو کافی چندہ جمع ہو جائے گا۔" شرمیلا، ناپختہ کار فہمی اس انوکھی اسکیم پر عمل پیرا ہونے پر ہچکچایا مگر رئیس نے اپنی باتوں نے اس کی ہمت بڑھائی۔ وہی ہوا جیسا کہ رئیس نے کہا تھا۔ دو چار نعرۂ تکبیر لگے اور پیش امام کی اپیل پر دو دو چار چار آنے جمع ہو کر ساٹھ روپے سے اوپر کی رقم ہو گئی۔ فہمی گریہ مسکین بنا پیش امام کی بغل میں بیٹھا رہا، تاکہ سب نمازی اس 'نومسلم' نوجوان کو دیکھ کر اپنا ایمان تازہ کریں۔ اس نے خشوع و خضوع سے ایک مدت کے بعد نماز پڑھی اور جمع شدہ سکے ایک پوٹلی میں باندھے جامع مسجد سے باہر آ گیا۔ باہر آ کر پہلے وہ سست مضمحل قدموں سے چلا تاکہ کسی کو شک نہ گزرے، پھر دوڑ لگائی۔ موڑ پر رئیس موجود تھا۔ دونوں کافی دیر تک ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہوتے رہے۔ دفتر پہنچے۔ ان دنوں ساٹھ روپے اچھی خاصی رقم ہوتی تھی۔ انھوں نے اس رقم کو آدھا آدھا کر لیا۔ فہمی رئیس کے ہاں مزید چار پانچ دن رہا۔ وہ اب دولت مند تھے اور انھوں نے خوب گل چھرے اڑائے۔ انھی دنوں رئیس کے پاس ایک سو روپے کا منی آرڈر آیا — ایک مرثیے "فلسفۂ غم" کی اجرت جسے رئیس نے ایک بڑے مشہور مرثیہ گو کے لیے لکھا تھا اور جو بعد میں اسی کے نام سے چھپا۔ رئیس نے اپنی ٹیلنٹ بے دریغ بیچی اور اس کا آدھے سے زیادہ کلام دوسروں کے کھاتے میں گیا۔

اس کے بڑے بھائی فلسفی محمد تقی کے رقت انگیز مضمون میں اُن کا دکھ اور درد عیاں ہے۔ رئیس ان کا چھوٹا بھائی تھا، اور دینی دوست بھی۔ محمد تقی نے اس خاکے میں یہ ثابت کرنے کی سنجیدہ کوشش کی ہے کہ اس کا بھائی ایک عارف اور ولی تھا — ایک سچ مچ کا غیب داں، جسے پہلے سے اپنی موت کے وقت اور وقوعے کا علم تھا۔ ان کے مطابق خرقِ عادات اس سے ظہور میں آتی تھیں، اور اس کی بھاوج زاہدہ حنا

Scanned with CamScanner

اور بیٹی شاہانہ رئیس کے مضامین میں بھی اس 'روحانی' رئیس کو ابھارنے کا جتن کیا گیا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اپنے مرنے سے کچھ عرصہ پہلے وہ بڑے تیقن کے ساتھ اپنی آنے والی موت کا ذکر کرنے لگا تھا اور اپنی آخری تحریر میں اس نے صاف الفاظ میں اس کی پیش گوئی کر دی تھی، ''ممکن ہے کہ پھر لکھنے لکھانے کا موقع نہ ملے۔ امکان قوی ہے کہ نہیں ملے گا...'' عالم شباب سے عجیب سا خوف اس پر مسلط رہتا تھا کہ کوئی ہولناک سانحہ ہونے والا ہے۔ چوالیس برس پہلے اس نے یہ شعر کہے تھے جنھیں شاہانہ رئیس نے اپنے مضمون میں نقل کیا ہے:

پڑھے کس طور کوئی دفترِ تہذیبِ انساں کو
ورق اکثر کتابوں کے لہو میں تر نکلتے ہیں
ابھی تدفین باقی ہے ابھی تو
لہو سے اپنے نہلایا گیا ہوں
مثالِ سخت جانِ نیم مذبوح
تہہِ شمشیر تڑپایا گیا ہوں

متعلقین کی اس ڈھنگ کی سوچ قابلِ درگزر اور سمجھ میں آنے والی ہے مگر حقیقت یہ نہیں۔ رئیس ولی و عارف تھا نہ صاحب کرامت وکشف ـــــ وہ ایک ہمارے جیسا عام معمولی انسان تھا، مکروہات دنیوی میں جکڑا ہوا، جاں گداز پریشانیوں میں مبتلا، کچھ کچھ سیرِ دنیا سے تھکا ہوا، جو اپنی عمر بھر کی مشقت اور جدوجہد کے بعد ہر ایک شے کی لاحاصلی دیکھنے لگا تھا۔ بوڑھے ہوتے آدمیوں میں یہ ڈیتھ وِش (death wish) اتنی غیر معمولی بات نہیں۔ غالب نے اپنی موت سے دس بارہ برس پیشتر ہی کہنا شروع کر دیا تھا کہ وہ اب چند روزہ مہمان ہے۔ شاید اس نے اپنا قطعہ' تاریخِ وفات بھی کہہ دیا تھا جو صحیح نہ نکلا۔ (اس کے مطابق اسے ڈیڑھ دو برس پہلے انتقال کرنا تھا۔) یہ بھی نہیں کہ بوڑھے آدمی فی الحقیقت مرنا چاہتے ہیں، کیونکہ ہر کسی کی طرح زندگی سے چمٹے رہنا ان کو عزیز ہوتا ہے۔ ہم سب نے ایسے چاق و چوبند، سو سے اوپر کے بوڑھے دیکھے ہیں جو اپنے وصیت نامے لکھ کر رکھے رہتے ہیں اور اپنے ورثا اور احباب کو اپنی سر پر منڈلاتی وفات سے باخبر رکھنا ان کا محبوب شغل ہوتا ہے۔ وہ اپنے مرنے کے بارے میں قطعاً سنجیدہ نہیں ہوتے اور اس بات میں یقین نہیں رکھتے کہ وہ سچ مچ مرنے والے ہیں۔ یہ ایک طرح خود

Scanned with CamScanner

اپنی ناز برداری کا حربہ ہے۔ چند بوڑھے آدمی قبر کے نزدیک ہوتے ہوئے سنکی، چڑچڑے اور اصلاً بدذات ہو جاتے ہیں۔ میں ایک ایسے بوڑھے آدمی کو جانتا ہوں جو اپنے ورثا اور متعلقین کے سامنے اپنی حسرت ناک موت کا تذکرہ ان کے چہروں پر اثرات دیکھنے کے لیے کرتا ہے۔ اس سے اسے بڑا سکون ملتا ہے۔ وہ (متعلقین) زیادہ فکر مند نہ ہوتے اور دل ہی دل میں خواہش کرتے کہ کاش یہ خوشگوار سانحہ جلد از جلد وقوع پذیر ہو جائے، بوڑھا آدمی اتنی دیر کیوں لگا رہا ہے!

رئیس کی یہ اپنی رہائی کی خواہش —ڈیتھ وِش— میں یقین کرتا ہوں، مختلف احساسات، مختلف اسباب کی وجہ سے تھی۔ عمر کے لحاظ سے، جسم ناتواں کے باوجود، اس کی صحت ٹھیک ٹھاک تھی۔ وہ کسی شدید یا مہلک مرض میں مبتلا نہیں تھا۔ یوگا کی ورزشیں، سادہ غذا اور شام کو تھوڑی شراب کا گلاس اس کے دبلے چھریرے بدن کو چست اور درست حالت میں رکھے ہوئے تھے۔ اس کے چیلے چانٹے، اس کے دوست اس سے حقیقی معنوں میں محبت کرتے تھے— پھر یہ ڈیتھ وِش کیوں؟ بات یہ ہے کہ ہم سب پر کبھی کبھار خودرحمی کے دورے پڑتے ہیں۔ رئیس بالخصوص ان کی جانب مائل تھا— اور وہ اس کا انجانا خوف جس کی گرفت سے وہ ساری زندگی نہ نکل سکا اور جو اس کو مابعد الطبیعیاتی علوم سے انتہائی شغف کی جانب لے گیا۔ اس نے اپنے قطعات سے، جو روزانہ "جنگ" میں چھپتے تھے اور جنھیں لاکھوں پڑھتے تھے، ملک کے کسی بھی سخنور سے زیادہ شہرت پائی تھی اور اس کا نام بچے بچے کی زبان پر تھا، مگر ادبی نقاد ہمیشہ اسے نظرانداز کرتے رہے۔ ان کی تنقیدوں، جائزوں میں مشہور شعرا کی فہرست سے اس کا نام ہمیشہ غائب ہوتا جیسے اس کا وجود نہ ہو۔ کیا اس نے ساری عمر جو ادبی کاوش کی وہ بے فائدہ تھی؟ اس جیسے قادرالکلام شاعر کو ثقہ نقادوں اور سخن سنجوں کی ستائش کیوں نصیب نہ ہوئی؟ وہ یہ دیکھنے لگا تھا کہ ادبی ناموری دراصل دیر سے آنے والی گمنامی ہے اور اس کا نام اور کام سطح آب پر لکھا ہوا ہے۔ وہ عام متاہل زندگی کا سکھ حاصل کرنے میں بھی ناکام رہا تھا۔ وہ کیوں زندہ رہے... کس کے لیے؟ کیوں؟ مجھے یقین ہے کہ ایک ہوش مند سوچنے سمجھنے والے آدمی کی طرح وہ یہ بھی محسوس کرتا ہوگا کہ نامور ہونا یا گمنام ہونا محض وہم ہے۔ جینے کے لیے کچھ راحت چاہیے— چند اچھے دوستوں کی صحبت، کمرے میں ایک آرام کرسی، اچھا تمباکو، اور گلاب کے پھول سینچنے کے لیے اور بلبل کے نغمے سننے کے لیے ایک چھوٹا سا باغیچہ... سو وہ اپنے مرنے کی پیش گوئی کرتا رہتا تھا۔ دوسرے بوڑھے آدمیوں کی طرح اس پیش گوئی کو

Scanned with CamScanner

اتنا دور نہیں لے جانا چاہیے کہ ہم اسے عارف بنادیں۔ اگر قاتل کی گولی اسے ختم نہ کردیتی تو وہ غالباً نوے کا ہو کر مرتا۔

زاہدہ حنا کے خاکے میں تھوڑا سا رئیس کا criticism بھی ہے۔ جس نے مجھے کچھ چونکا دیا۔ وہ لکھتی ہیں، ''ان سے شدید نظریاتی اختلافات تھے... اُن کی زندگی کے کئی پہلو تھے جو مجھے ہی نہیں، دوسرے بہت سے لوگوں کو ناگوار گزرتے تھے... وہ ان معاملات سے کنارہ کش ہونے کو تیار نہ تھے...'' آدمی جاننا چاہتا ہے کہ یہ ناگوار پہلو کون سے تھے جو اس کے متعلقین کو پسند نہ تھے۔ کمزوریاں، کردار کی خامیاں ہر شخص میں ہوتی ہیں۔ مگر کیا ہر آدمی کو اپنے خیال اور اپنے رجحانِ طبیعت کے مطابق اپنی زندگی خود جینے کا حق نہیں ہونا چاہیے؟ کیا یہ سچ نہیں کہ ہم اکیلے جیتے اور اکیلے مرتے ہیں؟ ہماری زندگی ہماری اپنی ہے، دوسروں کی نہیں۔

اور اس کا یہ کہنا کہ اسے دوسروں سے محبت کے تجربے میں سے نہیں گزرنا پڑا، اور دوسرے خود اس کی کچھ خوبیوں کی وجہ سے اس سے محبت کا دم بھرنے لگے تھے، شاید حقیقت سے زیادہ بعید نہ تھا۔ اس کی مثال اس کے دو 'عاشقوں' کے خاکوں میں ملتی ہے۔ ہر دونوں اس بات کے دعوے دار ہیں کہ وہ رئیس کے انر سرکل (inner cricle) میں تھے، اس کے خاص ہمراز، منظورِ نظر چیلے، اور جتنا دکھ ان کو اس کے جانے کا ہوا ہے، کسی اور کو نہیں ہوا۔ ایک نے جس کا مضمون پہلے ''جنگ'' میں چھپا، کہا ہے کہ رئیس کے قومی، معاشرتی اور مابعد الطبیعیاتی کالم ہی جن کو وہ اپنے خونِ جگر سے لکھتا تھا، اس کا اصل 'لٹریری' کام تھے، اور اس کے روزانہ بے کاوش کے کہے قطعات کی، جو پیدا ہوتے اور مرجاتے تھے، کوئی ادبی اہمیت نہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ سب جانتے ہیں کہ رئیس سب سے زیادہ مجھے چاہتے ہیں۔ دوسرے صاحب، ایک پروفیسر، اس پر تلملا اٹھے ہیں۔ اپنے جوابی خاکے میں وہ لکھتے ہیں کہ رئیس کے کالم تو بیسیوں اور بھی لکھ سکتے ہیں، اس کو زندہ رکھنے والی چیز اس کا قطعہ ہے... ان کے مطابق رئیس نے اپنی ایک تحریر میں اعتراف کیا ہے کہ ان سے ان کے رشتے پیچ در پیچ، تہہ در تہہ اور خم در خم ہیں اور رئیس ہر دورے، کانفرنس مشاعرے میں انھیں ساتھ رکھتا تھا۔ جس شہر میں جاتے، ایک کمرے میں سوتے۔ انھیں سرکاری طور پر بھی رئیس کا رفیقِ خاص تسلیم کیا گیا۔ جلاپے کی ماری دو سوکنوں کے یہ الہنے کتنے مزے دار اور پُرلطف ہیں! لیکن آدمی یہ بھی سوچتا ہے کہ ایک شخص جو دوسروں میں اس قدر شدید رقابت اور قبضہ گیری

Scanned with CamScanner

کے احساسات بیدار کرنے کا اہل تھا، اس میں کوئی خاص خوبیاں اور اوصاف ہوں گے ضرور! وہ اسے اپنا لینا اور کسی کو نہ دینا چاہتے تھے۔

آخری سیکشن میں ان تاریخ وفات کے قطعات، نظموں اور مرثیوں کے صفحات ہیں جو اس کی موت پر بہت سے لوگوں نے لکھے۔ اور ایسا لگتا ہے کہ اس کے قتل کے بعد ہر کوئی جو اسے جانتا تھا اور فن شاعری میں درک رکھتا ہے، قلم ہاتھ میں لے کر مصرعے موزوں کرنے بیٹھ گیا۔ یہ دستورِ زمانہ ہے مگر ایسی شاعری move کیوں نہیں کرتی؟ تاریخ وفات لکھنا کاریگری ہے، اور ادائے حق محبت اس سے نہیں ہوتا... ان میں عبدالعزیز خالد کی نظم کے یہ اشعار میرے دل کو لگے:

ایک کاہن تھا جو کراچی میں
بابل و نینوا سے آیا تھا
ساتھ لوحِ طلسم لایا تھا
جس کی مرموز نفسیات میں تھا

آخری مصرع میرے لیے کچھ دقیق ہے۔ مگر پھر میں عربی زبان سے ناآشنا ہوں۔

'فن و شخصیت' کی کتابیں بالعموم سخت بور ہوتی ہیں۔ پڑھنے والے کی ان سے جان جاتی ہے اور کوئی انھیں نہیں پڑھتا۔ مگر رئیس امروہوی کے فن و شخصیت پر یہ کتاب ایک اکسپشن (exception) ہے — ایک واقعی دلچسپ کتاب۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کی ایک وجہ تو شخصیت کا ایک پہلودار، رنگارنگ اور پُراسرار ہونا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ شخصیت کی اپنی تب و تاب اور گرمی کی وجہ سے اس پر مضامین دل سے اور اصل احساس سے لکھے گئے ہیں کیونکہ آدمی یقیناً بڑا چاہا جانے والا تھا۔ اور اس کتاب کے دوسری ایسی کتابوں سے مختلف ہونے کا بہت کچھ کریڈٹ صہبا لکھنوی کی محنت کوشی اور مدیرانہ مہارت کو جاتا ہے۔ کوئی یہ کام اتنے تھوڑے وقت میں اس سے بہتر ڈھنگ سے نہیں کر سکتا تھا۔

رئیس چلا گیا ہے اور ہمارے پاس اس پر یہ یادگار کتاب رہ گئی ہے۔ آدمی کا اس گھومتے سیارے پر گزر مختصر ہے، مگر اس کی کہانی نہ ختم ہونے والی ہے اور سیاہ کیے کاغذوں کے دفتروں میں بھی نہیں سمٹ سکتی — فائل پھر بھی نامکمل رہے گی۔

(فنون، لاہور، اپریل۔ جون ۱۹۹۱ء)

مہاتڈ راڈ یکھنس

انیس شاہ جیلانی

انیس شاہ جیلانی کا نام میں نے پہلے پہل آج سے بارہ تیرہ برس پیشتر سنا۔ اس نے حیرت شملوی کے خطوط پر مشتمل ایک پمفلٹ نما کتاب تالیف کی تھی۔ (میں حیرت شملوی کو بھی نہیں جانتا تھا۔) اس کے کافی طویل دیباچے میں حیرت شملوی کی قادر الکلامی اور سخن سنجی کی بہت ستائش کی گئی تھی اور یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ وہ اس عہد کا سب سے بڑا شاعر اور نثر نگار تھا اور اگر اس کی ساری غیر مطبوعہ تصانیف چھپ کر سامنے آجائیں تو دنیا محوِ حیرت ہو جائے گی۔ (انیس شاہ کے اصل الفاظ مجھے یاد نہیں۔) مجھے یہ تعریف و تحسین اس متوالے پجاری کی سی لگی جو اپنی دیوی کے اوصاف بڑھا چڑھا کر گاتا ہے۔ کتاب کے آخر میں حیرت شملوی کی بیس سے زیادہ زیرِ طبع کتابوں کی فہرست تھی۔ یہ کتابیں غالباً اب تک نہیں چھپ سکیں۔ جب میں نے خط پڑھے تو میں ان کے اسلوبِ نگارش اور خیالات سے واقعی مرعوب سا ہو گیا اور حیرت شملوی ادب کے میدان کا ایک چھپا ہوا رستم نکلا جسے نقادوں نے بے منصفی سے نظر انداز کیا ہے۔ (شاید میں نے ہی ''افکار'' میں اس پر تبصرہ بھی کیا)۔

مگر انیس شاہ جیلانی کی شخصیت نے مجھے اپنی طرف کھینچا۔ حیرت شملوی کو پوجنے والا میرا یہ ہم وطن یا ہم دیس کون ہے اور ایسا آدمی میری نگاہوں سے کیونکر چھپا رہا۔ وہ یقیناً کوئی نایاب پرندہ (rare bird) ہوگا۔ اس 'دریافت' کے تین چار سال بعد میں اور میرا چھوٹا شکاری اور گھوڑوں کا عاشق بھائی اس کی سرکاری جیپ میں صادق آباد وہاں کے میر زاہد حسین کے مشہور کتب خانے کو دیکھنے گئے۔ میر صاحب اس خطے کے بڑے زمینداروں میں سے ہیں، ایک سچے محبِ قوم، کٹر مسلم لیگی، قائد اعظم اور مادرِ ملت کی عقیدت اور محبت کا دم بھرنے والے، مس قرۃ العین کے ناولوں سے نکلے ہوئے ایک کردار۔ بہاولپور کے خطے میں وہ یقیناً کتابوں کے سب سے بڑے جامع ہیں۔ اس جامہ زیب، نستعلیق ارسٹوکریٹ نے اب صادق آباد میں ایک وسیع و عریض محل سرا کی تعمیر کا پروجیکٹ شروع کر رکھا ہے جو ان کی زندگی میں مکمل نہ ہوگا۔ میر صاحب ابھی اپنی پرانی حویلی میں پڑے ہیں گو انھوں نے کتب خانے کا کچھ حصہ پندرہ سال سے زیرِ تعمیر محل سرا میں منتقل کر دیا ہے۔ یہی میر زاہد حسین ہمیں انیس شاہ جیلانی سے

Scanned with CamScanner

ملانے اور اس کا کتب خانہ دکھانے اپنی گاڑی میں محمد آباد لے گئے۔ صادق آباد سے محمد آباد کا قصبہ جو صادق آباد کی تحصیل میں ہے، پندرہ سولہ میل کے فاصلے پر ہے اور سڑک اناج کے کھیتوں، گارے کی چار دیواری میں گھرے آم کے باغوں، کھجور کے جھنڈوں کے پاس سے جاتی ہے مگر بہاولپور کے خطے کے دوسرے علاقوں کی طرح سنہری فضا میں صحرا یا روہی کی 'بو' ٹھہری ہے، کیونکہ اب سے پینتالیس پچاس برس پہلے، جب یہاں نہریں نہیں آئی تھیں اور خال خال آبادی تھی، یہ سارا علاقہ چولستان کے لق و دق ریتلے ویرانے کا حصہ تھا؛ وہی روہی جس کے گیت خواجہ غلام فرید نے گائے ہیں جس میں نازک نازک جٹیاں دن کو اپنے کچے گھروندوں میں 'چاٹیوں' میں دودھ بلوتی تھیں اور رات کو دلوں کا شکار کرتی تھیں۔ قدم قدم آبادی کے باوجود روہی کی بو اب تک یہاں سے نہیں گئی، نہ کبھی جائے گی۔ یہ دنیا کی سب سے مست کر دینے والی بو ہے... انیس شاہ جیلانی کا مسکن قصبے سے ایک کچھ اونچی کرسی پر ایک پختہ سرخ اینٹوں کی چھوٹی سی عمارت ہے، گھر کی بجائے دیہاتی لائبریری یا ڈسپنسری لگتی ہوئی۔ وہ ہمیں برآمدے میں ملا۔ گھیرے دار شلوار قمیص اور ایک خوش مزاج دبلے چھریرے بدن کا آدمی۔ میرے چہیتے اسکاٹ لینڈ کے ناولسٹ رابرٹ لوئی اسٹیونسن کی عکسی تصویروں سے وہ کافی مشابہت رکھتا تھا — وہی کتابی چہرہ، فراخ پیشانی، وہی ہونٹ کے کناروں سے نیچے آئی ہوئی ہلالی مونچھ کا اسٹائل، بالوں کے بیچ میں سیدھی مانگ، آنکھوں میں وہی رومانی نرماہٹ (روہی کی فضاؤں میں پروردہ سب مردوں عورتوں میں یہ رومانی نرماہٹ پائی جاتی ہے)۔ وہ مجھے اور میرے بھائی کو اس تپاک سے ملا جیسے ہم برسوں کے بچھڑے ہوں۔ وہ ہمیں اندر لے گیا۔ دالان نما بستی کمرہ جھاڑا، بہارا، فرشایا ہوا۔ سامنے کی دیوار کے پاس معمولی صوفوں کی ترتیب، دائیں طرف داخل ہونے والے دروازے کے پاس توشک پر ایک 'میزچی'، جیسی مہاجنوں کی دکانوں پر ہوتی تھی اور جس پر حساب کتاب کے بہی کھاتے لکھتے تھے۔ میزچی پر ہمارے اسکول کی کلکی قلم، ایک بڑی صوف والی دوات۔ ایک رجسٹر سا اس کے اوپر کھلا تھا اور اس نے بتایا یہ اس کے لکھنے کا گوشہ ہے اور ان دنوں وہ اپنا ہندوستان کا سفرنامہ لکھ رہا ہے۔ ہم نے ایک دو نوجوان لڑکے ملازم دیکھے۔ وہ یہاں ایک گوشہ گزیں کی طرح رہتا تھا، اپنی کتابوں اور اپنے لکھنے پڑھنے کے سامان کے ساتھ۔ اس کی عورت کا (اگر اس کی کوئی عورت تھی) آس پاس کوئی نشان نہ تھا۔ ہم نے اس کا کتب خانہ دیکھا۔ اردو اور فارسی کی کتابیں، اس کے عالم و فاضل مرحوم باپ مبارک شاہ

صاحب کی اکٹھی کی ہوئیں۔اس نے ہمیں حیرت شملوی کے مسودات اور ملفوظات کے انبار بھی دکھائے اور رئیس امروہوی مرحوم کے کاغذ کے پرزوں پر لکھے اشعار کا ذخیرہ بھی۔اس نے ہمیں بتایا کہ پچھلے برس رئیس امروہوی صاحب یہاں اس کے پاس مہینہ بھر مہمان رہے۔ وہ کاغذ کے پرزوں پر اشعار، رباعیات لکھ لکھ کر ردّی کی ٹوکری میں پھینکتے رہتے تھے اور وہ ان سے آنکھ بچا کر ان 'تبرکات' کو محفوظ کر لیتا تھا۔ وہ رئیس امروہوی کا ذکر بڑی والہانہ شیفتگی سے دیر تک کرتا رہا۔ انیس شاہ جیلانی مجھے ان خبطی لوگوں میں سے لگا جو ادب پر 'پکے' ہوتے ہیں اور ادیبوں یا کتابیں لکھنے والوں کو اس ذوق شوق سے 'جمع' کرتے ہیں جیسے ٹکٹ جمع کرنے والے نادر ٹکٹوں کو۔اس نرم گفتار، خوش ذوق شخص کی طبیعت لطافت اور ظرافت کے عنصروں سے بنی تھی اور اس کی صحبت میں وقت گزرنے کا پتا نہ چلا۔ پھر ہم وہاں سے چلے آئے۔اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ مجھے خط لکھتا رہے گا۔شاید اس نے ایک دو خط لکھے بھی، جن کا جواب میں نے نہیں دیا۔

اس ملاقات کو آٹھ نو برس سے زائد عرصہ ہونے کو آیا ہے (میں اس کی کتاب کی پشت پر اس کے فوٹوگراف سے دیکھ سکتا ہوں کہ اس کی 'اسٹیونسونین' مونچھیں برف کی سی سفید ہو چکی ہیں؛ اسی طرح سر کے بال جو ماتھے سے بہت پیچھے ہٹ گئے ہیں۔ چہرے پر کچھ پرچھائیاں سی آگئی ہیں۔ ہاں وہ رومانی آگ آنکھوں میں اب بھی ہے (وہ میری طرح پیرِ فرتوت نہیں ہوا، نہ ہی بجھا ہوا)۔تقریباً نو برس کے بعد کوئی تین مہینے ہوئے اس کا پہلا خط مجھے ملا۔لفافے پر میرا بہاول پور کا پتا درج تھا اور ظاہراً اس کے خیال میں میں ابھی تک بہاول پور ہی میں تھا۔سرنامے میں مجھے ''بخدمت جناب ادیبِ شہیر'' لکھا تھا۔ میں خوب ہنسا۔ میں نے اپنے جواب میں اس خطاب پر احتجاج کیا اور اسے لکھا کہ میں 'ادیبِ شہیر' کی قسم کی کوئی چیز نہیں اور اس لفظ سے مجھے نفرت ہے۔مزید یہ کہ میں 'ادیب' بھی نہیں صرف ادب پڑھنے والا ہوں۔اس طرح ہمارے درمیان خط و کتابت جاری ہو گئی۔ میں نے اس کے رئیس امروہوی مرحوم پر لکھے ایک مضمون کی تعریف کی۔اس نے لکھا کہ وہ رئیس پر ایک ہزار صفحات کی کتاب لکھ سکتا ہے، اس کے پاس اتنی باتیں کہنے کی ہیں، مگر اسے چھاپے گا کون...پھر ایک خط میں اس نے مجھے بتایا کہ اس نے ہندوستان کے سفرنامے والی کتاب کئی سال پہلے مکمل کر لی تھی لیکن اسے 'زیورِ طباعت' سے آراستہ کرنے کے لیے اس کے پاس پیسے نہ تھے۔مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ اس کے لیے کسی شریف النفس پبلشر کی تلاش

Scanned with CamScanner

کروں۔ پھر اس کا آخری خط آیا۔ اس نے سرائیکی زبان میں ایک کتاب ''مہانڈرا ڈیکھنس'' لکھی تھی اور وہ چاہتا تھا کہ میں ''افکار'' میں اس پر تبصرہ کروں۔ میں نے اسے فوراً لکھا کہ گو میں سرائیکی ہوں ضرور، مجھے سرائیکی عبارت کو پڑھنے میں سخت دقت ہوتی ہے اور وہ کسی سرائیکی ادیب سے اس پر تبصرہ کرا کے مجھے بھیج دے۔ مگر چند روز بعد ''مہانڈرا ڈیکھنس'' کا رجسٹرڈ پیکٹ آ گیا۔ اس کے بعد اغلاط نامے کا ایک پوسٹ کارڈ... سو تبصرہ مجھے ہی کرنا ہوگا ہر حال میں۔

''مہانڈرا ڈیکھنس'' مکمل پڑھنے میں مجھے پندرہ دن لگے ہیں کیونکہ سرائیکی خط پڑھنے کی مجھے مشق نہیں، اور ساری کی ساری مصنف کے اپنے خط میں لکھی ہوئی ہے (گو وہ نہایت خوش خط ہے)۔ 'مہانڈرا' سرائیکی میں بڑے یا عظیم شخص کو کہتے ہیں، 'ڈیکھنس' نظر آنے والا ہے۔ میرے دوست انیس شاہ جیلانی کی یہ کتاب پاکستان کی گیارہ عظیم یا معتبر شخصیات کے قلمی خاکوں پر مشتمل ہے۔ یہ عظیم شخصیات کون ہیں؟ سابق گورنر جنرل غلام محمد، لیاقت علی خاں، فیض احمد فیض، مولانا مودودی، فیض محمد دلچسپ، بھٹو، نظامی صیب [صاحب] محمد علی جناح، فقیر بخت علی، صادقین، رفیق ساحل، ڈاکٹر نبی بخش بلوچ۔ ٹھیٹھ سرائیکی زبان میں لکھے یہ خاکے تیکھے، انوکھے اور خوبصورت ہیں اور مصنف ملک وقوم سے محبت کرنے والا ایک دردمند نواز ادیب ہے جو جانتا ہے کہ اعلیٰ مناصب پر فائز ہونے والے یا شہرت پانے والے لوگ ہی عظیم نہیں ہوتے، بخت علی فقیر جیسے لوگ بھی عظیم ہوتے ہیں جو کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے اور 'ان پڑھ' ہونے کے باوجود اپنی زبان میں دل پر اثر کرنے والی شاعری کرتے ہیں جسے کبھی چھپنا نصیب نہ ہوگا۔ وہ مشہور نہیں ہیں، ان کے نام اور کام کو کوئی نہیں جانتا، اخبار ان کے ناموں کی سرخی نہیں جماتے، لیکن کیا وہ ان لوگوں سے کم عظیم ہیں جو دنیا میں شور وغل مچاتے ہیں؟ مجھے (شروع شروع کی جانکاہی کے باوجود) ان خاکوں کو اپنی پیاری سرائیکی میں پڑھنے میں بڑا لطف حاصل ہوا۔ ہماری علاقائی زبانوں میں سرائیکی زبان بولنے اور لکھنے میں سب سے میٹھی ہے۔ پنجابی، پشتو یا بلوچی کے برعکس (جو بڑی بولیاں ہیں، اور جن کے دامن میں کافی ادبی سرمایہ ہے) سرائیکی بولتے ہوئے گلے میں ذرا بھی کھڑکھڑاہٹ محسوس نہیں ہوتی، گویا کہ شیر میں شکر کو ملا کر رکھ دیا گیا ہو۔ اور سرائیکی زبان میں عظیم ادب بھی موجود ہے — خواجہ غلام فرید کی لافانی کافیاں، مولوی لطف علی کی مثنوی سیف الملوک۔

بخت علی فقیر (جو اب اسی برس کا ہو چلا ہے) پیشے کے لحاظ سے ایک قلعی گر تھا اور انیس شاہ نے

خودا سے احمد پور لمّہ میں گاؤں والوں کے برتن قلعی سے اُجالتے دیکھا ہے۔ وہ تب عنفوانِ شباب میں تھا۔ پھر اس کو عشق کی ٹھوکر لگی اور وہ ایک سانولی سلونی کی محبت میں گھلنے لگا۔ اس خطے کے لوگ محبت کے لیے ہی بنے ہیں اور اس کے بغیر رہ نہیں سکتے۔ اس خاتون کا نام شاید بخت بی بی تھا۔ وہ ایک قلعی گر سے 'مکلانا' یا بیاہ کرنا نہیں چاہتی تھی، بخت علی کا دل ٹوٹ گیا۔ اس نے دھندا چھوڑ دیا، فقیر اور شاعر بن گیا۔

اس سرائیکی کے رابرٹ برنز کی ایک آتشیں رومینٹک نظم کا آزاد اردو ترجمہ یہ ہے:

اے سانول (محبوبہ)، لحہ لحہ تیری گھنیری سیاہ آنکھیں مجھے مارے ڈالتی ہیں۔ یہ تیری قاتل آنکھیں بے دھڑک مجھ پر تیر چلاتی ہیں۔ نہ مرنے دیتی ہیں نہ جینے۔ ان میں سرمے کی تحریر کے بغیر بخت قتل ہو گیا۔ اُس کا دل چھلنی چھلنی ہوا۔ سانول کا چہرہ نور سے تاباں تھا۔ آنکھیں نشیلی، بیچ میں سیاہ زلف لٹکتی ہے۔ بخت کا دل اس حسن پر کیوں نہ صدقے ہو، کیوں نہ تڑپے، عشق کے تھپیڑے تلوار کٹار کے وار سے زیادہ سخت، زیادہ بے رحم ہوتے ہیں... نہ یار سے وصال ہوتا ہے اور نہ ہی موت مجھے ختم کرتی ہے۔ لحہ لحہ دل ڈوبتا جاتا ہے... بخت! کوئی ایسی تقصیر تیرے پلّے آن پڑی ہے کہ اس دن تک تیرا درد نہیں مٹا۔"

مگر ترجمے میں سرائیکی ادب کی وہ خاص کیفیت جو روہی کی سرزمین نے یہاں بسنے والوں کی طبیعت یا مزاج یا ان کی خوبصورت زبان میں پیدا کی ہے، نا سمجھ کو مزہ نہیں دے سکتی۔ سرائیکی کا جادو، اس کی نا قابلِ یقین حلاوت —— یہ ایسی چیزیں ہیں جو اسی زبان کے ساتھ مخصوص ہیں۔

"مہانڈرا ڈیکھنس" میں ہر قلمی خاکے کے ساتھ اس شخصیت کا فوٹو ہے، فیض احمد فیض میر پور خاص کے ایک ۱۹۷۳ء میں منعقد ہونے والے مشاعرے میں نظم پڑھ رہے ہیں (انیس شاہ نے اس میں شرکت کی تھی)۔ سب سے دلچسپ تصویر ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی ہے۔ سکھر کے ایک فوٹو گرافر کی کھینچی ہوئی اور ان وقتوں کی جب وہ صاحبِ اقتدار تھے۔ سفید سوٹ، سیاہ ٹائی پہنے وہ آنکھیں پھاڑے گھوٹکی میں کسی جگہ کھڑے ہیں اور ہمارے انیس شاہ جیلانی کا ماموں سیّد بہادر علی شاہ جیلانی سرائیکی پگڑ اور قبا میں ان کی آنکھوں میں سرمے کی سلائی پھیر رہا ہے۔ تعظیم اور چاہت کی علامت، کحل کی یہ دھار سرائیکی شاعری اور ادب میں بار بار آتی ہے... ہم سب روہی کے رہنے والے اس کحل کی دھار کے کشتہ ہیں، ہم پر رحم کھاؤ۔

Scanned with CamScanner

تو یہ ہے انیس شاہ جیلانی کی دل لبھانے والی کتاب، ایک قلمی دستاویز، غالباً سرائیکی میں اپنی طرز کی پہلی اور واحد کتاب۔ اللہ اس دیوانے روہیلے کے وسائل اتنے وسیع کرے کہ وہ اپنے سب خواب پورے کر سکے۔ وہ ابھی اتنا بوڑھا نہیں ہوا اور جیسا کہ انگریزی شاعر رابرٹ براؤننگ نے کہا، عمر کا بہترین حصہ آگے آنے والا ہے:

The best is yet to be.

(فنون، لاہور)

Scanned with CamScanner

پیروڈیاں

Scanned with CamScanner

چھتری

تین بجے صبح ہی میری نے مجھے جگا دیا۔ آج میں نیویارک کو چند دنوں کے لیے چھوڑ کر جا رہا تھا۔ چھ ہزار میل ہوائی جہاز کو پائلٹ کرنا تھا۔ میری نے میری قمیصیں اور ٹائیاں احتیاط سے سوٹ کیس میں تہہ کیں۔ میری کہہ رہی تھی، ''ٹمبکٹو میں تمھاری ٹائیاں کون استری کرے گا؟'' اس کی نیلی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھلک تھی۔ میں خاموش تھا۔ زندگی کے یہ لمحے جو میں نے میری کے ساتھ گزارے تھے پھر نہ آئیں گے!

میں سیڑھیوں سے نیچے اترا اور کھانے کے کمرے میں میری کے والد مسٹر ہاچ پاچ کو آخری الوداع کہنے کے لیے گیا۔ وہ حسبِ دستور شراب نوشی میں مشغول تھے۔ جان ہیگ کی بوتل اور ''اسکوائر'' میگزین کی ایک کاپی سامنے میز پر رکھی تھی۔ ''اسکوائر'' میگزین اس صفحے پر کھلی تھی جہاں متعدد ننگی ٹانگوں کی تصاویر تھیں۔

مسٹر ہاچ پاچ کہہ رہے تھے، ''اسی سال سے زندگی میں میں نے کیا کچھ نہیں کیا۔ ہر پھول سے میں نے بھونرے کی طرح رس چوسا ہے، لیکن وہ لذت جو مجھے جان ہیگ اور ننگی ٹانگوں کی تصاویر سے حاصل ہوئی ہے وہ کسی اور شے میں نہیں ملی۔ قماربازی میں بھی نہیں۔ جان ہیگ اور اسکوائر میگزین کے علاوہ سب بکواس ہے۔ اچھا ہے میری بیوی عرصے سے مرچکی ہے۔''

مسٹر ہاچ پاچ نے وہسکی کا گلاس میری طرف بڑھایا۔ میں نے کہا، ''مسٹر ہاچ پاچ، مجھے معاف کیجیے، میں رات کو تین بجے وہسکی پینے کا عادی نہیں۔'' ویسے بھی جان ہیگ کی بوتل میں وہسکی کی

---

* جب یہ پیروڈی ۱۹۵۶ء میں پہلی بار شائع ہوئی تو اس کے عنوان کے اوپر ''جدید امریکی ادب پر ایک طنز'' اور نیچے قوسین میں ''سنکلیئر لوئیس سے معذرت کے ساتھ'' کی سرخیاں درج تھیں۔ یہ بظاہر اردو کے معروف ادیب کی اُس مشہور تخلیق کی طرف سے توجہ ہٹانے کی کوشش تھی جس کی پیروڈی کی گئی تھی۔ یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ یہ کوشش پڑھنے والوں کو گمراہ کرنے میں کس حد تک کامیاب ہوئی۔ البتہ یہ معلوم ہے کہ مذکورہ ادیب کے سلسلے میں، جو پیروڈی نگار کے قریبی دوست بھی تھے، یہ بالکل ناکام رہی اور دونوں کے باہمی تعلقات ایک عرصے تک کشیدہ رہے۔ (اجمل کمال۔)

Scanned with CamScanner

بزرگ نے غصے سے ہنٹر چلایا۔ کالج میں جوجتسو کا ماہر ہونے کی وجہ سے میں صاف وار بچا گیا۔

''بڑے پھرتیلے ہو۔ مجھے ایسے نوجوان اچھے لگتے ہیں۔''

فی فی کا باپ ٹمبکٹو میں امریکی نائب شارژدی افیئر (charge d'affairs) تھا۔ وہ مجھے اپنی کار میں پیچدار گلیوں میں سے شہر کے باہر ایک عمدہ مکان پر لے گیا جو بڑا عالیشان تھا۔ اس سے راستے میں بڑے مزے کی باتیں ہوتی رہیں۔ وہ مرید ہو گیا۔ اس سے پتا چلا کہ فی فی کی طبیعت ناساز تھی اس لیے وہ ہوائی اڈے پر نہیں آئی۔ مکان پر پہنچے تو فی فی کمرے میں بند تھی۔ بزرگ نے مقفل دروازہ کھول کر اسے باہر نکالا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے شرم سے اپنے صندلی چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ امریکی لڑکیاں بھی شرماتی ہیں۔ دراصل فی فی کے والد نے ایک ہوٹنٹاٹ (Hotintot) عورت سے شادی کر لی تھی۔ فی فی کو یہ شرم و حیا اپنی والدہ سے ملی تھی۔ امریکہ میں عورتوں میں تصنع اور نمائش ہے۔ ہوٹنٹاٹ عورتیں محبت کرتی ہیں تو سادگی، الھڑ پن اور جذبات کی آتش فشانی سے کہ پتھر کے مجسمے بھی پگھل جاتے ہیں۔

شام کو پیلا پیلا چاند نکلا۔ کھجور کے پیڑ سڑک کے دورویہ چلے گئے تھے۔ مسٹر شلانگ پٹانگ کی کوئی اپائنٹمنٹ تھی۔ فی فی اور میں ان کی کار لے کر نکل گئے۔

کیفے ڈی ٹمبکٹو میں پہنچے۔ حبشی بینڈ بج رہا تھا۔ رقص گاہ میں خود سلطان آف ٹمبکٹو چند مہ وش حسینوں کے جھرمٹ میں ایک بدصورت گوریلے کی طرح بیٹھے تھے۔ انھوں نے ایل ایل ڈی کی ڈگری کی وہ خلعت پہن رکھی تھی جسے مسٹر جان فاسٹر ڈلس اوٹاہ یونیورسٹی کی طرف سے ان کی خدمت میں پیش کر گئے تھے۔

کیفے ڈی ٹمبکٹو میں مشرق اور مغرب کی چند عریاں عورتیں اسٹیج پر ناچتی ہیں۔ بوڑھے امریکی یورپی تاجر اور چند شیخ انھیں خوردبینوں میں سے دیکھتے ہیں۔ معلوم ہوا یہاں ہر شخص کی جیب میں خوردبین ہوتی ہے۔ مجھے فوراً مسٹر ہاچ پاچ یاد آ گئے۔ ویسے مجھے ایسے عریاں ناچ میں کوئی لطف حاصل نہیں ہوتا جس میں ناچنے والے دوسرے ہوں۔

فی فی کے والد یہاں پہلے ہی موجود تھے۔ انھوں نے سلطان سے میرا تعارف کرایا۔ سلطان مجھ سے بڑی دیر تک دلچسپ باتیں کرتے رہے۔ انھوں نے بتایا کہ انھیں مغربی ناچ سے بڑی محبت ہے اور یہ کہ وہ اکثر یہاں آتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

وہ کہہ رہے تھے، ''تم ناچتے ہو؟''

ان کے اصرار پر میں نے اور فی فی نے اسٹیج پر برہنہ رمبھا ناچا۔ بڑی واہ واہ ہوئی۔ نیچے اترے تو سلطان نے دونوں گالوں پر میرا بوسہ لیا اور بتانے لگے کہ چند دن ہوئے ان کے حرم کی ایک پیرسی (Parisian) حسینہ محل سے بھاگ نکلی۔ بڑی تلاش کے باوجود اس کا پتا نہ ملا۔ آخر ان کا ایک پالتو لنگور اُس کو ڈھونڈ ڈھانڈ کے لے آیا۔ سلطان نے بتایا کہ انھوں نے لنگور کو اپنے پرنسپل باڈی گارڈ کا سالار مقرر کر دیا تھا۔ وہ اب مر چکا تھا۔ اس کی اسامی خالی تھی۔ کیا میں اس عہدے کو قبول کر دوں گا؟

سلطان نے بے تحاشا پی رکھی تھی۔ میں نے جواب دینا ضروری نہ سمجھا۔

فی فی نے ایک پریشان بالوں اور موٹے ہونٹوں والے ایک منحنی شخص سے میرا تعارف کرایا۔

''یہاں کے سب سے بڑے ادبی نقاد ڈاکٹر شٹو پا ہیں۔''

ڈاکٹر شٹو پا اٹھ کر ملے۔

فی فی نے ڈاکٹر شٹو پا کے کیریئر پر روشنی ڈالی:

''بچپن میں ان کو ٹی ایس ایلیٹ نے جیمز جوائس اور ہکسلے کی موجودگی میں چوما تھا اور آشیر باد دی تھی۔ آپ انسپائر ہو گئے۔ اس کے بعد آپ نے نٹال یونیورسٹی سے ڈاکٹری کی ڈگری لی اور ادب کے مختلف رجحانات پر طویل مقالے لکھے۔ ان کو کوئی نہیں پڑھتا تھا۔ مسٹر شٹو پا بڑے مشہور ہو گئے۔ آپ نے ایک معرکۃ الآرا مقالہ لکھا کہ پرانے ادبی نقادوں کو اب میدان چھوڑ دینا چاہیے۔ آپ کا شہرہ آسمان پر جا پہنچا۔ پھر آپ نے نئی فکر کے لکھنے والوں پر ایک زوردار تنقید کی۔ نئی فکر کے مصنفین نے انھیں کالج کے باہر بری طرح زدوکوب کیا۔ اب یہ خاموش ہو چکے ہیں۔ ادبی حلقوں میں اب ان کی ایک پرانے نقاد اور ادبی خادم کی حیثیت سے عزت کی جاتی ہے۔''

''آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔''

میں نے ڈاکٹر شٹو پا کو بتایا کہ میں بھی رائٹر ہوں۔ فی فی نے کہا، ''میں رائٹرز سے محبت کرتی ہوں۔''

اتنے میں ایک لمبا تڑنگا، اوٹ پٹانگ شخص آیا۔ آپ کی شکل رونی تھی۔ فی فی نے تعارف کرایا۔

''یہاں کے سب سے بڑے مزاح نگار مسٹر ہنگل باش ہیں۔''

فی فی نے ہنگل باش کی طرف شرارت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا، ''ان کے کیریئر کی

Scanned with CamScanner

کہانی بھی بڑی دلچسپ ہے۔ بچپن میں یہ عملی مذاق کرنے کے بے حد شوقین تھے، جو کبھی خود ان سے ہو جاتے تھے۔ اسکول میں یہ اکثر اسکول کی کاپیوں میں اپنے ماسٹروں کے کارٹون بنایا کرتے تھے۔ اس پر کئی دفعہ پیٹے گئے۔ گھر والوں نے ان کی شادی رچانے کا ارادہ کیا۔ انھوں نے اُن سے عملی مذاق کیا اور عین شادی کے دن بھاگ نکلے۔ دو مہینے پاگلوں کی طرح کشمیر اور پیر پنجال کے پہاڑوں میں غائب رہے۔ واپس لوٹے تو وکالت میں داخل ہو گئے۔ وہاں بھی شگفتہ اور خندہ جبیں تھے۔ اکثر الو بنائے جاتے۔ ان کے والد کہیں انجن ڈرائیور تھے۔ یہ ازراہِ کسر نفسی والد کا پیشہ بتانے سے احتراز کرتے۔ اسی اثنا میں مارک ٹوین نے ان کی پیٹھ ٹھونکی اور یہ مزاح نگار ہو گئے۔ انھوں نے سستے امریکن جوکس کی بے شمار کتابیں اکٹھی کیں۔ یہ ان جوکس کو اپنے افسانوں کے کرداروں کے منھ سے ادا کر دیتے۔ ان کا شہرہ آسمان پر پہنچ گیا۔ نقادوں نے واہ وا کی۔ ڈاکٹر شٹو پا نے انھیں زولوی میں شگفتہ ادب کا بانی قرار دیا۔ آٹھ کتابیں لکھنے کے بعد لوگوں کو ان کے لکھنے کے ڈھنگ کا پتا چلا۔ وہ سب ایک ہی طرح کی تھیں۔ 'الثنا' میں آپ کی ابلیسی ڈائریاں بچوں اور چودہ سالہ لڑکیوں میں بے حد مقبول ہوئیں۔ آپ قومی حیثیت اختیار کر گئے۔ 'الفانی' میں آپ کے سرقے پر ایک تابڑ توڑ مضمون نکلا جس میں ثابت کیا گیا کہ ان کا ایک مضمون ہو بہو مارک ٹوین کے 'انوسنٹس ابراڈ' (Innocents Abroad) کا چربہ ہے۔ عزت خاک میں مل گئی۔ ذلیل و خوار ہوئے۔ ٹمبکٹو ریڈیو پر 'حوالدار میجر چھبو خان' کا مستقل فیچر ترتیب دینے پر مقرر ہوئے۔ اب شادی کرنے کی کوشش کی۔ پرانی لڑکیوں سے خط و کتابت کی۔ ان کی شادی ہو چکی تھی۔ ایک بوڑھی باجی نے، جن کی لڑکی سے یہ عشق لڑا رہے تھے، انھیں گھر پر بلا کر جوتے لگوائے۔ شادی سے توبہ کی۔ آج کل کیفے ڈی ٹمبکٹو میں چیف کلاؤن ہیں۔ میلنکولیا کے مریض ہیں۔"

"تم نے تو تقریر ہی شروع کر دی۔"

مسٹر ہنگل باش کا چہرہ غضب سے لال ہو گیا۔ اس نے جذباتی طور پر کانپتے ہوئے کہا، "مادام نے اس شخص کے سامنے میری توہین کی ہے۔"

اُس نے فی فی پر اپنے ہاتھ دراز کیے۔ میں نے بڑھ کر اس کا راستہ روک لیا۔ "آپ مجھ سے بات کیجیے۔ فی فی کو آپ کچھ نہیں کہہ سکتے۔"

اس نے قہر بھری آنکھوں سے مجھے دیکھا اور مجھ پر مکے کا وار کیا۔ میں مشہور ورلڈ چیمپین جو لوئیس

Scanned with CamScanner

سے ایک عرصے تک مکے بازی کا سبق لیتا رہا تھا اور ایک بار ایک دوستانہ باؤٹ میں میں نے جو کو ناک آؤٹ بھی کر دیا تھا۔ میں نے مسٹر بنگل باش کو زناخ سے ٹھوڑی پر دو مکے رسید کیے۔ سب لوگ ہمارے گرد اکٹھے ہو گئے۔ بنگل باش کو ناک ڈاؤن کر کے میں نے اطمینان سے فی فی سے کہا، ”آؤ گھر چلیں۔“

سلطان بولے، ”ایسا بہادر اور بردبار آدمی میں نے ساری عمر نہیں دیکھا۔ خدا جانے اس ملک میں ایسے ذلیل آدمی کیوں ہیں۔ ہمیں اس سیاح کا فوراً بت نصب کرنا چاہیے۔“

واپسی پر خوشبودار رات میں گزرتے ہوئے فی فی نے کہا، ”تم اچھے باکسر بھی ہو، اچھے رائٹر بھی، اچھے ہواباز بھی۔ مجھے اپنے ساتھ لے جاؤ۔“

”میں سیاح ہوں۔ مجھے ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔“

”اچھا مجھے اپنا فوٹو دیتے جانا جو تم نے ہواباز کی یونیفارم میں کھنچوایا ہے۔ میں اسے مرتے دم تک اپنی خوابگاہ کے آتش دان پر رکھوں گی۔“

میں نے اسے فوٹو دے دیا۔

باب البصیر کے پاس بارش شروع ہوئی۔ مجھے اپنی چھتری یاد آئی۔ وہ کھوئی گئی تھی۔ وہ کہاں گئی؟ اس نے میرے ساتھ جگہ جگہ کا سفر کیا تھا اور اس سے میری زندگی کی کتنی ہی حسین یادیں وابستہ تھیں۔ معاً مجھے یاد آیا، بونگاباوا پر ہوائی جہاز سے کودتے ہوئے میری نے چھتری کو پیراشوٹ سمجھ کر استعمال کر لیا تھا۔ مجھے وہ چھتری ضرور حاصل کرنی چاہیے۔ بارش تیز ہو گئی۔ میں نے ایک دکان سے نئی چھتری خرید لی جو بالکل گم شدہ چھتری جیسی تھی۔

مرسامتروح ٹمبکٹو سے چھ سو میل دور ہے۔ یہاں پر بھوری چٹانیں ہیں۔ خوشبودار گھاس پھوس کے میدان ہیں۔ آموں اور کھجوروں کے باغات ہیں۔ باب السودا کے پاس چند شتر مرغ بازار میں سیر کرتے ملے۔ میں بھی ان میں شامل ہو گیا۔

کسی زمانے میں یہ شہر علم و تہذیب کا گہوارہ تھا۔ فنونِ لطیفہ کی تخلیق یہیں سے ہوئی تھی۔ سب سے پہلے اس شہر میں بنی آدم نے کپڑے پہننے کا رواج سیکھا تھا۔ دنیا کا پہلا درزی یہیں آباد تھا۔ پہلا حجام بھی یہیں آیا تھا۔ اس کی دکان دیکھنے کے لیے گیا۔ وہاں اب سلطان کا عالیشان محل کھڑا ہے۔

بودالعرب کے میدان میں بے شمار ہاتھی پھرتے ہیں۔ ایک ریستوراں میں دریائی گھوڑے کا

Scanned with CamScanner

گوشت کھایا۔ یہ ان لوگوں کی مرغوب خوراک ہے۔ شط الجبال کے چوک میں دنیا کے سب سے بوڑھے آدمی کو دیکھا۔ اس کی عمر دس ہزار سال بتائی جاتی ہے۔ اس کا مقبرہ پتھر کی ایک اونچی ڈھیری سی ہے۔ مقبرے کے گرداگرد لوہے کی سلاخوں کا کٹہرا ہے۔

لوگ بڑے ذلیل اور مفلس ہیں۔ کیا شیوخ اور کیا عام مرد، سب کیلے کے پتوں کے اسکرٹ پہنتے اور ہاتھوں میں بھالے اٹھائے چلتے پھرتے ہیں۔ قمیص پہننے کا یہاں دستور نہیں۔ لوگ ٹریفک سنس سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ تین چار میری ٹیکسی کے آگے آتے آتے بچے۔

میں خلیفہ البقری کے مزار کے باہر کھڑا تھا کہ پانچ لڑکیاں آئیں۔ انھوں نے وہی کیلے کے پتے کے اسکرٹ پہنے ہوئے تھے اور چاندی کے زیورات سے لدی پھندی تھیں۔

''ہماری مدد کیجیے۔''

''فرمایئے۔''

''سلطان کے آدمی صبح سے ہمارا تعاقب کر رہے ہیں۔ وہ ہمیں پکڑ کر سلطان کے حرم میں لے جانا چاہتے ہیں۔''

''تو آپ پکڑی جائیں۔''

ان میں سے دو تین ہنس پڑیں۔ بزرگوں کی دعا سے مجھ میں لوگوں کو ہنسانے کا قدرتی ملکہ ہے۔

''نہیں، سلطان بڑا ظالم ہے۔ اس کی پہلے ہی دو ہزار بیویاں ہیں۔''

''چلو، دو ہزار پانچ ہو جائیں گی۔''

اتنے میں سلطان کے آدمی بھی وہاں پہنچ گئے۔ وہ چار پستہ قد سپاہی تھے۔ سر پر طربوش اور بدن پر رنگین جبے۔ ہاتھوں میں بھالے تھے۔ لڑکیاں سہم کر میرے نزدیک ہو گئیں۔

میں نے ان سے پوچھا، ''کیوں، کیا بات ہے؟ ان لڑکیوں کے تعاقب سے تمھارا کیا مطلب ہے؟''

ان کا سردار بولا، ''آپ ہٹ جائیں۔ ان پر سلطان کی نظر ہے۔''

میں نے جوجتسو کے ٹرِک سے سردار کو چِت کر دے مارا۔ دوسرے سپاہی بھاگ کھڑے ہوئے۔

''آیئے اب ہم ان کا تعاقب کریں۔''

Scanned with CamScanner

لڑکیوں نے اپنا تعارف کرایا۔ ایک کا نام موشا تھا، دوسری کا نام خوخو تھا، تیسری کا نام بجو تھا، چوتھی کا نام میری سمجھ میں نہ آیا۔

''آؤ تمھاری تصویریں لیں۔''

جب میں نے اپنے کیمرے کو ان پر فوکس کیا تو وہ دہشت کے مارے کانپنے لگیں۔ انھوں نے کیمرا پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ اسے بندوق کی قسم کا کوئی خطرناک ہتھیار سمجھیں۔ یہ کیمرا مجھے چیکوسلوواکیہ میں فرولائن گوئرنگ نے تحفتاً دیا تھا۔ خود ہر ہٹلر نے اس سے تصویریں کھینچی تھیں۔

ان لڑکیوں نے وعدہ کیا کہ وہ شام کو مجھے بودالعرب میں ملیں گی۔

شام کو بودالعرب کے پاس صرف موشا آئی۔

''وہ شرمیلی لڑکی کیوں نہیں آئی؟''

موشا نے اس کا برا مانا۔ ''میں اسے خود چھوڑ آئی۔ اس کے پانچ عاشق ہیں۔''

ہم ایک کرائے کے شترمرغ پر چاندنی میں سیر کو نکلے۔ رات کا مرسامتروح صبح اور دوپہر کے مرسامتروح سے بالکل مختلف نظر آتا ہے۔ کھجوروں کے درخت دم بخود نظر آتے ہیں۔ سحر آلود۔ ہم شہر کے باہر جبل الدیر پر بڑی دیر بیٹھے رہے۔ جبل الدیر میں اس فاختہ نے جو حضرت سلیمان کی شادی کا پیغام ملکہ سبا کو لے گئی تھی، تھوڑی دیر کے لیے دم لیا تھا۔ اس فاختہ کی اولاد اب بھی یہاں مقیم ہے اور ان کی فریاد عشاق کے دلوں کو تڑپاتی ہے۔

موشا نے گٹار پر نغمہ بجایا۔

''کیا آپ مجھے پسند کرتے ہیں؟''

''پسند کا کیا سوال ہے!''

''آپ مجھے خوخو اور بجو سے زیادہ پسند کرتے ہیں نا؟''

''خوخو اور بجو کیوں نہیں آئیں؟''

''وہ امریکی فلم کمپنی میں رات کو کام کرنے جاتی ہیں۔''

''تم کیوں نہیں جاتیں؟''

''مجھے تم زیادہ پسند ہو۔''

''شکریہ۔ شرمیلی لڑکی کہاں ہے؟''

موشا ناراض ہوگئی۔ یہ لڑکیاں بڑی جذباتی ہوتی ہیں۔ ان میں رقابت کا جذبہ شدید ہوتا ہے۔

اگلے دن میں کسی سلسلے میں وہاں کی عدالت العالیہ کے اندر چلا گیا۔ دو تین بزرگ چغے پہنے مسندوں پر بیٹھے پیچوان گڑگڑا رہے تھے۔ درمیان کا بزرگ قاضی القضاۃ تھا۔ باقی دو صرف قاضی تھے۔ مجرم پیش ہونے لگے۔

ایک عورت نے شکایت کی، ''میرا خاوند مجھے پیٹتا ہے۔''

تینوں بزرگوں نے آپس میں سر جوڑے اور کچھ کھسر پھسر کی۔

عورت کے خاوند کو بلوایا گیا۔ وہ ایک لمبا قوی ہیکل شخص تھا اور بازو کی مچھلیاں ابھری ہوئی تھیں۔ غالباً وہاں کا مشہور پہلوان ہوگا۔

قاضی القضاۃ نے سپاہیوں کو حکم دیا، ''اس آدمی کو پکڑ کر لٹا دو۔''

سپاہی چھوٹے قد کے ذلیل آدمی تھے۔ خاوند نے قطعی طور پر پکڑے جانے سے انکار کر دیا اور ایک دو سپاہیوں کو مار کر فرش پر گرا دیا۔ عدالت کے کمرے میں اُدھم مچ گیا۔ قاضی القضاۃ تو اپنی تمکنت کے پیش نظر وہاں بیٹھے رہے، باقی دو قاضی کسی کام کا بہانہ کر کے فرار ہو گئے۔

آخر میں آگے بڑھا۔ میں نے خاوند سے کہا، ''لیٹ جاؤ۔''

اس نے مجھے غور سے دیکھا اور پھر چپ چاپ لیٹ گیا۔

''اب اسے اچھی طرح پکڑ لو اور لٹائے رکھو۔''

پانچ سپاہیوں نے اسے آ کر پکڑ لیا۔ اس نے اٹھنے کی جرأت نہ کی۔

قاضی القضاۃ نے کہا، ''یہ تم کو پیٹتا ہے۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تم بھی اسے پیٹو۔''

عورت نے پس و پیش کیا۔ قاضی القضاۃ نے اسے جھڑکا اور ہتک عدالت کی دھمکی دی۔ عورت نے مجبوراً اپنے جوتے سے اپنے خاوند کی پیٹھ پر تیس چالیس ضربیں لگائیں۔ وہ ہانپنے لگی۔

''دوسرا ملزم حاضر کیا جائے۔''

اس کی فرد جرم پڑھی گئی۔ اس نے سلطان کے چڑیا گھر سے ایک بن مانس چرا لیا تھا۔ قاضی القضاۃ نے فیصلہ کیا، ''تم بن مانس کو اپنے پاس رکھ سکتے ہو لیکن اس کی بجائے اب تم بن مانس کے

Scanned with CamScanner

پنجرے میں رہو گے۔"

شام کو میں اور وہ شرمیلی لڑکی جو پہلے دن نہیں آئی تھی، دریائے شوتر کے کنارے پر پہنچے۔ یہاں میڈ برادرز (Mad Brothers) کی مشہور فلم کمپنی ہالی وُڈ سے ایک فلم کے افریقی سینز کی شوٹنگ کے لیے آئی ہوئی تھی۔ مرسامتروح کی کل آبادی اس شوٹنگ میں حصہ لے رہی تھی۔ خود سلطان نے بھی اس میں تفریحاً تھوڑا سا پارٹ کیا تھا۔

ڈائرکٹر کنگ وائپر سے بھی ملاقات ہوئی۔ خوب پلا ہوا شخص تھا اور بڑا تیز طرار۔ اس نے اگلی فلم کے لیے مجھے ہیرو کے رول کی پیش کش کی۔

"جی نہیں۔"

"آٹھ ہزار ڈالر روز کے ملیں گے۔"

"نہیں جی، خدا کا دیا سب کچھ ہے۔"

مارلین ڈیٹرچ سے بھی ملاقات ہوئی۔ اب کچھ بوڑھی ہو چلی ہیں۔ چہرے پر جھریاں نمودار ہو چکی ہیں۔ ہیں ویسی کی ویسی چونچال۔ بڑی پر لطف صحبت رہی۔ آپ نے اپنی ٹانگیں دو لاکھ ڈالر میں انشور کرا رکھی ہیں۔ مجھے تو ان میں کوئی خاص بات نظر نہیں آتی۔

شام کو پروڈیوسر میڈ برادر سینئر خیمے میں بیٹھا کاک ٹیل پی رہا تھا کہ ایک آدمی بھاگتا ہوا اندر آیا۔

"غضب ہو گیا۔"

"کیا بات ہے؟"

"ہم وہ سین شوٹ کر رہے تھے جس میں ولین اور ہیرو کی چٹان پر لڑائی ہوتی ہے اور ہیرو ولین کو چٹان سے دس ہزار فٹ نیچے دریا میں گرا دیتا ہے۔"

"تو کیا ہوا؟"

"ہیرو نے ولین کے ڈمی کو گرانے کی بجائے سچ مچ ولین کو نیچے گرا دیا ہے۔ یہ شوٹنگ کے بعد پتا چلا کہ ڈمی چٹان پر پڑا تھا اور مسٹر آئی ہیفٹی جو ولین کا پارٹ ادا کر رہے تھے، غائب تھے۔"

"بڑا افسوسناک حادثہ ہے۔"

صبح خوخو نے کہا، "یہ پھول لو، یہ میری نشانی ہے۔"

Scanned with CamScanner

دوپہر کو جب میں نے سارے مرسامتروح کو اپنے ہوائی جہاز کی کاک پٹ میں سے دیکھا تو وہ ایک افسانوی شہر لگتا تھا۔ شتر مرغ اب بھی باب السودا میں پھر رہے تھے۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

ادیس ابابا میں نواب ممولا مجھے ملا۔ خاص ابی سینی (Abyssinian) طریق پر اس نے میرے گالوں پر بوسے دیے، اپنے ناک کو میرے ناک پر رگڑا۔

"بگھیرا! بگھیرا!" (میرے چچازاد بھائی!) وہ زار وقطار رو رہا تھا۔ ممولا سے میری پہلی ملاقات صحرائے گوبی میں ہوئی تھی۔ وہ دس سال سے وحشی ایبورجنز (Aborigines) کے ساتھ رہ رہا تھا۔ اس نے ایک ایبورجن لڑکی سے شادی کر لی تھی اور گوبی کے وحشیوں کے سماجی اور جنسی اطوار پر ریسرچ کر رہا تھا۔ میری اس سے وہاں دوستی ہو گئی۔ مجھے اس کی حالت پر ترس آیا۔ ایک شام وہ بھاگتا بھاگتا میرے خیمے میں آیا۔

"بگھیرا! بگھیرا!"

"کیا ہے؟"

"میرا خسر اور قبیلے کے دوسرے لوگ آج کوئی دعوت دے رہے ہیں۔ میری بیوی نے بتایا ہے کہ ان کا ارادہ مجھے بھوننے کا ہے۔ اس نے خود میرے خسر کو یہ کہتے سنا ہے۔"

میں ممولا کو اپنے ساتھ ہوائی جہاز میں آگرہ لے آیا۔ آگرہ میں وہ مجھ سے رخصت ہو گیا۔ اس واقعے کو دس سال بیت چکے تھے۔

ادیس ابابا پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ ادیس ابابا کے شمالی حصے پر ممولا کی حکومت ہے اور صرف غربی حصے پر شہنشاہ ہیل سلاسی کا سکہ چلتا ہے۔ حبشہ کے انٹیریر میں شیروں اور مردم خوروں کی حکومت ہے۔

ممولا نے خوب خاطریں کیں۔ ایسا احسان شناس، مہمان نواز اور مشفق دوست میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ دن رات ضیافتیں اڑتیں۔ ہم حمیر میں حضرت موسیٰ کا عصا دیکھا۔ اسے شیشے کی نلکی میں عمودا رکھا ہے، سیدھا اس لیے نہیں کہ کہیں سانپ نہ بن جائے۔ وہ پہاڑی بھی دیکھی جہاں حضرت نوح کی کشتی طوفان کے تھمنے کے بعد پہلے پہل رکی تھی۔ ان کے قدموں کے نشان دس ہزار سال کے بعد ابھی تک موجود ہیں۔ یہاں چیتے اور شیر کھلم کھلا پھرتے ہیں۔ ایک چیتا مجھے بھی ملا مگر دیکھ کر چپ چاپ سر ڈالے چلا گیا۔ اس زمانے میں چیتے بھی کتنے پست ہمت ہو گئے ہیں۔ کئی ایک لڑکیوں سے ضیافتوں

Scanned with CamScanner

میں اور سرراہے ملاقاتیں ہوئیں۔ اب تو ان کے نام بھی یاد نہیں۔ بلنے شقور کے بازار میں مُمولا کا اپنا بڑا ہوٹل کیفے ڈی مُمولا تھا۔ مُمولا نے مجھے وہاں ہی ٹھہرایا۔ میرے بغل کے کمرے میں مسٹر ہیمنگوے مقیم تھے۔ اس سے اگلے کمرے میں دو روز پہلے مشہور ہالی وڈ ایکٹریس ریتا ہیورتھ ٹھہری تھیں۔ وہ میرے وہاں آنے سے دو روز ہی پہلے گئی تھیں۔

ہیمنگوے سے ہر روز شام کو ٹیرس پر ملاقات ہوتی۔ آپ کی عمر ساٹھ سال ہے۔ چار شادیاں کر چکے ہیں۔ بُل فائٹنگ اور شکار کا بڑا شوق ہے۔ ادیس بابا میں اپنی بیوی کے ہمراہ شیر کے شکار کے سلسلے ہی میں آئے ہوئے تھے۔ ادبی گفتگو بالکل نہیں کرتے۔ مجھے کہنے لگے، ''کل کلیمنجارو (Kiliminjaro) چلو۔ وہاں کے شیروں کی بڑی تعریف سنی ہے۔ شست لگا کر حملہ کرتے ہیں۔''

''غریب شیروں نے میرا کیا بگاڑا ہے؟''

وہ اصرار سے مجھے اپنے ہیلی کاپٹر میں دوسرے دن کلیمنجارو لے گئے۔ وہاں میں نے چار شیر مارے جو پندرہ پندرہ فٹے تھے۔ ہیمنگوے نے بھی ایک شیر مارا جو بعد میں زیبرا نکلا۔ واپسی پر ہم کھالوں کو مُمولا کے لیے لیتے آئے۔

مُمولا نے پانچ لڑکیوں سے ملایا۔ وہ یکے بعد دیگرے اس کی منگیتریں رہ چکی تھیں۔ ایک کا نام خمیسہ تھا۔ وہ جمعرات کے روز پیدا ہوئی تھی۔

ایک صبح ہم جھیل گیلی میں نہانے کے لیے گئے۔ جھیل میں طوفان آیا ہوا تھا اور لہریں بڑی اونچی اوپر اٹھ رہی تھیں۔ خمیسہ بڑی تیکھی اور ضدی لڑکی تھی۔ مُمولا کے منع کرنے کے باوجود وہ اپنے ربڑ کے گھوڑے پر جھیل میں تیرنے لگی۔ اس ربڑ کے گھوڑے میں ایک ٹائر کی طرح ہوا بھر دی جاتی ہے، یہ پھول کر بالکل گھوڑے کی شکل کا بن جاتا ہے اور پانی میں نہیں ڈوبتا۔

ہم سب ساحل پر آرام کرسیوں میں دراز خمیسہ کو تیرتے دیکھ رہے تھے۔ یک لخت خمیسہ چلائی، ''میرا گھوڑا لنگڑا ہو گیا!''

مُمولا نے کہا، ''ہوا نکل گئی ہے۔ یہ ڈوب جائے گی۔'' اس نے میری طرف ملتجیانہ نگاہوں سے دیکھا۔

اب خمیسہ ڈوب رہی تھی۔ لہریں اسے اٹھا کر بڑی دور لے گئیں۔ اس کے بھورے بال کبھی کبھی

Scanned with CamScanner

پانی کے اوپر نظر آ جاتے۔

میں نے فوراً جھیل میں چھلانگ لگا دی۔ اپنے کالج کے تالاب میں میں نے تیرنے کی اچھی خاصی مشق بہم پہنچا لی تھی اور پیراکی کے مقابلے میں ہمیشہ اوّل رہتا تھا۔ میں لمبے اسٹروک لگاتا ہوا خمیسہ تک جا پہنچا اور اس کو بالوں سے پکڑ کر کنارے پر لے آیا۔ کنارے پر اس تماشے کو دیکھنے کے لیے کافی عورتیں اور مرد جمع ہو گئے تھے۔ مجھے بڑا سراہا گیا۔

''یہاں کا کوئی تیراک ایسے طوفان میں جانے کی جرأت نہ کرتا۔'' ممولا نے مجھے تشکر آمیز نظروں سے دیکھا۔

''دوست کے لیے جان حاضر ہے۔''

ممولا خمیسہ کو ہوش میں لانے میں لگ گیا۔ میں بڑی دیر تک لوگوں کو آٹو گراف دینے میں مصروف رہا۔ لوگ ختم ہونے ہی میں نہیں آتے تھے اور آخر بڑی مشکل سے ممولا نے ان قدر دانوں سے میری گلو خلاصی کرائی۔

رات کو ہیل سلاسی کا ڈنر تھا۔ مجھے ان سے ہاتھ ملانے کی سعادت نصیب ہوئی۔ ممولا کو نہیں بلایا گیا تھا۔ مجھے برطانوی سفیر سر جی وائلڈ مین کے ساتھ جگہ دی گئی۔ ضیافت کے بعد شہنشاہ ہیل سلاسی خود اٹھ کر میری طرف آئے اور اپنے ہاتھ سے میرے کوٹ پر ''آرڈر آف دی فائن فرسٹ کلاس'' کا تمغہ لگایا۔ یہ وہاں کا سب سے اونچا امتیاز ہے۔

دوسرے دن ممولا مجھ سے کچھ کھنچا کھنچا رہا۔

''تمھیں ہیل سلاسی کا تمغہ قبول نہ کرنا چاہیے تھا۔ وہ میرا دشمن ہے۔''

''مجھے افسوس ہے۔ میں اسے واپس کر دوں گا۔''

''تم اسے مجھے دے دو۔''

میں نے اسے تمغہ دے دیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اسے پھینک دے گا۔ رات کو سر جی وائلڈ مین کی پارٹی پر ممولا وہی تمغہ کوٹ پر لگائے ہوئے آیا۔

''تم اسے کیوں لگا کے آئے ہو؟ میں نے سمجھا کہ تم اسے پھینک دو گے۔''

''بگھیرا، تم سیاح ہو، تم چلے جاؤ گے۔ یہ تمغہ میرے کام آئے گا۔''

Scanned with CamScanner

ایک دن مشیکا (ممولا کی ساتویں منگیتر) مجھ سے میرے وطن کے متعلق سوالات پوچھنے لگی۔ میں نے اسے جغرافیہ کی ایک کتاب نکال کر دے دی۔

''اس میں پڑھ لو۔''

''میں انگریزی نہیں پڑھ سکتی۔ تم وہاں کیا کرتے ہو؟''

''میں ایک جگہ جم کر نہیں بیٹھ سکتا۔ میری قسمت میں سیاحی اور صحرانوردی ہے۔ نیویارک کا پانی مجھے کبھی موافق آتا ہے، کبھی نہیں۔ میں لکھتا بھی ہوں۔''

''تم لکھتے ہو؟ کیسی کتابیں؟''

''مجھے ان کے نام یاد نہیں۔ میں ساٹھ کتابوں کا مصنف ہوں۔ ان کے نام سب 'ش' سے شروع ہوتے ہیں 'شعلے'، 'شہتیر'، 'شرارتیں'، 'شکرانے'، وغیرہ۔''

''مجھے رائٹرز پسند ہیں۔''

''آپ کی نوازش، مگر محترمہ یہ تو میری ایک ہی ہابی ہے۔ میں ہوا باز بھی ہوں، شکاری بھی، بیس بال پلیئر بھی، زبردست مکہ باز بھی۔ ایک بار میں نے رودبار انگلستان کو تیر کر عبور کیا تھا۔''

''کیا تم مجھے چاہتے ہو؟ شاید میں تمھارے قابل نہیں۔'' وہ اداس ہوگئی اور میرے سر میں انگلیاں پھیرنے لگی۔

''سوچ کر بتاؤں گا۔''

ممولا نے دیکھا مشیکا اسے چھوڑ کر میری طرف راغب ہو رہی ہے۔ اس نے مجھے جلد از جلد وہاں سے رخصت کرنے کی ٹھانی۔ جاتے ہوئے اس نے نصیحت کی۔ ''بگھیرا! دوسروں کی منگیتروں سے عشق لڑانے سے احتراز کرو۔''

اڈے پر پہنچ کر مجھے خیال آیا کہ میری چھتری پھر غائب تھی۔ اتنے میں ایک آدمی چھتری سر پر تانے تیز تیز بھاگتا ہوا آیا۔

''یہ چھتری تمھاری ہے؟''

''دیکھے بغیر بھلا کیسے بتا سکتا ہوں!''

''مس میری غلطی سے اسے پیراشوٹ سمجھ کر کود گئی تھیں۔ ان کی پھوپھی نے اسے آپ کو واپس

Scanned with CamScanner

بھیجا ہے۔"

"میری کیسی ہے؟"

"نیچے زمین پر پہنچتے ہی اُن کا دم نکل گیا تھا۔"

مجھے بڑا صدمہ ہوا۔ میں نے چھتری لے لی اور اس آدمی کو دو ڈالر کا ٹپ دیا۔

کاہنا کاچھا کے گرد سفید ریت کے ٹیلے میں نمک کی جھیلیں ہیں۔ پچھم کی سمت کوہ ہاچاپاچو ایک ترشے ہوئے نیلم کی طرح امنڈا آتا ہے۔

یہاں پر جھیل سلاسی میں متبرک مگر مچھ دیکھے۔ مجاوروں کو پندرہ پندرہ ڈالر کے ٹپ تقسیم کیے۔ وہاں مفلسی اور فلاکت دیکھ کر عبرت ہوئی۔ اگر یہاں امریکن ٹورسٹ زیادہ تعداد میں آنے لگیں تو ملک میں پھر خوشحالی کا دور شروع ہو جائے گا۔

پاگل خانے میں گیا۔ شیخ آف کاہنا کاچھا سے ملاقات ہوئی۔ ان کا دماغ مدت سے چل چکا ہے۔ ان سے بڑی پر لطف باتیں ہوئیں۔ تہذیب و تمدن یہاں کسی زمانے میں اپنی معراج پر تھے۔ یہاں قرونِ وسطیٰ میں ایک بڑا شہر آباد تھا۔ عجائب گھر میں حمورابی کے زمانے کا جنگی رتھ دیکھا۔

میں نے گائیڈ سے پوچھا، "اسے کھینچنے والے کہاں ہیں؟"

"وہ تین ہزار سال ہوئے مر چکے ہیں۔"

کنگ مائیداس (Midas) کا مقبرہ بھی دیکھا۔ یہ وہی بزرگ تھے جو جس چیز کو چھوتے تھے سونے کی ہو جاتی۔ گائیڈ نے ان کے ہاتھوں سے چھوئی ہوئی کئی چیزیں دکھائیں۔ کئی ابھی تک پیتل کی تھیں۔

یہاں کسی لڑکی سے ملاقات نہیں ہوئی۔

یوکناپاوا ایک اونچے فلک بوس پہاڑ پر ہے۔ ہوائی اڈا یہاں کوئی نہیں ہے۔ میں نے ہوائی جہاز کو سیدھا گرانڈ ہوٹل کی چھت پر لینڈ کیا۔ وہاں کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ رولی فلیکس کیمرے سے ہوٹل میں کام کرنے والی لڑکیوں کی تصویریں کھینچیں۔ اپنی کتاب "شکارے" مکمل کی۔ مقامی دنگل میں کشتی لڑی۔ وہاں کے مشہور پہلوان شاپا کو شکست دی۔ وہ بڑا دوست بن گیا۔ اس کی بیوی ایک تیکھے نقوش اور سنہری بالوں والی حسینہ تھی۔ میں اس کو اپنے ہوائی جہاز میں فضا میں سیر کرانے لے گیا۔ واپس

Scanned with CamScanner

اترے تو شپاٹا نے اودھم مچا رکھا تھا کہ میں اس کی بیوی کو بھگا کر لے گیا ہوں۔ ہمیں دیکھ کر بڑا پشیمان ہوا۔

"مجھے معاف کر دو چیرا (ماموں زاد بھائی) کہ میں نے دوست پر شک کیا۔"

"قطعی معاف کیا۔"

شطاپا ہنس پڑا۔ گرانڈ ہوٹل سے اٹھ کر میں شطاپا کے ہاں رہنے لگا۔ جب میں رخصت ہونے لگا تو شطاپا کی بیوی قمرو نے کہا، "تم کہاں جا رہے ہو؟"

"جہنا۔"

"جہنا میں میری خالہ رہتی ہیں۔ وہ مجھے کئی بار آنے کے لیے کہہ چکی ہیں۔ مجھے لے چلو، لیکن شطاپا کو پتا نہ چلے۔"

شام کو ہم یوکنا پاوا کے اوپر فضا پر تھے۔ نیچے گرانڈ ہوٹل کی چھت پر ایک غصیلا آدمی کھڑا مکے دکھا رہا تھا۔

"اس کی طرف مت دیکھو۔ یہ شطاپا ہے۔" قمرو نے سگریٹ کو میرے ہونٹوں سے نکال کر خود پینا شروع کیا۔

جہنا۔ دہکتی ہوئی، اڑتی ہوئی آندھیاں۔ تاحد نظر ریگزار۔ قمرو کی خالہ وہاں نہ مل سکی۔ قمرو نے کہا، "یا وہ مر چکی ہے اور یا کہیں اور چلی گئی ہے۔ میں تمھارے ساتھ آگے جاؤں گی۔"

"اب میں سیاحی سے تنگ آ چکا ہوں۔ واپس جاؤں گا۔ دوسرے میں گرانڈ ہوٹل میں اپنی چھتری بھول آیا ہوں۔"

"میں شطاپا کے پاس نہیں جاؤں گی۔ وہ گدھا ہے۔"

"دیکھا جائے گا۔ میں اپنے دوست کے بارے میں یہ نہیں سن سکتا۔"

واپس یوکنا پاوا پہنچے۔ چھتری شطاپا کے پاس موجود تھی، قمرو میرے پاس تھی، ہم نے چیزوں کا تبادلہ کر لیا۔ شطاپا نے مجھے ایک تعویذ دیا۔ اس نے نصیحت کی، "یہ تمھیں نظرِ بد سے بچائے گا اور تمھاری نظرِ بد سے دوسروں کو۔"

کاہنا کاچھا۔ شیخ ابھی تک پاگل خانے میں تھا۔

یہاں پھر چھتری لاپتا تھی۔ میں اپنے کو اس بے پروائی کے لیے کوس رہا تھا کہ چھتری مل گئی۔ یہ

Scanned with CamScanner

میری بغل میں تھی۔ادیس ابابا۔مولا مجھے دیکھ کر بڑا پریشان ہوا۔اس کی منگیتروں کی تعداد اب نو تک پہنچ چکی تھی۔اس نے کہا:

''یہاں حالات خراب ہو چکے ہیں۔ کیفے ڈی مولا کا دیوالہ پٹ چکا ہے۔ چند دنوں میں میں یہاں سے فرار ہو جانے کا ارادہ کر رہا ہوں۔''

''خمیسہ کہاں ہے؟''

'آج ہی چلے جاؤ۔مردم خوروں کی ایک بڑی فوج انٹیریر سے ادیس ابابا پر چڑھائی کرنے آرہی ہے۔''

''اچھا بھئی، لیکن خمیسہ کہاں ہے؟''

''بکھیرا، تمھارا پتا کیا ہوگا؟ میں تمھارے پاس آنے کا ارادہ کرتا ہوں۔''

''ارادے کو تبدیل کر ڈالو۔میرا آج کا پتا وہ نہیں جو کل ہوگا۔''

مرسامتروح۔فی فی سلطان کے حرم میں داخل ہو چکی تھی اس لیے اس سے ملاقات نہ ہو سکی۔ یہاں وہ دوسری چھتری مل گئی جو وہاں خریدی تھی۔اب میرے پاس دو چھتریاں تھیں۔

بونگا باوا۔اس میدان میں ۳۰ اپ ایکسپریس میری کی پھوپھی کے گھر کو جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔جس جگہ میری اتری تھی وہاں ہوائی جہاز ہی سے دعائے فاتحہ پڑھی۔

نیویارک میں لینڈ کرتے ہی سیدھا مسٹر ہاچ پاچ کے ہاں پہنچا۔وہ اسی طرح اپنے کمرے میں بیٹھے ''اسکوائر'' میگزین کی برہنہ تصویروں کا بغور معائنہ کر رہے تھے۔میرے اندر آنے کی آہٹ پا کر انھوں نے سر اٹھایا۔

'تم نے یہ تصویر دیکھی ہے؟'' انھوں نے ایک نیم برہنہ تصویر کے صفحے کو میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے انھیں اپنے سیر و سیاحت کے قصے سنائے۔میں نے بتایا کہ میں جہنا ہو کر آیا ہوں۔

''واپس کیوں چلے آئے؟''

''سب سفر گھر پر ختم ہو جاتے ہیں۔''

''جہنا میں جان ہیگ کی کیا قیمت ہے؟''

''پانچ ڈالر۔''

Scanned with CamScanner

''یہاں تیس ڈالر ہے۔ جمنا نیویارک سے بہتر جگہ ہے۔ برخوردار، تم واپس کیوں آگئے؟ مجھے سیاحت کے اور قصے سناؤ۔''

''بڑی جہاں گردی کی۔ کئی اجنبی دیسوں میں گیا۔ پر شفقت لوگ ہر جگہ ملے۔ انھوں نے سر اور آنکھوں پر جگہ دی۔ ڈوبتوں کو بچایا۔ کشتیاں لڑیں۔ لڑکیوں کے سینوں میں محبت کے دیپ جلائے۔ شیر کا شکار کیا۔ تمغے جیتے۔ آپ جانتے ہیں، سیر و عشق ہی تو دو کام ہیں جن پر اس ناچیز نے عبور حاصل کیا ہے۔''

''ہاں ہاں، مجھے یاد آیا۔ میری چار دن سے غائب ہے۔''

''وہ میرے ہمراہ بونگا باوا تک گئی تھی۔ وہاں چھتری کے ذریعے اترتے ہوئے ہلاک ہوگئی۔''

''چھتری؟ ہاں، میری چھتری بھی کئی روز سے گم ہے۔ کہیں تم تو نہیں لے گئے تھے؟''

مسٹر ہاچ پاچ بڑے چاق و چوبند نکلے۔ وہ چھتری دراصل انھیں کی تھی۔ وہ اس کو میرے ہاتھ سے چھیننے کے لیے لپکے۔ میں نے ان کے کمزور و نحیف ہاتھوں میں وہ دوسری چھتری پکڑا دی جو میں نے مرسامتروح میں خرید کی تھی۔

اصل چھتری کو بغل میں داب کر میں اوپر آگیا اور سوچنے لگا، ''مسٹر ہاچ پاچ یہ چھتری لے لیتے تو میرا کتنا نقصان ہوتا۔ یہ میری تنہا مونس و غمخوار ہے۔ اس نے میرے ساتھ اجنبی ملکوں کی سیر کی ہے۔ اس سے میری حسین یادیں وابستہ ہیں۔ جب تک یہ میرے پاس ہے میری زندگی یادوں سے محروم نہیں ہو سکتی۔ نئے افق میری نگاہوں کے سامنے کھلتے رہیں گے۔ کئی میریاں، کئی خوخو، کئی موشائیں میری امنگوں کو سدا جوان رکھیں گی۔ کوئی مجھے یہاں نہیں رکھ سکتا۔ جہاں نوردی ہم سیلانیوں کی زندگی ہے۔''

میں چھتری بغل میں دابے نیچے آگیا۔

''مسٹر ہاچ پاچ، گڈ بائی!''

''برخوردار، اب کہاں جا رہے ہو؟''

''قطب شمالی کو۔''

''خوش رہو۔ تمھارے لیے وہی جگہ موزوں ہے۔''

وہ نصیحت کرنا چاہتے تھے لیکن میں جلدی سے الوداع کہہ کر نکل گیا۔

(ماہنامہ تخلیق، کراچی، اکتوبر ۱۹۵۶ء)

Scanned with CamScanner

گھپلا

(ایک ادبی رسالے کا اداریہ)

غریب اردو ادب کے ساتھ کیا کیا گھپلے نہیں ہوے۔ ہمارے افسانے کا جنازہ تو اُسی دن اٹھ گیا تھا جب منشی پریم چند کی پہلی جدید کہانی شائع ہوئی تھی۔ ان سے کسی نے نہ پوچھا کہ منشی جی آپ کا نزلہ ہماری داستانوں پر کیوں گرنے لگا ہے۔ آخر میر امن دہلوی اور رجب علی بیگ سرور کے سروں میں چھپکلیوں نے انڈے تو نہیں دیے تھے کہ ان لوگوں نے اس ملک کی پچھلی پوری تہذیب کی کوکھ میں سے داستان طرازی کی اختراع کی اور ادب کے ایوان میں ان تصویروں کو سلیقے سے سجایا۔ یہ حقیقت ہے کہ منشی پریم چند نے ایسے جدید افسانے لکھ کر جو ہماری تہذیب کے سانچے میں ڈھلے ہوے نہیں تھے بلکہ باہر سے مستعار تھے، ہماری داستانوں پر کاری وار کیا۔ بات یہیں تک رہتی تو بچاؤ کی صورت پیدا ہو سکتی تھی اور ہماری داستانیں کالے پانی جانے سے محفوظ رہ سکتی تھیں، مگر منشی پریم چند کے بعد جدیدیت کی کچھ ایسی رو چلی کہ پانی سر سے گزر گیا۔ اس دور میں مجھ جیسے بگڑے دلوں نے داستانوں کی روایت کو پھر سے زندہ کرنے کی ٹھانی مگر یار لوگوں نے الٹی میری ٹانگ لی۔ اس بات کو کسی نے نہ سوچا کہ ای ایم فورسٹر، موپاساں اور چیخوف وغیرہ نے ہمارے تہذیبی ورثے میں جنم نہیں لیا تھا۔ ان مغربی مصنفوں نے کنکوے نہیں اڑائے تھے۔ وہ گلیوں میں گلی ڈنڈا نہیں کھیلے تھے۔ اور تو اور، انھیں تو کوٹھے پر جا کر طوائف کا گانا سننے کا بھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔ جو تہذیبی سانچے ان لوگوں نے بنائے وہ ہمارے تہذیبی سانچے نہیں ہیں۔ یہ مانگے کے سانچے ہیں، اور مانگے کے سانچوں میں بڑا ادب پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہی وسوسہ مجھے دن رات کھائے پے جاتا ہے اور ٹی ہاؤس کے روزانہ پچیس تیس چائے کے پیالے بھی میرے اس دکھ کا مداوا نہیں بن سکتے۔

بے چارے پریم چند نے تو خیر پھر بھی داستانوں کے اسلوب اور ہیئت کو ایک حد تک قائم رکھا اور اپنے عہد کے مسائل سے روگردانی نہ کی۔ ان کا تو فقط اتنا سا قصور تھا کہ انھوں نے مغربی افسانے سے

بلاوجہ متاثر ہو کر کہانی کو نئے اسلوب اور نئی ہیئت میں ڈھالنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے۔ قیامت تو ان کے بعد آنے والے لوگوں نے توڑی۔ وہ تو گویا کلہاڑا لے کر داستانوں پر پل پڑے اور ان کی وہ دُرگت بنائی کہ اب کوئی پڑھے لکھے لوگوں میں قصہ حاتم طائی یا طوطا مینا کا ذکر تو کر کے دیکھے، لوگ اسے چڑیا گھر پہنچانے کی دھمکی دے ڈالیں گے۔

ویسے یورپ میں بھی بڑا ادب ایک مدت سے تخلیق نہیں ہو رہا۔ یہ بات میں نہیں کہہ رہا بلکہ اس کے کہنے والے ٹی ایس ایلیٹ ہیں۔ مجھے تو اپنے دھندوں سے اتنی فرصت نہیں ملتی کہ ایلیٹ صاحب کو پڑھوں، البتہ میرے ایک دو کرم فرما ایسے ہیں جو اپنی ساری گفتگو ٹی ایس ایلیٹ کے حوالے سے کرتے ہیں۔ ایلیٹ کو بھی چھوڑیے ایک طرف، یہ میں بطور شیخی نہیں کہہ رہا ہوں کہ میں نے تو یورپ کے مصنفین میں سے ایک آدھ ہی کو بمشکل پڑھا ہوگا، پڑھتا رہتا تو کبھی کا انٹلکچوئل ہو چکا ہوتا تھا اور میرا بھی وہی حشر ہوتا جو مجھ سے پہلے پیشتر کئی بزرگ ادیبوں کا ہو چکا ہے کہ ان کو پڑھ کر یوں گمان ہوتا ہے جیسے ڈی ایچ لارنس اور ژاں پال سارتر اردو میں بے پر کی ہانک رہے ہیں۔

یہ ثقہ ادیب جنھوں نے فورسٹر کے کمبل اوڑھ رکھے ہیں، کبھی کوئی تخلیقی چیز پیش نہیں کر سکتے۔ ایلیٹ نے جب انگریزی ادب کے افلاس کا اعلان کیا تھا تو کسی نے اسے نہیں ٹوکا تھا لیکن ہمارے ہاں کوئی اردو ادب کے بارے میں اس سے ملتی جلتی بات کہہ بیٹھے تو سب ہاتھ منہ دھو کر اس کے پیچھے پڑ جائیں گے۔ سچ یہ ہے کہ اگر آج کے اردو ادب کے سر میں سرخاب کا کوئی پر لگا ہے تو وہ مجھے دکھائی نہیں دیتا۔ جو ادب ہماری تہذیبی روایت کے سانچے سے ہٹ کر ڈھالا گیا ہے وہ کارنس پر سجانے کے لائق ہے۔ میر امن دہلوی کی داستانوں کے بعد سے ہمارے ادب میں کوئی بڑا تخلیقی کارنامہ نہیں ہوا، نہ ہی کام کی کوئی چیز ظہور میں آئی۔ مجھ پر کبھی کبھی بیٹھے بٹھائے اس خلا کو پُر کرنے کا دورہ پڑتا ہے اور میں نے نانی اماؤں کے خالص اسلوب اور ٹھیٹھ محاوروں میں کئی داستانیں لکھی بھی ہیں جن پر یار لوگ مختصر افسانے کا الزام دھرنے سے نہیں چوکتے، لیکن گھپلا یہ ہو گیا ہے کہ ہمارے نوجوان اپنی تہذیب اور معاشرت سے بیگانہ ہو چکے ہیں۔ کیا یہ افسوس کی بات نہیں ہے کہ اب کئی برس سے شہروں کی گلیوں میں لڑکے گلی ڈنڈے کی بجائے کرکٹ کھیلتے ہیں؟ جس محلے میں میں رہتا ہوں اس میں صرف ایک مکان کی چھت پر کبوتروں کا کابک میں نے مشاہدہ کیا ہے اور اتنے بڑے شہر میں کابک والی یہ چھت مجھے ایسی دکھائی

Scanned with CamScanner

دیتی ہے جیسے نئے پرانے اجاڑ صورت افسانہ نگاروں کے درمیان میں ہمارا میرا من دہلوی کھڑا ہے۔ پھر ایک نوجوان ہفتے میں ایک آدھ بار اپنے کبوتروں کو اڑانے آتا ہے۔ اس نے ٹیڈی لباس پہن رکھا ہوتا ہے۔ غرض اس شہر میں ہمارے نوجوان اپنے تہذیبی ورثے کو پسِ پشت ڈالے، ٹیڈی بنے، سڑکوں پر پھرتے ہیں، شربت بادام کی جگہ کوکا کولا نوش کرتے ہیں، اور ''کم سپٹمبر'' کی سی سستی امریکی فلموں پر مچلے جاتے ہیں۔ ایسے حالات میں بڑا تخلیقی ادب پیدا ہو تو کیونکر؟ ایک ہی صورت نظر آتی ہے کہ جوں توں کر کے ماضی کی روایات کو دوبارہ زندہ کیا جائے، نئی نسل کو کبوتر بازی کے روحانی اور جسمانی فیوض و برکات سے روشناس کرایا جائے، کرکٹ کلبوں کی بجائے جگہ جگہ گلی ڈنڈا سبھائیں قائم کی جائیں اور نانی اماؤں سے کہا جائے کہ وہ تھوڑا سا وقت نوجوان ادیبوں کو بھی دیا کریں، تا کہ بڑا تخلیقی ادب پیدا ہو۔

ہماری حکومت تو خود اپنی قومی تہذیب کے پیچھے لٹھ لے کر پڑی ہوئی ہے۔ آئے دن کبھی آتش بازی پر پابندی لگتی ہے کبھی گلی ڈنڈے پر۔ لے دے کے ایک کبوتر بازی رہ گئی ہے سو وہ بے چاری پہلے سے بدنام ہے۔ یہ سن کر کلیجہ منھ کو آتا ہے کہ مغرب زدہ والدین اپنے لڑکوں کو کبوتر اڑانے پر سخت ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ ہمارے نوجوانوں کو یہ سمجھ تو ہے کہ پتلون کے پائینچے کی موری کتنے انچ ہونی چاہیے، یا فلم ''بنجارن'' میں نیلو نے کون کون سے گانے گائے ہیں، لیکن یہ معلوم نہیں کہ لقے کبوتر اور ملنگ کبوتر کی پہچان کیا ہے اور کبوتروں کو اڑانے کے لیے کیا کیا ساز و سامان درکار ہوتا ہے۔ ہماری تہذیبی روایت کا بیڑا یوں غرق ہو رہا ہے۔

آتش بازی پر پابندی کی وجہ بڑی دلچسپ ہے۔ ہوا یہ کہ اس سال آتش بازی کی قومی تقریب میں آدھ درجن بچے آتش بازی کھیلتے ہوئے جھلس گئے، یا پھر آتش بازی کے سامان کی دو تین دکانیں بھک سے اڑ گئیں اور آس پاس کی دکانوں کو بھی آگ کی نذر کر گئیں۔ بس صاحب، اتنی سی بات پر آتش بازی پر پابندی عائد ہو گئی۔ میرا دل پوچھنے کو چاہتا ہے کہ اچھا صاحب! آپ نے ایک قومی تقریب پر جو ہمارے جذبے اور تخلیقی قوت کے شدید اظہار کا وسیلہ تھی پابندی لگا دی، مگر گلی ڈنڈے بے چارے نے آپ کا کیا بگاڑا تھا کہ آپ نے اس کو بھی دیس نکالا دے دیا؟ ٹریفک کے بہاؤ میں دو تین یا زیادہ سے زیادہ چار پانچ بچوں کا کچلا جانا، یا کارپوریشن کے کسی ایک آدھ معزز رکن کی ایک آدھ آنکھ کا پھوٹ جانا کوئی ایسی وجہ نہیں کہ اس کھیل کو جو صدیوں سے ہمارے خون میں رچا ہوا ہے اور جس کا بالواسطہ تعلق

Scanned with CamScanner

ہماری تخلیقی قوت کے اظہار سے ہے، اس بے پروائی کے ساتھ سولی پر چڑھا دیا جائے۔ گھپلا یہ ہے کہ ان تہذیبی علامتوں پر پابندی کا اثر ہمارے پرانے نئے اور آنے والے ادب پر پڑ رہا ہے اور پڑے گا۔ جن تہذیبی سانچوں میں ہمارے احساسات نے جنم لیا ہے، جب وہی نہ رہے تو ہمارا اپنا وجود مشتبہ ہونا لازمی ہے، اور جب ہم خود وہ نہ رہیں گے جو ہمیں ہونا چاہیے تو ہمارا ادب بھی ڈھول کی طرح بجے گا تو خوب، مگر اندر سے کھوکھلا ہوگا۔ مجھے تو حیرت ہے کہ حکومت والوں کو داستانوں پر پابندی لگانے کی کیوں نہ سوجھی! سارا قصہ ہی پاک ہو جاتا اور ہم سب مزے سے اپنی تہذیب سے لاتعلق ہو کر ڈنڈے بجاتے اور برلب سڑک گول گپے اور چاٹ کھاتے۔

یہ گول گپوں اور چاٹ کا ذکر میں نے ازراہِ احتیاط کیا ہے کیونکہ ہماری مہربان حکومت کے کسی بڑے صاحب بہادر سے یہ خدشہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ ہماری ان تہذیبی علامتوں کی بندش کا حکم صادر فرما دے۔ میں یہ محض فقرے بازی نہیں کر رہا ہوں۔ حقیقت میں ادب کا مسئلہ اور گول گپوں کا مسئلہ ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں۔ گول گپوں کا مسئلہ روز بروز ٹیڑھا ہوتا جا رہا ہے اور کچھ عجب نہیں کہ چند ہفتوں کے اندر ان ثقہ لوگوں کی گونج دار آواز میں جو ریڈیو پاکستان سے روز اول سے خبریں نشر کر رہے ہیں، یہ اعلان آپ کے کانوں میں آئے کہ حکومت گول گپوں کو بھی گول کر گئی اور اس تہذیبی علامت پر بھی پابندی عائد ہوگئی۔ حکومت سے یہ کون پوچھے کہ گول گپے کھائے بغیر تخلیقی اظہار پوری ذات کا اظہار کیسے بنے گا اور ہمارے ملک میں بڑے شاعر، بڑے سائنس دان، بڑے پہلوان اور بڑے گنکے باز کیسے پیدا ہوں گے؟ واضح رہے کہ ہابیل قابیل کے زمانے سے گول گپے کھائے جا رہے ہیں اور میری ذاتی معلومات کے مطابق، جو مجھے اپنے سفید کلغی والے ملنگ کبوتر سے حاصل ہوئی ہے، افلاطون خود گول گپے کھانے اور کھلانے کا شائق تھا، اور ہمارے عسکری صاحب کے لارنس صاحب نے اتنے سارے ناول جو لکھ مارے ہیں تو وہ محض اس لیے کہ انھوں نے افلاطون کو بغور پڑھا ہے۔ میرا کبوتر کبھی غلط معلومات نہیں دیتا۔ کبوتر کو تو چھوڑیے، وہ تو ایک پارسا، فقیر، صوفی مشرب، پڑھا لکھا پرندہ ہے، میں نے تو کوے کو بھی کبھی جھوٹ بولتے نہیں سنا۔

ویسے میں شرم سے اقبال کرتا ہوں کہ میرے گھر میں بھی ایک ریڈیو سیٹ ہے جس پر میں کبھی کبھار خبریں سن لیتا ہوں، حالانکہ کوے کی موجودگی میں مجھے فی الحقیقت نہ ریڈیو کی ضرورت ہے نہ

اخبارات کی۔ ہر روز صبح سویرے آنکھ کھلتے ہی کوا مجھے دنیا کی تازہ ترین خبروں کا خلاصہ سنا دیتا ہے۔ جس طرح بزرگوں کو انقلابِ روس کی خبر اور ان کے بھی بزرگوں کو انقلابِ فرانس کی خبر ان کے اپنے اپنے دور کے کووں نے سنائی تھی، اسی طرح انقلابِ پاکستان، انقلابِ مصر، انقلابِ عراق اور انقلابِ یمن کی خبریں مجھے مختلف اوقات میں ان مختلف کووں نے سنائیں جنھیں میرے گھر کا پتا معلوم تھا۔ اس قسم کے سیاسی انقلابوں اور خلائی پروازوں وغیرہ کی خبریں تو ہر ایرے غیرے کوے تک سات سمندر پار سے پہنچ جاتی ہیں مگر چند کوے ایسے بھی ہیں جو آئندہ ہونے والے واقعات کی بھی پیش گوئی کر سکتے ہیں۔ ثبوت اس امر کا یہ ہے کہ جب کبھی میرے ہاں خلافِ معمول کوئی مہمان آنے والا ہو تو دوپہر کو ایک خاص کوا، کہ اب میں اس کی شکل وصورت پہچاننے لگا ہوں، میرے مکان کی منڈیر پر بڑے ثقہ انداز میں دیر تک کائیں کائیں کرتا ہے۔ میں کوے کی بولی بخوبی سمجھتا ہوں، یہ دوسری بات ہے کہ اس بولی میں کلام کرنا پسند نہیں کرتا کہ میرے تلفظ اور لہجے پر غلط اثر نہ پڑے۔

واضح ہو کہ پرندوں کی بولی پر قدرت حاصل کرنے میں میری قابلیت سے زیادہ محلے ٹولے کی نانی اماؤں کی اُپچ کا دخل ہے۔ خدا ان سب کی مغفرت کرے، وہ کووں سے لے کر میناؤں اور طوطوں تک کی بولی سمجھتی تھیں اور گھنٹوں ان سے تبادلۂ خیال کرتی رہتی تھیں۔ میں صرف کوے کی بولی ہی ان سے سیکھ سکا کیونکہ بچے اور سیانے کوے سے بڑھ کر میرے نزدیک ہماری تہذیب کو انسانی آگہی سے روشناس کرانے والا اور کوئی نہیں، نہ ہی خبروں کی معتبر ترتیب وترسیل کے سلسلے میں کوئی خبر رساں ایجنسی کوے کے مقابلے میں دم بھر کے لیے ٹھہر سکتی ہے۔ آپ ہی بتایئے، آنے والے مہمان کی خبر ہماری آگہی کے لیے زیادہ اہم ہے یا یہ کہ آٹھ سو طلبا پرچہ سخت ہونے کی وجہ سے، امتحان کے کمرے سے واک آؤٹ کر گئے؟ ہمارے لکھنے والوں کو یہ تو پتا رہتا ہے کہ فورسٹر نے پچھلی جمعرات کو مٹن سینڈوچ کے ساتھ آلو کا بھرتا تناول کیا تھا مگر یہ علم نہیں ہوتا کہ فیروز پور روڈ پر ایک نہ دو اکٹھے پانچ اہلِ ذوق مہمان، لاہور اومنی بس سروس کی مدد سے، ان کے غریب خانے میں قدم رنجہ فرمانے یلغار کرتے آ رہے ہیں۔ کوے نے کبھی گھپلا نہیں کیا۔ کوا کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ کم سے کم مجھے تو کوے نے ہمیشہ بروقت مطلع کر دیا ہے کہ ٹی ہاؤس چلو، وہاں اس وقت بحث کی گنجائش پیدا ہو رہی ہے۔ سو میں ٹی ہاؤس پہنچا، محفل جمی ہوئی تھی۔ میں نے ذرا سی برف لگا دی کہ تھوڑی اور جم جائے۔ ایلیٹ صاحب سے لے کر عسکری صاحب

تک کی پگڑی اچھالی گئی۔ سارے افسانوی ادب اور اس عہد کے تخلیقی ادب کے مسائل پر بحثیں ہوئیں۔ چائے کے پیالے پر پیالے پلوائے گئے۔ دراصل ارسطو سے لے کر میر امن دہلوی کے زمانے تک قہوہ گھروں اور چائے خانوں نے تخلیقی اُپج اور صحیح اور صالح عرفان پیدا کرنے میں اہم پارٹ ادا کیا ہے۔ سنا گیا ہے کہ ایک مشہور انگریزی ادیب روزانہ چالیس پیالے چائے کے پیتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے دام اپنی گرہ سے ادا کرتے تھے۔

کہنا یہ ہے کہ اردو نثر پر بربادی اور تباہی کی گھٹائیں گھر آئی ہیں۔ یہ ابتری اس لیے آئی کہ ہم اس زمانے میں جی رہے ہیں جب ہمارا تخلیقی شعور ابتذال کی طرف مائل ہے۔ اس ملک میں ہمارے لکھنے والوں نے اپنی عظیم تہذیبی علامتوں، کوے، کبوتر اور کنکوے سے رشتہ توڑ لیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارا ادب اپنے معاشرے کے مسلسل تخلیقی عمل سے کٹ کر رہ گیا ہے۔ جس شخص نے چڑیا گھر سے انڈے نہیں چرائے وہ بڑا ادب بھلا کیسے تخلیق کرے گا۔ لاہور کی سڑکوں پر ٹیڈی لڑکے تو بہت سے پیدا ہو گئے مگر کوئی بڑا عاشق ظہور نہ کر سکا۔ ایک آدھ عاشق جس کا ظہور اس عہد سے چند سال پہلے کے عہد میں ہوا، مال روڈ کے کسی نہ کسی ہوٹل میں بیٹھا ضرور مل جائے گا، مگر اب اسے پہچاننا مشکل ہے کہ کثرتِ چائے نوشی نے عشق کی سکت اس کے بازوؤں سے چھین لی ہے۔ گھپلا ذرا زیادہ طول پکڑ گیا ہے۔ یہ طوالت اس لیے اختیار کی گئی ہے کہ اہلِ بصیرت صورتِ حال کی نزاکت اور نخرے سے پوری طرح آگاہ ہو جائیں اور میر امن دہلوی کی داستان طرازی کی اہمیت اور عظمت کو مناسب مقام پر رکھ کر پرکھا جا سکے۔ میر امن دہلوی اردو کے پہلے اور آخری افسانہ نگار تھے۔ یہ میں فقرہ بازی نہیں کر رہا ہوں، حقیقت بیان کر رہا ہوں۔

الپ ارسلان کا مضمون ''میر امن اور جیمز جوائس'' اس اشاعت میں شامل کیا جا رہا ہے۔

ہمارے ادب کا سرچشمہ ہماری دادیاں اور نانیاں تھیں۔ ان کے اُٹھ جانے سے اور کوکا کولا اور ٹیڈی پتلون کا دور دورہ ہونے سے ہماری کئی پشتوں سے آتی ہوئی سپلائی لائن میں شگاف پڑ گئے ہیں۔ ان شگافوں کو بھرنے اور صورتِ حال پر قابو پانے کے لیے جن حضرات کو دعوت دی گئی ہے، ان کے تاثرات ایک دلچسپ مذاکرے کی صورت میں پیش کیے جا رہے ہیں۔ ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

پروفیسر کابوس، جو ٹائپ اینڈ شارٹ ہینڈ نائٹ کالج کھمن پورہ کے پرنسپل ہیں؛ ڈاکٹر حیدر خوش نویس،

Scanned with CamScanner

جو ہومیو پیتھ ڈاکٹر ہیں اور خوش نویس تخلص کرتے ہیں؛ مولانا ابن الافسر تابوتی، جو کرشن نگر میں کچھ کرتے ہیں۔ مشتری نجومی، جنھوں نے منشی پریم چند کے خلاف بہت سے افسانے لکھے، اس بحث میں شریک نہیں ہو سکے کیونکہ ان دنوں وہ میر امن دہلوی کی تحریروں میں سے آئن اسٹائن کے نظریۂ اضافت کا سراغ لگانے میں مصروف ہیں۔

معیاری افسانوں کی ذیل میں اس بار خود اپنا افسانہ ''کالی بھیڑ'' شریک اشاعت ہے۔ اگرچہ اس رسالے میں معیاری افسانے چھاپنا ہمارے مسلک کے خلاف ہے مگر چند دوستوں کے اس اصرار پر ایسا کرنا پڑ رہا ہے، کہ پانچ غیر معیاری الابلا افسانوں کے ساتھ اگر ایک آدھ معیاری افسانہ بھی آجائے تو کسی گھپلے کا احتمال نہیں ہے۔ امید ہے کہ اس افسانے کی اشاعت سے رسالے کے غیر معیاری پن پر کوئی ضرب نہیں پڑے گی۔

(فنون، لاہور، جولائی ۱۹۶۳ء)

Scanned with CamScanner

میرے بھی جم خانے
(ایک غیر مطبوعہ باب)

وقت گزرتا جا رہا ہے اور اب تم کو فیصلہ کرنا ہے، مس قمر... مس قمر... اس نے اپنے دل سے کہا۔ کیا تم ہمیشہ اس طرح کلاؤڈ ککولینڈ میں رہتی رہو گی؟ کیا تم ہمیشہ اسی طرح بے سروپا سپنے دیکھتی رہو گی؟

وہ اس میڈ ہیٹرز ٹی پارٹی کے ہنگامے میں یہی سوچتی رہی۔ اس کے دائیں جانب اس کی پیاری مس ایلین ہاشمی اور رانی بگھیر سنگھ ٹیبل پر کہنیاں رکھے ریس کورس کی باتیں بڑے انہماک سے کر رہی تھیں۔

"آج راجہ صاحب بہادر نے بلیک بیوٹی پر دس ہزار روپے ہار دیے۔ دراصل بکی (bookie) نے ان کو ٹپ غلط دیا تھا۔" رانی بگھیر سنگھ نے قصور بکی کے سر تھوپا۔

"یہ بکی لوگ سخت چیٹ ہوتے ہیں، ان ریلائبل..." مس ایلین ہاشمی نے اپنی مصنوعی پلکوں کو جو کرنل شمیم رضوی حال ہی میں ان کے لیے پیرس سے لائے تھے، ہاتھ سے درست کرتے ہوئے فیصلہ کیا، گویا بکیوں کے کیریکٹر پر مہر ثبت کر دی۔

پاس کی میز پر راجکمار گھمسان رائے اور بیگم وسیم احمد فری لو کو بڑے ہی انٹلکچوئل انداز میں ڈسکس کر رہے تھے۔

"سی ایم جوڈ کا نظریہ ہے،" بیگم وسیم احمد اپنے ساری کے پلو کو دلکش، مار ڈالنے والے انداز سے جنبش دیتی ہوئی کوٹ کر رہی تھیں، "کہ فرسٹریشن کی اصل وجہ ہی ماڈرن سوشل لائف میں فری لو پرٹیبو ہے..."

راجکمار گھمسان رائے نے اپنی مونچھوں کو سہلاتے ہوئے اپنے دل میں کہا، "مڈل سٹکس! ٹیبو کہاں ہے؟ اگر سر رابرٹ سوائن میرے اضلاع کو کورٹ آف وارڈ میں نہ دے دیتے اور میں اس وقت

Scanned with CamScanner

بگلا پور کا زمیندار ہوتا تو میں ثابت کر دیتا کہ فری لو پر یٹو محض بکواس ہے۔" اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔" یہ انٹلکچوئل ہائی بروعورتیں فری لو پر باتیں تو بڑھ چڑھ کر بناتی ہیں لیکن عملی طور پر — مڈل سکس!"

مسٹر مہتہ رونے انداز میں منجھلے راجکمار مرتجان سنگھ جی سے کہہ رہے تھے،" یہ لڑکیاں ٹلنی کپور، جمیلہ گبسن وغیرہ کتنی بڑی بڑی ہوگئی ہیں۔ چند سال پہلے یہ بچیاں تھیں اور میرا تو خوب مذاق اڑایا کرتی تھیں۔ ان ریچھنیوں نے... آئی ایم ساری، ان بندریوں نے... آئی ایم ساری، ان بلیوں نے خاص میرے لیے ایک دُم تیار کر رکھی تھی اور اسے میرے پیچھے باندھ کر مجھے چچا ہنومان جی کہا کرتی تھیں... اور اب تو... مائی او مائی! ان کو دیکھ کر سیدھا سول میرج آفس کا خیال آتا ہے۔"

مس ایلین ہاشمی نے رانی بکھیر سنگھ کو اطلاع دی،" چلڈرن کو اگلے ہفتے ڈلہوزی پیک آف کرنا ہے۔ چلڈرن کو زیادہ وقت گھر پر رکھنا ٹھیک نہیں ہوتا، اسپائل ہو جاتے ہیں۔"

رانی بکھیر سنگھ بولیں،" چھوٹا بکھیر سنگھ اب کے رائیڈنگ میں اپنے اسکول میں فرسٹ آیا ہے۔ اس کا حساب بہت کمزور ہے۔ بڑے کنور صاحب بھی اپنے زمانے میں حساب میں کمزور تھے۔"

" ویری سیڈ!" مس ایلین ہاشمی نے ہمدردی جتائی۔

اردگرد ہالی ہاک، کارنیشن، فَرگٹ می ناٹ کے پھول کھلے تھے... لکھنؤ کے سارے ارسٹوکریٹک اور فیشن ایبل لوگ اس کی برتھ ڈے پارٹی پر آئے ہوئے ہیں۔ اس نے سوچا، یہ سب فائن ہائی برولوگ یہاں کیا کرنے آئے تھے... چائے کے بعد یہ سب کاریڈور میں چلے جائیں گے اور وہاں آدھی رات تک برج چلے گی۔

مولسریوں کے کشن پر آسائش میں سر رکھے قمر نیلگوں آسمان کی پہنائیوں کو تاکنے لگی۔ وہ اس مجمعے اور ہنگامے سے بہت دور تخیل میں مقدس مندروں کی سیڑھیوں پر چڑھتی جارہی تھی۔ تیز سرخ گلاب کے تختوں پر اپنے سلیپر اتارے اور انھیں ہاتھ میں پکڑے بھاگی جارہی تھی۔ ہالی ہاکس کے کنجوں میں رنگین انڈیگو بلیو تیتریوں کا پیچھا کر رہی تھی۔ سرسراتی ہوئی ہوا گویا بیتھوون کی سیونتھ میلوڈی بجاتی ہوئی اس کے پاس سے گزری۔ او ہاؤ سویٹ! بیتھوون کی میلوڈی میں کتنا دکھ ہے۔ اس کی اپنی زندگی میں کتنے مصائب ہیں، اس نے سوچا۔

Scanned with CamScanner

دو آدمی اسے سامنے سے گھاس کے قطعے پرسے اس کی طرف آتے دکھائی دیے۔ ایک تو اس کے ابا میاں تھے اور دوسرے میجر غیاث۔ اس کے ابا گولف کورس سے گولف کھیل کر آرہے تھے۔ اس کے گورے چٹے طویل القامت ابا اب بھی اس عمر میں گولف کے پلس فور اور پیلی ایروشرٹ میں کافی چست اور صحت مند لگتے تھے۔ ان کے چہرے پر پاکیزگی، نیک نیتی اور خلوص کا بے پناہ نور پھیل رہا تھا۔ میجر غیاث ابھی حال ہی میں کیمبرج یونیورسٹی سے فلسفے میں ٹرائپوس حاصل کر کے آئے تھے۔ خاندانی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے انھوں نے اب آرمی میں کمیشن لے لیا تھا۔ قمر نے سوچا، وہ غالباً ابا میاں کو شوشی آپا کے بارے میں ٹکل کر رہے ہوں گے۔ ان کے چہرے پر جو ایلس ان ونڈرلینڈ کے چیشائر بلے کی گرِن رہتی تھی، اب وسیع ہو گئی۔ بڑے ہی بشاش تھے کیمبرج ریٹرنڈ میجر غیاث۔

''تم یہاں مولسریوں کے تختوں پر کیا کر رہی ہو میری ننھی سویٹ قمر؟'' ابا میاں نے قمر کو دیکھتے ہوئے اپنی گونجتی ہوئی آواز میں للکارا۔

''ٹٹ... ٹٹ...'' میجر غیاث اپنے کیمبرج کے لہجے میں تاسف کرنے لگے۔ ''اخاہ، قمر ہیں! انکل ریمس، یہ تو بالکل ایف لینڈ کی چنچل سی ایف لگ رہی ہے۔ سویٹ انوسینس! ہاؤ ویری بریتھ ٹیکنگ!''

''مجھے انکل ریمس مت پکارو!'' ابا میاں نے احتجاج کیا۔

''آئی اپولو جائز، سر!'' میجر غیاث نے صفائی دی۔ ''میرا سچ مچ یہ مطلب نہیں کہ آپ گیدڑ ہیں۔ دراصل یہ لفظ میری زبان پر کیمبرج سے چڑھا ہوا ہے۔ کیمبرج میں ہمارے ایک پروفیسر تھے، بالکل ہی آپ کے حلیے کے۔ ہم فن کی خاطر ان کو انکل ریمس کہا کرتے تھے۔ لیکن وہ تو اسے کامپلیمنٹ تصور کرتے تھے۔''

''نری چھچھوندر ہے،'' ابا میاں ہنستے ہوئے کہتے ہیں، ''میری چھچھوندر بٹیا!'' اور وہ دونوں سیدھے چائے کی میزوں میں سے سامنے کلب بار میں ڈرنکس کے لیے چلے گئے۔

قمر نے سوچا، اس کے ابا کتنے چارمنگ ہیں۔ اب تھوڑے دنوں میں اس کی بے چاری آپا شوشی مسز غیاث کہلائیں گی۔ اس نے تصور کیا، اب مسز غیاث قرمزی رنگ کی ساری باندھے اپنے شوہر کے ساتھ بیٹھی اولڈ بس لو بیل میں سیوائل کلب جا رہی ہیں... میرے ہسبنڈ بیگنن کا بھرتا بے حد لائیک کرتے

Scanned with CamScanner

ہیں۔ میرے ہسبنڈ کو بلیوں سے چڑ ہے... مسز غیاث (بے چاری آپا شوشی!) ڈرائنگ روم میں صوفے پر بیٹھی اپنے خاوند کے لیے سوئٹر بن رہی ہیں جو اگلے سال بالکل ہی تنگ ہو جائے گا۔ میجر غیاث اپنے پائپ کو لائٹ کرتے ہوئے مسز غیاث کو ڈائٹنگ کی اہمیت پر لیکچر دے رہے ہیں، اور ان کو چند ایسی ورزشیں بجسٹ کر رہے ہیں جن سے ویسٹ لائن پر کنٹرول رکھا جا سکتا ہے۔ آہ بے چاری آپا شوشی! ازل سے تمھاری قسمت میں یہ لکھا ہے کہ تم مسز میجر غیاث بنو گی... میجر غیاث بڑی دیر سے کلب کی کاک ٹیل پارٹیوں اور ڈنرڈانسز سے لوٹ رہے ہیں اور آپا شوشی گدگدے بستر میں لیٹی جین آسٹن پڑھنے کی کوشش میں مصروف ہیں اور بار بار میز پر رکھے ہوئے سنہری چھوٹے کلاک کی طرف دیکھ کر جمائیاں لیتی ہیں۔

مس قمر نے اطمینان کا سانس لیا کہ وہ آپا شوشی نہ تھی۔ اگر وہ آپا شوشی ہوتی تو... وہ دہل گئی۔

ان سب لوگوں کی زندگی میں کتنا دکھ ہے، اس نے سوچا۔ راجکماری نرملا بخشی ریکارڈ چڑھا رہی تھیں، ''نہیں آوت مورے من کو چین''، اور اس پر بے حد بوریت سے اپنے پاؤں سے تال دینے کی کوشش فرما رہی تھیں۔ بالکل بے چاری بوڑھا گھوڑا لگتی تھیں یہ بخشی۔ بیرسٹر شیروانی اپنے ٹاپ ہیٹ میں مارچ ہیر بنے ہوئے، نرملا بخشی کی سرگیں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس امر کی وضاحت کر رہے تھے کہ اطالوی موسیقی کے مقابلے میں ہندوستانی موسیقی نہیں ٹھہر سکتی۔ ''ٹیک اِٹ فرام می، مس نرملا۔''

رانی بکھیر سنگھ نے شکایت کی۔ ''میرا پیانو کا ماسٹر بالکل ہوپ لیس ہے۔ شوبرٹ کا ایک نوٹ نہیں بجا سکتا۔''

مس ایلن ہاشمی نے موگرے کا پھول اپنے سیاہ مائل براؤن بالوں میں اُڑس کر ریٹا ہیورتھ پوز اختیار کیا۔ ''میں تو اپنا پیانو بیچ رہی ہوں۔ اس پر بی مائنر نہیں بج سکتا۔'' اور وہ اٹھ کر قربان الدین احمد آئی سی ایس کے ساتھ والٹز ناچنے لگی۔

اس کے ابا میاں اور میجر غیاث کلب میں سے ایک دوسرے کی گردنوں میں بانہیں حمائل کیے باہر آئے۔ وہ دونوں ہم عمر اولڈ اسکول چم لگ رہے تھے۔ والٹز کی مدھم بہتی ہوئی سُر پر وہ دونوں والٹز رقص کرنے لگے۔ اس کے ابا میاں ساٹھ اکسٹھ کے سن میں بھی ڈیزی کی طرح تازہ دم اور خوش طبع تھے۔ اور بارش ہو یا سوکھا، وہ لکھنؤ لنک پر اپنے گولف کے راؤنڈ کو کبھی مس نہ کرتے تھے... خوب ہی اُدھم مچا۔ انھوں نے کئی ایک ٹی ٹیبلز کو اوندھا کیا۔ چائے دانی رانی بکھیر سنگھ کی زرتار ساری پر جا گری اور وہ اپنی

ایرانی پسّی کو بغل میں سنبھالتی اور ''یو آفل باسٹرڈز!'' للکارتی اپنے شوہر کی ٹنی آرمسٹرانگ سڈلے کی طرف لپکیں۔ خوب ہی قہقہے پڑے اور ابا میاں اور میجر غیاث ''سیلی انمائی ایلی'' گاتے ہوئے ان کے پیچھے بھاگے اور ان کو آرامسٹرانگ سڈلے کے اندر سے باہر کھینچ لائے۔ راستے پر چکنے شبنمی لان پر ان کے پاؤں جو پھسلے تو وہ تینوں ہائی ہاکس کے تختوں پر شڑاپ سے نیچے آرہے۔ اوپر ابا میاں، نیچے میجر غیاث اور درمیان میں سینڈوچ ہوئی بے چاری رانی بگھیر سنگھ! ''یو گے برڈز!'' کنور بگھیر سنگھ نے برج کے پتوں کے اوپر سے دیکھتے ہوئے ان تینوں کو شاباش کہی۔ کنور بگھیر سنگھ رانی بگھیر سنگھ کے معاملے میں بے حد شولرس واقع ہوئے تھے اور اسی وجہ سے اپنے احباب کے حلقے میں مقبول تھے...

اور اب شام چاروں اور پھیلنے لگی۔ بجلی کے قمقمے جل اُٹھے۔ قمر نے سوچا، وقت کس حسن سے، کس سوز سے جل رہا ہے۔ کائنات اپنے ابد پر پہنچ گئی ہے۔ مولسری کے پودے پُر اسرار سائے میں اونگھنے لگے۔ وہ کچھ بور ہو کر، کچھ اسنیکس کے ڈر سے، اپنی پناہ گاہ سے نکلی اور خرگوش کے سے دبے پاؤں سے چلتی ہوئی اپنے ابا میاں کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ ابا میاں میجر غیاث کے ڈبل اسٹار پر منہ چپکائے دہاڑیں مار مار کر رونے میں مصروف تھے۔ ''آپا شوشی کہاں ہیں؟ کہیں نظر نہیں آتیں،'' میجر غیاث نے آہستہ سے اپنے کندھے کو ابا میاں کے منہ سے چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

''وہ تو ویمن اَپ لفٹ کانفرنس کے سیشن میں شرکت کرنے گئی ہیں،'' قمر نے جھینپتے ہوئے اور جرم کے قدرے لطیف احساس کے ساتھ اسے اطلاع دی۔ ''چند روز ہی ہوئے ہیں وہ لیڈی سوائن کے ایماپر اس کانفرنس کی جنرل سیکرٹری منتخب ہوئی ہیں۔''

''تم جھوٹ کہتی ہو۔ یو لائر!'' میجر غیاث چہکے۔ ''آج شام کس قدر حسین اور رومینٹک ہے۔ میرا خیال تھا کہ صرف کیمبرج ہی میں اتنی حسین اور رومینٹک شامیں ہوتی ہیں۔ آؤ آج ریزیڈنسی کی طرف ڈرائیو کریں۔ میں نے نئی موٹر کار خریدی ہے۔ ایم جی ٹی سی کنورٹیبل۔''

''میں اپنا فرکوٹ لے لوں،'' قمر نے کہا، ''رات قدرے خنک ہے۔'' اور اس نے سوچا، ''اور اتنے سارے لوگ ہمارے پیچھے پتا نہیں کیا باتیں کریں گے ــــ اسکینڈلز۔ خصوصاً آنٹی حمیدہ بلغمی کو تو جب سنو بیٹھی اسکینڈلز ٹاک کر رہی ہیں۔ فلانی کو فلاں کار میں بھگا کر سول میرج کے دفتر میں لے گیا،

Scanned with CamScanner

وغیرہ وغیرہ۔''

اس نے غالباً یہ فقرے بلند آواز میں سوچے ہوں گے، کیونکہ میجر غیاث اس سے کہہ رہا تھا:

''ڈونٹ مائنڈ۔ آنٹی حمیدہ ڈی مورلائزڈ اور ڈی جنریٹ خاتون ہیں۔ یوسی، اولڈ اسکول آف ٹھاٹ۔ تمھارا ڈیڈی بڑا ڈیر ہے، ڈیر انکل ریمس۔''

''ابا میاں کو ریمس مت کہو!'' قمر نے وارن کیا۔ ''وہ اس لفظ کو پسند نہیں کرتے۔''

''اب وہ مائنڈ نہیں کریں گے!'' اور میجر غیاث نے ایک فیصلہ کن انداز سے ابا میاں کے منھ کو اپنے کندھے سے ہٹا کر رانی کنور بگھیر سنگھ کے کندھے پر منتقل کر دیا۔ ابا میاں ابھی تک دھاڑیں مار مار کر رونے میں مصروف تھے۔ اسکاچ سے وہ ہمیشہ غمگین اور نم آلود ہو جایا کرتے تھے! کتنا دکھ تھا اُن کی اس پیاری، ظاہراً گولف کورس سی سرسبز زندگی میں، جسے کوئی نہ جانتا تھا۔

ابا میاں کو رانی بگھیر سنگھ کے کندھے مڑھ کر وہ اس میڈ ہیٹرز ٹی پارٹی سے چپکے سے کھسکے۔ پورچ کے نیچے میجر غیاث کی نئی ایم جی ٹی سی کنورٹیبل کھڑی دمک رہی تھی ــــ کچھوے کی شکل والی اسپورٹس کار جسے مرزا غیاث کیمبرج سے ساتھ لائے تھے۔ ٹی سی کے علاوہ وہ ایک مس ایلما شیخ کو (جو وہاں اڈنبرا وغیرہ میں ڈاکٹری کا امتحان دینے کی کوشش کر رہی تھیں) ساتھ لانے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن ان کے والد نواب چھبن میاں نے، جو کرشن پور کے جاگیردار تھے، کہلا بھیجا کہ بیٹا ایسا کیا تو جائیداد سے عاق کر دیے جاؤ گے۔ اب میجر غیاث وہاں سے خالی ہاتھ لوٹنے کے بعد، جس کا ان کو بڑا قلق تھا، کسی انٹلکچوئل اور پالشڈ لڑکی کی جستجو میں تھے جو والز وغیرہ جانتی ہو۔

تب قمر سکندر بخت اندر جگ مگ کرتی ہوئی کوٹھی کے دالان میں داخل ہوئی اور کتنے ہی پُر تکلف، آرائش سے سجے ہوئے کمروں میں سے ہوتی ہوئی اپنے ڈریسنگ روم میں آئی۔ اس نے اپنے سنہری باب بالوں کو شنیل نمبر ۶ سے ملا۔ جلدی سے دریچے میں رکھے ہوئے گلدان میں سے دو تیز سرخ فارگٹ می ناٹ کے پھولوں کو اپنے کانوں کے پیچھے اُڑس لیا۔ جب وہ اپنا قرمزی فرکوٹ جو لیڈی سوائن اس کے لیے سوئٹزرلینڈ سے لائی تھیں، الماری میں سے اتارنے لگی تو اس نے پہلی بار اپنے جرمن پیانو ماسٹر کو نوٹس کیا جو مہاگنی سے سیاہ بے بی گرانڈ پیانو کے پیچھے دبکا ہوا اس کا انتظار کر رہا تھا۔

''ہر باناف!'' قمر نے اسے اطلاع دی۔ ''آج میری برتھ ڈے ہے اور آج میں پیانو کا لیسن

نہیں لوں گی...اور پھر میں باہر جارہی ہوں۔"

جرمن کی آنکھیں نم آلود ہوگئیں۔ اس نے جواب میں بیتھوون کی سی مائنر بجانی شروع کردی، ایسے درد اور وارفتگی میں کہ موسیقی کے درد بھرے نغمے قمر کی ننھی معصوم روح میں حلول کرنے لگے۔

اچانک ایم جی کے سریلے، تحکمانہ ہارن کی آواز آئی۔ "میں جاؤں گی،" اس نے فیصلہ کیا۔ ایم جی کے ہارن کی پکار اس کی قسمت کی پکار تھی۔ وہ پیارے پروفیسر ہر باناف کو ماتھے پر چومتی اور "ایکسکیوزمی ہر پروفیسر" کہتی باہر چلی گئی۔ جرمن پروفیسر نے اپنی پیشانی سے اس دلکش ہندوستانی فرولائن کے معصوم لبوں کے نشان کو پونچھا اور پھر اس نے جذبات کی اس شدت سے پیانو کے کی بورڈ پر ہاتھ مارے کہ پیانو کی چار پانچ کیز بالکل ٹوٹ پھوٹ گئیں۔

موٹر سرسراتی ہوئی اندھیری رات میں پہاڑ گنج کی سمت جانے لگی۔ یہ لکھنؤ کی ایک معطر اور خوشبودار رات تھی... پہاڑ گنج اور دلکشا کے مینار چاندنی میں جھلملا رہے تھے...وہ شہر میں سے گزرے۔ فٹ پاتھوں پر چاکلیٹ رنگ کے ننھے بچے اخبار بیچ رہے تھے۔ "پانیر پڑھو پانیر۔" مداری لوگ یعنی جگر عجیب عجیب کھیل تماشے کر رہے تھے... "یہ بندریا انگلستان کی میم صاحبہ ہیں۔ ان کا صاحب روٹھ گیا ہے۔ اب میری سرکار دیکھو انھیں کیسے مناتی ہے۔"

"کوئی بات کرو،" میجر غیاث نے دفعتاً مکالمے کا آغاز کیا۔

"کیا بات کروں؟" قمر بولی۔ اور وہ سوچنے لگی کہ یہ سب کے سب لوگ آخر باتوں کے بغیر کیوں اس درجہ بے چین اور اِل ایٹ ایز ہو جاتے تھے۔ اس شام کو بھلا باتوں کی کیا ضرورت ہے؟ ورڈز ورتھ تھا یا شیلے جس نے کیا خوبصورتی سے کہا ہے کہ گائے ہوئے نغمے سویٹ ہوتے ہیں لیکن وہ نغمے جو کبھی نہ گائے جائیں گے ان سے بھی زیادہ سویٹ ہوتے ہیں۔ وہ، قمر سکندر بخت، ایک خاموش نغمہ تھی جسے کبھی کوئی نہ گائے گا... سڑکوں پر بجلی کے قمقمے جلتے گئے اور ان کے ساتھ وقت... سر ہارکورٹ آسٹرچ کے مجسمے کے نیچے کوئی لمبے بالوں والا شخص — شاید کوئی طالب علم — گا رہا تھا، "ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں۔" قمر نے سوچا، اقبال بھی خوب شاعر تھا۔ بیسویں صدی میں اردو کا سب سے بڑا شاعر اور مغنی اور فلسفی اور کیا کچھ۔ اور کم از کم جسٹس شعبان کا، جنھیں وہ چند روز پیشتر سر سوائن کی برج پارٹی میں ملی تھی، یہی خیال تھا۔ اس کے ابا میاں بھی اقبال کو غالب اور میر کے بعد اردو کا عظیم ترین شاعر مانتے

ہیں... لیکن اس کو اقبال کی سمجھ نہ آتی تھی۔ اس کی رائے میں اقبال بور تھا۔ اس نے کس جرأت اور صاف گوئی سے اگلے روز پدماہبتہ کی کاک ٹیل پارٹی میں سب ہائی برو لوگوں کو یہ کہہ کر چونکا دیا تھا کہ اقبال بور ہے... اور وہ سب فائن پالشڈ لوگ اس کی طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگے تھے جیسے کہ اس نے کوئی حد درجہ اَن فیشن ایبل حرکت کر دی ہو...

وہ دلکشا کے پاس اترے۔ ایک الف لیلہ میں سے نکلے ہوئے پُر وقار چوبدار نے ان کے سامنے آ کر جھک کر سلام کیا۔

'صاب، دلکشا منزل اس وقت بند ہے۔ صبح چھ بجے کھلے گا۔"

میجر غیاث نے بڑی بے نیازی اور بے دھیانی کے انداز میں اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور پانچ روپے کا نوٹ نکال کر چوبدار کے ہاتھ میں تھما دیا۔ چوبدار کی نگاہیں تعجب اور مسرت سے پھٹی رہ گئیں۔ "ابھی سرکار! ایک منٹ میں۔"

...اور تب وہ دونوں شاہ بلوطوں کے درختوں کے نیچے سے گزرتے دلکشا کی ایزی گیلری میں داخل ہو گئے جہاں اودھ کے حکمراں اپنے رنگین گیلنٹ چغے پہنے اور جھالروں اور زنجیروں سے لدے پھندے قطار در قطار انھیں چوکھٹوں میں سے دیکھ رہے تھے۔ باہر چاند سیبوں کے اوپر سے نکل کر دریچے سے جھانک رہا تھا۔ رات کے پرندے پھر شور مچانے لگے۔ ایک عقل مند بوڑھا الو ٹو وِٹ ٹو وُو کرنے لگا۔ باغ میں شاہ بلوط کس طرح چپ چاپ سر نیہوڑائے کھڑے تھے۔ قمر کو شاہ بلوط کے درخت بے حد پسند تھے۔ ان کا حزن، ان کا انفرادی روپ، ان کی گریس۔ قمر نے سوچا، "اگر میں درخت ہوتی تو ضرور شاہ بلوط ہوتی..."

میجر غیاث نے خالص کیمبرج کے لہجے میں کہا، "یہاں تو بالکل کاؤنٹ ڈراکولا اسما سفیر ہے۔"

قمر کو احساس ہوا کہ بے چارہ میجر غیاث! اس نے جین آسٹن کے ناول نہیں پڑھے۔ غالباً ورجینیا وولف کا نام تک نہیں سنا۔ وہ ساری عمر جاسوسی شاکر، شرلک ہومز اور آرسن لوپن پڑھتا رہا ہے۔ ابھی تک وہ کاؤنٹ ڈراکولا ورلڈ سے باہر نہیں نکل پایا۔ اس نے اس کی بات کا جواب دیے بغیر دریچے میں سے باہر ندی کے دمکتے پانی کی طرف دیکھا جہاں وقت، ابد اور لازوال حسن کا دلفریب سنگم ہو رہا تھا۔ "مس قمر..." اس نے اپنے دل میں کہا، "یہاں وجود اور کائنات پھر ازل بن گئے ہیں۔ اور وقت کے پرندے

نے اپنی پرواز تھام لی ہے۔"

وہ دریچے کے پاس رکھے ہوئے ایک پتھر کے سرد بنچ پر بیٹھ گئی۔ شنیل نمبر ۶ کی تیز خوشبو اس کے انگریزی باب گولڈن براؤن بالوں سے اٹھتی ہوئی اوپر اودھ کے گیلنٹ ڈی جزیٹ فرمانرواؤں کے مشاموں میں گھسنے لگی اور ان کی آنکھوں میں ایک ست مخموری لہک تیرنے لگی۔

میجر غیاث نے پروقار چوبدار کو ڈانٹا جو کچھ دور دست بستہ کھڑا ان کو ایک گارڈین اینجل کی مانند تک رہا تھا۔

"چلے جاؤ تم!"

گارڈین اینجل چپ چاپ اسی طرح کھڑا رہا۔ میجر غیاث نے جھلاہٹ میں ایک اور پانچ روپے کا نوٹ اس کی طرف پھینکا اور چوبدار وہاں سے اس طرح غائب ہو گیا جیسے وہ تحلیل ہو گیا ہو۔ میجر غیاث دیوار پر تصویروں کو دیکھتا ہوا اِدھر سے اُدھر گھومنے لگا۔ یک لخت اس نے قمر کے سامنے رکتے ہوئے کہا، "کچھ کولڈ ہو رہی ہے۔"

قمر نے سوچا، جب میجر غیاث، تمھارے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں ہے تو تم چپ کیوں نہیں رہتے؟ تم ایسی رومینٹک رات کو اسپائل کیوں کرتے ہو؟ میں جانتی ہوں تم کیا چاہتے ہو۔ میں جانتی ہوں تم مجھے یہاں کیوں لائے ہو۔ مجھے ان کمپنی بہادر کے وظیفہ خواروں کے بھوتوں سے دہشت زدہ کرنے کے لیے۔ لیکن غیاث میاں، میں چھوٹی بچی نہیں۔ جب میں چھوٹی بچی تھی تو ابا میاں مجھے ایک بار اپنے ساتھ سوائی کی ریاست میں چیتے کے شکار پر لے گئے تھے۔ اور میں ذرا بھی نہ ڈری تھی۔ "تم نے وہ اسپیچ تیار کر لی ہو گی؟" قمر نے بلند آواز میں میجر غیاث سے پوچھا۔

"اسپیچ؟" حیرت زدہ غیاث بولا۔ "اوہو، ہاؤ پروزیک! وہ تقریر جو مجھے کل سر گڈنی جوائس کے ڈنر کے بعد کرنا ہے؟ نہیں ابھی نہیں۔ اس کے لیے مجھے کل آفٹر ڈنر ٹوسٹس پر کوئی کتاب دیکھنا پڑے گی۔"

"وہ اسپیچ نہیں، وہ اسپیچ جو تم اب دینے والے ہو، جس کے لیے تم مجھے یہاں لائے ہو... کہ مس قمر سکندر بخت! تم بڑی سویٹ اور چارمنگ ہو۔ تم میڈونا ہو۔ میں تمھیں ورشپ کرتا ہوں۔ غیاث میاں! اگر تم نے ریاض اور بخشی کی طرح جیمز گرینگر کے وائلڈ ویسٹ عشقیہ فلم دیکھے ہوتے یا مس ایتھل

ایم ڈیل کے طویل سینٹی مینٹل رومانوں کو پڑھنے کی بھی زحمت کی ہوتی تو اس وقت تمھیں اس اسپیچ کے تیار کرنے میں دقت نہ پیش آتی۔''

میجر غیاث بالکل ساکت ہو کر اس غصیلی سنڈریلا کو دیکھتا رہا۔ اس کے سیاہ مائل نیلے بالوں کی ایک لٹ اس کے حسین ماتھے پر آ کر خم آلود ہو گئی تھی۔ قمر نے سوچا، میجر غیاث دلکش ضرور ہے۔

''میں جانتی ہوں،'' قمر نے تلخی اور بٹرنس سے اسے چبھونے کے لیے کہا، ''کہ میں ہی نہیں، تمھاری زندگی میں ابھی کئی اور آئیں گی، اور جہاں تک میرا خیال ہے کئی پہلے آ چکی ہوں گی۔ چنچل، باتونی، احمق، فلرٹش لڑکیاں جن کے دماغ میں ماسوا سوشل ہنگاموں، برج پارٹیوں اور کیڈی لاک والے آئی سی ایس شوہروں کے تصور کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ لیکن غیاث میاں! میں ان سے کہیں مختلف ہوں۔ میرے اور ان کے درمیان کتنا بُعد، کتنا تفاوت ہے۔ کیا تم نے 'آن لکر' اور 'مرر' میں میرے ملبوسات کے تذکرے نہیں پڑھے؟ کیا تم نے میرے مطالعے کے کمرے میں الماری میں سجے ہوئے جین آسٹن کے ناول نہیں دیکھے؟... اور کونے میں رکھا ہوا مہاگنی کا بے بی گرانڈ پیانو؟ غیاث میاں! ایک جرمن پروفیسر مجھے پیانو سکھاتا ہے... مگر تم کیا جانو؟''

''قمر... مس قمر، تم کیسی...'' غیاث نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔

''کیسی ظالم ہو؟ یہی تم کہنا چاہتے ہو؟ تم سب لوگ ہمیشہ یہی کہتے ہو کہ تم کیسی کروئل ہو قمر سکندر بخت؟'' قمر نے بھڑک کر کہا۔

''نہیں،'' غیاث نے کمرے کے غالیچے پر لیٹتے ہوئے کہا۔ ''میں یہ کہنے لگا تھا کہ تم کس قدر بور ہو، قمر بیگم۔''

قمر کی آنکھیں نم آلود ہو گئیں۔ ہر ایک اس سے یہی کہتا تھا کہ وہ سویٹ اور چارمنگ لڑکی ہے۔ اپنے ابا میاں کے نزدیک تو وہ سوسائٹی کی روحِ رواں اور جان تھی... اور اس میجر غیاث کی رائے میں وہ محض بور تھی! اس کی وینیٹی کو سخت صدمہ پہنچا اور وہ غصے اور برہمی سے تن گئی۔

''تم مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟'' اس نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے میجر غیاث سے مطالبہ کیا۔

''میں مکمل شانتی ہوں، میں مکمل طمانیت ہوں، میں بدھ ہوں،'' میجر غیاث الرحمٰن ایم اے (کینٹیب) نے سوچا۔ ''میں یہاں اس لیے آیا تھا، کیونکہ پارٹی کے ہینگ اوور کے بعد مجھے نیند آ رہی

Scanned with CamScanner

تھی۔۔۔اور تم میرے ساتھ یوں ہی آ گئیں، محض اتفاقاً۔ ممکن ہے تم جمیلہ گبسن ہوتیں یا ظلنی کپور ہوتیں یا رانی کنور بگھیر سنگھ ہی ہوتیں۔ تم جمیلہ گبسن ہو، تم ظلنی کپور ہو، تم رانی بگھیر سنگھ ہو۔ تم سب میرے لیے ایک ہی کچھ ہو۔ مجھ کو فقط ایک آئیڈیل، پالشڈ لڑکی چاہیے، جو برج میں پارٹنر بن سکے اور شام کو سوشل پارٹیوں میں میرے ہمراہ شریک ہو سکے۔ باقی تم کوئی ریٹا ہیورتھ نہیں ہو۔ میں بھی کوئی ٹائرن پاور، نوئل کاورڈ کے پلے کا کوئی ہیرو نہیں ہوں لیکن مس قمر! میرے پاس ایم جی ٹی سی کنورٹیبل ہے۔ میرے پاس ایک کوٹھی ہے اور میرا اچچا کرشن پور کی ساری جاگیر میرے نام لکھ گیا ہے، اگرچہ یہ دوسری بات ہے کہ وہ جاگیر اب کورٹ آف وارڈز میں ہے۔۔۔''

اور جب چاند چھپ گیا اور شاہ بلوطوں، آموں پر چاروں اور اندھیرا پھیلنے لگا تو میجر غیاث اپنی نیند سے جاگا۔ اسکاچ کا ہینگ اوور اب اتر چکا تھا۔ اس نے اردگرد قمر کے لیے دیکھا۔ قمر وہاں نہ تھی۔ اسے سوتا چھوڑ کر وہ جا چکی تھی۔

یک لخت اسے خوف کا احساس ہوا۔ اس دلکشا میں اودھ کے فرمانرواؤں کے بھوتوں کے درمیان وہ اکیلا تھا۔ کچھ دیر وہ چپکا سانس روکے پڑا رہا۔

پھر وہ اٹھا اور وہاں سے بھاگا۔ پورچ میں اس کی ایم جی ٹی سی غائب تھی۔ ''سرکار! میم صاب اس کو لے گیا ہے،'' چوبدار نے آنکھیں ملتے ہوئے اطلاع دی۔

اور جب صبح ہوئی تو مس قمر نے بستر پر کروٹ لیتے ہوئے سوچا، مانا کہ میجر غیاث اچھے خاصے انٹلکچوئل انسان تھے، ایم جی ٹی سی کا فورٹیبل کا نیا ماڈل بھی ان کے پاس تھا اور ہینڈسم وغیرہ تھے، لیکن خراٹے بھی بلا کے لگاتے تھے۔ اسے سنور کرنے والے مردوں سے شدید نفرت تھی۔

آپا شوشی بے چاری ہی آخر میجر غیاث کے ڈھب کی ہیں، قمر نے سوچا، اور وہ اٹھ کر ڈریس کرنے چلی گئی۔

ہر باشاف دوسرے کمرے میں پیانو کا لیسن دینے کے لیے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

مسٹر گھیٹو سے انٹرویو

غالباً اپریل یا مئی کے مہینے کی چودہ یا پندرہ تاریخ کا ذکر ہے، سنہ حافظے پر زور ڈالنے پر بھی یاد نہیں پڑتا۔ میں ادیس ابابا میں شہنشاہ ہیل سلاسی سے انٹرویو لینے آیا تھا۔ ان کی باریش، گمبھیر، عظیم شخصیت نے مجھ پر بڑا اثر کیا۔ وہ حقیقی طور پر براعظم کے بطل جلیل ہیں۔ مجھے وہ بہت پسند آئے۔ ان کے حسن اخلاق نے زندہ رہنے کی آرزو شدید کر دی۔ بین الاقوامی سیاست پر ان کی نظر کس قدر گہری تھی۔ وہ ساٹھ پینسٹھ سال عمر رواں کے بسر کرنے کے باوجود ابھی تک جوانوں کی چستی اور پھرتی اپنی رگ رگ میں سموئے ہوئے ہیں۔ داڑھی پر خضاب لگاتے ہیں لیکن کمر ابھی تک سیدھی ہے۔ خیر، میری داستان کے سرعنوان اس وقت شہنشاہ ہیل سلاسی نہیں۔ اس ملاقات کا حال بالتفصیل کسی اور موقعے پر بتاؤں گا۔ شہنشاہ سے ملاقات کے لیے بے اندازہ زینے طے کرنا پڑتے ہیں۔ وہ بہت مصروف تھے۔ میرے ڈیڑھ دو ماہ یہاں ادیس ابابا میں ان کے بلاوے کے انتظار میں لگ گئے۔ انٹرویو سے فارغ ہوا تو سوچا کہ کیوں نہ نوزائیدہ مملکت زومنگو کے سربراہ جرنیل گھیٹو سے بھی ملتا جاؤں۔ جہاں اپنے وطن عزیز سے اتنے ہزار میل کی صعوبت جھیل کر ادیس ابابا پہنچا ہوں، چند سو کلومیٹر اور سہی۔ پھر شاید زندگی میں ادھر آنا نصیب نہ ہو سکے۔ رخش حیات کی بے وفائی تو ضرب المثل ہے۔ جنرل گھیٹو کی ذات میں میرے لیے بے انتہا کشش تھی۔ اپنے ملک کے اخباروں میں زومنگو کی خبریں پڑھتا تھا تو میرا دل اس قوم کے عظیم المرتبت معمار جرنیل گھیٹو کے کارناموں پر جذبۂ عقیدت سے سرشار ہو جاتا جیسے مجھے ان کی روح سے کوئی گہرا تعلق ہو۔

شہنشاہ سے انٹرویو کر کے ٹیکسی میں شیرٹن ہوٹل لوٹا۔ وہاں سے ٹیلیفون پر زومنگو کے دارالحکومت ماسادا میں اپنے دیرینہ کرم فرما شیخ خطیب بن رقیب سے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ آپریٹر نے بتایا کہ ادیس ابابا اور ماسادا کے مابین کوئی براہِ راست ٹیلیفون کنکشن نہیں۔ یہ سن کر مایوسی ہوئی۔ سوچا کہ اب شیخ خطیب بن رقیب کو کیونکر اطلاع کروں کہ میں جرنیل گھیٹو سے انٹرویو کرنے کے لیے ماسادا آنے کا

Scanned with CamScanner

ارادہ رکھتا ہوں۔ آپریٹر سے فونوگرام کا پوچھا تو اس نے جواب دیا، ''ٹھہریں، میں منیجر سے پوچھ کر بتاتی ہوں۔'' میں اب تک آپریٹر کو مرد سمجھتا رہا تھا مگر اب اس کی سریلی نسوانی آواز دل پر نشتر کا کام کر گئی۔ یوں لگا گویا دل کے کئی زخم پھر تازہ ہو گئے ہوں۔ ریسیور کو کان سے لگائے اس کی آواز کا منتظر کھڑا رہا۔ میرا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ ہاتھ کانپ رہے تھے۔ وفورِ جذبات سے فون کا مقصد بھی بھول گیا۔ دس منٹ کے بعد فون میں غرغری پیدا ہوئی۔ میں ہمہ تن گوش بر آواز تھا۔

وہی نسوانی آواز آئی، یا کوئی اور تھی: ''ہیلو، ہیلو! میں نے منیجر سے پوچھا ہے، آپ ماسادا میں فونوگرام بھجوا سکتے ہیں۔ مگر اس کو وہاں پہنچنے میں تین دن لگیں گے۔''

میری زبان قدرے گنگ ہو گئی۔ میں نے جسارت کرتے ہوئے پوچھا، ''محترمہ، ذرا سمجھائیے کہ تین دن کیسے لگیں گے؟''

''سر، فونوگرم براہ راست ماسادا نہیں جاتی۔ یہ پہلے قاہرہ جائے گی، وہاں سے لیوپولڈوِل۔ لیوپولڈوِل سے ماسادا تار کی لائن سے منسلک ہے۔''

میں نے قدرے محکم انداز میں پوچھا، ''میں ماسادا جانا چاہتا ہوں۔ کیا وہاں پلین جاتا ہے؟''

''سر، میں نہیں کہہ سکتی۔ آپ اس ہوٹل میں ماسادا جانے والے پہلے مہمان ہیں۔ میں منیجر سے پوچھ کر بتاتی ہوں۔''

وہ انتظار کے خاموش لمحے بھی خاموش موسیقی میں ڈھل کر مجھ پر حاوی ہوتے گئے۔ ریسیور اٹھائے میں خاموش سوچتا رہا۔ پھر سوچ کی پگڈنڈیوں پر بجھی ہوئی حسرتوں کے تارے جھل مل کرنے لگے۔ عمرِ رفتہ کو آواز دی مگر وہ فون کے دہانے کی پہنائیوں میں کھو گئی اور گونج بن کر بھی نہ لوٹی۔

فون میں پھر زندگی پیدا ہوئی۔ میں نے ریسیور کو کان کے ساتھ پیوست کر لیا۔ اُدھر سے اب ایک پاٹ دار مردانہ آواز آئی۔ میں اس پر چکرا گیا۔ زندگی میں بارہا میرے ساتھ ایسا ہی حادثہ گزرا ہے کہ حسن نے اشارہ کیا اور میں متوجہ ہوا تو منہ چڑا دیا۔

''آپ ماسادا جانا چاہتے ہیں؟'' غالباً یہ منیجر کی آواز تھی۔

''ارادہ تو ہے۔''

''میں پوچھ سکتا ہوں، آپ ماسادا کیوں جانا چاہتے ہیں؟''

Scanned with CamScanner

''یہ تو راز کی بات۔ آپ کیوں پوچھتے ہیں؟'' میرے لہجے میں غصے کا ارتعاش آ گیا۔

''مجھے پوچھنا تو نہ چاہیے۔ بات یہ ہے کہ سوائے ناجائز اسلحہ اسمگل کرنے والوں کے ماسادا کوئی نہیں جاتا۔ ایتھوپیا اور زومنگو کے مابین سفارتی تعلقات منقطع ہیں۔''

میں نے کہا، ''میں ایک پاکستانی صحافی ہوں۔ ماسادا میں جرنیل گھیٹو سے ملنے کا پروگرام ہے۔''

''واقعی؟ جرنیل گھیٹو سے؟ میں آپ سے کہتا ہوں کہ جرنیل گھیٹو سے ملنا آپ کو مہنگا پڑے گا۔''

''میں اپنا ارادہ نہیں بدل سکتا۔''

''ان سے ضرور ملاقات کیجیے... وہ دنیا کے واحد آدم خور سربراہِ مملکت ہیں۔''

میں نے محسوس کیا جیسے میرے خون کا درجہ حرارت چڑھ کر اُبلنے کے نقطے کی خبر لانے لگا ہو۔ ایک قابلِ احترام سیاسی شخصیت اور زومنگو کے گل سرسبد کے بارے میں یہ الفاظ میرے سینے پر سانپ بن کر لوٹے۔ میں ریسیور رکھنے لگا تو پھر آواز آئی، ''آپ کے پاس زومنگو کے لیے ویزا ہے؟''

''ابھی بنوا نہیں سکا ہوں۔''

''ویسے زومنگو میں ویزے کے بغیر داخل ہونا زیادہ مفید ہے... بہرحال، آپ کو زومنگو میں پہنچانے کا انتظام میں کر دوں گا۔ آپ نکلنے والے معلوم نہیں ہوتے۔ اگر آپ کے پاس تیس پاؤنڈ اسٹرلنگ کرائے کے لیے موجود ہیں تو سوٹ کیس میں سامان پیک کر کے ابھی نیچے آ جائیں۔ ایک چھوٹا فاکر جہاز ابھی ماسادا جا رہا ہے۔ میں نے پائلٹ سے بات کی ہے۔ وہ آپ کو لے جانے کے لیے تیار ہے۔ اگر آپ جانا چاہتے ہیں تو توقف نہ کیجیے۔ یہ موقع پھر نہیں ملے گا!''

مجھے اپنی خوش نصیبی پر یقین نہ آتا تھا۔ سامنے سنگھار میز کے پچھنے ہوئے قدِ آدم آئینے میں دیکھا تو میرا چہرہ فرطِ انبساط سے کھل اُٹھا تھا۔ خدا نے خود ہی اس حقیر پرتقصیر کے زومنگو جانے کے اسباب پیدا کر دیے۔ اسی لیے اسے مسبب الاسباب کہتے ہیں۔ قدرے عجلت سے سامان سوٹ کیس میں پیک کیا اور نیچے ریسپشن پر پہنچا۔ منیجر وہیں موجود تھا۔ بھورے سوٹوں اور سرخ ترکی ٹوپیوں میں ملبوس دو قدرے مشتبہ سے آدمی بھی منیجر کے کمرے سے باہر دکھائی پڑے۔ مجھے وہ یونانی نژاد لگے۔ دونوں نے مجھ پر بھرپور نگاہ ڈالی۔ پھر مسکرائے جیسے سب کچھ جانتے ہوں۔ میں نے کاؤنٹر پر ہوٹل کا بل چکایا۔ منیجر سے بڑی نرمی سے پوچھا، ''جی یہ تیس پاؤنڈ آپ کو دوں یا ایئر لائن والوں کو؟''

Scanned with CamScanner

اس نے کہا، "لائیے، مجھے دے دیجیے۔ یہ ایئر لائن والے آپ کے سامنے موجود ہیں۔"

"اور ٹکٹ؟"

"میں نے آپ سے کہا ہے کہ ٹکٹ کی ضرورت نہیں۔ بس آپ ان اصحاب کے ساتھ چلے جائیے۔"

"آپ یہ تو بتائیے کہ یہ اصحاب آخر کون ہیں؟"

"مسٹر چشتی، آخر آپ میرے کہنے کا اعتبار کیوں نہیں کرتے؟ یہ دونوں اس ایئر لائن کے مالک مسٹر دوما دوس اور پاپا سکندروس ہیں۔ آپ زومنگو جانا چاہتے ہیں نا؟ مسٹر دوما دوس آپ کو پہنچا دیں گے۔"

دل اندیشہ ہائے دور دراز سے دھڑک رہا تھا۔ سوچا، نہ جانے یہ اجنبی کون ہیں اور راستے میں مجھ سے کیا سلوک کریں۔ ان میں سے ایک نے انگوٹھے کے اشارے سے ہوٹل کے بلوریں دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ میں منیجر سے ہاتھ ملا کر خاموشی سے ان کے ساتھ ہولیا۔ ادیس ابابا کے ایک محلے کو طے کر کے ہم چٹانوں کی اوٹ میں ایک ویران خطے میں ایک پتھریلے ایئر سٹرپ پر آئے۔ وہاں ایک ہلکے پھلکے طیارے کو موجود پا کر ڈھارس سی بندھی اور قدرے اطمینان ہوا کہ غالباً یہ راہرو عشق کی مراد کو پالے گا۔ کچھ افریقی جبے پہنے بھاری لکڑی کے تابوت نما صندوق طیارے کی ہولڈ میں لا د رہے تھے۔ قیاس لگایا کہ ان میں غالباً غیر قانونی اسلحہ ہے جسے زومنگو میں جنرل گھنٹو کے مخالف کرنل ٹینڈا کی سپاہ کو لیس کرنے کی خاطر اسمگل کیا جا رہا ہے۔ اس غدارانہ کاروائی میں ملوث ہونے کے تصور سے خود میرے دل نے مجھے ملامت کی۔ میں جرنیل گھنٹو کا کس منھ سے سامنا کروں گا!

سامان لادنے میں دوپہر ہوگئی۔ پونے پانچ بجے ان سمگلر حضرات کی معیت میں طیارے میں بیٹھ گیا۔ اب ہم ماسادا کی طرف مائل پرواز تھے۔ طیارے میں کل چار آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ تھی۔ میرے رفیق مسٹر دوما دوس اور پاپا اسکندروس باری باری خاموشی سے طیارے کو چلاتے رہے۔ میں ان کی کم گوئی اور حسن سلوک سے بے حد متاثر ہوا۔ وہ وقتاً فوقتاً ایک بوتل سے غٹ غٹ کر کے کوئی مشروب چڑھاتے۔ ایک بار مسٹر پاپا سکندروس نے بوتل کو میری طرف بڑھایا اور گہرے حلق سے نکلتی ہوئی یونانی زبان میں مجھے اس میں سے پینے کی ہدایت کی۔ کچھ نہ پوچھیے اس وقت کیا کیفیت اس خاک نشیں کے ذہن میں ابھری۔ ان قانون شکن اکھڑ یونانیوں کی مہمان نوازی کی فراوانی احساس کی بھٹی میں پگھلی اور قطرہ ہائے گہر بار بن کر آنکھ سے ٹپکی۔ پاپا سکندروس کو کیا معلوم کہ میں طبعاً اور مذہباً دختر رز کی لذت

Scanned with CamScanner

وصل سے بے گانہ رہنے کا پابند تھا۔ ایک ثانیے کے لیے میں ڈرا کہ کہیں میرے انکار سے پاپا سکندروس اور ان کے ساتھی بُرا نہ مان جائیں۔ اگر انھوں نے مجھے اٹھا کر طیارے سے باہر تاریک فضا کی پہنائیوں کی نذر کر دیا تو پھر میرا کیا بنے گا؟ میری معذرت، یعنی اس کفرانِ نعمت کو پاپا اسکندروس نے ذاتی اہانت سمجھا۔ ان کا چہرہ پتھر کی طرح سخت ہو گیا۔ غضب کے انگارے دھنسی ہوئی آنکھوں سے لپکے۔ انھوں نے مجھے باہر پھینکنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ گھن گرج کی آواز میں کوئی موٹی سی گالی دی اور منھ دوسری طرف کر لیا۔

جب ڈیڑھ گھنٹے کی پرواز کے بعد ایک بڑے دریا کے کنارے چند چھتی ہوئی مخروطی جھونپڑیوں کے قریب اُترے تو تیرہ وتار شب ہر ایک چیز کو اپنی زلفِ ہمہ گیر کی لپیٹ میں لے رہی تھی۔ طائرانِ دل زدگان بین و شیون کرتے ہوئے اپنے گھونسلوں کی جانب رواں دواں تھے۔ گاؤں کے لوگ طیارے کے گرد جمع ہو گئے اور تیز تیز لہجے میں کچھ گفتگو کرنے لگے۔ میں ایک طرف سمٹ کر ان کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیتا رہا۔ ساتھ ہی یہ خیال بھی آتا تھا کہ یہ ماسادا تو نہیں ہو سکتا۔ اچانک مسٹر دومادوس میرے قریب آئے۔

''مسٹر... مسٹر...''

''جی، اس حقیر کو چشتی کہہ لیجیے۔ پورا نام شاید آپ یاد نہ رکھ سکیں گے۔''

''مسٹر کشتی، مجھے افسوس ہے، طیارہ اس سے آگے نہیں جائے گا۔ یہ گاؤں ہومنگو کہلاتا ہے اور ہم زومنگو کی علاقائی حدود میں ہیں۔ آیئے میں آپ کو ماسادا کی سڑک پر ڈال دوں۔ ماسادا یہاں سے صرف پچیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔''

''شکریہ مسٹر دومادوس، یہ فرمایئے کہ یہاں سے کسی ٹیکسی وغیرہ کا انتظام ہو سکے گا؟''

میرے جواب پر دومادوس کی رگِ ظرافت پھڑک اٹھی۔ خوب ہنسے، جیسے اتنا اچھا لطیفہ پہلی بار سنا ہو۔

''کیا نام ہے آپ کا؟ ہاں، کشتی... پیدل چلنا ہوگا جناب کو۔'' پھر وہ مجھے گاؤں کی پچھلی طرف لے گئے جہاں ایک کچی سی سڑک کافی اور ربر کے جنگلوں میں سے جاتی تھی۔ ''بس اسے پکڑ لیجیے۔ ہاں سنیے تو۔ ماسادا سے لوٹنے کا ارادہ ہے نا آپ کا؟''

''ہے تو سہی۔''

Scanned with CamScanner

''تو پھر یہاں ہومنگو میں آجایئے۔ ہم یہاں ضروری سامان کی نقل و حرکت کے سلسلے میں ہر سنیچر کو آتے ہیں۔ اب کے ہم آپ کو مفت اوس ابابا لے جائیں گے۔''

سچ کہوں مجھے دومادوس پر پیار آنے لگا۔ دل چاہا کہ ان کی اس محبت کے لیے ان کی بلائیں لے لوں۔ پھر سوچا دومادوس قد میں مجھ سے اور کچھ نہیں تو ایک فٹ بڑے ہیں۔ سعی لاحاصل ہوگی۔ خیر، ان کی ٹانگوں سے بغل گیر ہوا، اور اپنا سوٹ کیس پکڑے سڑک پر ماساداکی طرف روانہ ہوگیا۔ گھڑی میں وقت دیکھا۔ رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ وقت کا دھارا بہتا جارہا تھا۔ میں نے دل میں سوچا کہ مجھ سے پہلے ہزاروں وارفتگانِ عشق نے وقت کی رفتار کو روکنے کی کوشش کی لیکن سب کو مایوسی ہوئی۔ اس اسپِ برق آشام کی باگیں کھنچ نہ سکیں۔ ماہتابِ عالم تاب طلوع ہو چکنے کے بعد اب غروب کی فکر میں غلطاں تھا۔ بھیڑیے اور لگڑ بگڑ اپنی غراہٹوں سے تسکین قلب کی برہمی کا سامان فراہم کرتے رہے۔ دو کلومیٹر چلا تھا کہ سڑک پر ایک گدھا گاڑی ماساداکی طرف کچھ سامان لے جاتی نظر پڑی۔ کراچی میں اکثر گدھا گاڑیاں جاتی دیکھی تھیں لیکن افسوس ان پر چڑھنے کا اتفاق نہ ہوسکا۔ گاڑی والا بڑا شگفتہ اور زندہ دل نکلا۔ میں نے جب بتایا کہ میں پاکستانی صحافی ہوں اور جنرل گھیٹو سے ملاقات کرنے آیا ہوں تو اس نے نہایت عام فہم عربی میں کہا، ''بسم اللہ! آپ ہمارے مہمان ہیں۔''

میں اس کی محبت اور شائستگی سے متاثر ہوگیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس عالمِ خاکی میں اس جنس کی نایابی ہے، پھر یہ کیونکر ہوا کہ مجھ سے معمولی آدمی ذات پر یہ متاعِ بے بہا اس فراوانی سے لٹائی گئی!

میں نے کہا، ''اگر آپ کبھی پاکستان آئیں تو غریب خانے پر قدم رنجہ ضرور فرمایئے گا۔''

میں گدھا گاڑی پر سوار ہوگیا۔ گاڑی بان سے گفتگو میں بڑا پر لطف وقت گذرا۔ زومنگو اور جرنیل گھیٹو کے متعلق پر مغز معلومات حاصل ہوئیں۔ وہ پھر کبھی بتاؤں گا۔ اتوار کے روز کوئی ساڑھے بارہ بجے ہم لوگ خوش گپیاں کرتے ماسادا پہنچ گئے۔ میں مصلحتاً شہر سے آدھ کلومیٹر کی دوری پر گدھا گاڑی سے اتر گیا۔ حاجی ٹینو کا شکریہ ادا کر کے ہوٹل شیرٹن کی تلاش میں چل پڑا۔ حاجی ٹینو صاحب نے باتوں باتوں میں بتادیا تھا کہ شیرٹن شہر کے وسط میں ہے۔ ایک گودام کے باہر پٹرول کے خالی پیپوں پر بیٹھی چند خواتین نظر پڑیں۔ وہ بھڑ کیلے قرمزی رنگ کے فراکوں میں ملبوس تھیں۔ سر پر دوپٹے کی بجائے پروں کی ٹوپیاں دیکھ کر حیرت ہوئی۔ چند لمحوں کے لیے یہ مشتِ خاک بوئے یار سے مہک اٹھی۔ خیر، ایں

Scanned with CamScanner

داستانِ دگر است۔ دھڑکتے ہوئے دل سے ان سے پوچھا کہ شہر کا وسط کہاں ہے۔ ایک پر تمکنت خاتون نے مجھ پر اچٹتی سی نظر ڈالی اور گود میں لیے بچے کے منہ میں چھاتی دیتے ہوئے بولیں، ''شہر کے وسط میں کیوں جانا چاہتے ہیں؟''

عرض کیا، ''مجھے بتایا گیا ہے کہ وہاں میرا ہوٹل واقع ہے۔''

''اس شہر کا وسط کوئی نہیں۔ ہاں اُدھر آدھ کلومیٹر پر ایک بڑا سا ہوٹل آپ کو ملے گا۔ بہت سی کاریں وہاں کھڑی ہوں گی۔''

خاتون کی اس ادائے دلنوازی نے کہیں کا نہ رکھا۔ جلدی سے شکریہ ادا کر کے آگے بڑھا اور ماسادا کی پر رونق سڑکوں پر قدرے لمبے ڈگ بھر کر شیرٹن ہوٹل پہنچ گیا۔ کنکریٹ اور بجری کی یہ عظیم الشان سات منزلہ عمارت ہے۔ اردگرد غلام گردشیں اتنی وسیع ہیں جیسے معماروں نے انھیں گھڑ دوڑ کے لیے بنایا ہو۔ انھیں طے کر کے ریسپشن پر گیا۔ ساری عمارت پر ہو کا عالم طاری تھا۔ بھوتوں کے مسکن کا سا اُجڑا اجڑا ویران ماحول۔ ریسپشن پر چند افریقی شوخ رنگین جبوں اور سولا ہیٹوں میں ملبوس، زومنگو زبان میں گفتگو کر رہے تھے۔ کارتوسوں کی پیٹیاں جبوں پر باندھ رکھی تھیں اور چمڑے کے خول میں ملفوف پستول اپنے زانوؤں پر لٹکائے تھے۔ ان کے چہروں کے اتار چڑھاؤ اور زبان کی فصاحت سے اندازہ کیا کہ غالباً جرنیل گھمبو کی قومی فوج کے افسر ہیں۔ ملاقات پر بڑے خوش اخلاق اور ہنس مکھ نکلے۔ اور ان سے باتیں کیں تو تفکرات کا بوجھ بالکل تحلیل ہو چکا تھا۔ ان میں ایک نے آنکھوں سے مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔ ''کہاں سے آئے ہو؟''

''لاہور سے۔''

''لاہور؟ کہاں ہے لاہور؟... ہاں، یاد آیا، وہی لاہور جس کے باہمت جیالوں نے بزدل بھارت کی عسکری قوت کا بھرم کھول ڈالا اور سینہ سپر ہو کر بھارتی فوج کے سیلاب کا رخ موڑ دیا۔ آپ تو ہمارے بھائی ہیں۔''

''میں بھی آپ کو بھائی سمجھتا ہوں۔ زومنگو کی جنگ آزادی کے کارنامے وہاں میرا خون بھی گرماتے رہے۔''

اس نے مجھے سرتاپا بھرپور نظروں سے دیکھا۔ ''آپ بھی ان جیالوں میں شامل تھے؟''

Scanned with CamScanner

''میں صحافی ہوں، اپنے اخبار کے دفتر میں بیٹھ کر جنگی ترانے لکھتا رہا۔''

''آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بلا تکلف ارشاد کیجیے۔''

''کیا آپ سردست مجھے ہوٹل میں کمرہ دلوانے میں میری مدد کر سکیں گے؟''

''بصد شوق۔ اس میں کوئی دقت نہیں ہے۔ ہوٹل کے تین چوتھائی کمرے خالی پڑے ہیں۔ ان میں ایک چوتھائی میں برطانوی اور امریکی اخباروں کے خاص نمائندے اور ہوٹل کے عملے کے لوگ اقامت پذیر ہیں۔ آپ کون سی منزل پر کمرہ پسند فرمائیں گے؟''

''میں ساتویں منزل کو ترجیح دوں گا۔''

اس تر و تازہ فوجی افسر کا نام جمعہ پچوکا تھا۔ وہ زومنگو کی قومی فوج میں میجر کے عہدے پر فائز ہوئے تھے اور عنقریب ترقی پا کر لیفٹیننٹ کرنل ہونے والے تھے۔ میجر جمعہ پچوکا کی اعانت اور رہنمائی سے ہوٹل کی ساتویں منزل پر کمرہ نمبر پچاسی میں مقیم ہو گیا۔ سفر کی تھکن اتارنے کے لیے کچھ عرصہ نیند کی آغوش میں خود کو لوری دی۔ سو کر اٹھا تو رات کے نو بج رہے تھے۔ فوراً جمہوریہ یمن کے قونصل شیخ خطیب بن رقیب سے فون پر رابطہ قائم کیا تو وہ نہ ملے۔ معلوم ہوا موزمبیق ہجرت کر گئے ہیں اور عرصۂ دراز سے وہیں ہیں۔ پھر پاکستانی قونصل خانے کے دفتر کے سپرنٹنڈنٹ چودھری عبدالمجید سے بذریعۂ فون ملاپ قائم کرنے کی کوشش کی۔ وہ بھی گھر چلے گئے تھے۔ چوکیدار نے بتایا کہ دفتر کے اوقات نو بجے صبح سے چار بجے شام تک ہیں۔ کل ان اوقات میں فون کر لیجیے۔ تب مل جائیں گے۔

دوسرے روز نو بجے قونصل خانے پہنچا۔ یہ تین منزلہ قدرے بوسیدہ عمارت تھی، بگلے کی سی سفید۔ زیریں دو منزلیں بینک آف ماسادا کی تحویل میں تھیں۔ عمارت کے کونے پر پاکستانی پرچم کے ہلال کو ایک تارے کی معیت میں لہراتے دیکھا تو دل ایسی انبساط انگیز کیفیت سے دوچار ہوا جس کے سامنے شادمانیٔ وصالِ محبوب خاک تھی۔

چودھری عبدالمجید صاحب سے ملاقات ہوئی۔ بڑی بردبار اور متواضع طبیعت پائی ہے۔ چودھری صاحب مائل بہ فربہی ہیں۔ وضع قطع انگریزی ہے۔ میں نے دیکھا کہ چشمے کی ایک کمانی شکست و ریخت زمانہ کی نذر ہو گئی ہے اور کان سے اس کا رشتہ ایک تاگے سے قائم ہے۔ موٹا سولا ہیٹ سب معزز زومنگوں کی طرح، دھوپ ہو یا چھاؤں، سر پر اوڑھے رکھتے ہیں۔ کہنے لگے، ''قونصل اب کوئی نہیں۔

Scanned with CamScanner

نائب قونصل بھی نہیں۔ زومنگو والے پاکستان اور ابی سینیا میں گہرے سفارتی تعلقات کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں اس لیے پاکستان نے اپنے قونصل کو واپس بلا لیا ہے۔'' چودھری صاحب نے بصد اصرار کافی سے تواضع کی اور دیر تک وطن کی باتیں کرتے رہے۔

میں جانے لگا تو انھوں نے پوچھا: ''چشتی صاحب، آپ یہاں ماسادا میں کیسے ٹپک پڑے؟''

''میں زومنگو کے حالات کا مطالعہ کرنے آیا ہوں۔ اصل مقصد یہ کہ یہاں کے عظیم سربراہ جرنیل گھیٹو سے انٹرویو لینے آیا ہوں۔''

''انٹرویو سے آپ کو کیا فائدہ ہوگا؟ چشتی صاحب، میرا مشورہ تو یہ ہے کہ جتنی جلد ہو سکے پاکستان اپنے بیوی بچوں کے پاس لوٹ جائیے۔''

''چودھری صاحب، انٹرویو کے بغیر لوٹنے کا تصور بھی میں ذہن میں کیسے لا سکتا ہوں۔''

''جرنیل گھیٹو سے ملاقات آسان نہیں۔ وہ صحافیوں اور اخباری نمائندوں سے شدید نفرت کرتے ہیں۔ چشتی صاحب، آپ میرے ہم وطن ہیں۔ میری بات مانیں۔ یہاں کے حالات بہت خراب ہیں اور زومنگو بحران سے دوچار ہے۔ کسی دن بھی ماسادا پر کرنل ٹینڈا کے تربیت یافتہ گوریلوں کا حملہ متوقع ہے۔''

چودھری عبدالمجید نے مجھے بتایا کہ ایتھوپیا اور سومالیا گوریلوں کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔ کرنل ٹینڈا کو روس اور چیکوسلوواکیہ سے دھڑا دھڑ جدید اسلحہ اور طیارے فراہم کیے جا رہے ہیں۔

میں چودھری صاحب سے مل کر آیا تو دیر تک زومنگو کی سیاسی صورت حال کے بارے میں سوچتا رہا۔ مفت میں اتنا وقت بیکار ضائع کیا۔ کل کو اگر کرنل ٹینڈا کے گوریلوں نے واقعی ماسادا پر دھاوا بول دیا اور دارالسلطنت ان کے قبضے میں آگیا تو پھر جرنیل گھیٹو سے ملاقات اگلے جہان ہی میں ہونی ممکن ہوگی۔ یہ خیال ذہن میں بجلی بن کر کوندا۔ لیکن جرنیل سے ملاقات ہو تو کیسے ہو؟ جن احباب سے توقع تھی کہ ان کے اثر و رسوخ سے رہ گذر ملاقات کے پیچ و خم اور نشیب و فراز کو سد حاوٹ اور ہمواری حاصل ہوگی وہ بھی میری طرح بے بال و پر نکلے۔ میں اپنی محرومیوں اور نامرادیوں کے زخموں پر سے پٹیاں کھولنے لگا۔ کتنے بڑے ناسور میرے دل کے اندر انگاروں کی طرح دہک رہے تھے۔ اس عالمِ تیرگی میں سے اوپر آیا تو ٹیلیفون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ ریسیور میں میجر جمعہ چچوکا کی آواز نوید صبح گاہی کا پیغام بن

Scanned with CamScanner

کر نغمہ ریز ہوئی۔ ’’چیکوسلوواکیہ کے سفارت خانے کے پریس اتاشی کی طرف سے دی ہوئی دعوتِ مشروب میں بلاوا آیا ہے۔ چلو گے؟‘‘

’’میرے نام کا دعوت نامہ ہے؟‘‘

’’یہ ضروری نہیں۔ میں اور میرے احباب سانیا کیفے میں تمھارے منتظر ہیں۔ پہنچنے کی کوشش کرو۔‘‘

دعوتِ مشروب میں اچھی رونق اور گہما گہمی تھی۔ مشرقی یورپ کے ملکوں کے سفارت خانوں کے تھرڈ سکریٹری سب کے سب موجود تھے۔ ان کے علاوہ ماسادا کے بڑے بڑے ہندوستانی تاجر اور دکاندار بھی خاصی تعداد میں شریکِ محفل تھے۔ آپ جانتے ہیں مجھے شرمیلے پن کا مرض ہے۔ اپنی تنہائی کو مجلسی یا اجتماعی گہما گہمی میں اور بھی گھبرانے لگتا ہوں۔ اپنے مشروب کو ہاتھ میں لیے کیفے کے ایک کونے میں جا بیٹھا اور چپ چاپ زندگی کے مفہوم پر غور کرنے لگا۔ ساتھ ساتھ ان لوگوں کی حرکات و سکنات کا مشاہدہ بھی کرتا جاتا تھا۔ صحافت نام ہی اس چیز کا ہے۔ دو ہندو تاجر میری طرف بڑھے۔ وہ سوٹوں میں ملبوس تھے اور سروں پر پگڑ باندھ رکھے تھے۔ مجھ سے بے تکلفی سے باتیں کرنے لگے۔ پتا چلا دونوں بھائی ہیں اور مدت سے ماسادا میں پنساری اور سود کا کاروبار کرتے ہیں۔ ان کی فرم کا نام شاہ نیم چند فول چند کمپنی تھا۔ یہ ہندو بھی گوریلوں کے حملے کی خبر سے بے حد ہراساں تھے۔ بتانے لگے کہ جرنیل گھیلو کی حکومت بھی اب غیر افریقیوں کو برداشت نہیں کرتی۔ جنرل اسمبلی نے نیا نیا قانون نافذ کیا ہے کہ ایشیائی دکاندار یا تو ایک ماہ کے اندر اندر حقوق شہریت حاصل کریں، ورنہ زومنگو سے اپنے بستر گول کریں۔ مجھ سے پوچھنے لگے، ’’کیسے آئے ہو؟‘‘

میں نے کہا، ’’جرنیل گھیلو سے انٹرویو کرنے۔‘‘

شاہ نیم چند فول چند سے جب میں نے اپنی کوششوں کا ذکر کیا اور ان کے حساس ذہن میں یہ بات ڈالی کہ اگر میں اپنے اس واحد مقصد میں کامیاب نہ ہوا تو پتا نہیں کیا کر گزروں تو انھیں میری ذات سے ایک گونہ ہمدردی ہو گئی۔ سیٹھ فول چند کہنے لگے:

’’مسٹر چشتی، ایسی بات ہے تو میں پوری کوشش کروں گا۔ جرنیل گھیلو ہماری کمپنی میں بے حد دلچسپی لیتے ہیں۔ خود ان کی خدمت میں آپ کی خواہش گوش گذار کروں گا۔‘‘

اگلے دن شاہ نیم چند فول چند سے رابطہ پیدا کیا۔ شاہ فول چند نے خوش خبری دی۔ ’’ہیلو! ابھی

Scanned with CamScanner

ابھی کمپنی پر آجائیں۔ جرنیل صاحب نے ملاقات کے لیے آج دوپہر دو بجے کا وقت مقرر کیا ہے۔"

میرے ہاتھ فرطِ مسرت سے کانپ رہے تھے۔ اسی وقت چودھری عبدالمجید کو مطلع کیا کہ آپ کو چلنا ہو تو اپنی کار میں مجھے بھی لیتے چلیں۔ میجر جمعہ پچوکا کے نمبر پر بھی فون پر خبر دی کہ جرنیل گھیٹو آج دو بجے ملاقات کریں گے۔ وہاں سے کوئی خاتون بولیں:

"میجر جمعہ پچوکا جنرل کے پاس آپ کی رفاقت میں نہیں جاسکیں گے۔ مناسب جانیں تو مجھے لے چلیں۔"

"جی، آپ کو... آپ کو؟ میجر جمعہ پچوکا کہاں ہیں؟"

"میجر جمعہ پچوکا کو تو آج صبح کیسینو کے چوک میں سولی پر چڑھا دیا گیا۔"

"سچ... دیکھیے..."

"آپ کو پتا نہیں؟ آدھا شہر وہاں منظر دیکھنے کے لیے پہنچا ہوا تھا۔ آپ کیا کر رہے تھے؟"

میری آنکھ نم ہو گئی۔ یقین نہیں آتا تھا کہ میجر جمعہ پچوکا کی پُروقار دلکش شخصیت یوں یکلخت داغ دے جائے گی۔ میرے ذہن میں ایک بم پھٹا اور پھر ان بموں کا سلسلہ میری روح کے پرخچے اڑاتا لامتناہی سا ہو گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ میجر جمعہ پچوکا اور ان کے دس ساتھیوں کو جنرل گھیٹو کے حکم سے غداری کے جرم کی پاداش میں پھانسی دی گئی۔ صداقت شعار اور محبِ وطن جیالوں کے اس انجام کو سامنے دیکھ کر بین الاقوامی سیاست سے نفرت ہونے لگی۔

"میں آپ کو لیتا چلوں گا۔ تیار رہیے،" میں نے پُرشفقت آواز میں خاتون سے کہا۔ عورت کا آئینۂ دل کوئی سنگ دل ہی توڑ سکتا ہے۔ مجھ میں قدرت نے یہ سنگ دلی ودیعت نہیں کی۔

ایک گھنٹے تک چودھری عبدالمجید نہ آئے۔ قونصل خانے فون کیا۔ چودھری صاحب نے بتایا، کار ان کے پاس نہیں ہے اور وہ پیدل نہیں آسکتے۔ ہوٹل سے ٹیکسی لی اور میجر جمعہ پچوکا کی اقامت گاہ پر خاتون کو بلایا۔ وہ نیلے، ارغوانی، نارنجی فراک میں ملبوس تھیں اور بہت روانی سے فرانسیسی بولتی تھیں۔ فوٹوگرافی سے شوق رکھتی تھیں، چنانچہ کیمرا بے داغ سفید شانے پر آویزاں کیے تھیں۔ کہنے لگیں، "جمعہ پچوکا مرحوم آپ کا ذکر اکثر کیا کرتے تھے۔ میں آپ سے ملنے کی بے حد مشتاق تھی۔" شاہ نیم چند فول چند کمپنی سے شاہ فول چند کو لیا اور جرنیل گھیٹو کی اقامت گاہ پر پہنچے۔ گھڑی کی ایک سوئی پورے دو بجے پر تھی۔

Scanned with CamScanner

ٹیکسی کو ماسادا پاور ہاؤس سے آگے آہنی تاروں کے پاس روکا گیا۔ چند نوجوان گلفام سنتری وہاں پہرہ دے رہے تھے۔ شاہ فول چند اور مادموزیل شنو کا گلا بو سے سنتریوں کا سارجنٹ اس انداز سے باتیں کرنے لگا جیسے پہلے سے گاڑھی چھنتی ہو۔ ہم ایک پختہ تارکول کے راستے پر فرلانگ کا فاصلہ پیدل طے کر کے اقامت گاہ کے اندر داخل ہو گئے۔ وسیع برآمدے میں بیسیوں سیاسی شخصیتیں رنگ برنگے جبے اور کلغیوں والے سولا ہیٹ پہنے جنرل گھیتو کے دیدار کی تمنا دلوں میں لیے بیٹھی تھیں۔ شاہ فول چند کہنے لگے کہ لوگ جنرل کے سلام کی خاطر ہر روز یہاں صبح سے آنے لگتے ہیں۔ جنرل شام کو چار بجے باہر نکلے گا اور ہر ایک سے گلے مل کر فرداً فرداً دو تین جملوں میں ان کے گھر بار کی خیریت پوچھے گا۔ اس کے بعد یہ لوگ دوسری صبح آنے کے لیے اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں۔ فوجی وردی میں ملبوس ایک چھریرا نوجوان، جس کے چہرے کو چیچک نے کسی کام کا نہ رکھا تھا، ہماری طرف بڑھا۔ یہ صاحب جنرل کے پرسنل سیکرٹری تھے۔ خندہ پیشانی سے کہنے لگے، ''آپ پاکستان والے کشتی صاحب ہیں؟ چلیے، جنرل گھیتو آپ کے منتظر ہیں۔''

وفورِ شوق سے دل بری طرح پھڑ پھڑا رہا تھا، جیسے کوئی طائرِ زخم چکیدہ ہو۔ اشتیاقِ وصلِ محبوب کی سی کیفیت تھی۔ میں اب زومنگو کے عظیم المرتبت قائد اور مردِ مجاہد سے ملنے والا تھا جنھوں نے ایک مدت فرانسیسی استعمار کے خلاف جنگِ حریت لڑی تھی اور اپنی قوم کو طویل جد و جہد کے بعد حق خود ارادیت دلا کر ایک ایسا مینار نصب کیا تھا جس کی روشنی کی طرف سارا براعظم افریقہ منھ اٹھا کر دیکھتا تھا۔ میرے اشارے پر مادموزیل شنو کا گلا بو نے کیمرا شانے سے اتار کر حنائی ہاتھوں میں سنبھال لیا۔ شاہ فول چند نے ایک کھاتے کی قسم کی کاپی نکال لی۔ ترجمانی کے فرائض انھیں نبھانے تھے۔

جرنیل گھیتو نے بیٹھے بیٹھے اپنی وسیع و عریض زرکار میز پر سے مجھ سے ہاتھ ملایا اور ہم ان کے سامنے بیٹھ گئے۔ جناب گھیتو بھوری رنگت کی قدرے نیلی فوجی وردی میں ملبوس تھے۔ یوں لگا جیسے حکومت کی تند ذمہ داریاں انھیں وردی کے دھلانے کی مہلت نہیں دیتیں۔ میں چپ چاپ چند ثانیے ان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ اور اس کی جغرافیائی تشکیل کا جائزہ لیتا رہا۔ سادہ کھردرا چہرہ، جسے گلگشتِ چمن زارِ حکومت نے خوے نفاست و ملائمت سے آلودہ نہیں کیا تھا۔ موٹی ارجمند ناک پر جمے ہوئے سیاہ محدب نگاہ چشمے جن کے پیچھے سے آنکھیں گویا نقاب میں مستور تھیں۔ نیچی پہلوانوں کی سی

پیشانی۔ کدو کا سا گول سر۔

میں نے مسکرا کر قدرے لرزاں لہجے میں کہا، ''میں پاکستان کے عوام کی طرف سے زومنگو کے مردِ مجاہد کے نام ہدیۂ تہنیت لے کر آیا ہوں۔''

شاہ فول چند کہنے لگے، ''چشتی صاحب، آسان ہندی میں بات چیت کیجیے۔ میں خود نہ سمجھا تو جنرل کو خاک سمجھاؤں گا'' وہ ترجمہ کرنے لگے۔ میں نے اسی اثنا میں جنرل کے کمرے کا مشاہدہ کیا تاکہ وقت کی پونجی کی پائی پائی راہزنوں کے ہاتھوں نہ لٹے۔ جرنیل کے عقب میں دیوار پر فرانس کے فاتح شہنشاہ نپولین اول کی شبیہ عزم واستقلال کا سبق دے رہی تھی۔ میز پر امریکی میگزین ''لائف'' کی ایک جلد دیکھی جو ایک نیم برہنہ عورت کی تصویر پر کھلی تھی۔ جناب گھیٹو نے اس پر دو تین جگہ پنسل سے لکیریں ڈال کر نشاندہی کی تھی۔ جنرل کے پاس سے ایک سفاکانہ بہیمیت کا حامل چہرہ ابھرا اور حقائق کو پالینے والی ترچھی بھرپور نظروں سے مجھے گھورا۔ یہ جناب گھیٹو کا پالتو چیتا تھا۔

''ہدیہ کہاں ہے جو آپ ساتھ لائے ہیں؟ میں اس کو دیکھنا پسند کروں گا،'' جناب گھیٹو نے کھلتے ہوئے کہا۔ ان کا بایاں ہاتھ چیتے کے سر سے کھیلنے لگا۔ خیال آیا کہ ترجمانی کی گڑبڑ ہوگئی۔ جناب گھیٹو کے اشتیاق کو دیکھ کر دل میں آیا کہ اپنا پار کر قلم نکال کر پیش کردوں۔ پھر دانش وفہم مصلحت کیشی پر گوے سبقت لے گئے۔ قلم کو نکالتے نکالتے رہ گیا۔ سوچا یہی تو صحافیوں کا زیور ہے۔ یہ نہ رہا تو کیا رہا؟

میں نے وضاحت کی تو جنرل کی غلافی آنکھیں غیظ وغضب سے دہکتے انگارے ہوگئیں۔ ان کا چہرہ ناخوشی اور خفگی کی کیفیات کا غماز تھا۔ چیتے نے بھی اپنے سر کو قدرے اوپر اٹھایا۔

''تو پھر آپ میرا وقت کیوں ضائع کرنے آئے ہیں؟ میں بہت مصروف آدمی ہوں... کیا نام ہے آپ کا؟''

''چشتی۔ پورا نام امید علی چشتی ہے۔ میں پاکستان کے ایک بہت کثیر الاشاعت اردو روزنامے 'ڈیلی وحشت' کا مدیر اعلیٰ ہوں۔ آپ کے درخشاں کارنامے ہر پاکستانی کے ورد زبان ہیں۔ وہی مجھے چار ہزار کلومیٹر کھینچ لائے۔''

جناب گھیٹو زیر لب قدرے مسکرائے، جس سے گھبراہٹ اور خوف کی فضا یکسر تحلیل ہوگئی۔ چیتا بھی شفقت بھرے لہجے میں غرانے لگا۔ لیکن ان کے اگلے الفاظ نے پھر کمرے کے درجۂ حرارت کو

Scanned with CamScanner

نقطہ انجماد تک گرادیا اور میں چکرانے لگا۔
''آپ سی آئی اے کے ایجنٹ ہیں یا آپ روسی خفیہ سروس کے؟''
میں نے ان کی حس مزاح سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کی اور خفیف سا مسکرایا۔ ''جناب گھیبو، یقین مانیے میں نہ امریکی ایجنٹ ہوں، نہ روسی شہری۔ ایک سیدھا سادا پاکستانی مسلمان ہوں۔ میرا پاسپورٹ ملاحظہ فرمائیے۔''
''آپ کو زومنگو میں آنے کا ویزا کس نامعقول شخص نے دیا تھا؟ اور آپ یہاں پہنچے کیسے؟''
''جناب، مجھے ادیس ابابا میں بتایا گیا تھا کہ آپ کے ملک میں داخل ہونے کے لیے ویزا درکار نہیں ہے۔''
''آپ ادیس ابابا میں کیا کر رہے تھے؟''
''جناب گھیبو، میں شہنشاہ ہیل سلاسی سے انٹرویو کرنے آیا تھا۔''
جناب جنرل گھیبو اپنی گھومنے والی زرکار کرسی پر اچھل پڑے۔ ان کی مستعدی اور چستی اس امر کی مظہر تھی کہ اس ادھیڑ عمر کی فربہی کی تہوں میں پُر اثر کمانیاں نصب ہیں۔
''شہنشاہ ہیل سلاسی سے؟ وہ فتنہ پرور شخص! کیا اسی نے تمھیں بتایا تھا کہ زومنگو میں ویزا ضروری نہیں؟ پھر تم یہاں آئے کیسے؟ داماد وس اور پاپا سکندروس ضرور تمھیں اپنے جہاز میں لائے ہوں گے؟''
جنرل گھیبو کرسی پر گھومے اور شاہ فول چند سے مخاطب ہوئے۔
''شاہ فول چند، یہ آدمی تو ہیل سلاسی کا جاسوس ہے۔ تم بھارتی تو کافی کائیاں اور سرتے سیانے ہوتے ہو، مگر یہ تمھاری آنکھوں میں بھی دھول ڈال گیا۔''
شاہ فول چند نے کہا، ''جنرل! اس صحافی کی معصومیت اور راست روی کے بارے میں میری ضمانت قبول فرمائیے۔''
''تمھاری ضمانت نہ ہوتی تو میں مسٹر چشتی کو دار پر چڑھا دیتا۔'' پھر میری طرف متوجہ ہوئے۔
''آپ چاہتے کیا ہیں؟''
''جناب گھیبو، آپ کی وزارت خارجہ سے زومنگو کا دستور اساسی اور آپ کے سوانحی خاکے فراہم کرنے کی درخواست کی تھی۔ پاکستانی اسسٹنٹ ڈپٹی قونصل چودھری عبدالمجید سے یہ سن کر مایوسی ہوئی

Scanned with CamScanner

کہ دستور ابھی تک زیر طبع ہے اور سوانحی خاکے پر بھی ہنوز وزیر تعلیم نے اپنا مکمل نہیں کیا۔ وقت بھی کم ملا، اس لیے انٹرویو کا سوالنامہ تیار نہیں ہو سکا۔ بہر حال چند ثانیے اپنے قیمتی وقت سے میرے لیے وقف کیجیے۔"

جناب گھمبو میری پر امید التجا پر جیسے کچھ پسیج سے گئے۔ "ہاں فرمائیے۔"

میں نے کچھ سوچا۔ ذہن میں بین الاقوامی سیاسیات، معاشی مسائل، افرو ایشیائی اتحاد، ایٹم بم وغیرہ پر ٹیڑھے میڑھے سوالات کا ایک اژدہام تھا۔ جنرل گھمبو سے کون سا سوال پوچھوں جس سے کمرے میں چھائی ہوئی اداسی اور اجنبیت کی گھنگھور گھٹا چھٹ جائے۔ سوالات کے سنگریزوں میں سے آخر ایک سنگریزہ ذہن پر گرا اور میں نے اسے جناب گھمبو کی طرف اچھال دیا۔ "جناب گھمبو، کیا آپ وضاحت کریں گے کہ زومنگو کے اہم سیاسی اور معاشی مسائل اس وقت کیا ہیں اور ان کو حل کرنے کے لیے آپ کی حکومت کیا کر رہی ہے؟"

"میری حکومت کے وزیر امور اقتصادیات و معدنیات نے ان مسائل پر ایک کتاب ترتیب دی ہے جس میں ان مسائل کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ آپ اسے پڑھیں، آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ہم نے فرانس کا مینڈیٹ ختم ہونے کے بعد پانچ سال کی مدت میں اس ملک کی تعمیر و ترقی کے سلسلے میں کیا کچھ کیا ہے۔ میں نے کتاب نہیں پڑھی، لیکن اس میں سب معلومات اور اعداد و شمار موجود ہیں۔ معاشی مسائل زومنگو میں نہیں ہیں۔ عوام میری حکومت سے مطمئن اور خوش ہیں۔ جہاں تک اقتصادیات کا تعلق ہے ان کا دارومدار امریکن فائرسٹون کمپنی اور بلیک بینز کافی کمپنی پر ہے۔ بعض سرپھروں کا خیال ہے کہ حکومت ان کمپنیوں کو قومی ملکیت قرار دے دے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ کمپنیاں یہاں سے اپنا سرمایہ لے گئیں تو ہماری اقتصادیات تباہ ہو جائے گی۔"

ذہن نے ایک اور طائرِ خیال شکار کیا۔ "کیا زومنگو میں تیل کے چشمے دریافت ہونے کے امکانات ہیں؟"

"نہیں، زومنگو میں تیل کے چشمے نہیں۔ ہم اپنا پٹرول وغیرہ موزمبیق سے درآمد کرتے ہیں۔ کامیوسا کی پہاڑیوں میں ہیروں کی کان کی دریافت کا کام دو سال سے ہو رہا ہے۔ دو مصری ماہر معدنیات اور چند یونانی انجینئروں کی ٹولیاں وہاں سروے کر رہی ہیں۔"

Scanned with CamScanner

ان باتوں کے بعد کمرے میں رفاقت اور انسیت کی بو رچ بس گئی تھی۔ میں نے جنرل کے پیچھے عقبی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ تیز خشک ہوا میں ببول جھول رہے تھے۔ طائرانِ مردار خور (جنھیں عرف عام میں گدھ کہہ لیجیے) اقامت گاہ کے لان پر فرطِ اضطراب میں محوِ رقص تھے۔ میں نے تیسرے سوال کے لیے پر تولے۔ "جناب گھیٹو، آپ کے یہاں کل آبادی میں سے خواندہ لوگ کتنے ہیں؟ کیا آپ ملک کے نظامِ تعلیم پر کچھ روشنی ڈالیں گے؟"

"خواندگان کی مردم شماری کی طرف ہم توجہ نہیں دے سکے۔ مگر وزیرِ اقتصادیات و معدنیات کے کتابچے میں اس ضمن میں چند اعداد و شمار غالباً مل جائیں گے۔ ہم نے دو تین صنعتی تربیت کے ادارے کھولے ہیں۔ میری حکومت اعلیٰ درسی تعلیم کے حق میں نہیں۔ یہ نہیں کہ زومنگو میں اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ آپ کو نہیں ملیں گے۔ میرا وزیرِ اقتصادیات معاشیات میں پیرس یونیورسٹی کا گریجویٹ ہے۔ خود میں بھی آکسفورڈ کا ڈاکٹر آف لاز ہوں — میں ابھی آپ کو گاؤن اور چوکور پھندنے دار ٹوپی دکھاتا ہوں — دو سال پہلے جب میں برطانیہ میں ملکہ الزبتھ اور شہزادہ فلپ کی دعوت پر گیا تو وہ مجھے آکسفورڈ کے شہر میں لے گئے اور مجھے بہت سے لوگوں کے سامنے ڈاکٹر آف لاز بنایا گیا۔ ہماری سول سروس میں بھی آپ کو اکثر ایسے لوگ مل جائیں گے جو پڑھ لکھ لیتے ہیں۔ فرانس نے اپنے مینڈیٹ کے دوران ماسادا، کیوٹا، ٹنکو وغیرہ میں کئی ایک اسکول اور کالج قائم کیے۔ دراصل انھیں انتظامیہ چلانے کے لیے کلرک درکار تھے۔ میں نے یہ دیکھا ہے کہ وہ لوگ جنھوں نے ان کالجوں میں تعلیم پائی ہماری قوم کا سب سے بیکار اور مفلوج حصہ ہیں۔ فرانسیسیوں کے جانے کے بعد مناسب اسٹاف نہ ہونے کی وجہ سے وہ کالج ایک ایک کر کے بند کرنا پڑے، اور یہ اچھا ہی ہوا۔ ان کی عمارت کو اب فوجی بیرکوں کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔"

"میں آپ کے ملک کی فکری، تہذیبی اور روحانی زندگی کے متعلق قدرے واقف ہونا چاہتا ہوں۔"

جنرل گھیٹو نے اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں پیوست کیا اور دو ثانیے کے لیے مراقبے میں چلے گئے۔ "چشتی صاحب، آپ کا سوال خاصا گہرا ہے۔ بہتر رہے گا کہ آپ جاتے ہوئے اسے میرے سیکرٹری کو نوٹ کرا دیں۔ وزیرِ تعلیم پروفیسر ہرچا کا تازی سے مشورہ کر کے دو تین روز میں ایک مربوط تفصیلی جواب آپ کو پہنچا دے گا۔ روحانی زندگی پر زومنگو میں خصوصی توجہ دی جا رہی ہے۔ صرف ماسادا میں بیس مختلف مشنوں کے کلیسا آپ کو ملیں گے جن کی تبلیغی سرگرمیوں کی بدولت یہاں کے

Scanned with CamScanner

اسی فیصدی باشندوں کا سراپا معرفت وروحانیت میں ڈوبا ہوا ہے۔ دن کا بیشتر وقت ان کلیساؤں کے گھنٹے بجتے رہتے ہیں۔ ہمارے دیہات میں روحانیت کی باگ ڈور وچ ڈاکٹروں نے سنبھال رکھی ہے۔ میرے والد بھی وچ ڈاکٹر تھے، اور کافی کامیاب۔"

جنرل گھیٹو کی باتوں میں اب اپنائیت کی مہک آنے لگی۔ ان کے چیتے نے بھی اب ہماری طرف اُنس سے دیکھنا شروع کر دیا تھا اور اس کی ترچھی شفیق آنکھیں چشم آہو کی سی حسرتناکی سے ہمارا جائزہ لینے لگی تھیں۔ چیتا ایک دفعہ میری طرف تھوڑا سا بڑھا بھی لیکن جنرل نے اسے گلے کے کالر سے تھام لیا۔ شاید وہ مصافحہ کرنے آرہا تھا۔ مادموزیل شنو کا گلا بو کے کیمرے کی مسلسل کلک کلک ظاہر کرتی تھی کہ ان کی فوٹوگرافی اس عرصے میں جاری وساری رہی۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کیمرے میں فلم ڈالنا بھول گئی تھیں اور کلک کلک سے جنرل گھیٹو کو بہلا رہی تھیں۔

اگلا سوال مجھ پر اتر رہا تھا کہ بیرا ایک پیتل کی طشتری میں ایک بوتل اور چار گلاس رکھے اندر آیا۔ بوتل میں مشروب کی رنگت سفید تھی۔ ہم مشروب پینے لگے۔ عجیب کڑوا اور ہیئر آئل کا سا ذائقہ تھا۔ سمجھا کہ زدمنگو کی سیون اَپ ایسی ہی ہوتی ہوگی۔ پیاس تو لگی تھی لیکن جوں جوں پیتا تشنہ کامی بڑھتی جاتی۔

"یہ کاکیشی واڈکا ہے،" جناب گھیٹو نے مجھ پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

یقین مانیے، پہلے اپنی اس معصومیتِ گناہ پر ذہن لڑکھڑایا، پھر اپنے آپ پر پیار آنے لگا اور دل چاہا کہ مادموزیل شنو کا گلا بو سے التجا کروں کہ جی بھر کے میری بلائیں لے لیجیے۔ پھر ندامت وخفت کے سیلاب نے شدت سے دبوچا کہ وضعداری کی ریت نبھانے کی خاطر چند ثانیے میں برسوں کی کمائی سے ہاتھ دھو لیے اور زندگی کے نازک آبگینے کو پاش پاش کر ڈالا۔ دلوں کے میکدوں سے شرابِ محبت اکثر پی تھی، مگر سچ مچ کی مے نوشی کا یہ پہلا موقع تھا۔

جنرل گھیٹو ایک گھونٹ مشروب کا خود پیتے اور پھر گلاس کے لبوں کو چیتے کے لبوں سے لگا دیتے۔ میں نے مشروب ختم کر کے سوال کے لیے پینترا بدلا۔ "امریکی اور روسی خلابازوں کے کارنامے تو آپ کی نظر سے گزرتے ہوں گے۔ خلائی پروگرام پر اپنی رائے سے مستفید کیجیے۔ کیا اپالو گیارہ چاند پر آدمی اتارنے میں کامیاب ہو جائے گا؟"

"امید علی صاحب، آپ نے بڑے بچے تلے اور گہرے سوالات پوچھے ہیں۔ آپ کی ذہانت

Scanned with CamScanner

وفطانت کا قائل ہونا پڑے گا۔ 'لندن ٹائمز' اور مصر کے 'الاہرام' کے اخباری نمائندے بھی مجھ سے انٹرویو لینے آئے لیکن یہ سوال ان کو بھی نہیں سوجھا... ایک اور گلاس مشروب کا لیجیے۔''

میں نے تھوڑا سا اور مشروب گلاس میں انڈیلا تاکہ اپنی سیاہ کاریوں اور گناہوں میں اتنا اضافہ کر لوں کہ رحمتِ خداوندی جوش میں آجائے۔ بوتل میں بچی کھچی شاہ فول چند کو بھی ترجمانی کے سلسلے میں حسنِ کارکردگی کے صلے میں دی۔

گھیٹو صاحب چیتے کی مونچھوں کو سہلاتے ہوئے کہنے لگے، ''بھائی امید علی صاحب، اپالو گیارہ کیا، اپالو چار سو بھی چاند پر آدمی نہیں پہنچا سکے گا۔ امریکہ اور روس دونوں وقت اور روپیہ مفت میں ضائع کر رہے ہیں۔ ہم اہلِ زومنگوان سے پہلے چاند پر پہنچ جائیں گے۔''

''زومنگو، وہ کیسے جناب گھیٹو؟''

گھیٹو کے چہرے کے نقش و نگار متانت اور سوچ میں ڈھل گئے۔ ''چشتی صاحب! اس وقت تین ممالک چاند پر خلائی انسان اتارنے کی دوڑ میں ہیں: روس، امریکہ اور زومنگو۔ آنکھیں مت پھاڑیے، میری بات غور سے سنیے۔ زومنگو روس اور امریکہ سے یقیناً گوے سبقت لے جائے گا۔ حال ہی میں میرے ایما پر عوامی پلازا کے پاس سائنس، خلا اور تحقیق نجوم و سیارگان کی ایک قومی اکادمی کا قیام عمل میں آیا ہے۔ میرا بھتیجا مکو کا نکالاسو، جو ایک ذہین نوجوان ہے، اس اکادمی کا ڈائریکٹر ہے۔ نکالاسو کو اس کام کے لیے غالباً سات لاکھ پچاس ہزار پاؤنڈ درکار ہیں۔ ہم نے امریکن فائرسٹون کمپنی اور بلیک بینز کافی کمپنی سے یہ رقم امدادی قرضے کے طور پر طلب کی۔ انھوں نے انکار کرتے ہوئے یہ عذر دیا کہ ان کے پاس اتنا روپیہ نہیں۔ میں نے خود اپنے دوست امریکی صدر رچرڈ نکسن کو خط لکھا کہ اگر زومنگو کی تعمیر و ترقی ان کے نزدیک کوئی وقعت رکھتی ہے تو ہمیں عالمی بینک سے قرضہ دلانے کا انتظام کریں۔ صدر رچرڈ نکسن کا تا حال کوئی جواب نہیں آیا۔ اب میں کوسیجن سے رابطہ پیدا کر رہا ہوں۔ چشتی صاحب، آپ تو سمجھتے ہوں گے، اس تامل کی اصل وجہ یہ ہے کہ روس اور امریکہ کو ہرگز گوارا نہیں کہ زومنگوان سے پہلے چاند پر پہنچے۔ بھلا وہ ہمیں کیوں قرضہ دینے لگے! لیکن جلد ہی بوسا والی ہیرے کی کان دریافت ہو جائے گی اور پھر ہمیں کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے کی حاجت نہ رہے گی۔ ان مالی مشکلات اور رکاوٹوں کے باوجود راکٹوں پر تحقیقاتی کام شروع ہو چکا ہے۔ ہم قدرتی طور پر اسے صیغۂ راز میں رکھ

رہے ہیں۔ آپ پہلے اخباری نمائندے ہیں جن کے سامنے یہ ذکر کر رہا ہوں۔"

میں ایک درویش کی طرح اپنی پشیمانی کا لہو واڈ کا کے ساتھ پیتا رہا۔ گلاس میں واڈ کا اپنے آخری دموں پر تھی۔ ذہن میں صفائی اور براقی پر اجمانے لگی۔ البتہ یہ احساس ہوا کہ ارد گرد کی اشیا قدرے دھندلی ہوتی جا رہی ہیں اور اپنی اپنی جگہ پر قائم نہیں۔

میں نے پوچھا، "گھیٹو صاحب، اس تحقیقی اکادمی کی کارکردگی کے بارے میں کچھ مزید بھی بتائیے۔"

گھیٹو اپنے مخصوص انداز میں مسکرائے اور قدرے جھک کر چپتے کے کان میں کہنے لگے، "امید علی صاحب، اس راز کو اپنے تک محدود رکھیے گا۔"

"جناب گھیٹو صاحب، انشاء اللہ یہ سربستہ راز قبر تک میرے سینے میں محفوظ رہے گا... ہاں، تو یہ فرمائیے کہ آپ نے اس تحقیقی کام کے لیے یورینیم اور دوسرا ساز و سامان کیونکر حاصل کیا؟"

"میرا بھتیجا نکالا سو شاہ فول چند اینڈ کمپنی کی کوششوں سے دس فاسفورس کی بوتلیں حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ میرے ایک جرمن دوست ہر کراشش نے اسے دو دوربینیں بھی فراہم کی ہیں۔ اگلے روز نکالا سو سے میری بات چیت ہوئی۔ وہ اس پروگرام کی کامیابی کے بارے میں بڑا پر امید ہے۔ خلابازوں کی تربیت بھی ساتھ ساتھ جاری ہے اور ان کی حوصلہ افزائی کے لیے امتحان بے وزنی میں پاس ہونے پر ایک پھول نما تمغہ ان کے کوٹ کے کالر میں ٹانک دیا جاتا ہے۔"

"جناب گھیٹو، یہ بے وزنی کا امتحان کیونکر لیتے ہیں؟ میرے وزن میں تمام کوششوں کے باوجود اضافہ ہو رہا ہے۔ ذاتی طور پر مجھے اس میں دلچسپی ہے۔"

"ان امتحانات میں تربیت پانے والے خلابازوں کو خاص مشقیں اور ورزشیں کرائی جاتی ہیں۔ مثلاً نیچے اوپر کودنا، سر کے بل کھڑا ہونا، اونچی سیڑھی سے فضا میں پھلانگ کر پرواز کی کوشش کرنا، اور فولادی سرپوش اوڑھے ہوئے ایک پٹرول کے پرانے پیپے میں ڈھلان سے لڑھکتے ہوئے آنا۔ نکالا سو کے چند گراؤنڈ عملے کے لوگ ہیں جو خلابازوں کو پٹرول کے پیپوں میں سے نکلنے میں مدد دیتے ہیں اور انھیں مصنوعی سانس دے کر ہوش میں لاتے ہیں۔ مسٹر چشتی، اگر آپ خلاباز بننا پسند کرتے ہیں تو میں نکالا سو کو ابھی فون پر کہے دیتا ہوں۔ ضرور کوئی نہ کوئی جگہ خالی ہوگی۔ بلا تکلف کہیے۔"

"مجھ کو معاف رکھیے۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں۔ مجھے اپنے وطن جا کر اپنے اخبار میں یہ انٹرویو

Scanned with CamScanner

چھاپتا ہے۔"

سوا چار بجنے والے تھے۔ پندرہ منٹ اور باقی تھے۔ بساطِ محفل کو سمیٹنے کا لمحہ آن پہنچا۔ میں نے موضوعِ گفتگو کو ایک نیا رخ دیا۔ "آپ صدارتی نظامِ حکومت کے حق میں ہیں یا پارلیمانی نظامِ حکومت کے حق میں؟"

"میں دونوں کے خلاف ہوں۔"

اس ایک جملے میں جنرل گھیٹو ایک طویل داستان کہہ گئے۔ دریا کو کوزے میں بند کرنے میں ان کی قابلیت دیکھ کر ششدر رہ گیا۔

"جناب گھیٹو، پریس کی آزادی کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ کیا زومنگو میں پریس آزاد ہے؟"

"زومنگو میں چار روزانہ اخبار نکلتے ہیں جن میں سے دو وزارتِ اطلاعات شائع کرتی ہے۔ فائرسٹون کمپنی اور بلیک بینز کافی کمپنی بھی اخبار چھاپتی ہیں۔ اپنے چھاپے خانے ہیں۔ خبریں ہم انھیں مہیا کرتے ہیں۔ پریس زومنگو میں بالکل آزاد ہے۔"

"شکریہ۔ اچھا یہ فرمائیے کہ چیتا آپ نے کیسے حاصل کیا اور کیونکر سدھایا؟"

"چشتی صاحب، یہ آپ نے قدرے ذاتی نوعیت کا سوال پوچھ لیا۔ بڑا نوکدار۔ احتیاط سے کام لیں ایسے سوالات پوچھتے وقت..."

"جناب گھیٹو، یہ تو آپ دفع الوقتی کرنے پر آ گئے۔ اچھا چھوڑیے۔ آپ کا سوانحی خاکہ نہیں مل سکا۔ کیا آپ سے آپ کی زندگی کے بارے میں پوچھ سکتا ہوں؟ فرانس کے مینڈیٹ کے ختم ہونے پر حکومت کی باگ ڈور آپ کے ہاتھ میں کیسے آئی؟"

"ضرور بتاؤں گا۔ یہ بڑا آسان سوال آپ نے پوچھا۔ سن پیدائش تو مجھے یاد نہیں لیکن سرکاری سن پیدائش میرے سیکرٹری کے پاس کہیں لکھا ہوگا۔ میرا والد مستا تو قبیلے کا وچ ڈاکٹر تھا۔ میں گھر سے بھاگ گیا اور ماسادا میں فرانسیسی فوج میں بھرتی ہو گیا۔ جب فرانسیسی یہاں سے چلے گئے تو اس وقت قومی فوج میں میں واحد سارجنٹ تھا۔ صدر ڈو۔ ہما نے مجھے فوراً ترقی دے کر قومی فوج کا سربراہ بنا دیا۔ میں یکلخت سارجنٹ گھیٹو سے جنرل گھیٹو بن گیا۔ جب صدر ڈو۔ ہما کو کسی نے گولی مار دی تو قومی اسمبلی کے ارکان

نے مجھ سے درخواست کی کہ آپ صدر بننا قبول کریں۔ آپ کے بغیر ملک تباہ ہو جائے گا۔"

ساڑھے چار میں ایک منٹ باقی تھا۔ میں نے لگے ہاتھوں ایک اور سوال پوچھ ڈالا۔

"کیا آپ کی رائے میں براعظم افریقہ کے ممالک کے سربراہوں کی چوٹی کانفرنس یہاں کے سیاسی اور اقتصادی مسائل کو سلجھانے میں ممد و معاون ثابت ہوگی؟"

"ہاں میں اس کے حق میں ہوں، بشرطیکہ یہ زومنگو میں ہو اور ہیل سلاسی کو اس میں شامل نہ کیا جائے۔"

زومنگو میں کیوں، جناب گھیٹو؟"

"چشتی صاحب! کانفرنس یہاں ہوئی تو قدرتی طور پر میں اس کا چیئرمین ہوں گا۔ مزید یہ کہ میں زومنگو سے باہر کہیں نہیں جانا چاہتا۔ آپ جانتے ہیں جب کانگو کا ماؤ سیشا قاہرہ ایسی ہی کانفرنس میں شمولیت کی خاطر گیا تو جمال عبدالناصر نے اسے کانفرنس کے دوران ایک محل میں اس کی خاتون سیکرٹری کے ساتھ محبوس و مقید رکھا، اور جب ڈاکٹر نکرومادنیا کے دورے پر گھانا سے باہر گئے تو ابھی وہ بمشکل دہلی پہنچے تھے کہ گھانا مخالفوں نے کُو (coup) کر دیا۔ میں زومنگو سے ایک ثانیے کے لیے بھی کسی بیرونی ملک میں نہیں جانا چاہتا۔"

"ایک درخواست اور ہے۔"

"فرمائیے۔"

"ابھی ملاقات کی تشنگی باقی ہے۔ بہت سے ضروری سوالات جو میں پوچھنا چاہتا تھا رہ گئے ہیں۔"

"مثلاً؟"

"مثلاً یہ کہ مسئلہ کشمیر میں آپ پاکستان کے موقف کی حمایت کرتے ہیں یا بھارت کے موقف کی؟"

"چشتی صاحب! میں بھول گیا، آپ پاکستان سے آئے ہیں یا بھارت سے؟"

"پاکستان سے، خاص لاہور سے۔"

"میں پاکستان کے موقف کی حمایت کرتا ہوں۔"

"میں آپ کی اہلیہ سے بھی ملنا چاہتا ہوں۔"

جنرل گھیٹو نے دیوار پر نپولین کو دیکھتے ہوئے کہا، "میں نے شادی نہیں کی۔"

Scanned with CamScanner

"جناب گھیلو، تو گویا میں اس سے یوں سمجھوں کہ آپ نے اپنی ذاتی امنگوں اور مسرتوں کو اپنے وطن عزیز کی خاطر قربان کر دیا؟ کتنا ایثار ہے آپ کا!"

"میں اسے ایثار نہیں سمجھتا۔ کئی ایک خواتین نے مجھے اس طرف لے جانے کے لیے دامِ تزویر بچھائے۔ لیکن امید علی صاحب، میں نہ پھنسا۔ میری پرانی رجمنٹ کا فرانسیسی کپتان ڈامرو تھا جس کی مجھ پر خاص نظرِ عنایت تھی۔ اس کا مقولہ تھا کہ عورت یوں تو ٹھیک ہے لیکن شادی کے چکر میں پڑنا سخت حماقت ہے۔ ہر ہٹلر کا نقطۂ نظر بھی اس معاملے میں یوں ہی تھا۔"

جنرل نے ایک جماہی لی۔ اپنی گھڑی کو دیکھا۔ میں نے عالمِ سرور میں پوچھا، "معاف کیجیے، ایک دو اشد ضروری سوالات تو رہ گئے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ کرنل ٹینڈا کی آپ سے مخالفت کے پیچھے کون سا جذبہ کارفرما ہے؟"

"حسد کا جذبہ۔ کیونکہ مجھے اس کرسی پر بیٹھے دیکھ کر اس کے سینے پر سانپ لوٹتے ہیں۔ میرا زومنگو کا صدر ہونا اسے بے حد کھٹکتا ہے، اور زیادہ جلن اسے اس بات کی ہے کہ بحیثیت صدر میں امریکن فائرسٹون کمپنی کے ڈائریکٹروں میں سے ایک ہوں۔"

اپنے حریف کرنل ٹینڈا کا ذکر کرتے ہوئے جنرل گھیلو کے لہجے میں خاصی تلخی آ گئی۔ ان کی تنگ پیشانی پر گہری سلوٹیں پڑ گئیں اور وہ مزید سمٹ گئی۔ گمان کیا کہ میرے سوال کا برا مانتے ہیں۔

میں نے جلدی سے بحرِ فکر میں غواصی کی اور ایک صدفِ سوال لیے اوپر اُبھرا۔ غالباً یہ مشروب کا اثر تھا کہ ذہنی قوتوں میں جولانی اور چستی آ گئی تھی۔ جنرل گھیلو سے انٹرویو ختم کرنے کو دل نہ چاہا۔

"آپ کو علم ہوگا کہ بیرونی پریس میں جو خبریں زومنگو کی چھپتی ہیں ان سے لامحالہ عام اخبار بین کا ذہن یہ تاثر قبول کرتا ہے کہ آپ کا ملک ایک عظیم خلفشار سے دوچار ہے۔ عوام میں مایوسی اور معاشی بے سکونی راہ پا رہی ہے اور وہ ایسا محسوس کرتے ہیں کہ سارا ملک ایک جیل خانہ ہے اور وہ اس میں بے بال و پر ہیں۔"

"مسٹر چشتی، زومنگو کے عوام بے وقوف ہیں۔ اپنا برا بھلا نہیں سمجھتے۔ کرنل ٹینڈا اور اس کی پارٹی ان کو گمراہ کر رہی ہے۔ 'لندن آبزور' اور 'ٹائمز' کے اخباری نمائندے ذاتی مخاصمت کی وجہ سے اس قسم کی بے پرکی رپورٹیں اپنے اخباروں کو بھجوا رہے ہیں۔ آپ دیکھیں، ہم ایک ترقیاتی دور میں سے گزر رہے

ہیں۔ فرانسیسی یہاں سے گئے تو ماسادا ایک معمولی گاؤں سا تھا۔ اب آپ یہاں کاروبار کی ریل پیل، پختہ سڑکیں، کیفے اور عالیشان عمارتیں دیکھ رہے ہیں۔ ہم نے حال ہی میں ایک نئے گیس چیمبرز کی عمارت تعمیر کی ہے۔ جس میں بیک وقت ایک منٹ میں تین سو مجرموں کو گیس سے ہلاک کیا جا سکتا ہے۔ فائرسٹون کمپنی کے مینیجنگ ڈائریکٹر نے مجھے بتایا کہ فن تعمیر میں سارے براعظم افریقہ میں کوئی عمارت اس سے ٹکر نہیں لے سکتی۔ صرف ماسادا ہی میں چار ہزار امریکن کاریں ہیں۔ اگر پھر بھی عوام کے دلوں میں ناخوشی اور بے اطمینانی ہے تو ان کی مرضی۔ اس ملک میں فری انٹرپرائز کی بدولت کئی لوگ اور سول سروس کے اہل کار دولتمند ہو گئے۔ جو اپنی کم ہمتی کی وجہ سے دولت کمانے میں کامیاب نہیں ہوئے وہ دوسروں سے جلنے اور کڑھنے لگے۔ میرے وزیر اقتصادیات و معدنیات نے اپنی تجزیاتی رپورٹ میں اس تفاوت کو اس بے سکونی کا سبب قرار دیا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ عوام خود ہمت کریں اور سرمایہ پیدا کریں۔ میری حکومت ان کی راہ میں حائل نہیں ہوگی۔"

میں ایک اور چبھتا ہوا سوال پوچھنے کے لیے اپنے ہونٹوں کو زبان سے گیلا کر رہا تھا کہ کمرے کے باہر کچھ شور وغل سنائی دیا۔ پھر فائروں کی دھائیں دھائیں شروع ہو گئی۔ جنرل گھیٹو فوراً اٹھے اور اپنے پستول کو نکال کر اس طرف بڑھے۔ اسی اثنا میں دروازہ کھلا اور ایک گرجتی ہوئی آواز آئی، "ہاتھ اوپر کرو۔" ہم نے ہاتھ اوپر اٹھا لیے۔

یہ کرنل ٹینڈا کی گوریلا افواج کے افسر تھے۔ جس وقت جنرل گھیٹو کا انٹرویو ہو رہا تھا، گوریلے دارالسلطنت پر ٹوٹ پڑے اور آدھ گھنٹے کی خونریز جنگ کے بعد ماسادا پر قابض ہو گئے۔ وہ جنرل گھیٹو کو گرفتار کر کے لے گئے۔ ہمیں انھوں نے توجہ کے قابل نہ سمجھا۔ میرا انٹرویو مکمل ہو چکا تھا۔

دوسرے دن شاہ فول چند نے مجھے ایک پھلوں کے ٹرک میں ہومنگو پہنچانے کا انتظام کر دیا۔ ہومنگو تو میں پہنچ گیا لیکن دوما دوس اور پاپا سکندروس کا طیارہ موجود نہ تھا۔ تین مہینے تک طیارے کا انتظار کیا، اور جب وہ نہ آیا تو پیدل ہی ادیس ابابا کی طرف رواں دواں ہو گیا۔ میں ابھی تک ادیس ابابا ہی کی طرف رواں دواں ہوں۔

(فنون، لاہور، نومبر دسمبر ۱۹۶۹ء)

Scanned with CamScanner

موم اور شہد

پبلشر کا نوٹ: ”جہنم“، ”فرار“، ”بھوک“، ”اتنی وسعت، اتنی تنگی“ کے شہرۂ آفاق مصنف منصور اللہ کا (غالباً) یہ آخری ناول ہے۔ یہ ناول لکھنے کے بعد منصور اللہ صاحب دنیائے ادب سے فرار کر گئے اور کوئی نہیں جانتا کہ ان کا کیا بنا۔ ان کی بعد کی کارکردگیوں کے بارے میں مختلف کہانیاں مشہور ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ امریکہ چلے گئے تھے اور اب نیویارک کے ہوٹل والڈراف سٹور میں نائب خانساماں ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ وہ زنجبار یونیورسٹی میں جنسیات کے پروفیسر ایمیریٹس ہیں — یا آخری اطلاعات آنے تک تھے۔ یہ یقینی ہے کہ اپنے اس آخری شاہکار ”موم اور شہد“ کے بعد منصور اللہ صاحب نے ایک سطر تک نہیں لکھی۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتے تھے انھوں نے اپنے ناولوں میں بے کم و کاست کہہ ڈالا اور اس کے بعد چاپ سادھ لینے میں عافیت سمجھی۔ منصور اللہ صاحب کا یہ شاہکار حسبِ معمول ایک ایسے ادھیڑ عمر شخص کی کہانی ہے جو شومیِ قسمت سے ایک بار بسلسلۂ تعلیم و عشق انگلستان اور یورپ ہو آیا ہے اور وطن لوٹ آنے پر بھی اس کا دل و دماغ پکاڈلی سرکس اور شانزالیزے کی بہاروں میں اٹکا ہے۔ بیشتر نوجوانوں اور ادھیڑ عمر کے لوگوں کی طرح اس کا دل بھی حسن و عشق کے معاملے میں موم تھا۔ وہ بڑھیا قسم کے شہد کا بھی بے حد شوقین تھا جس کی انگلستان میں فراوانی تھی اور جسے وہ ٹنوں کے حساب سے کھاتا رہا۔ وطن آ کر اس نے یہ عادت ترک کر دی کیونکہ دیسی شہد ناخالص اور گھٹیا کوالٹی کا تھا۔ منصور اللہ صاحب نے اسی رعایت سے ناول کا نام ”موم اور شہد“ چنا ہے۔ اس ناول میں انھوں نے موم اور شہد کی روشنی میں کمال چابکدستی سے جنسی اور نفسیاتی الجھنوں کو سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ وہ فی الواقع نقاشِ جنس ہیں۔

اس بلند پایہ ناول کی اشاعت نے اردو ادب میں بھونچال کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ اب کون کہہ سکتا ہے کہ ہمارا ادب عظیم ناولوں سے تہی دامن ہے؟

ان قارئین کے استفادے کے لیے جو منصور اللہ صاحب کے فن اور تخلیقی کام سے پہلی بار روشناس ہو رہے ہیں، مصنف نے ہماری فرمائش پر اس خاص مجلّد ایڈیشن میں بعض مقامات پر تشریحی حاشیے بڑھائے ہیں جن سے ان کے فن کی خوبیاں دو چند اُجاگر ہو جاتی ہیں... مزید ہم کیا کہہ سکتے ہیں؟

Scanned with CamScanner

موم اور شہد

از منصور اللہ

نقشِ اوّلیں

پانچواں باب: مانٹی کارلو

(آپ ناول کو پانچویں باب سے شروع کر سکتے ہیں۔ سب باب ایک سے ہیں۔)

مانٹی کارلو، بھینسوں کے جوہڑ کے کنارے بیک وقت نشیب و فراز میں ہونے کی وجہ سے، کچھ نمایاں اور کچھ ڈھکا چھپا دکھائی دے رہا تھا۔ طبل یار جنگ بہادر نے اس بنگلے کا عجیب و غریب رومانٹک نام مانٹی کارلو غالباً اس لیے رکھا تھا کہ انھوں نے اصل مانٹی کارلو میں ایک رات میں رولٹ کی میز پر دو سو پونڈ ہارے تھے اور دھوکا دہی کے الزام میں رات کا بقیہ حصہ وہاں کی جیل میں بسر کیا تھا۔ طبل یار جنگ کو فرانسیسی ادب، فرانسیسی شمپین اور فرانسیسی عورتوں سے بے پناہ محبت تھی۔ یہ محبت اس امر کی متقضی تھی کہ اسے بنگلے کی شکل میں منتقل کر دیا جائے۔ پھر ان کی اپنی ہونے والی بیوی مادام ہارپو سے پہلی ملاقات بھی مانٹی کارلو ہی کے کیسینو میں ہوئی تھی۔

لیکن طبل یار جنگ کو محض فرانسیسی عورتوں اور فرانسیسی شمپین ہی سے اُنس نہ تھا، وہ دنیا کی ہر چیز کے دلدادہ تھے۔ ان کے بنگلے مانٹی کارلو کے ساٹھ کمرے (غسل خانے اور باورچی خانے الگ) مختلف النوع اسالیب تمدن سے آراستہ و پیراستہ تھے۔ ایک کمرے میں فراعین مصر اور ان کی زوجگان کے حنوط شدہ اجسام شیشے کے ڈھکنے والے صندوقوں میں محوِ خواب تھے۔ دوسرے میں جنوبی امریکہ اور افریقہ کے زہریلے سانپوں کی مختلف اقسام اسپرٹ بھری بوتلوں میں رکھی تھیں۔ تیسرے میں سندر بن اور دوسرے خطوں کے آدم خوروں کے بھس بھرے سر دیواروں میں ٹنگے تھے۔ علیٰ ہٰذ القیاس۔ ایک کمرہ ایسا تھا جس میں یونانی اور فرانسیسی مصوروں کی نیوڈسٹ پینٹنگز بے ترتیبی سے بھری پڑی تھیں۔ طبل یار جنگ اپنا بیشتر وقت اسی کمرے میں گزارتے تھے۔ غرض مانٹی کارلو بنگلہ کیا تھا، ایک پورا بین الاقوامی عجائب گھر تھا۔

ویسے طبل یار جنگ ایک عظیم مصنف، فلسفی اور شاعر تھے۔ موسیقی کے بھی رسیا تھے اور خود بھی طبلہ

Scanned with CamScanner

اتنا اچھا بجاتے تھے کہ اکثر شادی بیاہ کی ناچ رنگ کی محفلوں میں مدعو کیے جاتے۔ اس مہارت نے ہی ان کو بارگاہِ سرکار سے طبل یار جنگ کا خطاب دلوایا۔

انھوں نے جو شادی مانٹی کارلو میں کی تھی اور جس میں بقول ان کے پرنس آف موناکو ان کا بیسٹ مین بنا، وہ خاتون ان کے ہمراہ دکن میں آئیں ضرور لیکن آب و ہوا کو ناموافق پاتے ہوئے تین چار سال بعد طلاق لے کر موناکو واپس چلی گئیں۔ اس خاتون مادام ہارپو سے ان کی ایک ہی لڑکی تھی — جون زبیدہ۔

اس وقت محمد بوٹا (طبل یار جنگ کا اصل نام محمد بوٹا تھا) اپنے عریاں تصویروں والے کمرے میں بیٹھا کام میں مصروف تھا۔ وہ نیوڈوں کو مسلسل ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا تھا۔ اس شغف کے باوجود اسے محسوس ہوا کہ دن کچھ زیادہ ڈھلتا جا رہا ہے۔ کمرے میں گہری شام کا جھٹپٹا چھانے لگا اور عریاں تصویریں کافی دھندلی پڑنے لگیں۔ پھر بھی وہ انھیں دیکھتا رہا — یکسوئی سے، لگن سے، چاہت سے۔ انھی صفات سے آرٹسٹ دوسرے عام لوگوں سے الگ پہچانا جاتا ہے۔ کام کے وقت خود فراموشی اکثر بڑے آدمیوں کی طبیعت کا خاصہ ہوتی ہے۔ دروازے کے ساتھ ہی بجلی کا سوئچ تھا مگر اس کی طرف اس کا خیال تک نہ گیا۔

آخر محمد بوٹا تصویریں دیکھتا دیکھتا تھک گیا۔ اس نے چشمہ اتار کر میز پر رکھ دیا اور آرام کرسی کے بازوؤں پر ٹانگیں پسار لیں۔ اسے دماغی محنت کا جنون تھا، یونانی علم الاصنام سے وارفتگی کی حد تک عشق، مصوری، خصوصاً عریاں مصوری سے پیار۔ اس لیے نہیں کہ ان تصویروں میں برہنگی اور جنسیت کو ابھارا جاتا تھا — بالکل نہیں۔ وہ اب اس عمر سے گزر چکا تھا۔ معاً اس نے محسوس کیا کہ وہ اب پچاس پچپن کے پیٹے میں ہے، کہ پانی سر سے گزر چکا ہے۔

وہ سوچنے لگا، آخر اس کی فنونِ لطیفہ سے محبت اور دماغی جفاکشی کا اسے کیا صلہ ملا؟ ماسوا اس کے کہ سرکار سے طبل یار جنگ کا خطاب مرحمت ہوا اور اس کے صدقے سے چار سو روپے ماہوار کی پنشن بندھ گئی، اسے کچھ بھی تو حاصل نہ ہوا — اور وہ خطاب بھی اس کو طبلچی ہونے کی بدولت ملا۔

پھر اس نے سوچا، نہیں نہیں۔ اس جیسے، محمد بوٹے کے سے لوگ ہی اس زمین کا نمک ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن میں قدرت نے براہِ راست غور و فکر کی قوت ودیعت کی تھی، جن کے حرفِ الہام نے معاشی سماجی، تصوراتی، جمالیاتی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا تھا۔ مگر جب لوگ گوئٹے، مائیکل انجلو،

Scanned with CamScanner

بیتھوون وغیرہ تک کو بھول گئے تو کیا وہ حیدرآباد کے طبل یار جنگ کو یاد رکھیں گے؟ اس کی شہرت و انفرادیت کا کل سرمایہ اس کا بنگلہ مانٹی کارلو تھا یا پھر اس کے ضخیم ناول تھے جن میں اس نے نفسیاتی، جنسی اور معاشی مسائل کا صاف اور دوٹوک حل پیش کر دیا تھا۔ اس کے تجربات یورپ کے رسائل میں بھی چھپے۔ اس نے — محمد بوٹا نے — اردو ناول کو دنیا کے عظیم ناولوں کے ہم پلّہ لا کھڑا کر دیا تھا۔ پھر بھی ایک زمانہ آئے گا کہ دنیا محمد بوٹا کو بھول جائے گی۔ اس نے اپنے آپ سے کہا، محمد بوٹا! تم اپنا وقت ضائع کرتے رہے۔ عمرِ عزیز رائیگاں گزار دی۔ طبل یار جنگ نے ایک آہ بھری جو ایک ڈکار کی صورت اختیار کر گئی۔ دوپہر کا کھانا، جو اس نے اپنے دوست فتیلہ یار جنگ کے ہاں تناول کیا تھا، ابھی تک پیٹ پر گراں بیٹھا تھا۔ دماغی محنت اور ورزش کی کمی کا یہ خمیازہ سب عظیم لوگ بھگتتے ہیں۔ طبل یار جنگ سوچتا رہا۔ چند سالوں میں بال جھڑ گئے، بچے کھچے برف کی طرح سفید ہو گئے۔ منہ میں دانت ضرور باقی ہیں مگر ہلنے لگے ہیں... وہ سو گیا۔

محمد بوٹا اب پہلے کی نسبت لحیم وفربہ ہو گیا تھا۔ اصل ٹھوڑی کے نیچے ایک اور ٹھوڑی طلوع ہو رہی تھی۔ جوانی میں بھی اسے خوش شکل تو نہیں کہہ سکتے تھے، البتہ اب اس فربہی اور گنج پنے نے ایک قسم کی تمکنت سی اسے دے دی تھی۔ وہ اب آرام کرسی پر سارا دن ٹانگیں پسارے پڑا رہتا۔ چوتھے پانچویں روز جا کر حجامت بنواتا۔ دماغی محنت سے اسے فرصت نہیں ملتی تھی۔ وہ آج کل ایک نیا ناول لکھ رہا تھا— یا سوچ رہا تھا۔ عریاں تصویریں دیکھنے سے اس کے تخیل کی مشین تیزی سے کام کرنے لگتی تھی۔

آخر وہ آرام کرسی سے اٹھا۔ سامنے جوہڑ کے اُس پار میر عجب علی عجیب یار جنگ بہادر کا مکان درختوں اور کھجوروں میں بالکل چھپا ہوا نظر آ رہا تھا۔ چھوٹا سا، مصری طرز پر بنا ہوا خوبصورت بنگلہ کسی بڑے پرندے، غالباً سندباد جہازی والے رُخ، کا ایک خوبصورت آشیانہ معلوم ہوتا تھا۔ محمد بوٹا کے دل میں کوئی خیال آیا۔ غالباً اس کا تعلق عجیب یار جنگ کی پرندے سے مشابہت سے تھا۔ اس خیال سے ایک محزوں سی مسکراہٹ اس کے ملگجی ہونٹوں کے درمیان رقص کرنے لگی۔ یہ پچھلے چودہ پندرہ سال کے عرصے میں طبل یار جنگ کی پہلی مسکراہٹ تھی۔

محمد بوٹا دیکھ رہا تھا کہ ہر شے روز بروز بڑھتی جا رہی تھی یا گھٹتی جا رہی تھی۔ جو چیزیں اس کی ہم عمر تھیں وہ ضعیف اور تنزل پذیر ہوتی جا رہی تھیں۔ ہاں جوہڑ ابھی تک اسی جگہ پر قائم تھا۔ یہ پہلے جتنا ہی

Scanned with CamScanner

لمبا، چوڑا اور گہرا تھا۔ اس کا مکان مانٹی کارلو بھی نہیں بڑھا تھا۔ بعض دوسری چیزیں بڑھ رہی تھیں۔ مثلاً جوہڑ کے کنارے اگے ہوے درخت پچھلے سالوں سے بڑے ہو گئے تھے... اور اسی طرح اس کی دوسری بیوی قمر جہاں بھی بڑی ہو رہی تھی۔ اس نے پھر سے آہ بھری اور پھر سے یہ ایک زور کی ڈکار بن کر نکلی۔

وہ پھر آرام کرسی میں لیٹ گیا۔ سامنے باغ میں گل مہر کا ایک درخت تھا، بالکل لبِ جو (یعنی جوہڑ کے کنارے اور گل مہر کا درخت اصل میں ایک شرین تھا)۔ محمد بوٹا گل مہر کو دیکھنے لگا۔ اس باغ سے پہلے بھی یہ درخت یہاں موجود تھا، کیونکہ وہ اپنی اونچائی میں باغ کے کل درختوں سے قد آور تھا۔ کتنا دلچسپ خیال تھا یہ! درخت باریک ریشمی گچھوں سے لدا پھندا تھا۔ نیچے پتوں کا فرش بچھا تھا۔ اگلے سال یہ درخت اور بھی بڑا ہو جائے گا۔

اس کی بیوی تو بیوی، اس کی بیٹی جون زبیدہ بھی بڑی ہو رہی تھی۔ جون زبیدہ کا تصور آتے ہی سامنے کا جوہڑ (یعنی جو)، گل مہر کا درخت اور عجیب یار جنگ کا آشیانہ فضا میں گم ہو گیا۔ جیسے یہ چیزیں وہاں تھیں ہی نہیں۔ وہ ان کو دیکھ تو سکتا تھا مگر غیر محسوس طور پر۔ اس کا ذہن ان مادی اشیا کو نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس پر اس کی بیٹی جون زبیدہ ساری و طاری تھی۔

جون زبیدہ کی عمر اب سولہ سال کی تھی مگر اپنے باپ محمد بوٹا کی نگاہ میں وہ ابھی تین چار سال کی بچی ہی تھی۔ محمد بوٹا کے خیال میں اس کی جون زبیدہ بڑی ہو کر بھی عام لڑکیوں سے مختلف لڑکی ہوگی جو ہمیشہ معصوم بچپن کی پُر شفقت گود میں لوری لیتی رہے گی، اور جسے جوانی دیوانی کبھی بھی بے کل نہ کرے گی۔ محمد بوٹا کی طرح ہر ایک باپ کے دل میں اپنی لڑکی کا یہی تصور ہوتا ہے اور اس کی آنکھ اس وقت کھلتی ہے جب صاحبزادی موٹر ڈرائیور یا خانسامے کے ساتھ بھاگ کھڑی ہوتی ہے۔

اتنے ناول لکھ چکنے کے بعد محمد بوٹا کو لوگوں کی نفسیاتی اور جنسیاتی کیفیات بھانپنے کی کافی مشق ہو جانی چاہیے تھی مگر اس کی اپنی بیٹی جون زبیدہ اس کے لیے بند کتاب تھی۔ اس نے سوچا، جون زبیدہ کے دل میں کیا خیالات، کیا احساسات موجزن رہتے ہوں گے؟ کیا یہ کسی طور ممکن تھا کہ جون زبیدہ کے قدرتی احساسات ابھی نہ جاگے ہوں؟ اسے یاد آیا کہ اس کے اپنے قدرتی جذبات تو اسی وقت جاگ اٹھے تھے جب وہ بارہ سالہ لڑکا تھا اور وہ پڑوس کی لڑکیوں سے عشق کی پیچیں لڑاتا تھا، اور جون زبیدہ کی ماں مادموزیل ہارپو تو سولہ سال کی عمر میں، جب وہ اسے مانٹی کارلو میں ملا تھا، ایک گرم دہکتا ہوا شعلہ

جوالہ تھی، محبت اور عشق کے سب رموز اور ساری جمناسٹک پر مہارت کی حد تک حاوی۔

تو کیا یہ ممکن تھا کہ جون زبیدہ کے دل میں کسی نوجوان کی آغوش میں جانے کی خواہش نے انگڑائی نہ لی ہو؟ کیا یہ ممکن تھا کہ جون زبیدہ پر اس کے کمرے کی برہنہ عشقیہ تصویروں، بائرن کی نظموں اور ڈی ایچ لارنس کے ناولوں کا اثر نہ ہوا ہو؟ کیا یہ ممکن تھا کہ اپنے باپ کے جنسیاتی اور نفسیاتی رومان پرور ناول پڑھنے کے بعد بھی جون زبیدہ کا جنسی شعور ابھی جوان نہ ہو سکا ہو؟ اگر ایسا ہی ہے تو کیا جون زبیدہ میں کوئی جسمانی یا طبیعیاتی کمی نہ تھی؟ محمد بوٹا کی بیٹی ہو کر اس میں یہ کمی ہونی تو نہیں چاہیے۔ پھر بھی، کیا کہا جا سکتا ہے۔

اسے محسوس ہوا کہ اس نے اپنی زندگی میں تین بڑی غلطیاں کی ہیں جن کا خمیازہ اسے اب بھگتنا پڑ رہا تھا۔ پہلی غلطی تو اس کی شادی تھی، وہ بھی ایک فرانسیسی عورت سے۔ دوسری غلطی جو اس سے سرزد ہوئی وہ جون زبیدہ کی پیدائش تھی — پہلی غلطی کا لازمی نتیجہ۔ تیسری اور سب سے ناقابل تلافی غلطی اس کی پُر شقاوت، کم سن قمر جہاں سے شادی تھی جو اب تیزی سے بڑی ہو رہی تھی۔ محمد بوٹا نے گھنٹی بجائی اور بٹلر سے کڑک کر کہا، "دیکھتے نہیں، نو بج گئے۔ ابھی تک تم وسکی اور سوڈا نہیں لائے۔"

اور جون زبیدہ!

جون زبیدہ پائیں باغ میں ایک آرام کرسی پر نیم دراز تھی۔ جس طرح اس کا نام مغربی اور مشرقی ناموں کا مرکب تھا، جون زبیدہ میں اسی طرح دو مختلف اور متضاد تمدن — ایک مغربی، دوسرا مشرقی — باہم دست و گریباں رہتے تھے۔ وہ ابھی ابھی باتھ روم سے ہو کر آئی تھی۔ اس کے سنہری بال بھیگے ہوئے تھے اور ایک لٹ اس کے مرمریں شانے سے ہوتی ہوئی، دوسرے مرمریں شانے کا بوسہ لے رہی تھی۔ عام طور پر ایسا نہیں ہوتا، مگر جون زبیدہ ایک غیر معمولی لڑکی تھی۔ اس کے ہونٹ بالکل خشک تھے۔ اس نے انہیں تولیے سے خوب رگڑ رگڑ کر پونچھا تھا۔ فراخ تابناک پیشانی کے نیچے جون کی نرگسی آنکھیں گویا عمیق سوچ میں ڈوبی تھیں، گو پلکوں کی متواتر لرزش اس سوچ میں مزاحم ہو رہی تھی۔ چہرے کا رنگ صاف گورا اور نکھرا ہوا تھا، جیسا کہ فرانسیسی نژاد لوگوں کا ہوتا ہے، اور اس کی سیاہ زلفیں ہوا میں کالے ناگوں کی طرح لہرا رہی تھیں۔

جون زبیدہ سامنے نواب عجیب یار جنگ کے آشیانے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ آشیانہ درختوں

Scanned with CamScanner

کے جھنڈ میں چھپا ہوا تھا مگر جون کی تیز عقابی آنکھیں اسے جھنڈ میں سے بھی دیکھ سکتی تھیں۔ اس آشیانے میں اس کا فرقت حسین رہتا تھا۔ فرقت حسین نواب عجیب یار جنگ کا اکلوتا بیٹا تھا اور چند دنوں میں موم تراشی کا فن سیکھنے کے لیے بوڈاپسٹ جانے والا تھا۔ فرقت کے مکان سے جون زبیدہ نے ہوا کے ایک جھونکے کو روانہ ہوتے دیکھا۔ وہ جھونکا گل مہر (یعنی شرین) کے درخت سے چھیڑ خانی کرتا ہوا جوہڑ (یعنی جو) پر رقص کناں ہوا۔ اس کے بعد اس نے سیدھے جون زبیدہ کا رخ کیا اور چند ہی منٹ میں اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ جون زبیدہ کو جھرجھری آئی۔ اسے ایسا لگا جیسے یہ جھونکا ہی خود فرقت حسین ہو۔ ایک سرد کرنے والی پر حدت کیفیت اس نے محسوس کی اور اس کے عنبریں سینے پر ہوئی سرسراہٹ کی وجہ سے ہلکا سا تموج پیدا ہو گیا۔ سینے کے اُبھار اور زیادہ واضح ہو گئے۔ ایسے اُبھار بالعموم خوابوں میں دیکھے جاتے ہیں۔

ساری عمر اپنے باپ محمد بوٹا کی صحبت میں رہنے کی وجہ سے جون زبیدہ کی فطری نسوانیت ایک مردانہ بے پروائی میں بدل چکی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی ہلکی مونچھوں کی روئیدگی کا اشارہ تھا۔

جون زبیدہ کو اپنے باپ کے سوا کسی مرد سے مل کر خاص مسرت نہ ہوتی۔ فرقت حسین بھی اسے کوئی خاص اچھا نہ لگتا تھا، حالانکہ وہ جانتی تھی کہ اس کے والد اور فرقت حسین کے والد کے بیچ ان دونوں کی شادی کی بات چیت چل رہی ہے۔ آخر وہ کیوں ان جذبات سے بے نیاز ہے؟ شاید اس لیے کہ اس کا خمیر مشرقی و مغربی دو متضاد عناصر میں گوندھا گیا تھا۔ وہ نہ مشرقی تھی نہ مغربی۔ وہ کچھ بھی نہ تھی۔ اس کی یہی بے نیازی اس کے ادھیڑ عمر کے باپ کے دل کا روگ بن کر اسے (محمد بوٹا کو) آہستہ آہستہ کھائے جا رہی تھی۔ طبل یار جنگ کی فربہی، اس کی مستقل کھوں کھوں، اس کی ذیابیطس، اس کا دل کا عارضہ —— ان سب کی وجہ دراصل یہ تھی کہ جون زبیدہ کا جنسی شعور بیدار ہونے کا نام نہیں لیتا تھا، ورنہ سولہ سال کے سن میں کون لڑکی ہے جس کے سینے میں ارمان نہیں مچلنے لگتے۔

جوہڑ کے پاس سے پھٹ پھٹ کی آواز آئی۔ فرقت حسین نے اپنی چھوٹی کھلونا سی چھ ہارس پاور کی فیاٹ موٹر کار کو بریک لگا کر جون زبیدہ سے پوچھا، ''جون! آج میرے ہمراہ فردوس میں کابرا دیکھنے چلوگی؟''

جون زبیدہ نے اپنی سنہری لٹ کو ہونٹوں میں چباتے ہوئے کہا، ''تمھارا مطلب ہے کیبرے؟

کابروں سے میں ڈرتی ہوں۔ ویسے فرقت، میں تو آج شام ابا حضور کے ساتھ مولانا خیر الدین بریانی کا میلاد سننے جا رہی ہوں۔"

فرقت حسین نے چھوٹی فیاٹ کو اسٹارٹ کیا۔ اس کی موٹر پھٹپھٹاتی ہوئی سیدھی جھنڈ اور آشیانے کی سمت چلی گئی۔ فرقت جوہڑ کے راستے سے نہیں گیا بلکہ اس نے سیمنٹ کی بنی ہوئی نئی سڑک کا راستہ اختیار کیا جسے حال ہی میں محکمہ آرائش بلدیہ نے عجیب یار جنگ بہادر کے آشیانے کو طبل یار جنگ بہادر کے مانٹی کارلو سے ملانے کی غرض سے تیار کیا تھا۔

طبل یار جنگ نے وہسکی کا پیگ چڑھاتے ہوئے دریچے میں سے یہ منظر دیکھا تو اس کے دل میں بے چین اطمینان، ایک تلاطم خیز سکون موجیں مارنے لگا۔ اسے فرقت حسین سے نفرت تھی۔ اسے فیاٹ کمپنی کی موٹر کاریں ناپسند تھیں۔ لیکن آخر کب تک اس کی بیٹی جون زبیدہ فطری جذبات سے بے نیاز رہے گی؟ کیا وہ کبھی کسی کی بیوی نہیں بنے گی؟ کیا وہ کبھی پوتا نواسا نہیں کھلائے گا؟

ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی میں جوہڑ کا پانی ملگجا ہو رہا تھا، گویا آفتاب ریزہ ریزہ ہو کر پانی کی موجوں کے ساتھ تحلیل ہوتا جا رہا ہو۔ آخر تحلیل ہو گیا۔

آٹھواں باب: آغوشِ رنگیں

(پانچویں باب کے بعد بیچ کے ابواب پھاند جانے سے فرق نہیں پڑتا۔)

پانچ سال جھپاک سے گزر گئے۔

یہ ستمبر کے مہینے کی ایک گرم تاریک رات تھی۔

جون زبیدہ کی طبیعت قدرے مکدر تھی۔ آسمان پر چاند نہیں نکلا تھا مگر تارے چھٹکے ہوئے تھے اور فضا منور تھی۔ کہیں ابر کے ہلکے سے ٹکڑے کا پتا نہ تھا۔

باغ کے درخت ہیبت ناک لگ رہے تھے۔ لبِ جو گل مہر کا درخت (یا جوہڑ کے کنارے شرین) تو الہ دین کے چراغ والا جن معلوم ہوتا تھا۔ جون زبیدہ کے دل و دماغ پر گل مہر کا شدید اثر پڑ رہا تھا مگر وہ برابر ٹہلے جا رہی تھی۔ اگر اس کی جگہ کوئی خالص مشرقی لڑکی ہوتی تو وہ ان درختوں میں اکیلے

Scanned with CamScanner

پھرنے پر ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر کسی رومانی ناول میں گم ہو جانے کو ترجیح دیتی، لیکن جون زبیدہ میں مشرقی باپ اور مغربی ماں کے خونوں کی والہانہ آمیزش نے آہوئے شوخ کا مزاج پیدا کر دیا تھا۔

ابر کے ہلکے سے ٹکڑے سے چودھویں کا چاند اس کے ساتھ آنکھ مچولی کرنے لگا۔ کبھی بادل کی اوٹ ہٹا کر نکل آتا، کبھی چھپ جاتا۔ سیمنٹ کی سڑک پر گہرا سکوت تھا۔ صرف فرقت حسین کی فیاٹ موٹر کار کا ہارن مسلسل پوں پوں کر رہا تھا۔

جون زبیدہ اپنے باپ کو زرد ساٹن کا ایک ہیولا سا معلوم ہوئی، گویا وہ اپنی ذات سے علیحدہ کوئی غیر مرئی سی چیز ہے۔ جون زبیدہ چھ سات فٹ کے فاصلے سے اپنے ہیولے کو دیکھنے لگی۔

اسے اختلاجِ قلب سا ہونے لگا۔ گل مہر کے درخت کے ساتھ دوسرے درخت بھی الف لیلوی جنات میں تبدیل ہو گئے۔ اس کے سیاہ بال ہوا میں اڑنے لگے اور اسے ہوا پر سخت غصہ آیا۔ ادھر فرقت حسین کی موٹر کار کی پوں پوں مستقل جاری تھی۔ غالباً ہارن بجانے والی بجلی کے تار کا کنکشن غلط ہو گیا ہوگا۔ جون زبیدہ اپنے والد کے کمرے میں چلی آئی۔

محمد بوٹا اپنے کام میں مستغرق تھا۔ وہ برابر اپنے کام میں مستغرق رہتا۔ جب محمد بوٹا کوئی کام نہ بھی کر رہا ہوتا تو مستغرق رہتا (اس کو فنکارانہ مزاج کہتے ہیں)۔ اسی لیے تو جون کو اپنے والد سے بے پناہ محبت تھی۔

پانچ سال پہلے جس شدت سے وہ اپنے باپ کو چاہتی تھی، اب وہ شدت دو چند ہو گئی تھی۔ محمد بوٹا اس وقت میز پر بیٹھا اپنا ناول ''جہنم کے بعد'' کا دسواں باب لکھنے میں مصروف تھا۔ میز پر جوئس، ڈی ایچ لارنس اور سارتر کے ناول دھرے تھے اور وہ دو تین سطور لکھ چکنے کے بعد ان میں سے کسی ایک کو اٹھاتا اور اس میں مستغرق ہو جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے ناولوں میں ایک ساتھ وہ سب کیفیات جمع ہو جاتی تھیں جو ان مغربی مصنفین میں منفرد ہیں۔ اسی لیے وہ لوگ جو بیک وقت جوئس، لارنس اور سارتر کے اسلوب و موضوع سے حظ اٹھانا چاہتے، طبل یار جنگ کے ناول پڑھتے۔ جون زبیدہ نے سوچا، میرا باپ کتنی عظیم شخصیت ہے۔

ٹیبل فین میز پر چل رہا تھا۔ محمد بوٹا کے بال پنکھے کی ہوا میں تارِ عنکبوت کی مانند ہل رہے تھے۔ ایک جمی ہوئی، ساکت سی نگاہ اس کی آنکھوں میں تھی۔ جون زبیدہ فوراً بھانپ گئی کہ اس کا عظیم باپ پھر

Scanned with CamScanner

اپنا غم غلط کرنے کی خاطر وسکی چڑھاتا رہا ہے۔ وہ اپنے باپ کی کرسی کی پشت کو تھام کر جھکی، ''ڈیڈی!'' اس نے کہا، ''آپ پھر وسکی پیتے رہے ہیں! آپ جانتے ہیں کہ ڈاکٹر نے آپ کو ڈرنک سے منع کر رکھا ہے۔''

محمد بوٹا نے کمزور آواز میں کہا، ''بیٹی جون زبیدہ!''

اس کے باپ کے چہرے پر ایک مغموم اور مظلوم عظمت تھی۔ محمد بوٹا کی پلکوں پر ایک سفید آنسو تھرتھرایا اور ڈھلکتا ہوا اس کی چار دنوں کی بڑھی ہوئی داڑھی میں عدم پتا ہو گیا۔ جون زبیدہ نے سوچا، مجھے اپنے باپ کے تخلیقی کام میں حارج نہیں ہونا چاہیے۔ وہ پھر باغ میں نکل آئی۔ آسمان پر دسویں کا چاند نہایت آب وتاب سے چمک رہا تھا۔

جون سوچنے لگی، چند دنوں میں فرقت حسین سے اس کی شادی ہو جائے گی۔ پھر کیا ہوگا؟ شادی کے بعد لوگ کیا کرتے ہیں؟ جہاں تک بزرگوں کی رضامندی اور آشیانے کے اس کے نام لکھے جانے کا مسئلہ تھا، سب معاملات بخوبی طے پا چکے تھے۔ عجیب یار جنگ نے یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو فیاٹ کار کی بجائے کوئی اور بہتر سیکنڈ ہینڈ گاڑی خرید دے گا۔ پھر بھی جون زبیدہ خوش نہیں تھی۔ وہ ان چیزوں کو پسند نہیں کرتی تھی جو شادی کے بعد کی جاتی ہیں۔ شاید جون زبیدہ کی مغربی رنگینی کی دلدادہ روح اسے کسی مغربی شخص کے پہلو میں ڈھیر ہو جانے کے لیے صدا دے رہی تھی، یا شاید وہ فرقت حسین پر اپنی مونچھوں کے ردعمل سے خائف تھی۔ فرقت حسین کو بوڈاپسٹ سے لوٹے کوئی تین ماہ ہو چکے تھے۔ اس نے اپنا اسٹوڈیو اپنے والد عجیب یار جنگ کے آشیانے کی آخری منزل میں قائم کر لیا تھا جہاں وہ سارا سارا دن زندگی کی روح کو موم کے مجسموں میں مجسم کرنے میں لگا رہتا۔ فرقت حسین اس لحاظ سے خوش نصیب تھا کہ اس کا والد عجیب یار جنگ حضور نظام کی بارگاہ میں ایک معزز عہدے پر فائز تھا اور فرقت معاش کی پریشانی اور روٹی کپڑے کے تفکرات سے بے نیاز، یکسوئی سے اپنے فن کی آبیاری کر سکتا تھا۔ اس کے آنے کے بعد حیدرآباد میں موم بتیوں کی قیمتیں کافی چڑھ گئیں... فرقت حسین کا خیال آتے ہی جون زبیدہ کے چہرے پر ہلکی سی زردی مائل سرخی دوڑ گئی۔ اسے خود اس کی وجہ معلوم نہ ہو سکی۔ شاید اس کی وجہ شادی کے بعد کی چیزیں تھیں...

(باب کا باقی حصہ ہم بغیر کسی نقصان کے حذف کر سکتے ہیں۔ اب ہم چالیسویں باب کا دامن پکڑتے

Scanned with CamScanner

ہیں جس میں شہرۂ آفاق موم تراش فرقت حسین آشیانے کی آخری منزل میں ایفرودیت کا مجسمہ مکمل کررہا ہے۔ چونکہ فرقت حسین اس ناول کا اصل ہیرو ہے، ہمیں اسے بالکل نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔)

چالیسواں باب: حقیقتِ موم و عسل

بجلی کی روشنی سے اسٹوڈیو بقعۂ نور ہورہا تھا۔ موم کے مجسمے اس نور سے محیط فضا میں غسل کررہے تھے اور ان کا خالق فرقت حسین، ایک ہاتھ میں موقلم لیے اور دوسرے میں شام کے وقت کا ہیٹ اٹھائے، اپنی ان مخلوقات کا جائزہ لے رہا تھا۔ فرقت حسین کے پاس ہر وقت کے لیے الگ الگ ہیٹ تھے۔ گنجا ہونے کی وجہ سے وہ اکثر ہیٹ سر پر رکھنے کا عادی تھا... نہ جون زبیدہ اور نہ ہی اس کا باپ طبل یار جنگ اس حقیقت کو جانتے تھے کہ فرقت حسین کے سر پر صرف گنتی کے بال ہیں۔ عجیب یار جنگ کو اس کا علم تھا مگر اس نے اس کو صیغۂ راز میں رکھنا مناسب سمجھا۔

فرقت حسین جانتا تھا کہ فن کار کے لیے مناسب پوشاک کیا ہونی چاہیے۔ یہ اس نے بوڈاپسٹ میں اپنے استادوں سے سیکھا تھا۔ اس نے سیاہ بولگا رکھی تھی، سفید چوڑی دار پاجامے کے نیچے اونچی ٹوکی بکسوئے والی سیاہ گرگابی اس کی نفاستِ طبع کی مظہر تھی۔ قمیض کی جگہ اس نے ایک خاکی جلیبیا پہن رکھی تھی۔

اسٹوڈیو کے عین وسط میں ایک اسٹینڈ پر ایفرودیت کی دیوی کا مجسمہ نصب تھا۔ فرقت حسین کو اس مجسمے پر بجا طور پر ناز تھا۔ اس نے اسے اپنے والد عجیب یار جنگ سے کئی دن تک مخفی رکھا۔ عجیب یار جنگ قدیم خیالات کے بزرگ تھے۔ اس گمراہ نسوانیت کی عریاں دیوی کی جھلک پالیتے تو مار مار کر فرقت حسین کا بھرکس نکال دیتے۔ وہ اچھے تن و توش کے مالک تھے اور بے چارہ فرقت... بس جیسے فنکار ہوتے ہیں۔ اگر فرقت حسین اپنے اس نادر شاہکار کو ناقدینِ فن کے روبرو پیش کرسکتا تو اس کی شہرت ہندوستان (پاکستان اس ناول کے چھپنے کے بعد بنا) سے سفر کرتی ہوئی افغانستان اور یاغستان تک جا پہنچتی اور وہ چاردانگِ عالم میں مشہور ہوجاتا۔ ناقدینِ فن اپنے منصب کا خیال کرتے ہوئے اس کی دھجیاں ضرور بکھیرتے مگر اس کا کچھ نہ بگاڑ سکتے۔ فرقت حسین ایفرودیت کو کیسے دنیا کے سامنے پیش

Scanned with CamScanner

کرے؟ اگر اس کے والد نے اپنے روسیاہ بیٹے کو جائیداد سے عاق کر دیا اور نان نفقہ بند کر دیا تو وہ اپنے فن کو کیونکر جاری رکھ سکے گا؟ فرقت حسین کے لیے جائیداد سے عاق ہو جانے کا تصور سوہانِ روح تھا۔

فرقت حسین اس مجسمے کو مارکیٹ میں کچھ اس وجہ سے بھی جلد از جلد لانا چاہتا تھا کہ گرمی کی وجہ سے ایفرودیت کے مجسمے کا موم ہر روز کچھ نہ کچھ پگھل جاتا اور اسے اس پر روزانہ تراش خراش کرنا پڑتی۔ اس سے ایفرودیت کی اصل شکل و صورت کے بدل جانے کا بھی خطرہ تھا۔ ہر روز اسے ایفرودیت کی ناک کی نوک تیکھی کرنی پڑتی اور سینے کا اُبھار نمایاں کرنا پڑتا۔ اس وجہ سے ایفرودیت کا مجسمہ مکمل نہ ہو پایا تھا۔ فرقت حسین رسمی مجسمہ سازوں (مثلاً مائیکل انجلو، لیونارڈو ڈی ونسی) کے انداز میں محض حسین شکل اور اُبھرتی چھاتیوں کی ایفرودیت دنیا کو پیش نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کی ایفرودیت میں وہ سب صفات اور کیفیتیں موجود ہوں گی جو محبت کی دیوی سے منسوب ہیں۔

گو آج رات اسے اپنے مجسمے میں ایک خاص بات دکھائی دی۔ ایفرودیت کے ہونٹوں پر اس مقام پر، جہاں بالائی اور زیریں لب متصل ہوتے ہیں، شہد کا کہر آلود داغ تھا۔ اس داغ کے کیا معنی ہیں؟ کہ مجسمہ شہد کھاتا رہا ہے؟

فرقت حسین سبک قدموں سے آگے بڑھا۔ دریچے سے برفیلی ہوا آ رہی تھی۔ باہر باغ میں گھٹاٹوپ تاریکی چھائی تھی۔ صرف گل مہر کا سیمیں بدن پیڑ چھٹکی ہوئی چاندنی میں درخشاں تھا۔

اس نے ایفرودیت کے تابناک نسوانی پیکر کو مس کیا، ٹھیک اس جگہ جہاں سینے کا اُبھار ایک کیف آور اختتام تک پہنچتا ہے۔ تند برقی رو اس کے جسم میں سرتاپا سرایت کر گئی اور اس نے پیٹ کے نیچے خلا سا محسوس کیا۔ صناعِ ازل کے تراشے ہوئے گوشت پوست کے مجسمے کتنے گرم اور حرارت سے پُر ہوتے ہیں۔ اس کی بنی ہوئی ایفرودیت سرد موم کی تھی۔ فرقت حسین نے کسی وجہ سے دریچے کو بند کر دیا۔ موم تراش تنہائی میں اپنے مجسمے سے ہم کلام ہونے کا خواہاں تھا۔ بعض لوگوں کو دریچوں یا دروازے کی درزوں میں جھانکنے کی بے ہودہ عادت ہوتی ہے۔

فرقت حسین نے اپنے دونوں بازو ایفرودیت کی کمر کے گرد حمائل کر دیے۔ ایفرودیت کی مومی نسوانیت اس کے بازوؤں میں گوشت اور خون کی طرح دھڑکنے لگی۔ اگر یہ ممکن ہوتا تو وہ مجسمے کو آغوش میں لے لیتا۔ مگر مجسمہ اپنے اسٹینڈ پر جڑا تھا اور تھا بھی کھڑے ہونے کی حالت میں۔

Scanned with CamScanner

مجسمہ اس کے بازوؤں کے دباؤ سے پچکنے اور ترمر ہونے لگا۔ فرقت نے دیکھا کہ موم میں شکست وریخت ہو رہی ہے۔ ایفرودیت کا بالائی دھڑ اب زیریں دھڑ سے زاویہ قائمہ بنانے لگا۔ اس نے جذبات پر قابو پاتے ہوئے مجسمے کو چھوڑ دیا۔

لیکن آخر مجسمے کے لبوں پر شہد کا دھبا کیونکر آیا؟ کیا ایفرودیت اپنی رسوائے عالم شہرت کی بدولت اس امر کی متمنی تھی کہ کوئی شہد چاٹنے کے بہانے ہی اس کے ہونٹوں کو چوس لے کہ اس سے... شہد کا دھبا اس نے آج ہی ایفرودیت کے ہونٹوں پر دیکھا تھا۔ پھر اسے یاد آیا کہ اس نے ناشتے میں ٹوسٹ پر شہد لگا کر کھایا تھا اور اپنے ہاتھ پونچھے بغیر موم تراشی میں لگ گیا تھا۔ اس دریافت پر اسے حیرت ناک تسکین ہوئی۔ اس نے اپنی انگلیوں کے پوروں کو چوسا، ان میں ابھی تک شہد کی مٹھاس اور چپچپاہٹ تھی۔ اس نے مجسمے کے ہونٹوں کو چوما اور اس عمل میں ایفرودیت کی ناک کو چپٹا کر دیا۔ اب اسے ناک پھر تراشنی پڑے گی۔ کوئی حرج نہیں۔ وہ انتھک موم تراش تھا۔ وہ پہلے سے بھی حسین ناک تراشے گا، جون زبیدہ کی ناک کے تخیل کو سامنے رکھ کر۔

اس کے ایفرودیت کے مجسمے اور جون زبیدہ میں کتنی مشابہت تھی۔ شہد اور موم... موم اور شہد۔ ان میں کسی کو پہلے رکھو یا بعد میں لگاؤ، ان کی خاصیت کا فرق مٹ نہیں سکتا۔ نہ شہد موم بن سکتا ہے نہ موم شہد۔ فرقت حسین ابھی تک موم کو زندگی کا نصب العین بنائے ہوئے تھا۔ معاً اس پر کھلا کہ شہد بھی کوئی کم ضروری چیز نہیں۔ اس نے سوچا کہ میں نے اپنے فن کے انتخاب میں غلطی کی ہے۔ کیا اس کے والد عجیب یار جنگ نے اسے بوڈاپسٹ بھیج کر مفت میں اپنا روپیہ برباد کیا ہے؟

شہد! آج اسے پہلی بار احساس ہوا کہ اصل حیات شہد ہے۔ زندگی کا راز شہد میں مضمر ہے۔ شہد کی گرم متلاطم شیرینی موم کی ٹھنڈی سفیدی میں کہاں! ہاں، شہد ہی اصل حیات ہے جو باغ کے پھولوں میں رستا بستا ہے، جسے شہد کی مکھیاں جگہ جگہ سے اکٹھا کرتی ہیں، جسے ٹوسٹ پر لگا کر کھایا جا سکتا ہے۔

فیثا غورث کی بائی نومیل تھیورم کی دریافت کے بعد فرقت حسین نے غالباً دوسری عظیم دریافت کی تھی۔

اسے موم سے نفرت ہونے لگی۔ اس کا دل چاہا وہ اسٹوڈیو میں رکھی ہوئی سب مورتوں کو توڑ پھوڑ دے۔ کیا اچھا ہوتا کہ اس کے اسٹوڈیو میں ان سب مومی مجسموں کی بجائے سچ مچ کے، صناع ازل کے

بنائے ہوئے، دھڑ کٹے نسوانی اجسام ہوتے۔ وہ ان کے ہونٹوں سے مگس جانباز کی مانند شہد چوستا اور باغ کے درختوں پر چھتے بناتا۔ فرقت حسین نے خود کو شہد کی مکھیوں کے ایک پورے چھتے میں تبدیل ہوتے محسوس کیا۔

یک دم فرقت پر وحشت طاری ہوئی اور وہ دروازہ کھول کر بیل کے سے سبک پاؤں سے گیلری میں آیا۔ نواب عجیب یار جنگ بہادر اپنے مصلّے پر خراٹے لے رہے تھے۔ باورچی خانے کے راستے وہ باہر نکلا اور اپنے ہونڈا اسکوٹر پر چڑھ بیٹھا (فیاٹ ابھی تک تھی مگر اب اسے چوکیدار اپنے گھر کے طور پر استعمال کرتا تھا)۔ اسکوٹر لینے میں کئی فوائد تھے۔ اسکوٹر پر وہ اپنے پیچھے جون زبیدہ کو بٹھا کر کیہروں میں لے جا سکتا تھا۔

مگر جون زبیدہ کو خدا جانے کیا ہو گیا تھا۔ وہ اب فرقت حسین کے ساتھ باہر سیر و تفریح پر جانے سے گھبراتی اور اکثر دردِ سر کا بہانہ کر دیتی۔ فرقت حسین نے سوچا، اب تو جون سے میری شادی ہونے والی ہے۔ اگر شادی کے بعد بھی اس میں جنسی شعور پختہ نہ ہو سکا تو ہماری کیسی نبھے گی؟ وہ اسکوٹر پر بیٹھا، ایک پوشیدہ ذہنی قوت کی دبوچ میں اسے ساٹھ میل کی رفتار سے دوڑانے لگا۔ پھر بھی اسے اسکوٹر رینگتا ہوا لگا اور اس نے ایکسلیٹر کو آخری حد تک دبایا۔ یکلخت اسکوٹر کسی پتھر سے اچھلا اور جوہڑ میں فرقت سمیت جا پڑا۔ اسکوٹر اس کی ٹانگوں میں سے نکلتا ہوا ڈوب گیا۔ وہ خود غوطے کھاتا کسی نہ کسی طور کنارے پر آ پہنچا، کپڑے پانی میں بھیگے ہوئے اور دانت بجتے ہوئے۔

فرقت نے اپنے کپڑے ایک ایک کر اتار ڈالے اور انھیں گل مہر کی ٹہنی پر سوکھنے کے لیے ڈال دیا۔ دھوپ کافی تیز تھی۔ آفتاب نصف النہار پر تھا۔ انڈرویئر بھی گیلا تھا مگر فرقت نے اسے پہنے رکھا۔ اچانک اس نے دیکھا، گل مہر کی ایک شاخ کو اپنی نازک مرمریں انگلیوں سے پکڑے جون زبیدہ اسے تک رہی تھی۔ ہو بہو ایفرودیت کا مجسمہ جسے اس نے گھڑ کر اسٹوڈیو میں تراشا تھا... ایفرودیت نیلی رنگت کے ایک ریشمی ڈریسنگ گاؤن میں...

یہ انڈرویئر اتارنے کا موقع نہیں تھا۔

Scanned with CamScanner

اکتالیسواں باب: گل چینی محبوب

(پہلے چار صفحات عطر بیزرات اور چاندنی کے بارے میں ہیں۔ وہ ہم حذف کرتے ہیں۔)

جون زبیدہ کا دل چاہا کہ آج دن میں بھی شب خوابی کا لباس پہنا جائے۔ اس نے اسے پہننے کے لیے وہ کپڑے اتارے جو وہ پہنے تھی۔ اب وہ نسوانی خم اور اُبھار، وہ خطوط اور دائرے اور گولائیاں جنھیں وہ اکثر لوگوں کی نظروں سے اور خود اپنی نگاہ سے بچا بچا کر رکھا کرتی تھی، عیاں تھے۔ وہ اپنے آپ سے شرمانے لگی۔ اپنے سینے کے کربناک اُبھار کو دیکھ اس کا چہرہ شرم سے تمتما اٹھا۔ اس نے جلدی سے ڈریسنگ گاؤن پہنا اور اس کی ڈوری مضبوطی سے باندھی۔

پھر وہ اپنے باپ کے کمرے میں آئی۔ اس کے ڈیڈی پیٹرومیکس کا لیمپ میز پر رکھے حسبِ معمول ناول نویسی میں منہمک تھے۔ "جہنم کے بعد" کے پینتالیسویں باب کے بیچ میں تھے اور ڈی ایچ لارنس کی لیڈی چیٹرلے صفحہ ۱۲۰ پر سامنے کھلی تھی۔ کتنی پاکیزہ اور عظیم شخصیت اس کے باپ کی تھی۔ ایک آنسو جون زبیدہ کی آنکھوں میں لرزا — خدا جانے کیوں!

وہ کمرے کے باہر باغ میں آگئی۔ چاندنی جوہڑ میں غوطے لگا لگا کر باہر نکلتی تھی، پھر مسکراتی اور پانی میں غوطے لگانے لگتی۔ وہ گل مہر کے درخت سے ایک پھول توڑنے کے لیے رُکی کہ اس نے ایک مرد کو دیکھا جو صرف انڈرویئر میں ملبوس تھا۔ جون زبیدہ کے معصوم نسوانی جذبات میں ایک تلاطم سا برپا ہوا۔ اس نے پہلے کسی مرد کو انڈرویئر میں نہیں دیکھا تھا۔ جون کی بچپن سے خوابیدہ نسوانیت جاگ اٹھی۔ اسے غیر محسوس انداز میں محسوس ہوا کہ اس کا ڈریسنگ گاؤن سرکتا جا رہا ہے۔

انڈرویئر والا مرد فرقت حسین ہی تھا۔

فرقت حسین نے بڑھ کر جون کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ کپڑوں کے سوکھنے میں ابھی کچھ دیر تھی۔ چاندنی ان دونوں کے اجسام میں مکمل طور پر حلول کر رہی تھی۔ وہ مست تھے۔ ان کو دیکھنے والا، ان کے معصوم پیار میں دخل در معقولات کرنے والا کوئی نہ تھا۔ سامنے سیمنٹ کی سڑک خوابیدہ تھی۔ جوہڑ خوابیدہ تھا۔ آشیانے میں نواب عجیب یار جنگ ابھی تک خراٹے لے رہے تھے۔ ادھر مانٹی کارلو میں طبل یار جنگ لیڈی چیٹرلے کا ایک سو بیسواں صفحہ اپنے ناول کے باب میں منتقل کرنے میں مصروف تھے۔

Scanned with CamScanner

جون زبیدہ ڈری۔ فرقت حسین آخر اسے اندھیرے میں درختوں کے نیچے سے کیوں لے جا رہا ہے؟ ایک لطیف سا خوف اس کے دل پر طاری ہونے لگا... ایک درخت کے قریب سے گزرتے ہوئے جون زبیدہ کے ڈریسنگ گاؤن کی ڈوری ایک شاخ سے اُلجھ گئی۔ وہ اسے چھڑانے کی کوشش کرتی تو وہ اور کھلتی جاتی۔ زمین پر نورو ظلمت کا فرش چارخانے بچھائے تھا۔ فرقت حسین نے جون کی ڈوری کو چھڑانے میں مدد دینا چاہی۔ دونوں کے جسم چھو گئے۔ جون نے ایک بوجھل لطافت محسوس کی۔ فرقت حسین کو ایسے لگا جیسے وہ پاور ہاؤس ہو۔ فرقت نے مدد کی تو ڈوری اور ڈھیلی ہو گئی۔

فرقت اور جون زبیدہ کو اپنا مستقبل معما معلوم ہو رہا تھا... انڈر ویئر، گاؤن، ڈوری، موم، شہد، عجیب یار جنگ بہادر، محمد بوٹا، اسکوٹر، جوانی، بڑھاپا، موت۔

پھر جون زبیدہ کو یوں لگا کہ جیسے فرقت حسین اور وہ 'من تو شدم تو من شدی' ہو رہے ہیں۔ فرقت اس کو سر سے پیر تک ہر جگہ چوم رہا تھا۔ وہ اس کے پاؤں سے شروع ہوتا اور اوپر اس کے بالوں تک اسے چومتا چلا جاتا اور پھر جو بالوں سے شروع ہوتا تو نیچے پاؤں (جون زبیدہ کے پاؤں) تک چومتا آتا۔

''جون زبیدہ!'' فرقت نے وفورِ جذبات میں بہتے ہوئے کہا، ''تم شہد سے زیادہ میٹھی ہو۔''

جون اب تک عریاں پڑی تھی۔ زندگی کا سربستہ راز جون پر کھولنے کے بعد فرقت حسین اس کے پاس کھڑا تھا۔ جون انفعال اور خجالت سے گویا نیچے ہی نیچے گرنے لگی۔ چاندنی اب بے کیف ہو گئی۔

وہ فرقت سے مخاطب ہو کر بولی، ''افسوس! فرقت، تم نے یہ کیا کر دیا؟ اگر اس گناہ کا کوئی نتیجہ ہوا تو غضب ہو جائے گا۔''

''میری جان! فکر نہ کرو، میں نے سب احتیاطی تدابیر سے کام لیا ہے۔ اور پھر ہماری شادی بھی ہونے والی ہے!''

''فرقت، اپنے والد کو کہو جلدی کی تاریخ رکھیں، ورنہ میں منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گی۔''

فرقت نے شفقت آمیز لہجے میں جواب دیا، ''ڈریسنگ گاؤن پہن لو۔ میں کل صبح ناشتے پر اپنے والد کو رضامند کر لوں گا۔ ہماری شادی بلا تاخیر ہو جانی چاہیے۔''

(اب ہم بیچ کے تین باب چھوڑ کر، جو محمد بوٹا یعنی طبل یار جنگ اور عجیب یار جنگ کے ایام طفولیت و

Scanned with CamScanner

شباب کے معرکہ ہائے عشق و وصال کو فلسفیانہ موشگافی اور ژرف نگاہی سے اُجاگر کرتے ہیں، اس ناول کے آخری باب بعنوان ''موم اور شہد'' پر آتے ہیں۔ ایک مشہور ادبی نقاد کی رائے میں یہ آخری باب اپنی رقت انگیزی، عروجی تاثر اور حسن بیان کے لحاظ سے سارے اردو ادب، اور غالباً عالمی ادب، میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔)

پینتالیسواں باب: موم اور شہد

آخر جون زبیدہ اور فرقت حسین کے درمیان وہ وحشیانہ مصنوعی رسم طے پا گئی جسے مذہب اور معاشرے کی رو سے نکاح کہا جاتا ہے اور جس کے بعد فریقین خاندانی منصوبہ بندی کے چکر میں پڑ جاتے ہیں۔

دو سال گزر گئے۔

رات تھی۔

بہار رُت کی چاندنی رات تھی۔ درختوں سے پتے کھڑاک کھڑاک جھڑ رہے تھے۔ چاند کے طلوع ہونے میں چند منٹ باقی تھے۔

فرقت حسین نے اپنے گھر کے پورچ میں اسکوٹر کھڑا کیا اور کھٹ کھٹ اندر داخل ہوا۔ آخر یہ اس کا اپنا گھر تھا۔ اس کی بیوی جون زبیدہ اپنی سہیلی سے ملنے باہر گئی ہوئی تھی۔ فرقت اپنی بیوی کے کمرے میں چلا گیا جو پردوں سے، آرائشی سامان سے، خوبصورت فرنیچر سے، ایرانی قالینوں سے آراستہ تھا۔ ان کی خادمہ گلدانہ ست انداز میں کھڑی جھاڑ پونچھ کر رہی تھی۔

اس وقت گلدانہ کے کپڑے نسبتاً صاف تھے۔ اس نے اودے رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔

فرقت حسین جب بھی گلدانہ کو دیکھتا—میلے کپڑوں میں بھی—تو اس کا دل تہہ و بالا ہونے لگتا۔

فرقت حسین کو اپنی بیوی جون زبیدہ کی مست کر دینے والی بوئے دلبری سے کمرہ لبریز محسوس ہوا۔ اس کے ساتھ اس میں خواہش بیدار ہوئی کہ وہ اس محبوب کمرے کی کسی ایک ایسی چیز کو جو سب سے زیادہ جاندار ہو، جس پر سب سے زیادہ جون زبیدہ کی رنگینی اور عشوہ طرازی کا اثر ہو، چوم لے۔ اس خواہش کی بیداری کے ساتھ اس نے گلدانہ کی صورت میں اپنی بیوی جون زبیدہ سے ایک ناقابل بیان مشابہت

Scanned with CamScanner

محسوس کی۔ گلدانہ اس کی بیوی جون زبیدہ تھی ـــ اسے معلوم تھا کہ اس کا قیاس غلط ہے مگر اس مسحور کن پُرفریب لمحے میں اس نے اپنے قیاس کو درست سمجھنے پر اصرار کیا۔ اس کے قدم خود بخود ہی گلدانہ یا جون زبیدہ کی سمت اٹھنے لگے۔

وہ آہستہ آہستہ بڑھا۔ ایرانی قالین کی دبیز نرمی میں اس کے بوٹوں نے کوئی آواز بلند نہ کی حالانکہ ان کے تلوں میں آہنی پترے جڑے تھے۔ اس پُر کیف قربت سے آہستہ آہستہ ایک جذبہ، ایک طفلانہ نیم مجنونانہ جذبہ فرقت کے سینے اور جسم کے دوسرے حصوں میں مچل اٹھا... وہ جذبہ مچلا، مشتعل ہوا... پھر اس نے سوچا، جون زبیدہ، اس کی بیوی، روز روز اپنی سہیلی کے ہاں کیا کرنے جاتی ہے؟

فرقت حسین اپنے والد عجیب یار جنگ کی طرح اپنے بچپنے ہی سے جمال پرست تھا۔ اس کے اندر ایک عورت سے ہمکنار ہونے، ایک نسوانی پیکر کو آغوش میں لینے کی خواہش بھڑک اٹھی۔ اسے یوں لگا جیسے وہ آگ ہے اور گلدانہ (اب اسے یقین تھا کہ وہ اس کی بیوی جون زبیدہ نہیں) خشک سرکنڈے کا دشت ہے جسے شعلہ دکھانے کی دیر ہے۔ فرقت نے جھپٹ کر پیچھے سے گلدانہ کے بازو پکڑ لیے۔ ملامت اور خوف کے متضاد آثار ایک دفعہ گلدانہ کی بادامی سیاہ آنکھوں میں آئے۔ پھر فرقت کے والد عجیب یار جنگ کے ساتھ پچھلے تجربات کی بنا پر اسے یک گونہ اطمینان ہو گیا۔

باہر سیال چاندنی لطف و کیف کا دریا بہا رہی تھی۔ گلدانہ کے چہرے پر معصومیت اور باوقار حسن تھا۔ اس کے حسن میں وہ ایک خاص شے تھی جسے نمک کہا جاتا ہے۔ فرقت حسین نے خیال کیا کہ نمک ہی اصل حیات ہے۔ نمک سے ہی زندگی میں جسارت، بدن میں توانائی، اعضا میں چٹان کا سا استحکام آتا ہے۔ شاید شہد کے لیے اس کی پسند صحیح مفروضے پر مبنی نہ تھی، اسے دراصل نمک کی ضرورت تھی۔

فرقت حسین نمک کی ڈلی کو زبان نکال کر چاٹنا چاہتا تھا۔ اب تک مفلسی نے سیاہ کثیف نقاب بن کر گلدانہ کی نسوانیت کو فرقت حسین کی آنکھوں سے پوشیدہ رکھا تھا۔ کچھ کچھ یہ شک بھی اس کے سینے پر مونگ دلتا رہا کہ غالباً گلدانہ اس کے باپ عجیب یار جنگ کے ہاتھوں اپنے نایاب جوہر دوشیزگی سے محروم ہو چکی ہے۔ اس میں عجیب یار جنگ کا بھی اتنا ہی قصور تھا جتنا گلدانہ کا۔ آگ کی خاصیت جلانے کی ہوتی ہے تو پٹرول کی جلنے کی۔ گلدانہ پٹرول تھی۔ سو فیصد آکٹین ـــ مصفا، شفاف، بھڑک اٹھنے والا۔ پھر بھی، فرقت حسین نے سوچا، اس لڑکی میں غربت اور ناخواندگی کے باوجود روح کی کتنی رفعت

Scanned with CamScanner

ہے ــــ ماؤنٹ ایورسٹ اور کنچن چنگا سی برفانی رفعت ۔ اس نے گمان کیا کہ وہ اور اس کا باپ عجیب یار جنگ دو کوہ پیما تھے جو گلدانہ پہاڑ کی چوٹی کو سر کرنے میں متفقہ طور پر کوشاں تھے ۔ ایک شمالی طرف سے، دوسرا جنوبی سمت سے ۔

ماؤنٹ ایورسٹ کے تصور سے فرقت حسین کے جسم میں جھرجھری سی آئی ۔ مگر اس پہاڑ میں جو گلدانہ کے روپ میں اس کے روبرو تھا، گوشت اور خون کی حدت... حیات پرور حرارت تھی، جو ایکسرے کے طور پر اس کے گرم موٹے ٹویڈ کے کوٹ اور سیاہ فلالین کی پتلون کے اندر سرایت کر رہی تھی ۔

پھر فرقت حسین کے دل میں باغی تصور پیدا ہوا ۔ کمرے میں رکھی ہر چیز میں اسے جون زبیدہ دکھائی دینے لگی ۔ گو یہ کیفیت اتنی موہوم تھی کہ فرقت کے احساس کا عشرِ عشیر ہی اس کی طرف متوجہ تھا، باقی کی توجہ گلدانہ کی طرف مبذول تھی ۔

اس نے گلدانہ کو اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا ۔ وہ تڑپ کر پلٹی تو فرقت پر اوس پڑ گئی ۔ ''تم! تم چلے جاؤ ۔ اتنی رات گئے تم کہاں سے آئے ہو؟'' وہ بولی ۔ فرقت حسین عرق انفعال میں غرق ہو گیا ۔ یہ گلدانہ نہیں بلکہ اس کی بیوی جون زبیدہ ہی تھی، جو گلدانہ کی اودی ساڑھی میں ملبوس، خادمہ کے لیے اپنے شوہر کے جذبات کی آزمائش کرنا چاہتی تھی ۔ فرقت نے خود کو سنبھالا ۔ ''جون! میں اسکوٹر پر گل مہر کے درخت تک گیا ۔ وہاں بڑی دیر تک چاندنی کا لطف اٹھاتا رہا ۔''

تھوڑی بہت خوشگوار ازدواجی گفتگو کے بعد فرقت حسین اور جون زبیدہ، جو پانچ مہینے سے امید سے تھی، آشیانے کے بالائی کمرے میں آئے جہاں فرقت شادی سے پہلے اپنے موم کے مجسمے تراشا کرتا تھا ۔ مجسمے کبھی کے ٹوٹ پھوٹ چکے تھے اور اب کمرے میں بھی نہیں تھے ۔ عجیب یار جنگ ایک بار ان دونوں کی عدم موجودگی میں اس پرانے اسٹوڈیو میں آدھمکا تھا اور اس نے خادمہ گلدانہ کی مدد سے ایک ایک کر کے مجسموں کو اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا تھا ۔ فرقت کو پہلے پہل تو اپنے والد کی یہ حرکت ناگوار گزری اور اپنی برسوں کی محنت کے ضائع ہونے کا صدمہ پہنچا، بعد میں اس نے حقیقتاً موم کے مجسموں سے چھٹکارا پانے پر اپنے باپ کو سراہا ۔ اسے اب موم تراشی میں کوئی دلچسپی نہ تھی ۔

اسٹوڈیو ان کی شادی کی رات حجلۂ عروسی کے طور پر استعمال ہوا تھا اور اب ان کی خواب گاہ کا کام دیتا تھا ۔ دیوار پر ریاستی کنٹوپ چڑھائے اور درباری خلعت پہنے عجیب یار جنگ کی تصویر آویزاں

Scanned with CamScanner

تھی۔

جب وہ سونے لگے تو جون زبیدہ نے کہا، ''ڈیئر، میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اس بچے کے ہونے کے بعد ہم تین چار سال تک کوئی اور بچہ پیدا نہیں کریں گے۔''

(اس فقرے پر یہ عظیم ناول اختتام پذیر ہوتا ہے۔ یہ بظاہر معمولی سا فقرہ، جو خاندانی منصوبہ بندی کے اس دور میں اس ملک کی ہر سمجھ دار، عاقبت اندیش بیوی کی زبان سے کبھی نہ کبھی ادا ہوتا ہے، اپنے اندر جدید معاشرے اور تہذیب پر بے پناہ طنز سموئے ہوئے ہے۔

قارئین اور نقادانِ فن کا فرض ہے کہ وہ اپنے اپنے وسائل سے کھوج لگائیں کہ منصور اللہ اس وقت دنیا کے کس گمنام خطے میں روپوش ہیں اور وہ کیوں اپنے ملک میں آنے کا نام نہیں لیتے؟ اپنے پُر حدت قلم کو کیوں انھوں نے ہاتھ سے دھر دیا ہے؟ حکومت کو بھی اپنے سفارت خانوں کی معرفت منصور اللہ کا پتا لگانا چاہیے۔ انھیں منت سماجت سے، یا پھر زبردستی، اس ملک میں لے آنا ضروری ہے۔ ان کا آخری ناول پندرہ سال پہلے چھپا تھا، اس کے بعد اردو ناول نگاری کے میدان میں قبر کی سی خاموشی ہے۔ اُلّو البتہ بولتے ہیں۔)

(فنون، لاہور، دسمبر ۱۹۷۳ء)

Scanned with CamScanner

مہتاب خاں شتاب اور شکیل چکوری
عرف ہر دو کا المیہ
(از شکیل چکوری)

مہتاب خاں شتاب میرے لیے ایک معما ہے۔ ایک کراس ورڈ پزل جس کا کوئی لفظ لغت میں نہیں، کوئی مسطح لفظ عمودی لفظ سے نہیں جڑتا، زبر زیر پیش مفقود ہیں۔

وہ ایک سپر سانک، آواز کی رفتار سے تیز اُڑنے والا جمبو جیٹ ہے جس کا پائلٹ کوئی نہیں، جو اپنی مرضی سے آسمان کی نیلگوں پہنائیوں میں گم ہو جاتا ہے اور جب چاہے لینڈ کرتا ہے۔ اس کے لیے ایئر سٹرپ کی قید نہیں۔

مہتاب خاں شتاب پرانے ماڈل کا ریڈیو ریسیور سیٹ ہے جو کسی نامعلوم ٹرانسمیٹر سے نشر ہوتی ہوئی برقی صوتی لہروں کو کیچ کرتا ہے۔ اس ٹرانسمیٹر کا مجھے آج تک پتا نہ چل سکا۔ بہر حال وہ ٹرانسمیٹر کراچی، لاہور، ماسکو، پیکنگ، لندن اور بون کا نہیں۔

ہماری دوستی بھی زیادہ پرانی نہیں۔ چھ سات سال پہلے میں اس سے متعارف ہوا، ایک ذاتی کام کے سلسلے میں۔ وہ ان دنوں وزارت فشریز میں ایک بے حد اہم عہدے پر تعینات تھا۔ محکمہ متعلقہ کی طرف سے ایک اشتہار میری نظر پڑا کہ انھیں ڈیڑھ ہزار روپے ماہوار مشاہرے پر چند ٹرالر سپروائزر درکار ہیں۔ گو میں ٹرالروں کی ورکنگ اور ماہی گیری کا کوئی تجربہ نہیں رکھتا مگر موٹر کار کے چند پرزوں کے نام مجھے آتے ہیں۔ میں نے بھی لگے ہاتھوں درخواست بھجوادی۔ پھر حسنِ اتفاق سے مجھ کو بازار میں ایک دوست مل گئے۔ وہ مہتاب خاں شتاب کو جانتے تھے۔

"ارے!" وہ بولے۔ "تم کس چکر میں پڑے ہو؟ میں تمھیں مہتاب خاں کے پاس لے چلتا ہوں۔ کام بن جائے گا۔"

دوسرے روز ہم رکشا لے کر شتاب صاحب کے دفتر جا پہنچے۔ میرے دوست نے چِٹ بھیجی۔

Scanned with CamScanner

شتاب صاحب ایک اہم ادبی کانفرنس میں مصروف تھے۔ کانفرنس کے ختم ہوتے ہوتے لنچ ٹائم ہو گیا۔ اتنی دیر انتظار کرنے کے باوجود ذرہ بھر بھی کوفت کا احساس نہ ہوا۔ بنچ پر بیٹھے چلغوزے کھاتے اور چھلکے برآمدے میں ڈھیر کرتے رہے۔ گنجے اور نازک بدن دانشوروں کے ہجوم کے نکلتے ہی انھوں نے ہمیں طلب کر لیا۔ چھوٹے ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں داخل ہو کر پہلے تو وہ مجھے نظر نہ آئے، پھر ایک طویل و عریض چمکدار آبنوسی میز کے پیچھے عینک کے شیشوں اور زرد نیکٹائی کے تھوڑے سے حصے کی جھلک نظر آئی۔

انھوں نے کھڑے ہو کر ہم سے مصافحہ کیا۔ کھڑے ہونے پر بھی وہ بیٹھے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ اتنی دیر ہمیں انتظار کرانے کی کچھ اس طور معذرت کی جیسے ان کا بند بند احساس گناہ، ندامت و تاسف سے سرشار ہو۔ ''خوب!'' میں نے سوچا۔ ''یہ ہے مہتاب خاں شتاب جس کے قلم کی ایک جنبش سے مجھے ڈیڑھ ہزار روپیہ ماہ بماہ ملنے لگے گا!'' میرے دوست نے میرا تعارف کرایا۔ کہا، ''مہتاب خاں! آپ نے ٹرالرز سپروائزر کی اسامیوں کے لیے ایڈورٹائز کیا ہے؟''

''ہاں شاید،'' وہ بولے ''کچھ یاد نہیں۔''

''چار ستمبر کے اخبار میں آپ کی وزارت کی طرف سے یہ پوسٹیں مشتہر ہوئی ہیں۔'' میرے دوست کو سب کوائف معلوم تھے۔ بعد میں پتا چلا کہ درخواست انھوں نے بھی دے رکھی ہے۔

''اچھا!''

''چکوری صاحب نے بھی اس پوسٹ کے لیے آپ کو ایک درخواست بھیجی ہے۔ یہ بڑے اونچے دانشور ہیں، ماہر نفسیات ہیں، منجم، ستارہ شناس، شاعر، ادیب، الغرض بہت کچھ ہیں۔ آج کل گوجرانوالہ میں مقیم ہیں۔''

''گوجرانوالہ میں؟'' مہتاب خاں گویا مراقبے سے نکل آئے۔ ''گوجرانوالہ میں بڑے بڑے بزرگ رہتے ہیں۔ ملک صاحب کو آپ جانتے ہیں؟''

میں نے ایک لحظہ اپنی واقفیت کے ان سب لوگوں کے نام یاد کرنے کی کوشش کی جو ملک کہلاتے تھے۔ صرف ایک ایسا نام حافظے میں ابھرا — ملک لال خاں — لیکن ملک لال خاں خاص چونی منڈی لاہور کے تھے اور ویسے بھی کئی برس پہلے سے متوفی تھے۔

''کون سے ملک صاحب؟'' میں بوکھلا کر پوچھ لیا۔

Scanned with CamScanner

''ایک ہی ملک صاحب ہیں، ان کو نہیں جانتے آپ؟'' وہ میری طرف دیکھ کر اس طرح مسکرائے جیسے میری کیفیت جانتے ہوں اور مجھ پر ترس کھا رہے ہوں۔ اِدھر میں نے خود کو ملک صاحب کو نہ جاننے پر سرزنش کی۔ ''اے چکوری! ملک صاحب کو جانتے ہوتے تو آج ٹرالر سپروائزی ہتھیلی پر دھری تھی۔''

تھوڑی دیر انھوں نے سوچا۔ پھر بولے، ''گوجرانوالہ آپ کی واپسی کب ہے؟''

''آج کسی وقت چلا جاؤں گا۔''

پھر وہی پُر اسرار مسکراہٹ۔ ''آج آپ نہیں جائیں گے۔ خیر، کل یا پرسوں جب لوٹیں ملک صاحب کے ہاں ضرور جائیں اور میرا اسلام ان تک پہنچا دیں۔''

''ضرور۔ جیسا ارشاد۔ ہاں، ملک صاحب کا نام پتا تو آپ نے بتایا نہیں۔''

''نام پتا تو مجھے بھی معلوم نہیں۔ شام کو رائل سینما تک چہل قدمی کر لیں۔ وہ تھرڈ کلاس کی بکنگ کی کھڑکی کے پیچھے بیٹھے ملیں گے۔ اللہ کی فوج میں ابدال کے عہدے پر حال ہی میں تعینات ہوئے ہیں۔''

میں حیران ہوا کہ یہ شخص جو حکومت میں اعلیٰ عہدیدار ہے، دانشور اور ادیب ہے، کیسی باتیں کرتا ہے! اسے میرے آج گوجرانوالہ نہ جانے کا بھی علم ہے۔ اس کی اس ہمہ دانی پر غصہ بھی آیا، مگر پی گیا۔ مصلحت اسی میں تھی۔

میرے دوست بولے، ''مہتاب خاں! ان چکوری صاحب کی تعیناتی میں ضرور امداد کیجیے۔ تعیناتی کا اختیار کلیتہً آپ کے ہاتھ میں ہے۔''

''امداد کرنے والے سے کیوں نہیں کہتے؟''

''وہ کون صاحب ہیں؟''

''مدینے والا۔''

''ہاں۔'' میرے دوست داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہنے لگے۔ رسول پاکؐ کی خدمت میں تو ضرور کامیابی کی دعا مانگیں گے، لیکن دعا کے ساتھ دوا بھی تو ضروری ہے۔''

''دعا کے ساتھ دوا ضروری ہے،'' مہتاب خاں مسکرائے۔

''تو پھر چکوری صاحب امید رکھیں گے۔ اچھا، اب اجازت دیجیے۔''

Scanned with CamScanner

"اجازت؟" وہ حاضر ہوتے ہوئے بھی غیر حاضر تھے۔ وہ میز کے گرد گھوم کر ہمیں دروازے تک چھوڑنے آئے۔ ایک پستہ قد، انتہائی عاجز، منکسر المزاج، بغیر استری کے کوٹ پتلون میں ملبوس شخص۔ ہمیں رخصت کرتے وقت وہ پھر بولے، "چکوری صاحب، ملک صاحب کو میرا اسلام پہنچانا نہ بھولیے گا۔ مدینے والے سے بھی ملک صاحب کا خاص تعلق ہے۔ جو کچھ مطلوب ہو، ان سے عرض کرو، وہ آگے سفارش فرمادیں گے۔"

گوجرانوالہ پہنچ کر میں رائل سینما کے بکنگ آفس پر ملک سے ملا۔ بکنگ ختم ہو چکی تھی اور وہ اسٹول پر بیٹھے نوٹ گن رہے تھے۔ بائیس تیئیس سال کے چونچیلے ناک والے نوجوان تھے۔ مجھ کو کھڑکی کے باہر دیکھ کر بولے، "بزرگو! ہاؤس فل ہے۔"

"میں فلم دیکھنے نہیں آیا۔ آپ کو ایک صاحب کا پیغام دینا ہے۔"

ملک صاحب مسکرائے۔ "آپ تھوڑی دیر انتظار کیجیے۔ کیش میں چالیس پینتالیس روپے کا گھپلا ہو گیا ہے۔ ذرا حساب جوڑ لوں۔"

میں آدھ گھنٹے انتظار کرتا رہا۔ آخر وہ کیش کو صندوقچے میں مقفل کر کے باہر نکلے اور مجھ کو تنہائی کی خاطر ٹائلٹ میں لے گئے۔ "آپ کو پیشاب تو نہیں آیا؟" وہ کہنے لگے۔

"نہیں، آپ شوق فرمائیے۔"

وہ پتلون کے بٹن کھول کر کھڑے کھڑے چینی کے بیسن میں پیشاب کرنے لگے۔ "آپ کہتے جائیے، میرے نام کیا پیغام ہے؟"

"مہتاب خاں شتاب نے آپ کو سلام بھیجا ہے۔"

"ہونہہ! اور کچھ؟"

"بس سلام ہی بھیجا ہے۔"

پتلون کے بٹن بند کرتے ہوئے بولے، "اچھا تو آپ ہیں وہ شخص جن کی سفارش مدینے والے سے کرنی ہے۔"

"یہ آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

"مہتاب کی وائرلیس آئی تھی۔"

Scanned with CamScanner

کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ میں بولا، ''پھر سفارش کریں گے آپ؟''

''آپ کا معاملہ ٹیڑھا ہے۔ سفارش تو حضور میں پہنچ جائے گی۔ یہ نہیں کہہ سکتا کہ قبول بھی ہوگی یا نہیں، اور آپ کی مراد پوری ہو جائے گی یا نہیں ہوگی۔ خاص آدمی اس مقصد کے لیے مدینہ شریف بھیجنا پڑے گا۔ چار پانچ ہزار روپے کا انتظام تو آپ کر دیں گے؟''

''چار پانچ ہزار روپے؟'' میرا منھ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ ''وہ کس لیے؟''

''بھولے بادشاہو! وہ خاص آدمی بائی ایئر جائے گا اور کام کے بعد بائی ایئر واپس آئے گا۔''

''میرے لیے تو یہ بہت بڑی رقم ہے،'' میں بولا۔ ''کیا اس خاص آدمی کے وہاں گئے بغیر کام بننے کی کوئی صورت نہیں؟''

''نہیں۔''

ملک صاحب کو میں نے شیشے میں اتارنے کی بڑی کوشش کی۔ بڑی مشکل سے ڈیڑھ ہزار تک اترے، مگر پھر وہیں رُک گئے۔ میں اور پیچھے پڑا تو جلال میں آ گئے۔ ''بدبخت انسان! دفع ہو جاؤ۔ کاغذ کے چند پرزوں کی خاطر تم نے رحمت و کرم کے دروازے اپنے لیے بند کر لیے اور ہمیشہ کے لیے دھتکارے گئے!''

میرا کام نہ بنا اور فشنگ ٹرالر کی سپروائزری مجھ کو نہ ملی۔ ملک صاحب ناراض ہو گئے تھے۔ اس قصے کے چند ماہ بعد مجھے لاہور میں ایک نفسیاتی ادارے میں ملازمت مل گئی۔ ادارے کے مالک، جو رشتے میں میرے ماموں لگتے تھے، ایک رسالہ ''تحت الشعور'' نکالتے تھے۔ ذہنی طور پر پریشان اور جنسی محرومیوں کے شکار کئی لوگ اس ادارے کو تفصیل سے اپنے مسائل کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر لکھتے اور ان کا حل چاہتے۔ میں رسالے کے مستقل عنوان ''مشورے'' کے تحت پروفیسر آفتابی کے فرضی نام سے ان خطوط کے جوابات لکھتا۔ میں نے فرائیڈ، ایڈلر، ژونگ وغیرہ کا ایک ایک لفظ پڑھا ہے۔ اس سلسلے میں مجھے بے شمار لوگوں کے نفسیاتی تجزیے کرنے پڑے اور رفتہ رفتہ اس کام میں اتنی مشق ہو گئی کہ خط پڑھتے ہی لکھنے والے کی شخصیت کی تمام گرہیں کھل کر سامنے آ جاتیں۔ انھی دنوں میں نے مہتاب خاں شتاب سے ملنا شروع کیا۔ ہم تقریباً ہر روز ملتے اور ہماری ملاقاتیں کافی طویل ہوتیں۔ کئی حضرات کا خیال تھا کہ ہم دونوں میں کافی گاڑھی چھنتی ہے۔ نفسیاتی تجزیے کا ماہر ہونے کا زعم رکھنے کے باوجود مجھ کو اقرار

ہے کہ میں مہتاب خاں کے اسرار کو نہ پا سکا۔ اس کی شخصیت کا کچھ حصہ میرے فہم کی دسترس سے باہر رہا۔ مہتاب خاں زندگی میں ایک بہت اچھا دوست ضرور ہے لیکن اس کے وجود میں قطعی بے نیازی اور بے تعلقی ہے۔ آپ اس کے پاس دو گھنٹے بیٹھے رہیں، خوب گپ شپ ہو گی، مگر وہ آپ سے چائے کو نہیں پوچھے گا۔ سگریٹ پیش کرنا بھول جائے گا۔ دوستوں کی طرف اس کی توجہ عدم توجہی سے مختلف نہیں۔ اس کو کسی سے چاہت نہیں، کسی سے نفرت نہیں۔ ایک دفعہ اسے اپنے ایک پرانے قریبی دوست کے وفات پا جانے کا تار موصول ہوا۔ اس کے چہرے پر رنج یا ملال کی کوئی کیفیت اس سانحے سے پیدا نہیں ہوئی۔ جس وقت یہ تار آیا، کھانا میز پر چن دیا گیا تھا اور مہتاب خاں نے اس دل جمعی اور اطمینان سے مختلف کورس ختم کیے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ خوش قسمتی سے میں بھی اس وقت وہاں موجود تھا۔ ہم کرکٹ اور اردو ناول کے افسوسناک انحطاط کی باتیں کرتے رہے۔ جب اس کی پہلی بیوی کا انتقال ہوا تو اس کی تجہیز و تکفین کے دوسرے روز وہ مجھے بانو بازار کے ایک جنرل اسٹور پر مل گیا۔ میں نے اس سے اس المناک وقوعے پر اظہار ہمدردی کیا مگر اس نے مرحومہ کا تذکرہ کچھ ایسے انداز سے کیا جیسے وہ اس کی نہیں کسی اور کی بیوی ہو۔

مہتاب خاں ایک ایسا لائٹ ہاؤس ہے جس کی سرچ لائٹ پُر تموج جھاگ اُڑاتے سمندری جہازوں کو میلوں دور سے دکھائی دیتی ہے لیکن جب کوئی جہاز اس کی رہنمائی کو قبول کر کے ساحل کا رخ کرتا ہے تو سرچ لائٹ ناپید ہو جاتی ہے، نہ صرف سرچ لائٹ بلکہ اس کے ساتھ لائٹ ہاؤس بھی۔ اس سنگلاخ چٹان کا بھی نام و نشان نہیں ملتا جس پر اس لائٹ ہاؤس کو انجینئروں نے تعمیر کیا تھا۔

وہ ایک ایسی نرتکی ہے جو اپنے رقص و طرب کی لہروں پر بہتی ہوئی، اپنے سرگم میں گم سم، جان بوجھ کر ایسے جفاکش آسن بروئے کار لاتی ہے کہ دیکھنے سننے والوں کے کلیجے پر سانپ پھر جاتا ہے۔

بارہ سال کی دوستی اور میل جول کے بعد بھی مہتاب خاں میرے لیے بعید از فہم ہے۔ تجزیہ نفسی کا اچھا خاصا ماہر ہونے کے باوجود میں مہتاب خاں کی شخصیت کے مخفی عوامل و مقاصد کا احاطہ نہیں کر سکا۔ ایک رسالے میں چند صفحات کا مضمون اس تفصیلی ذکر کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ چند برس پہلے میں نے ڈھائی ہزار صفحے کا ایک ضخیم ناول ''گوجرانوالہ کا پھتو'' لکھا تھا۔ اس کی زیرِ تصنیف دوسری جلد ''پھتو اور ابدال'' میں اتنے ہی صفحات مہتاب خاں کی شخصیت کے گورکھ دھندے کو حل کرنے کے لیے وقف ہوں گے۔ جب

Scanned with CamScanner

تک وہ جلد شائع نہیں ہو جاتی، آپ کو اسی تشنہ مضمون پر قناعت کرنا پڑے گی۔

میری تخلیقی صلاحیتیں تو جو کچھ ہیں، آپ کے سامنے میرے ناول ''گوجرانوالہ کا پھتو'' اور لاتعداد نفسیاتی افسانوں میں اجاگر ہو چکی ہیں۔ چند احباب اس ضمن میں مجھ پر منٹو کی جانشینی مڑھنے پر مصر ہیں حالانکہ منٹو مرحوم نے جو افسانے لکھے ہیں انھیں نفسیاتی افسانے ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔ میں نے ان کی رائے کو کبھی اہمیت نہیں دی۔ میرا ایمان ہے کہ مہتاب خاں شتاب کی تخلیقی قوتوں کے سامنے میرا کیا، کسی اور کا بھی چراغ نہیں جل سکتا۔ دانشور تو وہ بھی ہے اور میں بھی، مگر وہ دانشور کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہے۔

عام قاعدہ ہے کہ ہم انسان کسی محفل یا مجلس میں بیٹھ کر وقت گزاری کے لیے کسی غیر حاضر دوست کے اوصاف کے بخیے ادھیڑتے ہیں، اس کی کنجوسی، مطلب پرستی، رشوت خوری اور بیوی کے چال چلن کے بارے میں سیر حاصل مباحث چھیڑتے ہیں۔ اس کو غیبت نہیں کہا جا سکتا اور نہ ہی ایسے ذکر سے اس دوست کی تذلیل مقصود ہوتی ہے۔ ایسی معصوم بے ضرر گفتگو محض وقت کو ہنسی خوشی گزارنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اس مذاکرے کے درمیان اگر متعلقہ دوست وہاں آجائے تو سب مسرت و خلوص سے اس کو آنکھوں پر بٹھاتے ہیں اور پھر کسی اور غیر موجود صاحب کی عادات میں خوب خوب کیڑے ڈالے جاتے ہیں۔ آپ مانیں گے کہ ایسی پُر مذاق غیبت گوئی نہایت دلچسپ مشغلہ ہے۔ یہ نہ ہو تو مجلسیں سونی ہو جائیں اور گھروں میں الو بولنے لگیں۔ اس سے کسی کا فی الحقیقت کچھ نہیں بگڑتا۔

مہتاب خاں شتاب ایسی معصوم محفلوں میں بیٹھ کر سب کچھ سنتا ہے، کہتا کچھ بھی نہیں۔ غیر حاضر شخص کے اوصاف کچھ زیادہ ہی کھل کر سامنے آنے لگیں تو وہ دردِ سر کا بہانہ کر کے وہاں سے اٹھ بھاگتا ہے۔

میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس کا وقت کیونکر کٹتا ہے۔

مہتاب خاں کی مردم شناسی تو لاجواب ہے۔ ہر کوئی اس کے نزدیک بڑا اچھا آدمی ہے۔ بُرا کوئی نہیں۔ خوب انسانوں کو پرکھنے کا انداز ہے جناب کا:

فلاں عورت اپنے میاں کے دیر سے آنے پر اس سے بیٹھکیں کراتی ہے، لہٰذا بڑی اچھی عورت ہے۔

Scanned with CamScanner

فلاں آدمی اپنے جگری دوست کی بیوی کو لے اُڑا، مگر بڑا اچھا آدمی ہے۔

فلاں آدمی آٹھ بچوں کا گلا گھونٹ چکا ہے۔ ویسے اس کے اچھا ہونے میں کلام نہیں۔

مہتاب خاں کی اس منطق کو سمجھنے سے میں تو عاجز آ چکا ہوں۔

مانا کہ غیبت کوئی اچھی بات نہیں مگر کبھی کبھار کی عیب جوئی سے زندگی میں لطف اور رنگینی پیدا ہوتی رہتی ہے۔ جس محفل میں مہتاب خاں جیسا منھ میں گھنگھنیاں ڈال کر بیٹھنے والا شخص موجود ہو گا اس پر اوس نہ پڑے تو کیونکر۔ گھر میں بھی مہتاب خاں کا چلن اسی طور کا ہے اور میں اس کی حالیہ اور چوتھی بیوی پروفیسر صاعقہ کے صبر و حوصلہ کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا جو اس اُداس ماحول کو برداشت کیے چلی جاتی ہے۔ میاں بیوی کا بستر غالباً دنیا کی متبرک ترین جگہ ہے۔ اس کی اہمیت سے بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ اسی میں دو تپتے ہوئے جسم یک جا ہوتے ہیں، اگلی نسل کی تشکیل ہوتی ہے۔ محبت و عشق کی پینگ میں اُڑان بھرنے کے بعد ٹھنڈے اور پُر سکون ہو کر وہ دونوں دنیا جہان کی باتیں کرتے ہیں۔ پڑوسیوں، رشتہ داروں، آس پاس والوں کی کمینگیوں، خستوں، آوارگیوں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان کے مضحکہ خیز عیب گنائے جاتے ہیں۔ ان مکالموں سے کسی لڑائی جھگڑے اور چخ چخ کے بغیر دونوں کا وقت کٹ جاتا ہے۔ کئی ازدواجی رشتوں کی کامیابی ایسی ہی گفتگوؤں کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ اگرچہ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعد میں یہی گھلاوٹ اور اپنائیت کی باتیں بنائے فساد بن جاتی ہیں، جس میں وہ چنگاری سلگتی ہے کہ طلاق تک نوبت پہنچتی ہے۔

مہتاب خاں آپ کے سامنے اُجلے کپڑے پہن کر کبھی نہیں بیٹھے گا۔ گرم سوٹ اس کے پاس دو ہیں، وہ بھی ڈھیلے ڈھالے، کالج کے زمانے کے سلے ہوئے۔ اس نے انھیں کبھی ڈرائی کلین نہیں کرایا۔ آپ اس کے پاس بیٹھیں تو آپ کو خود بخود اپنی اہمیت اور برتری کا احساس ہونے لگے گا۔ وہ اپنی شخصیت کو ارادتاً اتنا غیر اہم اور کم مایہ بنا دے گا جیسے وہ ایک مٹی کھانے والا حقیر کیڑا ہو اور آپ برما کے سفید ہاتھی۔ اس کے روبرو آپ سر کے بل کھڑے ہو جائیں تو وہ آپ کے اس فعل کو چنداں اہمیت نہیں دے گا، نہ منع کرے گا، نہ ہی اس کی علت جاننے کے لیے کرید ے گا۔ آپ اس کے سامنے شراب سے بدمست ہو کر اخلاق سوز حرکات کرنے لگیں، وہ اسی طرح بیٹھا آپ کو تکتا رہے گا، آنکھ تک نہ جھپکے گا۔ دست درازی تک نوبت آنے پر البتہ وہ کوئی بہانہ بنا کر باتھ روم کھسک جائے گا اور وضو کر کے خشوع و

Scanned with CamScanner

خضوع سے نوافل پڑھنے لگے گا۔

اس کو کسی پر غصے ہوتے میں نے نہیں دیکھا۔ اسے غصہ آتا ہی نہیں اور نہ ہی اس پر کسی کو غصہ آتا ہے۔ ایک دن میں اسے اس کی کوٹھی پر ملنے گیا۔ وہ گھر پر موجود تھا۔ نوکر نے آکر کہہ دیا، صاحب گھر پر نہیں۔ واضح بات تھی کہ صاحب کی ہدایت ہی یہی ہوگی۔ مجھے اس بداخلاقی پر مہتاب خاں پر ذرا بھی غصہ نہ آیا بلکہ میں وہاں سے اس کے گن گاتا ہوا چلا۔ دوسرے دن شاہ عالمی کے باہر ایک بزرگ بھینس کو رستے سے کھینچتے ہوئے مل گئے۔ میں نے کہا، ''آپ کا مہتاب خاں جھوٹا ہے۔ کل جب میں اس سے ملنے گیا، وہ گھر پر موجود تھا، مگر نوکر نے آن کر کہہ دیا کہ وہ گھر پر نہیں۔''

وہ بزرگ بھینس کو اس کی زبان میں کچھ ہدایت دیتے ہوئے بولے، ''آپ مہتاب خاں کے گھر کس وقت گئے؟''

''ساڑھے چار بجے۔''

''ساڑھے چار بجے صبح یا ساڑھے چار بجے شام؟''

''ارے قبلہ، ساڑھے چار بجے صبح کون کسی شریف آدمی کو ملنے جاتا ہے؟ میں شام کو گیا تھا۔''

''تو بس آپ کو غلط فہمی ہوئی۔ ساڑھے چار بجے شام تو مہتاب خاں مدینہ شریف میں کملی والے کے دربار میں حاضر تھا۔''

''میں حیران رہ گیا۔'' مدینے میں؟''

''ہاں، مجھ کو وائرلیس پر معلوم ہوا تھا۔''

''آپ کے مکان میں وائرلیس اسٹیشن ہے؟''

وہ بزرگ اڑیل بھینس کو کچھ گالیاں دیتے ہوئے بولے، ''تم کیا سمجھو گے بھائی، اللہ کے برگزیدہ بندوں کے پاس وائرلیس ہر وقت موجود رہتی ہے۔ اللہ کی فوج کے پاس یہ آلات نہ ہوں تو وہ بھلا کیسے ایک دوسرے سے رابطہ رکھ سکتے ہیں؟ دنیا کے بندوبست کے لیے ہمارے پاس ہر قسم کا سامان ہے...او بھینس...''

اتنے میں بھینس رسا تڑا کر بھاگی اور بزرگ بات کاٹ کر اس کے تعاقب میں بھاگے۔ میں نے جب مہتاب خاں سے اس واقعے کا ذکر کیا تو حسبِ عادت وہ مسکرا دیا۔

Scanned with CamScanner

مہتاب خاں سے میرے تعلقات گہرے ہوے تو میں نے ایک کاپی رکھنی شروع کی۔ اس میں اس ملکِ خداداد کے اکثر اولیا و ابدال صاحبان کے نام پتے درج ہیں۔ یہ فہرست میں نے مہتاب خاں کی اعانت سے تین چار سال کی مدّت میں مکمل کی ہے۔ مہتاب خاں کا نام ابدالوں میں سولھویں نمبر پر ہے۔ یہ راز افشا کرنے کی مجھ کو اجازت تو نہیں تھی مگر میری عادت ہے کہ منھ پر آئی بات رکتی نہیں، پیٹ کا ہلکا ہوں۔

آپ کو حیرت ہوگی، آج تک میاں بیوی میں جھگڑا نہیں ہوا۔ ہو بھی کیسے؟ مہتاب خاں بیوی کی بڑی سے بڑی نیش زنی کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیتا ہے۔ شادی کے بعد مہتاب اور پروفیسر صاعقہ کی صرف ایک بات پر چخ چخ ہوتی دیکھی ہے۔

مہتاب کہتا ہے، ''آج بینگن کا بھرتہ کھانے کو جی چاہتا ہے۔''

وہ کہتی ہے، ''بینگن ہمارے خاندان میں تو کبھی کسی نے کھائے نہیں۔''

مہتاب کہتا ہے، ''بینگن ہمارے گھر میں تو روز پکتے تھے اور سب چھوٹے بڑے شوق سے کھاتے تھے۔ خانساماں کو کہہ دیجیے کہ میرے لیے کھانے پر بینگن کی ترکاری یا بھرتہ بنائے۔''

''خانساماں دو دو ڈشیں نہیں بنا سکتا۔ آپ کے لیے الگ اور میرے لیے الگ۔ اور بازار سے ذرا بینگن کا بھاؤ تو پوچھیے گا، جناب والا۔''

جب مہتاب کے دفتر سے آنے پر دوپہر کا کھانا میز پر لگتا ہے تو یقیناً بینگن کی سبزی کہیں نظر نہیں آتی۔ مہتاب خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے۔ پروفیسر صاعقہ اس گھریلو رسّا کشی میں فتح یابی پر گنگنائے بغیر نہیں رہ سکتی۔

مہاتما بدھ نے بڑ کے پیڑ کے تلے جو نروان حاصل کیا اس نروان سے مہتاب خاں کا انگ انگ سرشار ہے۔ وہ ایک ایسا کرشن ہے جسے ان گنت گوپیوں نے توبہ شکن آسنوں سے شعلہ بنانے کے جتن کیے ہیں مگر بے سود۔ بظاہر اس کی آنکھوں میں جذبات کی تپش کی لالی ضرور نظر آئی۔ میں نے اپنے محدب شیشوں میں سے اس لپکتی آگ کو الوہی نور میں بدلتے دیکھا ہے۔ دو تین گوپیاں اس طرح رو کے جانے پر بڑی دل گرفتہ ہوئیں، اور انھوں نے بالآخر گلے میں رسّی کا پھندا ڈال کر خودکشی کر لی۔ میں مہتاب کو ان کا قاتل کہتا ہوں۔ وہ جواب میں ایک انوکھے، فطری خواہشوں سے بے نیاز گیانی کی طرح

Scanned with CamScanner

مسکرا دیتا ہے۔

ادھر اس معصیت کار کی کیفیت سنیے۔ پچپن ساٹھ سال کے سن کے باوجود اب بھی ہر عورت کو دیکھ کر میرے بدن پر چیونٹیاں سی رینگنے لگتی ہیں۔ پاکھنڈی بنا نظریں نیچی رکھتا ہوں، مگر کانی آنکھ سے اس عورت کے سینے، کمر، کولھوں کے کنٹور (contour) کا جائزہ لیتا جاتا ہوں۔ میرے ہردے کا ریسیور سیٹ عورت کے ٹرانسمیٹر کی ہر ویولینگتھ کیچ کرتا ہے۔ اس کے سر پر ابلیس کو دانت نکالے ٹھٹھا کرتے دیکھتا ہوں۔

وقتاً فوقتاً میں خلوت میں ہڑبڑا کر اٹھ پڑتا ہوں اور چلا اٹھتا ہوں، ''کاش میں عورت ہوتا۔ عورت ہونے کا experience کتنا عظیم ہے!''

کئی ایک عجیب و غریب واقعات و حادثات مجھے پیش آئے ہیں جن کا میرے پاس کوئی جواز نہیں۔ اُن دنوں کی بات ہے جب مہتاب خاں ایک اہم سرکاری مراسلے کے سلسلے میں زنجبار گئے ہوئے تھے۔ میں تب پرانے مزنگ میں ایک دو کمروں کے چوبارے میں مقیم تھا۔ نیچے ایک قصائی کی دکان تھی۔ ایک صبح وہ قصائی بلاتکلف سیڑھیاں چڑھ کر میرے چوبارے میں آن موجود ہوا اور کاہنا کاچھا کے ایک بزرگ کا تذکرہ کیا جس کا وہ بہت قائل تھا۔ اس نے مجھے مجبور کیا کہ کاہنا کاچھا کے اس بزرگ کو خط لکھوں اور دعا کے لیے درخواست کروں تاکہ میں اس گوشت کا حساب چکا سکنے کے قابل ہوں جو میں اس سے ادھار لیتا رہا تھا۔ میں نے چار و ناچار اس بزرگ کو پوسٹ کارڈ لکھا۔ چوتھے دن ہی بزرگ کا جواب موصول ہوگیا کہ ''تمھارے حالات تمھارے دوست کے آنے پر پلٹ جائیں گے۔ دن رات میں چار ہزار بار درود پڑھا کرو اور اپنی تصنیف پر کام جاری رکھو۔'' اس کو پڑھ کر میں حیران رہ گیا۔ اس بزرگ کو یہ کیسے معلوم ہوگیا کہ میں ایک ناول لکھ رہا ہوں؟ اور بزرگ کی مراد میرے کس دوست سے ہے؟ میں شش و پنج میں پڑ گیا۔ میرے چار پانچ دوست ان دنوں لاہور سے باہر تھے اور میں شدت سے ان کی واپسی کا منتظر تھا۔ جب ان میں سے کوئی بھی نہ لوٹا تو میں نے پھر بزرگ کی خدمت میں جوابی پوسٹ کارڈ لکھا کہ ان کی مراد کس دوست سے تھی۔ وہاں سے جواب موصول ہوا کہ ''وہ دوست جو مدینے کا خاص غلام ہے، اس وقت سلطان آف زنجبار کے شاہی مہمان خانے میں مقیم ہے اور اس کا نام 'م' سے آغاز ہوتا ہے۔ کل اللہ والوں کی کانفرنس میں اس کے واپس بلوانے کا حکم صادر ہو چکا اور وہ ایک ماہ میں

لوٹ آئے گا۔ کراچی ایئر پورٹ پر اسے ملنے جاؤ۔''

ایک دن مہتاب خاں نے کہا، ''کبھی فقیر سائیں سے ملے ہو؟ بڑی پارسا تہجد گزار خاتون ہیں۔ ہر وقت ہاتھ میں تسبیح چلتی رہتی ہے اور ہر سال باقاعدہ دھوم دھام سے اپنا عرس مناتی ہیں۔ اپنا روضہ زندگی ہی میں تعمیر کرا لیا ہے۔''

''ان کی زیارت نہیں ہوئی۔''

مہتاب خاں بولے، ''وہ مستقبل کے حالات بتا دیتی ہیں۔ جس پر التفات کریں اس کی تقدیر بدل جاتی ہے۔'' انھوں نے ان خاتون کی رہائش گاہ کا پتا مجھ کو نوٹ کروایا۔

اگلے روز ہم سب جلوس کی شکل میں ان کے ہاں جا پہنچے — عمر شریف، ضیا قند ہاری، ابوسودا، مچھلی ماہی شہری، ڈاکٹر محشر مرزا۔ خاتون نے باری باری ان کے مستقبل کے بارے میں جو کہا وہ بعد میں سچ نکلا۔ پہلا ٹیلی وژن اسٹار بن گیا، دوسرے کی بیوی بھاگ گئی، تیسرے کی طیارے کے حادثے میں ٹانگ ٹوٹی، چوتھے کو ایک گھوڑے نے کاٹ لیا اور پانچواں ایک خطرناک سیاسی تقریر کرنے کے جرم میں تاحال جیل میں ہے۔ یہ خاتون سنہری فریم کا چشمہ لگاتی تھیں، اہلِ نظر میں سے تھیں اور طہارت و پاکیزگی پیشانی سے نور کی طرح چمکتی تھی۔

اس شام ہماری موجودگی میں یہ خاتون مہتاب خاں کے گھر آئیں۔ کہنے لگیں، ''میرا ارادہ تھا اعتکاف کروں۔ دوپہر کو قیلولے میں اشارہ کیا گیا کہ لاہور کے سب سے پاک مکان میں اعتکاف کرو اور آپ کے گھر کا ناک نقشہ دکھایا گیا۔ لہٰذا آپ کو اعتراض نہ ہو تو یہاں اعتکاف کروں؟''

مہتاب خاں کی تیسری بیوی خواب آور گولیاں کھا کر اللہ کو پیاری ہو چکی تھیں۔ گھر خالی پڑا تھا۔ وہ بخوشی اس سعادت پر رضامند ہو گئے۔ چنانچہ ان خاتون نے وہاں پورے ایک مہینے اعتکاف کیا۔ مہتاب نے بھی خاطر مدارات میں کسر نہ چھوڑی۔ آخری دن حالتِ اعتکاف میں انھیں اشارہ ہوا کہ اپنی بھانجی پروفیسر صاعقہ کی شادی مہتاب خاں سے رچاؤ۔ انھوں نے اعتکاف ختم کر کے مہتاب خاں سے اس اشارے کا ذکر کیا۔ وہ اس فرمان کو کیسے نہ مانتے، کچھ سوچ کر ہاں کر دی۔ اس طرح ان کی چوتھی بیوی پروفیسر صاعقہ ان کے گھر میں آ بسیں۔ وہ پاکیزہ خاتون اب مستقل اپنی بھانجی کے پاس رہتی ہیں۔ میاں بیوی ان کے مشورے کے بغیر قدم نہیں اٹھاتے۔ جب مہتاب خاں ''تیرہ سو'' میں آ گئے تو

میں دوسری صبح ان سے ملنے گیا۔ وہ بولے، ''یہ عتاب مجھ پر کیوں نہ آتا؟ پرسوں میں نے کسی بات پر چڑ کر اپنی ساس کی شان میں گستاخی کی۔ وہ مجھ سے کچھ نہیں بولیں مگر میں جانتا ہوں کہ اللہ والوں کی دعا فوراً قبول ہو جاتی ہے۔''

''اچھی دعا قبول ہوئی! بیٹھے بٹھائے تمھاری نوکری گئی۔''

''اللہ والوں کے کام میں ہم دخل نہیں دے سکتے۔ اس میں کوئی بہتری ہوگی۔''

''اچھی بہتری ہے!''

چار دن کے بعد مہتاب خاں کو ایک صنعتی ادارے میں بطور لیبر آفیسر دو ہزار روپے ماہوار کی ملازمت کا آفر آ گیا۔

ایسی داستانیں بہت سی ہیں، کہاں تک سناتا رہوں؟ اور سنانے سے فائدہ؟ ہر کوئی بات سننے اور اس کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ میں نے اپنے ناول کی پہلی جلد کے بعد ہر تحریر میں، احباب کی ہر محفل میں اس نکتۂ رمز کو کھولنے کی کوشش کی ہے۔ لوگ میری بات کو مصنوعی توجہ اور احترام سے سنتے ہیں اور میرے پیٹھ پیچھے تاسف سے سر ہلاتے ہیں یا ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنستے ہیں۔ ''بے چارہ چکوری! اچھا خاصا ماہر نفسیات ادیب تھا۔ بالکل nuts ہو گیا۔'' وہ مجھے سیڈ کیس (sad case) کہتے ہیں اور میری اس ذہنی کیفیت کا ذمہ دار مہتاب خاں شتاب کو ٹھہراتے ہیں۔

اس کو تو چھوڑیے، جب میں عجز و عقیدت کے جذبات سے سرشار مہتاب خان کو گھر پر ملنے جاتا ہوں تو وہ اکثر باہر گیا ہوا ہوتا ہے۔ شکیل چکوری کی زندگی کا عظیم المیہ وہ کس کو سنائے۔

(فنون، لاہور، نومبر دسمبر ۱۹۷۵ء)

سعید بن مجید عرف مجاہدِ اشبیلیہ

(ایک اسلامی تاریخی ناول)

ابتدائی نوٹ

اسلامی تاریخی ناولوں کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو دیکھتے ہوے میں نے بھی ایک اسلامی تاریخی ناول لکھا ہے۔ اسے لکھتے وقت کئی ایسے مشہور تاریخی شاہکار مصنف کے (یعنی میرے) پیش نظر رہے ہیں جن کے تھوڑی مدت میں سات سات ایڈیشن طبع ہو کر شائقین کے ذوقِ تفریح و جہاد کی تسکین کر چکے ہیں۔ میں نے اس ناول کو جدید طرز پر لکھا ہے۔ میں نے ان تاریخی ناولوں میں جہاد اور محبت کے جو تذکرے موجود ہیں ان سے کافی استفادہ کیا ہے، اس کا مجھے اعتراف ہے، اس لیے کوئی صاحب ایسے فقرے یا پیرے پڑھ کر جو وہ اس سے پیشتر کہیں اور پڑھ چکے ہوں چیں بہ جبیں نہ ہوں۔ کاپی رائٹ والے اصحاب سے استدعا ہے کہ خواہ مخواہ مقدمے بازی میں پڑ کر اپنا قیمتی سرمایہ ضائع نہ کریں۔

اگر ناشروں اور قاریوں نے مصنف کی (یعنی میری) اس پہلی کوشش کو قدر دانی کی نظروں سے دیکھا تو میرا ارادہ ہے کہ اس قسم کے کئی ناول لکھوں اور اس کارِ خیر کو اپنا مستقل پیشہ بنالوں۔ میں چار سو صفحات کا اسلامی تاریخی ناول پندرہ روز میں مکمل کر سکتا ہوں۔ ایسے ناولوں کے ناشر حضرات کو چاہیے کہ مجھ سے اس معاملے میں فوری خط و کتابت کریں اور کنٹریکٹ وغیرہ کی ضروری شرائط طے کر لیں۔

اس ناول کا معرکہ آرا باب بمصداق مشتے نمونہ از خروارے یہاں دیا جا رہا ہے۔ اس میں اگر قارئین کرام کو اسلام اور تاریخ کی کوئی بات نظر نہ آئے تو اسے مصنف اور اس کے مقبول و معروف پیشرووں کی ہیچمدانی اور کم فہمی پر محمول کر کے درگزر فرمائیں۔

باب ہشتم: اشبیلیہ کی گمشدگی

سعید بن مجید چند ایک ماہ کے بعد اشبیلیہ واپس آیا اور پھر محاذ پر چلا گیا۔ مشرقی محاذ پر سلطان ابن الجابر بن خمیرہ کی افواج پیش قدمی کر رہی تھیں۔ مغربی محاذ پر شاہ اوقیانوس کے سفاک بھانجے یک چشم بطلیموس

Scanned with CamScanner

کا وحشی لشکر ایک غضب ناک سیلاب کی مانند المغیرہ کی آہنی دیواروں سے ٹکرا رہا تھا، اور ہزاروں مجاہد جام شہادت نوش جان کر چکے تھے۔ جنوب مشرقی سمت سے خلیفہ نعوذ باللہ کے باجگزار ملک وقوم کے غدار اور ابوتیمّم کے سرکش شتر سوار علم بغاوت بلند کیے ہوئے اشبیلیہ کے دروازے پر دستک دے رہے تھے۔ شمال مغربی محاذ پر چنگیز خان کا لنگڑا نواسا چالاکو خان اپنے پچاس ہزار درندہ صفت سپاہیوں کے ساتھ اشبیلیہ پر آخری حملے کے لیے مناسب گھڑی کا انتظار کر رہا تھا۔

سعید بن مجید نے اپنے باد رفتار مشکی گھوڑے پر سوار ہو کر باری باری سب محاذوں کا دورہ کیا۔ اپنی ولولہ انگیز تقریروں سے مجاہدین کے حوصلوں کو پھر سے ابھارا۔ شمال مغربی محاذ پر اس نے فوج کو کیل کانٹوں سے لیس کیا۔ اس کی صف برائی کی اور ظہر کی نماز کے بعد مشکی گھوڑے پر سوار اسلام کے جانبازوں سے ان الفاظ میں مخاطب ہوا: ''اللہ اور رسول کے مجاہدو! آج تمھاری شجاعت اور ایمان کی آزمائش کا دن ہے۔ تم نہیں جانتے کہ کن جری اور بہادر اسلاف کا خون تمھاری شریانوں میں دوڑ رہا ہے۔ دیکھو ان کے نام کو آج بٹہ نہ لگنے پائے، ورنہ آنے والی نسلیں تم پر ہمیشہ لعنت بھیجیں گی اور تمھارا ذکر آتے ہی شرم سے اپنی گردنیں جھکا لیں گی۔ اگر تمھاری رگوں میں اسلام کی عظمت کا احساس بالکل مردہ نہیں ہوا، اگر تمھارا خونِ حمیت بالکل ہی منجمد نہیں ہوا، تو تم چالاکو خان کے تاتاری بھیڑیوں کے دانت اپنی خون آشام تلواروں سے کھٹے کر دو اور انھیں ایسا سبق دو کہ وہ دوبارہ ادھر کا رخ نہ کریں۔''

اسی طرح وہ دوسرے محاذوں پر پہنچا اور مشکی گھوڑے پر سوار اس نے کم وبیش یہی بات وہاں کی افواج سے بھی کہی۔ اس کی فصاحت اور شجاعت سے لبریز تقریروں نے ہر جگہ سپاہیوں کے اندر نیا ولولہ پیدا کر دیا۔ جہاں کہیں وہ جاتا عوام اسے اشبیلیہ کا نجات دہندہ سمجھ کر اس کی قبا کو فرط عقیدت سے بوسہ دیتے اور اسے سر آنکھوں پر بٹھاتے۔

سعید بن مجید مغربی محاذ پر چالاکو خان کے ٹڈی دل لشکر کی روک تھام کے لیے افواج اور رضا کاروں کی تنظیم کرنے میں مشغول تھا کہ اس کے پاس ایک حوصلہ شکن خبر پہنچی۔ اشبیلیہ کے بعض امرا اور سپہ سالار انور بن اللہ دتا کی غداری سے سلطان ابن الجابر بن خمیرہ اور یک چشم بطلیموس کے فوجی دستے اشبیلیہ میں داخل ہو گئے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ خلیفہ نعوذ باللہ کے باجگزار ابوتیمّم کے بدوی شہر کی مغربی فصیل کو منجنیق سے منہدم کرنے کے بعد شہر کے اندر گھس آئے تھے۔ یہ منحوس خبر اُسے قاضی ابو مصلح کی زبان سے

معلوم ہوئی۔ قاضی ابو مصلح اشبیلیہ کی جامع مسجد کا خطیب تھا اور وہ سعید بن مجید کو یہ خبر دینے کی خاطر اپنے صبا رفتار گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ہوا یہاں پہنچا تھا۔ دور دور تک قاضی ابو مصلح کے تقوے اور علم کا شہرہ تھا۔ پہلے تو سعید بن مجید کو پیغامبر پر شبہ ہوا کہ ممکن ہے کہ وہ دشمن کا کوئی جاسوس ہو اور اسے اس کی باتوں پر یقین نہ آیا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ یہ شاہسوار قاضی ابو مصلح ہے تو وہ فوراً اپنے گھوڑے پر سے اتر آیا اور بڑھ کر عزت و تکریم کے ساتھ قاضی سے مصافحہ کیا۔ قاضی ابو مصلح نے گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھے بیٹھے سعید بن مجید کے کندھے پر اپنا بزرگانہ ہاتھ رکھا اور کہا، ''اے نوجوان! آج اہل اشبیلیہ نے انتہائی بزدلی اور کم ہمتی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی عزت اور آزادی کا سودا کیا۔ انھوں نے اپنے دشمنوں پر شہر کے دروازے کھول دیے اور شہر کے معززین اور فقیہوں نے دروازوں سے چند قدم آگے بڑھ کر سلطان ابن الجابر بن خمیرہ اور یک چشم بطلیموس کا استقبال کیا۔ ان کی گردنوں میں پھولوں کے ہار پہنائے اور انھیں نہایت عزت و تکریم سے شہر کے اندر لے آئے۔ مگر خلیفہ نعوذ باللہ کے باجگزار ابوتیم نے کھلے پھاٹک سے پرامن طریقے سے داخل ہونے کو اپنے شایان شان نہ سمجھا بلکہ ایک بہادر غنیم کی مانند دیوار میں منجنیق سے شگاف ڈال کر یلغار کرتا در آیا۔ اب یہ تینوں اپنے لشکر کے ہمراہ اشبیلیہ کے اندر ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں اور اہل شہر ان بن بلائے مہمانوں کی خاطر مدارات میں مشغول ہیں۔ شاعروں اور قصیدہ گویوں کی ٹولیاں جابجا اپنے اشعار سناتی ہیں اور عوام سے خراج تحسین وصول کرتی ہیں۔ اہل اشبیلیہ کا ارادہ بھی یہ ہے کہ آج رات اپنے شہر کے فتح ہونے کی خوشی میں چراغاں کریں۔ ابوتیم چراغاں کا بڑا دلدادہ ہے، کیونکہ صحرائی مملکت میں مٹی کا تیل بمشکل دستیاب ہوتا ہے۔ اہل اشبیلیہ جوق در جوق یک چشم بطلیموس کے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہیں اور جامع مسجد کو چھوڑ کر بقیہ سب مساجد کے بے ضمیر خطیب منبروں پر سے اذانوں کی بجائے اس کی فیاضی اور عدل و انصاف کے قصیدے پڑھتے ہیں۔ نوجوان، میرا دل چاہتا ہے کہ زمین کا سینہ شق ہو جائے اور میں اپنے گھوڑے سمیت اس میں سما جاؤں۔''

قاضی کے منہ سے اہل اشبیلیہ کی اس بے حسی اور بے غیرتی کا تذکرہ سن کر سعید بن مجید کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے اپنی خوں آشام تلوار بلند کرتے ہوئے کہا، ''محترم بزرگ! ابھی وہ نامبارک وقت نہیں آیا کہ آپ کا غیور گھوڑا یا آپ زمین میں سما جائیں۔ میرے محسن، آپ گواہ رہیں کہ جب تک اشبیلیہ کے اندر دشمن کا ایک سپاہی بھی موجود ہے، جب تک ایک خوشامدی شاعر اور غزل گو بھی

اپنے فاتحوں کی ستائش میں قصیدے الاپتا ہے، یہ تلوار اپنی نیام میں واپس نہیں جائے گی۔"

قاضی ابو مصلح نے خورد سال مجاہد کو بڑی شفقت سے دیکھتے ہوئے کہا، "شاباش نوجوان! مجھے تم سے یہی امید تھی۔ تمھاری پیشانی تابناک ہے اور تمھارا چہرہ عزم و استقلال کا آئینہ دار ہے۔ خدا نے چاہا تو دنیائے اسلام پر یہ عصبیتوں کے بادل تمھاری باہمت تلوار سے جلد چھٹ جائیں گے۔ نوجوان! سچ سچ بتلاؤ، کیا میری بوڑھی آنکھیں اپنے سامنے اشبیلیہ کے نجات دہندہ سعید بن مجید کو تو نہیں دیکھ رہی ہیں؟"

سعید بن مجید نے ادب سے سر جھکا کر کہا، "جی ہاں، میرا نام سعید بن مجید ہے۔"

بوڑھے قاضی ابو مصلح کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے کہا، "میرے بیٹے! گواہ رہنا کہ جب تک میرے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی باقی ہے، میں تمھارے دوش بدوش کفر و باطل کی افواج کے خلاف سینہ سپر رہوں گا۔ جب تک اشبیلیہ کی جامع مسجد کے احاطے دشمنوں کے ناپاک وجود سے بالکل صاف نہیں ہو جاتے، میں قسم کھاتا ہوں کہ میرے پاؤں اپنے گھوڑے کی رکابوں سے علیحدہ نہیں ہوں گے۔"

سعید نے پوچھا، "محترم بزرگ، اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

قاضی ابو مصلح نے کہا، "نوجوان! میرے ہمراہ مسیلیہ چلو۔ وہاں جامع مسجد کے خطیب ابو فرار ہی عالم اسلام میں واحد ہستی ہیں جن کے پاس ہماری مشکل کا حل ہو سکتا ہے۔ مجھے یقین ہے، شیخ ضرور ہمیں وہ راہ بتا سکتے ہیں جس پر چل کر ہم بالآخر اپنے دشمنوں پر ظفریاب ہو سکتے ہیں۔"

سعید بن مجید قاضی ابو مصلح کے ہمراہ چلنے کے لیے اپنے مشکی گھوڑے پر سوار ہونے لگا تو قدرتاً اسے ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ اپنی تلوار کو نیام میں ڈال لے۔ اس نے ایسا کرنے کے لیے بازو کو اٹھایا ہی تھا کہ اسے یاد آ گیا کہ وہ ابھی ابھی قاضی صاحب کو گواہ ٹھہرا چکا ہے کہ جب تک اشبیلیہ میں دشمن کا ایک بھی فرد جیتا ہے وہ تلوار کو نیام میں نہیں رکھے گا۔ اس نے اپنے بازو کو وہیں روک لیا تھا۔ ایک ہاتھ میں تلوار سونتے وہ اُچک کر اپنے مشکی گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

قاضی ابو مصلح نے کہا، "نوجوان! تلوار کو نیام میں رکھ لو، تمھیں گھوڑا دوڑانے میں دقت ہو گی۔"

سعید بن مجید بولا، "مجاہد کو ہر تکلیف برداشت کرنی چاہیے، اور پھر میں آپ کو قول دے چکا ہوں۔"

"میرا تو اب بھی یہی مشورہ ہے، ویسے تمھاری مرضی۔"

"محترم بزرگ! یہ تلوار اب تو دس ہزار کفار کو موت کی گہری نیند سلا کر ہی نیام میں آرام کرے گی۔"

Scanned with CamScanner

یہ کہہ کر سعید نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور قاضی ابو مصلح کے ہمراہ مسیلیہ کی سمت روانہ ہو گیا۔

سعید بن مجید اور قاضی ابو مصلح گرد میں اٹے ہوئے مسیلیہ کے آہنی پھاٹک پر نماز عشا کے وقت پہنچے۔ پہرے داروں کے افسر نے، جو ایک دراز قد کا بائیس سالہ نوجوان تھا اور جس نے شلوار قمیص پر تانبے کا خود پہن رکھا تھا، ان سے کہا، ''آپ گورنر کے پروانے کے بغیر مسیلیہ میں داخل نہیں ہو سکتے۔''

سعید بن مجید نے تلوار کو سر کے اوپر لہراتے ہوئے جواب دیا، ''ہم کو شیخ ابو فرار سے ایک بے حد ضروری کام کے سلسلے میں چند لمحوں کے لیے ملنا ہے۔ نوجوان! ہمارا راستہ نہ روکو، ورنہ مجھے ڈر ہے کہ کہیں ہسپانیہ میں اسلامی سلطنت کا چراغ ہمیشہ کے لیے گل نہ ہو جائے اور شہدا کی روحیں تمھیں ابد تک بددعائیں نہ دیتی رہیں۔''

نوجوان افسر نے کہا، ''معاف کیجیے گا، ہم حکم کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے۔ آپ کے نام کیا ہیں؟''

سعید نے کہا، ''میرا نام سعید بن مجید ہے اور یہ بزرگ جو میرے ہمراہ ہیں قاضی ابو مصلح، اشبیلیہ کی جامع مسجد کے خطیب ہیں۔''

دراز قامت نوجوان افسر کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چمکنے لگے۔

اس نے پوچھا، ''آپ نے مجھے پہچانا؟'' دونوں چند منٹ ایک دوسرے کی طرف تکتے رہے اور سعید بن مجید گھوڑے سے اُتر کر اور تلوار کو ایک طرف پھینک کر نوجوان افسر سے لپٹ گیا۔

''بھائی شہید! تم یہاں کہاں؟''

''اور بھائی جان سعید! آپ اتنی مدت کہاں غائب رہے؟''

''ابا جان اور امی جان تو بخیریت ہیں؟''

''یہی سوال میں آپ سے پوچھنے والا تھا۔''

''تم کو گھر سے نکلے کتنا عرصہ ہو گیا؟''

''میں ٹھیک ٹھیک نہیں بتا سکتا، بھائی جان، یہی کوئی بارہ سال گزر چکے ہوں گے۔ بس آپ کے جانے کے دو سال بعد میں بھی گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ اس وقت سے ابا جان اور امی جان کی خیریت کی کوئی خبر نہیں ملی۔ نہ جانے وہ مر گئے یا جیتے ہیں۔''

دونوں بھائیوں نے وضو کر کے نماز عشا ادا کی۔ قاضی ابو مصلح بھی کچھ نماز اور کچھ ستانے کے

Scanned with CamScanner

ارادے سے گھوڑے سے اترنے کا ارادہ کررہے تھے، لیکن ابھی ایک پاؤں رکاب میں تھا کہ انھیں اپنا قول یاد آگیا۔ اشبیلیہ کی جامع مسجد کو دشمنوں سے صاف کرنے سے پہلے انھوں نے رکاب سے پاؤں نہ نکالنے کی قسم کھائی تھی۔ کچھ دیر تو وہ بیٹھے رہے، پھر انھوں نے سوچا کہ آخر کب تک وہ سعید بن مجید کے سامنے اپنا قول ہارنے پر تیار نہ ہوں گے۔ آخر انھوں نے ایک ترکیب سوچی۔ انھوں نے یہ قول دیا تھا کہ وہ رکاب سے اپنے پاؤں علیحدہ نہ کریں گے۔ اگر وہ کسی طرح رکابوں کو تھام لیں اور پھر انھیں اپنے موزوں میں پنجوں کی طرف سے پھنسا لیں تو ان کو چلنے میں دقت تو ہوگی لیکن ان کی قسم نہیں ٹوٹے گی۔

برسوں کے بچھڑے بھائی سعید بن مجید اور شہید بن مجید نماز کے بعد دیر تک اپنی سرگزشت ایک دوسرے کو سناتے رہے۔ شہید بن مجید بار بار بھائی سے پوچھتا کہ آخر قاضی ابو مصلح گھوڑے پر سے کیوں نہیں اترتے۔ یہ دونوں کے لیے اچنبھے کی بات تھی۔

سعید نے کہا، ''عزیزم، ہم کو شیخ ابو فرار سے ملنا ہے۔ کیا تم ہمیں ان کے گھر تک پہنچا سکتے ہو؟''

''بھائی جان، میری خواہش تو یہی تھی کہ آپ کچھ عرصے میرے پاس رہتے، لیکن چونکہ آپ ایک ضروری مہم پر ہیں اس لیے میں اصرار نہیں کرتا۔ چلیے، میں آپ کو شیخ کے مکان تک پہنچا آتا ہوں۔ خدا کرے وہ مکان پر ہوں۔''

''کیوں؟ کیا تمھیں ان کے مکان پر ہونے میں کچھ شک ہے؟''

''ہاں بھائی جان۔ وہ آج کل گورنر ابو قلندر کے عتاب میں ہیں۔ یہ ابو قلندر چند ناعاقبت اندیش اور خود غرض امرا کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا ہوا ہے۔ یہ لوگ اسے غلط مشورے دیتے رہتے ہیں۔ وہ فقیہوں اور علمائے کرام کا مذاق اڑاتا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ شیخ فرار نہ ہو گیا ہو۔''

''خدا نہ کرے۔''

رات کے تیسرے پہر تہجد سے فارغ ہونے کے بعد یہ دونوں بھائی اور قاضی ابو مصلح گھوڑوں کو ان کی باگوں سے پکڑے، شیخ ابو فرار کے دو منزلہ مکان پر پہنچے۔ شیخ کا مکان جامع مسجد کے عقب میں واقع تھا۔

گورنر ابو قلندر کے چھ سیاہ فام حبشی سپاہی شیخ کے مکان کے دروازے پر نیزے تانے پہرہ دے رہے تھے۔ ان میں سے ایک غالباً حوالدار میجر تھا۔ اس کے دائیں برہنہ بازو پر دو سفید دھاریاں تھیں۔

Scanned with CamScanner

حوالدار میجر نے لنگوٹی پہن رکھی تھی۔ باقی سب ننگے تھے۔

حوالدار میجر نے پکارا، ''ٹھہرو! کون آتا ہے؟ جواب دو، ورنہ تیسرے سوال کے بعد ہم کو نیزہ مارنے کا حکم ہے۔''

سعید بن مجید نے شہید بن مجید اور قاضی ابو مصلح کو رکنے کا اشارہ کیا اور پھر تلوار سونت کر بجلی کی پھرتی کے ساتھ حبشی پہرے داروں پر ٹوٹ پڑا۔ وہ اس اچانک حملے کے لیے تیار نہ تھے۔ چند لمحوں میں سات خون آلود لاشیں گلی کے فرش پر ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھیں۔

سعید بن مجید اور شہید بن مجید حبشیوں کی لاشوں کو گھسیٹ کر ساتھ بہتی ہوئی بدرو میں پھینکنے میں مصروف تھے کہ مکان کی چھت سے آواز آئی، ''میرے محسنو، السلام علیکم۔''

سعید نے سر اٹھا کر دیکھا تو چھت کی شہتیر سے ایک سفید ریش بزرگ کو الٹے لٹکتے ہوئے پایا۔

سعید نے پوچھا، ''محترم بزرگ، آپ کون ہیں؟''

سفید ریش بزرگ نے کہا، ''برخوردار! پہلے مجھے نیچے اتارو۔ تعارف بعد میں ہو جائے گا۔''

''پہلے آپ بتائیں کہ آپ کون ہیں اور یہاں کیا کر رہے ہیں؟''

''برخوردار! نوجوانوں کی کٹ حجتی اور نادانی کوئی مستحسن چیز نہیں۔ تم اصرار کرتے ہو تو تمھیں معلوم ہو کہ میرا نام شیخ ابوفرار ہے اور ابوقلندر کے حبشیوں نے مجھے شہتیر سے پیروں کے بل لٹکا دیا تھا۔ اس حالت میں لٹکتے ہوئے مجھے دو گھنٹے ہو چکے ہیں۔''

سعید بن مجید نے عقیدت مندانہ لہجے میں کہا، ''شیخ ابوفرار آپ ہیں! ہم آپ سے ایک بے حد ضروری مشورہ کرنے آئے ہیں۔ امید ہے کہ آپ، جو کہ ہمارا اس وقت واحد سہارا ہیں، ہماری رہنمائی کر سکیں گے۔ آپ کو یہ سن کر افسوس ہوگا کہ یک چشم بطلیموس، سلطان ابن الجابر بن خمیرہ اور ابوتیم کے خونخوار بھیڑیے اس وقت اشبیلیہ پر قابض ہیں اور ہماری تہذیب کا آخری چراغ گل ہو چکا ہے۔ آپ کی مشعل عظیم اسے روشن کر سکتی ہے۔''

''برخوردار! میں اس حالت میں کچھ نہیں کر سکتا۔ پہلے مجھے نیچے اتارو، پھر جتنے چاہو گے چراغ روشن کروں گا۔''

قاضی ابو مصلح نے رکاب میں پھنسے ہوئے موزوں سے بمشکل چلتے ہوئے کہا، ''شیخ! ہم آپ کو

Scanned with CamScanner

ساتھ لینے آئے ہیں۔"

"اس حالت میں میں کیسے چل سکتا ہوں، قاضی ابو مصلح؟"

سعید بن مجید نے تلوار کے ایک بھرپور وار سے اس رسے کو کاٹ دیا جس سے شیخ ابوفرار لٹکے ہوئے تھے۔ شیخ کھوپڑی کے بل پختہ فرش پر گرے اور ان کی کھوپڑی زخمی ہوگئی۔ قاضی ابو مصلح نے، جو اشبیلیہ کے نامی طبیب بھی تھے، اپنی دستار کو پھاڑا اور فوراً زخم پر پٹی باندھ دی۔

شیخ کو تھوڑی دیر بعد کچھ ہوش آیا تو اس نے اشارے سے سعید بن مجید کو پاس بلایا۔ شفقت سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا: "برخوردار! تمھارا نام کیا ہے؟"

"نیاز مند کو سعید بن مجید کہتے ہیں۔"

"برخوردار! میں نے تمھارا شہرہ سن رکھا ہے۔ ملارس کے محاصرے میں جو کارہائے نمایاں تم نے سر انجام دیے اور جس طرح تم نے تن تنہا دو ہزار فرنگی سپاہیوں کے چھکے چھڑا دیے، وہ واقعہ بھی میرے کانوں تک پہنچ چکا ہے۔ خرطوم میں آپ نے جس طرح اسلامی فوج کے علم کو سرنگوں ہونے سے بچایا، وہ بھی مجھے معلوم ہے۔ آپ کی زیارت کا بہت اشتیاق تھا۔ الحمدللہ کہ وفات سے پہلے یہ آرزو بھی پوری ہوئی۔"

شیخ! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ آپ اسلام کے بطل عظیم ہیں۔ شیخ، اب بیٹھنے کا وقت نہیں۔ ہم آپ کو ساتھ لینے آئے ہیں۔ اشبیلیہ پر کفار کے لشکر قابض ہو چکے ہیں۔"

"برخوردار! میں ساتھ چلنے کے لیے بالکل تیار ہوں۔ گھوڑوں کا انتظام ہو جانا چاہیے۔ میری اکلوتی بیٹی بھی میرے ساتھ جائے گی۔ میں اسے یہاں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ بیٹا، دروازے پر دستک دو اور اسے اطلاع دو کہ وہ ایک بہادر اور غیور باپ کی بیٹی کی طرح زرہ بکتر اور اسلحہ سے لیس ہو کر تیار ہو جائے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ آج اشبیلیہ کے بازاروں اور گلی کوچوں میں خون کے وہ سیلاب ہوں گے کہ اس کی سرخی صدیوں تک دھل نہ سکے گی۔"

شہید بن مجید چوکی پر سے دو تازہ دم گھوڑے لانے چلا گیا۔

سعید بن مجید کے دروازے پر دستک دینے پر ایک مشعل بردار خاتون نے دروازہ کھولا جو حسن اور رعنائی کی مکمل تصویر تھی۔ سعید نے فرش پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا:

"معزز خاتون! آپ ہی شیخ ابوفرار کی بیٹی ہیں؟"

Scanned with CamScanner

''جی ہاں۔ میرے والد اب کیسے ہیں؟ آپ کون ہیں؟''

''اس کا اب وقت نہیں۔ جلدی تیار ہو جائیں۔ آپ کے والد کا حکم ہے کہ جنگی لباس پہن کر باہر آ جائیے۔ مکان کو مقفل کرنے کی ضرورت نہیں۔''

تھوڑی دیر میں ایک زرہ پوش نوجوان، خوب رو، ترکش سے مسلح، مکان سے باہر نکل آیا۔ سعید بن مجید نے اس نوجوان کو حیرت سے دیکھا تو اس کے پھول جیسے چہرے پر نسوانی شرم و حیا کی لہریں پھیل گئیں۔ اتنے میں شہید بن مجید دو تازہ دم تازی گھوڑے لے آیا۔ افق مشرق پر صبح کا ستارہ طلوع ہو رہا تھا۔ صبح کی نماز سے فارغ ہوتے ہی یہ قافلہ مسیلیہ کے مغربی دروازے سے نکل کر طنبوریہ کی سڑک پر روانہ ہو گیا۔ دو گھڑی دن چڑھے جانباز مجاہدوں کا یہ چھوٹا سا قافلہ طنبوریہ کے مشرقی دروازے سے شہر میں داخل ہوا۔ طنبوریہ کے لوگ بازاروں اور مکانوں کی چھتوں پر کھڑے ہو کر اشبیلیہ کے نجات دہندہ کو دیکھ رہے تھے۔ سعید بن مجید کے چہرے پر ایک نوزائیدہ بچے کی سی دل فریبی، نیم روز کے سورج کا سا جاہ و جلال، شیر ببر کا سا دبدبہ اور صبح کے ستارے کی سی صباحت اور طہارت تھی۔ لوگ بڑھ بڑھ کر اس سے پوچھتے کہ آپ کہاں سے آئے ہیں؟ وہ نرمی سے کہتا کہ ''مسیلیہ سے۔'' اس پر لوگ اصرار سے کہتے کہ آپ ہمارے مکان میں ٹھہریے۔ چوراہے پر پہنچ کر سعید بن مجید نے اپنے وفادار مشکی پر سے ایک چھوٹی سی تقریر میں اہل طنبوریہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا، ''بھائیو اور بزرگو! آج میں طنبوریہ کے لوگوں کے پاس ضروری پیغام لے کر آیا ہوں۔ ہمیں فوراً اشبیلیہ جانا ہے۔ میرا پیغام سن لو، مجھ پر عنایت ہوگی۔ میرا پیغام ہے کہ اے طنبوریہ کے لوگو! آج وہ دن آ گیا ہے کہ تم اپنے طنبورے اور ساز توڑ دو اور شمشیر و سناں سے لیس، کٹ مرنے کے لیے نکل پڑو۔ اشبیلیہ کے در و دیوار تمہارے گھوڑوں کی آہٹ کے منتظر ہیں۔''

شیخ ابو فرار اور قاضی ابو مصلح نے بھی اہل طنبوریہ سے خطاب کیا۔ کمسن لڑکے، نوجوان، بوڑھے ایک نئے جذبے سے سرشار ہو کر جوق در جوق ان کے قافلے میں شامل ہوتے گئے اور جب وہ جامع مسجد میں ظہر کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد شہر کے شمالی دروازے سے نکلے تو طنبوریہ کے اسی فی صد لوگ تیر اور کمان، نیزے اور سنان اٹھائے ان کے ساتھ تھے۔ بعض زندہ دل لوگ شہر کی دو منجنیقوں اور ایک دمدمے کو بھی ساتھ لیتے آئے تھے جو بڑی مدت سے بے کار پڑے تھے۔

فجر کی نماز کے وقت وہ اشبیلیہ کی دیواروں کے قریب پہنچ گئے۔ سعید بن مجید نے گھوڑے پر

Scanned with CamScanner

بیٹھے بیٹھے اپنی فوج کا معائنہ کیا۔ ان کی صفوں کو آراستہ کیا۔ وہ طلوع آفتاب کا منظر دیکھ رہا تھا کہ ایک زرہ پوش سوار اس کی طرف گھوڑا دوڑاتا آیا۔ سوار قریب پہنچا۔ سعید نے اسے پہچان لیا۔ یہ حسین سوار شیخ ابوفرار کی شجاع اور غیور بیٹی زہرہ بی بی تھی۔

"سالارِ محترم! میں آپ سے درخواست کرتی ہوں کہ مجھے بھی حملے میں شریک ہونے کی اجازت دیں۔ میں تیر چلانا جانتی ہوں۔"

سعید بن مجید نے کہا، "زہرہ بی بی، بے وقوف نہ بنو۔ تمھارے ذمے زخمیوں کی دیکھ بھال کا کام ہے۔"

پھر سعید کچھ سوچ کر شیخ ابوفرار کی تلاش میں چل کھڑا ہوا۔ شیخ اپنی کمان کھینچتے ہوئے ایک بوڑھے سالار سے محو کلام تھا۔

سعید بن مجید نے کہا، "شیخ! میں آپ سے علیحدگی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔"

شیخ نے کہا، "ارشاد۔"

سعید نے سپاہیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "یہاں نہیں، یہاں بہت سے لوگ جمع ہیں۔"

شیخ نے کہا، "بہت اچھا۔ جہاں دل چاہے لے چلو۔"

وہ چلتے گئے یہاں تک کہ اندھیرا ہو گیا۔

شیخ نے کہا، "یہاں بات ہو سکتی ہے۔"

سعید نے کہا، "ابھی ہمیں اور چلنا ہے۔"

وہ چلتے گئے یہاں تک کہ ماہتاب طلوع ہو گیا۔ آخر شیخ نے سعید بن مجید سے کہا:

"تم کیا بات کہنا چاہتے ہو؟"

"آپ وعدہ کریں کہ آپ برا نہیں مانیں گے۔"

"انشاءاللہ!"

"وہ بات ایسی ہے کہ اگر میرے والدین موجود ہوتے تو آپ سے کرتے۔"

"اوہو! نوجوان، کوئی ایسی بات ہے؟"

"ہاں ایسی ہی بات ہے۔"

Scanned with CamScanner

''اچھا کہو۔''

''دیکھیے، شیخ! میں آپ کی لڑکی زہرہ بی بی کو اپنی زوجیت میں لانا چاہتا ہوں۔''

شیخ ابو فرار نے ہنستے ہوئے کہا، ''برخوردار اتنی سی بات کے لیے مجھے اتنی دور کھینچ لائے! ہم اس وقت لشکر سے پانچ میل دور نکل آئے ہیں۔''

''تو پھر آپ مجھے اپنی فرزندی میں قبول کرتے ہیں؟''

''خاطر جمع رکھو برخوردار۔ میں تمھارے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔ میں کوشش کروں گا کہ تمھارا نکاح جلد ہو جائے۔''

ساری رات سعید بن مجید اور اس کا چھوٹا بھائی شہید بن مجید منجنیق کی مدد سے شہر کی فصیلوں پر سنگ باری کرتے رہے۔ دو ہزار آدمی قلعے میں سرنگ ڈالنے پر مامور کر دیے گئے۔ دشمن کی طرف سے کسی قسم کا جوابی حملہ نہیں ہوا۔ علی الصباح سعید بن مجید نے دیکھا کہ دیواریں جوں کی توں مستحکم کھڑی ہیں اور ان پر سنگ باری کا ذرہ برابر اثر نہیں ہوا۔ بعد میں پتا چلا کہ منجنیق کے گولے دیوار سے کچھ ادھر ہی رہ گئے ہیں۔ منجنیق کچھ پرانے ڈیزائن کی تھی۔

وہ پھر زور شور سے شہر پر چڑھائی کی تیاریاں کر رہے تھے کہ گدھے پر بوریاں لے کر ایک چھوٹا سا آدمی وہاں سے گزرا۔

اس نے کہا، ''خواہ مخواہ شہر کی دیوار کیوں ڈھا رہے ہو؟''

سعید بن مجید نے کہا، ''ہم دشمنوں پر حملہ کر رہے ہیں جو قلعہ بند ہیں۔''

گدھے والے آدمی نے، جو شاید کمہار تھا، کہا، ''دشمن؟ نوجوان، کیا باتیں کر رہے ہو؟ اس شہر میں دوست یا دشمن کوئی بھی نہیں رہتا۔ وہاں میرا ایک جھونپڑا ہے۔ کیا اس کو منہدم کرنے کا خیال ہے؟''

''تو کیا یہ شہر اشبیلیہ نہیں ہے؟''

کمہار ہنسا۔ ''اشبیلیہ! تم نے اسے اشبیلیہ سمجھا؟ یہ خوب مذاق رہا۔ برادرم، گھاس تو نہیں چر گئے؟ اشبیلیہ تو پچاس کوس جنوب میں ہے۔''

سعید بن مجید یہ خبر سن کر بے ہوش ہو گیا۔

(افکار، کراچی، نومبر ۱۹۸۹ء)

Scanned with CamScanner

ایک لکھنے والے کی نوٹ بک

Scanned with CamScanner

ریت پر لکیریں

قوم میں اس وقت دولت کی بھرمار ہے۔ روپے کی جتنی ریل پیل اس دور میں اس ملک میں ہے، اسے پہلے کبھی نصیب نہیں ہوئی۔ ہم یقیناً دنیا کے خوشحال ترین ممالک میں سے ہیں۔ بعض لوگ اب بھی بربڑاتے ہیں، حالانکہ مال روڈ پر چمکیلی کاروں کا جلوس تھمنے میں نہیں آتا اور دکانیں رنگا رنگ پارچات، کاسمیٹکس، جواہرات اور مال و اسباب سے بھری پڑی ہیں۔ پٹرول پمپوں سے تیرہ روپے فی گیلن کی قیمت کا چشمہ ہر وقت بہتا رہتا ہے۔ کار کی ٹینکی میں جتنا دل چاہے ڈلوالو، کوئی کچھ نہیں کہتا۔ اس پر بھی اگر ہم ناشکری کریں تو کتنے افسوس کا مقام ہے۔ حقیقت میں ہماری پانچوں گھی میں ہیں اور سر کڑھائی میں ہے۔ سر کے کڑھائی میں ہونے میں تو قطعاً کوئی شک ہی نہیں۔

اس خوش قسمت قوم کے لیے اب روپیہ پیسہ ہاتھ کا میل ہے۔ لوگ بیٹھے بیٹھے یا کھڑے کھڑے سو دو سو روپے یوں خرچ کر ڈالتے ہیں جیسے گھر میں نوٹ چھاپنے کی مشین لگی ہو۔ اگلے دن میں نے گلبرگ کی مین مارکیٹ میں ایک تربوز کے سے سر والے چھوٹے سے آدمی کو دو تربوز، چار پپیتے، پانچ غیر موسمی آم اور ایک درجن کیلے اسّی روپے میں خریدتے ہوئے دیکھا۔ اس نے دکان دار کو سو روپے کا نوٹ دیا اور چینج لینے کے جھمیلے میں پڑے بغیر وہاں سے چلتا بنا۔ یہ ہے اصل مرفہ الحالی اور فارغ البالی۔ ہم اپنی خوش بختی پر جتنا بھی فخر و غرور کریں کم ہے۔

اس مہینے کی پہلی کو میں اپنی جیب میں چار سو روپے کی گڈی ٹھونسے بچوں کو قریب کی مارکیٹ میں سیر کرانے لے گیا۔ بچوں نے آرسی کولا پیا، پولکا آئس کریم کھائی اور تین چار بچوں کی کتابیں، سارا کی اسکول یونیفارم کے لیے کپڑے اور چائے، کافی، سرف کی قسم کی چند گھریلو اشیائے خورد و نوش خریدیں۔ واپسی پر اپنی موٹر کار میں جو ایک گیلن میں سات میل طے کرتی ہے، تین گیلن پٹرول ڈلوایا۔ گھر پہنچ کر دیکھا کہ گڈی میں دو دس دس کے نوٹ اب بھی موجود تھے۔ میں بھی روپے کو ہاتھ کا میل سمجھتا ہوں،

Scanned with CamScanner

چنانچہ اسی وقت حساب برابر رکھنے کے لیے لڑکے کو نیچے گولڈ لیف کنگ سائز کے دو پیکٹ لانے کے لیے بھیجا۔ بیوی نے بچی سارا کے اسکول کا بل لا کر دیا۔ میں نے اسے عینک لگا کر بڑی دلچسپی سے پڑھا۔ بل چار سو انچاس روپے پچاس پیسے کا تھا۔ اس مہینے کے لیے میرے پاس بعد منہائی اخراجاتِ مذکورہ کل اثاثہ بائیس روپے بچا ہے اور اب اپنے دوستوں سے ادھار مانگنے کی سوچ رہا ہوں۔ بدقسمتی سے گھر میں نوٹ بنانے والی مشین نہیں ہے۔

اور پچھلے دنوں ہی میرے ایک جگری دوست (چار پانچ اور بھی ہیں) نے اپنے ہوٹل سے ریلوے اسٹیشن جانے کے لیے ٹیکسی لی۔ ٹیکسی کا میٹر کام نہیں کرتا تھا، اس لیے ٹیکسی ڈرائیور نے اس کے اوپر ایک غلاف چڑھا رکھا تھا۔ اسٹیشن پہنچ کر میرے دوست نے پوچھا، "کتنا کرایہ بنا؟" ٹیکسی ڈرائیور نے کہا، "پینتالیس روپے ہوئے سرکار، ویسے آپ جو چاہیں دے دیں۔" میرے دوست نے کرائے کی معقولیت پر آنکھ جھپکے بغیر اسے پچاس روپے کا نوٹ تھما دیا اور چینج رکھنے کی ہدایت کی۔ (یہ میرا دوست پندرہ بیس برس پہلے کراچی میں ٹائیکون تھا۔ وہ آج کل قدرے تہی دست ہے مگر ٹائیکونوں کو پرانی روایت کا نبھانا لازم ہے۔) روایت نبھانے کے بعد اس نے کہا کہ اس کے پاس کراچی کے ٹکٹ کے پیسے نہیں بچے۔ اس وجہ سے وہ اپنے جانے کو ملتوی کرنا چاہتا تھا، مگر میں نے اور دوسرے دو دوستوں نے جو وہاں موجود تھے، اسے اس ارادے سے باز رکھا۔ ہم نے مل جل کر بخوشی چار سو روپے اکٹھے کیے، اسے کراچی کا فرسٹ کلاس کا ٹکٹ خرید دیا اور چینج کو دوسرے اخراجات کے لیے رکھنے کی ہدایت کی۔ وہ ضرور خیر و عافیت سے کراچی پہنچ گیا ہوگا، اگرچہ ہمیں اس کی کوئی خبر نہیں ملی۔

مختصراً ہم بڑے بابرکت، معجزنما معاشی آسودگی کے دور میں سے گزر رہے ہیں اور مستقبل کا مورخ جب روپے کے معاملے میں ہماری دریا دلی کا ذکر کرے گا تو آنے والی نسلیں یقین نہیں کریں گی ـــــ یعنی اگر کوئی آنے والی نسلیں ہوئیں تو!

۲

میں ان لوگوں سے اتفاق نہیں کرتا جو تعلیم کو قوم کے نونہالوں کے لیے سخت مضرت رساں بلکہ مہلک گردانتے ہیں اور اس بنا پر مطالبہ کرتے ہیں کہ اسے فوراً ختم کر دیا جائے۔ میرا خیال ہے، تعلیم کو

جاری رہنے دینے میں کوئی حرج نہیں۔ آخر ہم پچھلے سو سال سے اسکول، کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم سے فارغ التحصیل ہوتے رہے ہیں اور ہمارا کچھ نہیں بگڑا۔ اور پھر تعلیم اور امتحانات کو ختم کر دینے سے استادوں، پروفیسروں، ڈاکٹروں اور امتحان دینے والے طلبا کے نگرانوں کے لشکر کا کیا بنے گا۔ ماہرین نصاب، ارکانِ سینیٹ اور وائس چانسلر اپنے عالی مقدار مناصب سے سبکدوش ہو کر گھر بیٹھ جائیں گے۔ ان حضرات کو ان کے ماہانہ وظائف سے یکسر محروم کر دینا بڑا ظلم ہوگا۔ آخر ان کے بیوی بچے ہیں۔ بے شک اسکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں کی عمارتوں کا بہتر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ وہ جوڈو اور کراٹے کے مخلوط تربیتی اکھاڑوں میں بہ آسانی تبدیل کی جاسکتی ہیں۔ (کیا لطف رہے گا!) یہ اکھاڑے ایک یونیورسٹی سے منسلک کیے جاسکتے ہیں جس کی وائس چانسلری کے لیے ہانگ کانگ کے کسی آدمی کی خدمات مستعار لی جاسکتی ہیں۔ نہیں، میں مذاق نہیں کر رہا۔ نئی پود جوڈو اور کراٹے کے شوق میں دیوانہ ہو رہی ہے اور بہت سے لوگ اب اس امر پر یقین کرنے لگے ہیں کہ اس ملک کے مستقبل کی امید جوڈو اور کراٹے میں مضمر ہے... ان عمارتوں کو سوشلزم کے تقاضوں کو پورا کرنے کی خاطر (آخر ہم ایک سوشلسٹ ملک ہونے کے دعوے دار ہیں) مجھ جیسے پیرانہ سال پنشن یافتہ لوگوں کے لیے خیراتی گھروں میں بھی بدلا جاسکتا ہے جہاں ہمیں کام کیے بغیر تین وقت کی روٹی ملا کرے گی اور ہم اپنی اپنی کیاری میں گلاب کے پودوں کو سینچیں گے اور ایک دوسرے کو اپنے بچپن اور ایامِ شباب کے جھوٹے سچے قصے سنا سنا کر اچھی طرح زچ کیا کریں گے۔ ہالوں اور کامن روموں میں جدید آرٹ کی عریاں تصویریں آویزاں کی جاسکتی ہیں۔ ایک ماہرِ نفسیات کی تحقیق کے مطابق بوڑھوں کے لیے وقتاً فوقتاً عریاں تصویروں سے دل بہلانا ایک معصوم، بے ضرر مشغلہ ہے اور اس سے ان کی عمر بڑھتی ہے۔

ہم موضوع سے ہٹ چلے ہیں جو تعلیم اور امتحانات تھا... اب جیسا کہ سب جانتے ہیں تعلیم کے حصول کے لیے امتحان پاس کرنا سخت ضروری ہے۔ اس کے برعکس امتحان پاس کرنے کے لیے تعلیم حاصل کرنا قطعاً ضروری نہیں۔ اپنے مطلب کی وضاحت کے لیے میں چراغ دین کی مثال دیتا ہوں۔

یہ چراغ دین میرا دھوبی ہے — یا تھا — اور دو سال پہلے جب وہ میری دھلائی لے جانے لگا تو الف کے نام لٹھ نہ جانتا تھا۔ پچھلے دنوں وہ دھلائی دینے کے لیے آیا تو اس کی آنکھوں میں ایک غرور و افتخار کی کیفیت تھی اور اس کا سارا انداز بدلا ہوا تھا۔ اُس نے اپنی قمیص کی جیب میں سے ایک لمبا سا چھپا ہوا

Scanned with CamScanner

کاغذ نکالا اور میری طرف بڑھایا۔ یہ ایک یونیورسٹی کی سند تھی جس پر وائس چانسلر کے دستخط تھے۔ سند کے مطالعے سے مجھ پر منکشف ہوا کہ چراغ دین نے اس سال بی اے کا امتحان سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا ہے۔ وائس چانسلر کے چھپے ہوئے دستخط اصلی معلوم ہوتے تھے۔ میں نے متعجب ہو کر اس سے پوچھا کہ یہ سند کیونکر اس کے ہاتھ لگی۔ اس نے بتایا کہ اس نے اسے ایک شخص فیروز خاں سے، جو یونیورسٹی میں چپراسی ہے، ایک ہزار کچھ روپے دے کر حاصل کیا ہے۔ میں نے چراغ دین کو اتنی آسانی سے بی اے کر لینے پر مبارک باد دی۔ اس نے کہا کہ وہ اب پنجابی میں ایم اے اور پھر ڈاکٹریٹ کا سوچ رہا ہے، مگر فیروز خاں نے اسے بتایا ہے کہ اس کے لیے ابھی دو سال اور انتظار کرنا ہوگا۔ میں نے مناسب الفاظ میں اس کی حوصلہ افزائی کی۔ اس چراغ دین بی اے نے دھلنے کے کپڑے لے جانے سے معذوری ظاہر کی۔ اس نے اپنے آبائی پیشے کو خیر باد کہہ دیا تھا... چراغ دین کے نقش قدم پر چل کر ہمارے اردگرد بہت سے لوگ یکا یک بی اے، ایم اے، پی ایچ ڈی وغیرہ ہو رہے ہیں اور اگر یہ رفتار جاری رہی تو اگلے آٹھ دس سال میں اس ملک کی آدھی آبادی کسی نہ کسی یونیورسٹی کی سند یافتہ ہو چکی ہوگی۔ ڈاکٹر شمار قطار میں نہیں آئیں گے اور ان سے آنکھ بچا کر نکلنا محال ہوگا۔

تعلیم کا بنیادی مقصد (میری حقیر سمجھ کے مطابق) اپنے نام کے پیچھے بی اے، ایم اے کی لین ڈوری لگانا ہے (اس کے لیے البتہ چراغ دین کی طرح امتحان پاس کرنا بھی شرط ہے)۔ امتحان پاس کر لینے کے بعد کسی کتاب کو ہاتھ لگانا سخت نادانی ہے۔ ڈاکٹریٹ، بیچلر آف آرٹس، ماسٹر آف آرٹس وغیرہ کی سند حاصل کرنے کے بعد تم اپنی ملازمت کے لیے درخواست کا فارم، شناختی کارڈ کا فارم، پاسپورٹ کی درخواست کا فارم، انکم ٹیکس ریٹرن کا فارم خود پُر کر سکتے ہو۔ کسی دوسرے کی منت کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ خصوصاً انٹرویو بورڈ کے سامنے جانے کے لیے سندات کی استعداد کا ہونا اشد ضروری ہے۔

بورڈ: کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ کی تعلیمی اور ٹیکنیکل کوالیفکیشن کیا ہیں؟

تم: میرے درخواست کے فارم میں جو آپ کے سامنے دھرا ہے، ان کا مکمل اندراج ہے، اسے ایک نظر دیکھ لیجیے۔

بورڈ: آپ نے بی اے کس ڈویژن میں کیا تھا؟

تم: بی اے تو تھرڈ ڈویژن کیا تھا مگر اس کے بعد ایم اے فرسٹ ڈویژن میں کیا ہے۔ ڈاکٹریٹ

Scanned with CamScanner

کے لیے تھیسس پیش کر چکا ہوں۔

بورڈ: ٹیلی فون کس نے ایجاد کیا تھا؟

تم: یہ سوال میرے نصاب سے باہر ہے لیکن جناب میں کوشش کرتا ہوں — شاید — جولیس سیزر نے!

بورڈ: ٹائپ اور شارٹ ہینڈ کی رفتار کیا ہے؟

تم: کوئی رفتار نہیں، یہ دونوں مضامین میرے کورس میں شامل نہیں تھے۔

بورڈ: تمھاری تقرری بطور ٹیلی فون آپریٹر کی جاتی ہے۔ کل سے ڈیوٹی پر رپورٹ کر دو — اگلا آدمی!

تم: (کھڑے ہو کر سیلوٹ کرتے ہوئے) شکریہ جناب!

یہ سب کچھ تعلیم اور امتحانات کے بغیر بالکل ناممکن ہے!

۳

اور یہ ایک بڑے سرکاری افسر یا صنعت کار یا سیاست داں کی خیالی یادداشت ہے جو دنیائے سخن میں ناموری کا خواہاں ہے:

حال ہی میں باغ علی ناشرین نے مجھ سے فرمائش کی ہے کہ میں اپنے سوانح حیات یا اپنی جملہ تصنیفات کا مجموعی ایڈیشن ترتیب دوں اور اسے اپنے خرچ پر ان کے مکتبے سے شائع کراؤں۔ انھوں نے مجھے کتاب کے طبع ہونے پر دس جلدیں مفت اور ہر فروخت شدہ کتاب پر پانچ فی صد رائلٹی دینے کا وعدہ کیا ہے۔ اپنے گودام میں کتاب کو اسٹاک کرنے کے لیے وہ کچھ چارج نہیں کریں گے۔ انھوں نے معاہدے کا فارم بھی دستخطوں کے لیے مجھے بھیج دیا ہے۔ مختصراً، ناشرین نے اس سلسلے میں جو کچھ وہ کر سکتے تھے، کر دیا ہے۔ میرے لیے اب فقط اپنی سوانح حیات کا لکھنا باقی رہ گیا ہے، جس کے لیے میرے پاس وقت نہیں ہے۔ کوئی اور بھی اسے میری خاطر کرنے کے لیے تیار نہیں۔ جہاں تک میری تصنیفات کا تعلق ہے، وہ اپنے دوستوں کو لکھے ہوئے خطوط، سپاس ناموں اور خطبوں کے ڈرافٹوں، فائلوں میں طویل دفتری چٹھیوں، یادداشتوں پر مشتمل ہیں۔ پانچ چھ ہزار فل اسکیپ صفحات ہوں گے۔

Scanned with CamScanner

ان کو فراہم کرنا اور مجموعی ایڈیشن کے لیے ترتیب دینا جوئے شیر کا لانا ہے۔ دوستوں کو لکھے ہوئے خطوط ان کے پاس پہنچ گئے، وہ یقیناً ان کو ضائع کر چکے ہوں گے، جیسے ان کے میرے نام کے خط اب میرے پاس نہیں۔ فائلوں میں سے پچاس فی صد ریکارڈ روم میں ردّی کی صورت پڑی ہیں اور دیمک انھیں چاٹے جاتی ہے۔ میری زوردار اور طویل یادداشتیں انھی میں درج ہیں۔ کالج کے دنوں میں میں نے سیکڑوں اشعار بھی کہے تھے۔ مظلوم تخلص کرتا تھا۔ وہ بیاض امتدادِ زمانہ سے ضائع ہوگئی۔ بہر حال میں نے باغ علی سے چھ ہزار صفحات کے مجموعی ایڈیشن کی طباعت کا تخمینہ مانگا، انھوں نے دو لاکھ کا بینک ڈرافٹ طلب کیا ہے۔ یہ رقم یقیناً اس مرفہ الحالی کے دور میں بہت معمولی ہے—بس ایک مرسیڈیز کار کی لاگت! میں اپنی ایک مرسیڈیز بیچ ڈالوں گا (میرے پاس دو ہیں) اور انھیں مطلوبہ رقم کا چیک بھجوا دوں گا۔ باغ علی سینئر نے مجھے یہ بھی امید دلائی ہے کہ روپیہ ملنے پر وہ کسی نہ کسی طرح میری تصنیفات کا مجموعی ایڈیشن خود ہی مرتب کرا لیں گے۔ ان کے ادارے میں چند ایک لوگ ایسے ہی کاموں پر مامور ہیں۔ ادب میں شہرت بہر حال اب میری محبوب ترین خواہش ہے جو مجھے کسی پل چین سے نہیں بیٹھنے دیتی—اور پھر ادب میں نام سیاست یا بگ بزنس کے میدان میں آگے بڑھنے میں اکثر بڑا کارآمد ثابت ہوتا ہے... میں ایک مقامی ثقافتی ادارے کے ڈائریکٹر سے بھی ملا ہوں (میں نے اسے اور اس کی بیوی کو جم خانے میں دعوت دی تھی)۔ وہ اپنے ادارے میں میری تصنیفات کے مجموعی ایڈیشن کی پیشگی تعارفی تقریب منعقد کرنے پر رضامند ہو گیا ہے (شیواز ریگل کے تین پیگ پینے کے بعد آدمی تمھارے لیے جان دینے کی قسمیں کھانے لگتے ہیں) اگرچہ ایسی چیز اس ادارے میں پہلے کبھی نہیں ہوئی۔ اس نے مجھے کہا کہ میں اسے اپنی تصنیفات کے نام بتا دوں تا کہ وہ کل ہی دعوت نامے چھپوانے کا اہتمام کر سکے۔ چونکہ اس وقت کوئی نام میرے ذہن میں نہ تھا اور باغ علی کے مرتبین کی ترتیب بھی مجھے معلوم نہ تھی، میں نے ٹال دیا۔ ہم نے اس تقریب کی صدارت کے لیے ایک نیم ادبی، نیم سیاسی شخصیت پر اتفاق کیا جو اس وقت 'سفیری' (safari) پر افریقہ میں گوریلوں کا شکار کھیلنے گیا ہوا تھا اور خود بھی اس مخلوق سے مشابہت رکھتا تھا۔

خیر ہر ایک چیز اب بخوبی طے پا چکی ہے اور چند ہی ہفتوں میں تمھیں میری تصنیفات کی پیشگی تعارفی تقریب کا دعوت نامہ موصول ہو جائے گا۔ تاریخ اور دن کا انتظار کرو۔

Scanned with CamScanner

۴

اواخر مئی کی بھڑکتی ہوئی دھوپ میں سے ہم ایک تنگ لمبی غلام گردش کے جھٹپٹے میں داخل ہوئے۔ یہ ایک مختلف دنیا تھی — عجیب وغریب، فنٹاسٹک اور بے سکون کر دینے والی۔ اردگرد دیواروں پر چوکھٹوں میں بڑی بڑی آئل پینٹنگز تھیں جن کا تاثر روح کو ہلا دیتا تھا اور تمھارے خون کا حصہ ہو کر رگوں میں گردش کرنے لگتا تھا۔ وہ ایک غار کے آدمی کی بنائی ہوئی تصویریں تھیں — ابتدائی، وحشی اوران گھڑ۔ رنگوں میں کہیں شوخی نہ تھی اور کسی تصویر میں شادمانی یا حسن کا بھولے سے دخل نہ تھا۔ ان میں سے چند ایک بڑی تصویریں تھیں۔ ان کے خالق صادقین کے علاوہ کوئی ان کو اس صورت میں سوچ اور ان بے لطف متلی لانے والے رنگوں میں تابدار زندگی نہیں دے سکتا تھا۔ ہم سے ہر ایک کی اپنی دنیا ہے اور میری دنیا وہ نہیں جو تمھاری۔ اسی طرح صادقین کی اپنی دنیا ہے، اپنی بصارت اور اپنی رویائیں، اور اظہار کا اپنا اوریجنل اسلوب۔ یہ راحت اور آسودگی سے عاری دنیا ہر ایک کے لیے خوش آئند یا پُر معنی نہیں ہوگی۔ رنگ — زیادہ تر گدلے، سیاہ، نیلے، زرد اور ایک عجیب طور سے زہریلے — طبیعت کو الٹاتے ہیں اور اپنے تحت الشعور کے پاتال اندھیرے سے وہ جن ٹیڑھی میڑھی مسخ شدہ صورتوں کو سطح پر لاتا ہے، بہت سے غالباً ان کو پہچاننے سے قاصر رہیں گے۔ ہم ایک بڑی تصویر کے سامنے رکے — فن کار کا اپنا دبلا گھلا ہوا چہرہ، نیم باز آنکھیں ایک وجدانی کیفیت سے سرشار، گلے میں کنٹھ مالا، بازو اوپر کو اٹھے۔ کرخت افعیوں کی طرح کلبلاتے بالوں پر ایک چھوٹا سا الو بیٹھا تھا اور اس پر مکڑی کا جالا۔ ایک چوبی بازو پر ایک چھپکلا سرکتا جاتا تھا اور دوسرے پر کنکھجورا۔ اس تصویر میں کیا معنی پنہاں تھے۔ شاید فن کار نے آدمی کو ایک ابدالآباد کی روئیدگی تصور کیا تھا جس پر کائنات اپنے مختلف حیاتی رویوں میں حرکت کر رہی تھی اور آدمی اپنی اذیت کوشی اور گیان میں ایک برگد کے درخت کی طرح بے پروا مست الست تھا۔ میرے دوست نے اس میں کچھ مختلف معنی دیکھے۔ مجھے یہ تصویر کراہت انگیز، بھونڈی، بے آسودہ کرنے والی لگی، اور روح کو ہلا دینے والی کہ تم اسے آسانی سے بھلا نہیں سکتے۔ کسی طرح میں ٹالکین کے ناول ''لارڈ آف دی رنگز'' میں اس کیچڑ اور دلدل کی مکروہ مخلوق 'غیلم' کا سوچنے لگا جس کے خیال سے میرے سروپا میں ہمیشہ جھرجھری سی ہوتی ہے۔ صادقین ایک بڑا فن کار تھا مگر وہ غیلم بھی تھا۔ کیا ہم سب غیلم ہیں؟

پھر ہم نے دوسری تصویریں دیکھیں، لپٹے ہوئے بل کھاتے ہوئے، تشنج میں مڑے تڑے ہوئے انسانی جسموں کی، جن میں داڑھی والا کرخت مرد اور اس کی پسلی میں سے پیدا ہوئی عورت، قدیم بابل کے اُبھرواں نقوش کی یاد دلاتے تھے۔ میں نے کبھی ایسی تصویریں نہیں دیکھیں جن میں جنسی اختلاط کا فعل اس درجہ بے مسرت، بدنما، کچھ صوفیانہ انداز میں رنگا ہوا ہو۔ وہ جذبات کو مشتعل نہیں کرتی تھیں۔ کرب اور دکھ اور مرد و عورت کی ناگزیر وحدت کا احساس ان میں تھا۔ وہ اپنی فکر اور عمل کاری میں تلذذ اور فحاشی سے کوسوں دور تھیں۔ انھیں دیکھتے ہوئے میں نے اپنے دوست سے پوچھا کہ آیا ایک اخبار نے ان کے خلاف ابھی کوئی اداریہ نہیں لکھا۔

اس نے کہا، "کیوں، ان تصویروں میں کیا ہے؟"

"کچھ نہیں،" میں نے کہا۔

ہم نے تجریدی فن کی اور بہت سی تصویریں دیکھیں اور وہ بہت سی رباعیاں بھی پڑھیں جو چھوٹی چھوٹی تختیوں پر صادقین کی اپنی خطاطی میں لکھی ہوئی گچھوں میں آویزاں تھیں۔ ان میں سے بعض واقعی خوبصورت تھیں اور ہم ان کی شعریت اور عمدگی سے بڑے متاثر ہوئے۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہ فن کار اٹھتے بیٹھتے رباعیاں کہتا رہتا ہے اور وہ اس کے پاس اس طرح جھرمٹوں میں آتی ہیں جس طرح صحرائی ڈھنڈ پر مرغابیاں۔ میرے اور میرے دوست کے ذہن میں ایک ہی بات ہے، اس شخص میں بے پناہ تخلیقی آگ تھی اور بڑی فوق البشری لگن!

جب ہم اس تصویر خانے سے باہر دھوپ میں آئے تو اکرام نے، جو خود مختصر افسانے کا ایک پُر جدت فن کار ہے اور کسی کی یونہی رواروی میں تعریف نہیں کرتا، انگریزی میں کہا، "میں کہتا ہوں سر، ایک بڑا تخلیقی فن کار! سچ مچ ایک بڑا فن کار!"

(اس نے 'سر' کا لفظ میری بزرگی یا تقدس مآبی کے پیش نظر نہیں کہا بلکہ ڈاکٹر سیموئیل جانسن کے انداز میں—جب وہ کسی خاص مسئلے پر اپنی حتمی رائے پیش کر کے بحث ختم کرنے کا اعلان کرتا تھا۔)

میں نے اس سے اتفاق کیا۔

اور اگلے ہی دن (مجھے بعد میں معلوم ہوا) اُس اخبار نے فن کار اور اس کی تصویروں میں نمائش کے خلاف اداریے لکھنے شروع کر دیے۔ وہ حسبِ معمول بے حد زہریلے اور جلے کٹے تھے۔ ان کا اثر یہ

Scanned with CamScanner

ہوا کہ صادقین کی اس نمائش میں دیکھنے والوں کا ہجوم روز بروز بڑھنے لگا، گو ان میں بیشتر بار لیش ہوتے تھے۔ جنسی فحش تصویریں اتار کر ایک کوٹھری میں رکھ دی گئیں جس سے بہت سے لوگوں کو مایوسی ہوئی۔ فن کار البتہ خوش تھا کہ زندگی میں پہلے کبھی بھی اتنے لوگ اس کی تصویروں کی نمائش میں نہیں آئے۔

۵

''امروز'' کے منو بھائی کے ہاتھ فیض صاحب کی ایک نظم لگی جو اس نے اپنے فکاہیہ کالم میں چھاپی ہے۔ یہ ایک خوبصورت چھوٹی سی نظم ہے، گداز اور عجیب سا چارم لیے ہوے۔ (فیض کے دشمن بھی اس کا اقرار کرتے ہیں کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں اس میں سحر کی آنچ ہوتی ہے جس کے بغیر شاعری وجود میں نہیں آسکتی۔) اس نظم کو پڑھتے ہوے میں خود فیض صاحب کو اپنے روبرو بیٹھے اور اپنے ٹھیرے، میٹھے انداز میں اپنی مخصوص مسکراہٹ 'پہنے' اسے سناتے تصور کرنے لگا، کیونکہ یہ اس انوکھے شاعر کی اپنے سفرِ حیات کی سمنگ اپ (summing up) ہے، اپنی خود آگہی کا وصیت نامہ۔ نظم یہ ہے:

وہ لوگ بہت خوش قسمت تھے
جو عشق کو کام سمجھتے تھے
یا کام سے عاشقی کرتے تھے
ہم جیتے جی مصروف رہے
کچھ عشق کیا، کچھ کام کیا
کام عشق کے آڑے آتا رہا
اور عشق سے کام الجھتا رہا
پھر آخر تنگ آ کر ہم نے
دونوں کو ادھورا چھوڑ دیا

یہ ہم سب کے بارے میں سچ ہے۔ جب ہم پچاس پچپن سنگِ میل سے گزر کر پیچھے دیکھتے ہیں تو سوائے پچھتاووں، ضائع شدہ لمحات کے لمبے ریگ زاروں اور نامرادیوں کے کچھ نظر نہیں آتا۔ کاش میں یہ کر لیتا، کاش وہ بات واقع ہو جاتی، کاش میں اپنے وقت کو بہتر طریق سے منضبط کر پاتا — اس قسم کی

Scanned with CamScanner

سوچیں ہمیں تڑپانے لگتی ہیں اور ہم نوحہ کناں ہوتے ہیں کہ ہم زندگی میں کوئی کام بھی ڈھب سے نہ کر سکے اور کچھ بھی یافت نہ ہوئی۔ پطرس نے لندن میں عاشق حسین بٹالوی سے آتش داں کے سامنے بیٹھے ہوئے اداس بھٹکے لہجے میں کہا، ''افسوس ساری عمر گزر گئی اور کچھ حاصل نہ ہوا۔'' جس پر عاشق نے اپنے مجبور اور مایوس دوست کو اقبال کا یہ پُرسوز دل کو مسوس ڈالنے والا شعر سنایا:

میں نوائے سوختہ در گلو، تو پریدہ رنگ رمیدہ بو
میں حکایتِ غمِ آرزو، تو حدیثِ ماتمِ دلبری

اور برطانوی مصنف میلکم مگریج ایک توانا اور پُرشور زندگی گذارنے کے بعد پینسٹھ سال کی عمر میں جب اپنی آپ بیتی لکھنے بیٹھا تو اسے اس کا نام ''ایک ضائع شدہ زندگی کی سرگزشت'' سے بہتر نہ سوجھ سکا۔ سومرسٹ ماہام اپنے آخری سالوں میں ایک آرٹ گیلری میں جین آسٹن کا پورٹریٹ دیکھ کر رو پڑا (یہ محسوس کرتے ہوئے کہ وہ ایک ناولسٹ کی حیثیت سے سیکنڈ ریٹ سے آگے نہیں بڑھ سکا)۔ اور ارنسٹ ہیمنگوے — جس نے زندگی میں سب کچھ کیا اور بہت سی عورتوں سے محبت کی — طالسطائی اور دوستوئسکی کو نیچا نہ دکھا سکنے پر اتنا دل گزیدہ ہوا کہ اس نے اپنی انتہا یاس سے بچنے کے لیے اپنی چہیتی ہسپانوی بندوق کا سہارا ڈھونڈا — جس بندوق سے اس نے افریقہ کے جنگلوں میں شیر مارے تھے۔

گو عشق کئی قسم کا ہوتا ہے اور اسپ سیاہ اور سمندر سے لے کر خدا اور رسول کی ذات تک سے کیا جا سکتا ہے، فیض کی نظم میں عشق واضح طور پر گل رُخوں اور ستم پیشہ ڈومنیوں سے عشق ہے — سیدھا سا عشق، ہم سب فانی انسانوں کی کمزوری۔ اس عشق کے میدان میں غالباً کاسانووا سے اونچے جھنڈے کسی نے نہیں گاڑے۔ اس نے عشق کو کام سمجھا اور کمال یکسوئی سے سے صرف اسی ایک کام میں جیتے جی مصروف رہا۔ مگر اس کے سوانح نگار کے مطابق پچاس سال کے بعد وہ محض ایک کریہہ ہوسناک بوڑھا آدمی تھا جس پر عورتیں ٹھٹھے کرتی تھیں، اور اسے یقیناً اپنے کام کے ادھورا رہ جانے کا بے حد قلق ہوگا۔ فیض کے تیسرے مصرعے میں کام سے مراد یقیناً وہ کام ہے جو فن کار — شاعر اور ناول نگار اور مصور اور موسیقار — اپنے نام کو زندہ رکھنے یا فطرت کے گریز پا بے نام حسن کو مسخر کرنے کی دھن میں کرتے ہیں، ورنہ دولت پیدا کرنا بھی ایک کام ہے اور اپنے ہم جنسوں پر حکومت کرنے کی تگ و دو بھی ایک کام۔ مگر فن کار کا کام بھی کچھ 'عشق' کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ جان کیٹس کام سے عاشقی کرتا تھا (اس کا کام

شاعری تھا) مگر وہ ایک دیہاتی ہیلن فینی بران سے بھی عشق کرتا تھا۔ اور کیا اس کی لافانی نظمیں ''لا بیلے ڈیم سانز مرسی'' اور ''اوڈز'' اس عام ارضی عشق کی تپش کے بغیر اپنا سارا سوز، گداز اور حسن کھو نہ بیٹھتیں اور نظم گوئی کی بے جان مشقیں بن کر نہ رہ جاتیں؟ غالب اور اقبال 'کچھ عشق' کرنے کے بغیر جو کام کرتے کیا وہ شاعری ہوتا؟ میرا خیال ہے کہ فن سخن میں (اور دوسرے فنون میں) حسن و عشق کی گرمی ہی تابنا کی اور توانائی لاتی ہے، اور سوہنیوں، سسّیوں اور ہیروں کو بے فائدہ پیدا نہیں کیا گیا۔ فیض صاحب کو یہ حسرت ہے کہ وہ پوری طرح عشق کر سکے نہ شاعری۔ اس میں شک نہیں کہ انھوں نے شاعری کے ضخیم دیوان مرتب نہیں کیے اور ان کی ساری شاعری دو چار پتلی کتابوں میں سموئی ہوئی ہے۔ عشق کے کام تو ہم سب کے ادھورے رہ جاتے ہیں، خواہ ہم کاسانووا ہوں یا پرنس علی خان (عشق کو کام سمجھنے والے خوش قسمت لوگ)، لیکن فیض نے اپنے دوسرے ادھورے کام میں چند ایک نظمیں ایسی لکھی ہیں جو زندہ رہیں گی۔ انسانی زندگی اتنی مختصر ہے۔ ہم سب وہ سب کچھ نہیں کر پاتے جو کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اگر آدمی اس سارے سفر میں ایسی چند سطریں ہی لکھ جائے جن میں آگ بھڑکتی ہو تو وہ خوش مر سکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ فیض صاحب خوش قسمت ہیں اس لیے کہ انھوں نے کچھ عشق کیا، کچھ کام کیا... مگر میں اس چھوٹی سی نظم میں (جس نے، میں اقرار کرتا ہوں مجھے عجیب طور سے منو بھائی کی طرح بے کل سا کر دیا ہے) ہندی کی چندی نکالنے میں لگ گیا ہوں۔ اچھی شاعری کی اس طرح چھان پھٹک نہیں کی جاتی۔ یہ ایک لطیف پُراسرار چیز ہے۔ منو بھائی کے ادھورے کالم میں ایک ادھوری نظم! اس میٹھے بوڑھے آدمی میں، جس کا نام فیض ہے، اب تک کتنی گرمی ہے۔

۶

'میں ابھی ابھی ٹی وی پر اشفاق کا کھیل ''دیدۂ پُرخوں'' دیکھ کر آیا ہوں اور اس کے اثر تلے کسی اور چیز کا سوچ نہیں سکتا۔ میں نے اشفاق کو ہمیشہ ایک رائٹر آف جینیئس گردانا ہے اور ہر ایک اعتراف کرے گا کہ اس کی کہانی ''گڈریا'' اردو ادب کی لافانی چیزوں میں سے ہے۔ (میں نے یہ کہانی کم از کم چار بار تو ضرور پڑھی ہوگی اور میرا باپ، جس نے انگریزی ادب میں اولیور گولڈ اسمتھ کے ناول ''وکر آف ویکفیلڈ'' کے علاوہ کچھ نہیں پڑھا تھا، ''گڈریا'' کا اتنا رسیا تھا کہ اس کے فقرے کے فقرے اسے

از بر یاد تھے۔) ''گڈریا'' کو پڑھتے ہوئے اس کے چہرے پر چھو جانے والی خوشی کی کیفیت آجاتی اور کئی فقروں اور مکالموں پر وہ مسرت سے کشکنائے بغیر نہ رہ سکتا۔ وہ میرے اردو اور انگریزی ادب کا کیڑا ہونے سے واقف تھا اور جانتا تھا کہ میں بھی لکھنے کی کچھ امنگ رکھتا ہوں۔ ''خالد!'' اس کا مجھے ایک دفعہ کا کہنا یاد ہے، ''گڈریا جیسی کہانی لکھ سکو تو پھر کوئی بات بنے گی۔'' میں نے لکھنا اور چھپنا شروع کیا، مگر ''گڈریا'' جیسی کہانی کبھی نہ لکھ سکا۔ اشفاق کا عام چلتی پھرتی زندگی کا گہرا مشاہدہ، ہر قسم کے آدمیوں کی بات چیت کی حیرت ناک ٹیپ ریکارڈ یادداشت، ذہن کی قدرتی دانائی اور زور آوری میں کہاں سے لاتا۔ جو کچھ بھی دوسرے کہیں، میں اشفاق کو ایک بڑا لکھنے والا سمجھتا ہوں۔ اس کی قابلیت بڑی قابلیت ہے... یہ ٹی وی پلیز جن کی ''دیدۂ پُرخوں'' ایک کڑی ہے، اپنے تخیل اور موضوع کی وسعت کے لحاظ سے غیر معمولی ہیں۔ چند پلیز دوسروں سے اچھے ہیں، چند کسائے اور چند قدرے ڈھیلے اور مبالغہ آمیز، مگر سب کے سب (ہمیں یہ تسلیم کرنا ہوگا) توجہ کو جکڑ دینے والے ہیں اور مکالموں میں کہیں جھوٹا، اوپرا رنگ نہیں — اور وہ تمھیں سوچنے کے لیے بہت کچھ دیتے ہیں۔ ان پلیز میں کئی کرداروں کے روپ میں ہماری اپنی ذات سے جان پہچان ہوتی ہے اور مجھے یقین ہے کہ انھوں نے بہت سوں کو چونکایا اور حیران کیا ہوگا۔ بعض اپنی صورت دیکھ کر برہمی اور جھنجھلاہٹ سے چرمر ہو کر رہ گئے ہوں گے۔ لکھنے والا ان کے بارے میں یہ سب کچھ کیونکر جانتا ہے؟ کیا اس کی آنکھیں ایکس ریز آنکھیں ہیں؟ ایک بڑی صلاحیتوں کا مالک لکھنے والا ہی انھیں اس طرح سوچ سکتا ہے اور تشکیل دے سکتا ہے۔ اس لیے جب میں ان پلیز کو بعض ادبی اور ہائی برو حلقوں میں ہدفِ ملامت و تضحیک بنتے دیکھتا ہوں تو مجھے دکھ ہوتا ہے۔ کتا کتے کا بیری ہے، اور یہ کہاوت شاید ہم لکھنے والوں کے طبقے سے زیادہ کسی اور طبقے پر اتنی وضاحت اور بھونڈے پن سے اپنی سچائی نہیں جتاتی۔ ہمارے بیشتر لکھنے والے زندگی کے شعور و شغب سے دور ایک تنگ حلقہ یا اسکول بنا کر رہتے اور جرثوموں کی طرح ایک دوسرے پر پلتے ہیں۔ ایک اچھے لکھنے والے سے اتنے حسد و کینہ کی مجھے کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی — جہاں ستائش برحق ہو، ہم کو بخل سے کام نہیں لینا چاہیے۔ ان پلیز کی کامیابی میں پروڈکشن کی عمدگی کا بھی بڑا ہاتھ ہے اور میں نے ٹی وی پر شاذ و نادر ہی ان سے بہتر پیش کردہ پلیز دیکھے ہیں۔ کون کہتا ہے کہ اس ملک میں لیاقت کا فقدان ہے!

Scanned with CamScanner

۷

مجھ میں بچپن سے دنیا کے حکمراں بادشاہوں، سربراہانِ سلطنت، بزنس ٹائیکونوں اور کروڑ پتیوں کے لیے احترام اور تحسین کا جذبہ رہا ہے۔ میرا خیال ہے اگر ان میں سے کوئی مجھ سے ہاتھ ملالے یا اپنی چمک دار بلٹ پروف لیموسین (limosine) میں گزرتے ہوئے جواب میں ہاتھ لہرادے تو مجھے خوشی اور فخر کے مارے رات بھر نیند نہ آئے گی۔ وہ سب فوق البشر انسان ہیں، جارج آرویل کے الفاظ میں ''زیادہ برابر'' انسانوں میں سے۔ ان کی زیارت کرلینا ہی عین سعادت ہے۔ میں ان سب سے محبت کرتا ہوں۔ اسی لیے جب امریکی کروڑ پتی بلکہ ارب پتی مسٹر ہاورڈ ہوگز کی وفات حسرت آیات کی خبر اخباروں میں پڑھی تو مجھے بے حد صدمہ ہوا۔ میں غسل خانے میں جاکر جی بھر کر رویا اور مسٹر ہوگز کے سوگ میں دفتر جانے کی بجائے بستر میں منھ لپیٹ کر پڑا رہا۔ سارا دن سوائے چائے کی تین چینکوں اور دو گولڈ لیف کے سگریٹوں کے نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ اس کے چند ہفتے بعد ہی مسٹر پال گٹی کے مرحوم ہونے کی خبر آئی۔ تب سے بالکل کمر ٹوٹ گئی ہے اور بغیر کچھ کہے بولے خالی خالی نظروں سے اپنی بیوی، بچوں، دوستوں اور دفتر میں افسر کو گھورتا رہتا ہوں۔

''ٹائم میگزین'' میں آنجہانی ہاورڈ ہوگز کی پوری لائف اسٹوری اور اس دنیا سے مراجعت کا حال کئی صفحات میں شائع ہوا ہے۔ (''ٹائم میگزین'' کا ایڈیٹر بھی میری طرح کروڑ پتیوں کا عاشقِ زار لگتا ہے۔) سچ مچ دل پارہ پارہ ہوگیا۔ مرحوم دنیا کے تین چار امیر ترین لوگوں میں سے تھے اور بیسیوں کمپنیوں، ہوٹلوں، کارپوریشنوں کے کرتا دھرتا۔ انکم ٹیکس بچانے کے اتنے ماہر کہ وہ لوگ ان کے پیچھے پر ہاتھ نہ دھر پاتے اور یہ صاف بچ کر نکل جاتے۔ پہلا ارب ڈالر کچھ جان جوکھوں سے کمایا اور پھر اربوں کی اتنی بھرمار ہوئی کہ رچرڈ نکسن نے صدارتی الیکشن لڑنے کے لیے ان سے دو تین ارب قبول کرلیے۔ سر ہاورڈ ہوگز کو کوئی فرق نہ پڑا۔ آپ نے عشق بھی کافی سے زائد کیے اور وہ بھی ٹھاٹھ باٹھ سے (ویسے میری طرح شرمیلے تھے اور کسی عورت سے آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات کرنے کی ہمت نہ تھی!) عشق کا طریق کارمحیر العقول اور قابلِ رشک تھا۔ دنیا بھر کی مصور میگزینوں کی ورق گردانی خوب سے خوب تر کی تلاش میں کرتے رہتے۔ جو چہرہ نظروں میں کھب جاتا (اور دوسرے اعضا صحیح مناسبت میں پائے جاتے) اس پر انگلی دھر دیتے۔ ان کے گماشتے اٹلی، میکسیکو، حبشہ وغیرہ سے اس پری وش کو ڈھونڈ ڈھانڈ

Scanned with CamScanner

کر حاضرِ خدمت کرتے۔ اسے ایک خصوصی اپارٹمنٹ میں تزک و احتشام سے ٹھہرایا جاتا جس کے باہر مسٹر ہوگز کے بندوقچیوں کا پہرہ ہوتا تھا۔ مسٹر ہوگز اپنی بے اندازہ مصروفیت کی وجہ سے مہینے میں ایک دن عشق کے لیے نکال ہی لیتے اور اپارٹمنٹ میں ایک آدھ گھنٹہ گذارنے کے بعد باہر تشریف لے آتے۔ مرحوم کی غیرت کا یہ حال تھا کہ ان کی وقتی منکوحہ کو کسی سے بول چال کی اجازت نہ تھی، نہ وہ ان کی مرضی کے بغیر اپارٹمنٹ سے باہر قدم دھر سکتی تھی۔ یہاں ان کی نجی اور کاروباری زندگی کی روح پرور کہانی دینے کی جگہ نہیں۔ چودہ پندرہ سال سے مسٹر ہوگز نے اس جہانِ رنگ و بو سے کنارہ کر لیا اور اپنے ایک ہوٹل کی سب سے اونچی منزل میں فروکش ہو گئے۔ کسی سے ملتے ملاتے نہ تھے اور اس کے بعد سوائے ان کے سیکرٹریوں، جاسوسوں اور پہرے داروں کے، ان کو کسی نے نہ دیکھا۔ ان کا آخری فوٹوگراف ۱۹۵۹ء میں لیا گیا تھا۔

"ٹائم میگزین" لکھتا ہے کہ جب سوموار کے روز پانچ بجے صبح میکسیکن ڈاکٹر مانٹ میور بلاوے پر اکاپولکو کے پرنسس ہوٹل میں پہنچا تو وہ پرتمول چنبیلی سے مہکتے کمرے میں جاں بہ لب مریض کی حالت دیکھ کر شپٹا اٹھا۔ ہاورڈ ہوگز کا ننگا، تحلیل شدہ، نزار جسم سفید چادر سے ڈھپا، سکتے کے عالم میں کھٹولی پر پڑا تھا۔ اس کی کھال بستر کے زخموں سے داغ داغ تھی۔ سر کے ایک طرف ایک سوجن سے خون رستا جا رہا تھا۔ اس کا خون کا دباؤ برائے نام تھا اور سانس رک رک کر چل رہا تھا۔

دو دن بعد، اکاپولکو اسپتال میں ہاورڈ ہوگز چل بسے۔

اس کو کہتے ہیں کامیاب زندگی جس پر امریکہ میں ہر سال بے شمار کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ ایک کتاب بہ عنوان "آپ اپنا پہلا ارب کیونکر کمائیں" (How to Make Your First Billion) آج کل میرے زیرِ مطالعہ ہے۔

۸

میں نے مشتاق احمد یوسفی کی حالیہ کتاب "زرگزشت" کے پچاس سے زیادہ صفحات پڑھے بلکہ عبور کیے ہیں۔ مبالغہ آمیز تحسینی جملے اس کتاب کے بارے میں استعمال کیے گئے تھے اور مجھے اسے دیکھنے کا بے حد تجسس اور اشتیاق تھا۔ میں یہ اقرار کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ مجھے یوسفی کی اس کتاب سے

Scanned with CamScanner

سخت مایوسی اور جھنجھلاہٹ ہوئی ہے۔ نگارش اتنی بجی سجائی، پُر تکلف اور مشقت سے تراشی ہوئی ہے کہ جو کچھ مزاح اور ظرافت اس کی سطور میں ہے، پچھلے دروازے سے رخصت ہو جاتا ہے اور کتاب کہیں بھی تمھارے من کو نہیں پر چاتی۔ مزاح جیسی لطیف شے، اتنی عبارت آرائی، اتنی مسلسل گلفشانی کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ یہ فن نہیں صنعت گری ہے، اور میں نے کتاب کے طویل، ضرورت سے زیادہ چھانے پھٹکے واقعات کو بے لطف اور اکتا دینے والا پایا۔ میرا خیال ہے قصور ابوالکلام آزاد کا ہے۔ جب زبان سادگی، صفائی اور توانائی سے منجھنے لگی تھی، انھوں نے اسے پھر سے پُرشکوہ، فارسیت سے بھاری اور بناوٹی بنانے کی فکر کی۔ ان کا اسلوب کئیوں کے نزدیک عمدگی نثر کا نمونہ ٹھہرا اور اس کے بے شمار مقلد پیدا ہو گئے۔ اس رواج نے اردو کو تکلف سے گراں بار کر کے بڑا گزند پہنچایا ہے۔ میں سمجھتا ہوں پچھلے تیس چالیس برس میں اس ملک میں پطرس، منٹو اور شفیق الرحمٰن سے بہتر اردو نثر کسی نے نہیں لکھی۔ کیا مشتاق احمد یوسفی ان کے قدموں پر نہیں چل سکتے تھے؟ یہ یوسفی کی اس کتاب کا نقص ہے۔ اور دوسرا اغلباً یہ ہے کہ ان کے پاس کہنے کو زیادہ کچھ نہیں اور جو کچھ ہے اس کے لیے اتنا آراستہ پیراستہ، مرصع، اختراع کردہ اسلوب مناسبت نہیں رکھتا۔ آخر ہم اپنے پڑھنے والوں کو حسین اور پُر تجمل الفاظ کی شعبدہ گری سے خیرہ کر لینے پر کیوں تلے ہیں؟

اور اپنی اس خوبصورتی سے چھپی ہوئی کتاب میں (ایک خصوصی کاتب اس کے لیے بسیار تگ و دو کر کے ڈھونڈا گیا) انھوں نے پیش لفظ میں، جسے وہ ''تزکِ یوسفی'' کا نام دیتے ہیں، ابن انشا کو اس دور کے سب سے بڑے مزاح نگار کی حیثیت میں سلام کیا ہے۔ ادھر ابن انشا کو اصرار ہے کہ ہم اردو ادب کے عہدِ یوسفی میں جی رہے ہیں۔ میرے خیال میں دونوں حضرات کو مل بیٹھ کر یہ قضیہ نپٹا لینا چاہیے کہ دونوں میں اردو مزاح کے تخت کا اس وقت کون حق دار ہے تاکہ ہم اسی کے روبرو کورنش بجا لائیں۔ یہ مبارک بادیاں اس وقت دی جا رہی ہیں جب شفیق الرحمٰن ہمارے درمیان موجود ہے اور اس کی کتابیں پچھلے تیس سال سے بار بار چھپ اور بک رہی ہیں۔ اگر کوئی مجھے کہے کہ اردو میں فرحت اللہ بیگ اور عظیم بیگ چغتائی کے بعد پطرس اور شفیق الرحمٰن سے بہتر مزاح کسی اور نے لکھا ہے تو میں سمجھوں گا کہ اسے مزاح کا اتنا ہی علم ہے جتنا میری پالتو بلی کو۔

یہ ستائش و تحسین کے باہمی ڈونگرے مجھے حیران کرتے ہیں، اور مجھے اسکاٹ لینڈ کے باشندوں

کے بارے میں ڈاکٹر سیموئیل جانسن کا ایک مشہور فرمودہ یاد آرہا ہے۔ جب اس کے سوانح نگار اور دوست جیمز بازویل نے (جو ایک اسکاٹ تھا) اپنے ایک اسکاٹ دوست کا تعارف تعریفی کلمات کے ساتھ کرایا تو اس نے کہا، ''ویل، سر! اسکاٹ لینڈ والوں نے ایک دوسرے کی ستائش کرنے کی سازش کر رکھی ہے۔''

میں ابن انشا اور مشتاق احمد یوسفی دونوں کی شگفتہ گوئی اور حس ظرافت کا مداح ہوں مگر یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ اس دور میں اردو مزاح میں ہمارا بادشاہ شفیق الرحمٰن ہے۔ مشتاق احمد یوسفی (خواہ ان کے بہی خواہ اُن کو کتنا ہی اچھالیں) ہمارے ووڈ ہاؤس یا ڈبلیو ڈبلیو جیکبس نہیں بن پائیں گے۔ اور اس سے میں اردو مزاح لکھنے والوں کی مسلمہ گریڈنگ پر آتا ہوں جس کے مطابق رشید احمد صدیقی کا نام پطرس سے بھی پہلے آتا ہے۔ رشید احمد صدیقی کا مزاح نگاروں کی صف میں سرِ فہرست ہونا میرے لیے اچنبھے اور حیرت کی بات ہے۔ میں نے رشید احمد صدیقی کی بہت سی تحریریں پڑھی ہیں مگر مجھے ان میں مزاح کا ایک فقرہ بھی نہیں ملا۔ وہ مزاح نگار ہیں ہی نہیں۔

کوئی مجھے بتائے گا کہ یہ گریڈنگ کس نے کی ہے؟ ہم فاتر العقل لوگوں کو الو بنانے سے فائدہ!

میں نے مشتاق احمد یوسفی کو اور پڑھا ہے۔ یوسفی میں حس ظرافت ضرور ہے اور بعض جملے وہ ایسے بندھے ٹکے وضع کر جاتے ہیں کہ ان کے مداح مجلسوں میں کوٹ کرنے سے باز نہیں آئیں گے۔ وہ 'کوئیبل' مصنفین میں سے ہیں اور ان کے ظریفانہ جملے بے حد شائستہ، صیقل شدہ، کھنکتے بجتے ہوتے ہیں، مگر اس کا کیا کیا جائے کہ وہ ایک عام روزمرہ کے چھوٹے سے واقعے کو اپنی پیچ دار انشا پردازی سے اتنا زیادہ اٹیرتے ہیں کہ وہ ختم ہونے میں نہیں آتا۔ مثلاً وہ اپنے بینک کے اسکاٹ باس مسٹر اینڈرسن کے ہمراہ ایک کاک ٹیل پارٹی میں جاتے ہیں جہاں کوئی خاص بات واقع نہیں ہوتی۔ انھوں نے اس کاک ٹیل پارٹی کو 'بے پناہ' کہا ہے اور اس بات کو جسے پطرس یا شفیق شاید دس بارہ جملوں میں خوبی سے کہہ جاتے، انھوں نے پچیس تیس صفحات کے ایک مکمل باب پر پھیلانے کی کاوش کی ہے۔ وہ ایک انتہائی کانشس (conscious) مصنف ہیں، اور مجھے یقین ہے کہ یہ سارا نقشہ جمانے، اسے رنگ آمیزی سے لال بھبھوکا کرنے میں انھیں کم از کم دو ماہ لگ گئے ہوں گے۔ ایک ایک سطر سے خون، پسینے

Scanned with CamScanner

اور موم بتی کی بو آتی ہے، اور انھوں نے ایک بے جان، سرد مرمر کا تاج محل تعمیر کیا ہے۔ جس پر کئی معمار عش عش کر اٹھیں گے۔ باب کا نام ہے، ''جانا ہمارا کاک ٹیل پارٹی میں'' (وہ ہمارے سب مزاح نگاروں کی طرح 'ہم' کے سوا بات نہیں کرتے جیسے صرف 'ہم' کا لفظ ایک چیز کو پُر ظرافت بنانے کے لیے کافی ہو) اور یہ ہے اس کی ایک 'شق' بہ عنوان ''سوال دیگر جواب دیگر'' کا ایک ٹکڑا۔

> مہکتی بہکتی لیڈیز اب شراب اور شولری سے لبریز مردوں سے دامن کشاں اپنا ایک علیحدہ جھرمٹ بنا چکی تھیں۔ یہ جھرمٹ قریب سے فرنچ خوشبوؤں کا بگولہ اور دور سے صبح کا ستارہ نظر آتا تھا جس کی کٹیلی نوکیں مردانہ دائروں میں تا حدِ آرزو پیوست تھیں۔ جب وہ بقول پروفیسر عبدالقدوس گگل گگل ہنستیں تو ہر مرد اپنی اپنی گھنٹی کی آواز پہچاننے کے لیے کنوتیاں اٹھاتا۔ ان خواتین کا طرزِ تخاطب و تکلم دیکھ کر ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ جہاں سات آٹھ عورتیں جمع ہوں تو سب بیک وقت بولتی ہیں، اور اس سے زیادہ اچنبھے کی بات یہ کہ بولتے میں سب کچھ سن لیتی ہیں۔ گویا ایک عورت نان اسٹاپ ٹرانسمٹ بھی کرتی ہے اور اس عمل کے دوران سات آٹھ wave lengths پر کان ٹیون کر کے اوروں کی سن بھی لیتی ہے۔ لیکن مردوں کی بات اور ہے۔ سات آٹھ مرد یک جا ہوں تو آپ دیکھیں گے کہ ان میں سے صرف ایک بولتا ہے، باقی ماندہ نہیں بولتے... ہمارے وہ پڑھنے والے جو کبھی اس آتشیں چشمہ سے نہیں گزرے، ان کی اطلاع و حیرت کے لیے عرض ہے کہ اگر سو ڈیڑھ سو باتونی مردوں کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے تو ان کے درمیان جو گفتگو ہوگی وہ من و عن وہی ہوگی جو کاک ٹیل پارٹی میں سننے میں آتی ہے... وغیرہ وغیرہ

یہ ظرافت ہے، اگر تم ایسی ظرافت پسند کرتے ہو۔ مگر کیا ''اودھ پنچ'' کو بند ہوئے اب ساٹھ ستر سال نہیں گزر چکے؟ اور کیا وہی مزاح کا اسلوب اب تک ہمارے لیے نمونہ رہے گا؟ کیا اتنی پُر تکلف ظرافت ۱۹۷۰ء کے بابرکت سال میں 'انا کرزم' نہیں؟''

شفیق الرحمٰن اس سارے واقعے کو چھوٹے چھوٹے ہلکے پھلکے فقروں میں کچھ اس طرح بیان کرتا:

> مقصود گھوڑا اور میں کلب پہنچے۔ معلوم ہوا کہ مسٹر اینڈ مسز رَن اور ان کے دوست کاک ٹیل پی پی کر ساتویں آسمان پر ہیں۔ ایسی حالت میں ان کے بیچ چلے جانا رنگ میں بھنگ ڈالنا تھا۔ ہم کلب کے

Scanned with CamScanner

پائیں باغ میں کھسک گئے جو چنبیلی اور رات کی رانی سے مہک رہا تھا۔ بار کے ساتھ والے لاؤنج میں کئی پری چہرہ لڑکیاں بیٹھی بلبلوں کی طرح چہکتی نظر آئیں، کچھ معمر خواتین بھی تھیں۔ مقصود گھوڑا کھڑا ہو کر انھیں (لڑکیوں کو، معمر خواتین کو نہیں) بے تحاشا گھورنے لگا، اور خاص طور پر ایک عینک لگی خشگنی لڑکی کو کافی دیر ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اس پر ہزار جان سے عاشق ہو گیا ہے یا ہونے والا ہے۔ مقصود گھوڑا عینک لگانے والی لڑکیوں کے سامنے فوراً ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ خواتین نشے میں دھت بہک رہی تھیں۔ ان کی باتوں کے غل میں آرکسٹرا کی دھن بھی ڈوب چکی تھی۔ ہر خاتون بیک وقت مسلسل بول بھی رہی تھی اور اپنی پڑوسن کی بات بھی سن رہی تھی۔

خطرے کا سگنل دیکھ کر میں نے مقصود گھوڑے سے کہا، ''بھئی اب چلو بھی۔''

''کافی حسین چہرہ ہے، ہو بہو بڑی کی کزن کی شکل ہے جس سے مجھے پچھلے ہفتے محبت ہوئی تھی۔''

''قد قدرے چھوٹا ہے۔''

''موٹے شیشوں کی عینک اس کے چہرے کو کتنا دلکش بنا رہی ہے۔''

میں نے منہ میں ناقی رکھتے ہوئے کہا، ''یہ خواتین بالکل دوسرے عالم میں ہیں اور اس لڑکی کی ماں اس کے پاس بیٹھی ہے۔ چلو ریس کورس کی سیر کریں۔''

سچ مچ عینک والی لڑکی نے میری بات سن لی اور پھولوں کی کیاریوں پر سے اچھلتی کودتی ہمارے سروں پر آن موجود ہوئی۔ محبوب کو اتنے قریب سے دیکھ زمین مقصود گھوڑے کے پاؤں تلے سے نکل گئی۔

''معاف کیجیے گا، کیا آپ جاکی ہیں؟'' اس نے مقصود گھوڑے سے پوچھا۔

''نہیں محترمہ،'' میں نے وضاحت کی، ''یہ خیال آپ کو کیسے ہوا؟''

''آپ ریس کورس کا ذکر کر رہے تھے۔'' وہ ٹکٹکی باندھے مقصود گھوڑے کو دیکھنے لگی۔

''دراصل میرے پاپا کو اپنے ریس کے گھوڑے مارک اینٹونی کے لیے ایک جاکی کی ضرورت ہے۔ تنخواہ بڑی معقول ہے۔ آپ کے دوست کا جسم بالکل جاکیوں کی طرح چھریرا، کسا کسایا ہے۔''

''محترمہ!'' مقصود گھوڑے نے وقار سے کہا، ''میں جاکی نہیں، میں خود گھوڑا ہوں۔''

Scanned with CamScanner

یہ کہنے کے بعد مقصود گھوڑا ہنہناتا اور اصلی گھوڑے کی ڈلکی چال چلتا وہاں سے پھاٹک کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ میں خاتون سے معذرت کر کے اس کو اپنی باقی ماندہ ٹافیاں نذر کر کے اس کے پیچھے دوڑا۔

کیا میں کامیاب ہوا ہوں؟ غالباً نہیں!

(فنون، لاہور، ۱۹۷۶ء)

❁

اکرام اللہ مجھے ہمیشہ کہتا ہے، ''تم ڈیڑھ سال انگلستان رہ آئے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ انگلستان کی تم کوئی بات نہیں کرتے، نہ ہی تمھاری کسی نگارش میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ کیا یہ ایسا ناگوار تجربہ تھا کہ تم نے اسے اپنی یاد، اپنی آگہی سے مٹا دیا ہے؟ مجھے یہ بڑا عجیب لگتا ہے۔''

اتنا عجیب نہیں! میری جوانی کا سارا عرصہ (کیا میں کبھی جوان تھا بھی؟) ایک شدید ذہنی عارضے کے سائے میں گزرا جس کا تعلق جگر کی خرابی اور انتڑیوں کی کاہلی اور سرانڈ سے تھا۔ سورج میرے لیے کبھی نہ چمکا۔ جب میں کھا پی نہ رہا ہوتا تو ساری ہنستی کھیلتی ہوئی دنیا میرے لیے تنگ و تاریک ہوتی۔ اپنی خود پیدا کردہ شکستگی سے فرار کی خاطر میں ایک ریستوراں سے دوسرے ریستوراں میں جاتا اور بھوک کے ذرا سے شائبے کے بغیر خوراک اور چاکلیٹ کریم کیکوں سے خود کو حلق تک ٹھونستا رہتا۔ تم اس پر ہنس سکتے ہو، کیونکہ اپنے اس عارضے کا ذمے دار میں خود ہی تھا۔ جبری الکاہلک (compulsive alcoholic) کی طرح میں ایک جبری کھاؤ تھا۔ ہوسکتا ہے اس عادت کے پیچھے نفسیاتی وجوہ ہوں — انتہائی احساس کمتری اور شرمیلا پن، اپنے ہم جنسوں کا خوف، جو کام میں سیکھ رہا تھا اس سے طبیعت کی قطعی غیر مناسبت۔ بہر حال، عارضہ خوفناک اور حقیقی تھا اور اب بھی کبھی کبھی عود کر آتا ہے اور پھر میں بے بس ہوتا ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معدے کی قوتِ ہضم نے ہمیشہ کے لیے جواب دے دیا۔ موپاساں نے اپنی ایک کہانی میں ایک کردار کے منھ سے (جو خودکشی کی جانب بڑھتا ہے) یہ الفاظ کہلائے ہیں اور یہ کتنے سچے ہیں: ''اچھا ہاضمہ زندگی میں سب کچھ ہے۔ اسی سے کھلنڈراپن اور لطفِ طبع حاصل ہوتا ہے، اسی سے

امنگیں جوان رہتی ہیں اور کچھ کرنے کی دھن باقی رہتی ہے، اسی سے فرح بخش اور تابناک جنسی ولولے اٹھتے ہیں۔'' اگر مجھے انگلستان میں کوئی دردمند نواز گرل فرینڈ میسر آ جاتی جو مجھے خود و زغلا کر لے اُڑتی، تو شاید میں اپنی اس بے بسی کی حالت سے بچ نکلتا، مگر میری کوئی گرل فرینڈ نہ بنی۔ جنسی نامرادی مجھے چاکلیٹ کیکوں اور آئس کریم بارز کی طرف لے گئی جو میری پہنچ میں تھیں — اور میں اپنے تاریک گڑھے میں گہرا اور گہرا دھنستا گیا، جس میں سورج نہیں چمکتا تھا، نہ پرندے گاتے تھے۔

میں یہ خود رحمی کے جذبے کے تحت نہیں لکھ رہا اور میں جانتا ہوں کہ دوسروں کی اپنی بدحالیوں اور تباہیوں کی کہانی سے مدارات کرنا ناقابل معافی بدذوقی ہے۔ لیکن مجھے اپنے بارے میں ایک حقیقت بیان کرنا تھی — سچی اور دوٹوک حقیقت، لگی لپٹی رکھے بغیر!

اور اکرام! اب بھی کیا تم تعجب کرو گے کہ میرے انگلستان میں گزارے ڈیڑھ سال میری زندگی کے سفر میں ایک مہیب خلا تھے؟ اگر میں ان کے بارے میں چپ رہتا ہوں تو کیا یہ مناسب اور درست نہیں؟ — مگر کیا وہ سچ مچ خلا تھے؟ کیا میری زندگی سے محبت اور تخیل کی تب و تاب اور خوابوں کی درخشندگی — برے ہاضمے نے یہ سب نعمتیں مجھ سے چھین لی تھیں؟ شاید نہیں، کیونکہ...

وہ گرما کے دن یاد آ رہے ہیں، بھڑ کیلے جون کے دن (اگرچہ بھڑ کتے جون میں سورج برطانوی جزیروں پر کم ہی چمکتا ہے اور آسمان روتے رہتے ہیں) جب میں نے، اکرام اللہ، بارہ پاؤنڈ میں ایک ہرکولیس سائیکل خریدا، ایک ہیورسیک، یعنی سفری تھیلا، ایک میکن ٹوش (تم برساتی کہہ لو) اور انگلستان کی کاؤنٹیز کے کئی رنگین نقشے۔ میں ان نقشوں کے مطالعے میں دنوں غرق رہا اور ان کی مدد سے کئی طربناک تخیلی سفر کر ڈالے۔ میں نے اس کارخانے سے جس میں میں کام کرتا تھا، سات دن کی چھٹی لی اور ایک مبارک دن، جب سورج واقعی بادلوں میں سے جھانکتا تھا، اپنے ہیورسیک کو پیٹھ پر کسے، اپنے ہرکولیس پر سوار ہوا اور اسٹیورڈ کے شہر سے نکل کر زمردیں سبزہ زاروں میں سے لہراتی سڑک پر آیا۔ تب میں رابرٹ لوئی سٹیونسن کا آوارہ گرد لگتا تھا اور میرے چہرے اور نگاہوں میں ہائی ایڈونچر کی روشنی ضرور ہوگی، کیونکہ دو دیہاتی پینڈوؤں نے، جو اپنے ایک کھیت میں بھوسے کی ڈھیری جما رہے تھے، اپنے کام کو چھوڑ کر مجھے ہاتھوں کے اشارے سے ''گڈ لک'' اور ''بون وایج'' (Bon Voyage) کہا۔ میں نے بھی ہاتھ لہرا کر اس کا جواب دیا اور سیٹی بجاتا ہوا اپنے راستے پر پیڈل چلاتا گیا۔ میں سیٹی کیوں بجا رہا

Scanned with CamScanner

تھا، اکرام؟ میں، جو تمھارے جیسے خوش باش دوستوں کی صحبت میں بھی اپنے تاریک خیالات میں گھرا رہتا ہوں اور اپنے چہرے پر بشاشت نہیں لا سکتا؟ میں تمھیں اس کی وجہ بتاؤں گا۔ تم جانو، اپنے نقشوں پر غور کرتے ہوئے میں نے فیصلہ کیا تھا کہ میں لیک ڈسٹرکٹ جاؤں گا اور ویسٹ مور لینڈ کی یاترا کروں گا، جہاں ورڈز ورتھ رہتا تھا اور جہاں اس نے اپنی لافانی نظمیں ''ڈیفوڈلز'' اور ''ہائی لینڈ لیس'' اور ''اِنٹیمیشن ٹو امارٹیلیٹی'' لکھی تھیں۔ جب کوئی ایسے پُر سعادت ارادے سے اپنے سفر پر نکلے تو وہ کیوں نہ گائے اور کیوں سیٹی نہ بجائے؟... تو خیر، اکرام! ہرکولیس نے سترہ میل دور مجھے قصباتی اسٹیشن پر پہنچایا۔ میں نے اسے بک کرایا اور اس بھاپ کے انجن سے کھینچی جانے والی سبز اور سنہری گاڑی میں سوار ہو گیا جو لیک ڈسٹرکٹ کو جاتی تھی اور ورڈز ورتھ کے گھر کو۔ میں شام کو ونڈر میر پہنچا اور ونڈر میر جھیل کے کنارے ایک پہاڑی پر بنے ہوئے یوتھ ہاسٹل میں ٹھہرا۔ دوسری صبح دلیے اور ٹوسٹ کے ناشتے کے بعد دو چنچل، چٹکیلی، سنہری بالوں والی لنکا شائر کی لاوارث لڑکیوں نے مجھے اپنے چارج میں لے لیا اور ہم ونڈر میر جھیل پر ایک چپوؤں والی کشتی میں گئے اور ہم ونڈر میر شہر میں سچے سیلانیوں کی طرح گھومے پھرے۔ وہ دونوں سہیلیاں پریسٹن کے ایک اسٹور میں سیلز گرلز تھیں اور اپنے سائیکلوں کے ہمراہ لیک ڈسٹرکٹ کو دیکھنے آئی تھیں۔ ایک میگی تھی اور دوسری جینی۔ میگی لمبی، باوقار، تھلتھلاتی، سنجیدہ آنکھوں کی لڑکی تھی۔ جینی کا قد درمیانہ تھا، اکہرا دلربا جسم، چھوٹا دہانہ اور نیلی شرارت بھری آنکھیں (وہ تمھارے کندھے تک آتی تھی)۔ جینی ہاتھ پکڑنے، آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے اور تمھارے شانے سے لگ کر کھڑے ہونے کو پسند کرتی تھی — پوری اسپورٹ اور کھلنڈرے پن کی شوقین۔ میں اسے سیڈیوس (seduce) کر سکتا تھا، یا کم از کم اسے اس کے میٹھے سرخ ہونٹوں پر چوم سکتا تھا، مگر میں نے ایسی بات پہلے کبھی نہ کی تھی اور ہمت نہ کر پایا۔ وہ گیم (game) تھیں۔ (ہے نا ناکام محبت کی کہانی؟)

میرا سائیکل میرے ساتھ ہی پہنچا تھا۔ اس سائیکل پر میں نے لیک ڈسٹرکٹ کی پوری سیاحت کی اور اس کے مشہور چھوٹے میڈیول شہروں اور قصبوں میں گھوما پھرا۔ (ذرا میرے بارے میں ڈھلانوں اور اترائیوں پر سائیکل چلانے کا تصور کرو — سر پر بیرٹ ٹوپی، میرے میکنٹوش کے فلیپ ہوا میں اُڑتے ہوئے اور میں وادی کے جنگلی پھولوں اور فرنوں میں سے سیٹی بجاتے پرندوں کے سُروں کا ساتھ دیتا ہوا!) میں تمھیں اپنی ساری ایڈونچر اور ان جگہوں کا حال جہاں میں گیا، بتا کر نہیں اکتاؤں گا، اور سچ بات یہ ہے

کہ وہ باتیں میرے ذہن میں ایک مبہم خواب کی طرح رہ گئی ہیں... ہاں میں ورڈز ورتھ کے گاؤں رائیڈل (Rydel) بھی گیا جواب بھی اٹھارویں صدی میں سانس لیتا ہے — پکچر سک (picturesque) تنگ، ٹیڑھی میڑھی، چھوٹے پتھروں سے جڑی ہوئی، اوپر نیچے جاتی گلیاں، دو دو تین تین منزلہ حویلیاں اور ساری جگہ پھولوں اور بوٹیوں سے مہکتی ہوئی۔ میں نے ورڈز ورتھ کا گھر جا کر دیکھا — ایک تنگ اونچا پتھر کا مکان، ایک تختی کے ساتھ، اور میرا خیال ہے اس کے اوک کی لکڑی کے قدیم دروازے کے باہر ایک کھمبے پر لالٹین بھی تھی جسے ورڈز ورتھ کے زمانے میں مٹی کے تیل سے جلاتے ہوں گے۔ میں اس گلی کے نکڑ پر اس سادہ منکسر سے مکان کو ایک گھنٹے تک کھڑا تکتا رہا جس میں فطرت کا یہ شاعر اور اس کی لمبے لمبے خط لکھنے والی بہن ڈوروتھی ورڈز ورتھ رہتے تھے اور جس میں وہ مرے۔ افیم کھا کر عجیب غیر زمینی خواب دیکھنے والا کالرج کئی بار یہاں اپنے دوست کو ملنے، اس سے طویل فلسفیانہ بحثیں کرنے آتا ہوگا۔ ناخوش، شوریدہ ولیم ہیزلٹ کے قدم بھی ایک آدھ بار دروازے کی ان سیڑھیوں پر گونجے ہوں گے اور اس کا ہاتھ پیتل کے کھٹکے پر پڑا ہوگا۔ دوسرے ملاقاتی غالباً گاؤں کا مقامی بھاٹ (جو خود کو ورڈز ورتھ سے بڑا شاعر سمجھتا ہوگا)، گاؤں کا لوہار، اور گاؤں کا لال بجھکڑ وغیرہ ہوتے تھے۔

ورڈز ورتھ طبعاً ایک گوشہ نشیں تھا اور "بادل کی طرح تنہا" وادی میں منڈلاتا رہتا۔ ڈوروتھی ایک اچھی ہوشیار، سگھڑ گھر چلانے والی تھی اور کافی چرب زبان، گو اس کا ذہن بڑا تیز اور منجھا ہوا تھا جس طرح اس کے لمبے خطوط بتاتے ہیں۔ اس نے کبھی شادی نہ کی اور ایک بوڑھی کنواری ہو کر مری، اور میں تعجب کرتا ہوں کہ آیا کالرج کے دل میں ڈوروتھی کے لیے کبھی لطیف جذبات پیدا ہوئے یا کبھی اس کا دل ڈوروتھی کو دیکھ کر پرندے کی طرح پھڑ پھڑایا! کالرج ایب نارمل تھا (ہم میں سے کون نہیں؟) اور ایسے لمحے ضرور آتے ہوں گے جب جنسی ارمان اس کے ذہن کو پریشان کر دیتے ہوں گے اور راتوں کی نیند اڑ جاتی ہوگی۔ ورڈز ورتھ، جو ویسٹ مورلینڈ ضلعے کا موقر اسٹامپ فروش بھی تھا، قدرتی طور پر ایک شرمیلی، خلوت پسند طبع کا شخص تھا اور اسے اپنے ہی گاؤں کی مِلک میڈ (milkmaid) سے بھی فلرٹ کرنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ میں کہوں گا کہ اس کی جنسی اذیتوں ہی نے فطرت سے والہانہ محبت کا روپ دھار لیا، جو شاعری کے لیے یقیناً اچھی بات تھی (دیکھو میں فرائیڈین تجزیے کے بارے میں کتنا کچھ جانتا ہوں!) اور کالرج کے افیم زدہ دماغ کے سراب تو بڑے تیتے ہوئے، ننگے اور کلپانے والے ہوتے

ہوں گے ... مگر اتنا ورڈز ورتھ، ڈوروتھی اور کالرج کے ضمن میں کافی ہے۔ وہ کیا تھے، کیا نہیں تھے، کن انجانی مسرتوں اور خواہشات سے ان کی زندگی کی چنی ہوئی ڈگر پھوٹی ــــ کون یہ باتیں جان سکتا ہے! ہم میں سے ہر ایک کی الگ دنیا ہے، اور جیسا کہ ہمارے سلطان باہو نے کہا ہے، انسانوں کے دل دریاؤں اور سمندروں سے بھی زیادہ گہرے ہوتے ہیں!

یہ لکھتے ہوئے میں محسوس کرتا ہوں کہ مجھے ایک اپنے لیک ڈسٹرکٹ کے سفر کے دوران ایک ڈائری رکھنی چاہیے تھی (اپنے دوست 'ک' کی طرح) کیونکہ آدمی بہت کچھ دیکھی سنی باتوں کو بھول جاتا ہے اور غالب کے الفاظ میں ساٹھ کے لگ بھگ ہونے پر ''دماغ میں خرافت آجاتی ہے'' اور حافظے پر جالے تننے لگتے ہیں۔ اگر میں نے اُن دنوں کی ایک ڈائری رکھی ہوتی تو میں تمھیں لیک ڈسٹرکٹ کے پھولوں اور فرنوں کے رنگوں، سبزے سے ڈھکی پہاڑیوں کی گود میں ہلکورے لیتی جھیلوں کے حسن، پرندوں کی مختلف بولیوں اور چہکاروں، مکانوں کی وضع، یوتھ ہاسٹلوں میں دہکتی آگ کے سامنے بائیک پر آئے دوسرے لڑکوں اور ان کی گرل فرینڈز سے خوش گپیوں، ورڈز ورتھ کی حویلی کے دروازے کی اونچائی اور چوڑائی اور اس کے کھٹکے کی شکل (گاؤں کے لوہار کا ڈھالا ڈیزائن) ــــ ان سب کی صحیح صحیح معلومات دیتا جن میں بہت سی باتوں کی تم لیک ڈسٹرکٹ پر لکھی کتابوں سے تصدیق کر سکتے۔ میں تمھیں پنجر کی جگہ گوشت پوست دیتا، گٹھلی کی جگہ پکا ہوا میوہ۔ تم میرے اس لفظی ابال میں لیک ڈسٹرکٹ کے متنوع روپوں کی تصویر دیکھتے اور دلچسپ باتوں سے محظوظ ہوتے۔ 'ک' نے بڑی سوجھ بوجھ سے کام لیا کہ اپنے جرمنی کے سفر کے دوران اس نے ہر وقت جیب میں ڈائری رکھی اور روزانہ دن کی دیکھی سنی چیزیں اس میں لکھتا رہا۔ مگر پھر 'ک' ایک باضابطہ، سلیقہ شعار شخص ہے، میری اور تمھاری طرح نہیں۔ اگر ہم ڈائری رکھیں بھی اور اس میں روزانہ لکھنے کی زحمت بھی گوارا کر لیں تو بھی ایک ماہ، دو ماہ بعد اسے کہیں یوں اوپر تلے رکھ بیٹھیں گے کہ وہ پھر نہیں ملے گی... سو میں تمھیں اس طرح لیک ڈسٹرکٹ سے روشناس نہیں کرا سکتا جس طرح ہمارے دوست 'ک' نے ہم دونوں اور دوسروں کو جرمنی سے اپنی یادگار شگفتہ نثر میں کیا ہے۔ اور اکرام اللہ! میں ایک بڑا نادار لکھنے والا ہوں ــــ poor writer ــــ جسے اپنے مشاہدات اور جذبات کو لفظوں کا جامہ پہنانے میں بے اندازہ دقت ہوتی ہے اور جس کے فقرے کئی پڑھنے والوں کو عجیب اور بھدے اور ناآشنا لگتے ہوں گے۔ کافی قلم گھسیٹنے کے بعد بھی میں اپنے مافی

Scanned with CamScanner

الضمیر کو ادا کرنے سے قاصر ہوں۔۔۔ مجھے قلم ہانکنے کی بجائے کچھ اور کرنا چاہیے تھا۔

تم اس بد وضع خود کلامی سے تھک نہیں گئے؟ ہم ایسی خود کلامی اپنے دل کے دوستوں سے ہی کرتے ہیں۔۔۔ یہ جاننے کے بغیر کہ کب ہم ان کے لیے ناقابلِ برداشت اجڈ ہو جاتے ہیں اور ہماری صورت، ہماری آواز ان کو زہر لگنے لگتی ہے۔ تھوڑا سا صبر اور!

میں تمھیں لیک ڈسٹرکٹ کے آخری دن کی بابت ضرور بتاؤں گا۔ اصل ایڈونچر کی دھڑکن سے میں ایک صبح کینڈل کے شہر سے بس میں سوار ہوا جس نے مجھے بلیک فرائر کی سرائے کے سامنے اتارا۔۔۔ اپنے نام کی طرح ایک تاریک اجاڑ جگہ۔ لیک ڈسٹرکٹ کا سب سے دور دراز گوشہ جہاں اصل اونچے پہاڑ لڑھکنے لگتے ہیں اور بہت کم ہائیکر وہاں جاتے ہیں۔ کوئی تعجب نہیں کہ سیاہ راہبوں نے اس جگہ کو اپنی کمین گاہ کے لیے چنا، ویران اور پُر وحشت اور ہواؤں کے تھپیڑوں سے پٹی ہوئی۔ آسمان پر ڈراؤنے بادلوں کا ڈیرا تھا اور روشنی بہت کم تھی۔ میں ڈوبتے ہوئے دل سے بلیک فرائر سے پہاڑوں کے درمیان ایک دشوار گزار وادی میں سے ہائی گیبل کے لیے روانہ ہو گیا۔ اپنے نقشے کے مطابق مجھے اس وادی اور ہاسٹر ہاس کے درے میں سے کوئی بارہ میل جا کر لیک ڈسٹرکٹ کے سب سے بڑے پہاڑ ہائی گیبل پر چڑھنا تھا جس کی چوٹی پر ایک یوتھ ہاسٹل تھا۔ اکرام، میں پیدل خوب چل لیتا ہوں۔ میری ٹانگیں کافی لمبی ہیں اور ایک زمانہ تھا جب میلوں کی لمبی پیدل مارچ مجھے نہیں تھکاتی تھی۔ (افسوس اب وہ بات نہیں رہی۔) بادل اوپر دھمکانے کے انداز میں غرا رہے تھے۔ وادی اور درّے میں کہر کی چھاؤنی تھی۔ سرد ہوا کے جھکڑ تمھیں ایک زندہ قوت کے ساتھ آگے بڑھنے سے روک روک لیتے تھے۔ بھاری ہیورسیک کے نیچے ڈگمگاتا میں ولیم ہیزلٹ اور ہلیر بیلاک (دونوں میرے چہیتے مصنف!) کی روح اپنے میں حلول کیے بے خطر چلتا چلا گیا۔ (اگلے روز ایک خوبصورت شام کو شفیق نے مجھے رابرٹ لوئی سٹیونسن کا وہ فقرہ یاد دلایا جس میں اس نے ولیم ہیزلٹ کو یوں خراج دیا تھا: ''ان دنوں ہم سب خوب دھوم دھام کے روشن قلم لوگ ہیں لیکن ہم میں سے کوئی بھی ولیم ہیزلٹ کی طرح نہیں لکھ سکتا۔'') میں چلتا گیا اور چلتا گیا۔ کہر چھٹنے لگی، مگر بادل دھمکانے کے انداز میں اور قریب آ گئے اور پہاڑیوں کی چوٹیوں کو گویا چھونے لگے۔ بارش کے پہلے چھینٹے پڑے اور پھر ایک آدھ گھنٹہ پانی سچ مچ چھاجوں برسا۔ پناہ لینے کے لیے کوئی جگہ نہ تھی اس لیے میں قدم مارتا رہا۔ سارے کٹھن راستے مجھے کوئی آدمی نہ ملا، نہ کسی پرندے کی چہکار

Scanned with CamScanner

سنائی دی۔ میں گویا ایک تبتی درّے میں تھا— تہذیب اور اس کی برکتوں سے ایک ہزار میل دور— اور میرے دل میں دو تین بار یہ وسوسہ آیا کہ اگر میں ہائی گیبل تک نہ پہنچ سکا تو کیا ہوگا... الغرض، اکرام، ایک اندھیرے جھٹپٹے میں ہوا اور بارش کے دَھپ سہتا، میں ہائی گیبل پر پہنچ ہی گیا جس کی چوٹی تک چڑھائی ابھی باقی تھی۔ ایک چٹان کی اوٹ میں دم لینے اور ایک دو سینڈوچ کھانے کے بعد میں نے ہائی گیبل کو سر کرنے کے لیے کمر کس لی (دل میں یہ دعا مانگتے ہوئے کہ یہ میرے نقشے کی ہائی گیبل ہی ہو اور کوئی اور پہاڑی نہ نکل آئے)۔ جب میں چڑیا کی طرح بھیگا، نیم جاں، ہانپتا کانپتا، چوٹی پر پہنچا تو رات ہو چلی تھی۔ پہاڑ کی ایک نکر پر لکڑی کا ایک کیبن سا تھا۔ میں نے سوچا یہ یوتھ ہاسٹل نہیں ہو سکتا، یوتھ ہاسٹل ایسے نہیں ہوتے، مگر چمنی میں سے دھواں اُٹھ رہا تھا، ایک پیلی روشنی کی دمک دروازے کی دراز میں سے آ رہی تھی اور لوگوں کے ہنسنے بولنے کی آوازیں۔ کیبن کے باہر ایک قسم کی برجس اور بیرٹ کیپ میں ایک ترش رُو چھریرا آدمی کھڑا تھا— تھامس ہارڈی کے ناولوں کا کوئی کردار۔ میں نے اس سے پوچھا، کیا یہ ہائی گیبل کا یوتھ ہاسٹل ہے۔ ''شور!'' (Sure) اس نے ایک چوڑے ہائی لینڈ لہجے میں کہا، ''ہیل! گٹ اِن مینی! (Hell! Get in mannie) تمھارے لیے ایک بیڈ ہے۔'' میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ اندر پانچ چھ ہائیکر تھے اور ایک شعلے کے سے دہکتے بالوں والی لڑکی! انھوں نے اس آسیبی ہیولے کو حیرت کی نگاہوں سے دیکھا۔ میں نے گڈ ایوننگ کہا۔ ان کے چہروں پر مسکراہٹ کھل اٹھی اور گٹار بجانے والے لڑکے نے مجھے دوستی سے آنکھ ماری۔ میں یوتھ ہاسٹلوں کے آداب و قواعد کا عادی ہو چکا تھا۔ اس کیبن میں اوپر تلے چھ بیڈ تھے— تین ایک طرف اور تین دوسری طرف، ریل کے ڈبے کی برتھوں کی طرح۔ میں نے اپنا سیک اتارا، اسے خشک کرنے کے لیے آتش دان کے سامنے رکھ دیا، ہیورسیک کو خالی بستر پر پھینکا اور اوپر چڑھ بیٹھا۔ وہ اپنا شام کا کھانا کھا چکے تھے مگر ایک ہنستے ہوئے خوشگوار چہرے والے کسرتی لڑکے نے مجھے ٹین کے ڈبے میں سے دو موٹی سارڈین کی سینڈوچ پیش کیں۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور لیٹ کر انھیں چباتا رہا۔ یوتھ ہاسٹلز میں تم اتنے ہی آزاد محسوس کر سکتے ہو جتنا اپنے گھر میں۔ سینڈوچ کھا کر میں نے جیب میں اڑسا ہوا اپنا پائپ نکالا، اسے الیگزنڈر برانڈ تمباکو سے بھرا اور خاموشی سے اس کے کش لیے۔ ہا! ایک لمبے پُرتھکن مارچ کے آخر پر تمباکو کا ذائقہ! اکرام، تمیں سال کی مدت کے بعد بھی، جب میں ایک بوڑھا آدمی ہوں، اس پائپ کا

مزہ یاد ہے جو میں نے ہائی گیبل کی اس کیبن میں پیا۔ گٹار بجانے والا لڑکا گٹار کے تاروں کو جھنجھناتا رہا اور ہوا باہر لکڑی کے کیبن کے گرد کرلاتی رہی اور میری آنکھیں نیند سے مندنے لگیں۔

صبح ہو کا دلیہ اور چائے ٹوسٹ۔ اور سب رات کے مسافر جانے کی تیاری کرنے لگے۔ میرے سامنے ونڈرمیر کی لمبی مارچ تھی اور تنہا بے سنگی ساتھی اتنے میل چلنے کے خیال سے میرا کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ کیا میں بلیک فرائر کی سرائے کو واپس جاؤں اور وہاں سے بس پکڑوں؟ میں خود کو کسی پر ٹھونسنا نہیں چاہتا تھا۔ اتنے میں فرینک ٹووے (ہنستے چہرے والا لڑکا جس نے مجھے سینڈوچ دی تھیں) اور اس کی شعلے جیسے بالوں والی دوست لڑکی نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ وہ ونڈرمیر تو نہیں جا رہے تھے، البتہ پچیس میل دور سڑک تک میرے ساتھ تھے، جہاں میں ونڈرمیر کے لیے بس پکڑ سکتا تھا۔ ہمارا راستہ ایک تھا۔ میں نے ان اچھے فرشتوں کا شکریہ ادا کیا اور بڑی خوشی سے ان کی رفاقت میں چل پڑا، مگر ہاں، ان سے کچھ دور ہٹ کر، کیونکہ وہ دونوں ایک دوسرے کی چاہت میں سرشار تھے۔ کس کس طرح وہ ایک دوسرے کے ہاتھ چھوتے تھے! کیسی شرمیلی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھتے تھے! اور وہ رازداری کا لہجہ جس میں فرینک ڈوروتھی (وہ ایک اور ڈوروتھی تھی) کے کان کے ساتھ منہ لگا کر باتیں کرتا تھا اور ڈوروتھی کا خوبصورت گل گوتھنا چہرہ شرم سے سرخ ہو جاتا تھا۔ اور پھر زندگی کی وہ مسرت جو ان کے چہروں اور انگ انگ سے، ان لڑھکتے مہکتے ٹیکروں میں اکھٹے ہونے سے، پھوٹی پڑتی تھی! ان سب چیزوں نے مجھے ساری کہانی بتا دی۔ اکرام، دو جوان دلوں کی ایک دوسرے سے معصوم اور پاک محبت دنیا کی حسین ترین چیزوں میں سے ہے۔ ان کو دیکھ کر ہی تم کو خوشی ہوتی تھی، اور تم ان کے لیے ڈرنے بھی لگتے تھے، کیونکہ دنیا کی سب بے خود کرنے والی مسرتوں میں ہمیشہ کوئی روگ پنہاں ہوتا ہے، کوئی چھپا ہوا گھن جو اپنے موقعے کی تلاش میں رہتا ہے۔ دیوتا ہمیں زیادہ دیر ہنستے خوش ہوتے نہیں دیکھ سکتے اور حسد سے سیاہ پڑ جاتے ہیں۔ اکرام، فرینک ٹووے اور ڈوری کی دنیا (ایسا میں نے محسوس کیا) اپنی ایک الگ گلابی، تقدس بھری دنیا ہے — اور میں اس میں زبردستی مخل ہوا ہوں۔ ان کے لیے بہتر ہوتا کہ وہ ان پہاڑیوں پر اکیلے ہوتے، ایک دوسرے کی کمر بازو حمائل کیے، ناچتے گاتے، اور پیار کرتے ہوئے۔ اسی لیے خود کو ناخواندہ مہمان محسوس کرتے ہوئے میں ان سے ذرا ہٹ کر اور آگے آگے رہا۔ اور اگر میں ان کو کبھی دیکھتا بھی تھا تو آنکھ بچا کر، دزدیدہ نگاہوں سے۔ میری سوچوں سے ناواقف،

Scanned with CamScanner

میرے الگ چلنے کو انھوں نے میرے شرمیلے پن پر محمول کیا ہوگا۔ فرینک ٹووے اور ڈوروتھی، مجھے فرینک نے بتایا، اڈنبرا میں ہم جماعت میڈیکل اسٹوڈنٹ تھے۔ وہ ان دونوں کا آخری سال تھا اور وہ تعلیم پوری کرنے کے بعد افریقہ کے ایک دور دراز خطے میں کویکر مشن میں مشنری ڈاکٹر بن کر جانے کا ارادہ رکھتے تھے — البرٹ شوائٹزر کی طرح دکھی انسانیت کی خدمت کرنے کے لیے۔ وہ دونوں اسکاٹش کویکر (Quaker) عیسائی تھے جو ذرا مختلف انداز میں سوچتے ہیں۔ ڈوروتھی فرینک کی منگیتر تھی۔

''افریقہ جانے سے پہلے، اگلے سال، ہم پاک مناکحت میں جکڑے ہوں گے — ہے نا ڈوری؟ تم تھک تو نہیں گئیں؟'' فرینک ڈوری کے آرام کی بڑی فکر کرتا تھا جیسے کہ سب سچے عاشقوں کو کرنی چاہیے۔

ہمارا راستہ چھوٹی سبز پوش پہاڑیوں اور گھاٹیوں پر سے جاتا تھا جو ایک دوسرے کے پیچھے دور جھلملاتی نیلی دھندلاہٹ تک، بھیڑوں کے گلے کی طرح سمٹی ہوئی تھیں یا ایک پر تموج سمندر کی لہروں کی طرح۔ یہ ایک عمدہ اُجلا دن تھا — اُجلا اور نتھرا ہوا — اور گو سورج نے شکل نہیں دکھائی تھی مگر اس کی روشنی ہلکے بادلوں میں تھی اور انھیں لطیف اور چمکدار بنا رہی تھی — ہمدمی سے دمکتے نہ کہ گزرے دن کی سی سیاہ تیوری چڑھائے... اور بارش کا ایک چھینٹا بھی نہ آیا، جو لیک ڈسٹرکٹ کے لیے گرما کے موسم میں بھی غیر معمولی ہے، اور فرینک نے اس معجزے کا ذکر کیا۔ قدرت دو محبت کرنے والوں کو ایک سہانا دن دینے پر تلی ہے، میں نے سوچا۔ اور میں بھی خوش تھا۔ گو میں کسی ڈوروتھی سے محبت نہیں کر سکتا تھا، مجھے دو محبت کرنے والے جوان لوگوں کی رفاقت تو نصیب تھی، جو اتنی ہی اچھی بات ہے۔ ہمیں راستے میں کم ہی آدمی ملے۔ ایک اونچی ٹیکری کے دامن میں ہم نے کوہ پیمائی کے لباس میں ایک چالیس سالہ فربہ شخص کو دیکھا — سانس دھونکنی کی طرح چلتا ہوا، پلپلے گیم چہرے پر موٹے فریم کے چشمے، ہاتھ میں نوکیلی آہنی چھڑی۔ وہ شاید کوئی شہری گروسر یا پب کا مالک تھا جو مصمم ارادے سے لیک ڈسٹرکٹ میں پہاڑیاں چڑھنے اور وزن گھٹانے آیا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک الو کی سی سنجیدگی تھی، اپنے ورزشی مقصد میں اتنا انہماک کہ (میں نے سوچا) اس کی آنکھیں اردگرد فطرت کی رعنائی اور پتھروں تلے جھانکتے بسنتی پھولوں اور فرنوں کے لیے اندھی ہیں۔ اس کی اس وضع قطع میں کوئی ایسی بات تھی کہ ہمیں ہنسی آ گئی۔ میں ہنسا، اور پھر فرینک ٹووے اور ڈوروتھی بھی کھلکھلا کے ہنس پڑے۔ اکرام، جب لوگوں کی رگِ مزاح ایک

ہی چیز کو دیکھ کر پھڑکتی ہے اور وہ اکٹھے کھل کر ہنسنے لگتے ہیں تو ان کے درمیان جھجک اور اجنبیت کی برف پگھلنے لگتی ہے اور وہ عمر بھر کے لیے دوست ہو جاتے ہیں۔ یہ معجزہ اب ہوا اور ہمیں اس کی وقوع پذیری کے لیے موٹے کوہ پیا کا احسان مند ہونا چاہیے۔ وہ اب انجن کی طرح ہف ہفاتا ایک اونچی پہاڑی پر چڑھ رہا تھا (جس پر چڑھنے کی اسے قطعاً ضرورت نہ تھی) ___ اور اس نظارے پر تو ہم پیٹ پکڑ کر اتنا ہنسے کہ ہماری آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ ہم ہنسنے والے اس فینا مینا کو جانتے ہیں جب ہنسی ایک کیومولیٹو (cumulative) زور پکڑتی ہے اور تھمنے میں نہیں آتی۔ ہاں، موٹے آدمی پر اس ساجھی ہنسی نے میرے اور عاشقوں کے درمیان تکلف کو یکسر ختم کر دیا۔ میں اب فاصلے کو چھوڑ کر اپنے دوستوں کے ساتھ چلنے لگا تھا، فرینک ٹووے اور اس کی ڈوروتھی سے بے جھجک باتیں کرتا ہوا ___ میں اب ان میں سے ایک تھا اور اب فرینک نے بھی میرے سامنے ڈوروتھی کو پہلو سے بھینچنے اور اس کے کان چومنے میں کوئی جھجک محسوس نہ کی۔ فرینک نے مجھے اپنے کو یکر موروثوں کی عادات کے کئی قصے سنائے۔ اس نے مجھے اپنے ہائی لینڈ کے دیہاتی مکان کے بارے میں بتایا کہ کیسے وہاں اب بھی بین باجے کے مقابلے ہوتے ہیں اور جوان گھٹنوں تک آتے گھگھرے پہنے اپنے گاؤں کے گرجے میں شادی کی قسمیں کھانے آتے ہیں۔ فرینک کی گفتگو کتنی دلچسپ تھی۔ وہ بڑا چارمنگ، دردمند نواز شخص تھا ___ ایک اچھا اور نیک آدمی۔ وہ مشن کتنا خوش قسمت ہوگا جس میں فرینک اور ڈوروتھی ڈاکٹر ہوں گے، میں سوچنے لگا۔ کاش میرے ملک میں بھی ایسے ڈاکٹر ہوتے جو روپیہ کمانے اور مریضوں کی کھال اتارنے کے علاوہ کسی اور چیز کا بھی سوچ سکتے، جو اپنے پیشے میں مہارت کو کوٹھیاں کھڑی کرنے سے بہتر مقصد کے لیے استعمال کرتے، جن میں انسانیت کے لیے درد اور ان کی خدمت کا جذبہ ہوتا؛ فر[illegible]ے اور ڈوروتھی جیسے لوگ ___ سلجھے ہوئے، خوبصورت، زندگی کی اصل مسرتوں سے فیض[illegible]ر ارام، میں جانتا ہوں، ہم کبھی فرینک ٹووے اور ڈوروتھی جیسے لوگ اور ان جیسے ڈاکٹر پیدا نہیں کریں گے۔ ہمارے گھٹے ہوئے ریاکارانہ ماحول میں، جہاں روپیہ اصل خدا ہے، صرف قصاب اور بے درد کاسہ لیس ہی وجود میں آسکتے ہیں!)

ہم نے بسنتی پھولوں کے درمیان ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ کر سینڈوچ کا لنچ کھایا۔ آگے جا کر پہاڑیاں ختم ہونے کو آنے لگیں اور منظر کی ساری کیفیت میں تبدیلی آ گئی۔ ''ہم''، جیسا کہ فرینک نے

Scanned with CamScanner

ہنستے ہوئے کہا، ''تہذیب کے نزدیک آرہے ہیں۔'' ہم نے مویشیوں کے گلے میں گھنٹیوں کی آوازیں سنیں، بھیڑوں کی ممیاہٹ۔ ہم ایک دو باڑ لگے کھیتوں کے پاس سے گزرے، جہاں صحت مند چرتی گائیں سر اٹھا کر اپنی بڑی متفکر آنکھوں سے ہمیں تکتی تھیں۔ اور پھر، اکرام، میں نے ایک معجزنما منظر دیکھا جسے میں بیان نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے میرے پاس الفاظ ہیں ہی نہیں۔ اسے دیکھ کر میرا اندر کا سانس اندر اور باہر کا سانس باہر رہ گیا۔ جنوب مشرق میں سبز لینڈ اسکیپ کے اوپر آسمان کا کچھ حصہ پیلے سونے کا سا ہو رہا تھا اور دو تین بادلوں کے ٹکڑے جو وہاں منڈلا رہے تھے، نیلے عنابی رنگ کے ہو گئے تھے، جیسے وہ نیلم اور زبرجد کی پہاڑیاں ہوں، سونے کے سمندر کو گھیرتی ہوئی اور اس میں راسیں اور آبنائیں اور جزیرے بناتی ہوئی... اور پھر تھوڑی دور آگے جا کر ہم نے وہاں قوس قزح دیکھی! قوس قزح — ''اللہ میاں دی پوڑی'' جیسا کہ ہم اپنے بچپن میں کہا کرتے تھے۔ میرے ساتھی اور میں قدرت کے اس کرشمے کو دیکھ کر دم بخود ہو گئے۔ انگلستان میں میرے قیام میں یہ میری پہلی قوس قزح تھی — اور آخری بھی۔ فرینک نے مجھے بتایا کہ لیک ڈسٹرکٹ میں قوس قزح کا بننا زیادہ غیر معمولی فینامینا نہیں۔ میرا دل سچ مچ شادمانی سے بھر گیا — اور شکرانے سے بھی!

فرینک ٹووے نے میرے کندھے کے گرد بازو حمائل کر کے جنوبی آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، ''تم دیکھ رہے ہو مسٹر خالے، وہ افق پر باریک سی لکیر — وہ، اس پہاڑی سے اس طرف! یہ ونڈرمیر کے کرک (گرجے) کا مینار ہے — تم اسے دیکھتے ہو؟ اب ہم تہذیب سے چند میل دور ہیں۔''

ونڈرمیر، جہاں مجھے پہنچنا تھا، یہاں سے کوے کی اُڑان کے مطابق پانچ چھ کوس سے کم نہ ہوگا، مگر سچ مچ کرک کا مینارہ مجھے کچھ کوشش کے ساتھ نظر آ گیا — افق پر ایک مدھم پنسل کی مانند چھپا ہوا۔ عجیب طور سے، اپنی منزل اور رات کی رہائش گاہ کے نشان کو دیکھ کر میرا دل خوشی سے نہ اچھلا۔ میں اس طلسماتی سفر کے انت پر پہنچ رہا تھا اور جلد ہی اپنے خوبصورت ساتھیوں، فرینک اور ڈوروتھی سے جدا ہو جانے والا تھا۔ وہ اپنے راستے پر چلے جائیں گے اور میں اپنی تنہا راہ پر۔ اور جیسا کہ انسانی زندگی کا طور ہے، ہمارا ملاپ اس دنیا میں پھر کبھی نہ ہوگا۔ کتنی حسین الوداعیں جو ہمارے دل میں کیٹس کی سانیٹ کی طرح دمکتی ہیں اور زندگی کو رہنے کے لائق بناتی ہیں، آخری ہوتی ہیں۔

Scanned with CamScanner

ہم ایک چھوٹے سے دیہاتی گھر پر پہنچے — پتھر کی دیواریں اور چھپر چھائی چھتیں — اور وہاں سہ پہر کے جھٹپٹے میں (فضا میں سونے کی ایک ہلکی سی چمک تھی) ہم نے کھردری لکڑی کی کرسیوں پر مکھن لگے تکونی نرم کیکوں اور تازہ اُبلے ہوئے انڈوں کے ساتھ چائے پی — مرغیاں ہمارے اردگرد کٹکٹاتی ہوئی، اور سنہری بالوں والا ایک نوجوان ایک بڑی قینچی سے ایک ممیاتی ہوئی بھیڑ سے اون کترتا ہوا! ہم اس اچھے گھر میں تنہا مہمان تھے۔ خاندان کی بیٹی نے، جو ایک اٹھارہ سالہ خوبصورت، سنجیدہ لڑکی تھی، چائے سروکی، اور فرینک نے اس سے، اور اس کی معمر ماں اور اون مونڈنے والے آدمی سے (جیک اس کا نام تھا) اِدھر اُدھر کی پُرلطف باتیں کیں۔ میں نے اپنا پائپ سلگایا اور سکون سے اسے پیتا رہا۔ جب ہم اپنی دعوت کا ہدیہ دے کر (جو حیران کن حد تک معمولی تھا!) وہاں سے اٹھے تو شام پڑ چکی تھی۔ ہم نے دیہاتی میزبانوں کا شکریہ ادا کیا اور انھیں الوداع کہی اور چند ایک ننھے ننھے کھیتوں کے پاس ہوتے ہوئے سڑک پر آ گئے۔ یہاں سے ہمارے راستے جدا ہوتے تھے۔ فرینک اور ڈوروتھی نے سڑک کے پار دو تین میل آگے ایک یوتھ ہاسٹل میں رات کا پڑاؤ کرنا تھا۔ مجھے سات میل دور وِنڈرمیر کی بس یہاں سے پکڑنی تھی۔ انھوں نے اصرار کیا کہ وہ مجھے بس میں سوار کر کے یہاں سے جائیں گے کیونکہ انھیں زیادہ دور نہیں جانا ہے اور رات ابھی نوجوان ہے۔ ہم نے ایک دوسرے کے پتے لکھے اور وعدہ کیا کہ ہم ایک دوسرے کو لکھتے اور یاد کرتے رہیں گے۔ (فرینک اور ڈوروتھی نے اپنے اڈنبرا کے ہسپتال سے مجھے کرسمس پر ایک کارڈ ضرور بھیجا تھا۔) اتنے میں بس دکھائی دی۔ میں نے ان سے ہاتھ ملایا۔ فرینک نے مجھے کچھ ہدایات دیں۔ میں نے دیکھا کہ ڈوروتھی کی بڑی بڑی نیلی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے — ایک نرم، محبت بھرا دل ڈوروتھی کا تھا اور شاید وہ ایک اجنبی، دور دیس سے آئے لڑکے کی تنہائی کا سوچ رہی تھی جو اس کی منتظر تھی۔ ہمدردی اور رحم اور شفقت کے آنسو اور شاید اس خوبصورت دن کے لیے شکرانے کے بھی جو ہم نے بیابانی گیبل کی بلندیوں پر اکٹھا گزارا تھا اور جواب صرف ایک یاد ہو کر لوٹے گا۔ میں اس کی اُلفت آمیز فکرمندی پر حیران سا ہوا اور بے حد اداس بھی۔ اکرام! ہم سب خودغرض سخت دل لوگ نہیں۔ ہم میں سے بہت سے ایک دوسرے کے دکھوں کی گونج کو اپنے دل میں پاتے ہیں، مگر اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے۔

بس آئی اور میں اس میں سوار ہو گیا۔ میں نے شیشے میں فرینک اور ڈوروتھی کو سڑک کے دوسری

طرف ایک چھوٹی سی پہاڑی پر چڑھتے دیکھا۔ میرے گلے میں ایک پھانس تھی ـــــ اور اس وقت میں پھر رویا، چپکے چپکے روتا رہا، یہاں تک کہ ہم ونڈر میر کے بازار میں داخل ہو گئے۔ میں اپنے ہیور سیک کو اٹھا کر بس سے اترا اور ہمت اور بہادری سے نیلی رات میں یوتھ ہاسٹل کی طرف چڑھنے لگا۔ اکرام! زندگی کے اس کٹھن اور بیشتر تنہا سفر کو طے کرنے کے لیے ہمیں اکثر ہمت اور بہادری کی ضرورت ہوتی ہے۔

(فنون، لاہور، جولائی اگست ۱۹۷۷ء)

❁

جب میں لڑکا تھا تو ہمارے مختصر سے مکان (ان دنوں وہ بڑا لمبا، پھیلا ہوا لگتا تھا) کے ایک سرے پر ایک چھپر تھا جہاں میرے باپ کا گھوڑا بندھا رہتا تھا۔ اس میں ایک طرف کھرلیاں بنی ہوئی تھیں۔ فرش پر بھوسے اور چارے کے ڈھیر لگے رہتے۔ مہندی سے لال رنگی داڑھی والا بوڑھا لاہیا (اس کا نام الٰہی بخش تھا، اگرچہ اسے اس نام کا پتا نہ تھا، اور ہم اسے بابا لاہیا کہا کرتے) اس جھونپڑے میں گداز جسم کی نوجوان بیوی بختو کے ساتھ رہتا تھا۔ بختو کے بارے میں مجھے یاد ہے کہ وہ ہمیشہ ہنستی رہتی، اور میرا خیال ہے بیچارے بابے لاہیے کی زیادہ پرواہ نہ کرتی تھی۔ وہ دن رات میں بغیر کسی وجہ کے غائب ہو جاتی اور بابا لاہیا اس کے یوں غائب ہونے پر بڑی فکر کرتا اور لمبی ٹھنڈی آہیں بھرتا۔ کبھی ہم بھائی بھی بابا لاہیا کے پاس چلے جاتے (اس کو پرانے قصے بہت یاد تھے!) اور ایک رات ہم نے اسے جگا کر گھوڑے کو چوری ہونے سے بھی بچایا۔ بابا لاہیا فارغ وقت میں ''قصہ یوسف زلیخا'' پڑھا کرتا (اس کے پاس یہی ایک کتاب تھی)۔ وہ اُسے بہت لہک لہک کر گاتا اور ہم حیرت اور استعجاب سے سنا کرتے۔

یوسف پچھے کویں زلیخا تیرا وقت وہایا
کہے زلیخا جیوں جیوں یوسف تینوں آکھ سنایا
یوسف پچھے دس زلیخا کتھے گئی جوانی
کہے زلیخا عشق تیرے تھیں کر چھڈی قربانی
یوسف پچھے دس زلیخا حسن کتھے اج تیرا
کہے زلیخا ہجر اڑھایا ہتھ نہ پہتا میرا

یوسف پچھے دس زلیخا کتھے چمک جمالوں
کہے زلیخا غماں بجھائی تیریوں دور وصالوں

یوسف زلیخا، ہیر رانجھا، سوہنی مہینوال اور مرزا صاحباں کے بیت میں نے اپنے لڑکپن میں کئی بار سنے — یاد نہیں کہ کب اور کس کس جگہ۔ پھر کالج کے زمانے میں میں انگریزی شاعری کے سحر تلے آیا۔ جان کیٹس، کالرج، ورڈز ورتھ، بائرن، شیلے، برنز، رابرٹ براؤننگ اور دوسرے بہت سے انگریز اور اسکاٹش شاعر میرے چہیتے ہو گئے اور میں ان کی نظمیں (خود کو بڑا دردمند اور رومینٹک محسوس کرتے ہوئے) بار بار دہراتا۔ جان کیٹس کی اوڈیں اور ''لا بیلے...''، کالرج کی ''کبلا خان'' اور ''کرسٹابل''، اور دوسروں کی کئی نظمیں مجھے زبانی یاد تھیں (اب وہ حافظے سے مٹنے لگی ہیں) اور میرے لیے انگریزی شاعری کے سوا کوئی اور شاعری وجود نہیں رکھتی تھی۔ میں نے اردو شاعری بہت کم پڑھی ہے اور غالباً اس زمانے کے تعصب کی وجہ سے اچھی سے اچھی غزل مجھے اب بھی متاثر نہیں کرتی۔ اقبال کو میں نے کالج میں پڑھا۔ اس کی بیشتر شاعری میرے فہم میں نہیں آتی تھی، اگرچہ اب میں اسے ایک جینیئس مانتا ہوں اور اس کی شاعری کی میں اس لیے تعریف کرتا ہوں کہ سب لوگ کرتے ہیں۔ نظیر اکبرآبادی اور میر انیس مجھے پسند تھے۔ غالب کی طرف میں زندگی میں دیر سے آیا، اور جب آیا، اس کی عظمت کا قائل ہو گیا۔ یقیناً اردو میں بڑے شاعر پیدا ہوئے ہیں اور بڑی شاعری لکھی گئی ہے... مگر پھر میں کہتا ہوں (میرا آغازِ شباب کا تعصب!) کیا اردو میں کسی نے جان کیٹس کی ''اوڈ ٹو نائٹنگیل'' جیسی نظم لکھی ہے جو اس دلگیری سے انسانی کرب اور دکھ کے زخموں کی پٹیاں کھولے اور اس طرح دل کے خون کو نچوڑ کر رکھ دے؟ کیا کبھی کوئی ایسی نظم لکھی جائے گی؟ (پڑھنے والے، مجھے معاف کرو! شاید میں اٹھارویں اور انیسویں صدی میں جیتا ہوا پرانا فوزی ہوں، اور اردو شاعری کے جدید رجحانات سے بے بہرہ!)

اور اب پایانِ عمر میں، جب پڑھنا اور لکھنا دونوں گراں اور تھکا دینے والے کام ہوتے جاتے ہیں اور میں نے اپنی سب انگریزی اور اردو ادب کی کتابیں اپنے بھانجوں بھانجیوں میں لٹا دی ہیں، میں اکثر اپنا جی پنجابی شاعری سے بہلاتا ہوں۔ میں نے پنجابی شاعری کے لیے ایک نیا ذوق دریافت کیا ہے اور بابے لاہیے کی طرح اس کے لمبے بیتوں کو خاص انداز میں لہک لہک کر پڑھتا ہوں۔ وارث شاہ کی اصلی ''ہیر'' کا نسخہ میں نے چند ماہ پہلے خود خریدا اور مولوی غلام رسول عالم پوری کا ''قصہ یوسف زلیخا''

اور میاں محمد بخش کا ''قصہ سیف الملوک'' مجھے ایک دوست نے لا دیے۔ پنجابی کو اردو رسم الخط میں پڑھنے کی ابھی مجھے پوری طرح مشق نہیں ہوئی۔ کئی ٹھیٹھ پرانے پنجابی الفاظ کو سمجھنے میں دقت بھی ہوتی ہے اور مجھے ان کتابوں کے کئی بیت پورا لطف لیے بغیر چھوڑنے پڑتے ہیں۔ مگر یہ شاعری مجھے ہمیشہ مسحور کرتی ہے۔ پنجابی شاعری جیسی شاعری شاید اور کسی زبان میں نہیں۔ یہ ساری کی ساری داستانی اور بیلڈ (ballad) شاعری ہے — ارضی، آتشیں اور توانا۔ اس کے لکھنے والے سادہ دہقان، مولوی، ہالی، چرواہے، جولاہے اور موچی تھے۔ میں ان کو جانتا ہوں، کیونکہ میں ان کے ہی بیچ سے پھوٹا ہوں۔ بھولے، مسجدوں میں قرآن، سعدی اور حافظ پڑھے ہوئے لوگ، ساگ اور کچے شلجم، باجرے کی روٹی، بھینس کے دودھ اور مکھن پر پلے دیہاتی — خوش طبعی اور زیرکی کے ساتھ، ٹھٹھول اور پھبتی اور البنوں کے شیدائی۔ وہ پرہیزگار اور نمازی تھے مگر ان کی نماز انھیں مسجد کے کنویں پر گھڑوں میں پانی بھرنے والی الھڑ دبکتی کڑیوں کی تاک جھانک سے نہیں روکتی تھی۔ ان کے جنسی جذبے شدید تھے۔ ان کے منکوحہ اور غیر منکوحہ عشق، رات کی اڑان اور شب بسری، چوری چھپے کے ناجائز تعلقات انھیں وہ قوت اور رنگینی بخشتے تھے جس کے بغیر ان کی طرز کی شاعری لکھی نہیں جا سکتی۔ انھی کے دم سے ان کے بیت تند و تیز جذبے سے سلگتے تھے۔ خون کو تیز دوڑانے والی دھڑکن انھی سے حاصل ہوتی تھی... ہاں، میں ان کو جانتا ہوں۔ میرے مورث ایسے ہی تھے، اور شعری قصے اور داستانیں جو انھوں نے لکھیں، ان کی جڑیں ہماری اپنی امیدوں، آرزوؤں اور ارمانوں میں مضبوط گڑی ہیں۔ پنجاب کا دل اس شاعری کے پرجوش بیتوں اور قطعوں میں دھڑکتا ہے جب کڑیل گھبرو لڑکے اور بوڑھے گاؤں کے سبزہ زار پر پورے چاند کی روشنی میں جمع ہوں تو ''ہیر'' یا ''مرزا صاحباں'' یا ''یوسف زلیخا'' کے خاص لہجے میں گائے ہوئے بیت اور بند جادو جگاتے ہیں — زندگی کا سارا حسن، اندوہ اور خوشی ان میں ہے، اور کتنی حکمت! کتنی زمینی دانائی!

مولوی غلام رسول عالم پوری ایک سادہ دیہاتی ہل جوتنے والے کا بیٹا تھا۔ بچپن میں وہ گھر کے ڈھور ڈنگر چراتا رہا۔ عالم پور کے ایک مولوی سے مسجد میں چند ایک عربی فارسی کتابیں پڑھیں اور ساتھ ہی گاؤں کے ایک دیہاتی اسکول میں مدرس ہو گیا۔ اس کے جگری دوست، جن میں وہ اٹھتا بیٹھتا تھا، کمی تھے، موچی، نائی اور جولاہے۔ وہ رومینٹک ضرور ہوگا، کیونکہ اس نے تین شادیاں کیں۔ اس کی تصانیف کے غیر مطبوعہ نسخے، جنھیں اس کے دوست جانی موچی نے اپنے پاس محفوظ کر رکھا تھا، سکھوں کے حملے

میں کھوئے گئے۔ جو تصانیف موجود ہیں اور چھپی ہیں، ان کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے — ''احسن القصص المعروف یوسف زلیخا''، ''داستان امیر حمزہ''، ''چٹھی غلام رسول''، ''چٹھی ہیرے شاہ''، ''سی حرفی سسی پنوں''، ''چوہٹ نامہ''، ''پند نامہ''... وہ اپنے دوستوں — جانی موچی، روشن علی، ہیرے شاہ قلندر وغیرہ — کو شعر میں چٹھیاں لکھا کرتا۔ دنیا سے گیا تو عمر سینتالیس سال تھی۔

مولوی غلام رسول خوش بختی سے جینئس تھا — ایک فطری شاعر!

یوسف پچھے دس زلیخا کتھے تیریاں چالاں
کہے زلیخا گم گیاں اوہ تیریاں وچ خیالاں
یوسف پچھے دس زلیخا کتھے تیریاں شاناں
کہے زلیخا اوہ دن گزرے بدلیا ہور زماناں
یوسف پچھے دس زلیخا نین تیرے کیوں روندے
کہے زلیخا میرے رخ تھیں گرد دکھاں دی دھوندے
یوسف پچھے دس زلیخا اج کتھے سرداری
کہے زلیخا درد تیرے نے لٹ کھڑی او ساری

ہم سب 'غیلم' ہیں — ٹالکین کے ناول ''لارڈ آف دی رنگز'' کی زیرزمیں مخلوق جو ہیٹ فریڈو کی مورڈار کی تاریک، بد مملکت، منحوس مملکت کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ ٹالکین کی اس حیرت ناک داستان میں (یہ ''طلسم ہوشربا'' کی طرح ایک داستان ہے) اپنے مخصوص جغرافیے، حدود اور مخلوقات کے ساتھ پریزاد بھی ہیں، چنچل بھتنے بھی اور چلنے والے دوست درخت بھی۔ مگر ہم ان میں سے نہیں۔ ہم غیلم ہیں۔ ازل سے جب ''گہراؤ کے اوپر اندھیرا تھا اور خدا کی روح پانی کی سطح پر جنبش کرتی تھی'' ہم غیلم ہی پیدا ہوئے اور صدیوں قرنوں کے گزرنے کے بعد بھی غیلم ہی ہیں۔ اور اگر ہم کہیں سفر کر رہے ہیں تو مورڈار کی تاریک بد مملکت کی طرف۔ ہم نری بدی، خود غرضی، مطلب پرستی، نفرت کی پوٹ ہیں۔ ماہام نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اگر اس کے متعلق سب باتیں معلوم ہو جائیں اور اس کے دوست اور جاننے والے اس کے ان خیالات کو جان لیں جو اس کے ذہن میں سے گزرتے ہیں تو وہ اسے ایک بے حد

Scanned with CamScanner

بدنفس، غلیظ انسان سمجھیں اور اس سے اس طرح کترائیں جیسے وہ کوڑھی ہو۔ یہ ہر انسان کے بارے میں سچ ہے۔ دیوتاؤں کی ہم پر بڑی رحمت ہے کہ دوسرے ہمارے خیالات نہیں پڑھ سکتے، کیونکہ اپنی ساری سج دھج، اسٹارچ لگے کالر، مہذب گفتگو اور معقول شائستہ وضع کے ساتھ، ہم روح میں کوڑھی ہیں۔ اسی طور خداوندوں کے خدا نے ہمیں پیدا کیا۔ وہ چہرہ جو ہم دوسروں کے سامنے لے کر جاتے ہیں، ہمارا اصل چہرہ نہیں۔

یہ غیلم بعض لمحات میں ہمارے اندر سے یکا یک نمودار ہو جاتا ہے اور ہم چونک اٹھتے ہیں۔ اس سے منہ پھیر کر ہم اپنے آپ سے پوچھتے ہیں، ''کیا یہ سچ مچ میں ہی ہوں؟''

جب لاکھوں انسان بنگال میں ایک طوفانی بادگرد میں چڑھتے ٹھوکتے پانیوں کی نذر ہو جاتے ہیں یا کئی سو کان کن ویلز کی ایک کان کے کسی حصے کے دب جانے سے روشنی اور زندگی سے محروم ہو جاتے ہیں تو کیا اس سے ہمارے معمولات میں کچھ فرق آتا ہے؟ کیا ہم اپنی اشتہا کھو دیتے ہیں یا ہمارے قہقہے پہلے سے دھیمے ہو جاتے ہیں؟ مطلقاً نہیں! ہم بظاہر غم اور دہشت کا اظہار کرتے ہیں، اور دل میں کچھ مسرت کی رمق بھی محسوس کرتے ہیں کہ پانی ہمارے اوپر نہیں دوڑے اور کان کے نیچے ہم نہیں دبے۔ ایک دوست یا رفیق کار مرتا ہے، ہم غمگین ہوتے ہیں، مگر دل کی گہرائیوں میں کہیں ایک رقیب یا ایک مقابل کے ہٹ جانے پر مطمئن ہوئے بغیر بھی نہیں رہ سکتے۔ ہم سڑک پر ایک زخمی اور مرتے ہوئے آدمی کو دیکھتے ہیں اور منہ پھیر کر اپنی راہ پر چلے جاتے ہیں۔ کتنے ہی شوہروں نے اپنی بیویوں کو اور کتنی ہی بیویوں نے اپنے شوہروں کو زہر دینے یا قتل کرنے کے منصوبے نہیں باندھے، اور بعض دفعہ ان کو عملی جامہ نہیں پہنایا؟ ایک باپ مرتا ہے۔ اس کے بیوی بچے اور رشتہ دار غم سے نڈھال ہو جاتے ہیں۔ مگر جلد ہی انھیں رہائی کا احساس ہوتا ہے اور بوڑھے آدمی کو بھول کر وہ اس کی چھوڑی ہوئی چیزوں اور ترکے کی بانٹ میں لگ جاتے ہیں۔ ایک بڑا عزیز دوست یا بھائی دنیا میں کوئی امتیازی کامیابی حاصل کرتا ہے اور ہم مسرور ہونے کی بجائے حسد کی آگ میں جل بھن کر کوئلہ ہو جاتے ہیں — ہم غیلم ہیں۔

اگلے دن میں نے اپنے دوست اکرام اللہ سے کہا، ''پوزیسونیس (possessiveness)

یعنی اپنے محبوب پر مکمل تصرف حاصل کرنے کی خواہش، دنیا کی سب سے بڑی لعنت ہے—سب سے خوفناک بلا!" اس نے جواب دیا، "پوزیسو ہونا اور پوزیسڈ ہونا دونوں ہی نہایت خوفناک ہیں۔"

میں 'پوزیسو' کا لفظ اس لیے استعمال کر رہا ہوں کہ اس کا اردو زبان میں کوئی متبادل نہیں۔ کوئی ایک لفظ نہیں جو اس کے پورے مفہوم کو ادا کر سکے۔ پوزیسو کے لیے منیر نیازی کے پاس "قبضہ گیر" کا لفظ ہے جو اتنا ہی اچھا لفظ ہے جتنا کہ ہو سکتا ہے۔ الف الحر اث، جو ہندی، اردو، فارسی، عربی لغت پر حاوی ہیں، پوزیسو کا اردو مترادف "تملکیت" بتاتے ہیں۔ پوزیسو لوگ وہ ہوتے ہیں جو اس ہستی کو جسے وہ دل سے چاہتے ہیں، اس بری طرح اپنے قبضے میں رکھنا چاہتے ہیں جس سے اس کے خیال و ذہن کی آزادی سلب ہو جائے۔ ان کو گوارا نہیں ہوتا کہ محبوب ہستی کسی اور کی صحبت میں گھومے پھرے یا جی بہلائے۔ وہ چاہتے ہیں کہ وہ ہستی ان کے ساتھ یک جان و دو قالب ہو۔ انھی کے ذہن سے سوچے، انھی کی نظروں سے دنیا کا نظارہ کرے اور اپنی کوئی الگ ذات یا الگ شوق نہ رکھے۔ پوزیسو لوگ اپنے محبوب کی ہر دم حفاظت کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا پُر شفقت پہرہ بڑا سخت ہوتا ہے، اور محبوب اس میں سے بچ نکلنے کی تمنا کرتا ہے۔ ان کے احساسات بہت جلد مجروح ہو جاتے ہیں اور وہ حسد نفرت کی ٹیسوں سے کسی دم خلاصی نہیں پاتے۔ مگر وہ اپنے محبوب کی خاطر ہر مصیبت مول لینے اور جان پر کھیل جانے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔

میرا خیال ہے جان کیٹس ایک پوزیسو عاشق تھا اور وہ دیہاتی خوبصورت لڑکی فینی بران جو اس کی نظموں یا خطوں کی مخاطب ہوتی تھی، انھیں اچھی طرح نہیں سمجھتی تھی۔ کیٹس کے مرنے پر وہ کچھ آسودہ دل ہوئی ہوگی کہ اب اسے اس پاگل شاعر سے شادی نہیں کرنا پڑے گی۔ اسے اتنی پوزیسونیس سے رہائی پانے پر نئے سرے سے زندگی مل گئی اور جلد ہی اس نے ایک دہقانی گنوار سے شادی کر لی اور آٹھ بیٹے بیٹیوں کی مطمئن، باعمل ماں ہو کر مری۔ ہیر رانجھے کا قصہ پڑھتے ہوئے مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ رانجھا غالباً بڑا پوزیسو ہوگا۔ ان چند مہا آنند کے لمحوں اور بوس و کنار کی گھڑیوں پر قانع نہ رہ کر جو اس نے سیالوں کے بیلے میں ہیر کے ساتھ گزاری تھیں، اس نے جوگی کا روپ دھارا، ہیر کے سسرال کے گاؤں میں دھونی رمائی اور آخر اسے اغوا کر کے لے اڑا۔ میں نہیں سمجھتا کہ ہیر اپنے خاوند کے گھر میں زیادہ ناخوش تھی، مگر رانجھا زیادہ مرد آدمی تھا، زیادہ ہٹ دھرم، اور اسے اس کے ساتھ جائے بغیر بن نہ

پڑی۔ اگر قسمت ان کو کچھ دیر بیاہتا جیون بتانے کی مہلت دیتی تو بہت اغلب تھا کہ ہیر کو اپنا پوزیسو عاشق زہر لگنے لگتا، کیونکہ دو شخص ایک دوسرے سے ایک ہی درجے کی تندی اور وارفتگی سے محبت نہیں کرتے۔ ہمیشہ ایک چاہنے والا ہوتا ہے اور دوسرا جو صرف چاہا جاتا ہے — ایک پوزیسر (possessor) اور دوسرا پوزیسڈ (possessed)۔

ایک دفعہ برطانیہ سے بمبئی آتے ہوئے جہاز پر ایک گل گوتھنی خوبصورت ڈچ عورت نے، جو ہندوستان میں اپنے شوہر کے پاس جا رہی تھی (وہ ٹراونکور میں کوئی پروفیسر تھا)، مجھ سے کہا، "جان اچھا آدمی ہے اور میں اس سے محبت کرتی ہوں گی مگر میں یہ نہیں سمجھ سکتی کہ وہ اس قدر پوزیسو کیوں ہے۔"

مجھے اس سے اتفاق ہے۔ میں خود یہ نہیں سمجھ سکتا کہ لوگ اتنے پوزیسو کیوں ہوتے ہیں۔ ہم ایک لمحے کی مخلوق ہیں اور ہمیں محبت غیر سنجیدگی سے، لاابالی ہو کر کرنی چاہیے۔ بھنورے کے لیے ضروری نہیں کہ وہ ایک ہی پھول کا رس چوسے۔ مگر دنیا میں پوزیسو لوگ موجود ہیں جنھیں اگر اس ہستی کی قربت نہ ملے جسے وہ چاہتے ہیں، تو زندگی ان کے لیے سب معنی کھو دیتی ہے اور وہ خزاں رسیدہ پھولوں کی طرح مرجھا کر مر جاتے ہیں۔

لاہور ثقافتی، علمی، تہذیبی روایات کا گہوارہ ہے جہاں ہر روز اتنی ادبی اور ثقافتی تقریبات ہوتی ہیں کہ ان میں سے ہر ایک میں شرکت کرنا ناممکن ہے۔ بہر حال، اگر آدمی کے پاس کرنے کو کچھ نہ ہو اور وہ اربابِ عقل و دانش کی محفل میں بیٹھ کر استفادہ کرنا چاہے تو وہ ہر روز تین چار تقریبات میں ضرور شامل ہو سکتا ہے۔ روزنامہ اخباروں میں لاہور کی اس دن کی سرگرمیوں کی ایک خاص خبر درج ہوتی ہے۔ وہ کچھ یوں ہوتی ہے۔ آپ اپنے رنگ کی مجلس کا انتخاب کر سکتے ہیں۔

آج لاہور میں

ساڑھے پانچ بجے شام۔ حلقۂ خدامِ ادب (اصلی) لاہور کا ہفتہ وار تنقیدی اجلاس وائی ایم سی اے ہال کے کسی خالی کمرے میں۔ شاہزادہ اورنگ زیب خاں صدارت کریں گے۔ مضمون خلیل خاں

Scanned with CamScanner

روپوش۔ افسانہ لعل یمن صاحب۔ نظم مسافر علی مسافر۔ چائے مضمون نگار پلائیں گے۔

پانچ بجے شام۔ تنظیم اصلاحِ ابدانِ مومنینِ عالم کی مجلس عاملہ اور عہدیداروں کا اجلاس اندرون موچی دروازہ، پنجاب پیڑا ہاؤس۔ میاں نور دین عرف نورا پہلوان صدارت کریں گے۔ مگدر ہمراہ نہ لاویں۔

چھ بجے شام۔ حلقۂ خدامِ ادب (نقلی) لاہور کا ہفتہ وار مذاکراتی وتنقیدی اجلاس۔ وائی ایم سی اے کی چھت پر۔ مضمون اللہ دتا چودھری۔ کہانی صبیحہ خانم۔ نظم مسافر علی مسافر۔

چھ بجے شام۔ پنجابی ادبی گڑھ کا ہفتہ وار اجلاس وائی ایم سی اے ریستوراں میں۔ خان بہادر صدارت کریں گے۔ استاد امام دین گجراتی کی برسی کے موقعے پر ان کے احباب واقربا مقالے اور نظمیں پڑھیں گے۔

بعد نمازِ ظہر۔ انجمن ہدایتِ ملتِ اسلامیہ کا ہفت روزہ اجلاس۔ الحاج فخر الدین مالک لاہور واچ ہاؤس صدارت کریں گے۔ جدے سے اسمگل کی ہوئی قیمتی گھڑیوں کی نمائش بھی ہوگی۔

بعد نمازِ عشا۔ مرکزی جامعہ اربابِ نور، خواجہ روڈ۔ الحاج مجتہد العصر علامہ ضیاء اللہ نوری فضائلِ اصحاب پر مبسوط تقریر کریں گے۔ صرف ٹخنوں سے اوپر تک شلوار پاجامہ پہننے والے حضرات ہی شمولیت کا شرف حاصل کر سکتے ہیں۔

سات بجے شام۔ مجلس فروغِ ادب کا تنقیدی اجلاس۔ دی مسلم ہاؤس کے کمرہ نمبر گیارہ میں۔ صدارت جلیل شکور مغرور۔ افسانہ انور دُلدل۔ غزلیات آبنوس عمر کوٹی۔ گھوڑے صحن میں باندھیں۔

گیارہ بجے دن۔ تسخیر جنات کے موضوع پر مجلس مذاکرہ بمقام میانی صاحب سمن آباد۔ ماہر روحانیات حضرت الحاج پروفیسر خبیر افلاکی مذاکرے کے بعد تسخیر جنات کے جدید عملیات کے بارے میں تقریر کریں گے اور عملی مظاہرہ بھی فرمائیں گے۔ سوالات کی اجازت نہیں ہوگی۔

نو بجے شام۔ حلقۂ شاہسوارانِ ادب کا خصوصی اجلاس بمقام سرفراز ٹی ہاؤس ہیرا منڈی۔ ڈاکٹر عبد القدیر سہیر اقبال کے فلسفۂ خودی پر نانِ شعیر کی وساطت سے اپنے خیالات کا اظہار کریں گے۔ محرکِ بحث مسٹر چراغ دین نان فروش۔ افسانہ لعل یمن صاحب۔ غزل مسافر علی مسافر۔

دس بجے رات۔ برائے ایصال ثواب نواب نواب بیگ جنتی مرحوم ودیگر متعلقہ ارواح۔ قرآن

خوانی ہوگی اور بیگم نواب نواب بیگ برقع میں خطاب کریں گی۔ قبرستان پچھمن پورہ بالمقابل آہو چشم سینما لاہور۔

بارہ بجے شب۔ مولانا عبرت حسین مرحوم قدس سرہ، مصنف "جنت میں قیام وطعام کا مسئلہ" و "راہنمائے جنت بمعہ پل صراط پر سے کیسے گزریں" جو مقبول عام ہیں اور ہر گھر میں موجود، بنفس نفیس عالم بالا سے نزول فرما کر خطاب کریں گے اور جنت کے بارے میں چند غلط فہمیوں کا ازالہ فرمائیں گے۔ حاضرین کے ہر قسم کے سوالات کا جواب بھی دیں گے۔ مزار حضرت کبڑے شاہ صاحب۔ بارہ دری دریائے راوی کے پرلی طرف۔

دس بجے شب۔ مجلس ترویج غزل گوئی کا ماہانہ اجلاس۔ مسافر علی مسافر صدارت کریں گے اور بعد میں نئی غزلیں بھی پیش کریں گے۔ بمقام تکیہ گانجہ خوراں، نزد سول لائنز پولیس اسٹیشن وچڑیا گھر، لاہور۔

(فنون، لاہور، اکتوبر نومبر ۱۹۷۷ء)

❁

صبح اخبار دیکھنے سے پتا چلا کہ پچھلے گھنٹے میں ملک بھر میں ہلاکت اور خوں ریزی کا بازار پھر گرم رہا۔ اس 'جنگ وجدال' کے تھمنے کی کوئی صورت دکھائی نہیں پڑتی۔ قوم اپنی تاریخ کا خونچکاں باب لکھ رہی ہے۔ کتنے ہی بوڑھے، جوان، عورتیں، مرد اور بچے ہر روز جامِ شہادت پی کر جنت کے طلب گار ہو چکے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں، قتل، خون اور مار دھاڑ کا دروازہ کب تک باز رہے گا؟ خبروں کے مطابق صرف کل کے روز ملک کے ایک حصے میں چالیس مرد وعورت جو بس میں سوار تھے، دو سوفٹ گہری کھڈ میں گر کر ہلاک ہو گئے۔ پندرہ آدمی شدید زخموں سے چور فوجی اسپتال پنڈی میں پڑے ہیں۔ خبر رساں ایجنسی کا کہنا ہے کہ بس کو ڈرائیور کی بجائے اس کا کنڈکٹر چلا رہا تھا، اور جس وقت وہ بس کو کھڈ میں لے گیا تو وہ سیٹی بجا رہا تھا اور ایک حیوانہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھیل رہی تھی جو اس کے اِس دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد بھی کھیلتی رہی۔ خوش قسمتی سے ڈرائیور انور علی ایک اسٹیشن پہلے ہی بس کو کنڈکٹر کے حوالے کر کے اتر گیا تھا، ورنہ ایک اور قیمتی جان ضائع ہو جاتی۔ کہتے ہیں اس اسٹیشن پر اس کی محبوبہ رہتی تھی۔ بیان کیا

جاتا ہے کہ وہ شاعر اور مزاح نگار ابن انشا کا ''فین'' تھا، کیونکہ محبوبہ کے گھر کی چوکھٹ کو عبور کرتے ہوئے وہ یہ شعر گا رہا تھا: ''قدموں میں تیرے جینا مرنا، اب دور یہاں سے جانا کیا''۔ بعد میں وہ محبوبہ کے گھر سے ہی گرفتار ہوا حالانکہ بہ آسانی باڑے کی طرف بھاگ سکتا تھا... الغرض ہماری سڑکیں اور بازار انسانی خون سے رنگین ہوتے جاتے ہیں (اگرچہ بعض کہتے ہیں، یہ لال دھبے پان کی پیکیں ہیں)۔ اللہ تعالیٰ اس ملک کا محافظ ہو اور اس میں بسنے والے گناہگاروں پر بے پایاں رحمت کا نزول فرمائے۔ آمین!

خبر میں یہ بھی درج ہے کہ پولیس کنٹرول افسر کے مطابق حادثے کی صحیح وجہ ابھی معلوم نہیں ہو سکی۔ یہ کبھی معلوم نہیں ہوگی۔ ڈرائیونگ لائسنس بنوانے میں اب قطعاً کوئی دشواری نہیں رہی۔ عام معصوم لوگوں کو، جو بسوں میں ڈرائیور کے ساتھ کی سیٹ پر بیٹھ چکے ہیں، گھر سے ٹریفک پولیس کے دفتر بلایا جاتا ہے، ان کی خدمت میں ڈرائیونگ لائسنس اور دوسرے کاغذات پیش کیے جاتے ہیں۔ اجرت کی ادائیگی دفتر سے باہر بڑ کے نیچے بیٹھے پان سگریٹ کے کھوکھے والے کو کی جاتی ہے۔ اس ملک میں بیشتر لوگوں کے پاس اب ڈرائیونگ لائسنس ہیں۔ وہ سڑک پر جتنے آدمی چاہیں ہلاک کر سکتے ہیں۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ کھڈوں اور درختوں کے پاس سے گزرتے ہوئے ڈرائیور کو ان سے نبرد آزما ہو کر اس بے مصرف زندگی سے چھٹکارا پانے کی شدید خواہش ہوتی ہے۔ اس کو غالباً اوڈی پس کمپلیکس کہتے ہیں۔ آدمی اپنی ماں کا سوچتا ہے، اسی میل کی رفتار سے گاڑی دوڑاتا ہے اور پہلے ہی کھڈ میں مسکراتا ہوا غوطہ زن ہو جاتا ہے۔ سواریاں بھی اس کے ساتھ مسکراتی ہوئی غوطہ زن ہو جاتی ہیں۔ کھڈوں اور درختوں کا ہم کچھ نہیں کر سکتے، وہ قانون سے بالاتر ہیں۔ ملک میں اس عام ہلاکت خیزی کی دوسری وجہ موٹر گاڑی یا بس چلانے والوں اور پیدل چلنے والوں میں جنگ ہے جو دن بدن شدت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ موٹرِسٹ جائز طور پر محسوس کرتے ہیں کہ سڑکیں ان کی گاڑیوں کے لیے بنائی گئی ہیں، اس لیے جب کوئی پیدل شخص اپنے دھیان میں سڑک پار کرتا ہے تو وہ اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور بچ کر نہیں جانے دیتے۔ ان دونوں طبقوں کے درمیان جنگ بندی کا کوئی امکان نہیں۔ موٹرسٹس کا پلہ بھاری ہے کیونکہ ان کے پاس پیدل چلنے والوں کو نیچے دینے کے لیے گاڑی ہے۔ خدایا! قوم اور ملت کا اس صورتِ حال میں کیا بنے گا!

Scanned with CamScanner

اگر میں گا سکتا تو درختوں کے گیت گاتا۔ جب سے میری موٹر خراب ہوئی ہے (اور میں چاہتا ہوں وہ خراب ہی پڑی رہے) میں واپڈا فلیٹس سے، جہاں میں رہتا ہوں، اپنا بریف کیس جھلاتا، پیدل ہی دفتر جاتا ہوں۔ میرا راستہ کچھ دور ریس کورس روڈ پر جاتا ہے۔ پھر میں لارنس روڈ پر مڑتا ہوں اور آدھ فرلانگ چل کر نرسری کے سامنے کے گیٹ سے اس باغ میں داخل ہوتا ہوں جو میرے لڑکپن اور جوانی میں لارنس باغ کہلاتا تھا اور اب باغِ جناح۔ مال، یعنی شاہراہِ قائدِ اعظم، پر اپنے دفتر پہنچنے کا یہ شارٹ کٹ ہے۔ (مجھے فلیٹس سے دفتر پہنچنے میں بمشکل بیس منٹ لگتے ہیں۔ میں اپنی ڈھلتی عمر کے باوجود کافی تیز تیز چل لیتا ہوں۔) پہلے کئی روز میں باغ میں سے اپنی تاریک سوچوں میں غرق، اردگرد کی درخشاں بوقلمونی سے بے خبر گزر جاتا رہا — اس آدمی کی طرح جس کا ہاضمہ خراب ہو اور جو سخت جلدی میں ہو۔ فطرت اپنے سارے تجمل اور شان سے میرے آس پاس تھی مگر میں اس سے بے پروا تھا۔ اپنی خودرحمی کے جذبات کی کوٹھری میں قید! میرے پاس درختوں کی بھڑک دار رنگینی دیکھنے کے لیے آنکھیں نہ تھیں۔ بدقسمت آدمی!

اور پھر کل صبح ایک عجیب اور حیرت ناک بات ہوئی۔ ابھی میں باغ کی دیوار کے پاس چلتا جاتا تھا اور اندر جانے کے گیٹ پر نہیں پہنچا تھا کہ ایک کوئل کی آواز میرے کان میں آئی۔ کتنی سریلی اور بے خود کر دینے والی یہ کوک تھی۔ میں چونک سا گیا جیسے میں نے زندگی میں پہلی بار یہ نغمے سنے ہوں۔ میرا دل شادمانی سے اُچھلا۔ میں رک گیا اور میرے سامنے دیوار کی دوسری طرف آموں اور نارنگیوں کے بغیچے میں ایک جیکورنڈا کا پیڑ کھڑا تھا۔ اس کا نام تنے سے جڑی ہوئی تختی پر سفید رنگا ہوا تھا ورنہ مجھے کیسے پتا چلتا کہ یہ جیکورنڈا ہے۔ میں اس کے پاس سے پہلے کتنی ہی بار آنکھ اٹھائے بغیر گزرا تھا اور اب اسے پہلی بار مسرت سے دیکھ رہا تھا۔ سو یہ جیکورنڈا تھا! میں اس درخت کے نام سے سالوں پہلے ایچ ای بیٹس کے برما کے ناول "جیکورنڈا ٹری" سے آشنا ہوا تھا اور یہ نام میرے اپنی افسانویت کی وجہ سے میرے ذہن میں اٹک گیا تھا۔ پھر سومرسٹ ماہام کی فار ایسٹ کہانیوں میں بھی جیکورنڈا کے درخت ملتے ہیں اور میں سوچا کرتا کہ خدا جانے یہ کیسا درخت ہوگا۔ اب میں نے اپنے اس جیکورنڈا کو بغور دیکھا (مجھے اب دفتر جانے کی جلدی نہ تھی)، اس کے تنے اور پتوں اور شاخوں کی ساخت اپنے ذہن میں بٹھائی تاکہ اسے ہر جگہ پہچان لوں۔ ایک اکزاٹک دمک میرے سارے وجود میں سرایت کر آئی تھی۔ بچپن کا جذبۂ حیرت، جو میں

سمجھتا تھا ہمیشہ کے لیے مجھ سے کھویا گیا ہے، لوٹ آیا تھا۔ جیکو رنڈا نے مجھے نئی زندگی اور نئی جولانی عطا کی تھی۔ میں آگے بڑھا۔ کوئل لگاتار گا رہی تھی۔ گیٹ تک چار پانچ اور جیکو رنڈا مجھے ملے۔ ایک جیکو رنڈا نے خیالات کا رخ محبت اور ناز و نیاز کی طرف پھیر دیا۔ اس کے تنے دو میں بٹتے تھے اور دونوں حصے عاشقوں کی راتوں کی طرح ایک دوسرے کے گرد اتنی بے حیائی کے انداز میں لپٹے تھے کہ میں کاما سوترا کے آسنوں کے بارے میں سوچنے لگا۔ ڈرٹی اولڈ مین، میں نے کہا، ہنری ملر اس جیکو رنڈا سے محبت کرے گا اور شاید اس کے بے حجابانہ نظارے سے اسے "سیکس ویلکس" سے آگے ایک اور جنسی شاہکار لکھنے کی اشتعالک ملے۔

میں باغ کے اندر داخل ہوا۔ اب یہ اس سے مختلف باغ تھا جس میں سے میں روزانہ موندی آنکھوں اور بہرے کانوں سے گزرا کرتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ جیسے میرے پاس اپنے سبز پوش رفیقوں سے ملنے اور ان سے باتیں کرنے کے لیے بے اندازہ وقت ہے — میں سڑک کو چھوڑ کر ان کے درمیان ان کے نام پڑھنے اور ان سے ہاتھ ملانے کے لیے ٹھہر ٹھہر کر چلنے لگا۔ وہ اپنے رنگا رنگ پہناوے پہنے خاموش کھڑے تھے اور مجھے یقین ہے میری دوستی نے انھیں شاد کیا ہوگا، کیونکہ درخت بھی ہماری طرح جیتے اور سانس لیتے ہیں، ہماری طرح وہ بھی کھلتے اور افسردہ ہوتے ہیں — اور بڑھاپا ان پر بھی آتا ہے اور وہ مرتے بھی ہیں؛ صرف یہ بات ہے کہ ان میں سے بعض بڑی لمبی عمر پاتے ہیں — انسانوں کی کئی نسلوں سے زیادہ لمبی۔ ان میں چھوٹے چنچل بچے، رعنا البیلے جوان اور متین چہرے والے مشفق بوڑھے ہوتے ہیں۔ زہریلی مخلوقات کو چھوڑ کر، ان کی کثرت آدمی کی نسل سے کوئی بغض اور کینہ نہیں رکھتی۔ میں ایک شاندار شاہانہ درخت کنگ چمپا کی طرف بڑھا اور ایک منٹ سر جھکا کر ادب سے کھڑا رہا کیونکہ وہ کنگ تھا۔ ایک دیو قامت مہیب سنبل کے تنے پر بے شمار ملاقاتیوں کے نام کھدے تھے۔ مقصود ڈار، اسلم ایاز، شیوا رنویدہ، ارشاد... کچنار، ارجن، پام، املتاس، یوکلپٹس، سرو اور کتنے ہی اکڑ انگ درخت (ان کے لاطینی نام کتنے بارعب تھے) اپنی جداگانہ وضع قطع اور رنگوں کے ہجوم میں اٹھلا رہے تھے۔ انھوں نے مجھے خوش آمدید کہا۔ ان کے درمیان گھومتے ہوئے میری روح ایک ایسے سکون سے ہمکنار ہوئی جسے اس نے پہلے کبھی نہیں جانا تھا۔

دن اب کافی چڑھ آیا تھا۔ مجھے دفتر کو دیر ہو رہی تھی۔ پھر بھی میں اپنے مہربان دوستوں سے رخصت لینا نہیں چاہتا تھا۔ انھوں نے اپنے خاموش، سیانے طریقے سے میرے دکھتے زخموں پر پھاہے

Scanned with CamScanner

رکھے تھے۔ ایسے شانتی اور دلاسا دینے والے دوست بے اعتنا، روکھی دنیا میں بھلا کہاں مل سکتے ہیں۔ میں آخر سڑک پر آنکلا۔ زندگی اب اچھی اور پُر معنی تھی اور میرے دل میں انبساط کا احساس تھا۔ باغ کے ایک کنج سے ایک فاختہ کوکی — کو! کو! کو! — اور اپنے چھوٹے سے گاؤں میں گزارے بچپن کے لمحے پھر زندہ ہو گئے۔ اس میرے گاؤں میں فاختائیں سارا سارا دن اپنا کوکو کا اداس نغمہ الاپتی رہتی تھیں۔ کتنا درد ہے اس آواز میں، میں نے سوچا۔ جان کیٹس نے اپنی بلبل کی لافانی ''اوڈ'' لکھی تھی۔ کیا ہماری اردو زبان میں کوئی ایسا شاعر نہیں جو فاختہ کی اوڈ لکھ سکے؟ فاختہ جس کی الاپ میں اتنا دکھ، اتنا اُنس اور اتنی خوبصورتی ہے۔ احمد ندیم قاسمی ہی ایک ایسا شاعر ہے جو ایسی اوڈ لکھ سکتا ہے — یا اپنی جوانی میں لکھ سکتا تھا۔

ایک موٹا بوڑھا آدمی، برہنہ بدن، لنگوٹا کسے، سر پر سولا ہیٹ پہنے، ایک بنچ پر بیٹھا تھا۔ اس نے مجھے الو کی سی آنکھوں سے جاتے ہوئے دیکھا — وہ شاید صحت کو بہتر کرنے اور کچھ سال مزید جینے کے لیے آفتابی شعاعیں جذب کرنے کے لیے آیا تھا۔ یہ منظر کامیکل (comical) اور کسی قدر فحش بھی تھا...

میں اب باغ سے باہر جانے کی سڑک پر تھا اور میرے دونوں طرف لمبے سیدھے تنے والے پُر شکوہ چیل کے پیڑ تھے — تنے سرخ اور مٹیالی تھگلیوں سے مزین اور شاخوں پر پتوں کے جھرمٹ جیسے شمع دان آویزاں ہوں۔ میں نے اس کا لاطینی نام پڑھا۔ جو — یہ یقیناً ہنری ملر کا چہیتا 'پنس' نہیں ہے۔ ڈرٹی اولڈ مین! کیا میرا انجام بھی ایک ڈرٹی اولڈ مین کا ہوگا جو ٹنکھیوں سے اسکول کی نوخیز لڑکیوں کو تاڑا کرے گا اور خلوت میں پورنو کتابوں کے مطالعے سے اپنی حرارت غریزی کو بڑھانے کی کوشش کرے گا؟ زیادہ غیر اغلب نہیں۔

کروڑ پتی مجھے بڑے موہنے لگتے ہیں اور میرے لیے عجیب کشش رکھتے ہیں، خصوصاً امریکی کروڑ پتی جن کی ذات ہی الگ ہے۔ ہاورڈ ہوگز اور پال گیٹی اور راک فیلر وغیرہ — میں ان پر جان چھڑکتا ہوں اور ان کی عادات وخصلات، حرکات وسکنات جاننے کی مجھے ہمیشہ کرید رہتی ہے۔ اگر ان کروڑ پتیوں کے نام کی کوئی فاؤنڈیشن مجھے مناسب وظیفہ دینے پر تیار ہو تو میں بڑی خوشی سے اپنی بقیہ عمر ان کی زندگی کی ریسرچ کرنے میں صرف کردوں۔ ایک میکسیکن فائیو اسٹار ہوٹل کی سب سے اوپر کی چالیسویں منزل پر پورے ونگ کو مہینوں برسوں تک تصرف میں رکھنا، چارٹرڈ جیٹ جہازوں میں پُر اسرار

Scanned with CamScanner

معاملاتِ زر کو سرانجام دینے کے لیے پُر اسرار مقامات کو مراجعت کرنا، خود اپنا خود کار ہتھیاروں سے لیس محافظ دستہ اور اپنے ذاتی جاسوس رکھنا، چاکلیٹ کیک اور شمپین پر اپنے قیمتی جسم کو پالنا پوسنا — کتنے مزے کی اور شان کی یہ زندگی ہوگی! یہ سچ ہے کہ دس کروڑ ڈالر بھی باغ کے پتوں اور پھولوں میں چھپی کوئل کا ترانہ نہیں خرید سکتے، نہ ہی وہ چند گھنٹوں کی گہری نیند لا سکتے ہیں، مگر کروڑ پتی ان چیزوں کی پروا نہیں کرتے۔ وہ ہزاروں دوسری چیزیں اور نوادر جن کا خیال ہمارے منھ میں پانی لے آتا ہے، حاصل کر سکتے ہیں۔ آخر وہی تو امریکی کامیابی کے معیار کے مطابق اصل کامیاب آدمی ہیں۔

کامیابی حاصل کرنے پر بہت سی امریکن راہنما کتابیں پڑھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کروڑ پتی بننا زیادہ مشکل نہیں۔ میرے خیال میں سب سے آسان طریقہ گھر میں کرنسی نوٹ چھاپنے کا پریس مہیا کرنا ہے، مگر مشکل یہ ہے کہ گورنمنٹ اس کی اجازت نہیں دیتی۔ گورنمنٹیں سب کرنسی نوٹ خود چھاپنا چاہتی ہیں۔ دوسرا طریقہ (جو بیشتر امریکی کروڑ پتیوں نے اختیار کیا) یہ ہے کہ جیب میں دو تین ڈالر ہوں اور تم کہیں اخبار بیچو۔ بیس تیس سال میں وہ تین ڈالر تین ارب ڈالر بن جائیں گے۔ تمھاری روح البتہ گدھ کی روح ہونی چاہیے اور تمھارا واحد مقصد ڈالر بنانا ہونا چاہیے۔ پہلا ارب بنانے کے بعد باقی ارب خود بخود بنتے جائیں گے۔ اپنے منافع کو ایک اور لمیٹڈ کارپوریشن میں لگانے سے تم اسٹیٹ کے ٹیکسوں سے بچ سکتے ہو۔ یہ ضرب المثل تو تم نے سنی ہوگی کہ اپنے پیسوں کی فکر کرو، روپے اپنی فکر خود کر لیں گے۔

لارڈ تھامپسن صاحب کا نام تم نے سنا ہوگا۔ کروڑ پتی ہونے کے بعد انگلستان میں لارڈ کا خطاب خود بخود مل جاتا ہے۔ تھامپسن ''لندن ٹائمز'' اور ''ڈیلی ایکسپریس'' سے لے کر کئی سو مقامی اخباروں کا بلا شرکتِ غیرے مالک ہے۔ ایک آدمی کے ہاتھ میں کتنی طاقت! یہ لارڈ تھامپسن صاحب اپنے بیٹے کین کی ہمراہی میں، جو اپنے باپ کی شرکت میں چھ ارب کی اخباری سلطنت کا چیئر مین ہے، لیموسین میں اپنے دفتر کو جا رہے تھے۔ کین نے جب اپنا صبح کا اخبار پڑھنے کے لیے کھولا تو تھامپسن سے نہ رہا گیا اور وہ پوچھ ہی بیٹھے، ''بیٹے کین! یہ کیا ہے؟''

کین نے جواب دیا، ''ابا جان، اخبار ہے۔ میرا مطلب ہے لندن ٹائمز۔''

''کہاں سے خریدا تم نے؟'' تھامپسن نے قدرے برہمی سے سوال کیا۔

''کونے کی دکان سے،'' کین نے جواب دیا۔

Scanned with CamScanner

''ہوں،'' عالی شان لارڈ نے مشوش لہجے میں کہا، ''بیٹے! اسے ابھی واپس لے جاؤ تاکہ کوئی اور اسے خرید سکے۔ میں اپنا اخبار ختم کر چکوں گا تو تم اسے پڑھ سکتے ہو۔''

چنانچہ کروڑ اور ارب ایسے ہی بنتے ہیں۔

(فنون، لاہور، اکتوبر نومبر ۱۹۷۸ء)

❁

یہ 'ص' تھا جس نے ایک بار انسانی رشتوں کی باہمی تلخیوں اور رنجشوں کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے سارتر کے ایک مشہور فقرے کو (جسے میں نے کبھی نہیں سنا تھا) دہرایا، ''جہنم... جہنم دوسرے لوگ ہیں!'' میں نے تب سوچا کہ سارتر اپنے سنکی پن میں بہت دور چلا گیا ہے، اور کیا یہ کہنا زیادہ سچ نہ ہوتا کہ ہم خود اپنے جہنم ہیں؟ بلاشبہ ہماری کئی جھنجھلاہٹیں، چڑچڑاہٹ اور برہمی کے دورے، ناخوشیاں اور چھوٹی چھوٹی روزمرہ کی رنجشیں دوسروں کی کہی یا کی گئی باتوں سے جنم لیتی ہیں، مگر کیا ایک بڑی حد تک ہماری یہ اذیتیں خود ہماری اپنی لائی ہوئی نہیں ہوتیں اور کیا ان کا سبب دور اندر بیٹھی ہماری کمینگیوں یا خود غرضیوں یا شاید جگر کی خرابی میں مضمر نہیں ہوتا؟ ہم میں سے اکثر اپنی ناک سے آگے نہیں دیکھتے۔ ہمارا آرام، اپنی دلچسپیاں، اپنے مقاصد ہمیشہ ہمارے پیش نظر رہتے ہیں (ہم مجسم بے خطائی اور نیکی ہیں) اور جب 'دوسرے' (دوسروں کی بے خطائی اور نیکی بھی قطعی ہے) کوئی ایسی حرکت کرتے ہیں جو ہماری طبیعت پر 'کمینی، چھوٹی اور گھٹیا' ہونے کی وجہ سے گراں گزرتی ہے تو ہم دوسروں کو کوسے اور ان کو چیدہ خطاب دیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ''اس نے بڑی ذلیل حرکت کی ہے۔'' ''میں کہتا ہوں وہ اچھا دوست ہے لیکن تمھارا کیا خیال ہے، وہ کچھ کچھ پاگل نہیں؟'' ہم اپنے دوسرے دوستوں کو کہتے ہیں۔ ان دوسرے دوستوں کی پیٹھ پیچھے ہم ایک اور سے اُن کے بارے میں ایسی رایوں کا اظہار کرنے سے نہیں چوکتے جن کو اگر وہ سن پائیں تو حیران رہ جائیں۔ اس لحاظ سے جہنم اگر ہم نہیں تو جہنم دوسرے لوگ ہیں۔ لیکن ان کے بغیر ہم اپنی خود آگاہی، غرور، تحمل، لگن کہاں پائیں گے؟ وہی ہماری زندگی میں مقصد اور لطف بھی تو لاتے ہیں۔ تم بتاؤ، بھلا اپنے چند دوستوں کے بغیر جو ہمیں عزیز ہیں اور جن کی صحبت (ان کی کمینگی، چھوٹے پن اور دیوانگی کے باوجود) ہمیں مسرت بہم پہنچاتی ہے، ہم کہاں ہوں گے؟ وہ ہمارے پسینے کی

جگہ خون بہانے والے نہ ہوں، خودرائے اور خودسر ہوں، ہمارا چہیتا ادیب یا موسیقاران کے لیے زہر ہو — ان کی سنگت میں ہمیں اپنی مایوسی اور غم کا تریاق بھی تو ملتا ہے اور اچھی گفتگو میں چہرے اور روح میں چمک بھی تو آتی ہے۔ اپنے بچوں کے بغیر ہم کہاں ہوں گے (ان کے نالائق یا بہی یا لاپروا ہونے کے باوجود!) جن میں ہم اپنا بچپن دوبارہ جیتے ہیں، اور جن کی محبت دنیا کی بڑی نعمتوں میں سے ایک ہے؟ اپنی ٹوک ٹوک کرنا ک میں دم کرنے والی بیوی کے بغیر ہم کہاں ہوں گے، جو بلاشبہ ہمارے اونچے مقاصد اور ارفع خیالی کو نہیں سمجھتی اور اس میں اور ہم میں کوئی چیز سانجھی نہیں؟ ان سب کو لے لو اور دوسرے چھوٹے بڑے لوگوں کو بھی جو زندگی کی سڑک پر ہم سے آن ملتے ہیں اور ہمارے چہروں پر مسکراہٹ لے آتے ہیں— کیا ان کے بغیر دنیا کچھ رہ جاتا ہے جس کے لیے جیا جائے؟ میں جانتا ہوں، ایسے لوگ ہیں جو اپنے بالا خانوں میں زندگی سے کٹے ہوئے شب خوابی کے لباس میں رہتے ہیں یا پہاڑوں پر اسی جگہ جا کر دھونی زمانے کے متمنی ہوتے ہیں جہاں دور دور تک کوئی ہم نفس نہ ہو (میں بھی کچھ کچھ ان لوگوں میں سے ہوں)۔ مگر ان سنکیوں، روا قیوں کو چھوڑ کر، ہم سارے اسی جہنم کے لیے زندہ ہیں اور اسی کی تپش اور ستیز میں جیتے رہنا چاہتے ہیں۔ ''تنہائی نہایت ہی خوفناک شے ہے،'' جیسے چیخوف کا ایک کردار کہتا ہے، ''اور ہم میں سے بعض کے لیے تو ناقابل برداشت!''

جو واقعہ میں سنانے چلا تھا، اس سے میں ایک اور طرف ہٹ گیا ہوں اور اس کے لیے پڑھنے والے سے معافی کا خواستگار ہوں۔ 'ص' نے سارتر کا یہ فقرہ دوہرایا کہ ''جہنم دوسرے لوگ ہیں!'' اور اس کے بعد چند ہفتے ہی ہوئے تھے کہ 'ص' اور میرے تعلقات کے ضمن میں سارتر کا جملہ سچ ہونے لگا اور ہماری دوستی کے سرسبز مرغزار میں یخ بستہ ہوائیں چلنے لگیں۔ اس کا کوئی ظاہری سبب بھی نہ تھا۔ میں اسے ایک غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک انسان سمجھتا تھا، سحر انگیز گفتگو کرنے والا، نستعلیق اور پر تکلف، ہر شے میں قرینے کا قائل، دوستوں سے بے حد مخلص۔ اردو اور انگریزی ادب میں اس کا ذوق اعلیٰ اور وسیع نوعیت کا تھا— اور ایسا لگتا تھا کہ کوئی شاہکار ایسا نہیں جو اس نے نہ پڑھا ہو۔ موسیقی سے بھی اسے محبت تھی اور عظیم پینٹرز کی تصویروں کے مجموعوں کی کتابیں اس کے سینکٹم (sanctum) کتب خانے میں سجی تھیں۔ وہ میری بھی چند چیزوں کا، جو اس نے پڑھی تھیں، پرجوش اور پرخلوص مداح تھا۔ کوئی وجہ نہ تھی کہ ایسی اچھی دوستی، جو دونوں طرف سے اخلاص اور دلی قدر پر مبنی تھی، اور زیادہ نہ پھلے پھولے۔

Scanned with CamScanner

دو تین مہینے تک یہ حقیقتاً تنومند ہوتی گئی اور ہم ایک دوسرے کے کافی قریب آنے لگے۔ پھر اچانک چند چیزیں، چند واقعات ایسے ہوئے کہ وہ پہلے کی پرتکلف (وہ ہمیشہ پرتکلف ہی تھی) گرم جوشی سرد ہوتی گئی۔ شکوک اور غلط فہمیاں اُبھر آئیں۔ ہم انھیں دور کرنے کی بجائے ایک دوسرے سے نظر بچا کر نکلنے لگے۔ ہماری طویل ملاقاتیں اور گفتگوئیں یکسر ختم ہو گئیں۔ اور میں جانتا ہوں کہ ہماری دوستی اب کبھی بھی ویسی استوار نہ ہو پائے گی جیسی کہ وہ پہلے تھی، خواہ میں کتنا ہی ایک خاص معاملے میں اپنی روش کی صفائی دوں۔

اور صفائی اتنی آسان نہیں اور میں خود کو کسی قدر سفلہ پن اور بے وفائی کے جرم سے بری الذمہ قرار نہیں دے سکتا۔ میں نے 'ص' جیسے پوزیسو دوست کا دل ضرور توڑا اور ایک ایسی حرکت کی جس کے متعلق وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ میں کروں گا۔ جب اس نے میری روش کا ایک ساجھے دوست سے سنا تو پہلے تو اسے اس کا یقین نہ آیا۔ میں ایسی چیز بھلا اس کو بتائے بغیر، اس سے مشورہ کیے بغیر کیونکر کر سکتا تھا! جب اسے اس کا یقین دلایا گیا اور اس نے جان لیا کہ بات سچی ہے تو وہ لڑکھڑا گیا۔ اس کے دل کو شدید دھچکا پہنچا، اور میں گمان کر سکتا ہوں کہ وہ تقریباً رو پڑنے کے قریب ہو گیا ہو گا۔ اتفاق سے میں ان دنوں اس کے پاس معاملے کی وضاحت کرنے اور اپنی صفائی دینے کے لیے بھی نہ جا سکا۔ میرا ضمیر صاف نہ تھا کہ اس کا سامنا کرتا۔ میری وضاحت کچھ کچھ اس کی بدگمانی کو دور کر دیتی، مگر زیادہ نہیں۔ میرا لگایا ہوا زخم 'ص' جیسے پوزیسو اور شدید احساسات رکھنے والے شخص کے لیے ہر لحاظ سے کاری تھا۔

بات معمولی تھی۔ ایک اور مزاج اور افتادِ طبع کا آدمی اسے زیادہ اہمیت نہ دیتا اور ہنس دیتا—— مگر 'ص' نہیں! اسی کے کہنے پر، اور اس کے ہمت بندھانے پر، میں نے ایک انگریزی کلاسک کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ اس نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ اسے اپنے ایک میگزین میں، جسے وہ اگلے سال کے آخر تک نکالنے کا ارادہ رکھتا تھا، شائع کر دے گا۔ میں نے ترجمہ بڑی لگن سے اور دل لگا کر کیا تھا اور قدرتی طور پر خواہش مند تھا کہ وہ جلد از جلد چھپ جائے اور میرے بچے، جن کے نام میں نے اس کا انتساب کیا تھا، کتاب کے سرِ آغاز میں اپنے نام کو چھپا ہوا دیکھ لیں۔ دو تین دوستوں نے مجھے کہا کہ 'ص' کا منصوبہ مشکل سے پایۂ تکمیل کو پہنچے گا اور کتاب کبھی شائع نہ ہو گی۔ بہر حال، میں نے اپنے قول کا پاس کیا اور مسودہ 'ص' کو دے دیا۔ 'ص' نے مجھے کہا کہ رسالہ ضرور شائع ہو گا اور اپنے خوابوں کو حقیقت کا جامہ پہنانا اس کے بس میں ہے۔ 'ص' نے اسے اپنے پاس رکھ لیا۔ وہ اسے اپنی فرصت میں پڑھ سکتا تھا۔

Scanned with CamScanner

رسالے کا مرحلہ ابھی کافی دور تھا اور اس کے ذہن پر کئی اور باتیں تھیں۔ اسی عرصے میں میرے اور 'ص' کے ایک باہمی دوست نے، جو میرے اس ترجمے کے بارے میں جانتا تھا، رائے دی کہ میں اسے کیوں ایک ادبی ترقی کے ادارے کو پیش نہیں کرتا جو اسے بخوشی چھاپنے کو تیار ہو جائیں گے۔ میں نے اس ادارے کے ناظم کو خط لکھا کہ میں اپنی کتاب کو اشاعت کے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ بورڈ کی میٹنگ میں کچھ بحث کے بعد کتاب اشاعت کے لیے منظور ہو ہی گئی۔ اس طرح اس کی جلد اشاعت کے امکانات روشن ہو گئے اور میں خوش تھا۔ میں نے مسودہ 'ص' سے یہ کہہ کر لے لیا کہ میں اس پر ایک نظر اور ڈالنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد جلد ہی 'ص' کو پتا چل گیا کہ ایک اور ادارہ اس کی اشاعت پر غور کر رہا ہے۔ وہ جائز طور پر اس خبر سے رنجیدہ اور برہم ہوا۔ جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں، میں اس کے ہاں ایک دو بار اپنے دوستوں 'الف' اور 'ک' کے ہمراہ گیا بھی، تا کہ اپنی صفائی دے سکوں، مگر اتفاق سے 'ص' باہر تھا۔ ایک بار جو وہ ہمیں گھر پر مل گیا (دوبارہ کوشش کرنے کے بعد) تو وہ قدرے نارمل اور لیے دیے رہا اور سرد مہری اور ہلکے سے کھنچاؤ کی کیفیت اس کے چہرے سے، اس کے سارے انداز سے ہویدا تھی۔ وہ اپنی گفتگو میں خوش اخلاقی برتتا رہا، مگر اس نے ہمیں اپنے سینکٹم کتب خانے میں مدعو نہ کیا، نہ چائے کو پوچھا۔ اس سرد ماحول میں میں اپنے ترجمے کی دوسرے ادارے میں اشاعت کا ذکر نہ کر سکا۔ جلد ہی ہم اٹھے۔ اس نے خلافِ وضع ہم سے تھوڑی دیر اور بیٹھنے پر اصرار نہ کیا، جیسا کہ وہ ہمیشہ کرتا تھا، نہ ہی پھاٹک پر کار کے جانے تک تسلیمات بجا لانے کے لیے رُکا۔ وہ یقیناً اس وقت تک ساری کہانی سن چکا تھا۔

پھر 'الف' ایک دن مجھے ملا۔ اس نے بتایا کہ 'ص' میرے کتاب کو ایک اور ادارے کو دے دینے پر انتہائی اَپ سیٹ ہے، بے حد دل گرفتہ۔ 'ص' نے کہا کہ اسے مجھ سے یہ امید نہیں تھی اور یہ میں کیونکر کر سکتا تھا، ضرور میں دوسروں کے کہنے میں آ گیا ہوں گا۔ 'ص' نے کہا تھا کہ زندگی میں مجھے کم ہی کسی اور بات سے اتنا شدید دھچکا پہنچا ہے۔ 'ص' سے اپنی اس ملاقات کا قصہ سناتے ہوئے 'الف' نے تعجب کیا۔ ''میں نہیں سمجھ سکتا 'ص' اس پر اس قدر اَپ سیٹ کیوں ہے۔ وہ خوابوں میں بستا ہے۔ اس کا میگزین نکالنے کا خواب خدا جانے کب شرمندۂ تعبیر ہو۔ اور پھر تمھاری کتاب میگزین میں چھپنے سے ضائع بھی ہو جاتی اور ننھے پڑھنے والوں کے ہاتھوں میں کبھی نہ پہنچتی...'' میں 'ص' کے شدید احساسات کو سمجھتا تھا اور جانتا تھا کہ وہ انتہائی اَپ سیٹ ہو گا۔

Scanned with CamScanner

میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ ذہنی اذیت اور بدگمانی کی فضا زیادہ دیر ہم دنوں کے درمیان جاری رہے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں جوں توں، جی کڑا کر کے اس کے ہاں جاؤں گا اور سارے معاملے کی وضاحت کروں گا اور اپنے اس shabby behaviour کی معافی چاہوں گا۔ جس دن میرا اس کے ہاں شام کو جانے کا ارادہ تھا، اس دن وہ اتفاق سے مجھے کوآپرا بک شاپ پر مل گیا۔ 'ک' اور میں وہاں دفتر کے بعد کتابیں دیکھ رہے تھے کہ اتنے میں 'ص' اپنے نسواری پاجامہ قمیص کے بے شکن سوٹ میں ملبوس، بڑی بڑی روشن آنکھیں وا کیے، ایک روبوٹ کی طرح اندر کودتا ہوا آیا۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا، غالباً کوآپرا کا کوئی کارندہ۔ 'ک' اور میں نے اس سے ہاتھ ملایا، چند اِدھر اُدھر کی باتیں کیں، مگر اس کا رویہ نارمل اور رکھ رکھاؤ کا تھا — پرانی گرم جوشی کے ایک اشارے کے بغیر۔ تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد وہ دکان کے اندر چلا گیا۔ ہم دکان کی بیرونی گیلری میں تھے۔ دس بارہ منٹ کے بعد وہ باہر جانے کے لیے ہمارے پاس سے گزرا۔ ''اچھا، السلام علیکم،'' اس نے ہاتھ بڑھائے بغیر کہا۔ وہ جا رہا تھا۔ میں اس سے ابھی بات کیوں نہ کرلوں، میں نے سوچا اور اس کے پیچھے لپکا۔ ''ص صاحب،'' میں نے کہا۔ ہم ایک دوسرے کو صاحب کا لقب دیے بغیر بات نہیں کرتے کیونکہ 'ص' بڑا پرتکلف، نستعلیق شخص ہے۔ ''مجھے آپ سے ایک وضاحت کرنا تھی اور اس کے لیے آپ کے ہاں دو تین بار حاضر بھی ہوا...'' اور اپنی ٹوٹی پھوٹی گنگا جمنی اردو میں — میں اٹک اٹک کر گفتگو کرنے والا ہوں — میں نے اس ترجمے کی واردات سنانے کی کوشش کی۔ اس کا دل میری طرف سے صاف نہ تھا۔ ایک برتری کی قدرے تلخ مسکراہٹ اس کے چہرے پر آئی اور وہ پھٹ پڑا۔ شاید پھٹ پڑنے کی اصطلاح 'ص' کے لیے استعمال نہیں کی جاسکتی کیونکہ اس کی گفتگو ہمیشہ شستہ، مہذب اور پرتکلف رہتی ہے۔ اس کے لہجے میں البتہ زہرآلود سرزنش کی آنچ تھی۔

''خ صاحب،'' اس کے الفاظ کچھ اس طرح تھے۔ ''مجھے آپ سے اس کی توقع نہ تھی۔ جب وہ لوگ جنھیں تم اپنی محبت میں اتنے اونچے مقام پر جگہ دو، ان کی دوستی پر نازاں ہو، تمھیں اس طرح پچھاڑ دیں تو تمھاری موت واقع ہو جاتی ہے۔ آپ نے اپنے رویے سے دوستی کے تقدس میں میرے عقیدے کو جڑوں تک ہلا دیا ہے... میری سمجھ میں نہیں آتا...''

''سنیے تو ص صاحب'' میں نے لنگڑاتی زبان میں کہا، ''میرا خیال ہے آپ اسے زیادہ

Scanned with CamScanner

seriously لے رہے ہیں۔ بات معمولی ہے...''

''خ صاحب،'' اس نے کہا، ''میری زندگی میں اور کیا ہے — بس کتابوں اور دوستوں کا عشق۔ انھی کے لیے میں جیتا ہوں۔ جب دوست اس طرح گہرے گھاؤ لگائیں، جیسے آپ نے لگایا ہے، تو پھر مائیے، جینے کے لیے کیا رہ جاتا ہے... اور خ صاحب، وہ کتاب آپ کی تو نہیں تھی، میری تھی۔ میرے کہنے پر، میرے اصرار پر آپ نے اس کا ترجمہ کیا تھا... میرے لیے، میرے میگزین کے لیے...''

''میں مانتا ہوں میں نے بری حرکت کی ہے، ص صاحب،'' میں نے کہا، ''مگر میں نے یہ خیال کیا کہ آپ کا میگزین شاید اور چار پانچ سال تک نہ چھپ سکے... اور قدرتی طور پر میری خواہش تھی کہ یہ جلدی کتابی شکل میں شائع ہو جائے۔''

''خ صاحب،'' 'ص' کے لہجے میں تلخی اور دکھ بھرا تھا۔ ''میں نے آپ کو کہا تھا کہ مجھے اپنے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کرنے کا طریقہ آتا ہے... اور اگر میگزین کی اشاعت میں چار پانچ سال بھی لگ جاتے تو اس کا کیا ہوتا۔ خ صاحب، دوستی میں تو چار پانچ سال کا عرصہ کچھ وقعت نہیں رکھتا...''

ہم اس انداز میں کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ ہمارا دل صاف نہ ہوا، اور پھر وہ جلدی میں چلا گیا، جیسے وہ اس گفتگو کو زیادہ دیر جاری نہ رکھنا چاہتا ہو۔ ہماری باتوں کے دوران 'ک' ہٹ کر ذرا دور دکان کے اندر چلا گیا تھا، مگر اس نے سب کچھ سنا۔ 'ص' کے جانے کے بعد اس نے کہا، ''تمھیں اس قدر معذرت کا لہجہ اختیار نہیں کرنا چاہیے تھا۔ 'ص' خواہ مخواہ اتنا اگریسو (aggressive) ہو رہا تھا۔ آخر بات کیا ہے؟ کہ تم نے اپنی ایک کتاب جلد اشاعت کے لیے ایک ادارے کو دے دی جو اسے جلد چھاپ دے گا؟ کون سی قیامت آ گئی اس پر؟''

مگر میں 'ص' اور اس جیسے دوسرے پوزیسو اور جامع دوستوں کے احساسات سمجھ سکتا ہوں۔ 'ص' کے لیے یہ معمولی واقعہ نہیں بلکہ اس کی زندگی کا ایک بہت بڑا حادثہ تھا۔ اس کا یہ زخم کبھی نہیں بھرے گا، اور مجھے اس کا افسوس ہے کہ اسے لگانے والا میں ہوں۔ میں اب بھی کبھی اس کے ہاں جا کر معافی مانگنا چاہتا ہوں، مگر کسی طرح ہمت نہیں پڑتی... اور فائدہ کیا ہوگا؟ دلوں کی کھٹک اسی طرح باقی رہے گی۔

'ص' نے — میرا مطلب ہے سارتر نے — ٹھیک ہی تو کہا ہے، ''جہنم دوسرے لوگ ہیں۔''

(فنون، لاہور، جنوری فروری ۱۹۸۰ء)

Scanned with CamScanner

ضمیمہ

Scanned with CamScanner

محمد خالد اختر

ایک دیباچہ جو چھپ نہ سکا

لیوس کیرول (Lewis Carol) انگریزی ادب میں بہت مشہور نام ہے۔ اس کی دو کتابیں ''ایلس ان ونڈر لینڈ'' (Alice in Wonderland) اور ''تھرو دی لکنگ گلاس'' (Through the Looking Glass) بچوں کی کہانیوں میں کلاسک کا مرتبہ رکھتی ہیں اور ان کا ترجمہ دنیا کی بیشتر زبانوں میں متعدد بار ہو چکا ہے۔ ان کہانیوں کے انوکھے اوٹ پٹانگ (nonsencial) پگلے کردار — میڈ ہیٹر، سفید خرگوش، باگھڑ چوہا، ٹویڈل ڈم اور ٹویڈل ڈی — انگلستان کی لوک کہانیوں کا حصہ بن چکے ہیں اور سب بچے اور بڑے انھیں اچھی طرح جانتے ہیں۔ جب مصنف مرا، ایلس کے یہ قصے بچوں کے ادب کی مقبول ترین کتابوں کا درجہ پا چکے تھے۔ ۱۹۳۲ء میں جب لیوس کیرول کی برسی منائی گئی، ان کہانیوں کا شمار دنیا کی مشہور ترین کہانیوں میں ہونے لگا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سدا بہار کتابیں، جن میں انگریزی مزاج اپنے اعلیٰ ترین معیار کو چھوتا ہے، رہتی دنیا تک زندہ رہیں گی اور چھوٹے بڑوں کو باغ باغ کریں گی۔

ہمارے مصنف لیوس کیرول کا اصل نام چارلس لڈوج ڈاجسر (Charlis Ludwidge Dodgsor) تھا۔ یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے۔ پیشے کے لحاظ سے وہ حساب دان تھے اور انگلستان کی مشہور یونیورسٹی آکسفورڈ میں یہ خشک مضمون پڑھاتے تھے جس سے اکثر بچوں کی جان جاتی ہے۔ انھوں نے حساب، الجبرا اور جیومیٹری پر کئی ایک موٹی موٹی کتابیں شائع کیں، جواب دستیاب نہیں۔ ڈاجسر حساب کے مشکل سوالات اور پیچیدہ معموں میں مغز کھپانے سے تھک کر اپنے ذہن کو پُر لطف سوچوں اور عجیب خیالوں سے تازہ دم کرنے بیٹھ جاتے۔ بعد میں انھوں نے اپنے دوستوں کے بچوں کا جی خوش کرنے کو انھی خیالوں کو انوکھی کہانیوں کی شکل دے دی۔ شاید وہ ہکلانے کی وجہ سے

Scanned with CamScanner

شرمیلے اور جھینپو قسم کے انسان تھے اور بڑوں سے ملنے جلنے سے پریشان ہو جاتے تھے۔ بچوں کے ساتھ وہ خوب ہنستے، گھل مل جاتے اور انھیں مزے مزے کی کہانیاں گھڑ گھڑ کر سناتے۔ ڈاجسر پینسٹھ برس کے ہو کر مرے۔ انھوں نے شادی نہیں کی۔ مرنے سے کئی برس پہلے سے وہ آکسفورڈ کے بوڑھے کنوارے کہے جانے لگے۔ ڈاجسر نے جان جوکھوں سے ڈرائنگ بھی سیکھی۔ ان کو کیمرے سے بچوں کی تصویریں کھینچنے کا بہت شوق تھا اور اس فن میں کمال مہارت بھی پیدا کر لی۔ بچوں کے جو فوٹوگراف انھوں نے بنائے ہیں، وہ اعلیٰ پائے کے ہیں۔

ایلس کی پہلی کتاب ''ایلس ان ونڈر لینڈ'' انھوں نے ہاتھ سے پہلے اپنے دوست ڈین لڈل کی چھوٹی بچی (جس کا نام ایلس تھا) کا جی بہلانے کی خاطر لکھی۔ اس میں ان کے اپنے ہاتھ کی بنی ہوئی تصویریں بھی تھیں۔ اصل مسودہ بہت چھوٹا تھا، پھر اپنے دوست جارج میکڈانلڈ (George MacDonald) کے کہنے پر اسے اشاعت کی خاطر بہت کچھ بڑھا دیا اور اس میں کئی ایک تبدیلیاں بھی کر دیں۔ جان ٹینیل نے، جو بعد میں سر جان ٹینیل ہوئے، ڈاجسر کی ہدایت کے مطابق وہ مشہور تصویریں بنائیں جو اب کہانی کا حصہ بن چکی ہیں۔ ''ایلس اِن ونڈر لینڈ'' چھپی تو ڈاجسر نسبتاً جوان تھے، یہی کوئی چالیس پینتالیس برس کے۔ ایلس کی دوسری کتاب ''تھرو دی لکنگ گلاس''، جس کا خیال شطرنج کی بازی سے لیا گیا ہے، ۱۸۷۲ء میں چھپی اور کئی لحاظ سے پہلی کتاب سے بھی بڑھ چڑھ کر ہے۔ ہاں، ڈاجسر کو شاعری سے بھی شغف تھا اور ان کی ایک نظم ''ہنٹنگ آف دی اسنیک'' (Hunting of the Snake) تو انگریزی زبان کی بہترین خیالی نظم مانی جاتی ہے۔ ایلس کی کتابوں میں ان کی اپنی بنائی ہوئی نظمیں بھی بڑے مزے کی ہیں۔ مشہور شاعروں کی نظموں کو لے کر وہ ان میں کمال کی جدتیں پیدا کر دیتے تھے۔ اس کو انگریزی میں پیروڈی کہتے ہیں۔ اس فن میں وہ یکتا تھے۔

اب ان کی کتابوں کے ترجمے کے بارے میں ایک حرف۔ ان کہانیوں کے اردو زبان میں ترجمے کی راہ پر میرے دوست صلاح الدین محمود نے مجھے ڈالا اور میں ان کا نہایت درجہ شکر گذار ہوں کیونکہ ترجمہ کرتے ہوئے میرا وقت خوب لطف سے کٹا۔ میں نے ایلس کی دونوں کتابوں کو برسوں پہلے اسکول کے دنوں میں مزے سے پڑھا تھا لیکن اب یہ کہانیاں میرے ذہن میں کچھ دھندلی سی ہو چلی تھیں۔ ترجمے کی خاطر اب جوان کو بڑے غور سے پڑھنا پڑا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ ان کتابوں سے زیادہ

Scanned with CamScanner

مسرت بخش کتابیں انگریزی یا کسی اور زبان کے ادب میں موجود نہیں۔ ترجمہ میرے لیے پہاڑی پر چڑھائی کی طرح از حد کٹھن، گو خوشی بخشنے والا کام تھا۔ اردو زبان کا مزاج انگریزی زبان سے بڑا مختلف ہے اور انگریزی محاورے کو اردو کے سانچے میں اس طرح ڈھالنا کہ اصل بے ساختہ پن اور ذائقہ برقرار رہے، جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ میں نے اپنی طرف سے پوری کوشش اس بات کی کی ہے کہ لیوس کیرول کی نثر کی تازگی اور ندرت جوں کی توں اردو زبان میں اپنا جلوہ دکھائے، اس لیے اگر بعض اردوداں حضرات میرے فقروں کی انگریزی ساخت پر چیں بہ جبیں ہوں تو تعجب کی بات نہیں۔ میں ان کی خدمت میں یہی عرض کروں گا کہ اگر میں ایسا نہ کرتا تو ایلس کی کتابیں ایلس کی کتابیں نہ رہتیں، کچھ اور ہو جاتیں۔ ٹکسالی یا محاوراتی اردو کی یہاں گنجائش نہ تھی۔ میں نے لیوس کیرول کے ساتھ ایک ہو کر یہ ترجمہ کیا ہے۔ زبان آسان ہے جسے بارہ چودہ برس کے بچے سمجھ سکتے ہیں، گو میں نے اس کی شعوری کوشش نہیں کی۔ میں اس کام میں کتنا کامیاب ہوا ہوں اور ترجمہ اچھا ہے یا برا، یہ تو وہ پڑھنے والے ہی بتا سکتے ہیں جنھوں نے اصل انگریزی میں کتابیں پڑھی ہیں۔ میں خود سمجھتا ہوں کہ میری محنت رایگاں نہیں گئی۔

اب میرے لیے اپنی منھ بولی بہن کشور ناہید صاحبہ کا شکریہ ادا کرنا باقی ہے، جنھوں نے ایلس کی کتابوں کو اصل سر جان ٹینیل کی تصویروں کے ساتھ چھپوانے کا ڈول باندھا۔ انھوں نے میری عبارت کو بھی سنوارا اور جہاں ضروری تھا اردو روزمرے میں اصلاح بھی کی۔ ان کے ان جتنوں کے بغیر میں سمجھتا ہوں یہ ترجمہ، جو مجھے بہت پیارا ہے، شاید کبھی بھی اس دیدہ زیب، خوبصورت چھپی ہوئی کتاب کی صورت اختیار نہ کر پاتا۔ میری ان معاملات میں کاہلی مسلّم ہے اور ہمارے ناشروں کے اتنے بکھیڑے ہیں کہ ان بے چاروں کو کسی ادبی کتاب کے چھاپنے کی ضرورت نہیں۔ خود چھپوانے کا بھی مجھ میں مقدور نہ تھا۔ میرے وسائل اس کی اجازت نہ دیتے۔

اور اپنے دوست اور بھائی احمد ندیم قاسمی کا کس منھ سے شکریہ ادا کروں۔ انھوں نے میرے کٹے پھٹے مسودے کو ٹائپ کرایا اور اول اول میں مجلس ترقی ادب کی نگراں کمیٹی سے اس ترجمے کی طباعت و اشاعت کی منظوری لے لی۔ کتاب کو اسی ادارے سے شائع ہونا تھا مگر پھر اس میں کھنڈت پڑ گئی۔ ادارے کے پاس بس اتنے فنڈ تھے کہ اس سے ملازمین کی سال بھر کی تنخواہیں دی جا سکتیں اور اس لیے

بامرِ مجبوری اس منصوبے کو ترک کرنا پڑا۔ میری اس کتاب میں کئی نظمیں انھی کی ہیں جس میں انھوں نے لیوس کیرول کی اصل انگریزی نظموں کو بڑی خوبی سے اردو کا لباس پہنایا ہے، اور میں حیران ہوں کہ وہ کس طرح اتنی آسانی سے لیوس کیرول کے مزاج داں ہو گئے۔ پڑھنے والوں کو یہ نظمیں لطف دیں گی۔

(ماہنامہ ملن، کراچی)

❁

ابن انشا

چاکیواڑہ میں وصال

(تبصرہ)

یہ کتاب جو ہمارے سامنے ہے، ایک ناول ہے، لیکن عجیب ناول ہے۔ نام ہے اس کا ''چاکیواڑہ میں وصال'' اور مصنف ہیں محمد خالد اختر۔ چاکیواڑہ کراچی کی ایک مشہور بستی ہے۔ ہم جیسے ظاہر بینوں کو لی مارکیٹ کے نواحات میں سوائے گندگی، بے ترتیبی، لکڑی کے ٹالوں، ریڑھیوں، ٹرام لائن کی گڑگڑاہٹ اور مجمع بازوں کے شور کے کچھ دکھائی یا سنائی نہ دے گا، لیکن خالد اختر نے اس کو رومانوں کی بستی بنا ڈالا ہے۔ رومانوں سے یہاں مطلب وہ سستے رومان نہیں جو ہمارے تیسرے درجے کے ناولوں اور فلموں کا موضوع ہوتے ہیں بلکہ ان میں ایڈونچر کا جزو بھی ہے اور جس کی ایک مثال رابرٹ لوئی اسٹیونسن کی ''نیو اریبین نائٹس'' ہے۔ خالد کی یہ کتاب بھی الف لیلہ ہے۔ جس کا بغداد ہے چاکیواڑے کا محلّہ۔ عربی الف لیلہ نے جس مٹی سے ہارون رشید اور وزیر جعفر کے پتلے تیار کیے ہیں، اسٹیونسن نے اسی سے بوہیمیا کے شہزادے فلوزیل اور اس کے جاں نثار کرنل کے پیکر تراشے۔ اس مٹی کی باقیات خالد کے دو مرکزی کرداروں کی تعمیر میں کام آئی ہیں۔ ہیرو ہیں مصورِ فطرت، نباضِ نسائیات، شاد اسرار شیخ قربان علی کٹار گوجرانوالوی، جو ہونہ ہو پرانی چال کے ایک ناول نویس فدا علی خنجر کا عکس ہیں بلکہ لفظی ترجمہ۔ اور اس کا ساتھی ہے اقبال چنگیزی بیکری والا جو خود کو مینیجنگ ڈائریکٹر اللہ توکل بیکری کہلانا پسند کرتا ہے اور مصنفوں

Scanned with CamScanner

کا عقیدت مند ہے۔ وہ ان کے ناشتے کا خرچ اٹھاتا، ان کو قیمیں ادھار دیتا اور ان کے احمقانہ پلانوں میں طوعاً و کرہاً شریک ہوتا ہے۔ فکشن کا ایک اور جوڑا ہے جس کی خوبیوں کا سراغ ان دونوں کرداروں میں ملتا ہے: وہ ہیں سروانٹس کے ڈان کوئکزوٹ اور سانکو پینزا۔

محمد خالد اختر اردو ادب کی ایک تازہ دریافت ہیں۔ ویسے ان کی کتاب ''بیس سو گیارہ''، جو ایک شگفتہ طنز تھی، بارہ چودہ سال پہلے شائع ہو چکی ہے لیکن اس کا چرچا زیادہ نہیں ہوا۔ یہ ناول بھی پانچ چھ برس پہلے کی تصنیف معلوم ہوتا ہے لیکن چھپا اب ہے۔ اس کے بعد خالد نے مزاحی مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا جس کے دو کردار مقبول اور زبان زدِ قارئین ہو گئے تھے۔ ایک چچا عبدالباقی جس کا کام لوگوں کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھانا ہے اور عجیب عجیب خیالی منصوبہ بندیوں اور نت نئے کاروباروں کی داغ بیل ڈالنا اور جلد از جلد ان کا دیوالہ نکالنا ہے۔ دوسرا سادہ لوح رفیق بھتیجا بختیار خلجی ہے۔ ان دونوں کرداروں کا آغاز اصل میں اسی ناول سے ہوتا ہے۔ ہاں، اس ناول میں ان کے نام شیخ قربان علی کٹار اور اقبال حسین چنگیزی ہیں جو کبھی کبھی خود کو ایس کیو علی کٹار اور آئی ایچ چنگیزی بھی کہتے ہیں۔

ہمارے سامعین نے سمجھ لیا ہوگا کہ یہ سرتا سر مزاحی ناول ہے۔ اس کے دوسرے دلچسپ کرداروں میں ایک مجمع باز پروفیسر شہسوار خاں ہیں جس کے قبضے میں ایک بھالو ہے، ایک بندریا اور ایک بکری۔ لیکن اقبال چنگیزی سے اس نے یہ راز پوشیدہ نہیں رکھا کہ اصل میں یہ نافرمان جنات ہیں جن کو اس نے سزا کے طور پر جانور بنا رکھا ہے۔ ایک ڈاکٹر غریب محمد ہیں جو اس علاقے میں حضرت عزرائیل کے نمائندۂ خصوصی ہیں اور چاکیواڑہ والے کسی اور مرض کی بجائے انھی کی گولیوں سے جاں بحق تسلیم ہونا پسند کرتے ہیں۔ انھی میں قربان علی کٹار کے یک طرفہ عشق کی محبوبہ رضیہ بانو کا باپ عمر قصاب ہے جو اپنے نہ ہونے والے داماد کا قیمہ بنانے کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے۔

قربان علی کٹار نے محبوب کو اپنے قدموں میں لانے کے لیے کئی جتن کیے۔ شروع میں اس پر اپنے فاضل ہونے کا رعب ڈالنے کے لیے چنگیزی یونیورسٹی کے زمانے کا گاؤن اور ٹوپی پہن کر اور آکسفورڈ ڈکشنری لے کر بیٹھتا رہا اور آخر میں پروفیسر شہسوار خاں نے ایک طلسمی نگینہ دیا جس میں حضرت سلیمان آتے ہیں اور ضرورت مندوں کی حاجت روائی کرتے ہیں۔ یہ دونوں دوست پہلے سوچتے رہے کہ حضرت سلیمان سے کن الفاظ میں تخاطب کیا جائے۔ اقبال چنگیزی نے کہا، یور گریشس

Scanned with CamScanner

میجسٹی کہنا موزوں ہوگا کیونکہ موصوف جنات کے شہنشاہ ہیں۔ قربان علی کٹار نے کہا، یار میں نہیں سمجھتا کہ حضرت سلیمان اور جن انگریزی سمجھ سکتے ہیں۔ ہوسکتا ہے وہ انگریزی کے طرزِ خطاب کا برا مانیں۔ اقبال چنگیزی نے فہمائش کی کہ کیا آپ کے خیال میں حضرت سلیمان کو انگریزی نہ آتی ہوگی۔ وہ تو پرندوں تک کی بولیاں سمجھتے ہیں۔ پھر انگریزی اب ہمہ گیر زبان ہوگئی ہے، مجھے یقین ہے، بہت سے جن اس زبان میں دسترس رکھتے ہوں گے۔ البتہ قربان علی کٹار کی ایک صلاح صائب تھی۔ انھوں نے کہا، یور میجسٹی کی بجائے یور ایکسیلنسی کہنا چاہیے کیونکہ مسلمان ہونے کی وجہ سے حضرت سلیمان کی حیثیت ایک جمہوریہ کے صدر کی ہوگی اور صدر کے لیے موزوں خطاب یور ایکسیلنسی ہے۔

اس عشق کا جو انجام ہونا تھا وہ ظاہر ہے، لیکن اس کی بدولت کہانی کے تار و پود بلکہ اس کی ہر سطر اور ہر لفظ میں شرارت اور تبسم آفرینی کی رمق ملے گی۔ احمد ندیم قاسمی نے اس کتاب کو شائستہ مزاح کا بہترین نمونہ قرار دیا ہے، غالباً اس لیے کہ اس میں کہیں زبردستی قاری کو ہنسانے کی کوشش نہیں کی گئی۔ واحد متکلم نہایت سادگی سے ایک داستان بیان کرتا چلا گیا ہے، جیسے ''پطرس کے مضامین'' کا واحد متکلم۔

محمد خالد اختر کو پڑھنے والا اکثر یہ بھول جاتا ہے کہ وہ اردو پڑھ رہا ہے۔ اس میں انگریزی کے الفاظ کی بھرمار بھی نہیں ہے لیکن جملوں کی ساخت سراسر انگریزی ہے اور مصنف بار بار ''پیارے پڑھنے والے'' یعنی ڈیئر ریڈر سے مخاطب ہوتا ہے۔ شروع شروع میں یہ انداز غریب اور اُکھڑا اُکھڑا معلوم ہوتا ہے لیکن بعد میں اس میں بانکپن کا لطف آنے لگتا ہے۔ اور میں خالد اختر کو ہرگز مشورہ نہ دوں گا کہ اپنے اس انداز کو اردو کے روایتی اندازِ بیان میں بدلے ــــ شاید مشورہ دینے کی ضرورت نہیں، خالد کے لیے یہ ممکن بھی نہیں۔

(فنون، لاہور، اکتوبر ۱۹۶۵ء)

❁

محمد کاظم

کھویا ہوا اُفق

(تبصرہ)

یہ محمد خالد اختر کی تیسری کتاب اور اس کی تحریروں کا پہلا مجموعہ ہے جو اشاعت پذیر ہو کر سامنے آیا ہے۔ اس سے پہلے، بہت سال ہوئے، ہمیں اس کے قلم سے ایک تفریحی ناول ''بیس سو گیارہ'' ملا تھا جو بظاہر اکیسویں صدی کی ایک خیالی ریاست ''ماضنین'' میں ایک غیر ملکی صدر کی سیاحت کی پُر مزاح کہانی تھی، لیکن جو اصل میں ہماری اُس وقت کی سیاسی، معاشی اور سماجی زندگی کے پُر تصنع طور طریقوں پر ایک بے باک مگر لطیف اور خوش طبع طنز تھی۔ اس کے بعد محمد خالد اختر نے ہمیں اسی طرح کا ایک اور تفریحی ناول ''چاکیواڑہ میں وصال'' دیا جس میں اس نے ہمیں اُم البلاد کراچی کے اس تنگ اور پُر ہجوم شہری محلے کی دنیا کا ایک ہلکا پھلکا اور مضحکہ خیز پہلو، اس کے کچھ عجیب اور انوکھے کرداروں کے ساتھ، دکھایا۔ یہ دونوں ناول محمد خالد اختر کے اس خاص طنز و مزاح کا ایک عمدہ نمونہ تھے جس میں طنز کے تیکھے پن کو ایک بے حد لطیف اور شگفتہ انگریزی طرز کے مزاح میں لپیٹ کر اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ نتیجے میں پیدا ہونے والی چیز بجائے کوئی چبھن یا تلخی پیدا کرنے کے تفریح اور خوش دلی کا باعث بنتی ہے۔ طنز و مزاح کے اس مرکب میں کبھی کبھی مزاح کا عنصر نسبتاً زیادہ ہو جانے کی وجہ سے اس میں ہنسوڑ پن (funnyness) کا سا انداز بھی پیدا ہو سکتا ہے لیکن مزاح کسی حال میں بھی اپنی ہمت اور اپنا مقصد آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتا۔

محمد خالد اختر کی یہ تیسری کتاب ''کھویا ہوا اُفق'' اس کے ان رومانوں سے کچھ مختلف چیز ہے۔ کہانیوں، طنزیہ خاکوں، پیروڈیوں اور سفری روئیدادوں کے اس مجموعے میں ہمیں مصنف کی تخلیقی صلاحیتوں کی ایک ایسی پچی کاری (mosaic) دکھائی دیتی ہے جس کا نمونہ اس کی پہلی کتابوں میں موجود نہیں ہے۔ اس مجموعے میں وہ بیک وقت کئی حیثیتوں سے ہمارے سامنے آتا ہے۔ وہ ایک کامیاب افسانہ نگار بھی ہے اور ایک قابل اور مشاق پیروڈی نگار بھی۔ وہ ایک نادر فن کاری کے ساتھ

Scanned with CamScanner

سفری کہانیاں لکھنے والا بھی ہے اور ایک کامیاب فینٹسی لکھنے کے لیے اچھوتا تخیل (imagination) بھی اپنے اندر رکھتا ہے۔ اور پھر طنزیہ و مزاحیہ خاکے تو وہ سہولت اور سبک دستی کے ساتھ لکھتا ہے جیسے ان کے لکھنے میں اسے کوئی تردّد ہی نہ کرنا پڑتا ہو!

اس مجموعے میں شامل یہ سب چیزیں اُس نے آج سے بارہ یا چودہ برس پہلے اپنی زندگی کے اُس دور میں لکھی تھیں جسے میں اُس کی ادبی سرگرمی کا پہلا دور کہتا ہوں۔ اُن دنوں وہ اردو کے سب اچھے اور معیاری رسالوں میں لکھتا تھا—"ادبِ لطیف"، "سویرا"، "داستان گو"، "افکار"، "فانوس"، "شعور"، "نقش"، "لیل و نہار"—ان میں سے کبھی ایک اور کبھی دوسرے رسالے کے صفحات پر ہماری اس کی مڈبھیڑ ہوتی تھی، اور عموماً ہوتی تھی۔ اس کی وجہ یہ کہ وہ زمانہ اس کی تخلیقی قوتوں کے شباب کا تھا اور اس کی پیداواری صلاحیت اپنے پورے مد پر ہونے کی وجہ سے کسی ایک رسالے کی پابند ہو کر نہیں رہ سکتی تھی۔

اس کے بعد اس پر پانچ چھ برس کا زمانہ ایسا گزرا جس میں وہ ایک عجیب حالتِ خوابیدگی میں تھا۔ انجماد اور بے حسی (hibernation) کی یہ حالت انسان پر اس کی زندگی کے مختلف وقتوں میں طاری ہوتی رہتی ہے جبکہ شیلے کے الفاظ میں "گزرتے ہوئے لمحوں کا جاں گسل بوجھ ایک پچھمی ہوا کی طرح آزاد اور غیر مطیع انسان کو بھی جکڑ کے بے دست کر دیتا ہے۔" خالد کے معاملے میں یہ گزرتے ہوئے لمحوں کا بوجھ تھا یا ایک نئی گرہستی زندگی کی قید—بہر حال، اس عرصے میں اس نے بہت ہی کم لکھا، یہاں تک کہ اس کے قریب رہنے والوں کو یہ اندیشہ ہونے لگا کہ شاید وہ پھر کبھی نہیں لکھے گا۔

پھر اردو ادب کا یہ موقر رسالہ "فنون" وجود میں آیا تو اس کے ساتھ ہی محمد خالد اختر کا نام بھی ایک بار پھر ادبی منظر پر نمایاں ہوا، اور اس طرح سے اس کی ادبی سرگرمی کا دوسرا دور شروع ہوا۔ لیکن اب کی دفعہ اس نے اس ایک رسالے سے ہی عہدِ وفا استوار کیا اور اس میں ایک مذہبی رسم کی سی باقاعدگی کے ساتھ لکھنے لگا۔ چنانچہ "فنون" کی اب تک کی پنج سالہ زندگی میں اس کا شاید ہی کوئی شمارہ ایسا گیا ہو جس میں اس کم آمیز، راہب مزاج ادیب کی کوئی کہانی، کوئی طنزیہ خاکہ، کوئی سفرنامہ یا کوئی مفصل تبصرہ شریکِ اشاعت نہ ہو۔ ادب سے شغف رکھنے والا ایک اچھا خاصا طبقہ، خصوصاً نئی نسل میں سے، آج ایسا ہوگا جو محمد خالد اختر کو صرف "فنون" کے واسطے سے ہی جانتا ہوگا، ایسے لوگوں کے لیے اس ادیب کی پچھلی تحریروں کا یہ مجموعہ بڑی دلچسپی اور دل بہلاوے کی چیز ثابت ہوگی۔ رہے وہ لوگ جو مصنف کو اس کے

Scanned with CamScanner

اوائل زمانے سے جانتے ہیں اور ان ہی دنوں سے اس کی تحریروں کے متعلق اچھی رائے رکھتے ہیں، تو اُن کے لیے اس کے اِن منتشر فن پاروں کا یہ مجموعہ یقیناً ایک سنبھال کر رکھنے کی چیز ہے۔

اردو طنز و مزاح کے متعلق علم تحقیق کی کتابوں اور ادبی رسالوں کے بھاری بھرکم نمبروں میں جو کچھ بھی کہا جا چکا ہو، اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اردو ادب کی اس خاص صنف کو محمد خالد اختر سے بہتر جوہر (talent) اب تک میسر نہیں آیا۔ طنز و مزاح کے لیے اردو زبان میں زیادہ تر ایک ہی ٹکنیک لوگوں نے استعمال کی ہے اور وہ مضمون یا آج کل کی نئی اصطلاح میں انشائیے کی ہے۔ اب انشائیہ ایک بڑی ہی دھوکے میں ڈالنے والی چیز ہے۔ یہ ظاہر میں بہت آسان اور سہل الحصول دکھائی دیتا ہے لیکن اس میں فن کا ایک خاص معیار قائم رکھنا اتنا مشکل ہوتا ہے کہ اس میں اچھے اچھوں کی ہوا اُکھڑ جاتی ہے۔ طنز و مزاح کے باب میں ہمارے اہلِ قلم نے خاکے اور انشائیے تو بہت لکھے ہیں، لیکن کیسے خاکے اور انشائیے؟ میں بغیر کسی مبالغے کے کہتا ہوں کہ کچھ عرصہ ہوا کراچی کے رسالے ''نقش'' کے آغاز میں طنز و مزاح کی ایک جلیل القدر اور مستند شخصیت کا ایک مضمون پڑھ کر مجھے متلی کا احساس ہونے لگا اور میں نے حیران ہو کر سوچا کہ طنز و مزاح کے استادِ کل، اور فن کی اس پستی میں! طنز و مزاح اصل میں ''نشانے پر بیٹھنے یا خطا جانے'' والی بات ہے۔ جب مزاح نشانے پر نہ بیٹھے تو وہ فنی معیار سے اتنا نیچے گر جاتا ہے کہ اُسے منھ پر ہاتھ رکھے بغیر نہیں پڑھا جا سکتا۔ طنزیہ و مزاحیہ انشائیوں میں اگر کچھ لوگ کامیاب ہوئے ہیں، یا انھیں کامیاب سمجھا گیا ہے، تو وہ یوں کہ اُنھوں نے مزاح پیدا کرنے کے لیے زبان کے اُلٹ پھیر اور محاورے اور روزمرہ کی بازی گری کا سہارا لیا۔ ان کا سارا مزاح زبان و محاورے کی بیساکھیوں پر قائم ہوتا ہے۔ کسی دوسری زبان میں اس کا ترجمہ کیجیے اور مزاح کی ساری عمارت دھڑام سے نیچے آ رہتی ہے۔ محمد خالد اختر نے، اس کے برعکس، طنز و مزاح کے لیے زیادہ تر کہانی اور پیروڈی کی ٹکنیک استعمال کی ہے۔ وہ اپنا مزاح اپنی بات کے معنی و مدلول میں، یا اپنے تخیل کی کسی خاص انسانی صورتِ حال میں پیدا کرتا ہے۔ وہ اس کے لیے الفاظ اور زبان کا سہارا نہیں لیتا۔ وہ اس معاملے میں خوش قسمت ہے کہ قدرت نے اسے ایک طرف کہانی کہنے کا ہنر اور دوسری طرف ایک غیر معمولی تخیل ودیعت کیا، چنانچہ اس نے طنز و مزاح کے ضمن میں بہت اچھی اچھی کہانیاں لکھی ہیں جن میں سے ایک خاص سلسلہ ''چچا عبدالباقی'' کی کہانیوں کا زیادہ مشہور بھی ہے اور مقبول بھی! چچا عبدالباقی کے روپ میں محمد خالد اختر نے

Scanned with CamScanner

ایک ایسا حقیقی، دلچسپ اور زندگی بھرا کردار تخلیق کیا ہے جو اردو ادب کی روایت میں بہت دیر تک زندہ رہے گا۔ یہ ایک ناٹے قد کا، گول، معصوم چہرے والا، منصوبہ بند (schemer) ہے جس کے پُرتخیل ذہن اور بلند و بالا عزائم کے سامنے تجارتی کاروبار کی کوئی بھی اسکیم بڑی نہیں ہے، خصوصاً جب کہ اس کے سرمائے کے سلسلے میں بختیار خلجی جیسا ایک سادہ لوح اور خوش اعتقاد بھتیجا اس کی چکنی چپڑی باتوں میں آنے کے لیے ہمیشہ موجود ہو۔ چچا باقی کی راتوں رات بزنس میگنیٹ بننے کی ہر اسکیم، قدرتی طور پر، تاش کے پتوں کے مکان کی طرح نیچے آ رہتی ہے لیکن اس اسکیم کے ملبے میں سے ہاتھ جھاڑ کر نکلتے ہوئے چچا عبدالباقی کی خود اعتمادی میں ہمیشہ ذرہ بھر فرق محسوس نہیں ہوتا۔ اس کے پاس ہر منصوبے کی ناکامی کے لیے ایک بہت سوچی ہوئی اور قابلِ یقین قسم کی توجیہہ موجود ہوتی ہے اور وہ تھوڑے ہی عرصے میں ایک نئی تجارتی اسکیم کا بیڑا اٹھانے کے لیے پہلے سے بھی زیادہ مستعد اور چوکس نظر آتا ہے۔

> ''بھئی بختیار! یہ زیبرے اچھے خوبصورت جانور ہیں... میں سوچ رہا ہوں کہ اگر ان زیبروں کو وکٹوریہ یا تانگے کے آگے گھوڑوں کی بجائے جوتا جائے تو کیسا رہے۔ ذرا تصور کرو کہ کراچی کی وکٹوریاؤں کے آگے مریل بھورے گھوڑوں کی بجائے چست دھاری دار زیبرے جتے ہوئے ہیں... سنو بھئی بختیار! کیوں نہ ایک زیبرا درآمد کمپنی کھولی جائے اور نائجیریا سے زیبرے درآمد کیے جائیں اور وکٹوریا والوں کو مہیا کیے جائیں، بڑا اچھا بزنس ہو سکتا ہے۔''

یہ ''زیبرا اسکیم'' کا آغاز ہے جس میں چچا عبدالباقی کے تخمینے کے مطابق ایک سو زیبرے درآمد کرنے پر صرف ایک سال کی مدت میں دو لاکھ روپے کی بچت ہونا کوئی بات ہی نہیں ہے۔ ''مگر چچا، گھوڑے کیا کریں گے؟ گھوڑے تو بیکار ہو جائیں گے۔'' نئی اسکیم کی ترنگ میں آئے ہوئے چچا کے لیے کوئی مسئلہ مسئلہ نہیں ہوتا۔ وہ جواب میں کہتا ہے:

> ''وقت آ رہا ہے جب گھوڑے بیکار ہو جائیں گے۔ بھئی بختیار! واللہ مجھے گھوڑوں کے ساتھ کوئی بغض نہیں، مجھے ان سے ہمدردی ہے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ ان کا مستقبل تاریک ہے۔''

دوسری تکنیک جو محمد خالد اختر نے طنز و مزاح کے لیے استعمال کی ہے اور جو زیادہ نازک اور فن کارانہ ہے، وہ ''پیروڈی'' ہے۔ پیروڈی کا لفظی ترجمہ لغت میں ''مضحک نقل'' ہے یعنی کسی مصنف یا کسی تصنیف کے اسلوبِ خاص کی ایسی نقل اتارنا کہ اس میں اس اسلوب کے انفرادی خصائص ایک مبالغہ

Scanned with CamScanner

آمیز صورت میں سامنے آ کر تفریح کا باعث بنیں۔ ادب کی اس صنف کو لوگوں نے کچھ اور نام ــــ مثلاً مسخ نگاری، تحریف نگاری، چربہ نگاری وغیرہ ــــ بھی دے رکھے ہیں۔ اردو ادب میں پیروڈی کے نمونے نثر میں تو خال خال ہیں، البتہ نظم میں متعدد لوگوں نے اس میں طبع آزمائی کی ہے۔ زمانہ حال میں محمد خالد اختر سے پہلے کنہیا لال کپور اور شفیق الرحمٰن نے اس ضمن میں کچھ اچھی چیزیں لکھی ہیں، لیکن اس صنف کو جتنے اعتماد اور فنی مہارت کے ساتھ محمد خالد اختر نے برتا ہے اس کی مثال اردو ادب میں نایاب ہے۔ اس نے اپنے زمانے کے متعدد شہرت یافتہ قلم کاروں کا (کاش نام گنوانے میں کوئی مضائقہ نہ ہوتا) ایسی کامیابی سے چربہ اتارا ہے کہ اگر مضمون کے اوپر لکھنے والے کا نام نہ ہو تو نقل کا گمان بھی نہیں ہو سکتا۔ اس مجموعے میں محمد خالد اختر کی پانچ پیروڈیاں شامل ہیں جن میں سے دو شخصی ہیں اور تین عمومی قسم کی یعنی کسی رسالے کی یا درسی کتاب کی! ''سائیں علی حیدر رفندک'' میں مصنف نے ''آبِ حیات'' کے مولانا محمد حسین آزاد کا روپ بھرا ہے اور ''چچا سام کے نام آخری خط'' میں اس نے منٹو کے اس خاص اسلوب کی پیروڈی کی ہے جس میں اس نے چچا سام کے نام کئی خط لکھے تھے۔ اس مضمون کو ''ایک عقیدت مندانہ پیروڈی'' کہہ کر اس نے اس غلط فہمی کا ازالہ کرنے کی کوشش کی ہے کہ چربہ نگاری لازماً کسی ادیب کی پگڑی اچھالنے یا اس کا منہ چڑانے کا مترادف ہوتی ہے؛ یہ ایک صاحبِ طرز اور انفرادی رنگ رکھنے والے ادیب کے حضور میں لکھنے والے کا اظہارِ عقیدت و اخلاص بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن ہمارے اس ماحول میں یہ بات بمشکل ہی کسی کی سمجھ میں آئے گی۔ ''سائیں علی حیدر رفندک'' میں پیروڈی کا انداز ملاحظہ ہو:

> جلادرائے بھی جلد ماننے والے نہ تھے۔ وہ مصر ہوئے اور مزید دو سیر لڈو اور پندرہ روپے جو کہ لاہور سے بنگالہ کا تھرڈ کلاس کا کرایہ تھا، ہرکارے کے ہاتھ بھجوائے اور ساتھ لکھا کہ آپ نہ آئے تو میں خود پہنچتا ہوں۔ یہ نہ گئے۔ استاد مرحوم کہتے تھے کہ اصل میں لاہور نہ چھوٹ سکنے کا فقط بہانہ تھا، دراصل انھیں کھٹکا تھا کہ جلادرائے نام! کیا پتا جی میں آئے تو بلوا کر گلے پر چھری پھیر دے۔ جلادرائے کی خود آنے کی دھمکی سے اتنا ڈرتے تھے کہ دو ماہ نیم کے اوپر چڑھ کر سوتے تھے اور کالو کو نیچے پہرے پر کھڑا رکھتے تھے۔ افسوس، اب نہ وہ جلادرائے سے قدردانِ سخن ہیں اور نہ وہ محبت و اخلاص۔ چشمِ بصیرت سے دیکھو تو اس زمانے میں بھی چمنستانِ ادب مرغانِ نوا سنج اور طوطیانِ خوش الحان سے خالی نہیں، مگر کوئی ان کا پرسانِ حال نہیں ہوتا۔

Scanned with CamScanner

یہ تو طنز و مزاح کے متعلق ـــــ اس کے ساتھ زیرِ نظر مجموعے میں کم از کم چھ چیزیں ایسی ہیں جو ہمیں محمد خالد اختر کی تخلیقی صلاحیتوں کے ایک بالکل ہی دوسرے رخ سے آشنا کرتی ہیں۔ یہ اس کی سنجیدہ کہانیاں ہیں، فینٹسی ہے اور سفری روئیدادیں ہیں!

مجموعے کی عنوانی اور سب سے پہلی کہانی ''کھویا ہوا افق'' ایک ایسی مکمل اور جذبات انگیز کہانی ہے جسے لکھ کر ایک بڑے سے بڑا افسانہ نگار بھی اپنے آپ کو آسودہ محسوس کر سکتا ہے۔ یہ ہندوؤں کے مقدس شہر ہردوار میں مصنف کی ایک سفری آپ بیتی کے لہجے میں شروع ہوتی ہے لیکن آگے جا کر جب اس میں ایک ایسی باؤلی عورت کا کردار داخل ہوتا ہے جو اپنے کئی نام بتاتی ہے اور جو تیرہ برس سے گنگا مائی کے چرنوں میں پڑے اپنے رام کا انتظار کر رہی ہے تو یہ ایک توانا اور اثر آفریں افسانے کی صورت اختیار کر جاتی ہے جو ایک گہرے pathos کے ساتھ ختم ہوتا ہے۔

''فورتھ ڈائمنشن'' (چوتھی بُعد) ایک اور سنجیدہ کہانی، بلکہ آپ بیتی ہے جس میں مصنف نے اپنا وہ انوکھا اور ناقابلِ تشریح تجربہ بیان کیا ہے، جس میں ہم اور آپ بھی کبھی گزرے ہوں گے۔ وہ یہ کہ ایک خاص منظر جو اُس نے اپنے دور کے ماضی میں کبھی جاگتے یا شاید سوتے میں دیکھا تھا، اور جو اس کی بچپن کی یادوں میں محفوظ تھا، آگے چل کر اس کی عمر کے شعوری دور میں بعینہٖ اپنی اُسی شکل میں اس کے سامنے آتا ہے۔ یہ اپنے مزاج کے اعتبار سے ایک پُر اسرار کہانی لگتی ہے اور میرے نزدیک مجموعے کی بہترین چیزوں میں سے ہے۔

''مقیاس المحبت'' ایک فینٹسی ہے، جس میں محمد خالد اختر کے اچھوتے تخیل نے ایک ایسا آلہ ایجاد کیا ہے جسے تم کلائی پر باندھ کر اور اس کے ایک بلوریں ٹکڑے کو سامنے آنے والے کسی انسان (یا حیوان) کی سیدھ میں رکھ کر یہ دیکھ سکتے ہو کہ اس کے دل میں تمھارے لیے کتنی محبت ہے۔ اس آلے کی بے رحم اور مشینی سچائی فریب و ریا کی اس دنیا میں کیسے کیسے المیے برپا کر سکتی ہے، اس کا اندازہ کہانی کے ہیرو ڈاکٹر غریب محمد کے انجام سے ہوتا ہے۔ مقیاس المحبت کا یہ لائق موجد جب اسے ایک ایسے لمحے میں اپنی محبوبہ پر استعمال کرتا ہے جب وہ اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھنے کے لیے بڑھا رہی ہوتی ہے تو آلے کی سوئی نفرت کے آخری درجے (منفی چھ) کی طرف اشارہ کر کے اس رومان کا سارا بھرم کھول دیتی ہے اور دل آزردہ ڈاکٹر غریب محمد اپنے آپ کو لیاری کی لہروں کی نذر کر دیتا ہے۔

Scanned with CamScanner

سفرنامے کی صنف میں محمد خالد اختر نے متعدد چیزیں لکھی ہیں اور مجھے اپنی یہ بات دہرانے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ سفرنامے کی جو صورت اس وقت مغربی ادب میں ایک فنی صنف کی حیثیت سے مقبول اور رواج پذیر ہے، اسے اردو میں صرف محمد خالد اختر نے برتا ہے۔ سفرنامے کی حدود ایک طرف خشک اور علمی جغرافیائی بیان سے شروع ہوتی ہیں اور دوسری طرف کہانی اور ناول کے انداز میں لکھی ہوئی روئیداد پر جا کر ختم ہوتی ہیں۔ مراکش کے متعلق پیٹر مین کا سفرنامہ The Alleys of Marrakesh اپنی ساخت اور مزاج میں ایک پورا ناول ہے، اور میں نے مراکش کو جتنا قریب سے اس انگریز سیاح کی کتاب میں دیکھا، اتنا مراکش سے شائع ہونے والے عربی رسالوں اور کتابوں میں بھی نہ دیکھ سکا تھا۔ ایک اچھا سفرنامہ لکھنے والا دراصل ہمیں کسی ملک یا علاقے کا محض ایک خارجی مشاہدہ ہی نہیں کراتا بلکہ وہ اس علاقے کی بو باس اور اس میں بسنے والے انسانی کرداروں تک ہمیں اپنی داخلیت کے راستے سے پہنچنے کا موقع مہیا کرتا ہے اور ہم اس سارے منظر کو اس کی اپنی شخصیت کے جھروکے سے دیکھنے لگتے ہیں۔ اس طرح ہم ایک ہی وقت میں دو چیزوں کی دید سے لطف اندوز ہوتے ہیں — ایک تو خود موضوعِ مشاہدہ، دوسرے اس مسافر کی اپنی شخصیت، جو بذاتِ خود کچھ کم دلچسپ نہیں ہوتی۔

''ڈیپلو سے نوں کوٹ تک'' اور ''دہقانی یونیورسٹی'' اس مجموعے میں مصنف کی ایسی دو سفری کہانیاں ہیں جو ہمیں محمد خالد اختر کی شخصیت کی آخری تہوں تک اترنے میں مدد دیتی ہیں، ان میں سے اوّل الذکر میں مصنف کے ساتھ اس کے دوست احمد ندیم قاسمی نے بھی نکھارنے اور سنوارنے کا کافی کام کیا تھا اور یہ اپنی اصل حالت میں ان دونوں کے مشترکہ ناموں کے ساتھ چھپی تھی۔ نتیجتاً یہ کہانی زبان و بیان کے اعتبار سے بھی ایک خاص جِلا اور چمک دمک اپنے اندر رکھتی ہے اور پڑھتے ہوئے کچھ ایسا تاثر دیتی ہے جیسے کسی نے نثر میں شاعری کا رس گھول دیا ہو۔

محمد خالد اختر کے فن کے بارے میں اوپر کا یہ سارا بیان پڑھ جانے یا لکھ جانے کے بعد ذہن میں قدرتی طور پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے — وہ یہ کہ اگر محمد خالد اختر فی الواقع اس قد و قامت کا فن کار ہے تو کیا آج کے ادب کی سوسائٹی میں اسے اپنا یہ مقام حاصل ہے یا نہیں؟ اس سوال کا جواب غالباً نفی میں ہے اور طنز و مزاح کے بیشتر تذکرے آج بھی اس کے نام سے عموماً گریز ہی کرتے ہیں۔ اس صورتِ حال کی چند وجوہات ہیں جنھیں میں اختصار کے ساتھ نکات کی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔

Scanned with CamScanner

(۱) محمد خالد اختر کا اسلوب اور اس کے مزاج کا مزاج یقیناً مغربی اور انگریزی ہے۔ اس بات کا اسے خود بھی اعتراف ہے اس لیے اس کی لکھی ہوئی چیزوں کا پورا لطف صرف وہی لوگ اٹھا سکتے ہیں جو انگریزی ادب سے مانوس اور اس کے مزاج شناس ہیں۔ اس طرح وہ قارئین کے ایک منتخب حصے کا مصنف قرار پاتا ہے۔ اس کی اپیل عام نہیں، محدود ہے۔ اب اگر انگریزی ادب پڑھنا اور اپنی فکر اور طرزِ انشا میں اس کا اثر قبول کرنا ایک گناہ کی بات ہے تو اس گناہ کا مرتکب محمد خالد اختر بھی ہے اور اس کے سب مداح بھی۔ ذاتی طور پر میں اس میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتا، بلکہ مجھے یقین ہے کہ اردو زبان کی موجودہ تھکن اور اضمحلال کی حالت میں اس کے جسم میں دوسری زبانوں کا صحت مند خون داخل کرنا اس کی صحت اور بقا کے لیے ضروری ہے۔

(۲) محمد خالد اختر کے اسلوب و انشا کی اس انگریزیت سے جھنجلا کر کچھ لوگ اس کے فن طنز و مزاح کی قدر و قیمت لگانے میں ٹھوکر کھا جاتے ہیں۔ اس کے اسلوب میں ضرور ایک اجنبی زبان کا اثر ہے لیکن اس کے طنز و مزاح کا ماحول، اس کے افراد اور اُن کی گفتگو اور چلت پھرت سب کچھ یہیں کا ہے اور دیسی ہے۔ اس کی مزاحیہ کہانیوں کے کردار ہمارے آس پاس ہی کہیں بستے ہیں۔ اس اعتبار سے اس کا فن ہمارے لیے کسی طرح بھی اجنبی نہیں۔ یوں کوئی اردو ادب کی انیسویں صدی والی روایت کے خول سے باہر نہ نکلنا چاہے اور طنز و مزاح میں ''اودھ پنچ'' کے سجاد حسین اور مچھو بیگ یا ملا رموزی اور فرحت اللہ بیگ پر وحیِ خیال کا سلسلہ ختم سمجھتا ہو تو اس کا علاج کسی کے پاس نہیں ـــــ محمد خالد اختر ایسے بزرگوں کا مصنف نہیں ہے اور نہ اس کا یہ مجموعہ ان کے دسترخوان کی چیز ہے۔

(۳) اس معاملے میں میں محمد خالد اختر کو بھی بالکل بے گناہ نہیں سمجھتا۔ اس کا یہ عذر تسلیم کہ وہ انگریزی میں سوچتا اور اردو میں لکھتا ہے لیکن اپنے اس انوکھے عمل انشا پر اگر وہ چاہے تو کچھ محنت اور توجہ بھی صرف کر سکتا ہے۔ اس کی تحریروں میں ایسے مقامات کم تعداد میں سامنے نہیں آتے جہاں وہ کسی فقرے کا انگریزی سے محض لفظی ترجمہ کر دیتا ہے یا کسی جملے کو ڈھیلا چھوڑ دیتا ہے یا اس کے آخر میں 'ہے' یا 'ہیں' محذوف کر دیتا ہے، یا اس میں تاکید کا عمل غلط جگہ پر لے آتا ہے۔ ایسے مقامات پر اس کی تحریر میں ایک خام کیفیت اور ان گھڑپن پیدا ہو جاتا ہے جو اس کے مضمون کے مجموعی تاثر پر اثر انداز ہوتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اسے اردو فقرے کی ساخت اور اس کے در و بست کا شعور نہیں ـــــ مولانا محمد حسین آزاد

Scanned with CamScanner

کی اتنی کامیاب پیروڈی لکھنے والے پر عجز بیان کا گمان ایک حماقت ہوگی۔ وہ محض اپنی کاہلی اور لاأبالی پن کی وجہ سے ایسا نہیں کرتا۔ وہ کوئی چیز تخلیق کرتے وقت اُسے پہلی اور آخری بار لکھنے میں یقین رکھتا ہے اور اپنی لکھی ہوئی چیز پر دوسری بار نظر ڈالنے سے اکثر جی چراتا ہے۔ اس کی یہ سستی اور آرام پسندی اس کی بہت سی تحریروں کو اس لطیف اور نازک پچ سے محروم کردیتی ہے جس سے ایک عبارت میں ملائمت اور چمکیلا پن پیدا ہوتا ہے اور اس سے کسی اجنبی زبان کے نامانوس اثرات دور ہو سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے محمد خالد اختر کی نثر کی صحیح قدر و قیمت لگانے میں اہلِ نظر کو ہمیشہ یہی دشواری پیش آتی ہوگی، ورنہ جہاں تک ندرتِ خیال اور بات کہنے کے لطیف اور شگفتہ انداز کا تعلق ہے، اس میں وہ ایک منفرد مقام رکھتا ہے اور میرا خیال نہیں کہ اس فن میں آج کے ادبا میں سے زیادہ لوگ اس کے ساتھ شانہ ملا سکیں گے۔

(۴) اور اس کا ایک اور قصور اس کی شخصیت کا وہ پہلو ہے جس کی طرف اوپر ایک جگہ میں نے اشارہ کیا ہے۔ وہ یہ کہ وہ بہت کم آمیز ہے اور اس زندگی کے بارے میں ایک رواقی (Stoic) نقطۂ نظر کا حامل۔ وہ اردو ادب کی موجودہ گروہ بندیوں میں سے کسی کے ساتھ نہیں۔ اُس کی اِس عدم وابستگی کی وجہ سے معاصر ادبا میں اس کے دوست بہت کم ہیں اور اس نے اپنے گرد اپنے مداحوں کا کوئی حلقہ بھی نہیں قائم کر رکھا جو اس کے نام اور کام کا ہر جگہ چرچا کرتے پھریں۔ لیکن میں اس قصور پر اُسے ملامت نہیں کروں گا۔ ایک ادیب کو اپنی شہرت کے لیے اپنے فن ہی پر بھروسا کرنا چاہیے اور یہی کچھ وہ کر رہا ہے۔ آج اگر وہ اپنا صحیح مقام نہیں پا سکا تو کیا عجب کہ کل اس کے فن کی صحیح قدر و قیمت متعین ہو سکے، جب کہ آج کی بہت سی 'شاہکار' اور 'اوّل درجے' کی چیزیں گمنامی کی ریت میں گہری دب چکی ہوں۔

کتاب کاغذی پشتے کے ساتھ نیوز پرنٹ پر چھپی ہے جس کی طباعت اور گیٹ اپ میں ناشرین نے اپنا روایتی معیار بڑی خوبی کے ساتھ قائم رکھا ہے۔

(فنون، لاہور، جولائی ۱۹۶۸ء)

❁

صلاح الدین اکبر

تبصرے پر تبصرہ

میں یہ چند سطور لکھنے کے لیے کبھی قلم نہ اٹھاتا اگر اس سے مقصود اپنا بچاؤ ہوتا، لیکن کچھ غلط بیانیوں کی نشاندہی اور غلطیوں کی تصحیح لازمی ہے۔ یہ اس لیے بھی زیادہ ضروری ہے کہ آپ نے اپنے اداریے میں ان تنقیدوں کو تخلیقی ادب کی طرح رسالے کی خوبیوں میں گنوایا ہے۔

جو کچھ خالد اختر صاحب جیسے "پرانے لکھنے والے" نے مجھ سے "نئے لکھنے والے" کے متعلق کہا ہے، وہ ان کا حق ہے، مجھے اس سے کوئی تعرض نہیں۔

قیامِ پاکستان سے قبل ہی میرے افسانے "ہمایوں"، "ادبِ لطیف" اور "ادبی دنیا" میں چھپ رہے تھے، اور یہ ان رسائل کے عروج کے دن ہیں جب کرشن چندر، منٹو، بیدی، ندیم، اشک، ستیارتھی، عصمت اور پوری کی پوری ترقی پسند ادیبوں کی کھیپ ان رسائل پر چھائی ہوئی تھی۔ اُن دنوں خالد صاحب کو شاید ان کے ہم مکتبوں کے علاوہ اور کوئی جانتا بھی نہ ہوگا۔

میرا ناول ضرور مقصدی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں جو کچھ کہنا چاہتا تھا نہ کہہ سکا ہوں یا اسے اچھے طریقے اور پیرائے میں نہ بیان کر سکا ہوں۔ اس کا مقصد ایک مثالی معاشرے کی تشکیل ہے جہاں نہ خوف ہے، نہ حزن، نہ مایوسی اور محرومی کا گزر ہے، جہاں خوش حالی اور فراوانی میں مطمئن ضمیر بھی ہے۔ اس میں ماضی کی مدح سرائی کہیں نہیں، ایک ممکن مستقبل کی تشکیل ہے اور یوں اس کا روایتی اسلامی ناولوں سے مقابلہ کرنا زیادتی ہے۔

خالد صاحب نے بڑا اکرم کیا کہ سی ایس پی اور آئی سی ایس افسروں کی توجہ (بریکٹوں میں) میری طرف دلانے کے بعد میرے کمیونسٹ نہ ہونے کی تصدیق کر دی، ورنہ ان کو کون روک سکتا تھا اگر وہ یہ فرما دیتے کہ مصنف اشتراکی ہی نہیں اشتمالی بھی ہے۔ رحمٰن بستی میں فصل ایک جگہ اکٹھی 'پول' ہوتی ہے اور وہاں سے ہر کسی کو حسبِ ضرورت دے دی جاتی ہے اور فالتو زمین کے مالک کی نہیں سب کی ملکیت سمجھی جاتی ہے۔

تنقید ڈسٹ کور سے شروع ہوتی ہے۔ تصویر کے متعلق ارشادات بے عمل نعت خواں کی مدح سرائی ہے یا اپنی قیافہ شناسی کا اشتہار۔ مصنف اور کتاب کے ساتھ ساتھ ڈسٹ کور پہ جن بزرگوں کی آرا ہیں، انھیں بھی رگید دیا گیا ہے۔ میں مولانا صلاح الدین مرحوم کی اس کتاب پر ریڈیو پر تقریر میں دی گئی رائے کا ذکر کر کے ایک بزرگ ہستی کو، جواب ہم میں نہیں ہیں، زیرِ بحث نہیں لانا چاہتا۔ اگر وہ ان محترم ہستیوں کو درگذر کر کے اور ان کی آرا کو ان کی ذاتی رائے سمجھ کر نظر انداز کر دیتے اور اپنی تنقید کو کتاب تک ہی محدود رکھتے تو بہتر ہوتا۔

خالد صاحب فرماتے ہیں، ''ڈاکٹر صاحب یقیناً پڑھے لکھے آدمی ہیں۔'' یہ حسنِ ظن بھی خوب رہا۔ بھائی، میں نے کبھی اپنی علمیت کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ ہمیشہ اپنی کم علمی کا اعتراف کیا ہے، اس کا ایک فائدہ ضرور ہے کہ میرے کسی افسانے میں کوئی سرقہ نہیں، برا بھلا جو کچھ میں نے لکھا ہے، میرا اپنا ہے۔

خالد اختر صاحب نے میرے افسانے ''کبھی پڑھے'' تھے۔ اب انھوں نے شاید پڑھنا بند کر دیا ہے۔ تنقید سے معلوم ہوتا ہے کہ ناول انھوں نے پڑھا ضرور ہے مگر رواروی میں، ورنہ وہ کبھی یہ نہ کہتے کہ مصنف نے ستلج کے اُس پار کا ذکر کیا ہے مگر ستلج کے اُس پار تو مدراس تک کا علاقہ پڑا ہے — اوّل تو میں نہیں سمجھتا کہ مصنف کے لیے اصل بستیوں کے نام لکھنے کسی بھی قسم کی تحریر میں ضروری ہیں، سوائے تاریخ کے، جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ اس میں تاریخوں اور مقامات کے ناموں کے علاوہ اور کچھ سچ نہیں ہوتا۔ پھر بھی ان کا اعتراض بے جا ہے، مصنف نے مشرقی پنجاب سے پاکستان کے سفر میں یہ بھی تو لکھا ہے (ملاحظہ ہو صفحہ نمبر ۷۰): ''گاڑی میں بیٹھتے وقت ان کا خیال تھا کہ زیادہ سے زیادہ شام کے وقت وہ پاکستان میں داخل ہو جائیں گے... دریا شہر سے کوئی نو دس میل کے فاصلے پر تھا مگر ان کی آنکھیں دریا کے پانی کو دیکھنے کے لیے ترس گئیں۔''

یہ فاصلہ اتنے وقت میں آپ یقیناً مدراس، دلّی، لکھنؤ یا بمبئی سے گاڑی میں طے نہیں کر سکتے — اب کیا ضروری ہے کہ مصنف لڈو وال یا جمال پور لکھے۔ ناول کو اگر انھوں نے ذرا بھی غور سے پڑھا ہوتا تو ان پر یہ ظاہر ہوتا کہ مصنف نے جس صنعتی شہر کا ذکر کیا ہے، وہ لاہور نہیں۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ وہ لاہور سے نقل مکانی کر کے اس نئے شہر میں آتے ہیں۔ (صفحہ ۱۱۸-۱۱۹)

مجھے اعتراف ہے کہ میرا ناول رجعت پسند ہے۔ اس میں زنا بالجبر نہیں بلکہ ترغیبِ گناہ بھی

نہیں۔ وہ ان رومانی واقعات سے بھی تہی ہے، جس میں ہیرو ہیروئن چھپ چھپ کر ملتے اور ارمان بھری باتیں کرتے ہیں—— وہ رومانی باتیں جن سے ہمارے نام نہاد اسلامی ناول بھی بھرے ہوتے ہیں اور جو ان ناولوں کو نوجوان طبقے میں ہردل عزیزی بخشتی ہیں۔ ہمارے تنقید نگار کو ہیرو کا شادی شدہ ہونا بھی نہیں بھایا۔ وہ کبھی ناول لکھیں تو انھیں اختیار ہے وہ ایسا ہیرو نہ دکھائیں، لیکن یہ اعتراض تنقید نہیں، محض کیڑے ڈالنا ہے۔ ان کا رویہ مجھے ایک معروف ادبی حلقے کی گراوٹ کے زمانے کی یاد دلاتا ہے، جس میں افسانے یا نظم یا مضمون پر تنقید کا رُخ پہلے سے چائے خانے میں متعین کرلیا جاتا تھا اور پھر اسی نہج پر تنقید کی جاتی تھی۔

میرے ناول کے کردار ان معنوں میں غیر فطری ہیں کہ وہ واقعی اس قسم کی باتیں نہیں کرتے جس طرح کی باتیں آج کل ہمارے معاشرے میں لوگ کرتے ہیں۔ ہمارے آج کے دور میں نچلا طبقہ روٹی کے چکر سے نہیں نکل پاتا اور لازماً یہی جسم و روح کا رشتہ باقی رکھنے کی باتیں کرتا ہے۔ درمیانہ طبقہ محرومی کے قصے لے بیٹھتا ہے، اونچے طبقے میں مل جانے کی سعی کا ذکر کرتا ہے۔ اپنی زندگی کی بے مزگی اور امرا کے عیش و آرام کا حسرت بھرا ذکر کرتا ہے۔ اور امرا کے طبقے میں کاروں کے ماڈل، بنگلوں کے ڈیزائن انٹیریئر ڈیکوریشن کے قصے ہوتے ہیں یا زلف اور رخسار کی رومانوی انداز میں نہیں، کاروباری انداز میں باتیں ہوتی ہیں۔ ہمارے معاشرے میں اس وقت یا دولت کی ریل پیل ہے اور اخلاقی گراوٹ یا محرومی و ناامیدی اور مایوسی۔ نئی تعمیر کا عزم، حالات کو بدل دینے کی تدبیر کہیں نہیں۔

ماحول کی عکاسی بڑی بات سہی لیکن اس ماحول کی عکاسی ہمیں کہاں لے جائے گی؟ معاشرے کا حساس عنصر ہونے کی حیثیت سے ادیب کا فرض کیا وہیں ختم ہو جاتا ہے کہ ایسی صورت کی تصویر کھینچ کر الگ ہو جائے؟

ہمیں فرانسیسی یا جرمن ادب کی تخلیق مقصود نہیں۔ ہم ایک ایسے معاشرے کے فرد ہیں جو ابھی تشکیل ہو رہا ہے، اپنی آخری شکل کو نہیں پہنچا۔ ہم ایک ایسے ملک کے رہنے والے ہیں جو ایک نظریاتی مملکت ہے جو ریاست اور قومیت کے ایک نئے تصور کو عملی شکل دینے کے لیے وجود میں آئی تھی۔ یہاں ادیب کے فرائض کم از کم اس دور میں جو اس مملکت کے فلسفے کو سمجھتا ہے، مختلف ہیں۔ ہم اس دور میں عظیم تخلیق نہ کر رہے ہوں تو کوئی بات نہیں، لیکن اس وقت اگر ہم محض تتبع میں فیشن ایبل ادب تخلیق کرنے

کی کوششوں میں لگے رہے اور اس مملکت کو وقت کے دھارے پر بہنے دیا تو یہ انسانیت کے لیے ایک بہت بڑا المیہ ہوگا اور مستقبل ہمیں کبھی معاف نہ کرے گا۔

ناقد صاحب کو مصنف کے خواب سے بڑا پیار ہے۔ وہ رحمٰن بستی دیکھنے کے متمنی ہیں۔ وہ پوچھتے ہیں رحمٰن بستی کہاں ہے۔ میں کہتا ہوں، حضور میرے کردار تو سارے غیر حقیقی ہیں، وہ اس معاشرے کے کردار نہیں۔ ہم میں صلاح الدین اکبر اور محمد خالد اختر تو ہیں مگر ناول ''انسان'' کا اختر اور نیاز صاحب نہیں ہیں۔ اگر یہ کردار حقیقی ہوتے تو یقیناً رحمٰن بستی بھی کہیں ہوتی، یہ کردار آج بھی سامنے آجائیں تو رحمٰن بستی بھی یقیناً بس جائے گی۔

... اور وہ جو قلم کی بات خالد اختر صاحب نے کہی ہے اور جس انداز سے کہی ہے، اسے ادبِ عالیہ اور سنجیدہ ادب میں شمار کرنا اور تنقید میں کوئی حیثیت دینا! ''فنون'' کے قابلِ احترام ایڈیٹروں سے مجھے ایسی توقع نہ تھی۔ اگر ایڈیٹر اپنے رسالے میں چھپنے والے مضمون پڑھنا ضروری سمجھتا ہو تو اسے یہ بھی حق ہوتا ہے کہ ناروا باتیں حذف کردے، خاص طور پر ایسی باتیں جن سے تنقید کے مجموعی اثر یا رسالے کی ثقاہت پہ ناگوار اثر پڑسکتا ہو (حق ہی نہیں بلکہ یہ اس کی ذمہ داری بھی ہوتی ہے)۔

مرحوم مولانا صلاح الدین نے ایک بار اس موضوع پر گفتگو کے دوران راقم الحروف سے فرمایا، ''ڈاکٹر صاحب! یہ آج جو بڑے بڑے ادیب بنے پھرتے ہیں، ان کی ابتدائی تحریریں اگر آپ کو دکھاؤں تو ان میں نیلی کی بہ نسبت سرخ روشنائی زیادہ نظر آئے گی۔'' (یہ ہوتا ہے ایڈیٹر کا ہاتھ ادیبوں کے بنانے میں اور یہ ہوتی ہے اس کی ذمہ داری۔)

محمد خالد اختر صاحب کی الجھن ضرور سمجھ میں آسکتی ہے، طنز نگار کو اس میں کچھ نہیں ملتا، اس کے کرداروں میں منافقت نہیں ملتی۔ وہ جو کچھ کہتے اور کرتے نظر آتے ہیں، خلوص سے کرتے ہیں، ان کی زبان اور دل ایک ہیں — اور یہاں طنز نگار بے بس ہو کر ہاتھ ملتا ہے یا کھمبا نوچتا ہے۔

(فنون، لاہور، اکتوبر نومبر ۱۹۶۴ء)

❋

Scanned with CamScanner

فہمیدہ ریاض

''اداس نسلیں'' کے تبصرے پر تبصرہ

محمد خالد اختر اور پڑھنے والے کی دلچسپ جرح ابھی پوری نہیں ہوئی۔ لہٰذا جب خالد صاحب اپنی جگہ سے ہٹتے ہیں تو ان کی جگہ ایک پڑھنے والی آکھڑی ہوتی ہے اور خالد صاحب کی اجازت کے ساتھ ''ہر قسم کی لگی لپٹی اٹھا کر'' جرح شروع کرتی ہے۔ اس جرح کی خاص خوبی یہ ہے کہ پہلا پڑھنے والا اب صرف ایک خاموش سامع ہے۔

پڑھنے والی یوں شروع کرتی ہے:

محمد خالد اختر نے ایک اچھا ہنسانے والا انشائیہ تحریر کیا ہے۔ مگر یہ یقیناً بہتر ہوگا اگر اس میں سے تنقید والے دو چار جملے بھی نکال دیے جائیں، بلکہ انھیں شامل ہی نہ کیا جاتا تو بہتر تھا۔

''اداس نسلیں'' میری رائے میں ایک بہت اچھا ناول ہے جو کئی پڑھنے والوں کو بہت پسند آسکتا ہے۔ یہ ایک ایسا ناول ہے جس کے لیے کئی superlatives استعمال کیے جاسکتے ہیں۔ مگر خالد صاحب کا تبصرہ پڑھ کر آپ خدا کا شکر بھیجیں گے کہ وہ اچھے ادیب تو ضرور ہیں مگر تنقید نگار نہیں ہیں، کیونکہ جو کچھ انھوں نے سپردِ قلم کیا ہے اسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ایک تنقید نگار کو جو کام کرنا پڑتا ہے وہ چنداں خوشگوار نہیں۔ اسے تاک لگائی ہوتی ہے کہ کہیں ذرا سی بھی غلطی نظر آجائے اور وہ اسے دبوچ لے۔ میرا ذہن یہ تصویر کھینچ سکتا ہے کہ کسی بھی ناول کی دنیا میں نقاد ایک عقل مند سراغ رساں کی طرح داخل ہوتا ہے جسے کھوئی ہوئی لاپتا خامیوں کا کھوج لگانا ہے — محتاط قدم بڑھاتا ہوا، ذہین اور عقابی نظروں سے وہ ایک ایک چیز کو پرکھتا ہے اور کہیں غلطی نظر آجائے تو خوشی کا نعرہ بلند کرتا ہے۔

ایک قاری کے لیے کوئی بھی کتاب یا تو اچھی ہوتی ہے یا اچھی نہیں ہوتی، لیکن خالد صاحب نے اس کتاب کے بارے میں اس قدر متضاد باتیں کہی ہیں کہ پڑھنے والا یہ سمجھنے پر مجبور ہے کہ خود نقاد اس کتاب کے بارے میں کوئی واضح رائے قائم نہیں کرسکا ہے۔ ویسے یہ ممکن تو ہے کہ اسے یہ کتاب پسند آئی ہے، وہ اس کی تعریف بھی کرتا ہے لیکن کھلے دل سے نہیں — بلکہ آدھے دل سے، مذبذب سا ہوکر،

Scanned with CamScanner

کنی کتراتے ہوے— کیونکہ اس کی تعریف کا ایک پُر جوش جملہ سن کر دوسرے لوگ خود اس کے بارے میں رائے قائم کر سکتے ہیں۔ کم کم تعریف کرنا سنجیدگی اور دانش مندی کی دلیل ہے۔ ویسے کچھ لوگ تو قہقہہ لگا کر ہنسنے کو بھی پُر وقار نہیں سمجھتے، مگر کیا یہ حقیقت نہیں کہ ایسے لوگ ہمیشہ خوشی سے سرشار ہو کر ہنسنے اور پسندیدگی کے بے روک ٹوک اظہار کی مسرت سے ناآشنا رہتے ہیں؟ آخر پسندیدگی ہے کیا، اور لوگ پسند کرتے ہوے اتنا کیوں جھجکتے ہیں؟ یہ تو ایک ایسا فعل ہے جس سے انسان کو خوشی ملتی ہے۔ بعض لوگ ایک لایعنی سوال کرتے ہیں کہ فلاں چیز تم کو کیوں پسند ہے۔ آخر مجھے یہ معلوم کرنے کے لیے کیا چیز مجبور کرے گی؟ اگر مجھے کوئی چیز 'الف' پسند ہے تو وہ میرے لیے خوشی کا باعث ہے اور میں اس صورتِ حال سے مطمئن ہوں۔ ہاں اگر کوئی چیز مجھے ناپسند ہو تو وہ میرے لیے ناگواری کا باعث ہوگی اور میں یہ ضرور معلوم کرنا چاہوں گی کہ اس ناپسندیدگی کی کیا وجہ ہے۔

لیکن خالد صاحب بے لاگ اور بھرپور تعریف نہیں کر سکے۔ جو تعریف کی ہے اس سے ایسا ظاہر کرتے رہے جیسے ان کا دل نہیں چاہ رہا —یا شاید واقعی ان کا دل نہیں چاہا۔

انھوں نے مصنف کو نا کام کہہ دیا اور ایسی خاموشی سے کہ آپ انگشت بدنداں رہ جائیں۔ ویسے ہم کہہ دیں گے کہ یہ تبصرہ نگار کی ذاتی رائے ہے مگر انھوں نے مصنف کی پیٹھ تھپکنا تجویز کر کے جس مربیانہ رویے کا اظہار کیا ہے، وہ کسی قدر ناقابلِ برداشت ہو سکتا ہے اگر کوئی ان کی نیت پر شبہ کرنے لگے... اور پھر خالد صاحب ذرا دوبارہ سوچیں، کیا واقعی وہ ''اداس نسلیں'' کے خالق کو اس قدر بے چارہ سمجھتے ہیں؟

کسی نے کہا تھا کہ بعض لوگ غلطی کو یوں تلاش کرتے ہیں جیسے وہ کوئی خزانہ ہو۔ یہ الزام دھرنے کا مجھے کوئی حق نہیں ہے کہ محمد خالد اختر بھی ایسا کرتے ہیں، مگر یہ مضمون پڑھ کر قاری کو کبھی کبھی شبہ سا ہونے لگتا ہے کہ شاید ایسا ہی ہے۔

تبصرہ نگار نے یہ بیان کرنے میں کہ عبداللہ حسین ایک وجیہہ جوان ہیں، کافی کاغذ استعمال کیا ہے— میں نے ''گنوایا ہے'' جان بوجھ کر نہیں لکھا کیونکہ پُر لطف نثر کے یہ ٹکڑے کسی طرح بھی کاغذ کا زیاں نہیں کہے جا سکتے، مگر اس بات سے قطع نظر— تبصرہ نگار کی رائے میں مصنف کی شکل و صورت سے اس کی تصنیف میں کیا فرق پڑ سکتا ہے؟ یہ بات وضاحت طلب ہے۔

Scanned with CamScanner

خالد صاحب کا مزاح بہت دلکش ہے مگر پڑھنے والا اس سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ تنقیدی بصیرت کی تلاش بھی جاری رکھتا ہے، اور یہی اُس کی غلطی ہے۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں، ''پیارے پڑھنے والے! ذرا صبر سے کام لو۔'' اور تقریباً ہر صفحے پر پیارا پڑھنے والا کہہ سکتا ہے کہ انھیں یہاں ''ذرا'' نہیں بلکہ ''بہت صبر سے کام لو'' لکھنا چاہیے تھا۔

ایک بات دلچسپ ہے۔ مضمون میں محمد خالد اختر نے عبداللہ حسین سے حسد کرنے اور نہ کرنے کا کئی بار ذکر کیا ہے۔ جب ایک دو دفعہ مجھے اس تکرار کا احساس ہوا تو میں نے دلچسپی سے گنا۔ کل چھ بار یہی بات کبھی اثبات میں اور کبھی نفی میں لکھی گئی ہے۔ نہ جانے ایسا کیوں ہوا۔

قابل تبصرہ نگار نے دو بار اپنی عمر کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ یہ امر قاری کو ٹھنک کر سوچنے پر اکساتا ہے۔ مگر یہ کوئی ایسی خاص بات نہیں، کچھ لوگوں کی تو عادت ہی ہوتی ہے کہ وہ بات بے بات ٹھنک کر سوچیں۔ ایک جگہ فاضل تبصرہ نگار نے لکھا ہے کہ میں مسخرہ بننے کی کوشش نہیں کر رہا ہوں۔ سوال یہ ہے کہ انھیں یہ کہنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ اس ضرورت کی وضاحت کی جاسکتی ہے مگر کون ہے جو خالد صاحب کی دھار دار حاضر جوابی کو نہیں جانتا ہوگا اور خطرے مول لیتا پھرے گا۔

انھوں نے معاشرے میں ادیبوں کی حیثیت پر تاسف کا اظہار کیا ہے۔ بے قدری کی مثال دیتے ہوئے پہلوانوں کا بھی ذکر کیا ہے کہ ان کے شاگرد اور مداح ''انھیں ہار پہناتے ہیں اور کندھے پر بٹھا کر پھیپھڑوں کی پوری قوت سے اظہار مسرت کرتے ہیں۔'' میں متعجب ہو کر سوچتی ہوں، کیا وہ یہاں یہ کہہ رہے ہیں کہ ادیبوں کے ساتھ بھی یہی سلوک ہونا چاہیے؟

آخر میں اُنھوں نے کہا ہے، ''کیا یہ سوچنے کی بات نہیں؟''

میرا تو جواب ہوگا، ''نہیں!''

ادیبوں کی طرف عوام بہت زیادہ، یا نسبتاً زیادہ توجہ نہیں دیتے تو اس کے لیے ہم انھیں قصوروار نہیں ٹھہرا سکتے۔ اگر لوگوں کو زیادہ دلچسپی نہیں تو یہ فطری بات ہے۔ کسی بھی ملک اور کسی بھی قوم کی جنتا ادیبوں کے پیچھے دیوانی نہیں ہوتی۔ اس خارزار میں قدم رکھنے سے پہلے سب جان لیں کہ ان کا استقبال کرنے والے گنے چنے ہوں گے۔ جب ہی تو کہتے ہیں کہ ادیب کی زندگی کٹھن ہوتی ہے۔ لوگ یہ کیوں نہیں کہتے کہ پہلوانوں کی یا فلم ایکٹروں کی زندگی بڑے دکھوں میں بیتتی ہے؟ لیکن اگر ایک آدمی کو

Scanned with CamScanner

کتابوں سے زیادہ کشتیوں میں دلچسپی ہے تو اس کے لیے آپ اسے ملامت نہیں کر سکتے، یہ تو انتخاب کا معاملہ ہے اور یہ بالکل ایسا ہی ہوگا جیسے وہ شخص آپ سے پوچھے کہ آپ کو کتابوں کے بدلے پہلوانوں سے کیوں دلچسپی نہیں۔

اور اگر آپ کسی آدمی کے ملٹی وٹامن گولیوں پر پندرہ روپے خرچ کرنے پر ناک بھوں چڑھائیں گے تو کچھ حاصل نہ ہوگا — سوائے چڑھی ہوئی ناک بھوں کے۔ بڑے سے بڑا انٹلکچوئل اپنے ہاضمے کو کنفیوشس کے فلسفے سے زیادہ اہمیت دے گا۔

بقول فرینک روکار، ''اور یہ ایک تنہا، ذاتی فن ہے۔''

بہرحال اس آخری حصے کو چھوڑتے ہوئے — جو لکھا بھی اسی لیے گیا ہے کہ کوئی آخری حصہ بھی ہونا ضروری تھا (اور کیا میں نے جان نہیں لیا!) — یہ ایک ایسا مزے دار انشائیہ ہے جسے پڑھ کر موٹی سے موٹی کھال کا آدمی بھی ہنسے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اسے پڑھ کر آپ بہت لطف اندوز ہوں گے اور اس کے ذکاوت اور وِٹ سے دمکتے ہوئے حصے اپنے دوستوں کو سنائیں گے۔ مگر آپ اسے تنقید کسی صورت میں نہیں قرار دیں گے۔

(فنون، لاہور، مئی جون ۱۹۶۵ء)

❁

اشفاق احمد

محمد خالد اختر

اگر آپ کے پاس پچھلے سال کی کوئی ڈائری ہے یا اس سے بھی پچھلے سال کی چند ڈائریاں پڑی ہیں تو ان کو ضائع نہ کیجیے، سنبھال کر رکھیے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ یہ ڈائریاں بڑے سائز کی ہوں، ان صفحات کی جن کے ایک صفحے پر ایک تاریخ ہوتی ہے اور جن کی کشیدہ سطریں بہت تنگ ہوتی ہیں۔ گئے سالوں کی یہ پرانی ڈائریاں یا تو آپ مجھے بھجوا دیں یا بلاواسطہ طور پر مولوی اختر علی ہاؤس بہاول پور روانہ کر دیں جہاں

یہ اپنے اصل مالک کے پاس خود بخود پہنچ جائیں گی۔

آپ نے نابینا حضرات کو بریل لکھت کی کتابیں پڑھتے دیکھا ہوگا جو ابھرے ہوئے نقطوں پر انگلیاں پھیر کر نفس مضمون کو اچھی طرح سے سمجھ جاتے ہیں اور موٹی موٹی کتابیں گھنٹوں میں ختم کر لیتے ہیں۔ اگر آپ کے پاس دنیا کی کسی بھی زبان میں چھپی ہوئی ہیومر پر کوئی کتاب ہو تو محمد خالد اختر کو ایک لمحے کے لیے دیجیے اور پھر اس کے چہرے پر مسکراہٹ کی ڈوبتی ابھرتی لہروں کا نظارہ کیجیے۔ نبض دیکھ کر مریض کے ذہنی اور جذباتی معاملات کو بہت دور تک سمجھ جانے کے قصے تو سنے تھے لیکن کسی کتاب کو محض ٹچ سسٹم کے ذریعے اپنے اندر اتارنے کا کمال ہم نے صرف محمد خالد اختر میں ہی دیکھا۔ کہتے ہیں یہ عشق کی آخری منزل ہوتی ہے جس میں عاشق اپنے محبوب کے دل کی بات اپنی بات سے بھی بہتر سمجھنے لگتا ہے۔ کتابوں سے محبت کرتے ہم نے بہت سے لوگوں کو دیکھا بھی اور سنا بھی، لیکن جو عشق خالد کو مطالعے سے ہے، اس نے ہمیں تشویش میں ڈال دیا ہے کہ خدا کرے باقی سب معاملات درست ہوں، کیونکہ اس دیوانگی میں تو وہی مبتلا ہو سکتا ہے جو اور سب اطراف سے کٹ جائے اور اس دنیا کے مطلب کا نہ رہے۔ لیکن یہ بات بھی نہیں ہے۔ خالد ایک بہت ہی شفیق ملاقاتی اور بڑا ہی یار باش انسان ہے اور یہ اسی کا کمال ہے کہ اس نے خواہش کے بغیر اپنے اتنے سارے چاہنے والے پیدا کر لیے ہیں کہ اس کی مرضی کے خلاف بڑی آسانی کے ساتھ ایک سلسلہ ''خالدیہ اختریہ'' چل سکتا ہے اور بہت دور تک پھیل سکتا ہے۔ میں اس سلسلے کے ناظم الامور کے طور پر بہت مفید خدمات سرانجام دے سکتا ہوں۔ لیکن خالد کو اوّل تو یہ سلسلہ پسند نہیں ہوگا اور اگر وہ مان بھی گیا تو مجھے مفید خدمات سرانجام دینے کی اجازت نہیں دے گا، حالانکہ جب تک مفید خدمات سرانجام نہ دی جائیں پبلک خوش نہیں ہوتی۔

خالد سے میری محبت ذاتی نہیں پیوندی ہے۔ میں اس کی تحریروں کو پڑھتا تھا، خوش ہوتا تھا اور داد بھی دیتا تھا، لیکن اس قدر نہیں جس قدر میری بیوی کو توقع تھی اور جتنی داد اس کے حساب سے ڈیو (due) تھی۔ بانو قدسیہ جب بھی محمد خالد اختر کا کوئی مضمون، ناول کا کوئی حصہ، یا بیان کا کوئی ٹکڑا پڑھتیں تو ہنسی ضبط کرنے کے شکنجے میں خود کو اس قدر جکڑتیں کہ ان کی آنکھوں سے پانی بہنے لگتا اور وہ زور زور سے آوازیں دے کر ہمیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتیں۔ لیکن ان کی آواز چھک چھک کرتے پریشر ککر سے زیادہ بامعنی نہ ہوتی اور ہم سب ان کی ہیئت کذائی دیکھ کر خود بھی ہنسنے لگتے۔ ہنسنے کا یہ سلسلہ

ہمارے یہاں بڑی دیر تک جاری رہتا اور پھر جب ہم میں کوئی اس پیرا گراف کو پڑھ کر خود اس میں اترنے کی کوشش کرتا تو ہمارے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہتی کہ اس میں ہنسنے والی تو کوئی بات ہی نہ تھی۔
اوروں کو تو بانو قدسیہ بڑی صدق دلی سے معاف کر دیا کرتی لیکن میری کور ذوقی پر اس کو بڑا دکھ ہوتا اور وہ بجھ سی جاتی۔ اس کو اچھی طرح سے معلوم تھا کہ میں مکتسر ضلع فیروز پور کے ایک گاؤں کا رہنے والا ہوں اور میری تعلیمی اور تربیتی بیک گراؤنڈ کچھ ایسی مضبوط نہیں ہے اور میں چڑ اس کی آواز سنے بغیر ہنسنے سے قاصر ہوں اور لطیفے میں خط کشیدہ الفاظ کے مطالب واضح کیے بغیر اس سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ پھر بھی اس کو اس بات کا بڑا رنج تھا کہ میں محمد خالد اختر کی تحریر کو اور اس کے بیان کی لطافت کو اور اس کے واقعاتی گریز کو کیوں نہیں سمجھتا، اور کیوں اپری شی ایٹ (appreciate) نہیں کرتا۔ لیکن جب اس کو دوسرے ادیبوں سے ملنے کا اتفاق ہوا تو بانو قدسیہ کا یہ دکھ اجتماعی صورت اختیار کر گیا اور اس نے مجھے ادبی تھیلی کے ایک اور چٹے بٹے کے طور پر معاف کر دیا۔ مگر اس معافی کے باوجود اس نے مجھے محمد خالد اختر کے انداز پر اردو، انگریزی اور پنجابی میں سوا سوا گھنٹے کے پانچ لیکچر دیے اور مجھے یہ سمجھانے کی پُر زور کوشش کی کہ subtle ہیومر کس کو کہتے ہیں اور اس کی خوبصورتی بیان کے کس زاویے میں چھپی ہوتی ہے۔ مجھے ان لیکچرز کا بہت فائدہ ہوا اور میں خالد کی تحریر کی خوبصورتیوں کو بھی سمجھنے لگا، لیکن ہنستے وقت میری آنکھوں سے ایسا پانی کبھی نہیں بہا جیسا بانو قدسیہ کی آنکھوں سے اب بھی بہتا ہے اور میری صورت ویسی کبھی نہیں بنی جیسی ہنستی ہوئی بری عورت کی صورت بانو قدسیہ کی بن جاتی ہے۔

تیرہ چودہ برس پہلے کی بات ہے جب ایک محفل میں فیض صاحب نے کہا، ''بھئی ہم کو تو محمد خالد اختر کی تحریر پسند ہے اور ہم تو 'چاکیواڑہ میں وصال' کو اردو کا عظیم ناول سمجھتے ہیں،'' تو بانو قدسیہ نے فیض صاحب کا کندھا تھپتھپا کر کہا، ''شاباش فیض صاحب، آپ تو بہت ہی لائق ہیں اور آپ کی اسیس منٹ بالکل کریکٹ ہے۔ میں آپ کو فل مارکس دیتی ہوں۔'' جذبے میں آ کر وہ یہ بات کہہ تو گئی لیکن پھر خود ہی شرمندہ سی ہو گئی کہ میں کس کو کیا بات کہہ رہی ہوں۔

لیکن اس ساری گفتگو کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ میں خود محمد خالد اختر کی قدر و قیمت کو جانچ نہیں سکا اور اس کی صلاحیتوں کو آنک نہیں سکا ہوں۔ میں نے محمد خالد اختر کو خوب پڑھا ہے، بڑے شوق سے پڑھا ہے اور اس سے بے حد متاثر ہوا ہوں۔ یہ بات الگ ہے کہ میں نے پبلک میں کھل کر اس کا

Scanned with CamScanner

اظہار نہیں کیا اور اس بات کو سب کے سامنے تسلیم نہیں کیا۔ لیکن اس میں میرا کوئی اتنا بڑا قصور نہیں ہے۔ جب سارے بہاول پور کو اس بات کا علم نہیں ہو سکا کہ اس نے کتنے بڑے سپوت کو جنم دے رکھا ہے اور اردو ادب کو کس پائے کا ادیب عطا کر رکھا ہے تو پھر اس میں مجھ ایسے غیر بہاولپوری کا کیا قصور۔ جب بہاول پور کے لوگ محمد خالد اختر سے بے نیاز رہ سکتے ہیں تو ہم ایسے غیر ملکی اس سے لاتعلق کیوں نہ رہیں۔ جب بہاول پور کے لوگ افسروں اور اونٹوں کے سوا اور کچھ نہیں جانتے تو ہم کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ ان کے پنل کی صفت ثنا میں اپنی جان گنوائیں۔

محمد خالد اختر کی ذات اور اس کے حالات کے بارے میں میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ وہ سب کچھ تو اس کے دوست اور قدیمی یار بتائیں گے۔ میں تو صرف اسی قدر کہہ سکتا ہوں کہ محمد خالد اختر اُن بہت ہی خوش قسمت سوچنے والوں میں سے ایک ہے جو اپنے مشاہدے کے ساتھ ساتھ ارتقا کی منزلیں بڑی تیزی سے طے کر رہا ہے اور جو مغربی مصنفوں کی طرح وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلی کے نئے فہم تلاش کر رہا ہے۔ خالد کے فن کا سب سے بڑا کمال اس کے مغربی علوم کے مطالعے میں مشرقی زندگی کی پہچان ہے۔ یہ پہچان ایسی انوکھی، ایسی سبک اور کچھ ایسی اچانک ہے کہ اگلے فقرے پر پہنچ جانے کے بعد پچھلا راز کھل کر سامنے آ جاتا ہے۔ کچھ اس وجہ سے نہیں کہ اگلا فقرہ گزری ہوئی بات کی وضاحت کرتا ہے یا اگلے فقرے پر پہنچنے میں جو وقت ملتا ہے اس میں سوچ نکھر کر موضوع کو اپنی روشنی میں گھیر لیتی ہے یا قاری کو مصنف کے ساتھ چلنے کا ڈھب آ جاتا ہے: ایسی کوئی بات نہیں ہوتی، فقط ایک واقعہ ہو جاتا ہے، ایسا واقعہ جس کے لیے نہ تو کوئی سامان تیار تھا، نہ ہے اور نہ ہی کیا گیا۔ ایسا انداز مشق سے حاصل نہیں ہوتا، صرف فطرت کی طرف سے ملتا ہے اور اہل نظر کہتے ہیں کہ یہ انداز خاموشی میں رہنے والے کے لیے مختص ہے اور خلا کی بے آوازی اور بے صدائی کے اندر اترتا ہے۔

محمد خالد اختر کی تحریریں ہیں تو تفنن طبع کا سامان لیکن اس اوپر کی سطح کے نیچے ایک اور ہی علم موجود ہے۔ یہ علم آپ کی لایعنی معلومات میں کوئی اضافہ نہیں کرتا بلکہ آپ کے اندر کے خوابیدہ علم کو گھنٹی بجا کر بیدار کرتا ہے اور اس کے بیدار ہوتے ہی خود غائب ہو جاتا ہے۔ اور یہ سب کچھ محمد خالد اختر کا شعوری عمل نہیں ہے بلکہ اس شخص کی تخلیقی مجبوری ہے جو بہاول پور میں پیدا ہو کر دور دور کے لوگوں کو کھڑکا رہا ہے اور خود بھی پریشان ہو کر شرمندہ شرمندہ سی زندگی بسر کر رہا ہے کہ میرا مقصد کسی کو خفت میں مبتلا کرنا

Scanned with CamScanner

نہیں تھا، یہ لکھنا لکھانا تو مجھ سے بس یونہی سرزد ہو رہا ہے۔ اگر خالد کو اپنے کارناموں پر مان ہوتا یا اپنی اس تخلیقی مجبوری کو اس نے صحت مند اور کارآمد اور 'خدمتِ ادب' والی کوشش کا نام دیا ہوتا تو البتہ وہ ہمارے جیسا ادیب ہوتا اور پھر ہم چل کر یوں اس کے آگے سیس نوانے اور اس کی مہما گانے نہ آتے۔ بہاول پور اور بہاول پور کے رہنے والوں کی خدمت میں سلام پہنچے اور خالد کی عمر دراز ہو کہ ہم صرف اس کی وجہ سے یہاں حاضر ہوئے، ورنہ کون آتا ہے اور اتنی دور کس سے آیا جاتا ہے۔

ہاں سچ! وہ جو میں نے ابتدا میں آپ سے پرانی ڈائری یا پرانی ڈائریوں کا ذکر کیا تھا تو ان کا حصول بھی محمد خالد اختر ہی کے لیے تھا۔ محمد خالد اختر پرانی ڈائری کے چھوڑے ہوئے سفید کاغذوں کے علاوہ اور کسی سطح پر لکھ ہی نہیں سکتا۔ کہانی ہو، سفرنامہ ہو، تبصرہ ہو، غرض یہ کہ کسی قسم کا مسودہ ہو، وہ آپ کو ڈائری کے اوراق پر لکھا ہوا ہی ملے گا۔ آج تک اس نے کوئی خط، کوئی محبت نامہ، کوئی معاہدہ ایسا نہیں لکھا جو کسی شریفانہ کاغذ پر ہو۔ یہ اس کی مجبوری ہے اور ہم اس مجبوری کا احترام کرتے ہیں۔ لیکن ڈائری کے کے تنگ رول کے اندر اردو کے بڑے بڑے لحیم شحیم الفاظ کو یوگا کے آسنوں میں بٹھانا بھی خالد ہی کا کام ہے۔ میں اکثر اس کے پرانے خط نکال کر دیکھتا ہوں تو اُن الفاظ سے مل کر اس عمر میں بڑی تسکین ہوتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے باریک لائنوں کے اندر سرکس کی نوخیز لیڈیاں تار پر چل رہی ہوں اور ان کے جسم لمبی کششوں اور چھوٹے شوشوں سے کھل کھل جاتے ہوں اور وہ اپنے آپ کو سمیٹتی، انگڑاتی، جسم اور روح دونوں کے کرتب دکھا رہی ہوں۔ صورت اور معانی کا ایسا امتزاج آپ کو سوائے خالد کی لکھائی کے اور کہیں نہیں ملے گا۔ پرانے عرب ساربان کہتے ہیں کہ جو شخص ریگستان کے کنارے بیٹھ کر غروب ہوتے سورج کے سامنے اونٹوں کی گزرتی ہوئی قطار کو دور تک اور دیر تک دیکھتا ہے، اس کی لکھائی کا انداز محمد خالد اختر کی لکھاوٹ جیسا ہوتا ہے۔

بہاول پور کو اور بہاول پور کے لوگوں کو اور بہاول پور کے صحراؤں کو اور اس کی ڈاچیوں کو ہمارا سلام پہنچے جنھوں نے اتنی بڑی شخصیت کو جنم دیا اور اس کے بدلے میں نہ تو کسی سے کوئی صلہ مانگا اور نہ ہی کسی کو اپنی برتری کی جھمکیں مار کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ بہاول پور کو سلام! اس کی جد پشت کو سلام!

(فنون، لاہور، مئی جون ۱۹۸۵ء)

❁

محمد خالد اختر

مجھے کہنا ہے کچھ

میں نے پوری کوشش کی اور بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے کہ میری خاطر اس تقریب کا انعقاد نہ ہو۔ اس سلسلے میں پاکستان نیشنل سینٹر اور میرے درمیان بہت سے مذاکرے ہوئے جس میں باہمی دلچسپی کے امور پر تبادلۂ خیالات ہوتا رہا۔ مجھے امید تھی کہ بات تبادلۂ خیالات سے آگے نہیں بڑھے گی۔ دونوں جانب سے نہایت وزنی دلائل دیے گئے اور پھر اس خطے کی مشہور ادیبہ جمیلہ بیگم (جمیلہ ہاشمی) اس معاملے میں آن پڑیں جن کے سامنے کسی کا بس نہیں چلتا۔ جب فرار کی کوئی صورت نہ رہی تو میں نے زندگی میں پہلی بار ہتھیار ڈال دیے، اور اب جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں، یہ تقریب ہو کر رہی، جس کے لیے میں بری الذمہ ہوں — میرا ضمیر بالکل صاف ہے۔ جب میرے علم کے بغیر تقریب فیٹ اکمپلی (fait accompli) ہو چکی اور میرے چند دوستوں نے مجھے لکھا کہ انھوں نے مجھ پر اپنے مضامین مکمل کر لیے ہیں اور اگر انھیں کہیں پڑھا نہ گیا تو اُن کی محنت اکارت جائے گی تو میں نے ہامی بھر لی — اس شرط پر کہ یہ ایک عام ادبی تقریب ہوگی جس میں شامل تو میں ہو جاؤں گا مگر مجھے بولنے کے لیے نہیں کہا جائے گا۔ دراصل مجھے پبلک اسپیکنگ سے فی الواقع خوف آتا ہے اور میں نے ہمیشہ ان لوگوں پر رشک کیا ہے جو بلاخوف و خطر اسٹیج پر آ کر ہر قسم کی باتیں کر سکتے ہیں۔ پبلک اسپیکنگ کے خیال سے ہی میرے پسینے چھوٹ جاتے ہیں اور دل بیٹھنے لگتا ہے۔ آپ سب نے غالباً اردو زبان میں سب سے زیادہ ہنسانے والا مضمون ''مرید پور کا پیر'' پڑھا ہوگا جسے احمد شاہ بخاری پطرس مرحوم نے لکھا ہے۔ جہاں تک فنِ تقریر میں دسترس کا تعلق ہے، پیر صاحب کے بھانجے اور یہ فقیر ایک ہی زمرے میں شامل ہیں، اور میرے سب سے زیادہ ڈراؤنے خواب وہ ہوتے ہیں جن میں اسٹیج پر سے بھاگ پڑتا ہوں اور لوگ ''لینا، پکڑنا، جانے نہ پائے'' کے نعرے بلند کرتے ہوئے میرا تعاقب کرتے ہیں... اور پھر سچ یہ ہے کہ برات کا دولہا ہونا میرے خلافِ مزاج ہے۔

اس تقریب میں میرے بہت سے دلی اور روحانی دوستوں نے، جو مجھ سے کہیں زیادہ اچھا لکھتے

Scanned with CamScanner

ہیں، دستور اور آداب کی پیروی میں، ادب کے میدان میں میری ٹا مک ٹوئیوں کو سراہا ہے اور میری پیٹھ تھپکی ہے۔ میں ان کے خلوصِ نیت میں شک نہیں کرتا۔ میں ان کے تعریف و تحسین کے ڈونگروں پر عش عش کر اٹھا ہوں اور خوشی سے پھولا نہیں سما رہا۔ مجھے ان کے عقیدت مندی کے جذبات سے مکمل اتفاق ہے، کیونکہ اکثر لوگ اختلافِ رائے کو پسند نہیں کرتے۔

میں اب اس ستائشی تقریب کے منعقد ہو جانے سے بھی خوش ہوں جو اِن دوستوں کے یہاں فراہم ہونے کا سبب بنی ہے۔ انھیں دیکھ کر میری آنکھیں روشن ہوگئی ہیں۔ یہ سب پختہ کار، منجھے ہوئے ادیب ہیں — حقیقتاً جدید اردو ادب کے سپر اسٹارز، جن کے فنی کارناموں کے ڈنکے بجتے ہیں۔ ان کی تحریروں نے لاانتہا پڑھنے والوں کو مسرت دی ہے۔ یہ سب میرے پرانے دوست اور رفیق ہیں۔ جمیلہ بیگم نے ''آتشِ رفتہ'' جیسی کتاب لکھی ہے جس کے ہر صفحے پر آگ دہکتی ہے اور جسے ہم ایک مائنر اردو کلاسک کا درجہ دیتے ہیں۔ بانو قدسیہ نے ''راجہ گدھ'' جیسا ناول لکھا ہے جو پچھلے دس پندرہ برس کے لکھے عام اردو ناولوں کے درمیان ایسے ہے جیسے سیدھی سادی گرے رنگت کی بطخوں میں کوئی عالی دماغ راج ہنس۔ اس نے ہمیں چند ایک خوبصورت اور کبھی نہ بھولنے والے ٹیلی پلیز بھی دیے ہیں۔ قدسیہ کے میاں اشفاق احمد نے ہماری زبان کو ''گڈریا'' جیسی عظیم اور شاہکار کہانی دی ہے۔ وہ ہمارے بہت اوریجنل انسانوں اور مصنفوں میں سے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی اپنی ذات میں انسٹی ٹیوشن ہیں اور فیض احمد فیض کے جانے کے بعد ہمارے grand old man of urdu letters؛ ایک بڑے لکھنے والے اور ایک بڑے انسان۔ اکرام اللہ اردو کے تین چار بہترین کہانیاں لکھنے والوں میں سے ہیں۔ انھوں نے ایک غیر معمولی ناول ''گرگِ شب' لکھا ہے جو بینڈ (banned) ہے اور جسے ہر ایک نے پڑھا ہے۔ یہ مولوی عبدالسلام کے ''قیامت کا منظر'' اور ایریکا یونگ کی ''فیئر آف فلائنگ'' سے کم فحش ہے۔ آسکر وائلڈ نے ایک دفعہ لکھا تھا:

> There is nothing as a moral or immoral book. Books are well written or badly written. Those who find ugly meanings in beautiful things are corrupt.

منیر احمد شیخ نے بیس پچیس برس پہلے کہانیوں کی بہت خوبصورت کتاب لکھی تھی، ''قاف سے قلم تک۔''

Scanned with CamScanner

ان کی تحریریں اپنی صفائی بیان اور تازگی اسلوب کے ساتھ اچھی اردو نثر کا نمونہ ہیں۔

یہ سب اس ملک کے انٹلکچوئل الائٹ (intellectual elite) ہیں اور مجھے ان کی دوستی پر فخر ہے۔ میں نے ہمیشہ ان کے فن کو سلام اور اس پر رشک کیا ہے اور ان سے رفاقت اور محبت کے رشتے میں منسلک ہونے کے باوجود مجھے ان سے یہ رقابت کا احساس کبھی نہیں ہوا کہ میں ان سے اچھا کیوں نہیں لکھ سکا۔ اصل چیز، اہم چیز ورک آف آرٹ یا فنی تخلیق ہے، یہ اہم نہیں کہ اس کا خالق کون ہے۔ ولیم شیکسپیئر کے ڈرامے اصل چیز ہیں، شیکسپیئر کی اپنی ذات نہیں۔ اس نے خود کبھی اپنے پلیز کو اہمیت نہیں دی اور شاید وہ پلیز اس نے لکھے بھی نہ تھے — شاید سر فرانسس یا بن جانسن ان لافانی ورکس آف آرٹ کے اصل مصنف تھے۔ میرے یہ دوست قسمتوں کے مجھ سے اچھے ہیں اور میں اس بات سے بہت خوش ہوں۔

حقیقت یہ ہے — اور میں کسر نفسی نہیں کر رہا — کہ میں نے ایک امیچر (amateur)، ایک شوقیہ لکھنے والے کی حیثیت سے جوانی میں لکھنے کا آغاز کیا اور تقریباً ساری عمر اپنی ریلیف نب گھسانے کے بعد ابھی تک ایک امیچر قلم گھسیٹ ہوں۔ رائٹر سے زیادہ میں انگریزی اور اردو ادب کا طالب علم ہوں اور کسی قدر کتابوں کا کیڑا۔ میرے دو جگری دوست، شفیق الرحمٰن اور احمد ندیم قاسمی، رائٹر اور کتابوں کے مصنف تھے، تب میں نے سوچا کہ میرے بھی مصنف بن جانے میں کوئی حرج نہیں — مجھے اپنے نام کو چھپا ہوا دیکھنے کا شوق تھا۔ میرے دوستوں نے میرا دل بڑھایا۔ لکھنا میرے لیے ہمیشہ بے حد کٹھن رہا ہے جیسے ڈھلوان پہاڑی پر چڑھنا۔ اردو زبان میں پاپیادہ ہونے کی وجہ سے مجھے بڑی دقت سے لفظ کے ساتھ لفظ جوڑ کر لکھنا پڑا ہے اور فقرہ مکمل کر لینے کے بعد میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ میرا املا قواعدِ زبان کی رُو سے صحیح ہے۔ اگر مجھ میں کوئی تخلیقی ٹیلنٹ تھی تو وہ لطیف حس اب میرا ساتھ چھوڑ چکی ہے۔ میرا خیال ہے، یہ محدود اور عجیب سی ٹیلنٹ مجھے جوانی کے چھ سات برس حاصل رہی۔ جب طبیعت کا مزہ اور دل کا سودا جاتا رہا تو وہ ٹیلنٹ مجھ میں سے چلی گئی۔ ان چند تخلیقی سالوں میں میں نے اپنے دو ناول "بیس سو گیارہ"، "چاکیواڑہ میں وصال" اور اپنی پہلی "باقی کہانیاں" لکھیں — ایک طرح ان چیزوں نے خود اپنے آپ کو لکھا۔ "بیس سو گیارہ"، جسے میں نے کراچی کے ایک تنگ و تاریک فلیٹ میں ۱۹۵۱ء میں لکھا، مجھے اپنی کتابوں میں سب سے زیادہ عزیز ہے۔ یہ ایک مدت سے آؤٹ آف پرنٹ اور نایاب

Scanned with CamScanner

ہے اور اس کے دوبارہ چھپنے کی اس دور میں کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ ''چاکیواڑہ میں وصال'' (جسے میں نے ۵۴-1953ء میں بہاول پور میں لکھا) کا بھی یہی حشر ہوتا، مگر اتفاق سے یہ ناول فیض صاحب کے ہاتھ لگ گیا اور انھوں نے اس کی مشہوری کر دی۔ جب میرے دوست احمد ندیم قاسمی نے ۱۹۶۳ء میں اپنے جریدے ''فنون'' کا آغاز کیا، میں عملاً لکھنا چھوڑ چکا تھا اور میرا دل ادبی ہنگامہ خیزی سے بالکل اچاٹ ہو گیا تھا۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ میں اب کچھ نہیں لکھوں گا۔ اس کے بعد میں نے جو کچھ لکھا ندیم صاحب کے تقاضے اور حکم پر ''فنون'' کے لیے لکھا، کیونکہ مجھے یقین تھا کہ جو کچھ برا بھلا میں لکھوں گا، ''فنون'' میں چھپ جائے گا۔ خوش قسمتی سے ان کے پاس ایک ایسا کاتب تھا جو میرے ہینڈ رائٹنگ کو ڈی سائفر (decipher) کر لیتا تھا، گو بعد میں اس غریب کی آنکھیں اس کڑی مشقت سے خراب ہو گئیں اور اس کی آنکھوں کے آپریشن کی نوبت آ گئی۔ اب اس کے پاس صرف ایک آنکھ ہے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد میں نے بہت کم لکھا ہے — چند ہلکے پھلکے طنزیے، میری اور آپ کی عمر کے بچوں کے لیے ایک مکمل ''تفہیم القاعدہ''، صحرائے تھر پارکر کے بارے میں ایک سفری ناولٹ۔ یہ اہم اور قدرتی رائٹنگ نہیں ہے، اور میں یہ اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ میں نے بہت سے دوسروں کی طرح اپنی قابلیت کو اسے استعمال نہ کرنے سے اپنی تن آسانی، راحت کوشی یا کاہلی سے تباہ کر دیا۔ یہ ایک چھوٹی، معمولی قابلیت تھی اور اس طرح چلی گئی جس طرح یہ آئی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات غلط ہے کہ سالوں کے ساتھ ساتھ لکھنا آسان ہوتا جاتا ہے — یہ مشکل اور مشکل تر ہوتا جاتا ہے۔ اب میں اپنے دل بہلاوے کی خاطر اور وقت کاٹنے کے لیے ان انگریزی ادب کی چیزوں کے برے بھلے ترجمے کرتا رہتا ہوں جن پر میں پلا بڑھا ہوں، جن سے میں نے اپنے ایامِ طفولیت و بلوغت میں محبت کی تھی — رابرٹ لوئی اسٹیونسن کی ''ٹریژر آئی لینڈ'' اور ''کڈنیپڈ''، رائیڈر ہیگرڈ کی ''کنگ سالومنز مائنز''۔ میں جانتا ہوں یہ ترجمے کوئی نہیں چھاپے گا۔ مجھے اس کی پروا نہیں۔ ان کاموں میں مجھے خوشی اور نئی زندگی ملتی ہے جو میرے لیے کافی ہے۔ میں اب پہلے کی طرح کتابوں کا کیڑا بھی نہیں رہا۔ جب میں کوئی نیا ناول پڑھنا چاہتا ہوں تو کوئی پرانا ناول پڑھتا ہوں۔ انگریزی میں ''ٹریژر آئی لینڈ'' اور اردو میں میرامن کی ''چہار درویش'' دو ایسی کتابیں ہیں جنھیں میں نے کم از کم بیس اکیس بار پڑھا ہوگا۔ وہ میرے لیے ایسی سدا بہار کتابیں ہیں جن پر کبھی خزاں نہیں آئے گی۔ ''تذکرۂ غوثیہ'' ایک اور کتاب ہے جو

اشفاق نے مجھے بھجوائی تھی اور جسے میں اکثر پڑھتا رہتا ہوں۔ یہ یقیناً ہمارے ادب کی عظیم ترین کتابوں میں سے ہے جس کے پڑھنے سے دل نہیں کملاتا۔

مگر میں دیوتاؤں کا شکرگذار ہوں۔ ہر وہ شخص جو کسی فنی تخلیق کے تجربے میں سے گزرا ہے (خواہ شاعری ہو خواہ ناول و افسانہ خواہ ڈراما یا کچھ اور) اچھی طرح جانتا ہے کہ ایک بار شروع ہو جانے کے بعد یہ عمل مکمل طور پر ذہن پر مسلط ہو جاتا ہے۔ اور لکھنے والے کے جاگتے والے لمحات میں ایک obsession کی شکل اختیار کر لیتا ہے — کسی اور چیز سے زیادہ حقیقی، ایک ہی وقت میں حظ انگیز مسرت اور بے کل کرنے والی اذیت۔ ایک امیچر سیکنڈ کلاس رائٹر کی حیثیت سے میں کامیاب نہیں ہوا، کیونکہ ایک بہت بڑے عقل مند آدمی نے کہا ہے کہ کامیابی دراصل تاخیر سے آنے والی ناکامی ہے۔

اس مغزپاشی کے لیے معافی چاہتا ہوں۔ ہم اب اسپوتنک اور کمپیوٹر اور ٹیلی ویژن کے صندوقچے کی اتیج میں جی رہے ہیں اور ادب اور قطبی روشنیوں کی باتوں میں کسی کو کیا دلچسپی ہے؟ خالص ادب کا سنہری دور اب گزر چکا ہے۔ لکھے ہوئے لفظ کی جگہ تصویر لے رہی ہے۔ یہ نہیں کہ کتابیں نہیں پڑھی جائیں گی، مگر کیا وہ دھک سے رہ جاتے دل، اس بے صبری، اس اشتیاق سے پڑھی جائیں گی جن سے ہم انھیں بچپن اور لڑکپن میں پڑھتے تھے؟ فلم یا ٹی وی ڈراما اپنی دلچسپی اور جاذبیت اور انسٹنٹ نس (instant-ness) کی بدولت ناول یا کہانی کو سرپاس (surpass) کر رہا ہے۔ ہم میں سے کتنے ہیں جو گھر کے اسکرین پر طالسطائی، ڈکنز، ہارڈی اور برانٹے سسٹرز کے ناولوں پر بنے ہوئے ٹی وی پلیز دیکھنے کے بعد ان شاہکار عظیم ناولوں کی طرف لوٹنے اور ان کے بیانیوں اور قدرتی مناظر کے ہزاروں الفاظ کے سفر طے کرنے پر آمادہ ہوں گے؟ آرٹ کے concept تیزی سے بدل رہے ہیں۔ یہ اجتماعی عمل بن رہا ہے جس میں سیکڑوں شریکِ کار ہوتے ہیں، اور شاید یہ اچھی چیز ہے۔

میں اپنے دوستوں کو بہاول پور کے اس سرسبز و شاداب شہر میں دیکھ کر بہت خوش ہوں۔ ان کا ورود ہم سب کے لیے باعثِ عزت و افتخار ہے۔ مجھے امید ہے وہ یہاں اپنے قیام کے ایک ایک لمحے کو پُرلطف پائیں گے (کیونکہ وہ دور کا سفر کر کے یہاں پہنچے ہیں) اور ان کا دل اچاٹ نہیں ہوگا۔ گو الیکشن کی ریہرسل کی وجہ سے غریبوں کے ہمدردوں، قوم کے سچے خادموں، اسلام کے بے باک اور نڈر

Scanned with CamScanner

سپاہیوں نے اس شہر کی سب دیواریں سیاہ کر رکھی ہیں، اپنی نارمل صورت میں یہ ایک خوبصورت شہر ہے جس سے میں نے ہمیشہ محبت کی ہے۔ ہمارے نیشنل سینٹر نے ان کے لیے سیر و تفریح کا ایک ایسا ٹائٹ شیڈول بنا رکھا ہے کہ انشاء اللہ انھیں سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں ملے گی۔ یہاں کے قابل دید مقامات، یعنی میوزیم، بلدیہ، سینٹرل لائبریری اور شاید سینٹرل جیل کی بھی سیر کرائیں گے اور انھیں ایک ٹیکرے پر بنے ہوئے ایک صحرانشیں ریسٹ ہاؤس میں لے جائیں گے جو میرے انجینئر دوست راؤ ریاض الرحمٰن نے بنایا ہے۔ ہم انھیں گم شدہ افسانوی دریا ہاکڑہ کی تلیٹی کے ساتھ چولستان کے قلب میں دراوڑ کے قدیم قلعے میں لے جائیں گے جہاں اس خطے کے پرانے فرماں روا اور ان کے اہل خاندان ابدی نیند سو رہے ہیں۔ مشہور ہے کہ اس کی فصیلوں اور برجیوں پر ان کے شاہی مکینوں کی روحیں نرم بے آواز قدموں سے چلتی ہیں اور بہت سوں نے انھیں دیکھا ہے۔ ان کے بارے میں کتنے ہی قصے مشہور ہیں۔ ہمارے عزیز مہمان ہمارے خطے کے سب سے بڑے شاعر فرید کی محبوب 'روہی' کا تجمل اور ہار سنگار دیکھیں گے اور پھر رات کو جمیلہ بیگم کی محل سرا میں 'خانقاہ شریف' جائیں گے جہاں انھوں نے مہمانوں کے لیے ایک پُرتکلف ضیافت کا اہتمام کر رکھا ہے اور ان سے ان کے تازہ مختصر افسانے بھی سنیں گے۔

مجھے امید ہے کہ وہ اپنے اس سفر سے چند خوبصورت یادیں اپنے ساتھ لے کر واپس جائیں گے۔

(فنون، لاہور، مئی جون ۱۹۸۵ء)

آج

ہندستان میں مندرجہ ذیل پتوں پر دستیاب ہے

شب خون کتاب گھر

313 رانی منڈی، الہ آباد

کتاب دار

110/108, Jalal Manzil, Ground Floor
Temkar Street, Near J. J. Hospital
Bombay 400 008

ایم۔ آر۔ پبلی کیشنز

2652/55, 1st Floor, Kucha Chelan
Darya Ganj, New Delhi 110 002
Cell: 9810784549

Scanned with CamScanner

آج کی کتابیں

آئینۂ حیرت
اور دوسری تحریریں
سید رفیق حسین
Rs.375

اس نظم میں
میراجی
Rs. 225

ہندی کہانیاں - ا
انتخاب اور ترتیب
اجمل کمال
Rs.180

ایرانی کہانیاں
انتخاب اور ترجمہ
نیر مسعود
Rs. 90

ہندی کہانیاں - ۲
انتخاب اور ترتیب
اجمل کمال
Rs.180

نربدا
اور دوسری کہانیاں
اسد محمد خاں
Rs. 180

ہندی کہانیاں - ۳
انتخاب اور ترتیب
اجمل کمال
Rs.180

قرۃ العین حیدر کے خطوط
ایک دوست کے نام
خالد حسن
Rs.180

عربی کہانیاں
انتخاب اور ترتیب
اجمل کمال
Rs. 180

شب نامہ
اور دوسری نظمیں
ذی شان ساحل
Rs.150

خطِ مرموز
(کہانیاں)
فہمیدہ ریاض
Rs. 100

ای میل
اور دوسری نظمیں
ذی شان ساحل
Rs.150

Scanned with CamScanner

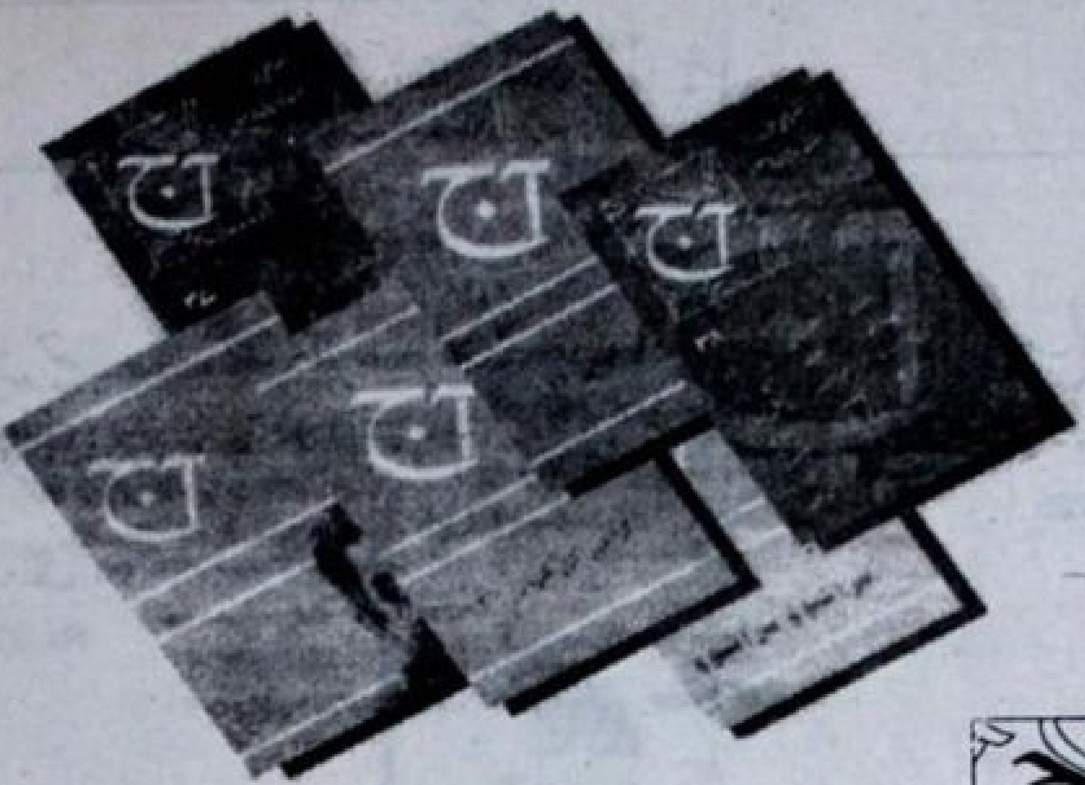

عالمی ادب کا سہ ماہی جریدہ

سہ ماہی ادبی کتابی سلسلے ''آج'' کی اشاعت ستمبر ۱۹۸۹ء میں کراچی سے شروع ہوئی اور اب تک اس کے ۵۰ شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ ''آج'' کے اب تک شائع ہونے والے خصوصی شماروں میں گابریئل گارسیا مارکیز، ''سرائیوو سرائیوو'' (بوسنیا)، نرمل ورما، اور ''کراچی کی کہانی'' کے علاوہ عربی، فارسی اور ہندی کہانیوں کے انتخاب پر مشتمل شمارے بھی شامل ہیں۔

''آج'' کی مستقل خریداری حاصل کر کے آپ اس کا ہر شمارہ گھر بیٹھے وصول کر سکتے ہیں اور ''آج کی کتابیں'' اور ''سٹی پریس'' کی شائع کردہ کتابیں ۵۰ فیصد رعایت پر خرید سکتے ہیں۔

(یہ رعایت فی الحال صرف پاکستانی سالانہ خریداروں کے لیے دستیاب ہے۔)

چار شماروں کے لیے شرح خریداری (بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان میں: ۳۰۰ روپے

ہندستان میں: ۲۴۰ روپے

دیگر ملکوں میں: ۳۰ امریکی ڈالر

Scanned with CamScanner

۵۲

قیمت

پاکستان میں: ۲۰۰ روپے

ہندستان میں: ۱۵۰ روپے

Scanned with CamScanner